فاران

قائد اعظم رح

کا ارشاد ہے :—

"خدائے تعالیٰ نے ہمیں یہ عظیم الشان موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم ایک نئی مملکت کے معمار کی حیثیت سے اپنی قابلیت کا اظہار کریں تاکہ یہ نہ کہا جائے کہ ہم اس کام کے اہل ثابت نہیں ہوئے"
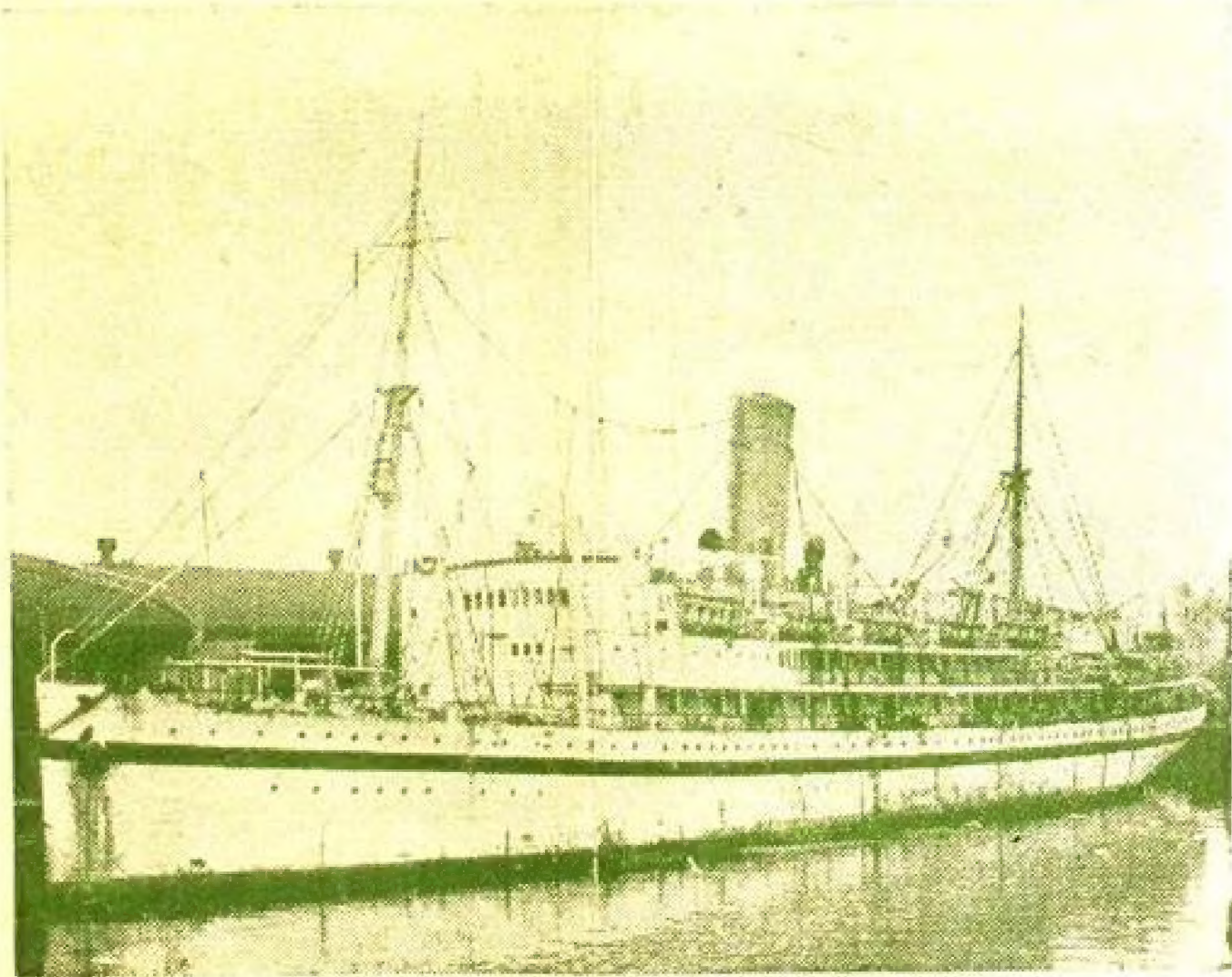
پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

نے قائداعظم رح کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آٹھ ہزار ٹن کا جہاز "النیل" خرید لیا ہے۔ یہ جہاز جسکی تصویر اوپر دی گئی ہے جرمنی میں تیار ہوا تھا

آپ بھی اس عظیم الشان قومی ادارہ کے حصہ دار بنیں

جاری شدہ سرمایہ : ایک کروڑ روپیہ — فی حصہ : ایک سو روپیہ

مطبوعہ لٹریچر اور فارم ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیے :-

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

۳ بندوق والا بلڈنگ میکلوڈ روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

سنہ ۱۹۴۶ء تک پاکستان ایک خواب تھا اور سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ ایک حقیقت بن گیا، زندہ و پائندہ حقیقت ——
—— کوئی کتنا ہی کیوں نہ جھنجلائے مگر پاکستان تو "تقدیر مبرم" بن کر وجود میں آچکا، جھنجلاہٹوں سے حقیقتیں
نہیں کرتیں! اب کسی کو بگڑنے، خفا ہونے اور جھنجلانے ہی کا شوق ہو تو وہ ہواؤں سے لڑ سکتا ہے، ستاروں کو گ
دی جا سکتی ہے، قوسِ قزح کا مذاق اُڑایا جا سکتا ہے، سُورج پر خاک اُچھالی جا سکتی ہے اور سمندر کی پُرشور مو
کو بھی "چیلنج" دیا جا سکتا ہے، مگر یہ باتیں اوچھے پن کی دلیل اور حماقت کی نشانیاں ہیں یہ ایک قسم کی دما
بیماری اور اعصابی تشنج ہے، جس سے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑتا، یہ خود جھنجلانے اور غصہ کرنے وا
کے لئے عذاب ہے۔

جو لوگ پاکستان کا نام سُن کر جھنجلا جھنجلا جاتے ہیں اور جن کی پیشانیوں پر عتاب و غضب کی سلوٹیں اُ
آتی ہیں اُن پر دراصل "کابوس" سوار ہے اور وہ "ہسٹیریا" میں مبتلا ہیں —— اور یہ جو ہم پاکستا
اربابِ اقتدار پر تنقید کرتے رہتے ہیں اُسے پڑھ کر کوئی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے! پاکستان پر خ
نخواستہ کوئی وقت آکر پڑا تو اس کی حفاظت کے لئے لیاقت علی خاں اور ابوالاعلیٰ مودودی ایک
محاذ پر دوش بدوش نظر آئیں گے جماعت اسلامی کے ارکان اور مسلم لیگ کے کارکنوں کا ایک سا

"بنیان مرصوص" بن جائے تاکہ جو طاقت اس سے ٹکرانے کی جرأت کرے اُسے پاش پاش ہو جانا پڑے۔
ہندوستان تقسیم ہوا، پاکستان وجود میں آگیا، متحدہ ہند کا جغرافیہ بدل گیا یہ سب کچھ ظہور میں آیا مگر اس تقسیم نے دھرم کے سمبندھ اور ایمان کے رشتہ کو قطع نہیں کیا، یہ تقسیم آبادیوں اور خطوں کی تقسیم تو ضرور ہے مگر اصول و عقاید اور مذہبی بھائی چارے کی تقسیم ہرگز نہیں ہے —— اگر ہم اتنا ہی کہہ کر رہ جائیں تو ان لفظوں سے شاید طرح طرح کی غلط فہمیوں کے دروازے کھل سکتے ہیں ہم چاہتے ہیں کہ بات الجھی ہوئی نہ رہے اس لئے عرض کرتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان کی دو مستقل اور علیحدہ علیحدہ حکومتیں بن جانے کے بعد بھی پاکستان میں جو ہندو رہ گئے ہیں اُن کے دھرم کا رشتہ بھارت میں بسنے والے ہندوؤں سے بدستور قائم ہے، یہ رشتہ ہرگز نہیں ٹوٹا اور نہ ٹوٹ سکتا ہے —— اگر کسی کو اس حقیقت کے ماننے میں تامل اور پس و پیش ہے تو وہ انسانی نفسیات سے بے خبر ہے اور ایسے بے خبر اور بے حس آدمی کو یہ حق ہی نہیں پہونچتا کہ وہ انسانوں کے بارے میں سوچ کر کوئی فیصلہ کر سکے اور کسی بات کا حکم لگا سکے۔

دھرم کا سمبندھ اور دین کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ قوی اور مضبوط ہوتا ہے، پاکستان میں اگر کسی غیر مسلم کو ستایا جائے تو بھارت کی غیر مسلم آبادی کو یقیناً اس سے دکھ پہونچنا چاہئے، اور بھارت کی غیر مسلم رعایا بلکہ وہاں کی حکومت بھی اس "ظلم" کے خلاف شدید سے شدید احتجاج کا حق رکھتی ہے، یوں تو ہر مظلوم کی حمایت انسانی فریضہ ہے مگر جب اپنے دھرم اور دین کا بھائی مظلوم ہو تو یہ فریضہ اور زیادہ اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔

"ظلم" سے ہماری مراد خود تراشیدہ اور خیالی "ظلم" نہیں، "واقعی ظلم" ہے، جو ظہور میں آیا ہو جس کا مشاہدہ کیا جا سکے، جس کے لئے دلائل و شواہد موجود ہوں، یہ ایسا "ظلم" نہ ہو جس "ظلم" کے افسانے بھارت کے مہاسبھائی اخبارات تراشتے رہتے ہیں کہ سکھر (سندھ) میں کسی ہندو کی نکسیر بھی نہیں پھوٹتی اور بھارت کے اخبار وں میں آتش زنی اور جبر و استبداد کی ہولناک خبریں شایع ہوتی ہیں، تہمت تراشی اور فتنہ طرازی کی کوئی حد ہے کہ نیپال میں گڑبڑ ہوتی ہے اور بھارت کے بعض اخبارات کھلے لفظوں میں لکھتے ہیں کہ نیپال کی اس عوامی کش مکش اور سیاسی خلفشار میں "پاکستان" کا ہاتھ ہے —— ہم نے ان خبروں کو پڑھا اور دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئے کہ اسی آسمان کے نیچے اسی زمین پر اتنے زیادہ "سچے" (؟) لوگ بھی بستے ہیں، بدخواہی، رقابت اور دشمنی کی بھی آخر کوئی حد تو ہونی چاہئے! دوسروں کے مقابلہ میں اہلِ علم اور اربابِ صحافت پر اخلاق و دیانت کی اور زیادہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔

جس طرح ہندو پاکستان کے غیر مسلم باشندوں کے مابین دھرم کا رشتہ قایم ہے اور وہ ایک دوسرے کی تکلیف اور پریشانی کی خبر سن کر متاثر و ملول ہو سکتے ہیں اسی طرح ان دونوں مملکتوں کے مسلمان بھی دینی اخوت کے رشتہ میں منسلک ہیں، اور ایک کی پریشانی دوسرے کے ملال کا سبب بن سکتی ہے، کوئی شک نہیں کہ زمین بٹ گئی ہے اور اجسام جدا ہو گئے ہیں مگر دین تقسیم نہیں ہوا اور مذہبی معتقدات نہیں بٹے! اور پاکستان اور ہندوستان ہی پر کیا موقوف ہے دنیا کے سارے مسلمان دینی اخوت کی ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں، دریاؤں، سمندروں، آبناؤں، خاکناؤں، خلیجوں، جزیروں، پہاڑوں، میدانوں اور جغرافیائی فاصلوں نے اُن کے جسموں کو البتہ دور

کردیا ہے مگر روحوں کو دور نہیں کیا، زندگی کے افکار کے اعتبار سے وہ بالکل ایک ہیں، اُن کا مشن ایک ہے اُن کا مقصدِ حیات ایک ہے اور اُن کی منزلِ مقصود ایک ہے، اس "وحدت" کو دنیا کی کوئی قوت ختم نہیں کرسکتی، جبر و ستم کے دباؤ سے یہ قوت تھوڑی دیر کے لئے دب سکتی ہے مگر فنا نہیں ہوسکتی!

پاکستان میں جو غیر مسلم بستے ہیں، اُن کی حفاظت ہم مسلمانوں کا دینی فرض ہے ہم نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری کو ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر قبول کیا ہے اور اس فریضہ اور عہد کو ہم دوسرے دینی فرائض کی طرح پورا کریں گے اور کر رہے ہیں۔ —— علماء مذہبی عصبیت کے لئے بہت بدنام ہیں، مگر انھی "متعصب" علما نے پاکستان کے لئے دستوری خاکہ کے جو ابتدائی اور بنیادی اُصول مرتب کئے ہیں اُن میں غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ شہری حقوق دیئے ہیں، یہاں تک کہ پاکستان کی اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو اپنے دھرم کے پرچار کرنے کی اجازت ہے، یہ فراخدلی، وسعتِ ظرف، رواداری اور احترام ہمسائگی اہلِ ایمان کی امتیازی خصوصیت ہے اور ہمیں اس پر فخر ہے! اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ پاکستان کے کسی حصہ میں کسی غیر مسلم کو ستایا جارہا ہے یا حکومت کی طرف سے کوئی بدعنوانی ہورہی ہے تو اُس مظلوم غیر مسلم کی حمایت ہمارا دینی فرض ہے ہم اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کریں گے کہ جہاں تک "مظلومیت" کا تعلق ہے، اسلام نے مسلمان اور کافر میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی —— اسلام تو عدل و انصاف کا پیامبر ہے، ظلم و عدوان کے خلاف جنگ کرنا اسلام کے پروگرام کا سب سے اہم جزو ہے!

احتجاج و حمایت

جب ہم "غیر مسلم مظلوم" کی حمایت کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھ کر ہم خاموش بیٹھے رہیں، یہ نہیں ہوسکتا ہرگز نہیں ہوسکتا، ہمارا دینی بھائی دنیا کے جس خطہ میں بھی ستایا جارہا ہے اُس کی مظلومیت، میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں، اُس کی ذلت اور اُس کی دل آزاری ہماری اپنی ذلت اور دل آزاری ہے!

دُنیا جانتی ہے اور بھارت کے لوگ تو خاص طور سے جانتے ہیں کہ انگریز کے دورِ حکومت میں ہندستانی مسلمانوں نے ترکی، الجزائر، مراکش، سوڈان اور دوسرے اسلامی ممالک کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ کھل کر اظہارِ ہمدردی کیا ہے، اُن کے لئے چندے، دوائیں، کپڑے اور طبی وفد تک بھیجے ہیں، اٹلی نے مسلمانوں پر مظالم کئے تو ہندوستان کے مسلمانوں نے اٹلی کی بنی ہوئی چیزوں کا بائی کاٹ کردیا، ترکی ٹوپیاں جلادی گئیں کہ وہ اٹلی سے بن کر آتی تھیں —— سمرنا فنڈ کو لوگ ابھی تک بھولے نہیں ہیں! اب سے چالیس سال پہلے ہندوستان کے مسلمان کی سیاسیات کا محور "خلافت" تھی جس کا دامن ترکی حکومت سے بندھا ہوا تھا۔

جب ہم نے غلامی کی حالت اور محکومی کے دور میں اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور اُن کو ظلم و ستم کے پنجے سے چھڑانے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم آزاد ہونے کے بعد اپنے مظلوم بھائیوں کے لئے کچھ نہ کریں اور خاموشی کے ساتھ غیروں کی دست درازیاں دیکھے ہیں اگر "آزاد" ہونے کے بعد ہم ایسے ہی بے حس اور بے غیرت ہوگئے ہیں تو لعنت ہے ہماری آزادی پر، اور تُف ہے ہماری خود مختاری (INDEPENDENCE) پر! —— غلامی میں ہمارے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے مگر اب تو ہم اللہ کے فضل سے آزاد ہیں، ہماری آواز کا آج دُنیا میں وزن محسوس کیا جاتا ہے، پہلے ہمارے پاس صرف زبان اور قلم تھے اور اب ہمارے پاس طاقت ہے، اسلحہ ہیں، فوجیں ہیں اور وہ تمام ذرائع اور وسائل

ہیں، جو حق کی حمایت کے لئے کام میں لائے جا سکتے ہیں ؛

ہم اُن لوگوں میں سے ہرگز نہیں ہیں جن کو "خلفشار" اور "کشمکش" میں لطف آتا ہے، جو صلح و آشتی پر جنگ و معرکہ آرائی کو ترجیح دیتے ہیں، اور ذرا ذرا سی بات پر جن کی تلواریں نیاموں سے نکل آتی ہیں، لڑائی کوئی اچھی چیز نہیں ہے اور آجکل کی جنگ تو سائنس کی بدولت اس قدر خوفناک ہو گئی ہے کہ جیتنے والا بھی ایک طرح سے ہار ہی میں رہتا ہے، کیسی کیسی ہولناک تباہیاں ظہور میں آتی ہیں، کیا کیا قیامتیں نازل ہوتی ہیں ؛

پاکستان اور ہندوستان دونوں کی بھلائی اور بہتری اسی میں ہے کہ ان دونوں مملکتوں کے تعلقات زیادہ سے زیادہ خوشگوار رہیں، دونوں ایک دوسرے کے حقِ ہمسایگی کو پہچانیں ــــــ اور یہ اُسی صُورت میں ممکن ہے کہ پاک و ہند کے عوام حکومتوں کی پالیسی[1] کا ساتھ دیں، یہ نہ ہو کہ بھارت سرکار تو حکومتِ پاکستان سے صُلح و آشتی کا معاہدہ کرے اور بھارت کی اکثریت "اکھنڈ ہندوستان" کا نعرہ لگا رہی ہو بلکہ اس کے لئے تیاریاں کر رہی ہو، ایسی نفرت اور دشمنی کی باتوں سے خطرناک قسم کی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے اور یہ وہ راستہ ہے جو جنگ کے میدان میں جا کر نکلتا ہے!

اگر "اکھنڈ بھارت" کے جواب میں، پاکستان بس اسی انداز کی تحریک شروع ہو گئی کہ "پاکستان" کے جو حصے (مشرقی پنجاب اور مغربی بنگال) غلط طور پر کاٹ دیئے گئے ہیں، اُن کو پھر سے مل جانا چاہیئے تو مہاسبھائیوں کی اس "چنوتی" "CHALLENGE" کا ردِّ عمل کس قدر خطرناک ہوگا ــــــ اور یہ جو بھارت میں "پختونستان" کے جلسے ہوتے رہتے ہیں ان کے نتائج کی تلخی سے کیا بھارت کے کرتا دھرتا بے خبر ہیں!

ظلم کے شکنجے میں!

ہم آگے چل کر جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُس سے تلخیوں اور ناگواریوں میں ذرا سا بھی اضافہ مقصود نہیں ہے! صلح و آشتی اور رواداری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی کے گلے پر چھُری رکھ دی جائے، اور وہ فریاد بھی نہ کرے، ہم یہاں جو حقائق پیش کر رہے ہیں، اُن میں ذرہ برابر مبالغہ بھی نہیں ہے، ہم نے صحیح حالات کو جُوں کا توں کاغذ پر منتقل کر دیا ہے، اگر ہم نے کسی واقعہ کے بیان کرنے میں غلط بیانی یا مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے تو بھارت کی حکومت ہمیں بین الاقوامی مُجرم کی حیثیت سے کسی عدالت میں ہم پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر سکتی ہے، ہمارا مذہب تہمت تراشی اور الزام سازی کی کسی حالت میں بھی اجازت نہیں دیتا، حکومتوں، اداروں، قوموں اور لوگوں کو جھوٹ موٹ بدنام کرنا ہمارے مذہب میں گناہ ہے!

تقسیم ہند کے بعد بھارت میں مُسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا اور جس قسم کے ہولناک واقعات پیش آئے اُن کو "تقسیم ہند" کی تلخی کا عارضی سبب سمجھا گیا تھا مگر یہ کس قسم کی تلخی اور کیسا انتقام ہے کہ تقریباً چار سال ہونے کو آئے لیکن نہ وہ تلخی اور بر ہی ختم ہوتی ہے اور نہ "انتقام" کا سلسلہ رُکتا ہے!

ہم نے ہندوستان کی جمعیۃ عُلماء کے اکابر کے حالیہ بیانات اور مُسلمان اخباروں کے "افتتاحیے" پڑھے ہیں، ایک ایک لفظ پر دل خون ہو ہو کر رہ گیا ہے، یہ "بیانات" نہیں فریادیں ہیں، نالے ہیں، مظلوموں کی چیخیں اور ستم زدوں کا شورِ فغاں ہے، اس مُتمدن اور مہذب دور میں بیکس و مظلوم انسانوں (اور یہ انسان بدقسمتی سے مسلمان ہیں) کو بیدردی سے قتل کر کے اُن کی لاشوں کو جلتی ہوئی آگ میں[2] ڈال کر بھون دینا، انسانیت کی سب سے بڑی "ٹریجڈی" ہے ــــــ

[1] امن و امان کی پالیسی　[2] لیاقت نہرو پیکٹ

شاید "آواگون" کا نظریہ صحیح ثابت ہوا اور چنگیز و ہلاکو نے بھارت کے مہاسبھائی سورماؤں کے جون میں آکر جنم لے لیا، یہ داستان اتنی دلخراش اور روح فرسا ہے کہ اُس کے تصور سے منھ کو کلیجہ آتا ہے، اس دُنیا میں لوگ ایک دوسرے سے دُشمنی بھی کرتے ہیں، لڑائیاں بھی ہوتی ہیں، سخت سے سخت کشمکش کی نوبت بھی آجاتی ہے مگر آدمی بالکل حیوان اور درندہ تو نہیں ہوجاتا۔

اس میں ذرّہ برابر مبالغہ بھی نہیں ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں، عام طور پر مُسلمان مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اچھوتوں کے لئے بھارت کی سوسائٹی میں ایک مقام ہے مگر مسلمان کے لئے کوئی مقام نہیں ہے، چنانچہ بعض شہروں اور بستیوں میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ بھنگیوں اور چماروں نے مسلمانوں کو زدوکوب کیا ہے اور اس "جُرمِ مظلومیت" اور "گناہِ ذلت وخواری" کی سزا مسلمانوں کو یہ ملی کہ پُولس نے اُلٹا اُنھی کو پکڑ کر حوالات میں بند کر دیا، ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی گاؤں یا قصبہ کے مسلمانوں کو صفوں میں کھڑا کیا گیا اور پولس نے اُس مقام کے مہتروں اور چماروں سے کہا۔۔۔ کہ پہلے تم ان "میاں صاحبوں" کو سلام کیا کرتے تھے، اب یہ تم کو سلام کیا کریں گے۔۔۔"!

یہ واقعہ بھی ظہور میں آیا کہ کسی بستی کے مسلمانوں کو صرف اس جُرم میں گرفتار کر لیا گیا کہ اُن کے مکانوں کی چھتوں پر ٹوٹی اینٹوں کے کچھ ٹکڑے پڑے ہوئے تھے! اس داروگیر کے سلسلہ کو یہاں تک وسعت دی گئی کہ کسی مسلمان کے گھر سے ترکاری کاٹنے کی چھری یا چاقو برآمد ہوا اور اُسے دھر لیا گیا، اس جُرم میں کئی کئی مہینوں کی سزائیں بھگتی ہیں مسلمانوں نے! ــــــ کسی مظلوم نے سر سے کفن باندھ کر اس سلسلہ میں کچھ دریافت کیا تو جواب دیا گیا کہ "ہمیں تو تم مسلمانوں کا زور توڑنا تھا۔۔۔"! ــــــ اور اُن غریبوں کا "زور" ابھی تک توڑا اور کم کیا جا رہا ہے۔

بسوں اور ریلوں میں مسلمانوں کو "پاکستان" کے نام پر گالیاں دینا، اُن کے مذہب کا مذاق اڑانا راستہ چلتے میں اُن پر پھبتیاں کسنا، سودا خریدتے میں اُن سے جھگڑا کرنے کی کوشش کرنا، ہولی کے تیوہار پر اُن پر رنگ ڈال دینا، اُن کی ڈاڑھیوں پر کیچڑ مل دینا ــــــ یہ ذلتیں اور خواریاں تو بھارت کے مظلوم اور بیکس مسلمانوں کی "تقدیر" بن کر رہ گئی ہیں!

یہ سلسلہ اسی نوبت پر ختم نہیں ہو جاتا، مسجدوں کے سامنے نماز کے اوقات میں باجہ کا بجانا، مدرسوں میں مسلمان بچوں کو گاندھی جی کی تصویر کو ڈنڈوت کرنے کے لئے مجبور کرنا، قرآن پر حملے، مسلمانوں کو دھمکی دینا کہ "مکہ اور مدینہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں" ــــــ اور "ہندستانی کلچر جب تک تم اختیار نہ کروگے، ہندستان کے ساتھ تمھاری وفاداری مشتبہ رہے گی" اور اب ایک نیا مطالبہ یہ سننے میں آرہا ہے کہ جن مندروں کو مسلمان بادشاہوں نے مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا مسلمانوں کو چاہیئے کہ ایسی تمام مسجدیں اپنی خوشی سے ہندوؤں کے حوالے کر دیں ــــــ بہر حال "مسلم آزادی" کا کوئی طریقہ ایسا نہیں ہے، جو استعمال نہ کیا جا رہا ہو، یہاں تک کہ اسکولوں کے "نصاب" کے لئے ایسی تاریخ لکھی گئی ہے جس میں حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی سے غلط واقعات منسوب کئے گئے ہیں۔

بھارت کے محکمہ کسٹوڈین کی "عدل گستری" (؟) کا یہ عالم کہ خود مکان کا مسلمان مالک اپنی ذاتی ملکیت کے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے رہتا ہے، جرم یہ کہ "تم پاکستان جانے کا ارادہ رکھتے ہو" ملازمتوں سے مسلمانوں کو علیحدہ کیا جا رہا ہے اور نئی جگہیں (POSTS) جو خالی ہوتی ہیں اُن کے دروازے مسلمانوں کے

لئے قریب قریب بند ہیں ——— اسکیم یہ ہے کہ معاشی طور پر مسلمانوں کو اس قدر خستہ کر دیا جائے کہ یا تو وہ پاکستان جانے پر مجبور ہو جائیں یا پھر وہ شودروں اور چنڈالوں کی طرح سیوا کر کے زندگی گزاریں ؛

بھارت کی اکثریت "مہاسبھا" کی ہم نوا ہے اور مہاسبھا نے بھارتی مسلمانوں کی تباہی اور بربادی کے لئے ایک پروگرام مُرتب کر لیا ہے جس پر عمل ہو رہا ہے، مثلاً شاہ جہاں پور کے آس پاس کے گاؤں میں مسلمان کسان اطمینان کے ساتھ رہ رہے تھے، مہاسبھا نے ان "ملیچھوں" کے خلاف اکثریت کو اُبھار کر چند دنوں کے اندر مسلمانوں کے گاؤں کے گاؤں صاف کرا دیئے ——— آگرہ میں جوتوں کی تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ لوگ اس صنعت اور تجارت کے سبب خوشحال تھے، مہاسبھائیوں نے ہنگامہ کرا کے مسلمان تاجروں کے پاؤں اُکھاڑ دیئے، بہت سوں کو مجبور ہو کے پاکستان آجانا پڑا، کچھ لوگ بمبئی اور دوسرے شہروں میں چلے گئے اور جو سخت جان رہ گئے ہیں وہ انتہائی عُسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، "مہاسبھا" کی جیت ہوئی کہ آگرہ میں جوتہ کی صنعت اور تجارت مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن کر اکثریت کے قبضہ میں آگئی ؛

دوسرے شہروں کے مقابلہ میں کوئی شک نہیں کہ بمبئی کے حالات بہت اچھے ہیں، وہاں مُسلمان تاجر اور عوام اب تک جمے ہوئے ہیں، مہاسبھائیوں نے کئی بار فساد برپا کرنے کی کوشش کی مگر حکومت نے اپنے فرض کو بروقت پہچانا اور فتنہ و فساد کو دبا دیا، لیکن مسلمان تاجروں کی معاشی پریشانیوں کا سلسلہ اب شروع ہو چلا ہے، تجارتی کاروبار کے نئے لائیسنس اُن کو نہیں دیئے جا رہے ہیں، اور مسلمان بیوپاریوں کی کافی تعداد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے، تجارت میں جب جان بُوجھ کر امتیاز بلکہ تعصب برتا جائے گا تو اُس کا مقابلہ کوئی کب تک کرتا رہے گا ؛

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو اور راج گوپال آچاریہ جیسے ارباب اقتدار بھی بھارت میں موجود ہیں جو مسلمانوں کی تباہی نہیں چاہتے اور مہاسبھائیوں کی حرکتوں اور فتنہ پردازیوں سے جن کو دُکھ ہوتا ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ پولس، دفتر اور انتظام کی دُنیا میں جو لوگ کام کرتے ہیں اُن کی اکثریت میں مہاسبھا فرقہ واریت بلکہ "مسلم دشمنی" کا زہر پھیلا چکی ہے، پنڈت نہرو اور راجہ جی احکام جاری کر سکتے ہیں اُن کی تعمیل و تنفیذ کے عہدیداروں ہی کے ذمہ ہے اور یہ عہدیدار حکومت کی پالیسی کے مقابلہ میں مہاسبھا کی پالیسی کو ترجیح دیتے ہیں، اُن کے دلوں میں یہ بات اُتار دی گئی ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ چکے ہیں اب ان کو جمنے نہ دو، اسی میں ہندو دھرم کی جیت ہے ——— بھارت میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوتے رہتے ہیں اُن میں مقامی عہدیداروں کی شہ ہوتی ہے بلکہ بعض مقامات پر تو فساد کے پروگرام عہدیداروں کے مشورے سے طے ہوئے ہیں! پولس جو امن و حفاظت کی ذمّہ دار ہے اُس نے نہ صرف طرح دی ہے اور چشم پوشی اختیار کی ہے بلکہ بلوائیوں کے دوش بدوش مسلمانوں پر گولیاں چلائی ہیں اور اُن کو لوٹا ہے، دادرسی کے لئے جو عدالتیں قایم ہیں، وہاں بھی مسلمانوں کو عام طور پر مایوسی ہی ہوتی ہے

"اُردو زبان" کے ساتھ بھارت کی "سیکولر" حکومت میں جو برتاؤ کیا جا رہا ہے اُس کے لئے کسی دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں ہے، گاندھی جی کی نصیحت اور پنڈت جواہر لال نہرو کے مشورے تک کو ٹھکرا دیا گیا، پنڈت نہرو اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو اتفاقی طور پر منصب اور اقتدار مل جاتا ہے، گاندھی جی کے بعد بھارت کے وہ سب سے بڑے لیڈر رہے ہیں، اُن کی قومی خدمات کی مدت تیس سال سے بھی کچھ زیادہ ہے، اُن کی جوانی کا کافی حصہ بھارت کی

آزادی کی خاطر قید و بند میں بسر ہوا ہے وہ اُس نامور باپ کے بیٹے ہیں جن کی شخصیت کانگرس کا بہت بڑا ستون تھی ـــ ـــ حیرت ہے بلکہ مقامِ افسوس بھی کہ پنڈت نہرو کی بات کا وزن واشنگٹن، لندن اور ماسکو میں محسوس کیا جاتا ہے مگر اُن کی قوم اُن کی بات نہیں سُنتی، بھارت میں ہوا کا رُخ اب کچھ اور ہے، جو نگاہیں کبھی پنڈت نہرو کے لئے زمین پر بچھ جاتی تھیں اب وہ ٹنڈن اور گوالکر کو "پرنام" کر رہی ہیں، بھارت کی اکثریت ایسے لیڈر چاہتی ہے جو مسلمانوں کی دشمنی میں زیادہ سے زیادہ سخت ہوں؛

صوبہ کے محکموں اور ضلع کے دفتروں کو جانے دیجئے خود آل انڈیا ریڈیو پر "فرقہ واریت" مسلّط ہے اور اُس کے پروگراموں سے "فرقہ وارانہ ذہنیت" بولتی ہوئی سُنائی دیتی ہے، کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر کے وہ جملے بھارت ریڈیو کے کرتا دھرتاؤں نے حذف کر دیئے جن میں "فرقہ واریت" کی مذمت کی گئی تھی، اور "راشٹریہ سیوک سنگھ" کی سرگرمیوں کے خلاف اظہارِ خیال کیا گیا تھا ـــــــ یہ باتیں اس کی دلیل ہیں کہ ماتحت عہدیداروں کے آگے وزیر اعظم تک کی چلتی نہیں چلتی اور حکومت کی پالیسی تک کو ٹھکرا دیا جاتا ہے!

یہ کیسا راج ہے؟ کیا حکومت ہے؟ کس قسم کا اقتدار ہے کہ ماتحت محکمے، مرکز کے ساتھ تعاون نہیں کرتے اور اتنی بڑی شخصیت اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ـــــــ وزیر اعظم تک بے بس نظر آتا ہے! کوئی شک نہیں کہ احکام صدر جمہوریہ ہند (ڈاکٹر راجندر پرشاد) اور "وزیر اعظم" (پنڈت نہرو) ہی کے دستخطوں سے جاری ہوتے ہیں مگر اُن کی تعمیل وہ لوگ کرتے ہیں جن کے "دل" مہاشہ ٹنڈن جی اور شری گوال کر مہاراج کے ساتھ ہیں!

ایمان لگتی کہیں گے، بھارت میں صوبہ مدراس کا انتظام بڑی حد تک قابلِ تعریف رہا ہے، یہ وہ صوبہ ہے جس کے جناب راج گوپال آچاریہ رہنے والے ہیں، مدراس پریسیڈنسی میں مسلمان سب سے زیادہ کم تعداد میں ہیں مگر امن چین کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، انگریز کے دور میں جب صوبہ کی وزارتوں پر کانگریس فائز تھی اور مسلمانوں کو کانگریسی وزارتوں سے بہت سی شکایتیں تھیں تو اُس وقت بھی صوبہ مدراس کی وزارت کانگریس کی سب سے زیادہ نیک نام وزارت تھی، کاش! ہندو لیڈروں میں سب کے دل راجہ جی کے دل کی طرح ہوتے!

گزارشیں ہم نے اوپر جن حالات کا ذکر کیا ہے اُن میں نہ تو "افراط" سے کام لیا ہے اور نہ "مبالغہ آمیزی" کی ہے، ان واقعات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا! یہ حقیقت ہے کہ مجموعی طور پر بھارت میں مسلمان مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، انگریز کی غلامی کے زمانہ میں اُن کو جو سوشل مقام حاصل تھا، اس آزادی کے دور میں اُس سے وہ بہت نیچے گرا دیئے گئے، اور گرائے جانے کا یہ سلسلہ ابھی جاری ہے ـــــــ ساڑھے تین سال کی مدت میں بھارتی مسلمانوں میں سے کسی ایک نے بھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس سے حکومت کے ساتھ وفاداری پر کوئی حرف آتا ہو مگر اُن سے یہی مطالبہ کیا جا رہا ہے "وفادار بنو، وفادار! اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھو۔۔۔" اور مسلمان اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھتے ہیں تو اُن میں زخموں اور جراحتوں کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ہندوستانی حکومت کی خدمت میں ہماری یہ گزارش ہے کہ مسلمانوں کی حفاظت کے لئے اُسے موثر سے موثر تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، حکومت باخبر اور مستعد ہو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، بھارت میں جو حالات پیدا

ہوئے ہیں، اُس کی ذمہ داری سے بھارت کی حکومت اپنے کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتی، اکثریت کی ناراضگی کے خوف سے بہت سے معاملات میں چشم پوشی اور تساہل سے کام لیا گیا اور اس چیز نے فتنہ پردازوں اور امن و آشتی کے دشمنوں کی جرأتوں اور حوصلوں کو بڑھا دیا، ہندستانی حکومت اگر مسلمانوں کو باعزت شہریوں کی طرح زندہ رکھنا چاہتی ہے تو اُس کا فرض ہے کہ وہ نیچے کے حاکموں اور عہدیداروں کی نقل و حرکت پر کڑی نگرانی رکھے، جن افسروں اور سرکاری ملازموں کو فرقہ وارانہ سرگرمیوں (Communal activities) میں مبتلا پایا جائے اُن پر شدید احتساب کیا جائے —— محکمہ تعلیمات، شعبۂ رابطہ عامہ اور ریڈیو کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں امن و اعتماد اور شانتی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

مہاسبھائیوں سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ آپ لوگ ہندو ہیں اور اپنے دھرم کے پرچار کرنے کا آپ کو یقیناً حق پہونچتا ہے، اپنے مذہب کا غلبہ ہر کوئی چاہتا ہے اور آپ کے دلوں میں بھی یہ خواہش فطری طور پر ہونی چاہیئے، ہندو تہذیب کے زندہ کرنے کا بھی آپ کو حق ہے، مگر اس مقصد کے حصول کے لئے جو طریقے آپ نے اختیار کئے ہیں وہ سراسر تخریبی ہیں، اپنی تہذیب اور اپنے دھرم کے اُصولوں کو آپ مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیجئے بلکہ کرتے رہیئے اگر اُن میں کشش اور جان ہو گی تو وہ خود غلبہ پالیں گے، تہذیبیں زبردستی مسلط نہیں کی جاتیں بلکہ اُن میں خود ایسی کشش ہوتی ہے کہ وہ قبول کرلی جاتی ہیں ؎

جس دھرم میں ایک چیونٹی کو ستانا بھی پاپ ہو، وہ دھرم انسانوں کے قتل و غارت کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل کر تم اپنے دھرم کو بدنام کر رہے ہو اور "دھرماتما" بننے کی بجائے "راکشش" بنے جا رہے ہو، تم ہندو دھرم اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتے ہو مگر جب دنیا یہ دیکھے گی کہ ہندو دھرم اور ہندو تہذیب میں قتل و خونریزی، لوٹ مار اور دوسروں کی بے عزتی کو جائز سمجھا جاتا ہے تو دنیا تمھاری تہذیب اور تمھارے مذہب سے نفرت کرنے لگے گی، اپنی حرکتوں سے تم اپنے دھرم کی رسوائی کا سبب بن رہے ہو، تمھارے لیڈر تمھیں غلط راہ پر لئے جا رہے ہیں یہ "سورگ" کا نہیں "نرکھ" کا راستہ ہے،

ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ بھارت ورش کے پراچین اتہاس میں تمھارے پُرکھاؤں کی بڑی بہت اونچی ہے، تمھاری تاریخ میں ارجن اور ابھیمنیو جیسے ویروں کے شاندار کارنامے ملتے ہیں مگر تھوڑی تعداد والے نہتوں پر ہاتھ اُٹھانا بہادری نہیں بزدلی ہے، انگریز کے زمانہ میں تمھاری "ویرتا" کہاں چلی گئی تھی اُس وقت تمھارے "ویر" اور "جودھا" کہاں سو رہے تھے؟ اور اس مظلومیت کے زمانہ میں بھی جہاں کہیں فوج اور پولس کی کمک دیر میں پہونچی ہے تو گنتی کے مسلمانوں نے تمھارے "ویروں" کے دل کے دل پیچھے ہٹا دئے ہیں —— زمانے تمھیں موقع دیا ہے تو شوق سے حکومت کرو مگر "ظلم" نہ کرو ؎

دسہرہ کا تیوہار جو تم بڑی دھوم دھام سے مناتے ہو یہ اس واقعہ کی یادگار ہے کہ ظلم کو مظلومیت کے مقابلہ میں شکست ہوئی، تم اس سے سبق کیوں نہیں لیتے؟ سوچو کہ تم تاریخ میں اپنا نام "رام چندرجی" کے ساتھ چاہتے ہو یا "راون" کے ساتھ! لوٹ مار، قتل و غارت گری، جور و ستم اور فتنہ و فساد "راون راج" کی خصوصیت ہے "رام راج" کی صفت تو شانتی، چھما، دیا، اور بھلائی ہے!

ظلم کی ٹہنی کو پھولتے پھلتے اور کاغذ کی ناؤ کو کسی نے چلتے نہیں دیکھا، ظالم دوسرے پر ظلم کرکے اپنے حق میں بھی خود بہت بڑا ظلم کرتا ہے، اپنے ملک میں انگریزوں کا ہی حشر دیکھ لو کہ ایک انگریز کا خون نہیں بہا مگر حالات نے انگریزوں کو کچھ ایسا گھبرا دیا اور اُن کی ایسی مت ماری گئی کہ وہ بوریا بستر باندھ کر چلتے بنے ——— "ظلم" اسی طرح ذلیل اور ناکام ہوا کرتا ہے، قدرت خود ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ ظالم کو سرنگوں ہونا پڑتا ہے، چشمِ آفتاب نے اس دنیا میں بڑے بڑے جابر اور ظالم کج کلاہوں کو خاک بسر دیکھا ہے، اپنی قوت کو جور و ستم کی معرکہ آرائیوں میں ضائع نہ کرو، ڈرو قدرت کے انتقام سے ڈرو، ایسا نہ ہو کہ قدرت اپنی دی ہوئی بخشش کو تم سے چھین لے!

بھارت میں سب کے سب ہندو، "مہاسبھائی" نہیں ہیں، اُن میں پنڈت سندر لال اور اکھنڈ برہمچاری جیسے اچھے لوگ بھی موجود ہیں، جو چاہتے ہیں کہ بھارت میں چاروں اور گیان، دھیان اور شانتی کے دیپک جلتے ہوئے دکھائی دیں، مسلمانوں کی مظلومیت سے جن کو دُکھ ہوتا ہے، یہی لوگ بھارت ماتا کے سپوت اور ہندو جاتی کے سچے سیوک ہیں، اس معقول ذہنیت کے افراد کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ وہ پوری مستعدی کے ساتھ "ظلم" کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں، حکومت اور عمّال کو بھی اُن کی زیادتی پر ٹوکیں اور "اکثریت" کی دست درازیوں کو بھی روکنے کی حتی المقدور کوشش کریں، گزشتہ خونیں حادثات گواہ ہیں کہ بعض مقامات پر صرف ایک نیک دل ہندو کی سعی، مزاحمت اور سینہ سپر ہو جانے سے مسلمانوں کی جانیں بچ گئی ہیں۔

حکومتِ پاکستان سے ہماری گزارش ہے کہ بھارت سے جہاں سیاسی تجارتی اور اقتصادی معاملات پر وہ گفتگو اور معاہدے کرتی رہتی ہے، اُن میں بھارت کے مظلوم مسلمانوں کا ذکر بھی ضرور آنا چاہیئے ہندوستانی مسلمانوں کو بھول جانا اسلامی اخوت کے ساتھ غداری ہے، ہم نے پاکستان اسلامی اُخوت کے رشتہ کو توڑنے کے لئے نہیں بلکہ اُسے مضبوط تر کرنے کی غرض سے بنایا تھا، نرمی اور گرمی بہر حال جس چیز کے بھی حالات مقتضی ہوں اُس سے کام لینے کی ضرورت ہے، اگر پاکستان لیکر، چار کروڑ مسلمانوں کی غلامی اور مظلومیت پر ہم مطمئن ہیں تو خدا کی قسم ہم نے خسارے کی تجارت کی! جو قوم چار کروڑ مسلمانوں کو پامال کر سکتی ہے اُس کی دست درازیوں سے پاکستان ہی کب محفوظ رہ سکتا ہے! حکومتِ پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلہ میں اب تک غفلت سے کام لیتی رہی ہے، یہ رواداری اور صلح پسندی نہیں جرأت اور غیرت کی کمی ہے! پاکستان کے اربابِ اقتدار کو اسلامی اُخوت کے تقاضوں کو محسوس کرنا چاہیئے۔

پاکستانی مسلمانوں کے دل اگر ہندوستانی مسلمانوں کے دُکھ درد سے غافل ہیں تو یہ غفلت نہیں اُن کی دینی غیرت کی موت ہے، اُن کا دُکھ درد ہمارا اپنا دُکھ درد ہے، اُن کی مصیبت ہماری ذاتی مصیبت ہے، ہمارا مذہب یہی بتاتا ہے، ہمارے پیغمبرؐ کا یہی فرمان ہے، اگر ہم میں احساسِ غیرت ہو تو ہندوستان کے مظلومیت کا حال سُن کر ہماری آنکھوں کی نیند اُڑ جائے، اور ہمارے لب اُس وقت تک تبسم آشنا نہ ہوں، جب تک کہ اُن کی مظلومیت اور درماندگی فوز و فلاح اور مسرت و کامرانی سے نہ بدل جائے! اگر ہمارے دل اس احساس سے خالی ہیں تو قیامت کے دن اس کوتاہی کی ہم سے باز پرس ہوگی، ہمیں خدا اور رسولؐ کے سامنے شرمسار ہونا پڑے گا، ایک ایک مظلوم مسلمان حقِ اخوت ہم سے طلب کرے گا! ———

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوستانی مسلمانوں سے ہم کیا کہیں؟ اُن کا نام زبان پر آتے ہی ہمارا

دل بھر آتا ہے اگر دل دکھانے کی چیز ہوتی تو ہم اُنھیں دکھاتے کہ اُن کے غم نے کتنے زخم ڈال دیئے ہیں، ہم جانتے ہیں یا ہمارا خدا جانتا ہے کہ اُن کے غم میں ان گناہگار اور پتھر آنکھوں نے کتنے آنسو بہائے ہیں!

بھارت کے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے سخت آزمایش میں مبتلا کیا ہے، جو کوئی اس آزمایش میں پُورا اُترے گا، اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا مستحق ہوگا اور یہ اتنا بڑا اجر ہے کہ اس کے لئے پیغمبروں تک نے خوشی کے ساتھ قتل ہونا قبول کیا ہے ـــــــ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے دین پر کامل استقامت کے ساتھ جمے رہنا چاہیئے، اس کوشش میں چاہے موج خون ہی کیوں نہ سر سے گزر جائے، غیروں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کئے جانے پر وہ ملول نہ ہوں کہ اللہ کے یہاں اُن کے درجے بلند ہو رہے ہیں، مکّہ اور طائف میں اُن کے آقا اور مولا فخر موجودات، سرورِ کائنات (ہم سب کی جانیں اُن کے قدموں پر نچھاور ہوں) پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے تھے، ہائے! طائف کے بازاروں میں چھوکروں کا دُنیا کے سب سے زیادہ عزت والے مقدس انسان کے پیچھے تالیاں بجانا، جسمِ اقدس پر وہ پتھروں کی بارش، زخموں سے چُور ہو کر سرکار زمین پر گر گر جاتے تھے ـــــــ محمد رسول اللہ اس دورِ مظلومیت سے گزر سکتے ہیں تو ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اس منزل سے گزارا جاسکتا ہے ؏

دُنیا کی زندگی چند روزہ ہے، یہاں کی خوشی کو قرار اور نہ غم کو ثبات! اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے کہ وہیں سدا رہنا ہے، قسمت کا لکھا نہ بدلا جاسکتا ہے اور نہ اُس کا مٹا دینا ممکن ہے، جو کچھ مقدر میں لکھ دیا گیا ہے وہ پیش آکر رہے گا، زندگی چاہے وہم و خیال ہی ہو مگر موت بالکل یقینی چیز ہے، وہ ہر حال میں آکر رہے گی، موت کا فرشتہ آہنی قلعوں میں بھی دبے پاؤں پہونچ جاتا ہے؟ پس! موت کا ڈر دل سے نکال دینا چاہیئے، صرف خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا احساس! پھر بیڑا پار ہے ؏

بھارت کے مسلمانوں کو ہندوستانی حکومت سے بغاوت کرنے کا ہم مشورہ نہیں دیتے، اپنی حکومت کے وہ وفادار رہیں مگر یہ وفاداری جب اللہ اور رسولؐ کی وفاداری سے ٹکرائے تو پھر خدا اور رسولؐ کی وفاداری سب پر مقدم ہے ؏

بزدلی کی زندگی سے بہادری کی موت اچھی ہے، مسلمان دُنیا میں سربلند ہونے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے اُس کا سر کٹ تو سکتا ہے مگر غیر اللہ کے آگے جُھک نہیں سکتا، مسلمانوں کی تاریخ قربانیوں سے بھری پڑی ہے، حق ناشناسوں نے تاریخ کے کسی دور میں بھی اُن کو چین سے نہیں رہنے نہیں دیا، مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ مسلمان دب کر جب اُبھرے ہیں تو پھر کوئی طاقت اُن کے آگے ٹھیر نہیں سکی، مکّہ کی سرزمین جن پر تنگ کردی گئی تھی، اُنھی کے ہاتھوں میں خانۂ کعبہ کی کنجیاں دیکھی گئیں، حدیبیہ میں جنھوں نے بظاہر دب کر صُلح کی تھی اُنھی کے سروں پر عرب کی سیادت کا تاج رکھ دیا گیا ؏

بھارت کے مسلمانوں نے صبر و استقامت اور جرأت و عزیمت کا ثبوت دیا اور پریشانیوں کے اس عُبوری دور کو اُنھوں نے گزار لیا تو پھر ہم اُنہیں کامرانی کی بشارت دیتے ہیں؟ حالات بدل کر رہیں گے، اللہ تعالیٰ کی غیرت بہت دن تک مسلمانوں کی پائمالی اور زبوں حالی کو گوارا نہیں کرسکتی، اللہ تعالیٰ ظالموں کو ڈھیل دیا کرتا ہے تاکہ پاپ کا گھڑا کناروں تک بھر جائے، اور بندوں کو امتحان میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ منافق اور اہلِ ایمان چھٹ چھٹا کر الگ الگ ہو جائیں! وہ جب چاہتا ہے تو کمزور چڑیاں ابرہہ کے بھاری بھرکم ہاتھیوں کا چُورا کردیتی ہیں اور عصائے موسوی کی ایک

ضرب سے دریا کا پانی پھٹ جاتا ہے تاکہ فرعون کے جرار لشکر پر بھاگنے کی راہ بند ہو جائے۔

بھارت کے مظلوم اور درماندہ مسلمانو! تمھاری اسی مظلومیت کے افق سے کامرانی کا آفتاب طلوع ہو گا۔ (ہمارا وجدان کہہ رہا ہے کہ آسمان کے فرشتے اس پر "آمین" کہہ رہے ہیں)

میں ابھی سے پرچھائیں دیکھتا ہوں منزل کی

بارِ الٰہا! ہندستان کے مظلوم مسلمان شاید اس عالم میں ہیں کہ جس عالم میں تیرے بھیجے ہوئے نبی اور رسولؑ تک چیخ اُٹھے تھے "کہ اللہ کی مدد آخر کب آئے گی" بس تیری مدد کا انتظار ہے، اسی کی سب آس لگائے بیٹھے ہیں اور جس دن تیری مدد آگئی، اُس دن ہمالیہ کی چٹانیں اور گنگا کی موجیں مسلمانوں کو فتح و نصرت کی مبارک باد دیں گی ——— تاریخ کا یہ ورق اُلٹ کر رہے گا ——— انشاء اللہ العزیز۔

ماہر القادری
۲۶ مارچ ۱۹۵۱ء

ہم انسان ہیں، ہم مسلمان ہیں، ہم ادیب ہیں ——— زندگی تضاد کو برداشت نہیں کرسکتی۔ انسانیت اسلامیت اور ادبیت کو ہم آہنگ ہونا چاہیئے، اگر ہم مسلمان ہیں تو ہماری دماغ کو، ہماری فکر کو، ہمارے ادب کو بھی مسلمان بنا پڑے گا ——— ادب کوئی خارجی حقیقت نہیں جس کے ہم ایجنٹ ہیں بلکہ اصل حقیقت ہم ہیں اور ادب ہماری حقیقت کا عکس لینے پر مامور ہے۔

(نعیم صدیقی)

ثبات و استقلال

اور صبر و عزیمت بھی

صالح عشماوی قائد اخوان المسلمون کے ایک مقالہ کا ترجمہ
قاضی خلیل الرحمٰن نعمانی کے قلم سے

> صبر و استقامت اہلِ ایمان کی صفت ہے، اور یہ صفت، راحت و آرام اور مصیبت و غم کی آزمائشوں میں اُن سے جُدا نہیں ہوسکتی ——!

ہر دعوت و تحریک کو خوشی اور غم، کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے۔ مومن تک بھی خیر و شر کی کشمکش کے ذریعہ آزمائے جاتے ہیں، اور آزمائش! مسلمان اور کافر دونوں کی ہوتی ہے! رنج و تکلیف کی حالت میں تو مسلمان کی آزمائش اس بات کی ہوتی ہے کہ آیا وہ اس پر صبر کرتا ہے، یا بدحواسی اور بے لگامی کا مظاہرہ کرکے کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور راحت و آرام کے وقت یہ معلوم کرنے کے لئے اس کی آزمائش کی جاتی ہے کہ وہ اس نعمت، و عنایت پر شکرگزار ہوتا ہے، یا طغیان و سرکشی اختیار کرتا ہے، اور کافر کی آزمائش یہ معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے، کہ آیا وہ آزمائشی حالت میں مبتلا رہ کر توبہ و اظہار اطاعت کرتا ہے یا اس کی سرکشی و نافرمانی، فسق و فجور کا پارہ اور چڑھ جاتا ہے۔

قرآنی آیات اور احادیث نبوی جو اس مضمون کی مؤید ہیں، بے شمار ہیں۔

کیا تمھاری حس سمع باری تعالیٰ کے اس قول سے ناآشنا ہے؟

ولنبلونکم حتیٰ نعلم المجاھدین منکم والصابرین — ہم تمہیں ضرور آزمائش میں مبتلا کریں گے تاکہ ہم جان لیں کہ تم میں سے کون کون مجاہد اور صبر کرنے والا ہے۔

نیز حق جل مجدہ کا ارشاد ہے:-

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یعلم اللہ الذین — ہاں کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ جنت میں جا داخل ہوگے حالانکہ

جاھدوا منکم ویعلم الصابرین — ہنوز اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا اور نہ ان کو دیکھا جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

اور سب سے برگزیدہ و پاک ذات کا یہ بھی فرمان ہے :-

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لا یفتنون۔ ولقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا و لیعلمن الکاذبین ٥

کیا ان لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ اتنا کہنے پر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ اور ہم تو ان کو بھی آزما چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ سو اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی جان کر رہے گا۔

اور مُسلم نے ابی یحییٰ صہیب بن سنان رضی اللہ عنہ سے روایت کی، انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کا معاملہ بھی عجیب ہے اور یہ خصوصیت مومن ہی کی ہے اور کسی کی نہیں۔ کہ اگر اس کو راحت نصیب ہو تو وہ شکر گزار ہوتا ہے اور یہ اس کے لئے بہتری کا سبب ہے، اور اگر اس کو کوئی ضرر یا نقصان پہونچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے۔ اور یہ بھی اس کے لئے بہتر ہے،

اس کے بعد ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کا جو گزشتہ زمانہ میں گزرے ہیں ایک قصہ سنایا۔

آپؐ نے فرمایا کہ تمہارے زمانہ سے قبل کسی کو گرفتار کیا جاتا۔ پھر زمین میں گڑھا کھود کر اس کو گاڑا جاتا۔ پھر آرہ منگا کر سر پر رکھا جاتا اور اس سے چیر کر دو ٹکڑے کر دئے جاتے۔ اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کی کھال اور ہڈیاں تک کھرچ ڈالی جاتیں۔ صرف اس لئے کہ اس کو اس کے دین سے باز رکھیں۔

اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالےٰ ظالم کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر اس کے لئے چھٹکارا ممکن نہیں ہوتا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف زبانی ہی جہاد و صبر کی دعوت نہیں دی بلکہ آپ کی بلند زندگی اور پاک سیرت مجاہد صابر کے لئے اعلیٰ نمونہ تھی۔ اور دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں کتنی ہی ناگواریاں مصیبتیں درپیش ہوئیں اور طرح طرح کی تکلیفوں اور ایذاؤں سے آپ کا سابقہ پڑا مگر حضورؐ نے ان سب کو کامل صبر و استقامت کے ساتھ انگیز فرمایا۔ نہ ضعف ظاہر کیا نہ نرم پڑے، نہ کمزوری دکھائی، اور نہ ذلت قبول کی، بلکہ صبر کیا، اور صابر رہے۔ تا آنکہ نصرتِ حق آگئی اور وعدۂ خداوندی پورا ہوا۔ وکان حقا علینا نصر المومنین (ہم پر حق ہے کہ ہم مومنین کی مدد کریں)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے اسوہ اور نمونہ تھے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے نبیؐ کے طریقہ پر چلے اور اپنے امام اور اپنے رسول کی سیرت کی پیروی کی۔ اور اپنے نبی کی طرح مصائب برداشت کئے، اور جس طرح ان کے نبی نے تکالیف و مصائب پر صبر اختیار فرمایا تھا، اُنھوں نے بھی صبر کیا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالےٰ نے ان کے دشمنوں کو ذلیل کیا اور اُن کو اُن کے اعداء پر غلبہ عطا فرمایا۔

"جو اللہ کی مدد کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی ضرور مدد کرتا ہے کیوں کہ اس کی ذات قوت و طاقت والی ہے ان لوگوں کے لئے کہ اگر اُن تمکن فی الارض نصیب ہو تو وہ نماز قایم کریں، زکوٰۃ دیں، بھلائی کا

حکم کریں۔ برائی سے روکیں۔ اور انجام کار (نتیجہ) تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ تو اے مسلمانو! صبر اختیار کرو، صابر بنو استقلال دکھاؤ اور ثابت قدم رہو، تا آنکہ اللہ کی فتح یا جو امر اس کے نزدیک مصلحت ہو اس کا ظہور ہو جائے اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ اس کا وعدہ ہے کہ ہم دنیاوی زندگی اور آخرت میں اپنے رسولوں کی اور ان لوگوں کی جو ایماندار ہیں ضرور مدد کریں گے!"

جس طرح شر کے ساتھ آزمائش ہوتی ہے اسی طرح خیر و شر بھی وجہ آزمائش ہوتی ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:-

"ہم تم کو خیر و شر میں ڈال کر تمہاری آزمائش کریں گے"

اور ایسے وقت جبکہ ابتلا شدید ہو یا کسی مادی آزمائش میں مبتلا ہو تو مسلمان کو چاہئے کہ وہ صبر کرے،

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان بخشش و وعدہ عطا پر مغرور نہ ہو اور خوف و دہشت سے مرعوب نہ ہو،

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بھی پیکر صبر بنے رہے جب آپ کو جھٹلایا گیا، گالیاں دی گئیں، آپ کے سر پر گندگی ڈالی گئی بلکہ آپ کو زخمی کیا گیا حتیٰ کہ قدم مبارک لہو لہان ہو گئے، اور میدانِ جہاد میں دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ اسی طرح آپؐ اس وقت بھی کوہِ ثبات بنے رہے جب آپؐ کو دنیا کا لالچ دیا گیا، آپؐ کو مال وجاہ اور سلطنت کی پیش کش کی گئی، اور آپؐ سے کہا گیا۔ آپ جو چاہیں گے آپ کو دیں گے۔

اور یہ اس طرح ہوا کہ کفار قریش آپؐ کے چچا (ابو طالب) کے پاس آئے اور انہیں پیش کش کی کہ اگر تمہارا بھتیجا اپنی دعوت ترک کردے، ہمارے معبودوں کی برائی کرنا چھوڑ دے۔ اور اپنے دعویٰ رسالت سے باز آجائے تو ہم ان کو کافی مال و زر دینے کو تیار ہیں۔ بلکہ ان کو اپنا بادشاہ تک تسلیم کرنے کو تیار ہیں،

چنانچہ ابو طالب نے یہ پیش کش آپ کے سامنے رکھی، تو آپ کی طرف سے کیا ردِ عمل ہوا؟

کیا آپ نے کوئی کمزوری اور نرمی دکھائی؟ کیا آپؐ نے زمانہ سازی کی؟ کیا آپؐ سیاست باز ثابت ہوئے، جو کچھ لیتا بھی ہے تو کچھ دیتا بھی ہے؟ یا ایسی سیاسی شخصیت کا کردار پیش کیا جو موقع اور وقت سے فائدہ اٹھا کر جھک جائے! کیا رسول اللہ ان لوگوں یا ان جیسے لوگوں کا نمونہ تھے یا آپؐ (صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ) ایک با اصول ہستی تھے جو اپنے اصول پر قائم رہے، اپنی دعوت و تحریک کے پھیلانے پر حریص ہو، اور جس کے سامنے دعوت کے مقابلہ میں دنیا کے سارے ساز و سامان حقیر ہوں۔ اور جو اس دعوت کے مقابلہ میں اپنے مال اپنی راحت بلکہ جان روح، اور پوری زندگی تک قربان کر دینے پر مستعد ہو۔

تاریخ میں یہ موقف سنہری روشنائی سے لکھا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب جو تاریخ کے کانوں میں گونج پیدا کر رہا ہے فریب اور حیلہ کے پردہ کو چاک کر دینے کا موجب ہوا۔ اور زمانہ نے اس واقعہ کو انسانوں میں نسلاً بعد نسل پھیلایا تاکہ وہ ابدالآباد تک مجاہدین صابرین اور مومنین صادقین کے لئے مشعلِ راہ بنا رہے۔ رسول اللہ نے جواب میں فرمایا:-

"خدا کی قسم اے چچا اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اس سے باز نہ آؤں گا تا آنکہ اللہ تعالیٰ اس دعوت کو غالب کرے یا پھر میں اسی میں ختم ہو جاؤں"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ موقف اس وقت تھا جبکہ آپ کی دعوت کا بھاؤ چکایا جا رہا تھا، اور آپ سے گفت و شنید کے ذریعہ کوشش کی جا رہی تھی کہ آپ اپنی رسالت کی تبلیغ سے باز آ جائیں۔

آپؐ کی ذاتِ گرامی آپ کے ہر پیرو کے لئے اور آپ کے اصحاب اور دوستوں کے لئے جو آپؐ کی رسالت پر ایمان لائے بہترین اسوہ اور اعلیٰ نمونہ تھی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ سبق اپنے امام اور اپنے ہادی سے سیکھا پھر انھوں نے نہ کبھی خوف و دہشت کے وقت کمزوری دکھائی۔ نہ دھوکہ دہی اور وعدوں پر نرم پڑے یا سرِ تسلیم خم کیا۔

اس دور کے بعد مسلمان اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راستے سے دور ہٹ گئے تو ان کو ہر طرف سے شیطانی وسوسوں نے گھیر لیا۔ اور ہر راستہ سے شیطان نے ان کے قلوب پر قبضہ جما لیا۔ پس جب انھیں، کوئی محنت یا سختی پیش آئی اور جہاد و قربانی کے راستے طویل اور صبر آزما ہوگئے۔ تو وہ راحت و عیش کی طرف مائل ہوگئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنی اس کمزوری کو نیکی کا جامہ پہنانے لگے اور اپنی گوشہ نشینی کی دور از کار تاویلات کرنے لگے۔

اور کہنے لگے، لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا اور ما علی المحسنین من سبیل۔ اور انہوں نے اللہ کے اس قول کو سند بنا لیا۔ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ۔ اور دوسری ایسی ہی آیات سے سند لینے لگے جن کے حقیقی معنیٰ انھوں نے بدل دیئے تھے اور من مانی تاویلات کرتے تھے، اور اپنی ذمہ داریوں اور امانتوں میں وسعت دے کر کتاب اللہ پر ایسی چیزیں محمول کر لیتے تھے جس سے اللہ اور اس کے رسول بری الذمہ تھے۔

جب مسلمانوں کو ابتلا کے بعد دھوکہ، اور وعید کے بعد وعدوں کے دور سے سابقہ پڑا، تو شیطان نے نئے پرپرزے نکالے وہ واعظ کے عماموں۔ صوفیوں کے کمبل، اور امانتدار ناصح کی چادر میں لپٹ کر سامنے آیا۔ حکیم حاذق اور اور باخبر دانشور کا بھیس چھپا ظاہر کر کے ظاہر ہوا۔ اور ان سے کہا کہ واقعہ صلح حدیبیہ پر غور کرو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں کیا کیا؟ کیا آپ نے لفظ "الرحمٰن الرحیم" مٹا کر لفظ "اللھم" نہیں لکھا؟ اور کیا "محمد رسول اللہ" کے لفظ کو مٹا کر، "محمد بن عبد اللہ" نہیں لکھا؟ آپ نے مصلحت کے پیشِ نظر ایسا کیا۔ اور یہ ایسی چال تھی کہ اس کی کامیابی پر فتح و نصرت نے قدم چومے، اور صلح حدیبیہ کے بعد فتح مکہ ہوئی اور گویا آپ کی یہی فتح اکبر کا ذریعہ بنی!

آہ! بے چاری مظلوم حدیبیہ! یہ شیطان کا ایک آلۂ مکر بن گئی ہے جس کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو دھوکہ دیتا ہے جبکہ وہ اپنے دین و دنیا سے کچھ خرچ کرنے کا ارادہ کریں۔ اور جبکہ وہ جہاد سے اکتا جائیں یا فتح و ظفر دور نظر آئے،

(اللہ کے بندو اتنا نہیں سوچتے) کہ حدیبیہ کا معاملہ تو اللہ کی طرف سے رسولؐ کے ساتھ وحی کے ذریعے طے ہوا تھا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کون رسول ہے؟ اور کیا اب آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے؟

اب مسلمانوں کے امام کے لئے صرف رائے اور اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسلام نے اپنے پیرووں پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے امور شوریٰ کے ذریعے طے کریں، اور اس موقع پر غور و فکر بحث و تمحیص سے کام لیا جائے، ہر شخص

ے کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی زندگی میں "صلح حدیبیہ" کا معاملہ بھی پیش آ سکتا ہے مگر شیطان یہ چال چلتا ہے کہ وقت تو ہوتا ہے بدر و خیبر کے معرکوں کا اور وہ "صلح حدیبیہ" کی مثال اور اس واقعہ کی تدبیر سمجھاتا ہے! شیطان کی یہ چال بڑی نازک، پُر پیچ اور خطرناک ہوتی ہے۔

(مدیر)

کو یہ اختیار ہے کہ وہ اپنے نظریہ کو آزادی سے پیش کرے، دلائل کے ساتھ اس کی مدافعت کرے اور جب بحث ختم ہو جائے اور رائے کا مناقشہ مکمل ہو جائے اور تنفیذ کا وقت آئے تو تمام لوگوں پر فرض ہے کہ وہ اس قرارداد کی پشت پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند صف بند ہو جائیں۔ قرآن میں بھی یہی حکم ہے، اپنے معاملات میں مشورہ کرو اور جب پختہ ارادہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، پھر جو اس قرارداد سے باہر ہے وہ مسلمانوں کی جماعت ہی سے باہر ہے، ایسے شخص کے لئے یہ مناسب نہیں کہ جس معاملہ پر صریح و غیر صریح ہر صورت سے آراء کا انعقاد ہو گیا اس پر اپنے نقطۂ نظر کو زبردستی ٹھونسے اور مسلمانوں میں ایک بری مثال قائم کرے،

جو لوگ جد و جہد سے اکتا جائیں اور جہاد کی مشقتوں میں کمزوری دکھائیں اور وہ چاہیں کہ غیر واقعی امور کو بہانہ بنا کر راحت و آرام حاصل کریں اور غیر واقعی وجوہ بیان کریں۔ اور غیر واقعی اور لچر مقاصد کی آڑ لیں تو ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے ہم اُن کے لئے ہدایت کی دعا کرتے ہیں، ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خاموشی کے ساتھ گوشہ گیر ہو جائیں ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی کو دھوکہ دینے کی کوشش کریں۔ یا ثابت قدم لوگوں کی صفوں میں انتشار و انشقاق پیدا کریں اور جن لوگوں کا ایمان صادق ہے وہ کوئی غیر واقعی کام نہیں کرتے وہ لوگوں کے سامنے ایسی وجوہ بھی بیان نہیں کرتے جن کا وجود ہی نہ ہو۔ اور وہ غیر واقعی مقاصد کے لئے جہاد نہیں کرتے جن میں مارتے بھی ہیں، مرتے بھی ہیں تو ان کے سامنے ہر دھوکہ دہی اور وعدہ فریبی کا جال تار تار ہو کر بے کار ہو جائے گا۔ جیسے اس سے پہلے خوف و دہشت کا حربہ بیکار ہو چکا ہے ہمارے لئے یہ مناسب نہیں کہ ہم ان لوگوں کی تردید کرتے پھریں جو واقعہ حدیبیہ کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی غرض بجز جھگڑے اور فتنہ و فساد کچھ نہیں

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ

"تم صبر کرو اللہ کا وعدہ سچا ہے، وہ لوگ جو صاحب ایقان نہیں ہیں تمہیں زک نہیں دے سکیں گے"

خواجہ راحت حسین بی۔ اے
(اکبر آبادی)

اخبار نگاری

انسان کی فطرت میں ٹوہ اور تجسّس کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے، وہ یہ چیز جاننا چاہتا ہے کہ دوسرے کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں، بالفاظِ دیگر انسان کو ہمیشہ نئی نئی اطلاعیں اور تازہ بہ تازہ خبریں معلوم کرنے کی فکر رہتی ہے، یہ چیز انسان کے مدنی الطبع ہونے کی دلیل ہے ـــــ یہی جذبہ اخبارات کی ایجاد کا سبب ہوا ؛

مغلیہ حکومت کی تاریخ جو ہم تک پہونچی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی طرف سے "وقائع نگار" مقرر تھے، جو شہروں کے عام حالات اور خاص واقعات قلمبند کیا کرتے تھے، وقائع نگاری ایک اہم اور معزز خدمت تھی، نعمت خان عالی کے "وقائع" ادب و تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں!

دُنیا میں سب سے پہلا اخبار انگلستان سے جاری ہوا، یہ ایک ہفت روزہ اخبار تھا جو ۱۶۲۲ء میں منظرِ عام پر آیا، اس اخبار کا نام ویکلی نیوز (WEEKLY NEWS) تھا، روزنامہ کے جاری کرنے کا شرفِ اولیت بھی انگلستان ہی کو حاصل ہے، اس روزنامہ کا نام کورنٹ (COURANT) تھا جو ملکہ آینے (ANNE) کی تاج پوشی کے موقعہ پر جاری کیا گیا ؛

انگلستان میں پریس کو مملکت کا چوتھا رکن سمجھا جاتا ہے، باقی تین رکن پادری، اُمرا، اور دارالعوام ہیں، انگلستان کے باشندے بادشاہ کا بھی احترام کرتے ہیں، اور وہاں کے دستور میں اب بھی یہ دفعہ موجود ہے کہ پادشاہ چاہے تو پارلیمان کو تحلیل (dissolve) کرسکتا ہے، مگر یہ سب کاغذی اختیارات ہیں، اصل قوت وہاں کی پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے ـــــ ڈیوک آف ونڈسر کا حشر دُنیا دیکھ چکی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے شادی بھی نہ کرسکا یہاں تک کہ اُسے تاج و تخت سے دست بردار ہونا پڑا ؛

انگلستان کے دستور اور آئین پر تنقید کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے، یہ تو ایک بات درمیان میں آگئی تھی جو بیان کردی گئی ـــــ ہم "اخبارات" کا ذکر کر رہے تھے، اور یہی ہمارا موضوعِ سخن ہے!

انگلستان میں ۱۸۷۰ء میں ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اُس کے دس سال بعد جب ملک میں پڑھنے لکھنے کا رواج عام ہوا تو اخبار ڈیلی میل (DAILY MAIL) جاری کیا گیا، جو سب سے پہلا سستا عوامی اخبار تھا، لوگوں میں تعلیم پھیلتی رہی اور اُس کے ساتھ اخبارات بھی ترقی کرتے رہے، اب لندن میں صبح کے وقت شائع ہونے والے روزناموں کی تعدادِ اشاعت دس لاکھ سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور شام کے پرچے دوپہر سے لیکر رات کے آٹھ بجے تک سات یا آٹھ ایڈیشن شائع کرلیتے ہیں ؛

دوسری جنگِ عظیم سے پہلے جب جاپان آزاد تھا تو وہاں ٹوکیو اساہی نام کا ایک روزنامہ شائع ہوتا تھا جس کی تعداد

اشاعت ستر لاکھ کے قریب بتائی جاتی تھی، اس روزنامہ کے پاس اپنے ہوائی جہاز تھے، اور خبر رسانی کے ذرائع اور وسائل کا یہ عالم تھا کہ نامہ بر کبوتر تک نامہ رسانی کے لئے موجود تھے، جاپان کی شکست کے بعد نہ جانے اس روزنامہ پر کیا گزری؟

خبریں

آج کی دنیا میں روٹی، کپڑے اور مکان کی طرح "اخبار" بھی زندگی کے لوازم میں داخل ہے، اب "صحافت" (journalism) ایک مستقل فن اور پیشہ بن گئی ہے اخبارات کی آواز کا وزن محسوس کیا جاتا ہے!

روزناموں میں سب سے زیادہ اہمیت "خبروں" کو حاصل ہے، اس لئے روزنامے news paper سے زیادہ "newspaper" ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں!

خبر* (news) کسی بھی واقعہ کی اطلاع کو کہتے ہیں، مگر جس طرح تمام واقعات ایک جیسے نہیں ہوتے اسی طرح خبروں کی نوعیت میں بھی فرق ہوتا ہے، مثلاً آپ کے پاس ایک دن میں کئی خط اور اطلاعیں آتی ہیں، جن سے آپ کو معلوم ہوتا ہے:

(۱) آپ کے ایک دوست آپ سے ملنے کے لئے آرہے ہیں۔
(۲) آپ کے ایک عزیز شدید بیمار ہیں۔
(۳) آپ کے ایک جاننے والے کے یہاں چوری ہوگئی اور چور گھر کی ساری نقدی نکال لے گئے۔
(۴) آپ کے ایک ساتھی کے باپ مقدمہ ہار گئے۔

ان تمام خبروں کو سن کر آپ پر مختلف اثرات مترتب ہوں گے "خوشی" غم، حیرت، ہنسی ......! بالکل اسی طرح اخبارات کی خبریں عام انسانوں کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے متاثر کرتی رہتی ہیں ——— انسان فطری طور پر خبروں میں "اعجوبیت" (peculiarity) چاہتا ہے ...... مثلاً ایک آدمی کو کتا کاٹ لے تو یہ کوئی خبر نہیں ہے، لیکن اگر آدمی کتے کو کاٹ لے تو اس خبر میں پڑھنے اور سننے والوں کے لئے بڑی دلچسپی ہے۔

چند خبروں کے عنوانات:-

(۱) سونے کا بھاؤ اسی روپے تولہ ہوگیا
(۲) بیوی نے سوتے میں شوہر کی ناک کاٹ لی
(۳) برطانیہ کے وزیر خارجہ نے استعفیٰ دے دیا
(۴) ترکی کا سب سے زیادہ معمر آدمی ایک سو بیس سال کی عمر میں چل بسا
(۵) آسام کی سرحد پر کمیونسٹوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کردی
(۶) پشاور کے قریب تیل کے چشمے نکل آئے
(۷) صدر بازار میں ایک شخص کی جیب کاٹ لی
(۸) ایک گریجویٹ نے بے کاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی

* قانوناً خبروں کا کاپی رائٹ نہیں ہوتا لیکن خبر کے طریقۂ اظہار کا کاپی رائٹ ہوتا اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ خبر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں؛ [illegible]

(۹) کراچی میں بین الاقوامی مشاعرہ کی تیاریاں
(۱۰) پاکستان اور بھارت کے مابین متروکہ جایدادوں کا تصفیہ جلد ہو جائے گا

یہ خبریں اپنی نوعیت کے اعتبار سے پڑھنے والوں کو متاثر کریں گی اور ان تاثرات کا بہت زیادہ تعلق لوگوں کے رجحانات اور عواطف و میلانات سے ہے ـــــــ "کراچی میں بین الاقوامی مشاعرے" کی خبر ان لوگوں کے لئے زیادہ دلچسپی کا باعث ہو گی جو شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں ـــــــ "برطانیہ کے وزیر خارجہ نے استعفیٰ دیدیا" یہ خبر عوام کے مقابلہ میں ان افراد کو متاثر کرسکے گی جو غیر ممالک کے خارجی اور سیاسی تعلقات سے دلچسپی اور آگہی رکھتے ہیں ـــــ "ایک گریجویٹ نے بے روزگاری سے تنگ آکر خودکشی کرلی" ـــــ اس خبر کو ہر طبقہ کے لوگ دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے ایسی حال دوسری خبروں کی نوعیت اور اہمیت کا ہے!

وہ اخبار پبلک میں زیادہ قبول ہوتے ہیں جو خبروں کے معاملہ میں عوام کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہیں، خبروں کی سرخیاں، خبروں میں جاذبیت پیدا کرتی ہیں ـــــ "کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ دلکشی اور معنویت" ـــ یہ ہے خبروں کے عنوانات کی تعریف!

خبروں کے عنوانات (Head lines) سے اخبارات کی پالیسی کا بھی اظہار ہو جاتا ہے ـــ مثلاً میزانیہ (BUDGET) کی تفصیل شائع ہوتی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حکومت کی آمدنی ستر کروڑ اور خرچ پچھتر کروڑ ہے، پانچ کروڑ کی رقم مختلف ٹیکسوں کے ذریعہ وصول کی جائے گی ... ایک وہ اخبار جو اپنی آزادانہ رائے رکھتا ہے، اس خبر کو اس قسم کے عنوان کے تحت شائع کرے گا :-

"حکومت کا غیر متوازن میزانیہ"
"عوام ٹیکسوں کی زد میں"

اس کے برخلاف جس اخبار کی حکومت سے کور دبتی ہے، اور جو حکومت پر آزادانہ تنقید کرنے کی جرأت نہیں رکھتا، اس میں اس طرح کے "عنوانات" درج ہوں گے۔

"حکومت نے قیامت خیز گرانی کے زمانہ میں اپنا بجٹ پیش کر دیا"
"خرچ آمدنی سے زاید، مگر یہ کمی پوری ہو جائے گی"

کسی جگہ سے فساد کی خبر آتی ہے جس میں ایک آدمی جان سے مارا جاتا ہے اور بیس آدمی زخمی ہوتے ہیں، خبر کو سنسنی خیز اور پڑھنے والوں کے لئے زیادہ دلچسپ اور جاذب توجہ بنانے کے لئے اس طرح پیش کیا جائے گا۔

"سیرام پور میں شدید فرقہ وارانہ فساد"
"اکیس آدمی ہلاک اور زخمی"

اخبارات کی کامیابی کا بڑی حد تک دارومدار اس بات پر ہے کہ ان کی خبر رسانی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ وسیع ہوں، مثلاً پاکستان اور بھارت کے درمیان نہروں کے پانی پر کوئی کانفرنس ہونے والی ہے، یہ خبر ابھی عام نہیں ہوئی مگر ایک اخبار کو اپنے ذاتی ذرائع سے اس کا علم ہو جاتا ہے اور یہ خبر شایع کرکے وہ عوام کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے بعض اوقات خبروں میں رنگینی، ندرت اور جدت پیدا کرنے کے لئے خبریں "تصنیف" بھی کی جاتی ہیں ان باتوں کو انگریزی

میں (STUNT) کہتے ہیں۔

مُراسلے۔۔۔!

اخباروں میں جو مُراسلے عوام کی طرف سے چھپنے کے لئے آتے ہیں اُن میں ہر مُراسلہ چھپنے کے قابل نہیں ہوتا، مراسلے اس قسم کے شائع ہونے چاہئیں جن میں عوام اور حکومت کی آگہی کے لئے زیادہ سے زیادہ عمومیت ہو، بعض لوگ محض اپنا نام چھپنے کے شوق میں مُراسلے بھیج دیتے ہیں۔

مُراسلے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں ان سے عوام کے خیالات اور میلانات کا اندازہ ہوتا ہے، بعض اخباروں کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ وہ گمنام مُراسلے شایع نہیں کرتے، اس پالیسی میں تھوڑی سی لچک بھی ہونی چاہیئے، بعض گمنام مراسلے اپنی افادیت اور عمومیت کے اعتبار سے اس قابل ہوتے ہیں کہ اُن کو شایع کیا جائے، ہر گمنام مراسلہ غلط اور فرضی نہیں ہوتا، مراسلہ نگاروں میں بعض اوقات جواب اور جواب الجواب کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے، اگر یہ بحث اخلاق اور معقولیت کے اندر ہو تو اس سے دلچسپی کے ساتھ ساتھ عوام کو فایدہ بھی پہونچ سکتا ہے۔

"مُراسلات" مضامین اور مقالے نہیں ہوتے کہ اُن میں کاٹ چھانٹ کی جائے، مراسلات جُوں کے تُوں شایع ہونے چاہئیں، مگر بعض حالات میں اضافہ و ترمیم کی ضرورت بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔

بعض مُراسلے اور اطلاعیں ایسی ہوتی ہیں جن کا عوام سے برائے نام تعلق ہوتا ہے مگر ذاتی اثرات اور شخصی کوشش یا تعلق کے سبب، اُن کو اخبارات میں جگہ دیدی جاتی ہے، یہ اخبارات کی جگہ" space "کا بیجا استعمال ہے، مثلاً کسی اخبار میں یہ خبر شایع ہوتی ہے:۔

"حضرت ابدالِ وقت سبز پوش میاں کا عُرس شریف"

اور سبز پوش میاں صاحب" کو نہ عوام جانتے ہیں نہ کسی کو اس خطاب (ابدالِ وقت) کا پتہ ہوتا ہے، اس خبر سے زیادہ سے زیادہ اُس گلی یا محلے کے رہنے والوں یا گنتی کے چند عقیدت مندوں کو دلچسپی ہوسکتی ہے۔

اخبارات عوام کی ذہنیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے افتتاحیے اور شذرات بڑی ذمہ داری اور کامل احتیاط کے ساتھ لکھے جانے چاہئیں، ایک صحافی (جرنلسٹ) کو شگفتہ نگار ہونے کے ساتھ وسیع المطالعہ اور کثیر المعلومات بھی ہونے کی ضرورت ہے، صرف جذبات نگاری اور لفظوں کی شیشہ گری سے کام نہیں چل سکتا، بعض خیالات اور نظریے ٹھوس حقایق چاہتے ہیں۔ صحافت کی زبان عام طور پر "افسانہ نویسی" کی زبان سے مختلف ہوتی ہے، صحافتی لٹریچر اور کتابوں کا ادب ایک دوسرے سے منفرد اور ممتاز ہوتا ہے۔

اخبار نویسی ایک ایسا مدرسہ ہے جس کے حلقۂ درس میں ساری قوم شامل ہے اور جس کا درس تمام سال جاری رہتا ہے اُس کی درس گاہ میں کبھی چھٹیاں نہیں ہوتیں ——— جرنلزم (صحافت) کی نہایت نازک اور اہم بحث یہ ہے کہ اخبارات رائے عامہ کے خالق ہوتے ہیں یا وہ خود رائے عامہ کا پرتو اور عکس ہوتے ہیں، لیکن اس مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ چیز سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ خود "رائے" کسے کہتے ہیں۔

اگر کوئی شخص سورج کی طرف اشارہ کرکے یہ کہے "میری رائے یہ ہے کہ یہ سورج ہے" تو سننے والے اس پر بیساختہ مسکرا دیں گے، بدیہیات میں کسی آدمی کو سعی و کاوش کرکے "رائے" قایم کرنے کی ضرورت پیش ہی نہیں آتی، "رائے" مسائل میں قایم کی جاتی ہے جہاں نزاکتیں، اُلجھنیں اور ایک تصویر کے کئی کئی رُخ اور متعدد پہلو ہوتے ہیں، مثلاً کسی نئے آدمی کو دیکھ کر اور اُس [illegible]

آپ یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں " میری رائے میں یہ شریف آدمی ہے " یہاں " رائے " کا لفظ برمحل استعمال کیا گیا ہے ، وہ آدمی غیر شریف بھی ہوسکتا ہے ، مگر آپ نے اُس سے ملنے جلنے کے بعد چند مقدمات ترتیب دیئے ، اُن مقدمات سے نتائج برآمد کئے اور آپ کی " رائے " انھی نتائج کا خلاصہ ہے ؛

" کشمیر " سے تمام پاکستانیوں کو غیر معمولی ہمدردی ہے اور عوام کی یہ ہمدردی بالکل فطری اور بدیہی ہے اس کے لئے سوچ کر کوئی " رائے " قایم نہیں کرنی پڑی ، ہر آدمی زندہ رہنا چاہتا ہے اس لئے زندگی سے محبت کرتا ہے اور زندگی سے اُس کی یہ محبت اُس کی " رائے " نہیں بلکہ فطری جذبہ ہے ! اگر پاکستان میں اخبارات نہ ہوتے تو بھی پاکستانیوں کو " کشمیر " سے لگاؤ ہوتا ۔

وہ بدیہی چیزیں جن سے کسی ملک اور قوم کا مفاد وابستہ ہے اُن میں " رائے عامہ " کو ہموار بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس فطری مطالبہ کی اخبارات کو خود ہم نوائی کرنی پڑتی ہے ـــــــ مگر یہی " بدیہیات " جب مسائل کی شکل اختیار کرلیتے ہیں تو پھر اخبارات کی " رائے زنی " اور " اظہار خیال " کی ضرورت پیش آتی ہے ؛

مثلاً مسئلہ کشمیر کے تصفیہ کے لئے ایک کمیشن مقرر ہوتا ہے اُس کو مخصوص اختیارات دیئے جاتے ہیں ، اِن باتوں کو عوام نہیں سمجھ سکتے ، اس پر اخبارات اظہار رائے کرتے ہیں کہ کمیشن کے ارکان کا تقرر کس حد تک صحیح ہوا ہے اور کمیشن کے اختیارات کے مسئلہ کا کشمیر پر کیا اثر پڑے گا اور پڑ سکتا ہے ـــــــ اگر اخبارات ایمانداری اور سچائی کے ساتھ یہ محسوس کریں کہ خود اپنی حکومت اس مسئلہ میں غلطی کررہی ہے تو وہ " رائے عامہ " کو کمیشن کے مقاطعہ کے لئے اُبھار سکتے ہیں ، اور اس نوبت پر " رائے عامہ " کو صحافت کی قیادت اور مشورت کا اتباع کرنا پڑتا ہے اور ہر ملک میں ایسا ہوتا رہتا ہے ؛

حکومتیں " اخبارات " سے ڈرتی رہتی ہیں اگرچہ اپنے اس " ڈر " کو وہ کھُل کر ظاہر نہیں کرتیں اسی لئے اخبارات کو لالچ اور دھمکیوں کے ذریعہ رام کرنے اور مرعوب بنانے کی کوششیں کی جاتی ہیں ، کمزور کردار کے اخبار نویس اس " دامِ ہم رنگِ زمین " میں آسانی سے گرفتار ہوجاتے ہیں ؛

اخبارات ملک میں آگ بھی لگا سکتے ہیں اور شبنم بھی برسا سکتے ہیں ، آجکل سیاسی شورشوں سے صحافت غیر متعلق نہیں رہ سکتی ، تقسیم ہند سے پہلے صوبہ بہار میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا تھا ، اُس میں مشہور روزنامہ " امرت بازار پتریکا " کا بہت کچھ ہاتھ تھا اُسی اخبار نے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی تھی ؛

اسلام اور صحافت

" جانب داری " (partiality) ، اس معنیٰ میں بُری چیز ہے کہ آدمی عدل و انصاف کی حدود پھاند کر کسی طرف جھک جائے ، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو جس مشن اور مقصد سے محبت ہوتی ہے اُس کی طرف وہ فطری طور پر میلان رکھتا ہے ، اور اُس کے مخالف مقصد سے اور مشن سے اُسے نہ صرف یہ کہ محبت نہیں ہوتی بلکہ اُس کے دل میں ایک طرح کی بیزاری ہوتی ہے ، اس لئے اس دنیائے کون و فساد اور عالمِ اسباب میں جہاں ہر آدمی ، ہر قوم ، ہر جماعت اور ہر حکومت کچھ نظریے اور مقصد رکھتی ہے ، کوئی آدمی بالکل " غیر متعلق " اور قطعاً " غیر جانبدار " ہوکر نہیں رہ سکتا ، کسی نہ کسی نظریہ کی اُسے حمایت ضرور کرنی پڑے گی ؛

ایک اشتراکی اخبار نویس جو " اشتراکیت " پر ایمان رکھتا ہے اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ " اشتراکیت " کی حمایت کرے اور اُس کے اخبار کی پالیسی " اشتراکیت " کی تبلیغ ، بقا اور اُس کے لئے جدوجہد کرنا ہو ـــــــ اسی طرح ایک مسلمان اخبار نویس کی صحافت نگاری کا بنیادی تصور " اسلام " ہونا چاہیئے ، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اپنے فریضہ کے ادا کرنے میں کوتاہی اور غفلت

سے کام لیتا ہے ؛

اسلام ایک مکمل اور جامع ترین دستورِ حیات اور نظامِ زندگی ہے، یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمان "مسجد" میں جب تک ہے تو وہ یہ سمجھے کہ اللہ اور رسولؐ نے جو طریقے اور ارکان بتلائے ہیں اُن کی پابندی مجھ پر فرض ہے اور مسجد سے باہر نکلتے ہی آزاد ہو جائے مسلمان کے لئے زندگی کا ہر شعبہ "نماز" اور "مسجد" کی حیثیت رکھتا ہے، سیاست ہو، تجارت ہو، زراعت ہو، صحافت وادب ہو، غرض ہر کارگاہِ عمل اور منزلِ حیات میں اللہ کے بنائے ہوئے حدود کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا!

ایک مسلمان صحافت نگار کو قلم اُٹھاتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ آخرت میں اُس کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کی باز پرس ہوگی، لفظوں کے اُلٹ پھیر اور عبارت کی رنگینی و دل آویزی سے وہ لوگوں کو دھوکا دے سکتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ جو ارادوں اور نیتوں کا جاننے والا ہے اُسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا ؛

جس نے بھی کہا خوب کہا کہ "پاکستان بنانے کے لئے اسلام کو استعمال کیا گیا اب "اسلام" کے لئے پاکستان کو استعمال کیا جائے گا —— اس لئے پاکستان میں صحافت کے ذریعہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ لوگوں کے دل و دماغ پر اسلام چھا جائے یہاں تک کہ زبان کے ساتھ عملی زندگی "کلمۂ شہادت" پڑھنے لگے ؛

صحافت انتہائی شریف اور کار آمد فن ہے بشرطیکہ اُسے نیک مقصد کے لئے استعمال کیا جائے اور یہ فن انتہائی خطرناک اور مضرت رساں بن جاتا ہے جب اس کو مفاد پرستی، ذاتی مخالفت اور شخصی ترقی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے ؛

مقالوں اور اداریوں ہی میں نہیں خبروں تک میں "اسلامی اُصول" کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اس پر شاید طنز کی جائے گی کہ کیا خبریں بھی "مسلمان" اور "کافر" ہوتی ہیں، اخبارات کو خبر رساں ایجنسیاں جیسی خبریں پہونچاتی ہیں، وہ اُن کو جُوں کا توں چھاپنے پر مجبور ہیں اور یہی دیانت کا تقاضا ہے —— ہم یہ کب کہتے ہیں کہ خبروں کی اشاعت میں دیانت کو ملحوظ نہ رکھا جائے —— مگر صرف ایک گزارش.. .. ایک مثال —!

تین سال کی بات ہے جب کراچی میں کسی صاحب نے جو خدا کے فضل سے مسلمان تھے مسلسل اسّی یا اس سے شاید کچھ زیادہ گھنٹے سائیکل چلانے کا مظاہرہ کیا تھا، رام باغ میں ایک خلقت کا ہجوم رہتا تھا اخبار والوں نے اس "cycle champion" کی خوب خوب تعریفیں کیں مگر اس طرف کسی کی نگاہ نہ گئی کہ اس مدت میں اُس مردِ مسلمان کی ایک دو نہیں سولہ وقت کی نمازیں قضا ہوگئیں —— جی ہاں! نماز جس کی قرآن پاک میں بار بار تاکید وارد ہوئی ہے اور جسے دین کا ستون بتایا گیا ہے، جس نے نماز کو قضا کردیا اس نے دین کو ڈھا دیا (حدیث شریف)!

وہ جلسے، پارٹیاں اور میلے ٹھیلے جن میں فواحش و منکرات کی گرم بازاری ہو اُن کی خبریں، اسلامی اخبارات میں ایسی سرخیوں کے ساتھ شائع کی جائیں کہ پڑھنے والوں کو اُن سے نفرت اور بیزاری ہو خبروں کی ترتیب و تسوید کے اس انداز کو ہم "اسلامی انداز" کہہ سکتے ہیں۔!

جس طرح ہم سب کے سب اللہ کے فضل سے مسلمان ہیں مگر ہماری زندگیاں پوری کی پوری "مسلمان" نہیں ہیں اسی طرح ہماری صحافت بھی تمام کی تمام مسلمان نہیں ہو سکی اسے "مومنِ کامل" بنایا جائے گا، اس کے لئے اہلِ صحافت کو کچھ منفعتوں اور فائدوں کی قربانیاں بھی دینی ہوں گی، بعض منفعتوں اور آمدنیوں سے کنارہ کش ہو جانا پڑے گا۔

جب ہم مسلمان ہیں تو پھر ہماری منفعتوں اور مفادات کا معیار وہی ہونا چاہیئے جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جسے قرآن کی اصطلاح میں "حدود اللہ" کہا گیا ہے ـــــــ پس حقیقت میں وہی صحافت اسلامی صحافت ہے جو قلم کی ہر جنبش کے ساتھ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کا خیال رکھتی ہے!

ماہرالقادری

یادِ رفتگاں

اس مضمون کا عنوان ہی بتا رہا ہے کہ یہ ایک نامۂ غم اور داستانِ حزن و ملال ہے ــــ ایک ہی سانس میں کتنی ہی آہیں اور بہت سے نالے کر رہا ہوں، کیا بتاؤں کہ دل کا کیا حال ہو رہا ہے؟

دوستوں عزیزوں کرم فرماؤں اور مشاہیر کی رحلت پر جس انداز میں اظہارِ غم کیا جاتا ہے، یہ داستان اُس سے کچھ مختلف ہے، میں نے جان کر شخصی تعلقات اور ذاتی تعارف کا ذکر کیا ہے تاکہ سوانح نگار ان سے کام لے سکیں!

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی

دو چار سال کا نہیں آج سے چوبیس سال قبل کا واقعہ ہے کہ اتنی مدت میں ایک بچہ جوان ہو کر صاحبِ اولاد بن جاتا ہے، اُنیس سو ستائیس (۱۹۲۷) سالِ عیسوی تھا اور جہاں تک مجھے یاد آتا ہے گلابی جاڑوں کا موسم تھا، حکومتِ حیدرآباد دکن کی طرف سے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم (صدر الصدور امور مذہبی) اور عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر مولوی عبدالواسع مرحوم (مصنف "البدر") کو مدرسہ قادریہ بدایوں کے معاینہ کے لئے بھیجا گیا:

بدایوں ریلوے اسٹیشن پر ان دونوں بزرگوں کا پرجوش استقبال کیا گیا اور شہر میں جلوس نکالا گیا، اس بارات کے دولہا مولانا شیروانی مرحوم ہی تھے، وہ آن کا رنگین عمامہ، جامہ وار کی اچکن اُس پر حجازی عبا، شرعی پاجامہ کے پائنچوں پر بیل ٹکی ہوئی، پھول دار جوتہ، سُرخ و سپید رنگت، خوبصورت ناک نقشہ، اور بچپن کے ساتھ ساتھ وجاہت بھی، اور سب سے بڑھ کر خاندانی شرافت اور علمی وقار جو سر سے پیر تک چھایا ہوا تھا ــــ دیکھنے والوں کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ جس کا چہرہ اس قدر روشن اور تابناک ہے اُس کا دل نہ جانے کیا ہوگا؟

مدرسہ قادریہ کی عمارت کے صحن میں جلسہ ہوا، شاندار جلسہ ــــ شامیانہ، رنگ برنگی جھنڈیاں، پھریرے، کتبے، خوبصورت ڈائس ــــ اور علماء، عمائد، عہدیدار، طلبا، اور عوام غرض سبھی کا جمگھٹا تھا، میں نے بھی اس جلسہ میں نظم پڑھی، وہ نظم کیا تھی نومشقی کی "شعر سازی" تھی، آج اُن شعروں کا خیال آتا ہے تو ہنس دیتا ہوں۔

نواب صدر یار جنگ مرحوم جب تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے محسوس کیا کہ علم کی پاکیزگی نزتد

مجسم ہو گئی، خطبۂ مسنونہ کے بعد فرمایا کہ "شہر کی گلیوں سے جب جلوس نکل رہا تھا تو میں توبہ واستغفار کرتا رہا کہ کہیں غرورِ نفس میں مبتلا نہ ہو جاؤں" ـــــــ پھر بدایوں کی علمی اور تاریخی عظمت پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالمقتدر قدس سرہٗ کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا۔

مولانا شیروانی مرحوم کی تقریر اُس جلسہ کا ماحصل تھی، علمی نکات کے ساتھ بیان میں شیرینی اور لہجہ میں دل نشینی بھی تھی، اندازِ تقریر بہت سادہ تھا ـــــــ مجھے اُن کا یہ تلفظ اب تک یاد ہے کہ "کو" اُن کی زبان سے "کُو" (KOO) ادا ہوتا تھا، دوآبہ کے قصبات میں عام طور پر بڑے بوڑھے اس لفظ کو اسی طرح بولا کرتے تھے!

پھر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ میں خود حیدرآباد دکن پہونچ گیا، مولانا شیروانی مرحوم کو بارہا دیکھا، جلسوں میں دعوتوں میں، شہر میں آتے جاتے کہ میں راستہ سے گزر رہا ہوں اور شیروانی صاحب اپنی شاندار موٹر میں جارہے ہیں، مرحوم سے تعارف بھی ہوا مگر اُس وقت کا تعارف ہی کیا، میں اس قابل ہی نہ تھا کہ کسی سے میرا تعارف ہو اور وہ مجھے یاد رکھے بہرحال نواب صدر یار جنگ مولانا شیروانی مرحوم مجھے صورت سے ضرور پہچانتے تھے۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم کو بڑے بڑے لوگ "سرکار" کہہ کر مخاطب کرتے تھے، سر (وزیر) حسن مرحوم حیدرآباد ریاست کے ملازم یا وثیقہ دار نہ تھے مگر میں نے اپنے کانوں سے سُنا کہ مہاراجہ بہادر کو وہ "سرکار" کہہ کر خطاب کر رہے ہیں ـــــــ لیکن مولانا شیروانی مرحوم مہاراجہ کشن پرشاد (آنجہانی) کو "مہاراجہ بہادر" اور "آپ" یا "جناب" سے مخاطب کرتے تھے۔

دفتری طور پر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا عہدہ (صدرِ صدور) وزیر (رکنِ بابِ حکومت) کی برابر نہ تھا مگر مرحوم اپنی ذاتی شرافت، خاندانی امارت اور علمی وقار کے سبب عوام وخواص میں وزیروں سے زیادہ مقبول اور معزز سمجھے جاتے تھے، اُس زمانہ میں حیدرآباد دکن میں جو علمی ترقیاں ہوئیں، مولانا شیروانی مرحوم کا بھی اُن میں ہاتھ تھا۔

حیدرآباد دکن میں میلادِ شریف کے جلسوں کا قدیم سے عجیب رواج چلا آتا تھا، کرایہ پر میلاد خوانوں کی ٹولیاں آتیں اور رات بھر چلاتی رہتیں، ان کی وہ کرخت آوازیں، وہ بازاری قسم کی غزلیں اور نظمیں پھر سننے والوں کا پتہ نہیں، گھر کے دو چار نوکر اور ماماؤں کے چھوکرے بیچارے جاگ کر عود بتیاں سلگاتے رہتے، مولانا شیروانی مرحوم کو اللہ تعالیٰ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے کہ ان کی کوشش سے حیدرآباد دکن میں سیرت النبی کے جلسے شروع ہوئے، سکندرآباد (دکن) میں سیرت النبی کا جلسہ سال کے سال جس شاندار پیمانہ پر ہوا کرتا تھا اُس کے لئے آنکھیں ترستی ہیں، ان جلسوں کی خاص بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان میں "قیام" نہ ہوتا تھا۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم سے آخری بار ۱۹۴۳ء میں شرفِ نیاز حاصل ہوا، اس کی تقریب بھی سُن لیجئے، قصبہ چھترہ (ضلع علی گڑھ) میں مشاعرہ تھا اس سلسلہ میں میرا وہاں جانا ہو گیا، مشاعرہ کے دوسرے دن صُبح کے وقت رئیس بھیکم پور کے صاحبزادے تشریف لائے کہ دوپہر کا کھانا ہمارے یہاں کھائیے بات پکّی ہو گئی، وقت مقررہ پر موٹر آئی اور ہم چند شاعر بھیکم پور پہونچے، وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ حبیب گنج یہاں سے بہت قریب ہے اور نواب صدر یار جنگ بہادر ان دنوں یہیں تشریف رکھتے ہیں، اس خبر کو سُن کر میری خوشی کی تو کوئی انتہا ہی نہ رہی، میری تحریک بلکہ اصرار پر حبیب گنج اطلاع بھجوائی گئی کہ ظہر کے قریب چند شعراء کتب خانہ دیکھنے اور شیروانی صاحب سے ملنے کے لئے

آرہے ہیں ——— قلعہ بھیکم پور میں دوپہر کا کھانا کھایا، پھر شعر خوانی ہوئی ——— شعر خوانی کیوں نہ ہوتی، اسی لئے تو شاعروں کو بلایا گیا تھا اِس زمانہ میں ایسا سخی کون ہے جو شاعروں کو دعوت میں بلائے اور شعر سُنے بغیر اُن کو جانے دے۔

دوپہر میں تین بجے کے قریب ہم حبیب گنج پہونچے، نواب صدر یار جنگ مولانا شیروانی مرحوم کتب خانہ میں بیٹھے ہوئے ہمارا انتظار کر رہے تھے، بڑی محبت اور گرم جوشی سے ملے، خود ساتھ ساتھ چل کر کتب خانہ کی سیر کرائی، مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ خوشی کتابوں کو دیکھ کر ہوتی ہے، دیوانوں کی طرح کتب خانہ میں پھر رہا تھا، فرصت بہت ہی کم تھی، "گلہائے حُسن" کی فراوانی تھی، نظارے کو بیچ میچ "جنبیدنِ مژگاں" سے گلہ تھا۔

ہندوستان اور پاکستان میں ریاستوں اور علمی اداروں کے کتب خانے تو بہت ہیں مگر شخصی طور پر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) کے بعد غالباً مولانا شیروانی مرحوم کا کتب خانہ نوادر اور کتابوں کی کثرت کے اعتبار سے اپنا جواب نہیں رکھتا، ایک بہت بڑے عریض و طویل ہال میں سلیقہ کے ساتھ الماریاں رکھی تھیں جو کتابوں سے بھری ہوئی تھیں وقت اجازت دیتا تو میں دو چار مہینے یہیں حبیب گنج میں رہ کر اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق کتب خانہ سے فایدہ اُٹھاتا اور سب سے زیادہ خود صاحبِ کتب خانہ کے فیضِ صحبت سے مستفید ہوتا کہ اُن کی ذات اپنی جگہ خود ایک "انجمن" تھی، مگر اس دُنیا میں ہر آدمی کی ہر تمنا پُوری کہاں ہوتی ہے، غالب نے ساری عمر کے تجربے کے بعد ہی تو کہا تھا:-

؎ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میں نے انھی دنوں علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیف "حیاتِ شبلی" تازہ تازہ پڑھی تھی، جس کا مجھ پر بہت اثر تھا اور اب تک ہے، اس کتاب کا میں نے ذکر کیا اور والہانہ انداز میں کیا تو مولانا شیروانی مرحوم نے خوش ہو کر میری رائے کی تائید کی اور اس سلسلہ میں بہت سی باتیں چھڑ گئیں، مولانا حالی پانی پتی کی "حیاتِ جاوید" کا بھی ذکر آگیا۔

تقریباً سولہ سترہ سال کے بعد مولانا شیروانی مرحوم کو میں نے دیکھا تھا، بہت کمزور اور بوڑھے نظر آتے تھے، کبر سنی نے گراں گوش بھی بنا دیا تھا کان پر ہاتھ رکھ کر بات سُنتے تھے، رنگ کی وہ سُرخی تو جاتی رہی تھی مگر چہرہ پہلے سے زیادہ نورانی ہوگیا تھا

نواب صدر یار جنگ مرحوم و مغفور کی ذات گوناگوں صفات اور متنوع کمالات کا مجموعہ تھی، امارت، خاندانی شرافت، حُسن و وجاہت، شہرت، علم و فضل، اولاد اور سپوت اولاد، غرض اللہ پاک نے سب کچھ دے رکھا تھا، اُن کے یہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی، اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ امارت اور جاہ و دولت کے باوجود نیک سیرت اور پاکیزہ کردار تھے، ادیب، شاعر، مفکر، مصنف، عابد، زاہد غرض سبھی کچھ تھے، اہلِ علم اور ضرورت مندوں کی امداد بھی کرتے مگر اس طرح کہ اس ہاتھ کی اُس ہاتھ کو خبر نہ ہوتی، انگریز کے دور میں زمیندار، اُمرا اور اہلِ دولت خطابات حاصل کرنے کے لئے کیا کیا ترکیبیں لڑاتے تھے اور کیسی کیسی ذلیل کوششیں کیا کرتے تھے مگر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کی حریتِ فکر، وسعتِ ظرف اور بلندیٔ نگاہ کا یہ عالم تھا کہ جب اُن کو پتہ لگا کہ حکومت کی طرف سے اُن کو "شمس العلما" کا خطاب ملنے کی تجویز ہو رہی ہے تو اُنھوں نے خود کوشش کر کے اس خطاب کو رکوایا ——— سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اپنے دور میں اپنی آپ مثال تھے اور اس شخصیت اور جامعیت کے لوگ جلد جلد پیدا نہیں ہوا کرتے ٭ ٭

؎ "علم اپنی جگہ خود "حُسن" ہے!

ابوالعلا ناطق لکھنوی

مولانا حکیم ناطق لکھنوی سے میری ملاقات سب سے پہلے حیدرآباد دکن میں ہوئی، یہ ۱۹۲۹ء کی بات ہے، ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنا ہوتا رہا، بلدۂ حیدرآباد میں وہ اپنے ایک عزیز کے یہاں سالار جنگ کی ڈیوڑھی کے قریب ٹھیرے تھے ——— مہاراجہ سرکشن بہادر کا دربار اہلِ کمال کا مرکز بنا ہوا تھا، فقرا، علما، شعرا، نجومی، جوتشی، پنڈت، خوش نویس، مطرب، مغنی، آرٹسٹ غرض ہر صاحبِ فن کو مہاراجہ بہادر کے دربار میں دیکھا گیا، برامکہ[1] کی معارف نوازی علم پروری اور داد و دہش کے کتابوں میں جو قصے پڑھتے ہیں اُس کی ایک جھلک مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں نظر آتی تھی حکیم ناطق مرحوم کا بھی مہاراجہ بہادر کے یہاں آنا جانا رہتا تھا۔

ایک بار جوبلی ہل پر مہاراجہ بہادر کے اہتمام سے بزمِ شعر و سخن منعقد ہوئی، یہ ایک طرحی مشاعرہ تھا، بلدہ حیدرآباد کے تمام مشہور اور باکمال شاعروں کا جمگھٹا تھا، سب نے غزلیں پڑھیں اور خوب خوب پڑھیں مگر مشاعرہ ناطق لکھنوی کے ہاتھ رہا مطلع تھا:-

اس اہتمام سے مجھ کو فلک وقار کیا
جلا کے خاک کیا خاک کو غبار کیا

اور یہ شعر تو حاصلِ مشاعرہ[2] تھا:-

یہ دو سبب ہوئے لے دل تری تباہی کے
کہ اُس نے وعدہ کیا تو نے اعتبار کیا

سرزمینِ دکن میں بلا کی کشش تھی مگر ...... اب نہیں رہی، اس انقلاب نے وہاں کے زمین و آسمان ہی بدل دیئے ...

سے نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز) جو شخص وہاں گیا، وہیں کا ہو کر رہ گیا، امیر، داغ، جلیل، فانی، طباطبائی، مولانا عبدالقدیر حمادی جیسے اہلِ کمال اُسی خاک میں سو رہے ہیں، مگر عجب اتفاق تھا کہ حکیم ناطق لکھنوی دو تین مہینہ ہی میں وہاں سے گھبرا کر وطن واپس چلے آئے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا حسرت موہانی نے ایک کانفرنس کی تھی اُسی سلسلہ میں میرا کانپور جانا ہو گیا، مولانا حکیم ناطق لکھنوی مرحوم اُن دنوں کانپور ہی مطب کرتے تھے، اُنھوں نے ایک ادبی صحبت میں مجھے یاد فرمایا کئی گھنٹہ تک شاعروں کا جماؤ رہا کانپور میں ناطق صاحب مرحوم کی موجودگی نے شعر و سخن کی محفلوں میں اور گرمی پیدا کر دی، اُن کے شاگرد تسلیم ناطقی نے دائرہ ادبیہ قائم کیا جس کے سال کے سال اچھے خاصے پیمانہ پر جلسے ہوا کرتے تھے، دو تین بار دائرہ ادبیہ کے سالانہ مشاعرے ریڈیو سے بھی نشر ہوئے، تسلیم صاحب کے انتقال کے بعد پھر اُس کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔

حکیم ناطق مرحوم سے آخری بار میری ملاقات ۱۹۴۱ء (غالباً) میں ہوئی، اُن کا قیام اپنے وطن لکھنؤ میں تھا، جناب احمق

---

[1] حکومتِ عباسیہ کے مشہور وزرا کا خاندان

[2] میں نے بھی طرح میں غزل کہی تھی مگر ناطق کے شعروں کے بعد اپنی غزل کے اشعار پیش کر کے اربابِ ذوق کو بے مزہ کرنا نہیں چاہتا۔

پھپوندوی میرے ہمراہ تھے، جاڑوں کا زمانہ تھا، ناطق صاحب رنگین لحاف میں لپٹے پٹائے پلنگ پر لیٹے تھے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ ملے، تھوڑی دیر تک حیدرآباد دکن کی پچھلی صحبتوں کا تذکرہ رہا، پھر مجھ سے کئی غزلیں سنیں اور میرے اصرار پر اپنا کلام بھی سنایا حکیم صاحب کا ان دنوں نواب صاحب رام پور کے دربار سے تعلق تھا ــــ بس وہ دن ہے اور آج کا دن ہے پھر اُن سے ملنا نہ ہوسکا، اخبار میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور میں تلملاکر رہ گیا۔

حکیم ناطق مرحوم اس انداز کے شعر کہتے تھے :-

اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح　　میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

میکشو! مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے　　یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

مگر افسوس ہے کہ دنیا نے اُن کی قدر نہ پہچانی، مانا کہ وہ خود شہرت سے گریز کرتے تھے اور نام و نمود سے بھاگتے تھے مگر یہ تو اہلِ نظر اور اربابِ قلم کا کام تھا کہ ناطق مرحوم کے کمال کو منظرِ عام پر لاتے ــــ میرے پاس تین چار مہینے ہوئے چٹگانگ سے ایک خط آیا تھا کہ کوئی صاحب ناطق مرحوم کا دیوان چھپوا رہے ہیں، اُن کے لکھنے پر میں نے ایک مختصر سا "پیش لفظ" بھی بھیج دیا تھا، پھر کوئی خیر خبر نہیں ملی کہ وہ ارادہ ابھی تک قلب و ذہن ہی کی زینت بنا ہوا ہے، یا عملی مراحل سے گزر رہا ہے۔

حکیم ناطق لکھنوی مزاج اور طبیعت کے اعتبار سے حکیم مومن خاں مومن دہلوی سے بہت کچھ ملتے جلتے تھے، عشق و رنگینی مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، فنِ طب اور دوسرے علوم میں دستگاہ رکھتے تھے، اُردو شاعروں میں اتنے پڑھے لکھے شاعر بہت ہی کم گزرے ہیں ــــ وہ شاعر ہی نہیں ایک اچھے تنقید نگار بھی تھے!

اُردو زبان کی "منظوم تاریخ" حکیم ناطق مرحوم کی غیر فانی یادگار ہے، اتنی شگفتہ اور مستند تاریخی نظم آج تک کسی نے نہیں کہی، جب یہ نظم شائع ہوئی تو اُس کے حاشیہ پر حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی جائے پیدائش "پٹیالہ" لکھی ہوئی تھی، میں نے ناطق مرحوم کو توجہ دلائی کہ یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے حضرت امیر خسرو پٹیالہ (مشرقی پنجاب) میں نہیں پٹیالی (یو۔پی) میں پیدا ہوئے تھے، جو قائم گنج ضلع فرخ آباد کے پاس ایک چھوٹا سا قصبہ ہے،

حکیم ناطق مرحوم اپنے کلام کو حفاظت سے نہ رکھتے تھے بے نیازانہ طبیعت پائی تھی، مجھے اندیشہ ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک یقین ہے کہ اُن کی بعض غزلیں دوسروں نے ہتھیالیں اور اب جبکہ خود شاعر دنیا میں نہیں رہا یہ چوری کھلے تو کس طرح کھلے! بہرحال یاروں کی دست بُرد سے جو کلام باقی رہ گیا ہے اُسے تو جلد سے منظرِ عام پر آنا چاہیئے!

سر شیخ عبدالقادر

سر شیخ عبدالقادر مرحوم اُن اکابر میں سے تھے، جن کے دیکھنے اور ملنے کا مجھے خود اشتیاق تھا، مگر ہر بات اور ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہے، آدمی ہزار چاہے اور لاکھ کوشش کرے، وقتِ معین سے پہلے کچھ ہو نہیں سکتا، اب سے کوئی بارہ برس پہلے کا ذکر ہے، کانپور میں اُردو کانفرنس ہوئی تھی، مشاعرہ بھی تھا، کانفرنس کے صدر سر عبدالقادر مرحوم اور مشاعرہ کے صدر نواب جمشید علی خاں رئیس باغپت تھے، میں اُن دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا، اسی کانفرنس اور مشاعرے کے لئے ایک ہزار میل کا سفر کرکے کانپور آیا۔

میں کانفرنس کے پہلے اجلاس میں شریک نہ ہوسکا، کانپور دوسرے دن پہونچا دوسرے اجلاس میں چند مقالے پڑھے گئے، جن میں مسعود علی ذوقی کا مقالہ "فسانۂ عجائب" پر بہت خوب تھا، سب نے پسند کیا، میں نے "اردو"عـ۵ پر نظم پڑھی، سر عبدالقادر کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے، جلسہ کے بعد بڑے تپاک سے ملے جیسے وہ مجھے بہت دنوں سے جانتے ہیں، میں نے دریافت کیا یہاں کانپور میں کہاں قیام ہے ؟ فرمایا ایک انگریزی ہوٹل میں ٹھیرا ہوا ہوں اور "زر میخورم" والا مضمون ہے ... ... "!

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب، مولوی سید محی الدین صاحب ایم۔ اے (سابق پرنسپل اورنگ آباد کالج) اور اس خاکسار کا قیام مولوی سید عبدالجامع صاحب کے مکان واقع افتخار آباد میں تھا، جلسہ گاہ سے سواری میں روانہ ہوئے تو راستہ میں باتوں کا ایسا سلسلہ چھڑا کہ سر عبدالقادر مرحوم ہوٹل جانے کے بجائے سید محمد عبدالجامع صاحب کے مکان پر اتر گئے، دوپہر کا کھانا سب کے ساتھ مل کر کھایا، کھانے کے بعد، شام کی چائے کے وقت تک شعر و ادب کے موضوع پر مسلسل گفتگو ہوتی رہی، شعر خوانی بھی ہوئی، ادبی لطیفے بھی رہے اور علمی مسائل کا بھی ذکر آیا۔

شب میں مشاعرہ ہوا، سر عبدالقادر مرحوم جس کانفرنس کی صدارت کے لئے تشریف لائے تھے وہ کانفرنس ختم ہوچکی تھی مگر مشاعرہ سننے کے لئے رُک گئے، دسمبر کا مہینہ تھا، کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے، سامعین کے لئے کرسیوں کا انتظام اور شاعروں کے لئے اسٹیج پر قالین کا اہتمام تھا، سر عبدالقادر مرحوم اسٹیج ہی پر فروکش تھے، ایک "خاتون" نے دو تین بار مجھے پان دیا تو میری طرف جھک کر آہستہ سے بولے "تم پان نہیں روح کھا رہے ہو" !

اس واقعہ کے دوسرے سال میرا لاہور جانا ہوا، میں نے سر عبدالقادر مرحوم کو خط بھیجا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں کوئی فرصت کا وقت بتایئے، مرحوم نے جو جواب دیا وہ مجھے مغرب کے بعد ملا، اس میں لکھا تھا کہ شام کی چائے میرے ساتھ آکر پیجئے، میں نے خط لانے والے کے ہاتھ اسی وقت جواب بھیجا کہ دعوت کا وقت تو گزر چکا، اب آپ سے ملاقات کب ہوسکے گی؟ کمال محبت کے ساتھ جواب دیا "کاش ! میرے خط کا جواب دینے کے بجائے آپ خود چلے آتے، یہاں بہت سے آپ کے کلام کے مشتاق جمع تھے مگر اب ان کا ہاتھ آنا ممکن نہیں، میں صبح کی ٹرین سے لائل پور جا رہا ہوں شب کا کھانا میرے یہاں ضرور کھایئے۔

نئی جگہ کا پتا لگانا میرے لئے بڑا دشوار ہے، طبیعت میں کیا کیا جھنجلاہٹ پیدا ہوتی ہے، لوگوں سے پتہ پوچھتے ہوئے شرم سی آتی ہے، پہلے اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کی رہنمائی کا احسان لئے بغیر ہی منزلِ مقصود تک پہونچ جاؤں اور جب اس کوشش میں .... کامیابی نہیں ہوتی تو رُوۓ سخن وا کرنی ہی پڑتی ہے —— مگر سر عبدالقادر مرحوم کی کوٹھی کا پتہ کسی سے پوچھے بغیر ہی مل گیا، ٹمپل روڈ پر ان کی کوٹھی کے دروازے پر تانگہ والے نے جا کر اُتار دیا۔

بڑی محبت اور بزرگانہ شفقت کا اظہار فرمایا، ذائقہ دار کھانوں سے تواضع کی گئی، پھر شعر خوانی ہوئی اور آخر میں "نعتیہ سلام" مجھ سے سُنا، میں نے کہا اپنی کوئی تصنیف مجھے پڑھنے کے لئے دیجئے، فرمایا "سفرنامہ" کا صرف ایک نسخہ رہ گیا ہے" میں نے عرض کیا کہ آپ مجھ پر اعتماد فرما کر دیدیجئے میں دو تین دن میں پڑھ کر واپس کر دوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا میں نے ان کے سفرنامہ کو "نشاط ہوٹل" میں پڑھ کر ان کے پاس واپس بھیجدیا۔

عـ۵ موجِ کوثر کی طرح نرم و رواں ہے اُردو طبعِ دشمن پہ مگر پھر بھی گراں ہے اُردو

آخری بار حیدرآباد دکن میں نیاز حاصل ہوا، وہاں "لاکانفرنس" (Law conference) تھی، سر عبدالقادر مرحوم ایک اجلاس کے صدر تھے، ہندوستان کے چوٹی کے قانون داں جمع ہوئے تھے، اُسی زمانہ میں وہاں ایک اُردو کانفرنس بھی منعقد ہوئی اور حیدرآباد دکن میں پہلی بار اشتراکیت زدہ "ترقی پسندوں" کو قدم جمانے کا موقعہ ملا، مجھ سے یہ گروہ ہمیشہ سے خفا رہا ہے اور ہے، اُسے خفا ہونا ہی چاہیئے کہ میں اُن کے مسلک کا شدید مخالف ہوں، کانفرنس سے ایک دن پہلے میرے پاس دعوتی رقعہ بھیجا گیا، اور وہ بھی شاید کسی کے کہنے سننے سے! میں نہ کانفرنس میں گیا اور نہ مشاعرہ میں شرکت کی۔

مشاعرہ جس رات کو ہوا ہے، اُس کے دوسرے دن صبح کے وقت سر عبدالقادر مرحوم سے میں ملنے کے لئے گیا، باغِ عام کے سامنے سرکاری گیسٹ ہاؤس میں اُن کا قیام تھا، ایک صاحب جو اس کانفرنس کے بانیوں میں تھے، اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ مشاعرے میں کیوں نہیں آئے" میں خاموش ہوگیا، اُنھوں نے پھر سوال کیا اس پر سر عبدالقادر مرحوم نے فرمایا "آپ لوگوں نے اِن (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) کو بُلایا نہ ہوگا" اُن صاحب نے جواب دیا "اِن کو دعوت نامہ بھیجا گیا تھا" سر عبدالقادر مرحوم نے میری طرف دیکھا اور ذرا سے توقف کے بعد فرمایا "تو آپ نے وہ ذرائع اختیار کئے ہوں گے جو ان کے بلانے کے لئے کرنے چاہئیں ... " اور پھر میرے بارے میں بہت کچھ کہا —— میں نے محسوس کیا کہ سر عبدالقادر مرحوم کس قدر ذہین، معاملہ فہم اور نفسیات کے ماہر ہیں کہ میں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں کہا اور وہ معاملہ کی نوعیت کو اس طرح سمجھ گئے جیسے یہ واقعہ خود اُن پر گزرا ہے۔

سر عبدالقادر مرحوم لندن میں انڈیا کونسل کے ممبر بھی رہے ہیں، میں نے اس سلسلہ میں کچھ دریافت کیا تو بولے کہ وہ تو بس ایک اعزاز تھا، جو تنخواہ ملتی تھی اُس میں گزر کہاں ہوتی تھی، لندن کی زندگی، پھر عہدے اور پوزیشن کا رکھ رکھاؤ، مجھے اپنی زمین بیچ کر اس عہدے کو نباہنا پڑا —— اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سر عبدالقادر کی مالی حالت زیادہ اچھی نہ تھی، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ "قبر کی حالت مردہ ہی جانتا ہے" باہر کے لوگ تو بس قیاس ورائے کے تیر تکے لڑاتے رہتے ہیں!

سر عبدالقادر مرحوم نے اپنی ذاتی قابلیت اور کوشش سے ترقی کی منزلیں طے کیں، ذمہ داری اور عزت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، اُردو ادب کے وہ نہایت مخلص خدمت گزار تھے، اُن کے رسالہ "مخزن" سے اُردو لٹریچر کی تاریخ وابستہ ہے، مرحوم کی نثر کا انداز بہت سادہ اور سلیس تھا، شاعروں اور ادیبوں کے بڑے قدرداں تھے، بعض مشہور شاعروں کی سر عبدالقادر مرحوم نے زندگیاں بنا دیں، ہونہار نوجوانوں کو اُبھارنے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرنے کا مرحوم میں بے پناہ جذبہ تھا، اُردو زبان کی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہ سکتی ؛

حضرتِ سیماب اکبرآبادی

حضرتِ سیماب اکبرآبادی مرحوم سے جے پور میں پہلی بار ملاقات ہوئی، یہ سنہ ۱۹۳۴ء[ف] کا واقعہ ہے جب جے پور میں بہت

ف اس مضمون میں جو تاریخی سنین درج کئے گئے ہیں، اُن میں غلطی بھی ہوسکتی ہے، میرے پاس ان واقعات کی کوئی ڈائری لکھی ہوئی نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ حافظہ میں محفوظ ہے اور اُسی سے کام لے رہا ہوں، (م - ق)

بڑے پیمانہ پر آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا، ملک کے قریب قریب تمام مشاہیر شعرا جمع تھے، اس انداز کے مشاعرے پھر دو چار ہی دیکھنے میں آئے، سر تیج بہادر سپرو کے داماد مسٹر امرناتھ اٹل مشاعرے کے صدر تھے اور انھی کی سرپرستی مشاعرے کی کامیابی کی ضامن تھی۔

حیدرآباد دکن سے فانی بدایونی، امجد حیدرآبادی، آزاد[۵] حیدرآبادی اور راقم الحروف اس مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے اور آئے کیا تھے سر اکبر حیدری مرحوم نے ہمیں بھیجا تھا، حضرت فانی کے علاوہ باقی تمام شاعروں نے "یادگار" میں قیام کیا، حضرت سیماب مرحوم کا بھی یہیں قیام تھا ـــــــ شاعرے کی طرحی غزلوں میں سب سے زیادہ کامیاب مطلع سیماب مرحوم ہی کا تھا

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

دوسری شب میں نظمیں پڑھی گئیں، میں نے "صبحِ بہاراں" اسی مشاعرے کے لئے کہی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ میں نے نظم جس وقت پڑھی ہے تو سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

اس مشاعرے کے دوسرے سال حضرت سیماب مرحوم سے ریاست ٹونک میں ملاقات ہوئی، نواب سعادت علی خاں مرحوم والی ٹونک کو شاعری سے بہت دلچسپی تھی، وہ کہتے تھے کہ میں مضطر خیرآبادی کا شاگرد ہوں اور یہ اشعار نواب صاحب مرحوم ہی سے منسوب ہیں!

ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں	یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں
انھیں دیکھو وہ رخصت ہو رہے ہیں	مجھے دیکھو میں رخصت کر رہا ہوں

شعراء کا قیام ڈاک بنگلہ میں تھا، اور ریاست کی طرف سے میزبانی کا انتظام تھا، کئی دن قیام رہا اور حضرت سیماب مرحوم سے ملنے، بات چیت کرنے اور قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، نواب صاحب ٹونک کے یہاں ایک مشہور شاعر کے تملق اور چاپلوسی کا عجیب منظر دیکھنے میں آیا جس کا میں یہاں تذکرہ مناسب نہیں سمجھتا۔

اس کے بعد متعدد مقامات پر مشاعروں، کانفرنسوں، دعوتوں اور ادبی صحبتوں میں حضرت سیماب مرحوم سے نیاز حاصل ہوتا رہا میں اظہار رائے میں فطری طور پر بے باک واقع ہوا ہوں، حق بات زبان پر آتی ہے تو پھر رکتی نہیں، اب سے کوئی سات سال پہلے کی بات ہے، صابر صاحب دہلوی کی لڑکی کی شادی تھی، حضرت سیماب بھی اس تقریب میں شریک تھے، فلم کمپنیوں کا ذکر چھڑ گیا، حضرت سیماب نے فرمایا کہ فلم انڈسٹری میں ایک انقلاب کی ضرورت ہے، میں نے ایک اسٹوری مرتب کی ہے اور اس کے مکالمے اور گانے بھی خود ہی لکھے ہیں، اور اس سلسلے میں فلمی گانوں کی دھنوں (TUNES) کا بھی ذکر آیا، مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا مولانا! فلمی لائن سے تعلق آپ کو زیبا نہیں، یہ آپ کے رتبہ سے فروتر ہے، میں خود اس لغویت میں مبتلا رہ چکا ہوں اور اس حماقت پر آج تک متاسف ہوں ـــــــ حضرت سیماب نے میری بات کا برا نہیں مانا بلکہ کچھ سوچ میں پڑ گئے!

---

[۵] حکیم آزاد انصاری نہیں یہ آزاد حیدرآباد دکن کے ایک شاعر تھے جو اکبر الہ آبادی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔

حیدر آباد دکن سے جے پور جاتے ہوئے ایک بار میں حضرت سیماب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک دن کے لئے ٹھیرا بھی تھا، بڑی تواضع سے پیش آئے، صبح کے وقت ان کا معمول تھا کہ نماز پڑھ کر شہد اور انڈے کا ناشتہ کرتے اور تھوڑی دور ٹہلنے کے لئے نکل جاتے پھر میں نے یہ منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ قصر الادب میں تکیہ کے سہارے تخت پر جھکے ہوئے بیٹھے ہیں، شاگردوں کی، غزلیں اور نظمیں پھیلی ہوئی ہیں اور اصلاح دیتے چلے جاتے ہیں۔

جناب اعجاز صدیقی نے پہلے سے سیٹ ریزرو کرادی تھی، حضرت سیماب مرحوم اور میں جے پور تک ہم سفر رہے، سیماب صاحب کا اور میرا یہ پہلا اور آخری سفر تھا، یہاں تک کہ اُنھوں نے سفر آخرت اختیار کرلیا اور میں اس کی تیاری میں مصروف ہوں۔

پاکستان میں آنے کے بعد حضرت سیماب مرحوم سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں، آخری مشاعرہ اُن کے ساتھ مئی ۱۹۵۰ء میں پڑھا، راولپنڈی کے ریلوے انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے یہ مشاعرہ منعقد ہوا تھا، مجھ سے فرمانے لگے "آپ نے راولپنڈی آنے کی مجھے اطلاع نہیں دی، میں بھی آپ کے ساتھ ہی آتا" میں نے عرض کیا اب آپ کا کیا پروگرام ہے، فرمایا "لاہور ایک ضرورت سے جانا ہے" میں نے کہا "میں کوہ مری اور پشاور جاؤں گا، دو مسافروں کے پروگرام میں جب اتنا اختلاف ہو تو وہ ہم سفر کیسے ہوسکتے ہیں۔۔۔"

حضرت سیماب مرحوم پر فالج کے دو حملے ہوئے، پہلے حملہ کے بعد وہ اچھے ہوگئے مگر دوسرا حملہ جان لیوا ثابت ہوا، آواز تک متاثر ہوگئی تھی، اُلجھ اُلجھ کر باتیں کرتے تھے، مگر اُن کا دماغ آخر وقت تک کام کرتا رہا، اس بیماری کے دوران میں بھی اُنھوں نے غزلیں کہی ہیں ——— یہ شعر اسی زمانہ کی یادگار ہے!

چلو ملتان یا لاہور سیماب
کراچی کی ہوا نے مار ڈالا

اور شاعر کا کہنا صحیح ثابت ہوا، کراچی کی آب و ہوا نے صحیح مچ اُسے مار کر چھوڑا، یہاں تک کہ جس کے شانے شعر و ادب کے بارگراں کو اُٹھائے ہوئے تھے اُس کے جنازہ کو مجھ سخت جان نے کاندھا دیا۔

حضرت سیماب مرحوم نے نظم و نثر کی چھوٹی بڑی کم و بیش ایک سو کتابیں یادگار چھوڑیں، نثر بھی خوب لکھتے تھے، مشاعروں کے صدارتی خطبے پڑھنے کی چیز ہیں، سیماب کی ذات اپنی جگہ شعر و سخن کی ایک یونی ورسٹی تھی، داغ کے بعد اتنے بہت سے شاگرد شاید ہی کسی شاعر کو نصیب ہوئے ہوں ——— اُردو زبان کے وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ... "ادارۂ تصنیف و اصلاح" قایم کیا جہاں اُجرت پر ناول، کتابیں، نظمیں، غزلیں اور سہرے لکھے جاتے تھے، مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک اشتہار میں "دیوان" کی اُجرت پانسو روپے درج تھی، حضرت سیماب کی شاعرانہ قوتیں دوسروں پر کافی صرف ہوئیں کاش! وہ تمام کی تمام اُنھی کے کام آتیں۔

پُرگوئی اور زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ نثر کی طرح کاغذ پر شعر لکھتے جاتے، وہ دس بارہ منٹ میں ایک غزل کہہ لیا کرتے تھے، اُن کا دماغ کثرتِ شعر گوئی کے سبب "شعر سازی" کی سچ مچ ایک مشین بن گیا تھا، ایک بار رسالہ "شاعر" سارے کا سارا منظوم شائع کیا یہاں تک کہ اشتہارات بھی نظم میں چھاپے گئے، مثنوی مولانا روم کے ساتوں دفتروں کا منظوم ترجمہ کیا قرآن پاک کے ترجمہ کو نظم کا جامہ پہنایا، ہزاروں غزلیں نظمیں، رباعیاں اور قطعے کہے، اپنے لئے

جو کچھ کہا اور جو دوسروں کو کہہ کر دیا، اُس کی تعداد دو ڈھائی لاکھ شعروں سے کیا کم ہوگی؟

حاجی محمد مصطفیٰ خاں صاحب لکھنوی نے گزشتہ سال چند شعراء کو کھانے پر بلایا تھا، مہینہ کے مہینہ ایک مخصوص شعری اجتماع کے لئے مشورت کرنی مقصود تھی، بعض حضرات نے یہ رائے دی کہ طرحی مشاعرہ ہونا چاہیئے، حضرت سیماب کو خاص طور پر اصرار بلکہ شدید اصرار تھا کہ صرف طرحی غزلیں پڑھی جائیں، میں نے کہا میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں طرح کی پابندی ٹھیک نہیں یوں کہنے کو شعر ہر وقت کہے جاسکتے ہیں مگر حقیقی شاعری کے لئے طبیعت میں "آمد" ضروری ہے اور "آمد" اختیاری چیز نہیں ہے، شاعری یہی ہے کہ شعر خود شاعر پر طاری ہو نہ کہ شاعر اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کرے، "آورد" کی شاعری ایک قسم کی صنعت "اور کاریگری" ہے —— دو تین صاحبوں نے میری تائید بھی کی، مگر حضرت سیماب اپنی رائے میں پختہ رہے اور یہی کہتے رہے کہ "طرح" ضرور دی جانی چاہیئے۔

حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم نے تقریباً پندرہ سال سے "بادہ و مینا" کے استعاروں کو ترک کر دیا تھا، غالب کی یہ رائے تھی:-

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

مگر سیماب نے "بادۂ و ساغر" کے بغیر ہی "مشاہدۂ حق" پر گفتگو کر کے دنیا کو دکھا دی۔

حضرت سیماب مرحوم نے نیاز فتحپوری مدیر "نگار" کے "مالہ و ماعلیہ" کا جواب لکھنا شروع کیا تھا مگر اُن کے انتقال کے سبب یہ کام ادھورا رہ گیا، مرحوم کے شاگردوں میں جناب اکمل مظفر نگری اس کام کو حُسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں کاش! وہ اس طرف توجہ کر سکیں ٭

حضرت صفی لکھنوی

حضرت صفی لکھنوی کو میں نے پہلی بار ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، دیکھنے سے میرا مطلب دید کا نظارہ ہے، ملاقات اور بات چیت نہیں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان ابن سعود کی فوجیں یلغار کرتی ہوئیں مکہ معظمہ تک پہونچ چکی تھیں، حجاز میں سعودی حکومت قایم ہو چکی تھی اور شریف حسین حجاز سے اپنا بوریا بستر باندھ کر قبرص پہونچ چکے تھے، شریف حسین سے تمام عالم اسلام ناراض تھا مگر حجاز میں مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ سعودی فوجوں نے جو نارو اسلوک کیا تھا اُس سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پھیلی ہوئی تھی —— لکھنؤ میں بہت بڑے پیمانہ میں حجاز کانفرنس ہوئی، صالح بھائی بڑودہ والے اس کے صدر تھے ملک کے قریب قریب تمام مسلمان عمائد، علما، اکابر اور مشاہیر جمع تھے، شیعوں کے مجتہد مولانا آقا حسین صاحب اور مولانا نجم الحسن صاحب کے دوش بدوش مولانا شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا عبدالقدیر بدایونی کو بھی دیکھا گیا، مولد النبی اور جنت البقیع بہرحال سب کے نزدیک محترم ہیں —— اس کانفرنس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی شریک تھے، بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں، سید جالب دہلوی مرحوم (مدیر روزنامہ ہمدم و ہمت) رپورٹر کی حیثیت سے ڈائس کے فرش پر بیٹھے ہوئے جلسہ کی کارروائی لکھتے جاتے تھے۔

اسی حجاز کانفرنس میں صفی لکھنوی مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں نظم سنائی، جس کا ایک ٹیپ کا بند مجھے یاد رہ گیا

ہے:- آتشی ہے گرد مولد خیر الانام سے اے تیغ انتقام نکل آ نیام سے

۱۹۲۷ء میں دوسری بار حضرت صفی لکھنوی کو بہار ادب (لکھنؤ) کے ایک مشاعرے میں دیکھا جو شہنشاہ حسین رضوی کے مکان میں منعقد ہوا تھا، مدرسۃ الواعظین کے پرنسپل مولانا سید سبط حسن صاحب نے "شاعری" پر تقریر کی اور پھر جو شاعرہ شروع ہوا ہے تو صبح کے دس بجے جاکر ختم ہوا، حضرت عزیز لکھنوی کو بھی اسی مشاعرہ میں دیکھا اور سنا ان کی طرحی غزل کے دو شعر اب تک یاد ہیں۔

اے نگاہِ شوق! تو نے کر دیا رُسوا مجھے اُس نے دیکھا اور اُسی انداز سے دیکھا مجھے

قصۂ عہد جوانی پوچھتے کیا ہو عزیز
آگیا تھا اتفاقاً نیند کا جھونکا مجھے

میں اُن دنوں لکھنؤ میں اپنے ایک عزیز کے یہاں صدر بازار میں ٹھیرا ہوا تھا، اخبار میں مشاعرے کی اطلاع پڑھ کر تماشائی کی حیثیت سے چلا گیا، شاعرے میں پہلی بار لکھنؤ کی وہ گوریاں کھائیں جن میں لوگوں کی جگہ لوہے کی کیلیں لگائی جاتی ہیں، لکھنؤ کی نفاست اور نزاکت کا میں معترف ہوں مگر یہ "فولادی قسم کی جدت" پسند نہ آئی۔

تقسیم ہند سے تین سال قبل میرٹھ میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا، مشاعرہ گاہ کے چاروں طرف شاعروں کے ٹھیرنے کے لئے خیمے لگائے گئے تھے، پنڈال، خیمے اور دروازوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ "مشاعرہ سٹی" بنایا گیا ہے، شعراء کی تعداد ایک سو کے قریب تھی، ہندوستان کے ایک ایک گوشہ سے مشہور شعراء کھنچ کر آگئے تھے، دو نشستیں ہوئیں ایک کی صدارت سر سیتارام (سابق انڈیا ہائی کمشنر) نے کی اور دوسرے اجلاس کے صدر سید رضا علی مرحوم تھے، میرٹھ کمشنری کے انگریز کمشنر نے بھی شاعرے میں شرکت کی، اسی شاعرے میں پہلی اور آخری بار حضرت صفی لکھنوی سے ملاقات ہوئی جناب صفی لکھنوی کی شاعری قدیم اور جدید طرز کا سنگم ہے، اُن کی قومی نظمیں کافی شہرت پا چکی ہیں یہ اُنھی کا شعر ہے:-

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی وہ اُبھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

حضرت صفی لکھنوی نغز گو شاعر ہی نہیں مستند اُستاد بھی تھے اُن کے شعر زبان کے لئے "سند" کی حیثیت رکھتے ہیں، صفی کے دم سے سچ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کی عزت قائم تھی —— اور یہ میں نے "قائم تھی" کیا کہا، اب بھی قائم ہے کہ صفی دنیا سے چلے گئے مگر اُن کا کلام زندہ ہے ٭

مولانا تاجور نجیب آبادی

مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کی نگرانی میں جب ماہنامہ "شاہکار" نکلتا تھا اُسی زمانہ میں اُن سے میری خط و کتابت تھی، میں اُن دنوں حیدرآباد دکن میں مقیم تھا، اُن کے انکسار کا یہ عالم تھا کہ ایک بار مجھے خط میں لکھا:-

"اپنی شاعری کی زکوٰۃ بھیجا کیجئے"

اور مجھے یہ الفاظ پڑھ کر پسینہ سا آگیا، فوراً تازہ غزل اُن کی خدمت میں بھیجدی۔

مولانا تاجور سے ملاقات ۱۹۴۲ء میں ہوئی، لائل پور کاٹن ملز میں مشاعرہ تھا، مولانا مرحوم نے بھی اُس میں شرکت فرمائی اور غزل بھی پڑھی، میں نے اندازہ لگایا کہ اُن کی طبیعت میں "کم آمیزی" کا رنگ غالب ہے، ایک آدھ ملاقات

ہیں نئے آدمیوں سے بے تکلف نہیں ہوجاتے۔

انگریز کے آخری دور میں مولانا تاجور کو "شمس العلماء" کا خطاب عطا ہوا تھا، اُن کے دوستوں اور جاننے والوں نے مبارکباد کے تار روانہ کئے اور خط لکھے مگر میرا خط سب سے مختلف تھا، میں نے سرکاری خطاب پر اُن کو مبارکباد نہیں دی غالباً اسی لئے میرا خط شائع نہ ہو سکا۔

مولانا تاجور مرحوم کو نظم اور نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی، لیکن ان کی یہ ادبی خدمات آخر میں "پروفیسر اور ممتحن" کی شخصیت میں ضم ہو کر رہ گئیں، وہ نجیب آباد (یو۔پی) کے رہنے والے تھے مگر لاہور ہی کو اپنا وطن بنا لیا اور اس خاک سے اتنی محبت تھی کہ اسی کا پیوند ہو کر رہ گئے، انھوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی رہنمائی کی، اُن کو مخالفتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا لیکن اُردو کی خدمت کا جذبہ اپنا کام کرتا رہا۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

تقسیم ہند سے پہلے پنجاب مسلم ایسوسی ایشن بمبئی کے زیر اہتمام سال کے سال یوم اقبال بڑے شاندار پیمانہ پر منایا جاتا تھا، تین دن تک خوب جشن رہتا تھا، ایک دن تقریریں، دوسرے دن قوالی اور تیسرے دن مشاعرہ ہوتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ڈاکٹر تاثیر مرحوم سے میری ملاقات بمبئی ہی میں ہوئی، اُن کو لاہور سے یوم اقبال میں تقریر کرنے کے لئے بُلایا گیا تھا، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر تاثیر کے علاوہ میں نے بھی تقریر کی، اس کے بعد سرگودھا کے مشاعرے میں ملنا ہوا اور آخری بار ملاقات گورنر جنرل ہاؤس (کراچی) کی ایک ادبی صحبت میں ہوئی۔

ڈاکٹر تاثیر مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، طبیعت بہت ذہین اور اخاذ پائی تھی، نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج تھے، جس محفل میں بیٹھتے چٹکلوں اور لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑ کر بزم کو باغ و بہار بنا دیتے، وہ ایک اچھے مقرر، شگفتہ نگار انشا پرداز اور خوش بیان شاعر تھے، لاہور میں اُن کے دم سے شعر و ادب کی چہل پہل تھی، چند دن تک وہ نام نہاد "ترقی پسندی" سے بھی متاثر رہے، مگر پھر غالب و اقبال کی راہ پر آگئے لیکن کبھی کبھار اس بجھی ہوئی آگ کی ایک آدھ چنگاری اُبھر آتی ــــــ غزل میں ایسے ایسے جاندار اور معرکے کے شعر کہے ہیں:-

داورِ حشر! مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

مولانا اظہر امرتسری مرحوم کی ادب و صحافت کی خدمات بھی شاندار ہیں، اُن کی بعض تاریخی کتابوں نے اُردو ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر دیا ــــــ اور میرے مخلص دوست محمد عالم صاحب مرحوم ایڈیٹر "عالمگیر" نے بھی اُردو پریس، اُردو اخبار، اُردو رسالہ اور اُردو پبلشنگ ہاؤس کے پروپرائٹر اور ناشر کی حیثیت سے پچیس سال تک خدمت کی، وہ معاملے کے بہت کھرے اور صاف تھے۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں آخری بار کوئٹہ میں ملاقات ہوئی اور اب عالم ارواح ہی میں ملنا ہو سکے گا۔

درسِ عبرت

جن مشاہیر اور بزرگوں کا اوپر ذکر کیا ہے، وہ انسان تھے فرشتہ نہ تھے اُن کی زندگیوں میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں لیکن ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ مرنے والوں کا بھلائی کے ساتھ ذکر کرو، ہم اللہ تعالیٰ سے ان سب کے لئے مغفرت طلب کرتے ہیں، اللہ پاک اُن سب کی قبروں کو ٹھنڈی رکھے اور قیامت کے دن رسُول اللہ کی شفاعت اور خدا کی رحمت و مغفرت اُنھیں نصیب ہو۔

اس دُنیا میں جو آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن جانا ضرور ہے، موت برحق ہے اور اس عالم آب و گِل سے جُدائی یقینی ہے، موت ٹل نہیں سکتی، ملک الموت آہنی قلعوں میں بھی دبے پاؤں پہونچ جاتا ہے، جو یہاں سے جاچکے ہیں، ہم بھی اُن کے پیچھے آرہے ہیں، جانا بہر حال ناگزیر ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے۔

شہرتیں، عزتیں، ناموریاں، عہدے، خطابات، مال و دولت سب کے سب یہاں دُنیا ہی میں رہ جاتے ہیں ان میں سے ایک چیز بھی ساتھ نہیں جاتی، کام آنے والی چیز صرف "صالح اعمال" ہیں، مرنے کے بعد کسی شخص کے قدم قدم پر مجسمے نصب ہو جائیں پھر بھی یہ شہرت اور ہر دلعزیزی اُسے بخشوا نہیں سکتی۔

غافل انسان جاہ و شہرت اور عیش و دولت کی پرچھائیوں کے پیچھے بھاگا بھاگا پھرتا ہے، اوّل تو یہ پرچھائیاں ہاتھ ہی کم آتی ہیں اور ہاتھ آ بھی جائیں تو پرچھائیوں کا اعتبار کیا؟ ادھر شام ہوئی اور پرچھائیاں یہ جا وہ جا! یہ دنیا تو سچ مچ سرائے فانی ہے، سچے موتی جن کے لئے یاقوت کی کھرل میں پیسے جاتے تھے، وہ زمین کے نیچے خاک پھانک رہے ہیں، جامِ جمشید کو بھی زمانہ نے توڑ ڈالا، سکندر کا تخت بھی مٹی میں مل گیا، گنجِ شایگاں کے بھی انقلاب نے دھوئیں اڑا دیئے، موت نے "طرفِ کلاہ کے" کو ہی نہیں "چینِ قبائے قیصر" کو بھی مٹا دیا ——— جب دنیا کی ہر حقیقت "شعلۂ مستعجل" ہو تو پھر آدمی کس بات پر فخر اور اعتماد کرے۔

اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے کہ وہیں سدا رہنا ہے، بدبخت اور احمق ہے وہ جس نے اِس دُنیا کے لئے اپنی آخرت برباد کر دی، ہر موت اہلِ بینش کے لئے درسِ عبرت ہے، جنازے اور قبریں دیکھ کر اور موت کی خبریں پڑھ کر خود اپنی موت یاد آنی چاہیئے کہ ہم پر بھی یہ عالم گزرنے والا ہے، زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، کیا خبر کہ سانس اندر جا کر واپس آئے یا نہ آئے، ہم نے بات کرتے اور ٹھوکر لگتے لوگوں کا دم نکلتے دیکھا ہے، موت کا فرشتہ آواز دیکر نہیں آتا اس لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے کہ نہ جانے کس وقت قاصدِ اجل آپہنچے!

وہ کہ جن کی ذات عالمین کے لئے باعثِ رحمت تھی اور جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا تھا دن میں ستّر بار موت کو یاد کیا کرتے تھے اور اُن کے عاشقِ زار غلاموں اور جاں نثار اُمتیوں کا یہ عالم ہے کہ موت کا بھولے سے بھی خیال نہیں آتا، ہر شخص نشۂ غفلت میں سرشار ہے، سب ہوا و ہوس میں مبتلا ہیں، کوٹ پتلون ہی نہیں جبّہ و دستار پر بھی "دُنیا" چھائی ہوئی ہے اور دُنیا سے ہماری مراد وہ ہوا و ہوس ہے جو آخرت سے غافل بنا دیتی ہے۔

ایک صحابی کی قبر کھودی جارہی تھی، جنازہ میدان میں رکھا تھا، حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے گردن جھکا کر، مٹی کریدتے ہوئے ارشاد فرمایا "لوگو! اس دن کے لئے کچھ کر رکھو، لوگو! اس دن کے لئے کچھ کر رکھو ... " آؤ ہم اس دن کے واسطے "کچھ کر رکھنے" کے لئے آج ہی سے تیاری شروع کر دیں ——!

والعاقبۃ للمتقین والحمد للہ رب العالمین!

اسمٰعیل احمد تسنیم
میناٸی

معارف

اس کارگہِ زیست میں عزت کی سزاوار　　یا ہستیٔ معبود ہے یا عظمتِ کردار
اے لطفِ رہائی کے طلبگار! خبردار!　　صیاد کا ہر لطف ہے صیاد کا اک وار
آزادیٔ کامل کا فقط وہ ہے سزاوار　　آزادیٔ مطلق کو سمجھتا ہے جو آزار

وہ ملتِ معروف کہ ہے وارثِ کونین　　ہے جس کے رگ و پے کا سکوں ہستیٔ کردار
جیتی ہے رُخِ ارض پہ اس طرح کہ جیسے　　"یا مردہ ہو یا نزع کے عالم میں گرفتار"

دُنیا کو ہے پھر معرکہِ باطل و حق پیش　　تقویٰ پہ ہے تہذیب کے فرزندوں کا پھر وار
مغرب تو ہمیشہ سے ہے خورشید کا مدفن　　مشرق ہی سے اُبھرے گا کوئی خاورِ بیدار
آ تجھ کو میں اسرارِ مشیت کے بتا دوں　　ہم بندۂ مختار ہیں وہ مالکِ مختار
مردانِ مجاہد کی فقط یہ ہے نشانی　　حق بات زبانوں پہ ہے دربار ہو یا دار

ہو جائے مسلماں جو مسلماں تو عجب کیا
اُمت ہو یہ پھر سطوتِ فاروقؓ کی حق دار

عزیز حاصل پوری

حقائق

مانا کہ روانہ ہوا انگریز یہاں سے　　تہذیب تو انگریز کی پہلے سے ہے دوچند
مغرور نہ ہوں کس لئے دولت کے پُجاری　　ہیں خیر سے ایمان فروشوں کے خداوند
اللہ سے بیگانہ ہوں اللہ کے بندے　　ہر وقت ہیں اس فکر میں ابلیس کے فرزند

کثرت سے جو ملتے ہیں تو اخلاص کے دُشمن
مخلص بھی زمانہ میں ہیں موجود مگر چند

دالکریم ثمرؔ

یہ کیا ہو رہا ہے؟

یہی ہے تری وحدت و کبریائی — کہ ذرّوں کو ہے آج زعمِ خدائی
نہ احساسِ ہستی نہ ادراکِ ہستی — نہ امن آشنائی نہ کشور کشائی

تن آسانیاں ہیں، غزل خوانیاں ہیں — نہ ذوقِ شہادت نہ تیغ آزمائی
ابھی ہو رہی ہے بیاباں میں رُسوا — خیابانِ ملّت کی رنگیں قبائی

جمود آشنا ہے ابھی تک مسلماں — ابھی ہے حرم میں بتوں کی خدائی
ابھی تک ہے آئینِ قرآں معطّل — ابھی ہے کلیسا کی فرمانروائی

ابھی شامِ غربت میں ہے کارفرما — امارت کا خونخوار دستِ حنائی
"کلب" میں ابھی رقص کرتی ہے دولت — ابھی موٹروں میں ہے نغمہ سرائی
ابھی تک دھوئیں میں سگاروں کے گم ہے — غریبوں کی آہ و فغاں اور دہائی
لہکتا ہے بیگم کا رنگیں غرارہ — چمکتی ہے محفل میں شوہر کی ٹائی
وہی سازشیں ہیں وہی رشوتیں ہیں — وہی ووٹ کے واسطے ہے گدائی
وہی ناخداؤں کو ساحل سے نفرت — وہی ہے نہنگوں کے ساتھ آشنائی
وہی مرحلے ہیں وہی منزلیں ہیں — وہی راہزن بر سرِ رہنمائی

غرض اس فضا میں خدائے محمدؐ!
سبھی کچھ ہے لیکن نہیں مصطفائی

قابل اجمیری

واردات

دلِ دیوانہ عرضِ حال پر مائل تو کیا ہوگا　　مگر وہ پوچھ بیٹھے خود ہی حالِ دل تو کیا ہوگا
یہ دریائے محبت ہے یہاں اہلِ سفینہ کو　　غمِ طوفاں نہیں ہوتا، غمِ ساحل تو کیا ہوگا
خرد کی رہبری نے تو ہمیں یہ دن دکھائے ہیں　　جنوں ہو جائے گا جب رہبرِ منزل تو کیا ہوگا
کوئی پوچھے تو ساحل پر بھروسہ کرنے والوں سے　　اگر طوفاں کی زد میں آ گیا ساحل، تو کیا ہوگا
شرابِ ناب ہی سے ہوش اُڑ جاتے ہیں انساں کے　　ترا کیفِ نظر بھی ہوگیا شامل تو کیا ہوگا
ہمارا کیا ہمیں تو ڈوبنا ہے ڈوب جائیں گے　　مگر اے موج تو پہونچی لبِ ساحل تو کیا ہوگا
ابھی تو راہرو گرمِ سفر ہیں شوقِ منزل میں　　مگر جب سامنے آ جائے گی منزل تو کیا ہوگا
تغافل اُن کی فطرت، بے نیازی ہے شعار اُن کا　　اگر ہم کہہ بھی دیں گے اپنا رازِ دل تو کیا ہوگا

خود اُس کی زندگی اب اُس سے برہم ہوتی جاتی ہے
تمھیں ہوگا بھی پاسِ خاطرِ قابل تو کیا ہوگا

وقار انجم

محسوسات

میں اب اپنی نگاہِ شوق کا پردہ اُٹھاتا ہوں　　جسے پردے میں رہنا ہو ذرا ہشیار ہو جائے
زلیخا! عشق کرنا جان کی بازی لگانا ہے　　یہ وہ سودا نہیں ہے جو سرِ بازار ہو جائے

پہلے اُن کو تلاش کرتے تھے　　اب خود اپنا نشاں نہیں ملتا

شیخ و حرم کہاں درِ پیرِ مغاں کہاں
اب اس کے بعد کیا کہیں اپنی زباں سے ہم

ے قابل صاحب بہت دن سے علیل ہیں، ناظرین "فاران" اس جوہر قابل کی صحت کے لئے دُعا کریں!

شوق کھنڈوی

آج بھی!

نام و نمود کے ہیں طلب گار آج بھی
ہے پست اہلِ عقل کا معیار آج بھی

حاصل نہیں ہے جراتِ گفتار آج بھی
پابند مصلحت کے ہیں افکار آج بھی

بکتی ہیں سیم و زر کے عوض میں جوانیاں
پھرتے ہیں عصمتوں کے خریدار آج بھی

عشق و فا شناس کے حسنِ خلوص کو
بدنام کر رہے ہیں ہوس کار آج بھی

امن و اماں کی سعیٔ مسلسل کے باوجود
میں سن رہا ہوں تیغ کی جھنکار آج بھی

یہ اعتبارِ نگاہ و دل بھی عجب عجب چال چل گئے ہیں
ذرا جو آنکھیں جھپک گئی ہیں تو راستے ہی بدل گئے ہیں

نگاہ سے دُور دُور جب تک رہے وہ کیا کیا شکایتیں تھیں
وہ آ کے جب مسکرا دیتے ہیں تو دل کے کانٹے نکل گئے ہیں

جنوں کی زد پر جو آ گئی ہیں تو منزلیں گرد ہو گئی ہیں
قدم جہاں تیز ہو گئے ہیں ہواؤں کے رُخ بدل گئے ہیں

صادق القادری
بی۔ اے (آنرز)

جذباتِ صادق

پیمانِ وفا توڑ دیا ہے تم نے
جذبات کا رُخ موڑ دیا ہے تم نے

دنیا تھا مرا ساتھ تمھیں منزل تک
رستے میں مگر چھوڑ دیا ہے تم نے

کامیابِ شوق بھی ہوں نامرادِ شوق بھی
ہوں بہت نزدیک منزل سے مگر منزل سے دُور

عشق میں صادق عجب ہے یہ بھی حسنِ اتفاق
وہ مرے پیشِ نظر ہیں میں ہوں ان کے دل سے دُور

خدا کا شکر تو جبر نہ دی زمانے نے
جنوں میں کہہ تو گیا تھا میں راز کی باتیں

ملال ہو گا قریبِ ساحل اگر یہ طوفاں کی زد میں آئے
جو میری کشتی کو ڈوبنا ہے تو آج دریا میں ڈوب جائے

خوشی کا تو خیر ذکر ہی کیا خوشی تو قسمت ہی میں نہیں تھی
مگر میں ہوں بدنصیب ایسا کہ اُن کا غم بھی نہ راس آئے

وہ ہوں گے اور جن کو فکر ہے صرف اپنے پینے کی
یہاں تو خیر سے پینے پلانے کا ارادہ ہے

سہارے کی نہیں ہم کو ضرورت چھوڑ دو ہم کو
سنبھل کر خود قدم آگے بڑھانے کا ارادہ ہے

مذاق العیشی فیروز پوری

"...... کسی نے اب تک سنا نہیں ہے"

کسی بھی عالم میں میرے دل سے خیال اُن کا جدا نہیں ہے
یہی تو وہ ایک سلسلہ ہے کبھی جو برہم ہوا نہیں ہے

مری نواؤں کی تلخیوں کو ابھی ترنم ملا نہیں ہے
شکستِ دل کی صدا میں شامل ابھی تمھاری صدا نہیں ہے

میانِ دیر و حرم کہیں بھی سرِ محبت جھکا نہیں ہے
تمھارے نقشِ قدم کا دھوکا کسی کے "در" پہ ہوا نہیں ہے

فسانۂ عرضِ شوق اے دل، ابھی مکمل ہوا نہیں ہے
نفس میں سوزِ نفس نہیں ہے، نوا میں سوزِ نوا نہیں ہے

حضور جو سب کی التجا ہے مری تو وہ التجا نہیں ہے
سکوں کی خواہش نہیں ہے مجھ کو، خوشی مرا مدعا نہیں ہے

شکستِ دل کی صدا کہاں تک ہی پردہ دارِ شکست اے دل!
یہی وہ آواز ہے کہ جس کو کسی نے اب تک سنا نہیں ہے

یہ تیز لہریں یہ تند موجیں ڈبو سکیں گی نہ میری کشتی
کہ جس کے قبضہ میں ہیں یہ طوفاں، وہ کیا سکوں کا خدا نہیں ہے؟

میں چپ ہوں رودادِ شوق کہہ کے وہ چپ ہیں رودادِ شوق سن کے
کہ جیسے کچھ بھی کہا نہیں ہے کہ جیسے کچھ بھی سنا نہیں ہے

سرور سرحدی

...... خبر ہوتی نہیں

بے زبانی ترجمانِ دل اگر نہیں ہوتی ختم رودادِ محبت عمر بھر ہوتی نہیں
اُس کی محفل میں ستم کی سحر کاری کیا کہوں لوٹ لی جاتی ہے دنیا اور خبر ہوتی نہیں

بے نیازی اُن کی فطرت بے رخی اُن کا شعار
جراتِ ترکِ محبت بھی مگر ہوتی نہیں

سرور بھوپالی

"ذکرِ جمیل"

(۱)

خوشا مجبوبیٔ کوئے محمدؐ
کھنچا جاتا ہے دل سوئے محمدؐ

(۲)

نسیم گلشن طیبہ سنبھل کر
بہت نازک ہے خوشبوئے محمدؐ

(۳)

دل مہتاب ہے مجروح اب تک
کبھی دیکھے تھے ابروئے محمدؐ

(۴)

گھٹائیں رحمتوں کی چھا رہی ہیں
زہے! توصیفِ گیسوئے محمدؐ

(۵)

سرورؔ اپنی حقیقت اور کیا ہے
بجز اک خادم کوئے محمدؐ

اسلام کی باتیں کریں.....

ماہر القادری

اہلِ دنیا زلفِ عنبر خام کی باتیں کریں
اور ہم اللہ کے پیغام کی باتیں کریں

بو ذرؓ و سلمانؓ کے جامِ شوق سے سرشار ہیں
کس لئے پھر حافظؔ و خیامؔ کی باتیں کریں

وقت کے دھارے کو مڑنا ہے ہمارے ساتھ ساتھ
اس طرح سے گردشِ ایام کی باتیں کریں

محفلوں میں چل کے ہر سازِ طرب کو توڑ دیں
میکدوں میں بھی شکستِ جام کی باتیں کریں

دوستو! آؤ کہ اب کچھ کام کی باتیں کریں
چھوڑ کر ہر ذکر صرف اسلام کی باتیں کریں

ماہرالقادری

چور!

وہ چور تھا اور "تھا کیا" ہو گیا تھا، کوئی آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے چور اور اُٹھائی گیرہ پیدا نہیں ہوتا، اُس کا ماحول اور اُس کی سوسائٹی اُسے اچھا یا بُرا بنا دیتی ہے، صحبت کا بڑا اثر ہوتا ہے چاہے وہ ایک لحظہ ہی کی کیوں نہ ہو اور جس گرد و پیش میں آدمی کے سالہا سال بسر ہوئے ہوں وہاں کے اثرات سے بچنا ناممکن ہے۔

اُس نے زندگی میں سب سے پہلے سینما دیکھنے کے لئے اپنے ماموں کی شیروانی کی جیب سے بارہ آنے چُرائے تھے اُس دن کے بعد سے وہ گھر کی چیزیں چُرانے لگا، اس روپے سے وہ دوستوں کے ساتھ تھیٹر اور سینما دیکھتا، ہوٹلوں میں کھانا کھاتا، پک نک پارٹیاں ہوتیں، آدمی کے جیب میں پیسہ ہو تو خرچ کرنے کے لئے سو راہیں نکل آتی ہیں۔

یہ عادت ترقی کرتی گئی، اب دوسروں کی جیبوں پر حریصانہ نگاہیں پڑنے لگیں، گھر کی چیز بست چُرانے والا اب جیب تراش اور اُٹھائی گیرہ بن گیا، میلے، ٹھیلے، جلسے، عُرس اور بازار اُس کی سُنہری چراگاہیں تھے، کسی موٹی آسامی کو بھانپ کر اُس کے ساتھ لگ جاتا، اور جہاں وہ بیچارہ ذرا غافل ہوا، جیب صاف، بٹوہ غائب! جیب تراش راہ گیروں کی غفلت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، غفلت ہے ہی بُری چیز، غافلوں کو اس دُنیائے بیداری اور عالمِ ہوشیاری میں بڑے نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں۔

پولس اُس کے کرتوتوں سے باخبر تھی، مگر سپاہیوں کی وہ مٹھی گرم کرتا رہتا، تھانیدار صاحب کی لڑکی کی شادی میں اُس نے سونے کے بُندے، دس سیر گھی اور ایک من شکر کا تحفہ دیا، جس گٹھ کٹے کی پولس دوست ہو اُسے کون پکڑ سکتا ہے، ایک بار بڑے بازار کے نکڑ پر جیب تراشتے ہوئے وہ پکڑا بھی گیا، مگر آدمی قوی اور تنومند تھا اُس نے جھٹکا دیکر ہاتھ چھڑا لیا اور لوگوں کی بھیڑ میں ہو کر یہ جا وہ جا!

ہوس پاؤں پھیلاتی چلی جاتی تھی اور بڑھتی ہوس کے لئے وسیع میدان چاہیئے اس کے لئے کچھ ساتھی آسانی سے مل گئے، چھ آدمیوں کی ایک ٹولی بن گئی اور یہ لوگ مل کر چوری کرنے لگے یُوں سمجھئے کہ چوروں کی یہ ایک "لمیٹڈ کمپنی" تھی جس کے سارے حصہ دار برابر کے شریک تھے اور چوری میں ٹوٹے کا کوئی سوال ہی نہ تھا، نفع ہی نفع تھا اگرچہ خطرات بہت تھے، عزت آبرو کا، جان کا، رُسوائی اور تشہیر کا! مگر خطرہ مول لئے بغیر زندگی میں مدوجزر کا لُطف کہاں، اسا کن اور جامد زندگی کس کام کی؟ اور ہاں! چوری بھی تو ایک طرح کا آرٹ (ART) ہے؟ "چوری اور آرٹ"؟ یہ کیا فرمایا جناب! جب بُت تراشی، تصویر کشی، عُریاں رقص اور کلب گھروں کی قمار بازی "آرٹ" ہو سکتی ہے تو آخر "چوری" آرٹ کیوں نہیں ہو سکتی، ہم کہتے ہیں کہ جو جتنا باکمال چور ہے اُتنا ہی اچھا "آرٹسٹ" ہے اور چور کا آرٹ اس میں ہے کہ وہ ساری عُمر چوری کرتا رہے مگر پکڑا نہ جائے، یہ جو چور پکڑے جاتے ہیں دراصل ان کے "آرٹ" میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے اسی لئے تو دھر لئے جاتے ہیں، آرٹسٹ قسم کے چوروں پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔

یہ سب آرٹسٹ قسم کے چور تھے، دو سال تک چوریاں کرتے رہے، ہزاروں کا مال مارا، گھر کے گھر صاف کر دیئے مگر کیا مجال ہو کہ پولس نے ان میں سے کسی کے ہاتھ بھی لگایا ہو، اس دُنیا میں بہت سے بدمعاش آرٹسٹ زندگی بھر شریف بنے رہتے ہیں، زندگیاں پُورے طور پر بے نقاب کہاں ہوتی ہیں!

ہولی کا تیوہار تھا، گلیوں میں رنگ کھیلا جا رہا تھا، ہر طرف رنگ کی پچکاریاں چھوٹ رہی تھیں، چہرے گلال کی سُرخی سے لال بھبوکا بنے ہوئے تھے، چوبھیاں نکل رہی تھیں، گانا بجانا نقلیں ناچ رنگ! آج لوگوں نے خوب بھنگ گھوٹ گھوٹ کر پی! دھرم کے نام پر پاپ کی باتیں ہو رہی تھیں چوروں کے لئے آج اچھا موقعہ تھا، ایک بنیے کے گھر میں سب لوگ غافل سو رہے تھے، کچھ لوگ تھکے ہوئے تھے، دن بھر اُودھم بھی تو مچایا تھا، کچھ آدمیوں نے دارو اور بھنگ پی رکھی تھی، چوروں نے گھر میں گھس کر لالہ جی کی تجوری کا صفایا کر دیا، تجوری کی کنجی لالہ جی کی دھوتی کے ٹھوک میں بندھی تھی، وہ کھول لی گئی، لالہ جی بھنگ کے نشہ میں غافل پڑے تھے۔

اس چوری میں ہزاروں کا مال ہاتھ لگا، نوٹوں کی گڈیاں، اشرفیوں کے توڑے، اور سنہری زیور بھی! زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑی، ڈیڑھ دو گھنٹہ میں سب کچھ ہو گیا، چور اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے تھے اور ہولی کے تیوہار کو دعائیں دے رہے تھے ——

چور اگر پارسا ہوں تو چوری ہی کا ہیکو کریں، چوری کے ساتھ اور بُرائیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں —— وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چوری کا مال آسانی سے ہضم نہیں ہوتا، ان چوروں میں سے ایک چور کی ایک طوائف سے آشنائی تھی، چُرائے ہوئے مال میں سے دو چیزیں اُس نے طوائف کو دے دیں اور پولس نے یہ چیزیں پکڑ لیں تفتیش ہوئی لالہ جی نے اپنا زیور پہچان لیا، پہلے یہ چور پکڑا گیا اور پھر اُس کے دوسرے ساتھی بھی! واردات کی تمام کڑیاں ملتی چلی گئیں، مقدمہ عدالت میں پیش ہوا، ثبوت بہت مضبوط تھا اور صفائی انتہائی کمزور، ملزموں کے وکیلوں نے بہت کچھ ایچ پیچ کی باتیں کر کے مجسٹریٹ کو متاثر کرنا چاہا مگر کامیابی نہ ہو سکی، پولس کے بنائے ہوئے مقدمے جب کامیاب ہو جاتے ہیں اور یہ تو سچا مقدمہ تھا، پھر بھی ثبوت کے لئے دو جھوٹے گواہ پیش کرنے پڑے جب کہیں جا کر مقدمہ کامیاب ہوا —— مجسٹریٹ نے اپنی بھوری اور چھدری مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے۔ "دو سال سخت سزائے قید" کا حکم سُنایا، ملزموں کے چہروں پر غم و ندامت کی سیاہی دوڑ گئی۔

پانچوں مُجرموں کو مختلف جیلوں میں بھیجا گیا، جس چور کا ہم شروع سے ذکر کرتے آ رہے ہیں اُس کو سنٹرل جیل میں جگہ ملی، اس جیل میں دسیوں بارکیں تھیں، قیدیوں کی ایک دُنیا یہاں آباد تھی، بوڑھے، جوان، شریف، رذیل، امیر، غریب، کسان، زمیندار غرض سبھی طرح کے قیدی تھے، ان میں وہ بھی تھے جو دسیوں خون کر چکے تھے اور ایسے بھی تھے جن کا کوئی قصور ہی نہ تھا کسی مالدار آدمی کی دشمنی اور پولس کی سازش نے اُنھیں جیل کا پانی پلا کر چھوڑا ——

—— قیدیوں میں زیادہ تعداد غریبوں کی تھی، قصور، گناہ، جرم اور خطائیں غریب ہی تو کرتے ہیں، یہ روپے پیسے والے تو دھرماتما ہوتے ہیں، یہ بیچارے گناہ و ثواب اور پاپ پُن کو کیا جانیں اور کچھ کریں بھی تو روپیہ میں وہ زور ہے کہ مجرم کو پھانسی کے تختہ سے اُتارا جا سکتا ہے، زر و مال کو اسی لئے تو "ستارِ عیوب" کہا گیا ہے —— جو بڑوں میں کوئی کھانس بھی دے تو اُنگلیاں اُٹھنے لگیں اور قصر و ایوان میں خون بھی ہو جائے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو!

یہ چور جس بارک میں رکھا گیا اُس میں بیس قیدیوں کے رہنے کی جگہ تھی مگر تعداد اس سے کم ہی رہتی تھی، قیدی آتے جاتے رہتے، کسی مہینہ میں پندرہ سولہ کسی میں اس سے بھی کم! دُنیا ہی متغیر اور حوادث پذیر ہے تو قید خانے ایک ہی حال میں کس طرح رہ سکتے ہیں، چور کو شروع شروع میں بان بٹنے کا کام دیا گیا، ایک ن میں دو سو گز بان بٹنے پڑتے، جس دن کام کم کرتا اس دن چوکیداروں کے ڈنڈے کھانے پڑتے، پھر وہ مٹی کھودنے لگا، دو مہینہ مٹی کھودنی پڑی اس کے بعد کھیتوں میں پانی دینے کا کام اُس کے ذمہ لگا دیا گیا، یہ سب سے ہلکا کام تھا، ستانے کا بھی موقع مل جاتا تھا۔

چور کو قید خانہ میں رہتے ہوئے ایک سال ہوگیا تھا، وہ شریف قیدیوں میں تھا اُس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو قید خانہ کے ڈسپلن کے خلاف سمجھی جائے اُس نے چوکیداروں سپاہیوں اور پہرے داروں کے ڈنڈے کھائے مگر منہ سے اُف نہیں کی، باہر کام کرنے والے قیدی راہ گیروں سے سگریٹ اور بیڑی مانگ لیتے مگر اس "چور" نے کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا وہ دل ہی دل میں بہت غمگین رہتا، کبھی کبھی گہرے سوچ میں ڈوب جاتا، بیوی بچوں کی یاد بھی ستاتی تھی، بدنامی کا بھی غم تھا، قید کی سختیاں بھی باعثِ ملال تھیں، بہت سے غمناک تاثرات مل جُل گئے تھے، ہر قیدی اس ذہنیت کا نہیں ہوتا، تمام کے تمام گناہ گار اپنے گناہوں پر کہاں پچھتاتے ہیں، ندامت اور تاسف کسی کسی دل کو نصیب ہوتا ہے اور کوئی کوئی تو برائی کر کے اُلٹا فخر کرتا ہے۔!

برسات کی رُت تھی اور قیدیوں کے لئے یہ زمانہ بڑا سخت ہوتا ہے، کھٹمل، مچھر، پسو اور طرح طرح کے کیڑے بارکوں میں بھر جاتے ہیں، جس رات کو ہوا نہ چلے تو وہ رات قیامت کی رات ہوتی ہے ——— اسی زمانہ میں ایک قیدی اس بارک میں داخل ہوا، ادھیڑ عمر، سانولی رنگت، دوہرا جسم، خوب گھنی ڈاڑھی، اُس کے چہرے پر شرافت کے آثار پائے جاتے تھے، اس بارک میں یہی ایک قیدی تھا جس نے آتے ہی نماز پڑھی، قیدیوں نے ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا، "یہ مولوی صاحب یہاں کیسے تشریف لے آئے" ——— اس قیدی کو سب مولوی صاحب کہنے لگے۔

اُس چور قیدی اور ان مولوی صاحب کے لیٹنے کی جگہ پاس پاس تھی، یُوں سمجھو کہ وہ دونوں ساتھی قیدی اور صحیح معنوں میں "رفیق السجن" تھے، چور رفتہ رفتہ مولوی صاحب سے مانوس ہو چلا تھا، مولوی صاحب بڑے خلیق ملنسار اور بھلے آدمی تھے، شگفتہ رو، کشادہ جبیں بات کرتے ہیں منہ سے پھول جھڑتے، ہر قیدی دوسرے قیدی کو اپنی داستان سُناتا ہے اور یہ داستانیں عام طور پر سچی ہوتی ہیں، مولوی صاحب سے بھی "چور" نے پوچھا کہ آپ پر کیا بپتا آن کر پڑی آپ یہاں کیسے آئے، مولوی صاحب نے ہنس کر کہا، جیسے آپ سب آئے ہیں اُسی طرح میرا بھی آنا ہوگیا، تو آپ نے چوری کی ہے، کسی کی گرہ کاٹی ہے، جوا کھیلا ہے، شراب پی کر لوگوں کو گالیاں دی ہیں، کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالا ہے، کسی فوجداری یا بلوہ کے مقدمہ میں پکڑے گئے ہیں؟ اتنے بہت سے سوالوں کے جواب میں مولوی صاحب نے مُسکراتے ہوئے سر ہلایا، اثبات کے لئے نہیں نفی کے لئے کہ بھائیو! میں نے ان کاموں میں سے ایک کام بھی نہیں کیا، میں ان باتوں کو کیا جانوں۔

اصرار کیا گیا کہ آپ کو اپنی بپتا بیان کرنی پڑے گی، مولوی صاحب مجبور ہو گئے، انھوں نے کہا کہ میرے یہاں لکڑی کی تجارت ہوتی ہے، شہر میں میری لکڑی کی دو ٹالیں ہیں، سال کے سال میں جنگل مول لے لیا

کرتا ہوں اور درختوں کی کٹائی اور لکڑی کی چرائی کا کام جب جنگل میں ہوتا ہے تو مجھے کئی کئی مہینہ وہاں رہنا پڑتا ہے تین مہینے پہلے میں جنگل ہی میں تھا، ایک دن شام کے وقت ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں دو دن سے پریشان ہوں، رات کی رات آپ کی جھونپڑی میں ٹھیرنا چاہتا ہوں، خدا کے لئے مجھے پناہ دیجئے، صبح اُٹھتے ہی چلا جاؤں گا، تو صاحبو! اس کے حال پر ترس کھا کر میں نے اُسے جھونپڑی میں ٹھیرنے کی اجازت دیدی، رات کے بارہ بجے پولس نے آکر اُس میدان کو حلقہ میں لے لیا، جھونپڑیوں کی تلاشی شروع ہوئی، جس شخص کو میں نے پناہ دی تھی وہ اشتہاری ڈاکو نکلا، وہ پکڑا گیا اور اُس کے ساتھ ہی مجھے بھی پولس نے دھر لیا، میں نے پولس والوں کی لاکھ منت سماجت کی کہ میں نے تو اس شخص کو راہ گیر جان کر پناہ دی تھی، میں اس کو نہیں جانتا، میں تو اسے مسافر سمجھا تھا مگر پولس کہاں ماننے والی تھی، میرے خلاف مقدمہ قایم ہوا اور عدالت میں جیت پولس ہی کی رہی، بیچاری عدالت بھی کیا کرے وہ تو ثبوت اور صفائی کو دیکھتی ہے، پولس کے گواہوں نے میرے خلاف کہا کہ اس ڈاکو سے سعادت حسین (مولوی صاحب کا نام) کی دوستی تھی اور یہ نام ڈاکو اُن کے یہاں آتا جاتا رہتا تھا، شروع شروع میں، میں چاہتا تو جھوٹ بھی سکتا تھا مگر میں نے کہا کہ چاہے مجھے پھانسی ہی کیوں نہ ہو جائے مگر رشوت نہیں دوں گا ـــــــ مولوی صاحب کی بپتا کو قیدیوں نے بہت دلچسپی کے ساتھ سُنا، سب افسوس کرنے لگے کہ آپ بے گناہ پکڑے گئے، ہم مطمئن ہیں کہ کچھ کیا ہے تو یہاں جیل خانہ آئے ہیں مگر آپ نے کچھ بھی نہیں کیا اور ناحق اس مصیبت میں مبتلا کر دیئے گئے، مولوی صاحب نے کہا بھائیو! قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یا تو میرے کسی پچھلے گناہ کی یہ سزا مجھے ملی ہے یا پھر قدرت امتحان لے رہی ہے، اور میں تو کہتا ہوں کہ اس دُنیا میں آدمی چاہے جس مصیبت میں گرفتار ہو جائے مگر آخرت میں رسوائی نہ ہو (مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے، آواز بھرا سی گئی ـــ)!

چور نے مولوی صاحب کو نماز پڑھتے میں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دُعائیں مانگتے اور روتے ہوئے بھی دیکھا، مولوی صاحب کی ڈاڑھی آنسوؤں میں بھیگ بھیگ جاتی، چور کا دل بھی پسیجنے لگا، مولوی صاحب گڑگڑا کر جب کہتے "بارالٰہا! گناہوں کی معافی! آخرت کی رسوائی سے بچانا میرے معبود!" تو چور کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں، مولوی صاحب سے اُسے بڑی انسیت بلکہ عقیدت ہو گئی تھی" مولوی صاحب سے نہ اُس کی کوئی غرض وابستہ تھی نہ کوئی لالچ تھا اور نہ کسی طرح کی اُمید تھی، ایک قیدی دوسرے قیدی کے کیا کام آسکتا ہے؟ جیل خانے میں سبھی قیدی ایک جیسے ہوتے ہیں، مولوی صاحب کی نیکی اور پاکبازی بنیاد تھی اِس اُنسیت اور تعلق خاطر کی!

یہ رنگ روز بروز گہرا ہوتا چلا گیا، دل میں گداز پیدا ہو جائے تو نیکی کو اثر کرتے کیا دیر لگتی ہے، چور اپنے میں تبدیلی محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اندر ہی اندر اُس کے دل کو دھو کر اُجلا بنائے دے رہا ہے، قید خانہ اُس کے لئے ذریعہ ہدایت ثابت ہوا، ٹھوکر جیل خانہ سے باہر لگی اور آنکھ یہاں آکر کھلی، پچھلی زندگی سے وہ بیزار تھا، گھنٹوں پچھتاتا اور کبھی کبھی رو تا کہ ہائے! میں نے یہ کیا کیا؟ بھلا چور اور اُٹھائی گیرے کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے، اس گندگی کو اب چھوڑنا چاہیئے، چھوڑ دوں گا ... چھوڑ دیا (مٹھیاں بند کرتے ہوئے جیسے کوئی عہد و پیمان کرتا ہے .. ..)!

قید کی میعاد ختم ہونے پر اُسے جیل خانہ سے چلا آنا پڑا، قید سے چھٹنے کی کسے خوشی نہیں ہوتی، اُسے بھی خوشی تھی مگر مولوی صاحب کے چھٹنے کا رنج بھی تھا، اُس کا بس چلتا تو وہاں ابھی کچھ دن اور رہتا، ایسی نیک اور

پاک صحبتیں ہر کسی کو میسر کہاں آتی ہیں، مولوی صاحب نے چلتے وقت کہا :-

"فیاض! یاد ہے تم نے اپنے خدا سے کیا عہد کیا ہے؟ زندگی کو بدل دینے کا! اس عہد پر قایم رہنا، یہ نہ ہو کہ قید خانہ سے نکلتے ہی اس عہد کو توڑ دو، جاؤ! اللہ تمہارا نگہبان رہے —— (اور فیاض کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں...)

فیاض کے دو چار رشتہ دار قید خانہ کے پھاٹک پر موجود تھے، سب خوشی خوشی گلے ملے، پھر وہ سب کے ساتھ گھر پہنچا، گھر میں سب سے مل جل کر وہ سیدھا مسجد گیا، لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ فیاض چور نماز پڑھ رہا ہے اور نماز بھی کیسی جیسے یہ اس کی آخری نماز ہے، کیا خضوع و خشوع تھا، کتنی نیازمندی اور عاجزی تھی، کیا استغراق اور حضورِ قلب تھا، لوگوں نے تو اب تک مسجدوں میں مرغوں کی طرح ٹھونگیں مارنے والے نمازی دیکھے تھے، فیاض کی نماز سب سے جدا تھی یہ وہ نماز تھی جس میں سر کے ساتھ دل بھی جھکتا ہے۔

سر ہو سجدے میں تو پھر آئے کسی کا کیوں خیال
اے معاذ اللہ! تیری بندگی تیرے بغیر

چوری کے زمانے میں بڑی اللّے تللّے کی زندگی تھی مگر اب اُن رنگ رلیوں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا، وہ حالات ہی بدل گئے تھے، فیاض نے ایک ٹھیلا بنا لیا تھا جس پر بساط خانہ کا سامان رکھ کر گلیوں میں گھومتا، اس زندگی میں وہ بہت خوش تھا —— چوروں اور بدمعاشوں پر پولس کی نظر رہتی ہے، فیاض کی نقل و حرکت پر پولس کی نگاہ تھی، تھانیدار صاحب کو اُس کے حالات کی جو اطلاع ملی تو وہ بطورِ خاص نگرانی کرنے لگے، شبہ یہ تھا کہ جو چور قیدخانہ سے آنے کے بعد اپنی ایسی حالت بنالے وہ نہ جانے کیا گل کھلائے، مگر تھانیدار صاحب کی حیرت میں اضافہ ہوتا گیا، انھوں نے دیکھا کہ فیاض کی زندگی بدل چکی ہے، فیاض چور اب انتہا درجہ کا امانت دار اور نیک بن گیا ہے —— ایک دن تھانیدار صاحب بازار کی پٹری پر سادہ کپڑوں میں سینما کے اشتہار کے بورڈ کی آڑ میں کھڑے تھے، اُنھوں نے دیکھا کہ ایک راہ گیر کا بٹوہ فیاض کے ٹھیلے کے قریب گر گیا، فیاض بٹوہ اٹھا کر راہ گیر کے پیچھے بے تحاشہ دوڑا اور بٹوہ اُسے پکڑا دیا۔

تھانیدار صاحب پہلے سے متاثر تھے، آج کے واقعہ نے اس تاثر کو اور بڑھا دیا، وہ اپنی سائکل لیکر گھر پہونچے، بیوی نے کہا آج آپ کس سوچ میں ہیں، اور ہاں! ابھی سے کیسے چلے آئے، آپ تو سینما دیکھنے کے لئے گئے تھے۔

"آج سے تمام لغوتیں ختم... بیوی! یہ پھلوں کی ٹوکریاں، کیک پیسٹری کے ڈبے، دوستوں کی پارٹیاں قیمتی لباس... سب بند، ہمیشہ کے لئے بند، حرام کی کمائی سے تو یہ اچھا ہے آدمی زہر کھا کر سو جائے —— جب فیاض چور نیک بن سکتا ہے تو علیم تھانیدار اپنی زندگی کیوں نہیں بدل سکتا، خدا کو ایک دن مجھے بھی منہ دکھانا ہے... (بیوی منہ تک رہی تھی اور تھانیدار کا لڑکا جو پتنگ اُڑانے کے لئے ماں سے پیسہ مانگنے کے لئے آیا تھا چپ کھڑا تھا ——)

روحِ انتخاب

اِحتساب!

حمد و ثنا کے بعد :-

رفقاء کرام و معزز حاضرین! مجھے پوری توقع ہے کہ آپ حضرات دنیا کے حالات پر کسی قدر خود واقفیت رکھتے ہوں گے مسائل کے اُلجھاؤ اور حالات کی ابتری پر میں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مجھے تو صرف آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ اِن حالات میں آپ کو اپنا پورا پورا جائزہ لیتے رہنا چاہئے کہ آپ اپنے عزیز اوقات کو کن کاموں میں صرف کر رہے ہیں جبکہ آپ کا یہ دعویٰ ہے (اور اس سے زیادہ سچا دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے) کہ موجودہ مسائل کا حل اور حالات کے سدھار کی اسکیم آپ کے پاس ہے۔ بیکاروں کے لئے تو مہینوں اور سالوں کی مدت بھی زیادہ نہیں لیکن ہمارے لئے تو وقت کا ایک ایک لمحہ بھی عزیز ہے یہ مدت عمر جو ہمیں خالق کائنات کی طرف سے عطا ہوئی ہے کیا یہ اس کا احسان اور اس کی بہت بڑی نعمت نہیں ؟ پھر اگر ہم نے اس کا ایک لمحہ بھی ضایع کیا تو آج ہی سوچ لیجئے جس دن خدائے حی و قیوم کے سامنے حاضر کئے جائیں گے اور ایک ایک نعمت کے بارے میں سوال ہوگا۔

ثم لتسئلن یومئذٍ عن النعیم۔ (۱۰۲-۸)

پھر اس دن تم سے نعمتوں کے بارے میں ضرور ہی پوچھ گچھ ہوگی۔

تو اس وقت ہمارا کیا جواب ہوگا۔

دُنیا کا ایک ایک ذرہ اللہ کے احاطہ علم میں ہے کما قال اللہ تعالےٰ۔

ما یخفیٰ علی اللہ من شیئٍ فی الارض ولا فی السّماء (۱۴-۳۸)

آسمان و زمین میں کوئی چیز بھی اس کے علم سے مخفی نہیں۔

اور انسان بھی اس کے وسعتِ علم سے باہر نہیں بلکہ انسان سے قریب تر اگر کوئی ہے تو وہ اسی کی ذات ہے

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہٖ نفسہٗ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ (۵۰-۱۶)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔ اور ہم انسان سے اس کی رگ گردن سے

اس سب کے باوجود صرف حجت تمام کرنے کے لئے ہمیں کاتبانِ اعمال کی بھی خبر دی گئی ہے۔

اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیبٌ عتید۔ (۵۰-۱۷،۱۸)

جب داہنے اور بائیں بیٹھے ہوئے دو لینے والے لیتے جاتے ہیں وہ کوئی بات منہ سے نہیں کہتا مگر اس کے پاس ایک نگہبان تیار

جن کا نوشتہ قیامت کے دن پیش ہوگا۔

وقال قرینہ ھذا ما لدیّ عتید۔ (۵۰-۲۳)

اور اس کا ہم نشین فرشتہ کہے گا کہ یہ اعمالنامہ جو میری پاس حاضر ہے۔

اور پھر کہا جائے گا کہ

اقرء کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیباً

اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

تو قبل اس کے کہ وہ دن آئے اور

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ (۳ — ۱۰۶)

جس دن کچھ چہرے سپید و چمکدار ہوں گے اور کچھ سیاہ اور اترے

اور — وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ ووجوہ یومئذ علیہا غبرۃ ترھقہا قترۃ۔ (۸۱ — ۳۸ تا ۴۰)

بہت سے چہرے اس دن روشن اور خنداں و شاداں ہوں گے اور بہت سے ایسے ہوں گے جن پر گرد و غبار پڑا ہوگا جس پر سیاہی چھا رہی ہوگی۔

اس وقت کا منظر آنکھوں کے سامنے ہو، ہم آج ہی کیوں نہ اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہیں کہ:۔

"اقرأ کتابک کفیٰ بنفسک الیوم علیک حسیبًا"

اس لئے کہ ہم اپنے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر اپنے لئے اپنے سے زیادہ اچھا محاسب کون ہو سکتا ہے۔ اور پھر یہی وقت ہے کہ اگر اس وقت ہم اپنے احتساب اعمال کی طرف متوجہ ہوئے تو ہم اس کا پورا پورا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ عقل مند وہی ہے جو اس دن کے آنے سے پہلے باخبر رہا ہو پس اس کے آرام و آسایش کا کیا ٹھکانا۔

فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فیقول ھاؤم اقرأوا کتابیہ انی ظننت انی ملاق حسابیہ فھو فی عیشۃ راضیۃ فی جنۃ عالیۃ۔ (۶۹ — ۱۹)

پھر جس شخص کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ تو کہے گا کہ لو میرا نامۂ اعمال پڑھو، مجھے تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ میرا حساب پیش آنے والا ہے پس وہ پسندیدہ عیش یعنی بہشت

لیکن جو یہاں غافل رہے گا اسے ظاہر ہے حسرت و ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

واما من اوتی کتابہ بشمالہ فیقول یلیتنی لم اوت کتابیہ ولم ادر ما حسابیہ۔ (۶۹ — ۲۵ و ۲۶)

اور جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا کہ کیا اچھا ہوتا کہ مجھ کو میرا نامۂ اعمال ہی نہ ملتا اور مجھے یہی خبر نہیں ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے۔

معزز رفقاء! خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں اوروں کی طرح زندگی کی کوئی تقسیم نہیں ہے کہ ہم جہاں تک عبادات کا تعلق ہے اس میں دین کی پیروی کریں اور سیاسی زندگی کو اس طاعت سے بالکل خارج کرلیں بلکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ مکمل دین کے اختیار کرنے ہی میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے۔ اور اس بات کا مطالبہ اس آیت کریمہ میں کیا گیا ہے۔ کہ

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔

کہ اے مومنو پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

مگر میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ شیطان جو ہمارا آپ کا اور تمام بنی آدم کا ازلی دشمن ہے اس کے بہکانے کے بھی مختلف اور نوع بنوع طریقے ہیں۔

اگر ہمارے وہ مشاغل جن کو ہم نے اختیار کیا ہے خواہ وہ کھیتی ہو یا تجارت ہو۔۔۔۔۔ یا ملازمت ہو یہی ہمارے نزدیک اصل اور مقدم ہیں اور اقامت دین کا کام جسے درحقیقت مقصود اصلی ہونا چاہیئے وہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے کہ ان مشاغل سے فرصت کے دو چار گھنٹے اگر حاصل ہو جائیں تو اقامت دین کا کام بھی کر لیا جائے ورنہ اس کام کے لئے اس قدر بھی وقت نہ دے سکنے کے لئے یہ بہانہ کافی سمجھ لیا جائے کہ ضروری مشاغل سے فرصت نہ مل سکی تو یقین مانئے کہ یہ بھی زندگی کی ایک تقسیم ہے۔ ایسی اکائی کی تقسیم جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی، اسلام بھی اس تقسیم کو گوارا نہیں کرتا۔ ہمارے لئے اقامت دین کا کام ہی اصل ہے باقی سارے کام فروع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہر عقل مند انسان فرع میں اصل کو مقدم رکھے گا۔ لیکن اگر آپ کے نزدیک

اپنے ہی مشاغل زیادہ اہم ہیں اور زیادہ محبوب ہیں تو خالق کائنات کا فرمان بھی سن رکھیے کہ:۔

قل ان کان آباؤکم وابناءکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا احب الیکم من اللہ و رسولہ وجھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ واللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔ (۹-۲۴)

کہہ دو (اے نبی) کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے قرابت والے اور وہ مال جنھیں تم نے کمایا ہے اور وہ سوداگری جس کے ... مندے ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور فی سبیل اللہ جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

رفقاء کرام! ہماری ایک چھوٹی سی لغزش بھی بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی حرکات کا جائزہ لیتے رہیں۔ لوگوں کی اپنی بہت سی حرکات سے لاپرواہی اور انہیں حقیر جاننے ہی کی وجہ سے حضرت انسؓ بے چین ہو گئے تھے۔ اور اسی بے چینی ہی نے تابعین کے سامنے انہیں یہ کہنے پر مجبور کیا تھا جسے امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے کہ:۔

الکم لتعملون اعمالاً ھی ادق فی اعینکم من الشعر کنا نعدھا علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الموبقات۔

تم بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے زیادہ باریک اور حقیر ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم انہیں مہلک و تباہ کرنے والے سمجھتے تھے۔

اور کیوں نہ بے چین ہوتے جبکہ ان کے سامنے رحمۃ للعالمین کا یہ ارشاد تھا۔ کہ:۔

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ ۔ بہترین مسلم وہ ہے جو لغویات کو ترک کر دے۔

اب ہمیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو سامنے رکھتے ہوئے کہ:۔

اتق اللہ حیث ما کنت واتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا وخالق الناس بخلق حسن

جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرو اور لغزش کے بعد فوراً اچھے کام کی طرف متوجہ ہو جاؤ جو اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔ اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ

اپنا جائزہ لینا چاہیئے اور کوئی بھی غلطی ہو اس سے ہٹ کر فوراً اچھے کاموں میں لگ جانا چاہیئے۔ خدا ہم کو اور آپ کو نیک عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین:

(مولانا ابوبکر اصلاحی

سہ روزہ الانصاف الہ آباد)

(جماعت اسلامی ہند کے ارکان کے اجتماع میں یہ تقریر کی گئی)

ہماری نظر میں!

تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت جلد اوّل "عہد کشور کشائی"

"تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" تالیف :- سیّد ہاشمی فرید آبادی، ضخامت ۴۹۴ صفحات مجلد گردپوش کے ساتھ، قیمت سات روپے آٹھ آنے - ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو پاکستان، ہسپتال روڈ کراچی ۱

جناب سیّد ہاشمی فرید آبادی کو اردو داں عوام کم اور خواص بہت زیادہ جانتے ہیں، حکومت حیدرآباد دکن کا جو "دارالترجمہ" اپنی علمی خدمات کے لئے مشہور رہی، موصوف اُس کے سالہاسال تک رُکن رہے ہیں پھر وہ ترقی کرکے ہوم آفس میں مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) ہوگئے اور اُس خدمت سے قبل از وقت سبکدوش ہوکر "کل ہند انجمن ترقی اردو" کے شریکِ کار بن گئے ـــــ ۱۹۴۷ء میں دہلی کے مسلمانوں پر جو تباہی آئی، انجمن ترقی اردو بھی اُس کی لپیٹ میں آگئی ، بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کو دلی چھوڑ کر پاکستان چلا آنا پڑا، سیّد ہاشمی صاحب جنھوں نے امن و آسودگی کے زمانہ میں مولوی صاحب موصوف کا ساتھ دیا اور ہمیشہ رفیق کار رہے تھے، مروت کے خلاف تھا کہ ہجرت میں وہ ان کی رفاقت نہ کرتے، سیّد ہاشمی صاحب اب کراچی میں مقیم ہیں اور ان کی ذات انجمن ترقی اردو پاکستان کا ایک ستون سمجھی جاتی ہے۔

جناب سیّد ہاشمی فرید آبادی بہت سی کتابوں کے مصنف مولف اور مترجم ہیں، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے لئے وہ کئی تاریخیں لکھ چکے ہیں جو غالباً وہاں کے نصاب میں بھی داخل تھیں، اُن کی پوری زندگی ادب انشا کی دشت پیمائی میں گزری ہے اور اُن کے بال سچ مچ علم و ادب کی دھوپ میں سپید ہوئے ہیں، شعر گوئی کی طرف بھی طبیعت کا رجحان ہے مگر قسمت میں شاعر نہیں، "مورخ" ہونا لکھا تھا۔

ہندوستان کی درس گاہوں میں انگریز مورخین (مارسڈن، ونسنٹ اسمتھ، ڈلیفوز.....) کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں، مورخین نہ صرف یہ کہ غیر محتاط تھے بلکہ انھوں نے جان کر تاریخی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ میں پیش کیا تاکہ ہندو اور مسلمان رعایا کے دل ایک دوسرے سے پھٹے رہیں، مسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنے میں تو انگریز انشاپردازوں اور مورخوں کو خاص لطف آتا ہے ـــــ ضرورت تھی کہ پاکستان و بھارت کی تاریخ مستند مآخذ کی روشنی میں واقعات کو اچھی طرح کھنگال کر مرتب کی جائے، جناب سیّد ہاشمی فرید آبادی کی "تاریخ"، اسی جذبہ اور احساس کے ساتھ مرتب ہوئی ہے اور ہمارے خیال میں لائق مولف نے اپنی استعداد کی حد تک تحقیق و تفحص کی تمام کوششیں صرف کر دی ہیں، اور اس کے لئے وہ شکریہ اور تبریک کے مستحق ہیں۔

ـــــــــــــــــــــــ

[۱] کتابت و طباعت اور کاغذ اس قدر نفیس ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ اردو میں کتابیں بہت کم چھپتی ہیں۔

"تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" میں واقعات کو بڑے دل نشین انداز میں پیش کیا گیا ہے زبان فصیح اور پیرایہ بیان شگفتہ ہے، دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے خود کتاب پڑھنے میں دن رات ایک کر دیئے، بعض بعض مقامات پر جنگوں کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے کہ لڑائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے،

اس کتاب میں بادشاہوں، راجاؤں، امیروں اور فوجی افسروں کی جنگ و جدال ہی کا حال نہیں ہے بلکہ اُس زمانہ کے تمدن و تہذیب، سیاسی پس منظر، عام معیشت، حکومت کے نظم و نسق اور علمی و مذہبی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں یہاں تک کہ اجناس کی شرح اور تنخواہوں کے رقمی اعداد تک درج کر دیئے ہیں۔

اس تاریخ کے پڑھنے سے معلومات میں اضافہ اور بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوتا ہے ـــ مثلاً عہدِ اکبری کے صدر الصدور شیخ عبدالنبی کے بارے میں ہم شدید سوئے ظن میں مبتلا تھے مگر اس کتاب میں اُن کے حالات پڑھ کر وہ شدت معتدل ہو گئی۔ ـــــ مشہور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی کے بارے میں عام طور پر یہی خیال ہے کہ بداؤں اُن کا مولد و منشا تھا لیکن اس کتاب نے ہماری اس اطلاع کی تردید کی، ملا صاحب بداؤں میں نہیں اجمیر کے ایک موضع میں پیدا ہوئے تھے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ اُن کا خاندانی وطن بداؤں ہی تھا۔

ہوانگ چوانگ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ ہندستان میں سنگین جرائم کی تحقیقات کا یہ پرانا طریقہ بھی رائج تھا کہ ملزم کو آگ میں ڈال دیتے یا زہر کھلا دیتے تھے اور اگر وہ زندہ بچ جائے تو اُس کی بے گناہی ثابت ہو جاتی تھی (صفحہ ۵۲) بھارت باشیوں کی اس خاندانی عادت ہی کا یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات میں بعض مقامات پر بیکس و مجبور مسلمان جلتی آگ میں جھونک دیئے جاتے ہیں ٹھیک کہا ابن خلدون نے کہ قوموں کو بعض عادتیں موروثی طور پر ملتی ہیں۔

"محمد ابن قاسم کی کامیابی کا اصلی سبب اس کی طبعی شرافت اور ذاتی فراست تھی اُس نے اہلِ سندھ کے ساتھ نہایت نرمی اور فیاضی کا برتاؤ کیا، اُن کے رسم و رواج میں کوئی ایسی جبری تبدیلی نہیں کی جو انھیں ناگوار ہوتی، باشندوں کے سابقہ حقوق کی حتیٰ الامکان حفاظت کی اور جیسا ہم آگے پڑھیں گے انھیں مذہبی آزادی عطا کی، ملک بھر میں امن قائم، رفاہ کے آئین جاری ہوئے اور ذاتی طور پر یہ نوجوان عرب سندھ کے لوگوں میں ایسا محبوب و محترم ہو گیا کہ وہ اسکی معزولی اور گرفتاری پر اشک بار ہوئے، ایک مقام پر عقیدت مندوں نے اُس کی مورت بھی بنائی" (صفحہ ۹۲) ـــــ کاش! بھارت کے راج نیتاؤں تک کوئی اس تفصیل کو پہونچا دیتا کہ فتح و اقتدار کا کس طرح استعمال کیا جاتا ہے اور حکمرانی کے یہ طریقے ہوتے ہیں۔

دوسرا رُخ ـــــ (صفحہ ۶۶) "ان چار برنوں کے درجے اور کام معین تھے"۔ "درنوں" سنسکرت کے اصل املا کے ساتھ ہی لکھنا تھا، جبکہ مصنف نے "ذات" کو "جات" دوسری جگہ لکھا ہے، اُردو میں "برن" بھیس اور روپ دھارنے کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے، بہت مشہور مصرعہ ہے ؎ جوگی کا برن ہم نے لیا یار کی خاطر ـــــ ـــــ (صفحہ ۷۱) "عرب مجاہدین کو پھر بھی سیری نہ ہوتی تھی" اس طرح لکھنا تھا "عرب مجاہدین کی پھر بھی سیری نہ ہوتی تھی" (صفحہ ۸۸) "محمد (ابن قاسم) کو یہ بزرگ فتح ۱۰ رمضان المبارک ۹۳ھ کے دن حاصل ہوئی"۔ "دن" یہاں زائد استعمال ہوا ہے، کئی جگہ مولف نے یہی غلطی کی ہے، اس طرح کوئی نہیں بولتا کہ "فلاں تاریخ کے دن میں نے یہ کام کیا۔۔" ـــــ (صفحہ ۹۱) "محمد (ابن قاسم) کو اتنی چھوٹی عمر میں ایسی بڑی فتوحات

نے قدرتاً اسلامی تاریخ میں ایک سورما بنا دیا ہے" لفظ "سورما" یہاں لفظوں کے توازن اور سیاق و سباق کے اعتبار سے وجدان کو کھلتا ہے "ہیرو" کا لفظ انگریزی سہی مگر وہ اردو میں داخل ہو چکا ہے اور اسی کا یہاں محل تھا ——— (صفحہ ۱۰۸) "نامتمدن زندگی بسر کرتی تھیں" "نامتمدن" کانوں کو اجنبی محسوس ہوا "غیر متمدن" "غیر مہذب" "غیر تعلیم یافتہ" ہی عام طور پر کیا بلکہ ہمیشہ بولتے اور لکھتے ہیں ——— (صفحہ ۱۱۸) "پہلا معرکہ سابقہ حریف راجا جے پال سے پشاور کی حوالی میں ہوا" ——— "حوالی" زیادہ تر مذکر بولا جاتا ہے، "حوالیٔ پشاور" لکھ دینے سے تذکیر و تانیث کا یہ اشتباہ ہی باقی نہ رہتا اور جملہ کی ساخت محکم تر ہو جاتی ——— (صفحہ ۱۵۴) "وہ پرتھی راج کا دشمن صحیح، مسلمانوں کا دوست نہ تھا" "سہی" لکھنا چاہیئے تھا، یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

(صفحہ ۲۱۰) "باپ کے رد و کد کے سمجھانے سے بادشاہ نے پرہیز و پارسائی کی قسمیں کھائی تھیں، مگر واپس ہونے کے بعد راستے ہی میں توبہ توڑ دی اور احمقانہ افراط کی وجہ سے بہت جلد ضعیف و زرد بلکہ فالج میں مبتلا ہو گیا" ——— "احمقانہ افراط" نے جملہ کے وزن کو ہلکا اور بات کو گنجلک بنا دیا اور "افراط و تفریط" اپنی جگہ خود غیر دانائی کی بات ہے" "دانشورانہ افراط" سننے میں نہیں آئی ——— (صفحہ ۲۲۱) "عام مسافر یا تجارتی قافلے اور بھی آہستہ چلتے اور ہر دس بارہ میل پر سرائے یا دیہات میں پڑاؤ کرتے جاتے" "دس بارہ کوس" لکھنا چاہیئے تھا، ایک دن میں دس بارہ میل کی رفتار تو بہت ہی کم ہے ——— (صفحہ ۲۳۵) "ملوک شمسی ہی کے دور میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتان میں اور شیخ فرید الدین گنج شکرؒ پاک پٹن میں تزکیہ نفوس اور معرفتِ الٰہی کی "وہ" تعلیم دینے میں مصروف رہے جس کے فیوض شمالی بھارت اور پاکستان کے ہر گوشہ میں پھیل گئے" "وہ" یہاں کھٹکتا ہے "تعلیم" کی خصوصیت کا اظہار کرنا مقصود تھا تو اس جملہ کی ساخت ہی دوسری طرح کی ہونی چاہیئے تھی ——— (صفحہ ۲۴۹) "اور کئی جگہ غلطی کھائی" "غلطی کی" لکھنا تھا "ٹھوکر کھانا" البتہ بولتے ہیں۔

(صفحہ ۲۵۶) "خیال، قوالی وغیرہ چند راگنیوں کی ایجاد اور ستار کی اختراع بھی اُن سے منسوب کرتے ہیں" "قوالی" کسی راگنی کا نام نہیں ہے، (صفحہ ۲۹۹) "خاندانِ شاہی کی دہلی میں تباہی سُن کر اُسے سخت صدمہ ہوا" ——— "تباہی کا حال سُن کر" فصیح تر تھا، اور ہم "تباہی سُن کر" سے صرفِ نظر بھی کر جاتے مگر مولف نے ایک جگہ "ارادہ سُن کر" بھی لکھا ہے، اس لئے اس کا ذکر ضروری سمجھا ——— (صفحہ ۳۸۸) "برسات میں خوب بارش برستی اور پھر مزے کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں" "بارشیں ہوتی ہیں" لکھنا تھا، "برسنا" مینہ اور بادل کے ساتھ بولتے ہیں ——— (صفحہ ۳۹۶) "توپوں نے راج پوت تلواریوں کے دھوئیں بکھیر دیئے" ——— "دھوئیں اُڑا دیئے" روزمرہ ہے۔ "دھوئیں بکھیر دیئے" ہر اعتبار سے غلط ہے "بکھیرنا" "شیرازہ" کے ساتھ آتا ہے ——— اسی صفحہ (۳۹۶) کا ایک جملہ ہے "مغل سوار بڑی چستی سے دشمن کو دھکیل دھکیل کر زد میں لاتے اور توپ و تفنگ کا لقمہ بنواتے رہے" "لقمہ بنواتے رہے" کو پڑھ کر وجدان وحشت محسوس کرتا ہے حیرت ہے کہ مصنف کو اس کا احساس نہیں ہوا۔

---

۵ اور یہاں تو عیش کی افراط ہے!

(صفحہ ۴۱۴) " بادشاہ کی باخبری اور مستعدی کی مثال یہ کہ ایک عزیز خضر خاں سردانی کو بنگالہ کا صوبہ دار بنایا تھا، اس کے سر میں شیخی کی ہوا اور دولت کا نشہ بھرا، خضر گم راہی پر مائل ہوا، مگر اس وادی میں چند قدم چلنے پایا تھا کہ پنجۂ شیر نے گردن دبائی، خضر کو ذلت و گم نامی کی جھیل میں غوطہ دیا" ــــــ یہ "تاریخ" کی نہیں " قصہ گوئی کی زبان ہے، سید ہاشمی فرید آبادی نہیں معلوم، ہوتا ہو کہ میر باقر علی داستان گو بول رہا ہے ــــ
ــــ (صفحہ ۴۳۳) مصنف اپنے بادشاہ کو بڑھانے کی خاطر دوسروں کو گھٹانے میں کمی نہیں کرتا، سلاطینِ پیشیں کے فضائل اکبر کے سر منڈھتا ہے" " منڈھنا" یہاں قطعاً غلط استعمال ہوا ہے، یہ لفظ الزام یا تہمت کے لئے بولا جاتا ہے اور یہاں اس کا محل نہیں ہے ــــــ (صفحہ ۴۶۸) " آٹھ دس برس تک شیخ عبدالنبی کی چڑھ بنی رہی" " چڑھ بنی رہی" کیا بات ہوئی ــــ (صفحہ ۴۹۳) " متھرا کے قریب چھاؤنی رمائی" "چھاؤنی چھائی" لکھنا تھا، " رمانا" " دھونی" کے ساتھ بولتے ہیں ــــــ (صفحہ ۵۸۶) " حضرت مجدد کے خلف ارشد خواجہ محمد معصوم رحمہ سے عالم گیر نے کسبِ فیض کیا اور اُن کے صاحبزادے اکثر آتے اور بادشاہ کے پاس نائبانہ " قیام فرماتے رہے" " نائبانہ" عجیب ترکیب ہے، نہ جانے مصنف کہنا کیا چاہتا ہو شاید یہ کہ خواجہ معصوم کے صاحبزادے اپنے باپ کے نائب کی حیثیت سے عالم گیر کے یہاں قیام فرماتے رہے، طولِ کلام سے بچنے کے لئے " نائبانہ" کی ترکیب تراشی گئی ہو مگر اس نے جملہ میں بے ربطی سی پیدا کر دی ــــــ (صفحہ ۵۰۳) " اور تلوار پر قسمت کا انحصار رکھنے پر مجبور کر دیا" " انحصار" کے ساتھ " رکھنا" نہیں بولا جاتا اور کسی طرح کھینچ تان کر " رکھنا" یہاں درست بھی ثابت کر دیا جائے، پھر بھی اس جملہ کی ساخت ہی کاواک ہے ــــــ (صفحہ ۵۳۵) " سموگڈھ کی فتح نے اس کے جنگی جوش کو سمو دیا تھا" ــــــ آخر اُس کے جنگی جوش کو کس چیز میں سمو دیا تھا اُس کا ذکر نہیں کیا گیا اور " سمو دینے سے" لکھنے والا کس مفہوم کا اظہار چاہتا ہے؟ ــــ

سید محمد صاحب جون پوری کو فاضل مولف نے بہت سراہا ہے، ہمارا خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا " تذکرہ" مولف کے پیشِ نظر رہا ہے، حیدرآباد دکن میں جن مہدویوں سے ہماری ملاقات ہوئی وہ یہ کہتے تھے کہ سید محمد صاحب نے خانۂ کعبہ کے سامنے " مہدویت" کا دعویٰ کیا اور فرمایا کہ جو کوئی میری مہدویت کو تسلیم نہ کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، بہت ممکن ہو کہ سید محمد جون پوری کے عقیدت مندوں نے یہ کلمات اُن سے منسوب کر لیئے ہوں، بہر حال مہدوی حضرات عام مسلمانوں کو بے دین سمجھتے ہیں، اُن کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے اور حیدرآباد دکن اور ریاست میسور میں اُن کی مسجدیں اور قبرستان عام مسلمانوں سے الگ ہیں ــــ نواب بہادر یار جنگ مرحوم اپنے آبائی مذہب کے اعتبار سے مہدوی تھے لیکن اللہ تعالےٰ نے اُن کی ہدایت فرمائی اور وہ سید محمد جون پوری کے دعویٰ مہدویت کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتے تھے اُنہوں نے اپنی ڈیوڑھی (مہدوی منزل ــ واقع بیگم بازار) کا نام بھی بدل کر " بیت الامت" رکھ دیا تھا۔

" تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت" میں بادشاہوں اور راجاؤں کے علاوہ مشاہیر صوفیا، علما اور شعراء کے حالات بھی ضمناً آ گئے ہیں، غزالی، شیرازی، ملا قاسم کاہی، شیری سیال کوٹی، سعیدائے گیلانی، منشی چندر بھان برہمن (میر منشی شہزادہ دارا شکوہ) اور شیدا اکبر آبادی کے نام اور کلام سے عوام تو

کی بعض خواص بھی شاید واقف نہ ہوں مگر یہ تاریخ اُن کا تعارف کراتی ہے ـــــــ لفظ واصطلاح کی بعض تحقیقات معلومات میں اضافہ کرتی ہیں ... مثلاً "آریا کسی جداگانہ نسلِ انسانی کا نام نہیں ہے بلکہ آریا (بہ معنی شریف) سید ڈیزا کی طرح ایک اعزازی لقب تھا" ـــــ "لفظِ تغلق کی نسبت فرشتہ نے "ملحقاتِ طبقات ناصری" کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اصل میں یہ ترکی زبان کا اسم صفت "تغلغ" تھا جس کے معنی بڑے یا بزرگ کے آتے ہیں، اسی کو اہلِ ہند نے الٹ کر تغلق بنا دیا" ـــــ بابر کی تزک کا جو حصہ نقل کیا ہے اُس میں لکھا ہے :-

"ہندوستان کے خاص میووں میں سے ایک انبہ (آم) ہے اکثر ہندوستانی "ب" کو ساکن بولتے ہیں وہ ایک واہیات لفظ بن جاتا ہے اسے "نغزک" کہنے لگے، چنانچہ امیر خسرو فرماتے ہیں :-

نغزکِ ما نغز کن بوستاں

نغز ترین میوۂ ہندوستاں

فاضل مولف جب مسلمانوں کی فتحمندی کا حال لکھتے ہیں تو اُن کا قلم جوشِ مسرت سے جھومنے لگتا ہے واقعہ یہ ہے کہ کوئی مصنف کتنا ہی غیر جانبدار کیوں نہ ہو مذہبی اثرات اور قومی رجحانات سے دامن بچانا محال ہے، مگر عدل کا سررشتہ ہاتھ سے جانے نہ پائے تو یہ کوئی معیوب بات نہیں۔

افسوسناک حقیقت مسلمانوں کی تاریخ پڑھ کر کشور کشائی اور فتحمندیوں کی داستانوں سے جہاں خوشی ہوتی ہے، وہاں اس بات کا صدمہ بھی ہوتا ہے کہ جمل و صفین میں مسلمانوں کی جو تلوار کھنچی تھی وہ پھر نیام میں نہیں آئی ـــــــ ایران کابل اور ہندوستان میں مسلمان بادشاہ ایک دوسرے پر بلا دریغ چڑھائی کرتے ہیں جس میں ہزاروں نہیں لاکھوں کلمہ گویوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں اور حیرت ہے کہ منبر و خانقاہ سے اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی ـــــــ

ـــــــ کوئی خدا کا بندہ تاریخی واقعات پر سچائی کے ساتھ احتساب کرتا ہے تو اُسے مطعون کیا جاتا ہے کہ تم تمام پچھلے مسلمانوں کو "غلط کار" بنائے دے رہے ہو، یہ تو "خارجیت" ہے، تمہارے اس احتساب سے بہت سے صلحاء اور علماء کی تنقیص ہوتی ہے، ان "مرجئین" سے کوئی پوچھے کہ حقائق پر کوئی کس طرح پردہ ڈال دے غلطیوں کو نیکی اور صواب کس طرح سمجھ لیا جائے۔

دین میں اصل اعتبار "کتاب و سنت" کا ہے اور اسی معیار پر ہر زندگی اور ہر واقعہ کو جانچنا چاہیئے جہاں جہاں اس معیار سے دوری ہے اُس سے ہمیں بھی دوری اختیار کرنی چاہیئے اور جہاں مطابقت ہے، وہ زندگی اور وہ عمل ہمارے لئے دلیلِ راہ ہے، دین کے تجدید اور احیاء کی اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہرگز نہیں ہے

---

۵۱ ترکی زبان میں

۵۲ اس میں مستثنیات بھی ہیں مگر ہم عمومیت کا ذکر کر رہے ہیں۔

سہ روزہ دعوت

سہ روزہ "دعوت" مدیر :- مولانا سید نورالحسن بخاری، سالانہ چندہ پندرہ روپے، ششماہی آٹھ روپے، فی پرچہ دو آنہ، ملنے کا پتہ مرکزِ تنظیم اہلِ سُنّت چوک جھنڈا لوہاری منڈی، لاہور۔

دنیائے صحافت میں بہت سے ایسے اخبار اور رسالے بھی ہیں جن پر "برعکس نہند نام زنگی کافور" کی مثل صادق آتی ہے یا کم سے کم یہ عالم ہے کہ "نام بڑے اور تھوڑے درشن" ــــــ مگر سہ روزہ "دعوت" کا جیسا نام ہے ویسا ہی کام بھی ہے، یہ جریدہ اللہ کے دین کی سچی اور بے لاگ دعوت کے لئے وقف ہے، اس کے مضامین میں جرات، بے باکی، صاف گوئی اور حق پرستی نمایاں ہوتی ہے یہ اخبار "کتاب وسنت" کا بہت بڑا مبلغ ہے اور جس فرقہ اور گروہ کو کتاب وسنت سے ہٹا ہوا دیکھتا ہے اس پر احتساب کرتا ہے، خاص طور سے "فتنہ قادیان" کے لئے تو اس کے مضامین "ضرب کلیم" کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہم تو کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے مولانا سید نورالحسن بخاری کو اس دجالی فتنے کے استیصال کے لئے مامور فرمایا ہے اور وہ اسلام اور پاکستان کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں!

"دعوت" ظاہری محاسن اور "GET UP" کے اعتبار سے بھی خوب ہوتا ہے، مفید معلومات بھی اس میں شائع ہوتی ہیں، نظموں میں روانی اور شگفتگی کے ساتھ اسلامی رنگ غالب ہوتا ہے، اداریہ میں بعض وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایڈیٹر نے اپنے دل کی دھڑکنیں لفظوں میں سمو دی ہیں یہ اخبار زیادہ سے زیادہ اشاعت کا مستحق ہے!

سالنامہ "صحت"

سالنامہ "صحت" مُدیر :- حکیم سید عثمانی، سالانہ قیمت دو روپے، فی پرچہ تین آنہ، یہ سالنامہ جس کی ضخامت ۴۴ صفحات ہے اس کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ، ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "صحت" بارنس اسٹریٹ، کراچی ۳۔

"صحت" خراب ہو تو آدمی سے دین اور دُنیا کا کوئی کام ٹھیک طرح سے انجام نہیں پاسکتا، ماہنامہ "صحت" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس غرض کے لئے شائع ہوتا ہے کہ لوگوں میں جسمانی صحت کی حفاظت کا صحیح شعور پیدا ہو ـــــــ اب اس نے اپنا شاندار سالنامہ "بچوں" کے لئے شائع کیا ہے! ہمارے اس جملے سے اس غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ اس میں شاید بچوں نے مضامین لکھے ہیں، نہیں یہ بات نہیں ہے اس سالنامہ کو بچوں کے علاج معالجہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔

ماہنامہ "صحت" اطفال کا طبی مشیر ہے اس میں بچوں کے امراض جسمانی نگہداشت اور حفظانِ صحت کی تدابیر سے بحث کی گئی ہے، یونانی طبیبوں کے علاوہ ڈاکٹروں نے بھی اس کے لئے مضمون لکھے ہیں، کچھ مضامین ایسے ہیں کہ جن سے عام لوگ استفادہ کر سکتے ہیں اور بعض مضامین جن میں فنی خصوصیات آگئی ہیں وہ صرف طبیبوں اور ڈاکٹروں کے کام کے ہیں۔

سالنامہ "صحت" (طبیبِ اطفال) میں "طب" پر ایک علمی مقالہ بھی ہے جس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، چیچک (جدری) "Small Pox" کے بارے میں لکھا ہے کہ زکریا رازی پہلا

فاران

جلد (۳) ——— شمارہ (۲)

ماہ نامہ

فاران

مئی سنہ ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ
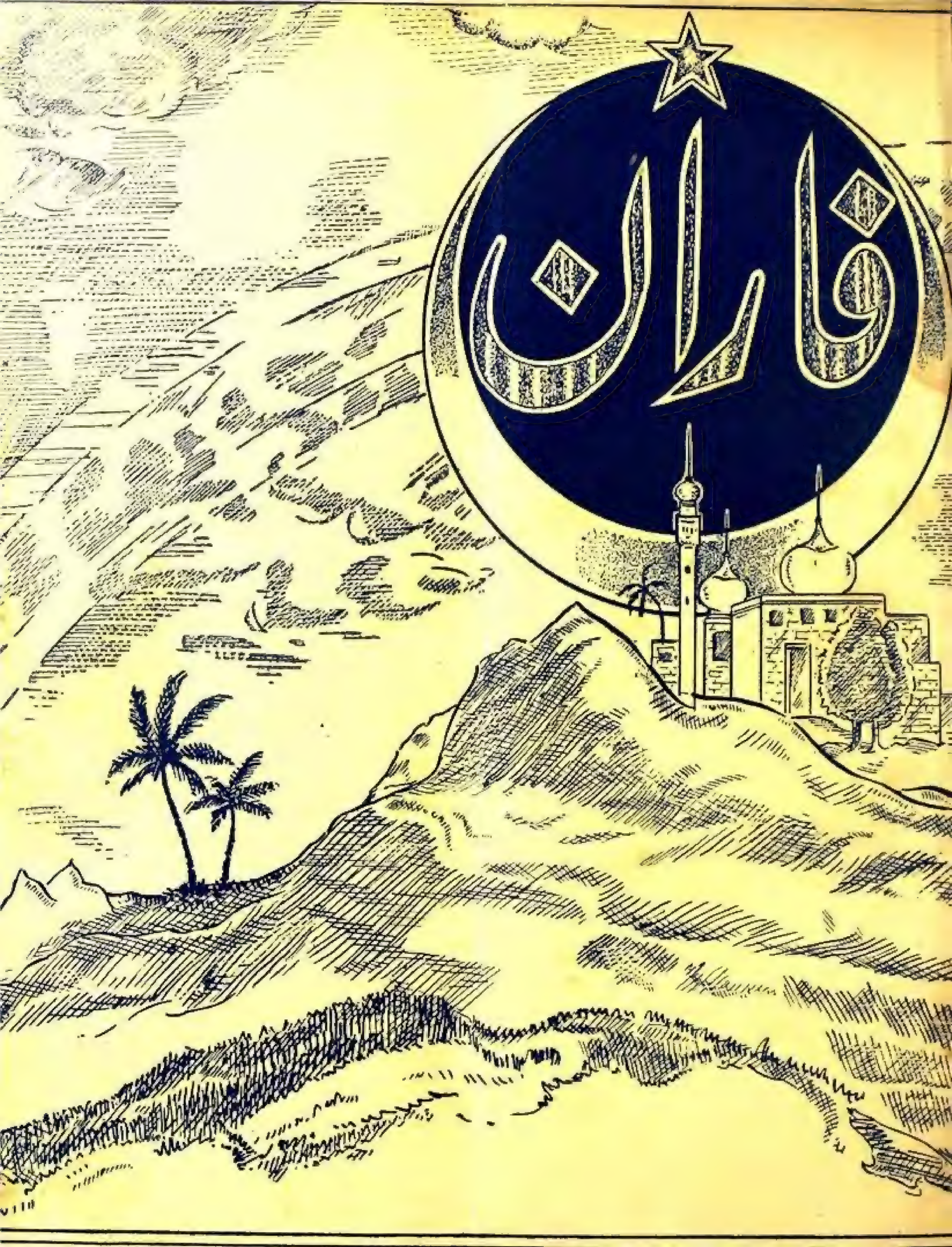
۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر

"فاران" - کیمبل اسٹریٹ

کراچی

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل!

تمدن کی یہ بوقلمونیاں اور تہذیب کی یہ رنگ آرائیاں یقیناً "ترقی یافتہ" دور کی زندہ نشانیاں اور بولتے ہوئے آثار ہیں، ہوا اور پانی کو آدمی مسخر کر چکا ہے اور برق و بخارات کی قوتوں نے زمین اور وقت کے فاصلوں کو کم کر دیا ہے، پچھلے لوگ اگر زندہ ہو جائیں تو آج کی دنیا انھیں ایک طلسمِ حیرت نظر آئے اور وہ ایسا محسوس کریں جیسے یہ کارخانہ جادو کے زور سے چل رہا ہے، ایجاد و اختراع کی افادیتوں اور حیرت سامانیوں کا یہ عالم ہے کہ اعداد کی میزان لگانے اور ہندسوں کے جوڑنے تک کی مشین وجود میں آ چکی ہے!

قدرت نے اشیاء میں جو قوتیں رکھ دی ہیں اور کائنات میں جو توانائیاں بکھیر دی ہیں اُن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے، انکشاف، اکتشاف، ایجاد اور اُس کے ساتھ ہی استفادہ کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے، سائنس آدمی کی سہولتوں اور آسانیوں کے لئے ہر امکانی کوشش کر رہی ہے اور اس کے لئے وہ یقیناً تبریک و تحسین کی مستحق ہے۔

اس اعتراف کے باوجود ہم "ترقی یافتہ" دماغوں سے پوچھتے ہیں کہ انسان کی "ترقی" کیا صرف ان ایجادات و اختراعات ہی کا نام ہے؟ نئی نئی چیزیں بنا کر اور حیرت انگیز قوتوں سے فائدہ اُٹھا کر کیا آدمی مطمئن ہو جائے کہ اُس نے ترقی کر لی؟ ہماری آج کی گفتگو کا یہی موضوع ہے، اور ہم خالص عقل و فکر اور دانش و آگہی کی بنیاد پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

بغیر مسلسل چھتیس چھتیس گھنٹے تک اُڑنے والے کبوتر موجود ہیں اور ابھی تو طیارے تسلسل پرواز میں کبوتروں کی برابری بھی نہیں کر سکے، ہوائی جہاز کی ایجاد اور اُس کی برق رفتاری یقیناً انسان کا بہت بڑا کارنامہ ہے مگر اس شرف و افتخار میں پرندے بھی اُس کے شریک ہیں ؞

دُخانی جہازوں نے سمندروں کے سینے چیر دیئے ہیں، دَریا کی پُرشور موجوں پر آدمی فرماں روائی کر رہا ہے، پانی میں جہاز اس طرح چلتے ہیں جیسے سمندروں میں بیچ بیچ سڑکیں بنی ہوئی ہیں ——— اس کوشش اور ترقی پر سائنس کو مُبارکباد! مگر سمندروں میں ایسی مخلوق بھی رہتی ہے جس کا اوڑھنا بچھونا پانی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، بحر و دریا کی ہولناک موجیں چھوٹی سے چھوٹی مچھلی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، یہ مگرمچھ، گھڑیال اور مچھلیاں حقیقت میں سمندروں پر حکومت کرتی ہیں، آدمی کے اس کارنامے کو بھی نہنگ و ماہی آئینہ دکھاتے ہیں!

آدمی نے کیسے کیسے خوشنما کپڑے ایجاد کئے ہیں مگر تتلیوں کے جسم کے نقش و نگار اور قمری و فاختہ کے پروں کی نفاست کے سامنے لباس کی یہ خوشنمائیاں سرِ افتخار بلند نہیں کر سکتیں، موسیقی و غنا پر آدمی ہزاروں سال سے محنت اور ریاض کر رہا ہے اور اب تو یہ فن مستقل "آرٹ" بن گیا ہے لیکن یہ تمام مزامیر اور خوش نوائیاں ایک طرف اور کوئل کی کوک اور بُلبل کی چہک ایک طرف!

یہ تو اس تصویر کا ایک رُخ ہوا، اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ "ایجادات" اور "اختراعات" آدمیوں کی سہولتوں، آسانیوں اور منفعتوں کے لئے وجود میں آتی ہیں، یعنی ایجاد و اختراع کے سلسلہ میں انسان نے جو ترقیاں کی ہیں اُن کا مجموعی نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا کہ دُنیا زیادہ سے زیادہ سکھی، خوشحال اور مطمئن ہوتی مگر ہم حالت اس کے برعکس دیکھ رہے ہیں، جس دُنیا کو "ترقی" نے بہشت بنانا چاہا تھا وہ جہنم سے بدتر نظر آتی ہے، اور یہ کوئی شاعرانہ استعارہ نہیں ہے، یہ واقعات و حقائق ہیں جن پر حرف گیری کی جُرأت وہی شخص کر سکتا ہے جس کی عقل پرندوں کے ساتھ چُگنے اور جانوروں کے ساتھ کھیتوں میں چرنے کیلئے چلی گئی ہو۔

عجیب بات ہے کہ تمدن و تہذیب اور ایجاد و اختراع میں آدمی جتنا زیادہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر اُس کا ماحول ابتر اور پراگندہ ہوتا جاتا ہے، دُنیا شاید ہی تاریخ کے کسی دَور میں آج کی طرح پریشان اور مضطرب رہی ہو، کائنات کے گوشہ گوشہ میں فتنہ و فساد کے جہنم سلگ رہے ہیں مشرق بھی خراب ہے اور مغرب بھی تباہ ہے، کالے بھی پریشان ہیں، گورے بھی ضیق میں ہیں اور زرد رنگت والوں پر بھی حیرانیاں اور بے اطمینانیاں مسلط ہیں ؞

معلوم ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدّن اور ترقیوں اور ایجادوں کی اس مشین میں کوئی نہ کوئی ایسی خرابی ضرور موجود ہے جس کے سبب ابتری پھیلی ہوئی ہے، پس جب تک یہ بنیادی خرابی دُور نہ ہوگی، اُس وقت تک تہذیب و تمدّن کی ظاہری چمک دمک اور چیزوں کی ایجادوں میں تو اضافہ ہوتا رہے گا مگر خود "انسانیت" گھٹتی رہے گی ؞

صحیح استعمال

تلوار ایک مُفید آلہ ہے اور اگر وہ تیز اور جوہردار ہو تو اور زیادہ قابلِ تعریف ہے، کوئی شخص تیغ جوہردار کو لیکر خود اپنا پاؤں کاٹ لیتا ہے، یا اپنے عزیزوں دوستوں، ہمسایوں اور راہ گیروں پر چلاتا ہے یا اُس سے پیاز چھیلتا اور سیب تراشتا ہے تو ان تینوں صورتوں میں خود اُس کو اور دوسروں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑے گا، تلوار کی افادیت اپنی جگہ مسلّم مگر چونکہ اُس کا استعمال صحیح مقصد کے لئے نہیں ہوا اس لئے فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہوا، یہ مثال دُنیا کی تمام ایجادوں اور چیزوں پر منطبق ہوتی ہے، ایجادیں اور اختراعیں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتی ہیں اگر اُن کو صحیح طور پر استعمال نہ کیا جائے تو جو کوئی شخص ایجاد و اختراع کے

غلط استعمال پر احتساب اور تنقید کرتا ہے، وہ چیزوں، اور ایجادوں کی افادیت کا منکر نہیں ہے ؛

پس جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایجاد و اختراع کی یہ تہذیب اور یہ ترقی یافتہ تمدن انسانیت کو نقصان پہونچا رہا ہے، اور اس کے سبب دُنیا میں ابتری پھیل رہی ہے تو اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم ہوائی جہازوں، موٹروں اور بائیسکلوں کو توڑ کر اُن کی جگہ اونٹوں کی سواری لانا چاہتے ہیں یا اس تنقید و احتساب سے ہماری یہ غرض ہرگز نہیں ہے کہ کرسیوں اور صوفوں کو آگ لگادی جائے اور لوگ ٹوٹی ہوئی چٹائیوں اور پھٹے ہوئے بوریوں پر بیٹھا کریں یا کاغذ سازی کے کارخانوں کو توڑ پھوڑ کر لوگ اونٹوں کی کھالوں، ہڈیوں اور کھجور کے پتوں پر لکھا کریں ۔

ایک دوسری مثال ۔۔ جو شخص بھی قلم کو استعمال کرتا ہے وہ اُس سے لکھنے کا کام لیکر قلم بنانے والے کے منشا کو پورا کرتا ہے اگر کوئی شخص قلم سے لکھنے کے بجائے اس سے زمین کھودنے کا کام لینے لگے تو اُس کا یہ فعل چونکہ قلم بنانے والے کے منشا کے خلاف ہوگا اس لئے قلم کی افادیت نقصان سے بدل جائے گی پس معلوم ہوا کہ چیزوں کے استعمال میں چیز کے بنانے والے کی غرض اور منشا کا جاننا ضروری ہے۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ دُنیا میں کوئی چیز خود بخود وجود میں نہیں آجاتی، کوئی اُسے وجود میں لاتا اور بناتا ہے تو وجود میں آتی ہے، جب ننھی سی سوئی اور چھوٹی سی آلپین کے ساتھ کاریگر اور صناع کے وجود کی علت وابستہ ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اتنی عظیم الشان منظم کائنات خود بخود وجود میں آگئی ہو ؛

اس کائنات کا یقیناً ایک بنانے والا ہے، اور جس طرح قلم بنانے والا لکھنے کے لئے قلم کو بناتا ہے اسی طرح خالق کائنات نے کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، اتنا بڑا نظام صرف تفریح اور دل بہلانے کے لئے وجود میں نہیں آیا۔

۔۔۔۔۔ جس طرح ہر چیز کا بنانے والا ایک مقصد اور ایک کام کے لئے کسی چیز کو وجود بخشتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُسی کے منشا کے مطابق چیز کا استعمال کیا جائے اسی طرح خالق کائنات اور رب السموات والارض کی بھی یہی مشیت اور مرضی ہے کہ اُس کی بنائی ہوئی کائنات کی ہر چیز اُس کے منشاء کے مطابق استعمال ہوا کرے ؛

دُنیا میں کوئی شخص اس کائنات کے اعراض جواہر اور مواد اور مسالہ کے بغیر گھاس کا ایک تنکا بھی پیدا نہیں کرسکتا جو ایجاد اور اختراع ہوتی ہے وہ اسی کائنات ہی کے مسالہ (M A T T E R) سے ہوتی ہے پس تمام موجدین اور مخترعین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو خالق کائنات کے منشاء کے مطابق استعمال کریں، اس لئے کہ جس طرح چیز کا بنانے والا، چیز کی حکمتِ ایجاد اور غایتِ تخلیق کو بہتر جانتا ہے، اسی طرح خالق کائنات تخلیق کائنات کی حکمت اور غایت سے باخبر ہے، پس ایجاد اختراع اور تہذیب و تمدن میں جہاں جہاں خالق کائنات کی حکمت، مشیت اور منشاء کو ملحوظ رکھا جائے گا وہاں بناؤ پایا جائے گا اور جہاں اس سے غفلت، تساہل یا بیزاری ہوگی وہاں بگاڑ پیدا ہو کر رہے گا۔

صراطِ مستقیم

ان بدیہی مثالوں اور دھوپ سے زیادہ روشن شواہد کے باوجود جو کوئی شخص خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے تو وہ ہماری اس گزارش کا مخاطب ہی نہیں ہے کیونکہ جو شخص خدا ہی کو نہیں مانتا، وہ اس کی کتابوں، نبیوں اور رسولوں اور اُس کے احکام کو کیوں ماننے لگا، اور آگے چل کر ہم انہی حقائق پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں ۔۔۔۔ افسوس ہے کہ ہم مُردوں کو اپنی آواز نہیں سُنا سکتے اور نہ پتھروں کے سینوں میں جذبات پیدا

اور خشونت پر اُتر آئے! یہ درشتی نہیں واقعیت ہے کہ منکرین خدا کی ہماری نگاہ میں مُردوں، اینٹ پتھروں اور جانوروں سے زیادہ حیثیت نہیں ہے چاہے اُنھوں نے کارل مارکس اور اینجلز کے پورے فلسفہ ہی کو گھول کر کیوں نہ پی لیا ہو!

ہاں تو ہم حکمتِ تخلیق اور منشاء خداوندی کا ذکر کر رہے تھے ـــــــ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ خدا کسی کو نظر نہیں آتا البتہ اُس کی نشانیاں ضرور نظر آتی ہیں، وہ اپنے منشاء اور احکام کا اعلان بھی نہیں فرماتا کہ مخلوقِ خدا ان غیبی آوازوں کو سُن کر اُس کے منشاء کو سمجھ لے اور نہ آسمانوں سے دستور و احکام کی لکھی لکھائی کتابیں نازل ہوا کرتی ہیں ـــــــ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ وہ خود انسانوں میں ہی سے بہترین نفوس اپنے پیغام کے پہونچانے اور منشاء کے بتانے اور سمجھانے کے لیے منتخب فرما لیتا ہے، یہ لوگ عزت، شرافت، عصمت و پاکیزگی اور فہم و بصیرت میں تمام انسانوں سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں، دُنیا کا بڑے سے بڑا لالچ نہ تو ان کو نرم بنا سکتا ہے اور نہ کسی دھمکی اور خوف سے یہ سچے انسان مرعوب ہوتے ہیں، ان کو آرے سے چیرا جاتا ہے، ان کو بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینکا جاتا ہے، ان کی راہ میں کانٹے بچھائے جاتے ہیں ان کے سر پر نجاست ڈالی جاتی ہے، ان کا گلا چادر کے پھندے سے گھونٹ دیا جاتا ہے، ان کے مقابلہ کے لئے فوجیں تیار ہوتی ہیں، قوم ان کا بائیکاٹ کرتی ہے، پتھر برسا کر ان کا جسم لہو لہان کیا جاتا ہے، دیس چھوڑ کر ان کو پردیس جانا پڑتا ہے، مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہتے ہیں مگر ان نفوسِ قدسیہ کے پائے استقامت کو ذرہ برابر جنبش نہیں ہوتی اور اللہ کے پیام کی تبلیغ جاری رہتی ہے ۞

یہ وہی سچے انسان ہیں جن کو قرآن میں "انعمت علیہم" کہا گیا ہے، ان کے طریقہ اور راستہ کا نام "اسلام" ہے، اس راہ میں حضرت آدمؑ سے لیکر ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم تک کے نقشِ پا نظر آتے ہیں، دُنیا میں ہر منزل کج اور ہر راستہ ٹیڑھا ہے، سیدھی راہ بس یہی ایک اسلام کی راہ ہے، اس راہ کا آخری نشان محمدؐ رسول اللہ کا نقشِ قدم ہے کہ اب کسی اور نشان کی ضرورت باقی نہیں رہی، یہی نشان قیامت تک دلیلِ راہ اور چراغِ ہدایت بنا رہے گا، کچھ جھوٹے اور لپاڑیئے ایسے بھی پیدا ہوں گے جو اس آخری نشان کے بعد اپنا نشان بھی قایم کرنا چاہیں گے مگر سوادِ اعظم اس فریب میں مبتلا نہ ہو سکے گا، اب رہا کچھ لوگوں کا جھکاؤ اور رغبت و میلان، تو ہم نے شعبدہ بازوں اور جادوگروں کے پیچھے بھی کچھ عقیدت مندوں کو پھرتے ہوئے دیکھا ہے، اس دُنیا میں احمقوں کی کمی نہیں ہے!

"اسلام" صرف پوجا پاٹ کا مذہب نہیں ہے یہ وہ نظامِ انسانیت اور دستورِ فطرت ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے، وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایجادات اور اختراعات کن مقاصد کے لئے استعمال کی جائیں، سائنس کی ترقیوں اور اسلام کے مابین کوئی مزاحمت اور تعارض نہیں ہے کہ انسان کو کائنات کی توانائیوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اسلام چاہتا ہے کہ انسان کی صلاحیتیں پوری طرح اُبھریں اور خدا کی الوہیت اور قدرت کے بعد دُنیا کی ہر چیز آدمی کی قوتِ تسخیر کے سامنے سپر انداختہ ہو جائے ـــــــ یہ سب کچھ ہو اور ہونا چاہیئے مگر ان قوتوں، توانائیوں، ایجادوں اور اختراعوں کا استعمال اللہ تعالےٰ کی بنائی ہوئی حدود کے اندر رہ کر ہونا ضروری ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہر چیز مفید اور صالح مقصد کے لئے استعمال کی جائے، سائنس کی ترقیوں اور تہذیب و تمدن کی بوقلمونیوں کے ساتھ اگر "صالحیت" نہیں ہے تو اسلام کی نگاہ میں یہ ترقیاں زوال و پستی کی نشانیاں ہیں ۞

ایک چور بھاگنے میں اتنی ترقی کر جائے کہ صبا رفتار گھوڑے بھی اُسے نہ پکڑ سکیں تو اُس کی یہ ترقی اور تیزی شریفوں کے نزدیک قابلِ تحسین ہرگز نہیں سمجھی جائے گی کہ اس "ترقی" کا استعمال گناہ اور بُرائی کے کام میں ہو رہا ہے، اس کے برخلاف ایک شریف اور دیانتدار آدمی کو چاہے اتنا تیز بھاگنا نہ آتا ہو مگر اُس کی سُست گامی مطعون نہ ہو گی کہ اُس کا رُخ کسی بُرے مقصد کی طرف نہیں ہے ہاں! اس سے یہ ضرور کہا جائے گا کہ بھائی! اس زمانہ میں تیز رفتار چوروں کا دور دورہ ہے، اُن کے مقابلہ کے لئے تم بھی ذرا پھرتیلے بن جاؤ، اور سُستی کے مقابلہ میں تیزی اور مستعدی یوں بھی اچھی چیز ہے ؂

یہ ساری تہذیب چاہے وہ روس کی تہذیب ہو یا انگلستان اور امریکہ کی! اُس صبا رفتار چور ہی کی طرح ہے کہ جو بہت چالاک، چاق چوبند، مصلحت شناس اور تیز تو ضرور ہے مگر اُس کی یہ تیزی اور ترقی گناہ و معصیت میں صرف ہو رہی ہے، اس لئے جس کو دوسرے لوگ "ترقی یافتہ دَور" کہا کرتے ہیں، ہم اُسے "زوال و پستی" کا دَور کہتے ہیں ؂

دوسرے لوگ صرف بوقلمونیوں، رنگ آرائیوں اور ایجاد و اختراع کو دیکھتے ہیں اور ہم اُس کے ساتھ مقصد اور غایت بھی دیکھتے ہیں کہ اشیاء اور اُصولوں میں اصل اعتبار مقصد و غایت ہی کا ہے، اگر مقصد نیک نہیں تو پھر ہر "ترقی" ایک مستقل لعنت اور مجسّم ادبار ہے ؂

تہذیب و تمدّن کی تمام ترقیاں اُس راستہ پر جا رہی ہیں جو فساد و طغیان کا راستہ ہے، جہاں قدم قدم پر خدا کی نافرمانی ہوتی ہے اور اخلاق و انسانیت سے بغاوت کی جاتی ہے، جس جگہ نفس کی لذت کے پیچھے پیچھے آدمی ہاتھ باندھے پھرتا ہے، جہاں ذرا سی منفعت اور تھوڑی سی نمود و شہرت کے لئے اخلاق و پاکیزگی کی ہر حد توڑ دی جاتی ہے ——— اس کا نتیجہ بگاڑ، فساد، تباہی اور بربادی کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے! دنیا نے جو کچھ بویا تھا وہی کاٹ بھی رہی ہے، یہ کیسے ممکن تھا کہ اُس نے لگائے تو ببول کے پودے اور اُسے آم کھانے کو مل جاتے، ایسا کبھی نہیں ہوا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، یہ قدرت کا اٹل قانون ہے

از مکافاتِ عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو ز جو

اربابِ اقتدار سے!

یہ تو ایک عام خطاب تھا، اب ہمیں حکومتِ پاکستان کے اربابِ اقتدار سے کچھ عرض کرنا ہے اور یہ ہم آج پہلی بار گزارش نہیں کر رہے ہیں اس سے پہلے بھی یہ سعادت ہمیں حاصل ہو چکی ہے نہ جانے اونچے درباروں اور بلند سرکاروں میں ہم غریبوں کی آواز پہنچتی بھی ہے یا نہیں اور اگر پہنچتی ہے تو شاید وہ اس لئے بے اثر ہے کہ ہماری آواز کے پیچھے احتجاجی جلوس کے ہنگاموں کا اعلان اور ہڑتال کی دھمکیاں نہیں ہوتیں، اور انگریز جس طرح اس بات کا عادی ہو گیا تھا کہ جب تک شدید احتجاج کا اندیشہ اور امکان نہ ہو، وہ ہر معقول سے معقول مطالبہ کو اس کان سُن کر اُس کان اُڑا دیا کرتا تھا اسی طرح انگریز چلتے ہوئے پاکستان کی حکومت کو جن لوگوں کے چارج میں دے گیا ہے، وہ بھی غالباً انگریز کی اس "سنت" پر عمل پیرا ہیں ——— مگر اس قسم کے ہنگاموں کے تصوّر سے بھی ہم خالی الذہن ہیں، ہمارے پاس تو اللہ کا کلام ہے، رسولؐ کی سنت اور خلفائے راشدین کا اسوہ

فاروق کا حکم سنتے ہی خالد سیف اللہ اسلامی لشکر کی قیادت اور امارت سے خوشی کے ساتھ ہٹ گئے تھے ۔۔۔۔۔ ارباب اقتدار کو اپنے اندر یہ اسپرٹ پیدا کرنی ہوگی !

اسلام نے ہمیں سازش کرنا نہیں سکھایا اور نہ ہم منافقت برتنے کے لئے تیار ہیں، جو کچھ ہمارے دل میں ہے وہی ہماری زبان اور قلم پر ہے، ہم جو کچھ کہتے ہیں ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اور اس ذمہ داری کو محسوس کرکے کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنے ہر لفظ کی ہمیں جواب دہی کرنی ہے، اگر ہم کسی پر تہمت دھر کر اور الزام لگا کر اس دنیا میں قانون کی زد سے بچ بھی جائیں تو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے مواخذے سے نہ بچ سکیں گے، جب ہمارا یہ عزم اور یہ ایقان ہے تو پھر حق گوئی پر کسی قسم کے احتساب کا ہمیں خوف بھی نہیں ہے، مسلمان کے دل میں صرف خوفِ خدا ہی سما سکتا ہے، خدا کا ڈر اور بندوں کا خوف یہ دونوں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے ؛

اے پاکستان کی کشتی کے ناخداؤ! تم جب "اسلام" کا نام لیتے ہو تو اُس سے وہی اسلام مُراد ہونا چاہئے جس کو خدا کے آخری رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیش فرمایا تھا اور جو کتاب و سنت میں پایا جاتا ہے اور جس اسلام میں نہ "مینا بازار" ہیں نہ "خشک ناچ" کے جلسے ہیں، نہ عورتوں مردوں کا بے حجابانہ اختلاط ہے، نہ گھوڑ دوڑ کی شرطیں اور کلب گھروں کی قمار بازیاں اور عیش سامانیاں ہیں !

ہم پوچھتے ہیں کہ جس "اسلام" کا تم نعرہ لگاتے ہو وہ اسلام کہاں ہے ؟ کیا تمہاری جلوتوں، خلوتوں، جلسوں، پارٹیوں، کلب گھروں، کوٹھیوں اور بنگلوں میں وہ "اسلام" پایا جاتا ہے ؟ کیا تمہاری زندگیاں تمہارے قول سے ہم آہنگ ہیں ؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر ہم جیسے دیوانوں کو طوق و زنجیر پہنا کر پاگل خانہ میں بند کردو کہ تم جیسے "مجسّم اسلام" اور "سراپا دین" بزرگ و محترم ہستیوں کو ہم سمجھ ہی نہیں سکتے یعنی جن کے نام کے منبروں پر خطبے پڑھے جانے چاہیئے تھے اُن پر ہم جیسے کم نظر تنقید کرتے ہیں ۔۔۔۔۔ اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر خدا کے لئے بتاؤ کہ اس غیر اسلامی ماحول کو کب تک برداشت کرتے رہیں، آخر انتظار کی کوئی حد ہونی چاہئے، چار سال ہونے کو آئے مگر ۱۹۴۷ء میں نظم و نسق کا جو رنگ تھا وہی آج ۱۹۵۱ء میں بھی ہے، اس عرصہ میں لے دیکر اسلام کے نام اور قرار دادِ مقاصد کی بنیاد پر دستور کا ایک خاکہ تم نے بنایا تھا سو اُس نے تمہارے عزائم ہی کی نہیں تمہاری "اسلام فہمی" کی بھی قلعی کھول دی ؛

ایک ضعیف و ناتواں بڑھیا نے فاروقِ اعظم رض کا گریبان تھام کر اپنا حق طلب کیا تھا اور ہم تمہارے پاؤں چھو کر تم سے دریافت کرتے ہیں کہ اس چار سال کی مدت میں تم نے کس "معروف" کو قایم کیا اور کون سے "منکر" کو مٹایا، اگر ایسا نہیں ہوا اور واقعی نہیں ہوا تو پھر تم خود انصاف سے بتاؤ کہ وہ حکومت جس کی بنیاد اسلام پر رکھی گئی ہے اُس کی امارت، قیادت اور حاکمیت کیا تمہیں زیب دیتی ہے !

پاکستان اسمبلی کے حالیہ اجلاس میں بعض ارکان کی طرف سے جس صوبہ وارانہ[ه] ذہنیت کا مظاہرہ ہوا ہے اُس نے شدید اندیشے پیدا کردیئے ہیں، اگر پریس، ریڈیو اور سرکاری اور دفتری نظم و نسق کے ذریعہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی تو یہ تنگ نظریاں کب کی ختم ہوگئی ہوتیں ۔۔۔۔۔ مگر ختم کیوں ہوتیں جبکہ صوبہ پرستانہ ذہنیتوں کے ساتھ "پارٹی سسٹم" اور اس کا توازن قایم رکھنا ضروری تھا تاکہ ذاتی اقتدار اور شخصی وجاہت کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو ۔۔۔۔۔ اور ہم تو اس

[ه] پروانشلزم

کے ساتھ یہ شیشہ گری بھی دیکھ رہے ہیں کہ صوبہ کا وزیر اعظم کبھی عدالت میں ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی وزارتِ عظمیٰ کی مسند اُس کی فرش پا انداز بن جاتی ہے اور یہ بھی ہے کہ کچھ بیگمات "ملکہ نور جہاں" کا پارٹ ادا کر رہی ہیں' ان اُلجھاؤوں نے داخلی اور خارجی سیاست میں بہت سے پیچ ڈال دیئے ہیں ؛

کہا جاسکتا ہے کہ عوام بُرائیوں میں مُبتلا ہیں جب تک وہ اپنے اندر خود تبدیلی پیدا نہ کریں' اسلامی دستور کے نفاذ سے بھی کیا ہوسکتا ہے ؟ دستور نافذ ہوتے ہی لوگوں کے دلوں کو تو بدلنے سے رہا ـــــــ ہم مانتے ہیں کہ عوام (جن میں ان سطور کا لکھنے والا بھی شامل ہے) میں برائیاں پائی جاتی ہیں، عام طور سے زندگیاں غیر اسلامی انداز پر بسر ہو رہی ہیں مگر ہم اربابِ حکومت سے پوچھتے ہیں کہ تم حکومت کے دوسرے کاروبار میں کیا اُس وقت کوئی قانون نافذ کرتے ہو جب عوام اُس قانون کیلئے پہلے سے اپنے کو بدل لیتے ہیں ـــــــ سنہ ۱۹۴۷ء میں ریلوے ڈپارٹمنٹ کی آمدنی کتنی گھٹ گئی تھی عوام ریلوں میں بے ٹکٹ سفر کرنے کے عادی ہو گئے تھے، تم نے اس وقت کیا کیا ؟ کیا لوگوں کی ذہنیتوں کے بدلنے کا انتظار کیا گیا ؟ نہیں ایسا نہیں ہوا بے ٹکٹ چلنے والوں کے لئے سخت سے سخت تعزیری قانون جاری کئے گئے، شروع شروع میں غلط کاروں کو سزائیں بھگتنی پڑیں اور بھاری جُرمانے دینے پڑے مگر پھر حالات سُدھر گئے ؛

ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ تمھارا ادنیٰ سپاہی چوراہے پر ذرا انگلی اُٹھا دیتا ہے تو بڑے سے بڑے آدمی کی موٹر رک جاتی ہے اور اُس وقت تک رُکی رہتی ہے جب تک سپاہی چلنے اور راستہ کھلنے کا اشارہ نہیں کر دیتا کاش! "منکرات" کے روکنے اور مٹانے کے لئے بھی یہی طریقے اختیار کئے جاتے مگر افسوس ہے کہ نہیں کئے گئے اور نہ بظاہر اس کے آثار و علایم نظر آتے ہیں ؛

ہم عرض کرتے ہیں، منت کرتے ہیں، مطالبہ بلکہ احتجاج کرتے ہیں کہ خود کو بھی بدلو اور قانون و دستور کو بھی بدل دو' قراردادِ مقاصد میں تم نے جو وعدہ کیا تھا اُسے پورا کرو ـــــــ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کا ہم بھی انتظار کرتے ہیں اور تم بھی انتظار کرو! مگر یاد رکھو کہ اللہ کا فیصلہ غلط کاروں کے لئے بڑا شدید ہوتا ہے اور اس دُنیا میں سب سے بڑی غلطی اور بدتوفیقی یہ ہے کہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں اقتدار و قوت ہو اور وہ اُسے نیکیوں کے پھیلانے اور بُرائیوں کے مٹانے کے لئے استعمال نہ کر سکے، خدا کے لئے اپنے منصب کو پہچانو، اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، مت جاؤ اُن "جی حضوریوں" کی باتوں پر جو صرف اپنی منفعت کے لئے تمھاری ہم نوائی کرتے ہیں، اُن کی بات سُنو جو تم سے کسی فائدے اور منفعت کی اُمید نہیں رکھتے، جن کی کوئی ذاتی غرض تم سے وابستہ نہیں ہے، اور جن کے مشوروں کی بُنیاد خلوص اور للّٰہیت پر ہے!

ہم یہ بھی کہے دیتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہو کر رہے گا، یہ مطالبہ رُک نہیں سکتا، کیا اچھا ہو کہ یہ نیک کام تمھارے ہی ہاتھوں انجام پا جائے، لیکن تم نے اپنے فرض کو نہ پہچانا تو پھر دوسرے اس سعادت کو حاصل کریں گے!

ماہر القادری

۲۳ اپریل ۵۱ء

فلسفہ کیا ہے؟

(ڈاکٹر عشرت حسن انور ایم، اے۔ ایم، اے۔ پی، ایچ ڈی۔ لکچرار مسلم یونیورسٹی)

فلسفہ کے متعلق بعض لوگوں میں عجیب عجیب باتیں مشہور ہیں، کوئی اس کو حماقت سے تعبیر کرتا ہے، کوئی اس کو لایعنی بحث بتاتا ہے، فلسفہ کے خلاف عام مخالفت کے علاوہ بھی اور کئی محاذ ہیں مثلاً سائنس، مذہب[۱] اور کسی حد تک عام سیاسی نظریات بھی اس کی مخالفت کے درپے رہے ہیں، یہ تمام مخالفت بہت حد تک کم نگاہی اور کم فہمی کی بنا پر رہی ہے اور کسی حد تک تعصب اور بدگمانی کی بنا پر۔

فلسفہ آخر ہے کیا؟ اور اس مخالفت اور مخاصمت کی اصلی وجہ کیا ہے؟

فلسفہ کی تعریف کئی طرح سے کی جاسکتی ہے لیکن ہر ایک تعریف دوسری تعریفوں کا بھی کسی قدر احاطہ کرتی ہے، سرسری طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ فلسفہ غور و فکر کرنے کا ایک دوسرا نام ہے، ہر ایک انسان بحیثیت انسان کے غور و فکر کرنے پر مجبور ہے، یہی قوت فکر انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے، غور و فکر کرنا ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے اس فطری فکری صلاحیت کی رو سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر ایک انسان فلسفی ہے لیکن غور و فکر کرنے کے بھی ڈھنگ اور طریقے ہیں، چنانچہ بے ڈھنگے طریقہ کو چھوڑ کر ڈھنگ اور سلیقہ کے ساتھ غور و فکر کرنا ہی فلسفہ ہے، یہ انسان کی عقل و فکر کی قوتوں کو اجاگر کرنے کا نام ہے، یہ انسان کی عقل و فکر کی صلاحیتوں میں فروغ اور تنظیم پیدا کرنے کا ضامن ہے،

لیکن یہ کام تو ہر ایک فن یا علم انجام دیتا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخ یا سیاسیات یا طبعیات یا حیوانیات یا ریاضی سے فکر انسانی میں فروغ یا نظم نہیں پیدا ہوتا، یہ صحیح ہے کہ تمام علوم و فنون اپنی اپنی وسعت کے مطابق انسانی عقل و فکر میں ترقی اور تنظیم کا موجب ہوتے ہیں، لیکن فلسفہ کے مقابلہ میں ان تمام علوم و فنون کا فکر و تعقل میں ترقی کا موجب ہونا بلاواسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ ہے، ان علوم و فنون کے برعکس فلسفہ کا موضوع خود فکر انسانی ہے اور اس کا منتہائے نظر ہی یہ ہے کہ انسانی عقل و فکر کو جلا دیکر اس کو منظم اور مکمل بنا دے۔

چنانچہ فلسفہ کا مقصد ہی یہ ہے کہ کس طرح غور و فکر کیا جائے یا بالفاظ دیگر یہ ایک نظام فکر و تعقل ہے لیکن ابھی یہ کہا جاچکا ہے کہ ہر ایک انسان فطری طور پر غور و فکر کرنے کی طرف مائل ہے، اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان بذاتہ عقل و فکر کا حامل ہے تو پھر بھلا فلسفہ کی کیا ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ انسان فی نفسہٖ تعقل و تفکر کی طرف مائل ہے لیکن ہر ایک انسان اس سے واقف نہیں کہ کن بنیادی اصولوں کے تحت اس کی عقل و فکر مکمل اور مستند ہوسکتی ہے، غور و فکر کرنا تو ہر ایک جانتا ہے اور ہر ایک شخص اپنے اپنے حلقہ میں غور و فکر کرتا بھی ہے لیکن صحیح غور و فکر کرنے کے جو شرائط ہیں یا جو اصول ان سے متعلق ہیں ان اصولوں سے لوگ عام طور پر بے خبر ہیں اور بے خبر رہتے ہیں۔

[۱] اس کے بارے میں ایڈیٹر نے آخر میں اپنے معروضات پیش کئے ہیں!

اسی خیال کے تحت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "فلسفہ ایک غیر معمولی کاوشِ فکر کا دوسرا نام ہے "فلسفی کا یہ کام ہے کہ "وہ سوچے کہ حقایق کو کس طرح سوچے" "اور اس فکر میں تعقل و تفکر کے تمام شرائط بجا لائے"، اب یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید غور و فکر کرنا خود اختیاری چیز ہے اور جب ہمارا جی چاہے ہم غور و فکر اختیار کریں اور جب جی چاہے ہم اس سے باز رہیں، مگر ایسا نہیں ہے، ہم جو اشرف المخلوقات ہیں اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ کائناتِ عالم اور اس کی جزئیات پر غور و فکر کریں اور حقایق عالم کو سمجھنے کی کوشش برابر کرتے رہیں، ہاں اس قدر اختیار ضرور ہے کہ ہم سرسری خیالات ہی پر قناعت کر لیں یا اپنے خیالات کو منظم، مدلل، مستند اور روشن تر بنانے کی کوشش کریں، ہر ایک سلیم الطبع انسان یہ چاہے گا کہ اس کی فکر میں ہم آہنگی اور اصابت پیدا ہو سکے تاکہ اس کی قوت پرواز اور بھی بلند ہو سکے، کوئی بھی سمجھدار انسان یہ نہ چاہے گا کہ غور و فکر اس طرح کیا جائے کہ اس میں کوئی قرینہ نہ ہو غور و فکر میں اس قرینہ کو پیدا کرنا ہی فلسفہ ہے، اس تعریف کی رو سے تمام علوم فلسفہ کے محتاج ہیں چونکہ بغیر نظامِ فکر کو درست کئے کسی علم و فن کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی ؛

ہر ایک علم اپنی اپنی جگہ کائنات کے کسی نہ کسی جزو کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھنے کی کوشش میں ہے مثلاً طبیعات صرف مادہ کی کُن کو سمجھنے کے لئے کوشاں ہے، اس کے علاوہ اس کا کوئی اور منتہائے نظر نہیں، اسی طرح علم حیوانات صرف حیوانات تک محدود ہے، اس کے آگے قدم نہیں اُٹھاتا اسی طرح دیگر علوم کا حال ہے، اس سلسلہ میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں اوّل یہ کہ تمام علوم و فنون ایک آدھ حقیقت ہی کو سمجھنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مثلاً اگر طبیعات صرف مادہ سے متعلق ہے تو نفسیات صرف احساسات اور جذبات سے متعلق ہے تمام فنون اپنی اپنی حدود میں رہ کر اپنے اپنے متعلقہ موضوعات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں متعلقہ موضوعات کی حدود سے باہر قدم نکالنا ان کے لئے نہ صرف غیر ضروری بلکہ ناممکن بھی ہے،

فلسفہ دیگر علوم و فنون کے برعکس کائنات کے کسی جزو یا شعبہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کا مقصود کل کائنات کی حقیقت کو سمجھنا ہے چنانچہ اس کا موضوع عین حقیقت ہے کائنات کے کسی جزو یا شعبہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ حقیقت فی نفسہٖ کی تلاش میں ہے، یہ کائنات عالم کے تمام رموز کے انکشاف کے درپے ہے، اسی سعی میں اس کا سب سے بڑا ذریعہ تفکر و تعقل ہے، ؛

یہاں پر پہونچکر تمام دیگر علوم و فنون پر اس کی فوقیت محسوس ہونے لگتی ہے، اولاً یہ کہ تمام دیگر علوم و فنون بھی تعقل و تفکر کے محتاج ہیں مگر اکثر لوگ تعقل و تفکر کے جو شرائط یا جو ذرائع ہیں اُن سے ناآشنا رہتے ہیں، ثانیاً تمام دیگر علوم و فنون کا زاویۂ نگاہ اور کوشش ایک جزوی حقیقت اور محدود موضوع کو سمجھنے تک محدود ہے لیکن ممکن ہے محدود حلقہ میں رہ کر پوری حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکتا ہو، اس لئے ضروری ہے کہ فلسفہ کی روشنی ڈھونڈی جائے تاکہ کل کی روشنی میں جزو پر نظر ڈالی جا سکے، بہت ممکن ہے کہ اس سعی کے بغیر ہمارے تمام محدود علوم کی کوششیں بیکار اور عین حقیقت کے انکشاف سے قاصر رہیں، ثالثاً ہمارے تمام علوم و فنون کے نتائج اپنی اپنی جگہ اس وقت تک حتمی نہیں کہے جا سکتے جب تک کہ فلسفہ کی رو سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ تمام نتائج اور فیصلے آپس میں متضاد اور منافی نہیں ہیں، اگر کسی علم و فن کے نتائج کسی دوسرے علم یا فن کے نتائج سے ٹکراتے ہیں تو دیکھنا ہوگا کہ آخر وجہ تضاد کیا ہے اور اس تضاد کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے، یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ کسی بلند تر منظر سے حقیقت کو دیکھا جائے، اس بلند تر منظر پر پہونچنے کی کوشش فلسفہ ہے، یہ تمام علوم و فنون کے آپس کے ظاہری تضاد اور تقابل کو ایک بلند تر زاویۂ نگاہ کی اعانت سے دور کرنے کا ضامن ہے، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ طبیعات کی رو سے تمام حقیقت مادی ہے، نفسیات کی رو سے نفسانی واردات یا احساسات یا خیالات ہی اصل حقیقت کہے جا سکتے ہیں، دونوں

علوم میں بُعد المشرقین ہے، یہ تضاد، یہ منافرت کس طرح دُور ہو، آخر دونوں بیانات تو بیک وقت صحیح نہیں ہو سکتے، ان میں سے کس کو قبول کیا جائے اور کس کو رد کیا جائے یا اگر یہ نہیں تو ان دونوں کو کس طرح ایک دوسرے سے ہم آہنگ بنایا جا سکتا ہے؟

تقریباً ساٹھ ستر سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حقیقت کی تلاش میں اگر کہیں ایک تجربہ کچھ کہتا ہو اور دوسرا تجربہ کچھ اور تو ان دونوں میں سے صرف ایک ہی قابل قبول ہو سکتا ہے (چاہے دونوں کتنے مستند ہی کیوں نہ ہوں) اور دوسرے کو رد کرنا لازم ہوگا، یہ خیال اپنی جگہ کسی حد تک صحیح تھا اور قانون تضاد (Law of contradiction) پر اس خیال کی بنیاد تھی، اس خیال کے اثرات کے تحت سائنس، مذہب اور فلسفہ سب ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان سب کے آپس کے جھگڑے کس طرح طے کئے جائیں اور ان کی آپس کی اجنبیت اور منافرت کس طرح دور کی جائے، مذہب تمامتر فلسفہ کے خلاف تھا اور اس کے تمام بیانات اور انکشافات فلسفہ کا گلا گھونٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے اسی طرح سائنس نے فلسفہ کے خلاف بھی احتجاج بلند کر رکھا تھا،

شروع شروع میں جب مذہب کا زور تھا مذہب ہی کو حقیقت کی کسوٹی سمجھا جاتا تھا، فلسفہ کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا سقراط کو کسی حد تک اسی وجہ سے زہر پینا پڑا، اس کے خلاف یہ جرم تھا کہ وہ جوانوں کے خیالات خراب کرتا ہے اور یونانی دیوتاؤں کی عزت نہیں کرتا، برونو کو بھی اسی وجہ سے نذرِ آتش کیا گیا، لوگوں کے خیال میں وہ بھی مذہب کے مخالفین میں سے تھا ——— پھر ایک زمانہ وہ آیا جب سائنس کا بہت زور شور ہوا، سائنس نے بھی مذہب کی طرح فلسفہ سے ٹکر لی اور کچھ دنوں کے لئے سائنس کے انکشافات اور تجربات ہی کو حق نما اور حقیقت کا آئینہ دار سمجھا گیا، مگر یہ حالت کسی طرح بھی اطمینان بخش نہ تھی لوگوں نے سائنس اور فلسفہ کی آپس کی اجنبیت وغیریت کی وجہ پر غور و فکر جاری رکھا اور اس غور و فکر کا بہت جلد ہی ایک نتیجہ نکلا، فلسفیوں کو محسوس ہوا کہ فلسفہ سائنس کے نتائج کو ٹھکرا کر آگے نہیں بڑھ سکتا نیز سائنسدانوں کو احساس ہونے لگا کہ سائنس کے تمام نتائج کو جمع کرنے کے بعد بھی فلسفہ کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس صورت میں اسکی ضرورت کسی قدر شدید محسوس ہوتی ہے، سائنسدانوں نے بھی سائنس کے تمام تجربات، نظریات اور انکشافات پر غور و فکر کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ سائنس کی جزوی تحقیقات کے بعد یہ بھی غور کرنا لازم ہے کہ جزوی حیثیت سے نہیں بلکہ من حیث المجموع سائنس کے یہ تمام بیانات کس غایتِ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اس سوال کے اُٹھانے سے سائنس کی جو اجنبیت مذہب سے تھی وہ بھی کسی حد تک کم ہو گئی اور کسی حد تک سائنس فلسفہ سے بھی قریب تر ہو گیا۔

خوش قسمتی سے اسی عرصہ میں کچھ اس قسم کے سائنسداں گزرے ہیں جو اپنی شعبہ دارانہ تنگ نظری سے تنگ آ گئے تھے اور انھوں نے دوسرے علوم و فنون کی تحقیقات کی روشنی میں اپنے نظریات کو پرکھنا اور جانچنا چاہا، یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس جانچ پڑتال میں فلسفہ سے بھی امداد چاہی، فلسفہ کو طریقہ کار بنا کر جزوی تجربات پر قناعت نہ کی بلکہ ان تجربات سے اُس حقیقت کل کا تصور کرنا چاہا جو فلسفہ کا عین مقصود ہے، چنانچہ برگساں، وائٹ ہیڈ، آئن اسٹین، رسل وغیرہ اُس جماعت سے متعلق ہیں جس نے سائنس کی تحقیقات و نظریات ہی کا رُخ نہیں بدل دیا بلکہ فلسفہ کی بھی کایا پلٹ دی۔

فاضل مضمون نگار نے فلسفہ کی برتری اور اہمیت کو بڑے سلیقہ سے ثابت کیا ہے، استدلال تو فلسفیوں کا خاص فن

ہے اور یہ فن اس مقالہ میں جھلک رہا ہے، مذہب کو فلسفہ کیا کسی فن اور علم سے بھی دشمنی نہیں ہے، دُنیا کا کوئی فن اور علم بھی کیوں نہ ہو جب تک راہِ راست اور صراطِ مستقیم پر گامزن رہتا ہے، مذہب اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے مگر جہاں راہِ راست سے انحراف ہوتا ہے، مذہب اُسی جگہ سے اُس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے ؛

غور و فکر یقیناً انسان کی سرشت اور جبلت ہے مگر دُنیا میں ہزاروں اربابِ فکر و نظر اور بے شمار سوچنے والے ہیں اور ہر سوچنے والا یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے غور و فکر کے صحیح شرائط کے ساتھ اس مسئلہ کو سوچا ہے اور اُس کی حقیقت تک پہونچ گیا ہوں، تو اب ان میں سے کس کی بات ٹھیک مانی جائے جب کہ یہ غور و فکر کرنے والے بہت سے مسائل اور نظریوں میں ایک دوسرے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں ؛

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر بڑے سے بڑے آدمی کو سہو و نسیان بھی لاحق ہو جاتا ہے، اور حقایق کائنات کا پورا پورا احاطہ کرنا آدمی کے ذہن و فکر کے لئے محالات سے ہے، اور پھر کوئی آدمی یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے جن شرائط کے ساتھ غور و فکر کیا ہے ... ... وہ شرائط سو فی صد صحیح بھی تھے، اور سوچنے میں جن ذرائع کو اُس نے استعمال کیا ہے، اُن ذرائع کے علاوہ اب کوئی ذریعہ باقی ہی نہیں رہا ؛

حقیقت لامحدود اور بے نہایت و بیکراں ہے یہ وہ سمندر ہے جس کی تھاہ نہیں ملتی، اور آدمی کی عقل اور اُس کی تمام توانائیاں محدود ! پھر انسان کو سیکڑوں قسم کے امراض لاحق ہوتے ہیں اور امراض سے ہماری مُراد بخار، کھانسی اور اس قسم کے دوسرے امراض ہی نہیں ہیں، ہم نے یہ لفظ بہت وسیع معنیٰ کے لئے استعمال کیا ہے، مثلاً غضب اور شہوت کی شدت بھی ایک طرح کا مرض ہی ہے، غم و مسرت سے متاثر ہونا بھی ایک طرح کے عوارض ہی میں داخل ہے اور اس عالم میں آدمی خود اپنی رائے اور ذہن سے سوچکر جو فیصلہ کرے گا اُس میں افراط و تفریط کا امکان ہے ؛

مذہب یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ انسانوں کی اس کمزوری سے واقف ہے وہ جانتا ہے اور اس لئے جانتا ہے کہ اُس نے انسانوں اور اُن کی فطرت و سرشت کو خلق کیا ہے، کہ انسان خود ہی سوچکر اپنے لئے زندگی کی کوئی راہ متعین نہیں کر سکتے، اس لئے اللہ تعالےٰ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں پر وحی نازل فرماتا ہے جو خدا کے بندوں تک اُس وحی کو جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں، یہ وحی نبیوں اور رسُولوں کے غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ یہ اُن کے پاکیزہ دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، اسی وحی و الہام کے ذریعہ جو طریقِ زندگی متعین ہوتا ہے بس وہی مستند، معتبر اور درست ہے، لوگوں نے خود سوچ کر جو طریقے بنالئے ہیں وہ ٹیڑھے اور غلط ہیں ؛

غور و فکر کرنے سے مذہب نہیں روکتا بلکہ وہ تو اللہ کی نشانیوں میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ غور و فکر اُس طریقِ حیات اور اُس تعلیم کا پابند ہونا چاہئیے جو تعلیم انبیاء کرام نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے، جہاں جہاں اس تعلیم سے بیزاری اور انحراف ہے، وہاں مذہب بڑے سے بڑے مفکر اور فلسفی کی بات کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت دینے کے لئے تیار نہیں ہے ! مرعوب کُن اصطلاحیں اور نازک دلیلیں کوئی وزن اور اعتبار نہیں رکھتیں، اصل اعتبار صداقت، حقیقت اور واقعیت کا ہے ؛

وہ غور و فکر کس کام کا جس سے یقین کی جگہ شک ریب پیدا ہو بے یقینی قلب ضمیر کی موت ہے، کائنات میں سب سے بڑی حقیقت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، فلسفیانہ اصطلاح میں یہی علت العلل اور حقیقت الحقائق ہے، جو فلسفہ اس حقیقت کا انکار کرتا ہے یا اس کے بارے میں کچھ شکوک رکھتا ہے تو وہ فلسفہ اپنی تمام علمی وسعتوں اور فکری صلاحیتوں کے باوجود

بے وزن اور ناکارہ ہے ؛
فلسفہ زندگی سے علیحدہ کسی چیز کا نام نہیں ہے اور زندگی میں صرف غور و فکر کرتے رہنے سے کام نہیں چل سکتا، کسی شخص کو بھوک لگی ہو اور وہ روٹی تو نہ کھائے بلکہ روٹی کے فلسفہ پر غور کرتا رہے تو بھوک اس کو ہلاک کر دے گی، زیادہ غور و فکر سے آدمی میں جرأت کم ہو جاتی ہے، بس وہ سوچتا ہی رہتا ہے کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں، اسی لئے اقبال نے کہا ہے :-

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور یہ بھی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ؎ لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

دنیا کو ارسطو اور بقراط کے فلسفہ سے کہیں زیادہ جرأتِ کلیمیؑ اور عزمِ خلیلؑ کی ضرورت ہے ؛
ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ یونانی فلسفی خدا کے منکر نہیں ہیں اور سقراط و افلاطون جیسے نامور فلسفی تو "نیکی" کے مبلغ بھی تھے اور فلسفۂ اشراقیت میں تو مراقبہ اور مکاشفہ تک شامل ہے مگر چونکہ وحی کی تعلیم اور انبیاء کرام کی تلقین سے وہ محروم تھے اس لئے خدا کو مانتے ہوئے بھی خدا کے ساتھ کیسی کیسی غلط باتیں انہوں نے جوڑ دیں ـــــــ کوئی کہتا ہے کہ خدا نے فلکِ اوّل کو پیدا کیا، فلکِ اوّل نے فلکِ ثانی کو خلق کیا اور اسی طرح کائنات پیدا ہوتی چلی گئی، "عقولِ عشرہ" کا تصور خود ایک عجیب گورکھ دھندا ہے، کسی کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کو خلق تو بیشک کیا ہے مگر اب وہ جس نہج اور اسلوب پر چل رہی ہے اس سے اللہ تعالیٰ کو کوئی سروکار نہیں ہے، کسی کی نزاکتِ فکر کا یہ عالم ہے کہ خدا سے کوئی صفت ہی منسوب نہ کرو، اُسے "ایک" (واحد) بھی نہ کہو کہ اس طرح اس کی ذات صفت کے مخصوص تصور میں محدود ہو جاتی ہے۔

؎ چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مسلمانوں میں تعقل و تفلسف کی یہ نزاکت آفرینیاں اور موشگافیاں "اعتزال" کی راہ سے داخل ہوئیں جس نے کوئی شک نہیں کہ غور و فکر کی راہیں تو کھول دیں مگر "دین" کی سادگی کو بے خیالی مسائل میں الجھا بھی دیا، علاف، نظام، ابو جبائی اور جاحظ کے غور و فکر نے اسلام کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا، خلقِ قرآن کا فتنہ فلسفی ذہنوں کا پیدا کیا ہوا ہے، عقل جب مطلقاً آزاد ہو جائے تو وہ دنیا کے لئے ایک مستقل عذاب و فتنہ بن جاتی ہے ؛
مولانا شبلی نعمانی نے پُر لطف بات کہی تھی کہ غزالی کے وجود کے لئے فارابی کا پیدا ہونا بہت ضروری ہے مگر "دین و دانش" کے فاضل مصنف نے اس پر اضافہ فرمایا کہ فارابی کے ساتھ جب تک امام مالکؒ اور امام ابو حنیفہؒ پیدا نہیں ہو لیتے اس وقت تک غزالی وجود میں نہیں آتا ؛
امام غزالی فلسفہ کی راہوں سے گزرے تھے اور اس راستہ کی خطرناکیاں اور پیچیدگیاں بلکہ گمراہیاں اُن پر روشن تھیں اس لئے انہوں نے بڑے شد و مد کے ساتھ فلسفہ کا رد لکھا، ایک بہت بڑے فلسفی کو جب فلسفہ مطمئن نہ کر سکا تو اس نے مرتے دم کہا "نا اموت علی عقائد عجائز نیشاپور" یعنی میں نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدے پر مر رہا ہوں"
لائق مضمون نگار نے جیسا کہ لکھا ہے کہ مذہب، سائنس اور فلسفہ میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے، اس کوشش کو ہم استحسان کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ہم تو خدا سے چاہتے ہیں کہ فلسفہ اور سائنس بھی مومن بن جائیں ؛

فلسفہ کی علمی اہمیت کے ہم منکر نہیں ہیں، اس سے کم سے کم تشحیذ ذہن وفکر ہو جاتی ہے، اور استدلال واستنتاج کے گر معلوم ہوتے ہیں، مسلمان فلسفیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسلام کی خدمت کے لئے صرف کریں، حکمت مسلمان کی کھوئی ہوئی چیز ہے، وہ جہاں بھی ملے اُسے اُٹھالینا اور حاصل کرنا ضروری ہے ــــ جو فلسفہ محض غور وفکر اور نازک خیالیوں میں اُلجھ کر رہ جائے، ہمارے خیال میں وہ شطرنج کے کھیل کی مانند ہے کہ جس سے دل بہل جاتا ہے، دماغ کے لئے کاوش وفکر کے موقع میسر آجاتے ہیں مگر عمل ویقین کی دنیا میں اُس کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا ــــ (م - ق)

ہندستان کے ایجنٹ صاحبان

"فاران" کی بقایا رقم براہ کرم دفتر "الحسنات" رام پور (یو-پی) کو روانہ فرماکر، ہمیں شکر گزاری کا موقعہ دیں!

"منیجر"

محمد یوسف حکیم نیر مرحوم

حارث بن کلدہ

طبیب العرب

دربار کسریٰ میں

حارث بن کلدہ ثقفی طائف کا رہنے والا تھا۔ علم طب کے شوق میں اس نے بہت سے شہروں کی خاک چھانی اور فارس پہنچکر فنِ طب میں کمال حاصل کیا۔ وہاں مدتوں رہا اور امراض و معالجات کی معرفت میں مجتہد الفن ہوگیا۔ یہ شخص مشہور باجا عود بھی بہت اچھا بجاتا تھا جس کی تعلیم اس نے فارس اور یمن میں پائی تھی۔ حارث بن کلدہ جناب رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں زندہ تھا اور آپؐ کے بعد ابوبکر صدیق رض۔ عمر فاروق رض۔ عثمان ابن عفان۔ علی مرتضیٰ رض اور امیر معاویہ رض کے زمانہ تک موجود رہا۔

ایک مرتبہ امیر معاویہ رض نے اُس سے پوچھا کہ طب کیا چیز ہے۔ کہا ازم یعنی بھوک۔ ابن جلجل کہتا ہے کہ کتاب صحاح میں جوہری نے ازم کے معنی کسی چیز سے رکنے کے بتلائے ہیں "ازم الرجل" یعنی وہ شخص اس چیز سے باز رہا۔" الوزید کہتے ہیں کہ ازم کے معنی لبوں کا بند رکھنا ہے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ حضرت عمر فاروق نے حارث سے پوچھا کہ طب کیا ہے۔ کہا "ازم" یعنی پرہیز۔

اس شخص نے "طبیب العرب" کا خطاب حاصل کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص مکہ میں بیمار ہوئے اور جناب رسالت پناہ کی خدمت میں حاضر کئے گئے۔ فرمایا طبیب حارث بن کلدہ کو بلایا جائے۔ جب وہ حاضر ہوا تو سعد بن ابی وقاص کو دیکھتے ہی کہنے لگا۔ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ تھوڑا سا کھجور اور السی کا آٹا لیکر اور حریرے کے طور پر پکا کر پلا دیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا اور سعد بن ابی وقاص اسی سے اچھے ہوگئے۔ حارث کے اسی قسم کے اور بھی بہت سے معالجات مشہور تھے اور وہ اہلِ عرب کے عادات و خصائل کے لحاظ سے انھیں چیزوں سے اُن کا علاج کرتا تھا جن چیزوں کے وہ خوگر تھے۔

طب کے متعلق اس کے بہت سے تجربات اور دلچسپ اقوال ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ بارگاہِ کسریٰ میں اس کو باریابی کا موقع ملا جب وہ باریاب ہوا ہے تو نوشیرواں کے روبرو مؤدب کھڑا ہوا۔ کسریٰ نے پوچھا تم کون ہو۔ کہا میں حارث بن کلدہ ثقفی ہوں۔ پوچھا کیا کام کرتے ہو کہا طب کا پیشہ۔ پوچھا کیا تم اعرابی ہو۔ کہا ہاں ٹھیٹ اعرابی اور اس پر بھی وسطِ عرب کا متوطن پوچھا عرب کے لوگ طب کی قدر کیا جانیں۔ وہ تو جاہل نادان اور ردی غذاؤں کے خوگر ہوتے ہیں۔ کہا انھیں وجوہ سے تو انھیں اس امر کی ضرورت ہے کہ کوئی ان کی جہالت کی اصلاح کرے۔ ان کی کجی کو دور کرے۔ ان کے اجسام کی حفاظت کرے اور ان کی اخلاط کی تعدیل میں سرگرم رہے۔ اس لئے کہ عقلمند تو خود ہی ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ وہ اپنے مرض کی حقیقت سمجھتا ہے اور اپنے حفظِ صحت کے لئے پہلے ہی سے تدبیریں سوچ لیتا ہے۔ کسریٰ نے کہا وہ بھلا تیرا کہنا کس طرح مان لیتے ہیں۔ جواب دیا بچوں کو بہلا پھسلا کر اور سانپ کو منتر کے ذریعہ سے مطیع کیا کرتے ہیں اور اے بادشاہ عقل تو قسمت ربانی ہے جو اس نے

اپنے بندوں میں رزق کے طور پر تقسیم فرمائی ہے۔ ہر شخص اور ہر قوم کا جو نصیب ہے وہ اسے مل جاتا ہے اور اس میں کس کو دخل ہے کہ کوئی دولت مند ہے کوئی مفلس اور محتاج۔ کوئی عالم ہے کوئی جاہل۔ کوئی عاجز اور بیکس ہے، کوئی مدبر اور مآل اندیش۔ المختصر یہ خدائے تعالیٰ کا عطیہ ہے۔ کسریٰ نے کہا کہ اہل عرب کے عادات و خصائل کے متعلق بھی کچھ بیان کرو۔ حارث نے کہا وہ نہایت راست باز۔ حق پسند اور بے انتہا جری ہوتے ہیں۔ قدرت نے فصاحت و بلاغت ان کی زبانوں میں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، اور حسب و نسب کے لحاظ سے انتہا درجہ کے شریف و نجیب ہوتے ہیں۔ ان کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ دلوں میں یوں اتر جاتی ہے جیسے کسی قادر انداز کی کمان کا تیر۔ بلکہ موسم بہار کی ہوا سے زیادہ نشاط افزا اور چشمۂ شیریں کے پانی سے زیادہ خوشگوار ہوتی ہے۔ قحط میں وہ ایثار پسند لوگ ... مخلوق کو کھانے کھلاتے ہیں اور رزم کے زمانہ میں سروں پر تلوار بس لگاتے ہیں۔ کوئی شخص ان کی عزت کو صدمہ نہیں پہنچا سکتا اور کسی طرح ان کے ہمسائے تکلیف نہیں دیئے جا سکتے۔ کسی کی مجال نہیں جو ان کی طرف آنکھ بھر کے دیکھ سکے اور ان کے واجب التکریم لوگ ہرگز ذلیل نہیں کئے جا سکتے وہ اپنے آگے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں ... ... !

یہ باتیں سن کر نوشیرواں دوزانو ہو بیٹھا اور اس کی خوش بیانی سے اتنا خوش اور متاثر ہوا کہ چہرے سے مسرت کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ پھر اہل دربار سے مخاطب ہو کر کہا دیکھو یہ شخص کتنا آزاد منش اور اپنی قوم کا کیسا مداح اور ان کے فضائل کا کس قدر سچائی کے ساتھ معترف ہے عاقل اور صاحبِ تجربہ شخص کی یہی شان ہونی چاہیئے۔ پھر حارث کو بیٹھنے کا حکم دیا وہ اجازت پاکر بیٹھ گیا۔ نوشیرواں نے پوچھا تمہیں فنِ طب میں کیسا دخل ہے۔ کہا نہایت کافی۔ پوچھا طب میں اصل اور بڑا اگر کیا ہے۔ کہا "ازم" پوچھا ازم کسے کہتے ہیں۔ کہا منہ پر قابو رکھنا اور ہاتھوں سے کام لینے میں اعتدال سے کام لینا۔ کسریٰ نے اس بات کی داد دی پھر پوچھا سب بیماریوں کی جڑ اور سب سے خوفناک مرض کیا ہے کہا غذا کے ہضم ہونے سے پہلے غذا کا استعمال کیونکہ یہ ایسی چیز ہے جس سے مخلوق فنا ہو جاتی ہے اور درندوں تک سے جنگل خالی ہو جاتے ہیں کہا سچ ہے پوچھا وہ کونسی چنگاری ہے جس سے بیماریاں ہیجان میں آتی ہیں۔ کہا تخمہ اگر باقی رہ گیا تو مہلک ہے اور تحلیل ہو گیا تو ردی اخلاط کی تولید کا باعث ہو کر امراض کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ کہا سچ ہے۔ پھر کہا بخور کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے کہا زوال قمر کے زمانے میں اگر ابر باراں نہ ہو رنج و غم بھی نہ ہو اور سکون و راحت ہو تو بخور لگانا فوری مسرت اور دفع کلفت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ پوچھا حمام وغیرہ کے بارے میں کیا رائے ہے۔ کہا شکم سیری کی حالت میں حمام کرنا نشہ کی حالت میں سو جانا۔ رات کے وقت ننگا رہنا اور حالت غیظ و غضب میں کھانا کھا لینا ہرگز مناسب نہیں۔ نفس کو سکون کی عادت ڈالنی چاہیئے کہ دل مطمئن رہے۔ غذا میں تقلیل لازم ہے کہ خوشگوار نیند آئے۔ پوچھا دوا کے بارے میں کیا رائے ہے کہا جب تک تندرستی رہے دوا کو نہ چھوؤ لیکن مرض پیدا ہو جائے تو اس کے استحکام سے پہلے چارہ سازی کی تدبیر کر لو کیونکہ بدن کی حالت زمین کی سی ہے اگر اصلاح ہوتی رہے تو بن جاتی ہے ورنہ خراب ہو جاتی ہے۔ پوچھا شراب کے بارے میں کیا رائے ہے کہا نفیس شراب سرور و نشاط پیدا کرتی ہے رقیق خون میں جلد شریک ہو جاتی ہے اور خوشگوار شراب اشتہا پیدا کرتی ہے مگر بادہ ناب کو بلا امتزاج نہ پیو۔ کہ درد سر کی مورث ہے اور انواع انواع کی بیماریاں کھینچ لاتی ہے۔ پوچھا گوشت کونسا بہتر ہے کہا نوجوان اور تندرست مینڈھے کا مگر سوکھا نمکین گوشت ایک مہلک چیز ہے اور اونٹ اور بیلوں کے گوشت سے بھی احتراز لازم ہے۔ پوچھا پھلوں کے بارے میں کیا رائے ہے کہا نورس اور پختہ پھل جب تک ان کا موسم اور وقت رہے اچھی چیز ہیں اور فصل کا آخر

وقت آجائے تو پھلوں کو ہرگز نہ چھوؤ۔ پھلوں میں بہتر پھل انار اور نارنگیاں ہیں پھولوں میں پھول گلاب اور بنفشہ اور ترکاریوں میں ترکاری لکڑی اور کاہو۔ پوچھا پانی کے بارے میں کیا رائے ہے کہا پانی جسم کے لئے روح رواں ہے اور صحت کا دار و مدار اسی پر ہے۔ لیکن مقدار کے موافق پیا جائے تو مفید ہے اور بے اندازہ اور سو کر اُٹھتے ہی پیا جائے تو مُضر ہے ؛

پانی کی صفت یہ ہے کہ رقیق ہو صاف و شفاف ہو۔ بڑے بڑے بہتے ہوئے دریاؤں کا ہو۔ ٹھنڈا ہو۔ جنگلوں وغیرہ کی کثافتیں اس میں شامل نہ ہوتی ہوں اور مصفا چشموں میں مسلسل موجوں کے ساتھ حرکت میں ہو۔ پوچھا اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ کہا مار الحیات وہ ہے جس میں ذائقہ کا وہم و گمان تک نہ ہو۔ پوچھا رنگ کیسا ہو کہا جس کا رنگ متعین کرنے میں بصر حیران رہ جائے اور ہر ایک چیز کا انعکاس اس کو اپنا ہم رنگ بنا سکے ؛

نوشیرواں نے پوچھا جسم انسان کتنے چیزوں سے بنا ہے۔ کہا چار چیزوں سے :- سودا جو سرد و خشک ہے۔ صفرا جو گرم و خشک ہے۔ خون جو گرم و تر ہے۔ اور بلغم جو سرد و تر ہے ؛

پوچھا ایک ہی چیز سے کیوں نہ بنایا گیا۔ کہا ایک چیز ہوتی تو آدمی نہ کھاتا نہ پیتا نہ بیمار ہوتا نہ جیتا نہ مرتا۔ پوچھا دو طبیعتوں پر کیوں اقتصار نہیں کیا گیا۔ کہا دو متضاد چیزیں ایک دوسرے کو فنا کر دیتیں - اور تین ہوتیں تو ان میں موافقت اور مخالفت کا صحیح اندازہ پیمانہ ہوتا۔ اس لئے چار ہی موزوں تھیں ؛

قاضی احمد میاں اختر
(جوناگڑھی)

نثر اُردو کا مجدّد
غالِب

اُردو کے نامور شاعر مرزا غالب کی زندگی، شاعری، اور تصانیف پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن غالب کو بحیثیت مُجدد نثر اُردو روشناس کرانے کی کوشش نہیں کی گئی، بلکہ ان کی "مشکل پسندی" کا غلط تصور کرکے ان کے فارسی آمیز اُردو اشعار کو ان کی اُردو کا نمونہ سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ان کو اُردو زبان کا نثر اردو کا مجدد کہنا چاہیئے جس نے زبان اُردو کی کایا پلٹ دی اور جس کی تجدید کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے، چنانچہ یہ وہی زبان ہے جسے آج ہم اُردو کہتے ہیں، اور جس میں تقریر و تحریر کر رہے ہیں۔ آیئے تاریخی حیثیت سے نثر اُردو کے ارتقا کا ایک سرسری جائزہ لیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ اس سلسلہ میں غالب نے اپنا کس قدر حصہ پیش کیا ہے۔

زبان اُردو کے مورخین نے اُردو نثر کی پہلی کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی کتاب "معراج العاشقین" قرار دی ہے جو آٹھویں صدی کی قدیم دکنی زبان کا نمونہ ہے۔ اس کے بعد سے کئی کتابیں نثر کی گجرات اور دکن میں لکھی گئیں، لیکن جو زبان ان کتابوں کی ہے ہم اسے اُردو نہیں کہہ سکتے۔ اس کو دکھنی گجراتی یا پھر ہندی اور ہندوی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ہمارے دکنی اور گجراتی مصنفین خود اسے سمجھتے رہے ہیں۔ ابتدا میں اُردو کی نظم و نثر ہندی یا ہندوی میں لکھی جاتی تھی۔ ولی کے زمانے سے اس زبان کی اصلاح ہوئی اور اسے ریختہ کہا گیا۔ لفظ "ریختہ" کی تعریف اور معنی میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ بعض نے اس کو لفظی معنوں میں لیا ہے اور بعض نے اصطلاحی میں۔ بعض نے اس کو شاعری کے لئے مخصوص قرار دیا ہے۔ دراصل "ریختہ" سے مُراد وہ فصیح اُردو زبان ہے جو ابتدائی زبان "ہندوی" کے بعد وجود میں آئی، اور اس کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس پر فارسی عربی کا کافی اثر پڑا اور ان دونوں زبانوں کے طرزِ ادا اور انداز بیان نے اس کو ایک مخصوص اور مستقل زبان بنا دیا۔ اس ریختہ کی ایجاد کا سہرا ایک گجراتی شاعر ولی احمد آبادی کے سر ہے اور سب سے پہلے اسی نے اپنی نظم میں اس کو رائج کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "اُردو زبان کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر" کہتے ہیں۔ بقول آزاد "جب ولی کا دیوان دلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا، قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا، لذت نے زبان سے پڑھا، گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہی کی غزلیں گانے بجانے لگے، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔" (آبحیات صفحہ ۹۲)

اس "والی ملک سخن"[۵] کی ولایت کی توجیہ بھی لگے ہاتھوں اُردو کے اس رنگین بیان داستان سرا کی زبانِ قلم سے سن لیجئے:

---

۵ ہوا جو خادم شاہِ ولایت ولی ہے والی ملکِ سخن ہے

فرماتے ہیں :-

"شاعر قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے ، مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہو اور ستارے اس کے دلّی کے اُفق سے طلوع ہوا کریں۔ اس عہد کی حالت اور بھاشا کی زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحب کمال زبان اُردو اور انشاء ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا، اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہوگی، اس پر دکانیں تعمیر ہوں گی، لالٹینوں کی روشنی ہوگی، اہل سلیقہ دوکان دار جواہر فروشی کریں گے اور اُردوئے معلیٰ اس کا خطاب ہوگا"[۵۱]

آج ہم آپ اس وَلی کی ولایت کے قائل نہ ہوں لیکن خود اس کے معاصرین اور اس کے بعد کے آنے والے سخندانوں نے اس کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے جن میں "خدائے سخن" کا یہ اعتراف بہت معنی خیز ہے :-

یونہی نہیں ہم عاشق اس ریختہ گوئی کے ۔۔۔ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس کے ساتھ ہی "ریختہ" یا خالص اُردو میں شعر کہنے پر مرزا غالب کا یہ انکسار بھی کچھ کم بلیغ نہیں ہے :-

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب ۔۔۔ کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا!

یہی "خدائے سخن" "میر تھا جو" والی ملک سخن" اور "اُستاد ریختہ" کے درمیان واسطۃ العقد بن گیا !

نظم میں "ریختہ" کی ایجاد خود اُردو زبان کی ایک ارتقائی صورت تھی کہ اس پر میر اور ان کے بعد غالب کا اس کو سلیس اور سہل ممتنع کی حد تک پہنچا دینا سونے پر سہاگہ ہوگیا۔ یہ تو زبان کی حد تک تھا لیکن ان کا یہ قول "کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور" نظم کے علاوہ نثر میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا۔

اس آخری "استاد ریختہ" نے نظم و نثر کی درس گاہ میں "ریختہ" کی "نوشت خواند" کا جو سبق پڑھایا تھا، اس کو تقریباً عہد حاضر کے تمام ادیب اور شاعر رٹتے جا رہے ہیں اور اس کا اثر ہماری زبان اور ادب پر اس قدر غالب ہے کہ کسی طرح مٹائے نہیں مٹ سکتا۔

قصر سخن کی تزئین و تحسین میں غالب کی اُستادی اور بے مثل صنعت گری ایک وسیع موضوع ہے جو تفصیلی اظہار خیال چاہتا ہے، لیکن سب سے بڑھ کر غالب کا عظیم الشان کارنامہ زبان اُردو کی وہ اصلاح و تجدید ہے جس نے نہ صرف نثر اُردو، بلکہ شعر کی زبان میں بھی انقلاب پیدا کر دیا، ہمارے مورخین ادب کی یہ سہل انگاری کس قدر افسوسناک ہے کہ جدید اُردو کی تعمیر میں غالب کی اوّلیت کو نظر انداز کر گئے ہیں اور اس کی اہمیت سے اس قدر غافل ہیں کہ اُردو نثر کی تاریخ لکھتے وقت جدید نثر اُردو کی ابتدا سر سید سے کرتے ہیں، یا اگر میر امن سے شروع کرتے ہیں تو بیچ میں غالب کو چھوڑ جاتے ہیں۔ آزاد کا تو ذکر ہی کیا کہ انھوں نے زبان اُردو کی تاریخ کے سلسلہ میں غالب کے اس تجدد کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے، لیکن بعد کے مورخین ادب نے حتیٰ کہ خود غالب کے شاگرد رشید مولانا حالی نے بھی غالب کی اس خصوصیت کو نمایاں کر کے نہیں دکھایا، بلکہ اس کو صرف مکتوبات کی حد تک محدود سمجھا، حالی تو صرف اسی قدر کہہ کر رہ گئے ہیں کہ "مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اُردو اور نظم فارسی سے نہیں ہوئی"[۵۲] البتہ شبلی کی نکتہ شناس نگاہ نے اس ذہنیت کی ایک جھلک

---

[۵۱] آبحیات صفحہ ۹۱ ۔۔۔ [۵۲] یادگار غالب صفحہ ۱۵۶

دیکھی اور ہمیں بھی دکھلائی ہے۔ "سرسید مرحوم اور اُردو لٹریچر" پر اپنے ایک مقالہ میں فرماتے ہیں:۔

"آثار الصنادید جس زمانے میں نکلی اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء میں دلی کے مشہور شاعر غالب نے اُردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتبات وغیرہ اُردو میں لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لئے اُنھوں نے اپنے تمام ہمعصروں کے خلاف مکاتبہ کا مکالمہ کر دیا۔ مکاتبات میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثل رنج و غم، مسرت و خوشی، حسرت و بیکسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔" اس لحاظ سے یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد سر سید مرحوم تھے، اس کا سنگِ بنیاد مرزا غالب نے رکھا۔"

تاریخ ادب میں واقعیت اور دیانت کا تقاضا ہے کہ اُردو شاعری کے اس مجدد اور موجودہ نثر کے اس معمار اعظم کی دماغی کاوشوں اور ادبی کوششوں کا اعتراف کیا جائے، جن سے موجودہ انشاپردازی اور سخن طرازی اس بام عروج پر پہنچی ہیں۔ مولانا شبلی نے غالب کو "اُردوئے جدید" کا سنگِ بنیاد رکھنے والا مانا ہے، لیکن تاریخی ترتیب کے لحاظ سے اس کا سنگِ بنیاد رکھنے والے تو میر امن تھے جن کی باغ و بہار اُردو کے چمن میں "سدا بہار" رہے گی۔ البتہ غالب کے حصہ میں "مجددیت" آئی اور یہ بجائے خود بہت بڑا کارنامہ ہے جس نے اُردو ادب انشا کے مجددین میں ان کو شہرت دوام عطا کی ہے۔

غالب سے پہلے نثر اُردو ترقی کی دو بڑی منزلیں طے کر چکی تھی۔ خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین سے فضلی کی دہ مجلس تک ایک دور ختم ہو گیا۔ دوسرا دور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ارباب نثر کا تھا، یہ دونوں دور غالب کے پیش نظر تھے۔ پہلے دور کی نثر تمام تر دکنی یا ہندی زبان تھی اور دوسرے دور کی اُردو باوجود سلیس اور سادہ ہونے کے قدامت کا رنگ لئے ہوئے تھی، جس میں قدیم فارسی نثر کے تتبع اور طرز انشا کے ساتھ ایک قسم کا تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے، اگرچہ میر امن کی نثر بہت صاف اور سلیس ہے، لیکن میر امن سے لیکر غالب کے دور تک جتنی نثری کوششیں ہوئیں ——— جن میں فسانہ عجائب، بوستانِ خیال اور اسی قسم کے افسانے اور دیگر تصانیف شامل ہیں ——— سب کی سب طرز قدیم کی حامل ہیں اور اس لحاظ سے دور ثانی میں رکھی جانے کے قابل ہیں۔ غالب سے نثر اُردو کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اُنھوں نے نثر اُردو میں ایسی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کر دیں کہ نثر کا اندازہ بالکل بدل گیا۔ اُنھوں نے اس کی ابتدا خطوط سے کی جن میں بول چال، روزمرہ اور آمنے سامنے کی گفتگو کا انداز پایا جاتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا ابہام یا اُلجھاؤ نہیں ہے، چونکہ مرزا نے نثر کا جو ڈھنگ ایجاد کیا وہ مکتوبات کی صنف خاص میں تھا، اس لئے اس کو صرف مکتوبات کی حد تک محدود سمجھ لیا گیا اور ان کو صرف خطوط نویسی میں طرز جدید کا موجد مانا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا طرز ادا اور اسلوب نگارش محض خطوط تک محدود رہے ؟ کیا عام نثر اُردو پر اس کا اثر نہیں پڑا ؟ کیا اس نثر سے کوئی کام نہیں لیا گیا ؟ یقیناً ان کی نثر نے عالم رواج پایا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ موجودہ اُردو اس طرز جدید کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جس کا سنگ بنیاد میر امن نے رکھا اور غالب نے اس کی تجدید و اصلاح کر کے اس کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا!

...... "بیرنگ من است" بعض اوقات معمولی واقعات سے بڑے اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی تو ہم جس بات کو غیر اہم سمجھ کر ترک کر دیتے ہیں، وہی بڑی اہم ...... بلکہ آئندہ چل کر دوسروں کے لئے حیرت کا موجب

بن جاتی ہے۔ شاعری میں جس چیز کو مرزا نے معمولی اور غیر اہم سمجھا، ہی چیز خود ان کے زمانے میں سر آنکھوں پر رکھی گئی، اور ہمارے زمانے میں تو وہ "الہام" سمجھی گئی! ان کا "بیرنگ" مجموعۂ اشعار "نقش ہائے رنگ رنگ" کی بہار دکھانے لگا۔ بقول آزاد "وہ یہی دیوان ہے کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"! اسی طرح غالب جو معاشرہ کے عام دستور کے مطابق فارسی ہی میں خطوط لکھا کرتے تھے، اس میں قافیہ سنجی اور عبارت آرائی سے تنگ آکر سلیس اور سادہ اُردو میں اظہار خیال پر آمادہ ہو گئے۔ چنانچہ مولوی عبدالرزاق شاکر کو لکھتے ہیں:۔

"بندہ نواز، زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری وضعف کے صدموں سے محنت پژوہی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب اب عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں میں نے فارسی میں خطوط و مکاتبت لکھے اور بھیجے تھے اُن میں سے جو صاحب الی الآن ذی حیات و موجود ہیں ان سے بھی عند الضرورۃ اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق ہوا کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اور اب میں انتہائے عمر ناپائدار کو پہنچ کر آفتاب لب بام اور بہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے۔ نظم و نثر کی قلمرو کا انتظام ایزد دانا و توانا کی اعانت و عنایت سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا تو قیامت تک میرا نام و نشان باقی و قایم رہے گا۔ پس اُمیدوار ہوں کہ انہیں نذور محقرہ یعنی تحریرات روزمرۂ اُردو کے سادہ و سرسری کو ناامکان غنیمت جان کر قبول فرماتے رہیں۔" (عود ہندی صفحہ ۱۵۶)

اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے پچھلی زندگی میں اُردو میں لکھنا شروع کیا۔ ان کے تمام خطوط دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد سے اُردو میں خطوط لکھنے شروع کئے تھے۔ یہ رقعات اگرچہ اُردو نثر کی ارتقائی صورت پیش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مرزا صاحب نے ان کی زبان کو اُردوئے سادہ و سرسری سے تعبیر کیا ہے۔ اور اس کی شہرت کو اپنی سخنوری کے شکوہ کے منافی سمجھا ہے۔ اور جب ان کے ایک شاگرد منشی شیو نرائن نے ان خطوط کو چھاپنا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں:۔

"اُردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے کہ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضروری ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات دیگروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے۔" [۵]

اس انکار کے باوجود ان کے ایک شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے ان کے خطوط کا مجموعہ "اُردوئے معلیٰ" کے نام سے سنہ ۱۸۶۹ء میں شائع کیا اور اس پر مرزا کے شاگرد رشید میر مہدی مجروح نے دیباچہ لکھا۔ میر صاحب نے اس میں مرزا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"معین میرے قول کی یہ اُردو کی تحریر ہے کہ سہل الممتنع کیا بلکہ ممتنع النظیر ہے۔ اس اُردو کا نیا انداز ہے کہ

---

۵ اُردوئے معلیٰ صفحہ ۳۶۱ سنہ ۱۸۶۹ء

جس کے دیکھنے سے روح کو اہتزاز ہے ...... مدت سے حضرت کو اس طرزِ نو ایجاد اردو سے لگاؤ ہے اور خط کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے"[۵۰]

اگرچہ مرزا صاحب کو "اردوئی سرسری" میں لکھے ہوئے اپنے خطوط کا چھپوانا اس وجہ سے گوارا نہ تھا کہ ان میں وہ عبارت آرائی اور قافیہ پیمائی نہ تھی جو اس زمانے کی طرزِ انشا اور اس عہد کا مذاقِ طبیعت تھا، اور اس کے علاوہ زورِ قلم اور قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ علمی و فنی واقفیت کا اظہار بھی مقصود تھا۔ بایں ہمہ آگے چل کر ان کو اس طرزِ مکتوب نویسی پر ناز و افتخار ہونے لگا تھا، اور اس اندازِ تحریر کو وہ اپنی ایجاد سمجھتے تھے۔ چنانچہ مرزا حاتم علی مہر کو لکھتے ہیں:-

"مرزا صاحب میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو"[۵۱]

اگرچہ بعض خطوط میں غالب کی نثر کچھ قدامت کا رنگ لئے ہوئے ہے کہ ان میں تھوڑی سی قافیہ بندی پائی جاتی ہے، لیکن ان کے مکاتیب کے مجموعوں میں بے شمار خطوط ایسے ہیں جو بہت سادہ و سلیس اور سہل ممتنع کے بہترین نمونے ہیں۔ مکتوب ذیل بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:-

"صاحب! کیوں مجھے یاد کیا، کیوں لکھنے کی تکلیف اٹھائی۔ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمہارے خط میں مولوی قمر الدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنشن کی فکر میں تھے، ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی، حق تعالیٰ اُن کی جو مراد ہو بر لاوے۔ اُن کو میرا سلام کہنا۔ تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو۔ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیجدو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گون ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا۔ شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیونکر کہا تھا۔ قصہ مختصر وہ اجزا جلد بھیجدو۔ غالب یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء"[۵۳]

اس میں شک نہیں ہے کہ غالب کے اس طرزِ انشا کی عام طور پر تقلید کی گئی اور یہ ان کی سادہ نثر نگاری کا اثر تھا کہ سرسید، آزاد، نذیر احمد، حالی اور شبلی جیسے اردو کے زبردست انشا پرداز ہوئے جنہوں نے غالب کے تجدد اور اصلاح سے متاثر ہو کر اس طرزِ انشا کو بہت ترقی دی خصوصاً موخر الذکر نے تو غالب کے طرزِ مکتوب نویسی کو اپنانے کی کوشش بھی کی ہے۔[۵۴] سرسید اور حالی کا غالب سے براہ راست استفادہ کرنا اور ان کی علمی صحبتوں سے مستفید ہونا امر واقعی ہے[۵۵] اور ان دونوں بزرگوں کی سادہ و سلیس نثر میں غالب کی "اردوئی سادہ و سرسری" کی جھلک پائی جاتی ہے۔

غرض یہ کہ غالب کے طرزِ انشا نے بعد کے نثر نگاروں کی کافی رہنمائی کی ہے اور اس لحاظ سے انہوں نے اردو زبان کی وہ گرانقدر خدمت انجام دی ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی سادہ و سرسری اردو آج بھی ہمارا قابلِ فخر سرمایہ ہے، اور ان کے یہ "ناچیز تحفے" (نذر محقرہ) ہمارے لئے بیش بہا ارمغاں سے کم نہیں ہیں جن کی بدولت ہماری زبان نے وہ ارتقائی منازل طے کئے ہیں کہ آج دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہمدوش ہے اور ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ اردو شاعری میں زبان اور اندازِ بیان دونوں کی تجدید و تکمیل غالب کے حصہ میں آئی یہی شرف کیا کم تھا کہ قصرِ شاعری کا یہ آخری نقاش، ایوانِ نثر کا معمارِ اعظم قرار پایا! ؎ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار + صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا!

---

[۵۰] اردوئے معلیٰ صفحہ ۴ [۵۱] ایضاً صفحہ ۲۵۸ [۵۳] ایضاً [۵۴] ملاحظہ ہو مکاتیب شبلی [۵۵] دیکھو آثار الصنادید طبع اول باب چہارم، ذکر غالب اور یادگار غالب

عاصی کرنالی

آبگینے

لب پہ سکوت آنکھوں میں سوال — ہم ہیں کسی کا حسنِ خیال
حال کی لذت سے محروم — ساری ملت قال ہی قال
فکر و نظر کی پستی بھی — شاید ہو معراجِ کمال
عالمِ نو کے سینے میں — پا نہ سکو گے سوزِ بلالؓ
لوگ تعجب کرتے ہیں — قیصر و کسریٰ کو بھی زوال!
آپ کی آنکھیں بھی نم ہیں — آپ کو بھی ہوتا ہے ملال
اُن کی نظر میں صرف آغاز — میری نظر میں صرف مآل
مومن کے ہونٹوں پہ ہنسی! — مومن کی آنکھوں میں جلال!

فکر ہماری بے توفیق!
شعر ہمارے سحرِ حلال!!

ابوالبیان حماد

"حقائق"

مزاج دینِ فطرت ہے نہ ایرانی نہ افغانی — اُسے سونپی گئی ہے سارے عالم کی نگہبانی
یہاں کانٹوں پہ چلنا اور شعلوں سے گزرنا ہے — تجھے اے دل رہِ حق میں ہے کیوں فکرِ تن آسانی
تماشائے جمالِ یار موسیٰ کس طرح کرتے — کہ اکثر ہوش کھو دیتی ہے جلوؤں کی فراوانی
سپہرِ اَوج کا وہ بدرِ کامل ہو نہیں سکتا — نہ ہو جب تک اسیرِ چاہ و زنداں ماہِ کنعانی
کوئی ملت جہاں میں سربلندی پا نہیں سکتی — نہ دے جب تک ثبوتِ جذبۂ ایثار و قربانی

نظامِ مملکت ہو یا بساطِ خانقاہی ہو
جو روحِ دیں سے خالی ہے تو ہے یکسر ہوس رانی

شوق کھنڈوی

"اے وائے بہارے اگر این است بہارے"!

نسیم صبح سے دامانِ گل بھڑکتا ہے
چمن میں ذکرِ بہاراں سے دل دھڑکتا ہے

جھجک جھجک کے گلے صبح و شام ملتے ہیں
لرز لرز کے ستاروں کے پھول کھلتے ہیں

وہ بندشیں ہیں نظر مسکرا نہیں سکتی
دلوں کی بات بھی ہونٹوں پہ آ نہیں سکتی

جفا و جور کے باقی ہیں مشغلے اب تک
دلوں میں کروٹیں لیتے ہیں زلزلے اب تک

بھرا ہے زہر ابھی دل کے آبگینوں میں
بھڑک رہی ہے تعصب کی آگ سینوں میں

وہی ہے نفرت و بغض و عناد کا عالم
عروسِ زیست کی زلفیں ہیں آج بھی برہم

وہی ہے موجِ حوادث کی قہر سامانی
ہلاکتوں کی خدائی ستم کی سلطانی

بھری ہوئی ہے دماغوں میں خود سری کیا کیا
خراب و خستہ ہے احساسِ زندگی کیا کیا

تباہ حال ہیں راہوں میں قافلے کتنے
گھٹے گھٹے سے ہیں سینوں میں ولولے کتنے

چھپا رکھا ہے اندھیرے نے آفتابوں کو
حقیقتوں پہ ہنسی آ رہی ہے خوابوں کو

ہلاکِ حرص و ہوس ہیں خرد کے زندانی
وہی ہے جنتِ فکر و نظر کی ویرانی

یہ پُر فریب سیاست یہ نرم و نازک دام
بنا رہے ہیں ہزاروں مجاہدوں کو غلام

ہے آج بھی وہی اندازِ کج کلاہی کا
غرورِ سر میں ابھی تک ہے بادشاہی کا

نہ پوچھ اہلِ چمن کا خدا کے واسطے حال
روش روش پہ بچھائے ہیں سازشوں نے جال

رخِ حیات پہ کانٹوں کے زخم گہرے ہیں
تبسموں پہ ابھی آنسوؤں کے پہرے ہیں

خزاں خزاں ہے بہارِ دگر کہوں کیسے
میں آندھیوں کو نسیمِ سحر کہوں کیسے

سرور بھوپالی

جامِ سرور

یہ شوقِ جبہ سائی والہانہ　　اگر مل جائے تیرا آستانہ
وہ نظریں ملتفت ہیں میری جانب　　ذرا کہہ دو ٹھہر جائے زمانہ
الٰہی! خیر شانِ عاشقی کی　　چلا ہوں لے کے عزمِ خسروانہ

نہ آیا فرق شانِ بندگی میں
ہزاروں کروٹیں بدلا زمانہ

رنج ہو کہ راحت ہو، غم ہو یا خوشی لیکن　　زندگی ہے اک نغمہ روز گنگناتے ہیں
اس ستم کو کیا کہیے اس کرم کو کیا کہیے　　سامنے نہیں آتے دل پہ چھائے جاتے ہیں
کاش! تم بھی آجاتے، کاش تم بھی سن لیتے　　آج اک نئی دُھن میں ہم غزل سناتے ہیں

حُسنِ خیال حُسنِ نظر حُسنِ زندگی!　　اے دوست! پھر بھی چشمِ محبت نگر کہاں

بادل سیاہ سیاہ، ہوائیں خنک خنک
آجاؤ پھر یہ موسمِ دیوانہ گر کہاں

دلیر مارہروی

جو خون دل میں تھا وہ مری چشم تر میں ہے
اے ضبط روکنا اگر ابھی گھر کے گھر میں ہے
پہلے ہی خاکِ دل تھی مری فخرِ کائنات
اب پوچھنا ہی کیا کہ تری رہگزر میں ہے
گھبرائے کیوں نہ کشمکشِ نزع سے دلیر
پہلا یہ اتفاق اسے عمر بھر میں ہے

سائل دہلوی

قفس کے پاس دل تھامے ہوئے صیاد بیٹھا ہے　　اسیرِ غم! خدا جانے تری آواز میں کیا ہے

جذب وسوز

یہ مصلحت کی زباں میں پیامِ بیداری
اسی کا نام ہے اے دل! خرد کی عیاری

وہ بوالہوس ستمِ حسن کیا اٹھائے گا
جو کر سکا نہ محبت کی ناز برداری

یہ خستگی ہے کہ برگِ زمیں فتادہ پر
کہاں کی دھوپ یہ پھولوں کی چھاؤں ہے بھاری

وہ زندگی کہ نہیں جس میں جذب و مستی و سوز
وہ زندگی تو حقیقت میں خود ہے بیماری

ہے تیرے واسطے اک کھیل سعیٔ و طوفِ حرم
کہ تو ہے دل سے نظر تک تمام زناری

یہ چھیڑ چھاڑ یہ نغمے یہ شعر و افسانہ
یہ لڑکیاں ہیں کہ ہیں شاہدانِ بازاری

خدا کے واسطے اُس روزِ احتساب سے ڈر
کہ جب ہوں دیدہ و دل مجرمانِ اقراری

نہ تاجِ قیصر و سنجر نہ دولتِ پرویز
مرے لئے ہے بہت کچھ متاعِ خودداری

کہاں کی بزمِ سیاست عہ، کہاں کے قصر و چمن
ترا مقام تو ہے بوذری و کراری

غزل ——— اور گیت بھی!

کیسی موجیں کیا منجدھار
اب کے کشتی آر کہ پار

جتنے دیکھے دنیا دار
تن چنگا اور من بیمار

عشق کہاں تک روکے گا
حسن کے اوچھے اوچھے وار

ایک نہیں دو چار نہیں
لاکھوں نظریں اُن پہ اُدھار

اُمیدوں کے تاج محل
ارمانوں کے شالامار

یہ بھی زمانہ دیکھ لیا
چور بنے ہیں چوکیدار

مورکھ ہے وہ پاپی ہے
فرض کو جو سمجھے بیگار

ماہر القادری

عہ مکر و دغا کی سیاست!

ماہر القادری

قافلہ!

خانۂ کعبہ سے تھوڑی دور پر بنو ہذیل کا شراب خانہ تھا، صنادید قریش یہاں آکر شراب نوشی کرتے اور یہی نہیں کہ بس شراب پی اور چل دیئے، دار الندوہ کے بعد یہی وہ جگہ تھی جہاں شیوخِ قبائل کا سب سے زیادہ جمگھٹا رہتا، شعر خوانی ہوتی، اچھے پُرجوش قصیدے پڑھے جاتے اور ملک و قوم کے مختلف مباحث پر گفتگو ہوتی ؛

اس شراب خانہ کی دیواریں کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں، اونچی چھت کھجور کے ستونوں کے ذریعہ قائم تھی، دروازوں پر یمنی چادروں کے منقش پردے ہوا سے ہلتے رہتے، فرش چٹائیوں کا تھا، عرب میں اس سے بہتر اور قیمتی چٹائیاں کہیں مل نہ سکتی تھیں، دیواروں کے گوشوں میں بڑے بڑے تکیے بھی رکھے رہتے اور بوڑھے عرب ان سے ٹیک لگا کر بیٹھتے!

ایران کی طرح عرب میں بھی شراب کے ساتھ گزک کا رواج ہو چلا تھا مگر یہ رواج امیروں اور دولت مندوں تک محدود تھا، عوام اس لذت سے آشنا نہ تھے اور آشنا کہاں سے ہوتے، لذتوں کے لئے روپیہ پیسہ چاہیئے، لذتیں ہوا اور پانی کی طرح مُفت نہیں ملتیں، اس شراب خانہ میں شراب کے ساتھ بُھنا ہوا گوشت اور تلی ہوئی رانیں بھی ملتی تھیں ؛

گلابی جاڑوں کی شام تھی قریش کے امیر لوگ شراب پی رہے تھے، ان میں بڑے بوڑھے بھی تھے اور جوانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی، عباؤں، عقالوں، کُرتوں، ڈاڑھیوں، تلواروں اور کمانوں نے اس محفل کو پُرمنظر بنا دیا تھا ؛

ایک ادھیڑ عمر کا عرب جامِ شراب کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے بلند آواز سے بولا :-

" ایہا الاخوان! میں عمرو بن کلثوم کے قصیدے کا مطلع تم کو سُناتا ہوں، کون عمرو؟ قبیلہ تغلب کی بولتی ہوئی زبان، جس کے قصیدے مفاخر میں اپنا جواب نہیں رکھتے

" الا ھبی بصحنک فاصبحینا "

——— مطلع بہت خوب ہے! مگر بھائی شام کے وقت "صبوحی" کا ذکر بے موقعہ معلوم ہوتا ہے، اثلم! تم ذرا سی شراب پی کر بہک جاتے ہو، یہ بڑی کم ظرفی ہے ——— ایک نوجوان نے جواب دیا

——— یا ابنِ فرزدہ! میری شراب نوشی پر طعن نہ کر! لات و عزیٰ کی قسم طائف کے انگوروں کی شراب کے خم کے خم پی کر بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بہت سے بہت یہ ہوتا ہے کہ میری آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہو جاتے ہیں، اچھے شعر کے لئے کسی وقت اور موقعہ کی قید نہیں ہے اے پست قامت خزیمی! ——— اس جواب پر بات بڑھ جانے کا امکان تھا بلکہ اُس کے آثار پیدا ہو چلے تھے مگر اس تکدر کو ختم کرنے کے لئے دوسرے لوگوں نے اعشیٰ، طرفہ، الملتمس اور زہیر، مہلہل کے اشعار سُنانا شروع کر دیئے اور گفتگو کا رُخ ہی دوسری طرف کو ہو گیا، اس شعر پر داد و تحسین کا

ـــہ ہاں! جاگ اپنے پیالۂ شراب کے ساتھ اور ہمیں جام پلا۔

وہ شور اُٹھا کہ ہاتھوں سے شراب کے پیالے چھٹ چھٹ پڑے :

"میری محبوبہ جب بالوں کی ڈھیریاں اپنے رُخساروں پر رکھ کر سوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے تہ بہ تہ بادلوں میں آفتاب محو خواب ہے ... ..."

—— واہ ! واہ ! ہمارے شعراء (دنیا جہان کے شاعروں کی شاعری گرد ہے اُن کے سامنے —— ایک آواز) اور ہماری فصاحت (اسی لئے تو ہم ساری دُنیا کو "عجم" (گونگا) کہتے ہیں —— دوسری آواز) اور ہماری شجاعت (کوئی طاقت ہمیں غلام نہیں بنا سکی، حیرہ اور غسان کے تاجداروں کی تلواروں کو ہم نے کُند کر دیا، ایک بوڑھا عرب بولا ...)

اتنے میں ایک ناقہ سوار آتا ہوا نظر آیا، اونٹ کی گردن سے پسینہ ٹپک رہا تھا جیسے وہ بہت دور سے چل کر آ رہا ہے اور شاید صبح سے اب تک سستانے کا کہیں موقعہ نہیں ملا، سوار کے چہرے سے بھی تکان کے آثار نمایاں تھے، شراب خانہ کے سامنے آکر اُس نے ناقہ کو ٹھہرا دیا، سب لوگ کھڑے ہوگئے، خیر مقدم کے لئے، اور خیر مقدم سے زیادہ مدینہ کے حالات کے استفسار کے لئے !

سوار کے پاؤں کی ایک ہی جنبش میں اونٹنی بیٹھ گئی اس کے مُنہ سے سفید جھاگ نکل رہے تھے جس میں ببول کے پتّوں کی ہریالی بھی ملی ہوئی تھی، ناقہ سوار ترکش اور تلوار کو لئے ہوئے اُترا، اُترتے میں اُس کا ترکش پانی کی چھاگل میں اٹک گیا ایک نوجوان نے پھُرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر ترکش کو چھاگل سے نکالا :

—— کچھ دماغ ٹھیک ہوا، اُن سر پھروں کا یثرب میں پہونچکر ! پردیس میں اچھے اچھوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے —— ایک بوڑھا شیخ یمنی عبا کے سنہری پھُولوں کو چھُوتے ہوئے بولا —— کس خیال میں ہو اے میرے بوڑھے چچا ! محمدؐ ابن عبد اللہ اور اُن کے ساتھیوں کو ہم نے مکّہ چھوڑنے پر مجبور کرکے بڑی حماقت کی، شدید غلطی جس کی تلافی ناممکن ہے ! یثرب اور اُس کے عوالی کی آبادی ابو قحافہ اور خطاب کے بیٹوں کا دین قبول کر چکی ہے، قبیلوں کے وفود آتے ہیں اور ابن عبد المطلب کے ہاتھ پر بیعت کرکے اپنے گھروں اور بستیوں کو واپس جاتے ہیں —— ناقہ سوار نے جواب دیا

—— یہ تو آپنے بُری خبر سُنائی کاش ! آپ ادھر نہ آتے، ہمارے عیش کو آپ کی باتوں نے مکدّر کر دیا، ہمارے کان کے پردوں میں آپ کی باتوں نے شیشہ کی تیز نوکیں چبھو دیں —— ایک شخص نے کہا

—— تو صاحب ! یہ ہو کیا رہا ہے ؟ اسے جادو کہیں، یا پھر یہ سمجھیں کہ ہمارے نامور اسلاف کی روحیں محمدؐ ابن عبد اللہ اور اُس کے ساتھیوں کی مدد کر رہی ہیں، یہ آثار تو کسی خطرناک انقلاب کا پتا دیتے ہیں —— ایک دوسرا سردار قریش بولا۔

اس پر تھوڑی دیر سکوت طاری رہا، ناقہ سوار کو شراب پیش کی گئی تھی، اُس نے لکڑی کے خوب بڑے پیالے کی شراب دو چار گھونٹوں ہی میں ختم کر دی، اس بے احتیاطی میں شراب کی بوندیں اُس کی ڈاڑھی پر بھی گر گئیں، نوجوان مُسکراتے مُسکراتے رہ گئے —— پھر وہ بولا :-

—— میں نے ایک دو دن نہیں پورے دو ہفتہ یثرب میں قیام کیا اور اچھی طرح سے صُورتِ حال کا جائزہ لیا محمدؐ اور اُس کے ساتھیوں کے پاس نہ مال و دولت ہے، نہ حُسن و شباب کا لالچ ہے نہ قبیلوں کی سیادت کی پیش کش ہے صاحبو ! اُن کی زندگی اپنی جگہ مجسّم تبلیغ و دعوت ہے، یہودیوں کی جوان اور خوبصورت لڑکیاں اپنے سینہ اُبھار اُبھار کر اُن

کے آگے سے گزرتی ہیں مگر وہ آنکھ اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہیں دیکھتے، یا تو ان لوگوں کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیے گئے ہیں یا پھر یہ لوگ انسان نہیں سچ مچ فرشتے ہیں، میں وہیں یثرب میں تھا، ایک شخص نے اعلان کیا کہ محمدؐ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو شیطانی فعل قرار دیا ہے، بس اس اعلان کا سننا تھا کہ لوگوں نے شراب کے خم کے خم زمین پر پھینک دیے میں نے اپنی آنکھوں سے شراب یثرب کی گلیوں میں بہتی ہوئی دیکھی ہے (ایک پیالہ اور! شراب پلانے والا چھوکرا، شراب کے چھوٹے سے مشکیزہ سے شراب اُنڈیلتے ہوئے کہتا ہے ——— نہیں ابھی نہیں! میں بات تو پوری کرلوں ——— ناقہ سوار جواب دیتا ہے —)

ایہا الاخوان! لات و ہبل کے ان دشمنوں کے عدل و انصاف کا یہ عالم ہے کہ ایک یہودی اور ایک مسلمان میں لین دین پر جھگڑا ہوگیا، مدعی اور مدعا علیہ دونوں محمدؐ کے پاس پہونچے، معاملہ پیش ہوا یہودی ڈر رہا تھا کہ مسلمان کے مقابلہ میں بھلا میں کس طرح کامیاب ہوسکوں گا مگر محمدؐ نے اپنے پیرو اور ساتھی کی ذرہ برابر پروا نہ کی، مقدمہ کا یہودی کے حق میں فیصلہ ہوا ——— اور سنیئے (جی! سنائیے جب سے سُن ہی رہے ہیں اور ہمارے دل نہ جانے کیوں بیٹھے جا رہے ہیں ——— ایک قریشی نے تلوار سے زمین کریدتے ہوئے کہا ۔ ۔ ۔) صہیب کو جانتے ہو؟ (کیوں نہیں جانتے، اور اُس کی پشت اور سینہ پر ہمارے نیزوں کے داغ ہیں، جلتی ہوئی ریت پر اس رومی غلام کو لٹا کر گرم پتھر سے داغا گیا ہے ۔ ۔ ۔ مگر صاحب! یہ شخص عجیب دُھن کا پکا تھا، ایسے ایسے ظلم و ستم سہہ کر بھی محمدؐ اور محمدؐ کے خدا کا نام اُس کے وردِ زبان رہا ——— خوب کھلتی رنگت والے شخص نے کمان کو گھماتے ہوئے کہا) اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ صہیب کو کس شرط پر ہم نے مکہ سے جانے دیا تھا۔ (اس شرط پر کہ تمام مال و اسباب حتیٰ کہ پہننے کے کپڑے تک ہمارے حوالے کر جائے ——— سننے والوں میں سے ایک نے جواب دیا) یہ صہیب جب یثرب میں پہنچا ہے اور محمدؐ کو ان حالات کی اطلاع ملی ہے تو ابن عبداللہ نے کہا، قسم خدا کی صہیب نے اس تجارت میں بہت نفع کمایا ——— " محمدؐ کے کہے ہوئے لفظ پورے یثرب میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیل گئے، محمدؐ کے ساتھی ان لفظوں کو جھوم جھوم کر دُہراتے تھے ——— کسی انسان کو اس قدر جانباز اور عقیدت مند ساتھی کاہیکو ملے ہوں گے، صاحبو! ان لوگوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے، میرا تو دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ دین پھیل کر رہے گا۔ (سفر کی تکان نے تمہیں بدحواس کر دیا ہے، ابو رفادہ! یہ لو شراب پیو اور یثرب کی باتوں کو بھول جاؤ، تمہاری باتیں سُن کر یہ ہمارے نوجوان کم ہمت ہوئے جا رہے ہیں ——— ایک بوڑھے آدمی نے جواب دیا)!

تھوڑی دیر بعد یہ محفل برخاست ہوگئی، ناقہ سوار نے اپنے گھر کی راہ لی اور دوسرے لوگ بھی منتشر ہوگئے، ان لوگوں میں گندمی رنگ کا ایک شخص تھا، دراز قامت، چوڑی پیشانی، جُٹی بھویں، اُس کی جبا کا اوپر کا حصہ کافی اُجلا تھا مگر دامن میلگجے میلگجے سے دکھائی دیتے تھے، یہ شخص ناقہ سوار کی باتیں خاموشی کے ساتھ سُنتا رہا، اُس نے کسی بات پر آہستہ سے بھی " لا " اور " نعم " نہیں کہا، وہ گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور محفل برخاست ہونے کے بعد بھی یہی عالم طاری رہا، دوسروں کے ساتھ وہ بھی شراب خانہ سے روانہ ہوگیا۔

رات کا اندھیرا خوب پھیل چکا تھا، مکہ کی گلیوں میں راہگیروں کی آمد و رفت کم ہوگئی تھی وہ شخص تھوڑی دور پہونچا ہوگا کہ ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے آدمی نے اُسے آواز دے کر بلایا، گندمی رنگت والا قریشی بوڑھے کی آواز پر رُک گیا بلکہ اُس کے پاس لوٹ کر آگیا، وہ دونوں مکان کے اندر چلے گئے، وہاں دوسرے لوگ بھی بیٹھے تھے تمام کو

جو تجارتی مال گیا تھا اُس میں اس شخص کا بھی حصہ تھا، قافلہ آج شام ہی کو واپس آیا تھا، پھر جو کاروباری گفتگو چھڑی ہے تو آدھی رات ہوگئی، کیا کیا قصّے نکلے کیسی کیسی باتیں ہوئیں۔

——— اب یہیں سو جاؤ، یا ابن عم! رات بہت ہوگئی ہے ——— صاحبِ خانہ نے گندمی رنگت والے شخص سے کہا۔

——— نہیں! گھر جانا ضروری ہے، تمہیں معلوم تو ہے کہ قبیلۂ اَزد کا ایک نوجوان مُسلمان میرے مکان میں قید ہے ———

——— وہ شخص جواب دیتے ہوئے چل پڑا، کمان ہاتھ میں تھی اور ترکش بازو میں لٹک رہا تھا، کمر سے تلوار بندھی تھی۔

مکّہ کی گلیاں سنسان پڑی تھیں، کسی آنے جانے والے کی ہچل بھی سُنائی نہ دیتی تھی، سکوت ویرانوں جیسا سکوت! کتے اور اونٹ تک سو رہے تھے اور جاگ رہے ہوں تو آواز نہ کرتے تھے، چاروں طرف گھُپ اندھیرا تھا، ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہ دیتا تھا، ایک گلی میں اُس شخص کو ٹھوکر لگی، کمان ہاتھ میں نہ ہوتی تو وہ اوندھے مُنہ گرتا، کمان کا سہارا لیکر بڑی مشکل سے سنبھلا، اور جھُنجلا کر بولا:—

"بنو سلیم سدا کے بدتمیز واقع ہوئے ہیں، اونٹوں کی ہڈیاں گلی میں ڈال دی ہیں، اونٹ کی ہڈی کا زخم بعض وقت مہلک ثابت ہوتا ہے۔۔ ۔۔"

یہ شخص اپنے گھر پہنچا مگر دروازہ پر جاکر ٹھٹک گیا اندر سے عورت اور مرد کی بات چیت کی آواز آرہی تھی، وہ دروازے سے کان لگاکر ان کی گفتگو سننے لگا۔

——— میں موقعہ پاکر تمھارے پاس آئی ہوں، میرے والد شراب خانہ گئے ہوئے ہیں، میری ماں گہری نیند سو رہی ہے یہاں میرے اور تمھارے سوا اور کوئی نہیں ہے ——— لڑکی نے بڑی التجا کے ساتھ کہا

——— میرے اور تمھارے سوا یہاں تیسری ہستی خدا کی بھی ہے اُس خدا کی جو آدمی کے دلوں کا حال جانتا ہے جس کی نگاہ تاریک غاروں میں چیونٹی کے پاؤں کو دیکھ لیتی ہے ——— نوجوان نے جواب دیا

——— ایسی باتیں کرکے میرے پُرامید دل کو نہ توڑو! تمھاری محبت مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے ——— لڑکی بولی

——— خدا کے لئے یہاں سے چلی جاؤ، میرے مذہب میں اس قسم کی باتوں کا ذکر کرنا بھی گناہ ہے، میں اپنے خدا سے نیکی اور پاکبازی کا عہد کرچکا ہوں ——— نوجوان نے پیر کی زنجیر کو اُٹھاتے ہوئے کہا

——— تو تمھارے مذہب میں کیا عورتوں سے مرد پیار محبت کی باتیں نہیں کیا کرتے، تمھارے دین میں کیا جذبات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے ——— لڑکی نے دروازہ کی کواڑ پر ٹیکا دیتے ہوئے پُوچھا

——— صرف بیویوں سے اس قسم کی باتوں کی اجازت ہے، غیر عورتیں ہماری ماؤں اور بہنوں کی برابر ہیں (اس جواب پر لڑکی نے نوجوان کی بات کاٹ کر کہا) "مگر میں تو غیر عورت نہیں ہوں، میں تمھاری شریکِ زندگی بننا چاہتی ہوں" (نوجوان نے اس پر جواب دیا) "ایک مشرک اور کافر عورت سے ہمارے مذہب میں مناکحت جائز نہیں ہے" (لڑکی بڑی لجاجت کے ساتھ بولی) "تو میں مسلمان ہوتی ہوں" (نوجوان نے اس پر قدرے تیز لہجہ میں کہا) "مجھ سے شادی کرنے کے لئے مسلمان ہونا چاہتی ہو تم؟ اور —— اسلام —— (لڑکی بیچ میں بول پڑی) "مجھے شروع ہی سے اسلام سے رغبت ہے، میں نے کعبہ کا طواف کرتے ہوئے رُک رُک کر مسلمانوں کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، باپ کی سختی کے سبب اسلام کا اظہار نہ کرسکی، مگر اب۔۔ ۔۔ ۔۔ اور گندمی رنگت والا آدمی دروازے پر دستک دیتا ہے ——— گفتگو کا سلسلہ

یکایک رُک جاتا ہے۔

اُس کی لڑکی نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھولا، اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا، آنے والے نے جاتے ہی مسلمان نوجوان کے پیر کی زنجیر کاٹ دی۔ "تم آزاد ہو، تم آزاد ہو، میں سب کچھ سُن چکا ہوں، اللہ نے آج میرے دل کی گرہ کھول دی، بہت دن شرک و نافرمانی میں مبتلا رہا مگر اب حق واضح ہو چکا" ——— (لڑکی کی طرف مخاطب ہو کر) عریفہ! اپنی ماں کو جگا میں اونٹ پر کجاوہ کستا ہوں، صُبح ہوتے ہوتے ہم یہاں سے نکل جائیں گے، مکّہ والے اب ہمیں برداشت نہ کرسکیں گے، میں ان سیاہ باطنوں کے ارادوں سے واقف ہوں۔

چار آدمیوں کا یہ قافلہ روانہ ہوگیا، سپیدۂ سحر نمودار ہوا ہے تو یہ لوگ مکّہ سے کئی کوس دور نکل چکے تھے، اس قافلہ کا رُخ مدینہ کی طرف تھا، دُھوپ پھیل رہی تھی، شاخساروں پر سُورج کی کرنیں سنہری حروف میں مسرّت کے قصیدے لکھ رہی تھیں "کیا عجب ہے کہ اسی راستہ سے محمدؐ رسول اللہ مدینہ تشریف لے گئے ہوں (نوجوان اس پر سر ہلاتا ہے ...) مجھے اس وقت ایک شعر یاد آرہا ہے، کتنا اچھا شعر ہے:-

"راستہ میں بہت سے نقشِ قدم ہوتے ہیں مگر
ہر نقشِ قدم دلیلِ راہ نہیں ہوتا"

دُھوپ چڑھ رہی تھی اور قافلہ چلا جارہا تھا!

روحِ انتخاب

ہدایت و ضلالت کا راز

کچھ مدت ہوئی کہ اسلام کے متعلق مسٹر جارج برنارڈ شا کے خیالات جرائد میں شائع ہوئے تھے۔ حال میں جب انھوں نے مشرق کا سفر کیا تو اس کے دوران میں سنگاپور کے عربی اخبار "الہدیٰ" کا نامہ نگار ان سے ملا اور اس سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے پھر ایک مرتبہ اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام آزادی اور دستوری و ذہنی حریت کا دین ہے۔ اجتماعی نقطۂ نظر سے مسیحیت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کسی مذہب کا نظامِ اجتماعی اتنا مکمل نہیں ہے جتنا اسلام کا نظام ہے۔ دنیائے اسلام کا تنزل اسلام سے دور ہٹ جانے کی بدولت ہے۔ مسلمان جب صرف اسلام کی بنیادوں پر جدوجہد کریں گے تو عالمِ اسلامی کا خواب بیداری سے بدل جائے گا۔

ان خیالات کے سننے کے بعد نامہ نگار نے سوال کیا کہ جب آپ اسلام کو اچھا سمجھتے ہیں تو پھر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو فطری طور پر ان بیانات کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک سلیم الطبع آدمی کے لئے کسی چیز کے اعترافِ قبح اور اس کو ترک کر دینے اور کسی چیز کے اعترافِ حسن اور اس کو قبول و تسلیم کر لینے میں کوئی حدِ فاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسٹر شا نے جو کچھ جواب دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قبولِ اسلام کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ایسا نہ کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس چیز کی کمی ہے جس کو شرح صدر کہتے ہیں۔

ایک مسٹر شا ہی پر موقوف نہیں ہے۔ بہت سے اہلِ فکر و نظر پہلے بھی گزر چکے ہیں، اور اب بھی موجود ہیں جنھوں نے اسلام کی خوبیوں کا اعتراف کیا، اس کے دنیوی یا دینی یا دونوں حیثیتوں سے مفید ہونے کا اقرار کیا۔ اس کی تہذیب، اس کے نظامِ اجتماعی، اور اس کی علمی صداقت اور اس کی عملی قوت کی برتری تسلیم کی۔ مگر جب ایمان لانے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہو جانے کا سوال سامنے آیا تو کسی چیز نے ان کو قدم آگے بڑھانے سے روک دیا، اور وہ اسلام کی سرحد پر پہنچ کر ٹھہر گئے۔

برعکس اس کے بہت سے آدمی ایسے بھی ہو گزرے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسلام کی مخالفت اور اس کی دشمنی میں صرف کر دیا۔ لیکن اسی مخالفت کے سلسلہ میں اسلام کا مطالعہ کرتے ہوئے حقیقتِ اسلام ان پر منکشف ہو گئی۔ اور اس انکشاف کے بعد کوئی چیز ان کو ایمان لانے سے نہ روک سکی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا راز بھی ایک عجیب راز ہے۔ ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے، مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا، کوئی توجہ کرتا ہے لیکن وہ اس کے پردۂ گوش سے اچٹ کر چلی جاتی ہے، کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر مانتا نہیں، کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا، اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے

اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے ؛

ہمارا شب روز کا مشاہدہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ بہت سے اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے مگر وہ افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کا تماشا دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اللہ کے بندے ایسے نکلتے ہیں جو بڑھ کر اُسے اُٹھاتے ہیں، اس سے ہمدردی کرتے ہیں اور اس کو مدد پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ——— ایک مجرم کو پا بہ زنجیر لے جاتے ہوئے بہت سے آدمی دیکھتے ہیں۔ کوئی اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا، کوئی اس پر حقارت کی نظر ڈالتا ہے، کوئی اس پر ترس کھاتا ہے، کوئی اس کی ہنسی اُڑاتا ہے، کوئی اس کے انجام پر خوش ہوتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ جیسا کیا ویسا بھرا، اور کوئی اس کے انجام سے عبرت حاصل کرتا ہے اور جرم سے بچنے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے ؛

یہ تو مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں، جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں۔ اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی شخص کے تاثر اور اس پر ایک ہی چیز کے اثر کی نوعیت مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ وہی ایک بات ہے جس کو ایک شخص ہزاروں مرتبہ سُنتا ہے اور نہیں مانتا، مگر ایک ایسا موقع آتا ہے کہ یکایک اس کے دل کا بند کھُل جاتا ہے، جو بات کان کے پردے میں اٹک کر رہ جاتی تھی وہ سیدھی دل تک پہنچ جاتی ہے، اور وہ خود حیران ہوتا ہے کہ یہی بات میں پہلے بھی بارہا سُن چکا ہوں، پھر آج یہ کیا ماجرا ہو گیا کہ یہ خود بخود دل میں اُتری چلی جا رہی ہے؟ ایک ہی شخص کو بارہا آفت رسیدہ آدمیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے اور وہ ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا۔ لیکن ایک موقع پر کسی شخص کی مصیبت دیکھ کر دفعتاً اُس کا دل بھر آتا ہے، قساوت کا پردہ پاک چاک ہو جاتا ہے اور وہ سب سے زیادہ ہمدرد، رحیم اور نرم دل بن جاتا ہے ایک شخص کو اپنی عمر میں بے شمار عبرتناک مناظر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کبھی وہ ان کو تماشا سمجھ کر دیکھتا ہے، کبھی ایک حسرت و افسوس کی نگاہ ڈالتا ہے اور کبھی ایک معمولی نظر سے اس پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ دل پر ایک مستقل نقش بیٹھ جاتا ہے ؛

یہی حال ہدایت و ضلالت کا بھی ہے۔ وہی ایک قرآن تھا۔ وہی ایک اُس کی تعلیم تھی۔ وہی ایک اُس کو سنانے والی زبان تھی — ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی وہ اُن کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰ رض، ابوبکر رض، اور علی بن ابی طالب رض نے سُنا اور پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آئے بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شک کا شائبہ بھی گزرتا۔ عمر رض بن الخطاب نے بیسیوں مرتبہ اس کو سُنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہ کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف اور دشمن ہوتے چلے گئے۔ لیکن ایک مرتبہ انہی کانوں نے اس چیز کو سُنا تو کان اور دل کے درمیان جتنی مضبوط دیواریں چنی ہوئی تھیں، یکایک منہدم ہو گئیں اور اس چیز نے ان کے دل میں ایسا اثر کیا کہ ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی ؛

ہر چند نفسی نقطۂ نظر سے اس اختلافِ کیفیت اور اختلافِ اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جا سکتی ہیں اور وہ سب اپنی اپنی جگہ درست بھی ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے، کہیں ایک حد تک حجاب بنی رہتی ہے اور ایک نفسی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے، کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں، کہیں کسی بات کے لئے حجاب بنتی ہے اور کسی بات کے لئے نہیں بنتی، وہ بالکل انسان کے ارادہ و اختیار کے تابع نہیں ہے، بلکہ فطری و جبلی طور پر خود بخود انسان میں پیدا ہوتی ہے ؛

یہی نکتہ ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ :-

فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن — اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتا ہے اور جس

وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

(الانعام - ۱۵)

کو گمراہ رکھنا چاہتا ہے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا ہے اور ایسا بھینچتا ہے کہ گویا وہ آسمان پر چڑھا چلا جا رہا ہے۔ یہ طریقہ ہے جس سے ایمان نہ لانے والوں پر اللہ کی طرف سے ناپاکی مسلط کی جاتی ہے۔

ایک اور بات بھی اس سلسلہ میں قابل بیان ہے اور ضرورت ہے کہ مسلمان اس کو ذہن نشین کر لیں۔ عام طور پر جب غیر مسلم مشاہیر کی جانب سے اسلام کے متعلق کچھ اچھے خیالات کا اظہار ہوتا ہے تو مسلمان بڑے فخر سے ان خیالات کو شہرت دیتے ہیں گویا اُن کا اسلام کو اچھا سمجھنا اسلام کی خوبی کے لئے کوئی گراں قدر شہادت ہے لیکن یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ اسلام کی صداقت و حقانیت اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اس کا اعتراف کرے۔ جس طرح آفتاب کا روشن ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اُس کو روشن کہے۔ اور جس طرح اور پانی کا سیال ہونا اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اُس کی گرمی اور اُس کے سیلان کو تسلیم کرے اسی طرح اسلام کا برحق ہونا اس کا حاجتمند نہیں کہ کوئی اس کے برحق ہونے کو مان لے۔ خصوصاً ایسے لوگوں کی تحسین اور مدح تو کوئی بھی وقعت نہیں رکھتی جن کے دل ان زبانوں کا ساتھ نہیں دیتے اور جو خود اپنے اعراض و انکار سے اپنی مدح و تحسین کی تکذیب کرتے ہیں۔ اگر حقیقت میں وہ اسلام کی خوبی کے معترف ہوتے تو اس پر ایمان لے آتے لیکن جب اُنھوں نے زبانی اعتراف کے باوجود ایمان لانے سے انکار کر دیا تو اہل عقل کی نگاہ میں ان کی حیثیت بالکل اس شخص کی سی ہے جو طبیب کی صداقت کو تسلیم کرے اور تجویز کردہ نسخہ کی صحت کا اعتراف کرے مگر اپنی بیماری کا علاج کسی عطائی طبیب سے کرائے۔ مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہیئے غیر مسلم کا اعتراف بھی اسلام کے لئے قابل فخر نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک ہی فخر کافی ہے۔ اور وہ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ!

اور

رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

کا

فخر ہے!

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(ترجمان القرآن - محرم ۱۳۵۲ سنہ ھ - مئی ۱۹۳۳ سنہ ء)

ہماری نظر میں

تجدید تعلیم و تبلیغ

"تجدید تعلیم تبلیغ" از:- مولانا عبدالباری ندوی، ضخامت ۲۶۳ صفحات کتابت وطباعت دیدہ زیب، مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:- پاکستان میں (۱) مولوی پیر عبداللطیف صاحب جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد انار کلی لاہور۔۔۔ ہندوستان میں (۲) مہتمم تجدید دین شبستانِ قدم رسول، ہارڈنگ لاہور، لکھنؤ۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات کی تشریح و توضیح کو مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے اپنا موضوعِ سخن بلکہ شاید عنوانِ حیات بنا لیا ہے، اس سے قبل دو کتابیں ۔۔۔۔۔ (۱) "جامع المجددین" اور (۲) "تجدیدِ تصوف و سلوک" مولانا موصوف اسلامی دُنیا کے سامنے پیش کر چکے ہیں جن پر "فاران" میں تبصرہ ہو چکا ہے اب یہ تیسری کتاب منظرِ عام پر آئی ہے۔

حضرت حکیم الاُمت قدس سرہٗ کی ذات فی الحقیقت ارشاد و حکمت کا مجمع البحرین تھی، مولانا تھانوی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی دین کی حکمت اور شریعت کے تقاضوں کا خیال رکھتے تھے، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے صاحبزادے نے ہم سے خود بیان کیا کہ میں نے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا اُس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ "تم اپنے خط کو اور صاف کر لو، اس سے تم کو راحت اور دوسروں کو سہولت ہوگی، اور اگر دوسروں کی سہولت کی نیت سے خط صاف کیا تو ثواب بھی ملے گا۔"

یہ کتاب تعلیم و تبلیغ کے موضوع پر ایک "ہدایت نامہ" کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے چند اہم ابواب کے صرف عنوانات ہی اُس کی افادیت کا اعلان کر رہے ہیں ۔۔۔۔ تعلیم کے صحیح معنی ۔۔۔۔ اسلام کا تصورِ انسان ۔۔۔۔ روحانی امراض کے دو بنیادی اسباب ۔۔۔۔ علماء کی اخلاقی کمزوریاں علمِ دین کا اثر نہیں ۔۔۔۔ علمِ دین کے دینی و دنیوی استعمال میں فرق ۔۔۔۔ علماء کی جاہ طلبی ۔۔۔۔ مناظرہ و مجادلہ کی حقیقت ۔۔۔۔ مسائل قطعیہ میں خلافت کی مختلف حالتوں کا حکم ۔۔۔۔ تعلیمِ دین کے ساتھ تحصیلِ معاش ۔۔۔۔ تعلیم کے حقوق ۔۔۔۔ کون علم میراثِ انبیاء ہے ۔۔۔۔ تبلیغِ احکام کی ترتیب ۔۔۔۔ تبلیغ میں افراط و تفریط کی اصلاح ۔۔۔۔ قرآن مجید صرف کتاب ہدایت نہیں نظامِ ہدایت بھی ہے ۔۔۔۔ دینی زندگی کے دو کلیدی اُصول ۔۔۔۔ نصابِ تعلیم ۔۔۔۔ زندہ کتابوں کا مطالعہ ۔۔۔۔ مادیانہ سطحیت ۔۔ ۔۔ ۔۔!

کون علم میراثِ انبیاء ہے؟ اس کا جواب حضرت جامع المجددین کی زبان سے سُنئے:-

"ایسا علم جو خشیت سے خالی ہو علم ہی نہیں صاحبو! علم کو میراثِ انبیاء کہا جاتا ہے تو اب دیکھ لو کہ انبیاء کی میراث کونسا علم ہے، کیا انبیاء کا علم بھی نعوذ باللہ ایسا ہی تھا جس میں محض مسائل و اصطلاحات کا تلفظ ہو اور خشیت کا نام نہ ہو، ہرگز نہیں ہاں تو یہ حالت تھی کہ جتنا علم بڑھتا تھا اُتنی ہی خشیت بڑھتی تھی، حدیث میں آیا ہے کہ "انا اعلمکم باللہ و اخشاکم للہ" (میں

تم سب سے زیادہ جاننے والا اور تم سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہوں) (صفحہ ۱۶۰)

ہم مسلمانوں میں بہت سے ایسے ہیں جو خود تو دینی احکام کی پابندی کرتے ہیں مگر اپنی غفلت مصلحت یا بیجا محبت اولاد پیار کے سبب گھر والوں کو اُن کے حال ہی پر چھوڑ دیتے ہیں، حضرت حکیم الامت کی نگاہِ حقیقت نگر نے اس فروگزاشت کی نشان دہی فرمائی، لکھتے ہیں:۔

"مسلمانوں میں اولاً تو دعوت الی اللہ کا باب ہی گم ہو گیا ہے حتیٰ کہ جہاں قدرت ہے وہاں بھی نہیں ہے اور جہاں قدرت نہیں، وہاں کا تو پوچھنا ہی کیا، ہمارے بزرگ وہ تھے کہ جہاں قدرت نہ تھی وہاں بھی دعوت الی الحق سے باز نہ رہتے اور ہم ہیں کہ قدرت کی جگہ بھی (دعوت کا اہتمام) نہیں کرتے، بچوں کو، نوکروں کو، باوجود قدرت کے کبھی امر بالمعروف نہیں کرتے مگر یہ برتاؤ صرف خدا کے معاملات میں ہے اپنے معاملات میں ہرگز نہیں، گھر میں آکر یہ تو پوچھیں گے کہ کھانا تیار ہوا یا نہیں مگر یہ کبھی نہ پوچھیں گے کہ بیوی نے نماز بھی پڑھی یا نہیں؟ ——— بہتیرے کہیں گے کہ کہا تو تھا اگر وہ نہ پڑھے تو کیا کریں، بھائی کہنے کے دو طریقے ہیں ایک مشورہ ایک حکم ہے ... ... " (صفحہ ۲۲۰)

ایمان اور عمل کا باہمی کیا تعلق ہے، اس پر مولانا تھانوی ارشاد فرماتے ہیں:۔

"ایک اور دقیق بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ عملِ صالح، اور تواصی بالحق کے ساتھ تواصی بالصبر کیوں بڑھا دیا، وجہ یہی ہے کہ اعمالِ صالحہ جوہرِ ایمان کے محافظ ہیں اور گناہ و معاصی اس دولت کے دشمن ہیں، جو شخص خود گناہ کرتا یا کسی دوسرے کو گناہ میں مبتلا دیکھ کر نصیحت نہیں کرتا، رفتہ رفتہ اس کے دل سے گناہوں کی نفرت کم ہو جاتی پھر زائل ہو جاتی ہے اور گناہ کو ہلکی معمولی بات سمجھنے لگتا ہے یہی کفر ہے (صفحہ ۲۳۷)

(صفحہ ۲۲۹) "واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة ... ..." کی یہ تفسیر آئی ہے کہ ایک شخص کسی بستی میں گناہ کرتا رہتا ہے، لوگ اس کو دیکھتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس سے کنارہ کشی نہیں کرتے نہ اس پر کچھ تشدد کرتے ہیں تو اس شخص کی وجہ سے سینکڑوں بے گناہ عذاب میں گرفتار ہو جاتے ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ حق تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو کسی بستی کے الٹ دینے کا حکم دیا، جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ خداوندا! اس بستی میں ایک شخص ایسا ہے جس نے عمر بھر میں کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی کیا اس سمیت الٹ دوں فرمایا کہ ہاں! اس سمیت الٹ دو کیونکہ اس نے یہ تو ہے کہ کوئی گناہ نہیں کیا مگر گنہگاروں کو دیکھ اس کے چہرے پر بل نہیں پڑا، وہ ہمارے دشمنوں سے ویسی ہی دوستی و محبت کے ساتھ ملتا رہا، جیسا دوستوں سے! تو کیسی یہ محبت ہے کہ ہمارے دشمنوں پر غصہ بھی نہ آئے، اس لئے وہ بھی انہیں کی مثل ہے"!

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی یا جماعتِ اسلامی کے کسی فرد کی طرف سے اس قسم کے خیالات کا اظہار ہوتا اور ایمان و عمل کے ربط و تعلق پر زور دیا جاتا تو بعض نازک طبع حضرات شاید چیں بر جبیں ہو کر طنز فرماتے کہ "یہ تو خارجیت ہے"!

صفحہ (۲۴۷) پر "انبیائی راہ" کی ترکیب جدان کو کھٹکی اس طرح عام طور پر نہ بولتے ہیں اور نہ لکھتے ہیں ———

——— مولانا عبدالباری ندوی نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بہت خوب ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں دین کی محبت کے ساتھ ساتھ دین کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا کر دیا ہے اور یہی نیک جذبہ اس کتاب کی صورت میں مجسم ہو گیا ہے۔

فلسفۂ تعلیم و تربیت

"فلسفۂ تعلیم و تربیت" ترجمہ:- از رئیس احمد جعفری ضخامت ۳۶۵ صفحات، لکھائی چھپائی نظر پسند، مجلد، خوبصورت رنگین گردپوش کے ساتھ

قیمت تین روپیہ بارہ آنہ، ملنے کا پتہ :- کتاب منزل، کشمیری بازار لاہور ——— اور کتاب منزل فریر روڈ، کراچی۔

دارالعلوم مصر کے شعبہ تربیت و علم النفس کے پروفیسر محمد عطیۃ الابراشی نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "روح التربیۃ والتعلیم"! جناب بدر میں احمد جعفری نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا ہے - صفحے کے صفحے پڑھ جائیے، یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اصل کتاب ہے یا ترجمہ پڑھا جا رہا ہے اتنے سلیس، رواں اور شگفتہ ترجمے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

یہ کتاب "تعلیم و تربیت" کے موضوع پر بہت خوب ہے اس میں "فکر" کے ساتھ مصنف کا "ذاتی تجربہ" بھی شریک ہے! فاضل مصنف نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ بعض لوگوں کو درس و تدریس سے فطری مناسبت نہیں ہوتی مگر وہ معلمی کے پیشہ کو آسان اور سہل الحصول سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں ——— پاکستان اور ہندستان میں اس قسم کے معلم کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں!

معلم کو پڑھاتے وقت کیا چیز پیش نظر رکھنی چاہیئے؟ اس کا جواب فاضل مصنف سے سنیئے :- "وہ [illegible] وعظ و پند و نصیحت کا دفتر کھول کر نہ بیٹھ جائے، بلکہ طلباء کے سامنے بنائی ہوئی چیزوں کی مثالیں پیش کرے کہ علم سے اتنا اثر پیدا نہیں ہوتا جتنا نمونہ اور مثال کو دیکھنے کے بعد پیدا ہوتا ہے ——— (صفحہ ۴۳)

تربیت عقلی کے بارے میں مصنف کی رائے :- "بعض خوش فہم لوگوں کا تربیت عقلی کے بارے میں یہ خیال ہے کہ تربیت عقلی کی مثال دھار اور چھری کی سی ہے، اگر چھری کی دھار خوب تیز ہو تو اس سے ہر وہ چیز کاٹی جا سکتی ہے جس کا کٹنا چھری سے ممکن ہے لیکن یہ خیال غلط ہے ——— عقل اگر تربیت یافتہ ہو تو وہ ہر چیز کو نہیں کاٹ سکتی اسی کو کاٹے گی جسے کٹنا چاہیئے۔ (صفحہ ۷۷)

اور یہ باتیں تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں :- "مذہب اسلام نے تربیت پر خاص زور دیا ہے، وہ دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے اور یہ بجز بہترین تربیت کے ممکن نہیں خدائے بزرگ و برتر اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے "اللہ نے تمہارے لئے آخرت میں جو کچھ رکھا ہے اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرو، لیکن دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اُسے فراموش نہ کرو"۔ سرکار دو عالم کا ارشاد ہے :- "تم میں سے وہ آدمی اچھا نہیں ہے جس نے دنیا کے لئے آخرت چھوڑ دی بلکہ تم میں بہتر وہ ہے جس نے یہ بھی لیا اور وہ بھی لیا" ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوا "دنیا کا کام اس طرح کرو جیسے تم ہمیشہ زندہ رہو گے اور آخرت کا کام اس طرح کرو جیسے کل ہی مر جاؤ گے" ——— ان اشارات کا حاصل کیا ہے؟ یہ کہ ہم کسی ایک چیز سے چمٹ نہ جائیں، دنیا کو پکڑیں تو دنیا ہی کے نہ ہو رہیں، آخرت کی طرف متوجہ ہوں تو دنیا سے منہ نہ موڑیں بلکہ غلو کو چھوڑ کر اعتدال کا راستہ اختیار کریں۔ ... ... ہم جب تک جئیں تو اچھی اور شاندار زندگی کے مالک ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ہمارا دین بھی مکمل ہو۔ (صفحہ ۸۷)

"تربیت کی مثال کھیتی کی سی ہے پہلے زمین ہموار کیجئے، پھر بیج ڈالئے، پھر سیراب کیجئے، تب فصل کاٹئے، یہی مرحلے لڑکے کی زندگی میں پیش آتے ہیں ان سے گزرے بغیر چارہ نہیں (صفحہ ۱۱۲)

"پستالوزی کا کہنا ہے کہ تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے جو نامعلوم ہے وہ معلوم ہو جائے بلکہ یہ ہے کہ آداب، اخلاق اور حسن معاملت کا جوہر پیدا ہو جائے" ——— فرڈیل نے اپنی کتاب "تربیت انسانی (The education of man) میں لکھا ہے کہ تربیت کا مقصد اچھی زندگی کا پیدا کرنا ہے جو پاک، ہموار اور مقدس ہو جس میں اخلاص اور پاکیزگی ہو ——— ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ تربیت کا جزوی و کلی مقصد یہ ہے کہ انسان میں "فضیلت" پیدا ہو جائے

(صفحہ ۱۱۵)......اور آج کل جس نہج پر تعلیم و تربیت ہو رہی ہے اُس سے بداخلاقی بلکہ بدچلنی کو فروغ ہو رہا ہے! علم و تعلّم کے ساتھ اس قسم کا مذاق شاید ہی کسی زمانہ میں کیا گیا ہے

"مدرس کو چاہیئے کہ وہ ہمیشہ یہ یاد رکھے کہ ہمارے لئے صرف علم ہی کافی نہیں ہے، علم سے زیادہ ہمیں اخلاق کی ضرورت ہے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح پرہیز علاج سے بہتر ہے، طب اور اخلاق دونوں کا یہ اصول بنیادی طور پر ایک ہے"..." (صفحہ ۱۱۶)

"مدرسین کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ تو ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ پڑھائیں کیسے؟ علم کا حاصل کرنا اور چیز ہے اور علم کا سکھانا بالکل دوسری چیز ہے (صفحہ ۱۶۸)......"مدرس ماں اور باپ دونوں کی نیابت کرتا ہے اس میں باپ کی سختی اور ماں کی نرمی دونوں چیزیں ہونی چاہئیں (صفحہ ۲۵۶)......"مدرس کو اپنے طلبہ کے سامنے حفظِ اوقات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے اگر مدرس اپنے کلاس میں پانچ منٹ لیٹ آیا ہے اور درجہ میں، فرض کیجئے چالیس طالب علم ہیں تو گویا مدرس نے پانچ نہیں دو سو منٹ ضائع کئے (صفحہ ۲۵۹)

"سندِ فراغت حاصل کر لینے کے بعد ایک مدرس یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب اُس کی تعلیمی زندگی کا دور ختم ہو گیا حالانکہ اُسے جاننا چاہیئے کہ علم کی کوئی آخری حد ہی نہیں، بلکہ مدرسہ سے نکلنے کے بعد ہی طالب علم کا اصل زمانہ شروع ہوتا ہے، مدرسہ تو صرف راستہ کھول دیتا ہے اب ہر دن خود آپ کا کام ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ علم اور معلومات کے حصول میں ہمیشہ آدمی لگا رہے تاکہ فکر کا دروازہ بند نہ ہو علم و اطلاع بحث و تجربہ اور غور و نظر کی طرف گام فرسائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے (صفحہ ۲۹۲)......"مدرس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ مدرس ہو اُسے منظم، مُرتب اور مہذب ہونا چاہیئے" (صفحہ ۲۶۳)

فاضل مصنف نے بچوں کی نفسیات سے بحث کرتے ہوئے بڑی نازک باتیں بیان کی ہیں، مدرس کی صفات گنائی ہیں، تدریس کے بنیادی قواعد پیش کئے ہیں پھر طریقِ قیاسیہ (DEDUCTIVE METHOD) طریقہ استقرائیہ (INDUCTIVE METHOD) طریقہ اختباریہ اور طریقہ سقراطیہ سے لیکر امریکہ کی مشہور ماہر تعلیم خاتون ہیلین پارکہرسٹ، مانٹسوری[1] اور ڈکرولی[2] کے طریقہ ہائے تعلیم (System of Education) کا بھی عام فہم انداز میں ذکر کیا ہے!

مصنف اپنی خود بھی آزاد اور مستقل رائے رکھتا ہے اُس نے بعض مقامات پر کانٹ اور ڈیکارٹ جیسے اکابر فلسفیوں کی رائے سے بھی اختلاف کیا ہے...... کہیں کہیں "مغرب زدگی" کی جھلک بھی نظر آتی ہے، صفحہ (۲۲۰) پر لکھا ہے "اور لڑکی کو موسیقی نقاشی، تصویر کشی اور مطالعہ کتب اور دوسرے اچھے کاموں میں لگا رکھنا چاہیئے"...... حالانکہ تجربہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ موسیقی اور تصویر کشی سے اخلاق پر اچھا اثر نہیں پڑتا اور موسیقی تو صنفِ نازک کے لئے زہرِ قاتل ہے!

ترجمہ میں یونان کے مشہور مقنن سولن (SOLON) کو "سولون" لکھا گیا ہے ممکن ہے یونانی زبان میں اسی طرح بولتے ہوں اور عربی میں یہ نام اسی طرح لکھا جاتا ہو مگر اردو میں "سولن" لکھا اور بولا جاتا ہے، فاضل مترجم کو اردو رسم الخط

---

[1] اٹلی کی نامور ماہر تعلیم و تربیت خاتون [2] OVIDE DECROLY جس کی اپنی تربیت گاہ بروکسل کے مضافات میں تھی!

ہی کا اتباع کرتا تھا ۔۔۔۔۔ (صفحہ ۱۰۱) " وہ شخص جو غم عظیم سے زیادہ متاثر ہو ... " " غم عظیم " کی ترکیب نادرست ہے
۔۔۔ (۱۲۶) " اور ذلیلت کا نام جہل ہے " اردو میں " رذالت " بولا جاتا ہے ۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ جن شخصیتوں کے نام آئے ہیں ان کے مختصر حالات بھی فٹ نوٹ میں دیے ہیں ۔۔۔۔

۔۔۔۔ یہ کتاب اردو ادب میں قیمتی اضافہ ہے، یقین ہے کہ ٹریننگ کالجوں میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا اور یوں بھی یہ سب کے پڑھنے کی چیز ہے کہ علم و تربیت کی ضرورت کس کو نہیں!

لمحاتِ جاوداں

" لمحاتِ جاوداں " از محمد ہادی حسین ضخامت ۱۹۰ صفحات ۔ " ٹائپ عمدہ مجلد مصور اور مع خوبصورت گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ :- دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمیٹڈ، ۱۰ چیمبر لین روڈ، لاہور۔

جناب محمد ہادی حسین (ڈی سی ایس (سابق)، بی اے، ایس (حال)، ملتان اور راولپنڈی میں کمشنر رہ چکے ہیں اور اب حکومت پنجاب کے محکمہ ترقیات عامہ کے سکریٹری (Secretary - [illegible]) ہیں، قدرت نے ان کو شاعر اور ادیب پیدا کیا تھا مگر حالات نے ان کو سرکاری عہدیدار بنا دیا، اس لیے شعر و ادب کی صلاحیتیں افسوس ہے کہ پورے طور پر ابھر نہ سکیں، فطری جوہر مشق و مہارت سے مجلّیٰ ہوتا ہے اور اس کے لیے جناب ہادی صاحب خاطر خواہ وقت نہ نکال سکے، پھر بھی سرکاری مصروفیتوں کے باوجود جو کچھ کہہ لیتے ہیں وہ غنیمت ہے ۔۔۔۔ ہادی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور فن عروض میں خاصہ درک رکھتے ہیں جو اس زمانہ میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے ۔

" لمحاتِ جاوداں " ہادی صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے جس کا " پیش لفظ " مولانا عبدالمجید صاحب سالک نے لکھا ہے ابتدائی حصہ شگفتہ و رواں ہے، مگر آخر میں چل کر اس قسم کے جملے آگئے ہیں :-

" کہیں حقائقِ حیات پر فلسفیانہ تعریف و تسلیم ہے " ۔۔۔۔ " یہ بعض قدما کے کلام کی گھٹی گھٹی پُر تکلف اور اہتمام آمیز کیفیت ہے " ۔۔۔ " کیفیت ایک تو گھٹی گھٹی اس پر اہتمام آمیز اور پُرتکلف یہ نثر کیا ہے ایک " معمہ " سا ہے !

جناب ہادی حسین کا کلام پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت زیادہ حساس اور نازک دل رکھتے ہیں قدرتی مناظر کا بھی ان پر بہت اثر ہوتا ہے اور سماجی حالات بھی ان کے سازِ دل پر زخمہ و مضراب کا کام کرتے ہیں، انگریزی شاعری سے وہ کافی متاثر ہیں اور یہ تاثر ان کے اندازِ بیان سے صاف نمایاں ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اردو شاعری کی پرانی قدروں کی افادیت بھی باقی رہے اور ترقی پسند شاعری " کا رنگ بھی جھلکنے لگے اس کوشش میں بعض جگہ کلام کی ہم آہنگی مجروح ہو گئی ہے ۔

ہادی نے منظر کشی بھی کی ہے اور کہیں کہیں تو فکر و خیال نے " آرٹ " کی بلندیوں کو چھو لیا ہے :-

وہ گھر گھر کے بادل دھواں دھار آئے　　　افق سے افق تک لگاتار چھائے
چلے آرہے ہیں وہ ایسے مسلسل　　　کہ بادل سے گویا نکلتا ہے بادل

" شعر و شاعر " کے عنوان سے چند رباعیات کہی ہیں، پہلی رباعی کتنی جاندار ہے :-

گوشے کو نقاب کے ذرا تھام ابھی　　　بہتر ہے نہ ہو جلوہ ترا عام ابھی
آئینہ ابھی پیشِ نظر رہنے دے　　　باقی ہے عروسِ فن! بہت کام ابھی

غزل کے یہ چند شعر کس قدر سادہ و پُرکار ہیں :-

بلبل کی فغاں شنیدنی ہے — کچھ گُل کے سکوت کی زبانی
اوروں کی تو بات ہی الگ تھی — دل نے مری بات بھی نہ مانی
تھا عقل کو اور کام ہی کیا — کرتی رہی دل کی پاسبانی

تیسرے شعر کی سچ تو یہ ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی، اس غزل کے بہت سے اشعار خوب سے خوب تر ہیں :-

اُف عقل کی آشیانہ سازی
اُف عشق کی برق آشیانی

کاش! "لمحاتِ جاوداں" میں شروع سے آخر تک یہی آہنگ قائم رہتا اور یہ "لے" "ٹوٹنے نہ پاتی"۔

(صفحہ ۶) نظم کا عنوان ہے "حیاتِ جاوداں کی بشارتیں" ورڈز ورتھ کی نظم کا ترجمہ ہے

؎ پھول اُسی صورت میں اب بھی گلعذار

"گلعذار" کی جگہ تازہ و شاداب یا اسی انداز کی کوئی اور صفت لانی تھی

؎ اور کی کچھ اور اس دُنیا کی ہیئت ہو گئی

"اور سے اور" یا "کیا سے کیا" کہنا چاہیئے تھا "اور کی اور" روزمرہ کے خلاف ہے ؛

(صفحہ ۱۴) ؎ ہو نقط نقالی لا انتہا ——— یہ پورا مصرعہ ہی غیر شاعرانہ ہے؛

(صفحہ ۱۶) ؎ تھی جو خود اک پھرتی پھرتی چھاؤں سی ناپایدار ——— "چلتی پھرتی چھاؤں" بولتے ہیں ؛

(صفحہ ۲۳) ؎ اتنی گہری، اتنی گہری آنسوؤں کی بھی زباں ——— زبان کی صفت "گہری" پہلی بار دیکھنے میں آئی، اس سے پہلا مصرعہ ہے ؎ فوراً آجاتی ہے گہری سوچ سی ! قریب کے دو مصرعوں میں ایک لفظ (گہری) کا بار بار استعمال کچھ اچھا نہیں لگتا، "سوچ آجاتا" بھی غلط ہے !

(صفحہ ۴۷) ؎ جس راز کی تھا رکھے ہوئے جیتے جی وہ لاج ——— مصرعہ میں تعقید کا عیب ہے !

(صفحہ ۵۹) ایک شعر ہے :-

ہر اِک رُکھ کوئی چھاؤں میں جس کی پائیں
چلے اور تپے جو ہیں دم بھر ٹھکانا

درخت کو ہندی میں "رُکھ" نہیں "رُوکھ" کہتے ہیں، اس شعر میں بھی تعقید وجدان پر گراں گزرتی ہے ؛

(صفحہ ۸۰) ؎ تو آ کے کہاں پھنس آ گیا اے بندۂ خوددار
موزوں ان تھی کیا تیرے لئے خدمتِ سرکار

"موزون" کے "اعلانِ نون" نے شعر کو بے لطف کر دیا۔

(صفحہ ۹۹) ؎ مُغنیہ! ٹھہر ٹھہر! یہ میرے دل کا ساز ہے
نوائیں جس سے نوچ نوچ کر نکالتی ہے تو

"نواؤں کا نوچ نوچ کر نکالنا" انگریزی پیرایہ بیان ہو جو اس مذاق کے آدمیوں کو گوارا ہو تو ہو مگر ہم اردو داں تو عجیب وحشت محسوس کرتے ہیں "نوچنے" کی جگہ "چھیڑنا" بہت موزوں تھا ؎ نوائیں جس سے چھیڑ چھیڑ کر نکالتی ہے تو ؛

(صفحہ ۱۰۶) سے

ہاتھ میں اُن کے فروزاں مشعلِ تہذیب ہے
آستیں میں اُن کی پنہاں آلۂ تخریب ہے

"آلہ" کی جگہ "دشنہ" زیادہ موزوں لفظ اور شاعرانہ اندازِ بیان تھا۔

"لمحاتِ جاوداں" کی بعض نظمیں لُطف سے خالی نہیں شاعر نے جذبات اور فلسفہ کو ایک دوسرے میں سمونے کی کوشش کی ہے ——— "یہ گریہ بھی زہر خند بھی ہے" جس نظم کا عنوان ہے وہ طویل نظم ہادی صاحب نے رباعی کے اوزان میں کہی ہے اور اس جدت کا سہرا قدرت نے اُن کے سر باندھ دیا ہے۔ ایک مسلسل غزل کے یہ دو شعر کتنے اچھے ہیں:-

کس کام کے نہ کرنے کی پاداش موت ہے
کس کارکردگی کا ہے انعام زندگی

وہ آخری اُفق کہ نہیں کچھ بھی جس کے پار
ہے اُس اُفق کے پار کا پیغام زندگی

شلانگ کے مناظر سے متاثر ہو کر جو نظم کہی ہے اُس کا یہ شعر خود اپنی جگہ ایک مُرقع ہے:-

تابانیٔ رُخِ لالۂ خودرو کی دمک ہے
نازک بدنی سروِ خراماں کی لچک ہے

گردِ راہ

"گردِ راہ" از:- وحید احمد، ضخامت ۱۰۶ صفحے مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: وحید احمد پارلیمنٹری سکریٹری کونسل ہاؤس لکھنؤ۔

بدایوں سے دو ڈھائی میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی بستی شیخوپور ہے، جہاں کے رؤسا کا سلسلۂ نسب حضرت بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے، جناب وحید احمد صاحب اسی خاندان (فریدی فاروقی) سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی خان بہادر سید محمد عرف نیکو میاں مرحوم برسوں سے یو۔پی کی لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے ہیں اور سرکاری حلقوں میں وہ کافی متعارف تھے۔

جناب وحید احمد آغازِ جوانی میں فیشن ایبل نوجوان تھے، اُنھوں نے انگلستان کی بھی سیر کی ہے، پھر طبیعت نے پلٹا کھایا تو کوٹ اور پتلون کی جگہ شیروانی اور پاجامہ نے لے لی، مذہب کی پابندی کے ساتھ ڈاڑھی رکھنے کی توفیق بھی نصیب ہوئی، کتابوں کا مطالعہ ہر عالم میں جاری رہا، ادب اُن کی گھٹی میں پڑا تھا، غالباً ۱۹۲۲ء میں بدایوں سے ماہنامہ "نقیب" جاری کیا جو تین چار سال نکل کر خاموش ہو گیا مگر اُس کی گونج اُردو دُنیا میں آج تک باقی ہے۔

جناب وحید احمد ان دنوں یو۔پی کی حکومت میں پارلیمنٹری سکریٹری ہیں، اپنے عہدے کی گوناں گوں مصروفیت کے باوجود احباب کے اصرار پر کبھی کبھار مضمون بھی لکھ دیا کرتے ہیں، اُن کے صاحبزادے فرید احمد مسعود نے ان مضامین کو ترتیب کر کے کتابی شکل میں شائع کیا ہے، قاضی عبد الغفار صاحب مراد آبادی (مصنف لیلیٰ کے خطوط) نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے فرماتے ہیں:-

"افسوس اس کا ہے کہ وحید احمد صاحب اگر پارلیمنٹری سکریٹری نہ ہوتے تو خدا جانے کتنے بہتر اور کس قدر زیادہ بلند پایہ ادیب ہوتے! پھر بھی بسا غنیمت ہے کہ وہ اپنے قدرتی اور ابتدائی مذاق کو زندہ رکھتے ہیں۔"

"گردِ راہ" میں شعر و ادب، سماج، سیاست اور دین و تصوف کے مختلف موضوعات پر پندرہ مضامین ہیں، اندازِ بیان شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ پُرشکوہ بھی ہے، دو تین سماجی مضمون بہت ہلکے پھلکے ہیں، زبان منجھی ہوئی ہے، "اقبال کے کلام

سے مضمون نگار کو خاص شغف ہے اور اس کا سب سے بڑا سبب مذہبی لگاؤ ہے، لکھتے ہیں:۔

"نٹشے کا مافوق الانسان جب ذوقِ گناہ کے لئے بے تاب نظر آیا تو اقبال نے فخرِ موجودات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سرِ عقیدت و نیازمندی جھکا دیا اور وہیں سے ازِ انسانیت پا کر بقائے دوام حاصل کر لی۔" (صفحہ ۸)

وحید احمد صاحب کی باخبری اس زمانہ میں بسا غنیمت ہے کہ اپنے مضمون میں اشراقیین اور معتزلہ کی بحثوں کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری طرف تصوّف کی اصطلاح "قوسِ نزولی" اور "قوسِ عروجی" کو بھی بیان کر جاتے ہیں:

(صفحہ ۱۱) "شاہدِ مطلق کو جو اپنی نمایش منظور ہوئی" "نمایش" میں ذم کا پہلو نکلتا ہے۔ "ظہور" یہاں مناسب تھا[ع] ——
—— (صفحہ ۱۱) "جنت میں آدمؑ کو اپنے عطیات استعمال کرنے کا شعور نہ تھا" اس میں "اپنے" ٹھیک استعمال نہیں ہوا، اس کے علاوہ حضرت سیدنا آدم علیہ السلام کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں —— "انسان نہ صرف خلق ہے بلکہ حق بھی ہے، قوتِ عشق اسے تختِ توحید پر بٹھا دیتی ہے" (صفحہ ۱۴) تصوّف کا یہی وہ غلو ہے جس نے تصوّف اور اہلِ تصوّف کو بدنام کر رکھا ہے —— "اذان کو نہ سنکھ سے ڈرنا چاہیئے اور نہ سنکھ کو اذان سے نفرت کرنا چاہیئے کیونکہ دونوں ایک ہی حقیقت وحقانیت کے اعلان کی مختلف شکلیں ہیں" (صفحہ ۴۹) اذان اور سنکھ دونوں کی حقیقت میں زمین آسمان کا فرق ہے ان کو ایک سمجھنا نہ صرف یہ کہ فہم و بصیرت کی بلکہ عقیدے کی غلطی ہے —— "آج یہ دیوالی ہندستان والوں کو یہ جتلانے آئی ہے کہ لکشمی کے دیوتا کے گُن گاؤ اور لکشمی سے بہتری کی اُمید رکھو" (صفحہ ۹۴) اگر "ہندستان والوں" سے "ہندو" مراد ہیں تو ہم کچھ نہیں کہتے کہ وہ لوگ اسی قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں لیکن اگر اس تصوّر میں مسلمان بھی شامل ہیں تو مسلمان خدا کے سوا کسی سے بھلائی کی اُمید نہیں رکھتا اور ان دیوی اور دیوتاؤں کے وجود سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے —— مصنّف کو ان لفظوں سے رجوع کر لینا چاہیئے! —— "گائے کا مسئلہ زبان کا مسئلہ باجا اور جلوس تعیش کی باتیں تھیں اب قلیت کو اس پر اصرار قطعی زیبا نہیں" (صفحہ ۱۰۴)

یہ عجیب قسم کی دریافت ہے ؎ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے!

کوئی شک نہیں کہ ہندستان میں مسلمان مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اُن پر روز بروز عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے مگر صبر و عزیمت کا یہ تقاضا ہے کہ خواہ موجِ خوں ہی سر سے کیوں نہ گزر جائے اُن کے پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہونی چاہیئے" بزدلی کی باتوں سے یہ اُلجھنیں کم نہ ہوں گی بلکہ اور بڑھ جائیں گی ——

ایمان کی قیمت دُنیا کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی چاہے آنکھوں کے سامنے اولاد ذبح ہو جائے مگر ایمان پر حرف نہ آنا چاہیئے، ظالم کو مظلوم کی بزدلی ظلم پر اور اُبھارتی ہے! ہر کسی کی خوشی اور رضامندی سے بڑھ کر اللہ تعالےٰ کی خوشی اور رضا ہے —— ہندستان کا جو مسلمان اس آشوب میں اپنا ایمان صحیح سلامت بچائے جائے گا اللہ کی مغفرت اور رحمت اُس کا خیر مقدم کریگی:

ہندی مسلمانوں سے یہ ہمارا خطاب عام ہے کہ جو لوگ اظہارِ حق کی جُرأت نہیں رکھتے وہ خدا کیلئے خاموش رہیں اور ظلم و کفر کی ہاں میں ہاں ملا کر ملت کی رُسوائی اور افرادِ ملت کی کمزوری کا سبب نہ بنیں جن کو اللہ نے جُرأت دی ہے وہ ڈنکے کی چوٹ حق کا اعلان کریں، اس لئے کہ

؎ اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

[ع] ؎ شاہدِ مطلق کو جب اپنا ظہور منظور ہوا۔

یہ جرأت پیدا ہو گئی تو پھر اللہ کی نصرت آنے میں کے دن کی دیر ہے!

ستاروں سے ذرّوں تک "ستاروں سے ذرّوں تک" از:۔ جگن ناتھ آزاد ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت دو روپے بارہ آنہ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ "شاہراہ" دہلی!

جناب جگن ناتھ آزاد اردو زبان کے نغز گو شاعر ہیں یہ کتاب اُن کے تازہ ترین کلام کا مجموعہ ہے جس میں نظمیں، غزلیں، قطعے، رباعیاں اور بلینک ورس سبھی کچھ ہے ـــــ سنہ ۱۹۴۷ء کے پُر آشوب انقلاب کے بعد جگن ناتھ آزاد کی شاعری ایک نئے راستہ پر مڑ گئی ہے جس میں کہیں کہیں مذہب کے خلاف جھنجلاہٹ بھی پائی جاتی ہے!

آزاد کو اپنے وطن کے چھٹنے کا بڑا قلق ہے، یہ غم اُن کے بہت سے شعروں سے نمایاں ہے! وادیٔ گنگ و جمن میں بھی اُنھیں کنارِ راوی اور ساحلِ سندھ و چناب کی یاد ستاتی ہے۔

کنارِ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں
وہ تجھ میں بات کہاں اے دیارِ گنگ و جمن

پاکستان میں وہ ایک مشاعرے کے سلسلہ میں آتے ہیں تو اُس ہوائی جہاز کو دعائیں دیتے ہیں جو اُنھیں اپنے وطن میں لیکر آتا ہے:۔

گزرے ہوئے دور کو بلانے والے | بچھڑی ہوئی دنیا سے ملانے والے
اللہ تجھے اور سبک بال کرے | اے مجھ کو وطن میں لے کے جانے والے

ایک دو رباعی ہے، جس میں "حبِ وطن" کروٹیں لے رہی ہے

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا | مہجورِ وطن، وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن! چمن میں اعلان کرو | شیدائے چمن، چمن میں واپس آیا

آزادی کے بعد جس نئے دور سے شاعر کا سابقہ پڑا ہے، اُس سے وہ بہت بیزار ہے، کہتا ہے اور محسوس کر کے کہتا ہے:۔

کیا نئے دور میں ہے عدل اسی چیز کا نام | کہ ہو راکب بھی بشر اور ہو مرکب بھی بشر
کس لغت میں ہے یہ مفہوم مساوات کہ ہوں | سیکڑوں امن میں خرف اٹھنے کے ذہن میں گُم

چند اشعار کا زورِ بیان، لطفِ اظہار اور شاعرانہ نازک بیانی دیکھئے:۔

ترے ہی ساتھ مجھے بھی سفر میں جانا ہے | ٹھہر تو قافلۂ نوبہار سرو سمن
حرم والو پُرانے دوستو! ایمان سے کہنا | بسر کی ہے تمہارے ساتھ کیسی زندگی میں نے

اس شعر میں بلا کی تاثیر ہے، یہ ایک منظوم فریاد اور ایک دردناک چیخ ہے جو لفظوں میں ڈھل گئی ہے ـــــ اس غزل کا ایک اور شعر ہے

منور کر لیا ہے داغِ دل سے راہِ منزل کو | کبھی مانگی نہیں شمس و قمر سے روشنی میں نے

میں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے | ہاتھ سے گر کے جام ٹوٹ گیا

تری تلاش کی منزل ابھی ہے دُور اے دوست!　　ابھی تو خود مجھے اپنا نشان نہیں ملتا

جسم مشکل میں اگر ہے رُوح بھی مشکل میں ہے　　آج دونوں کا مقدر ایک ہی منزل میں ہے

غمِ دوراں، غمِ جاناں کا بدل ہو کہ نہیں　　اس میں بھی تاب و تبِ سوزِ ازل ہو کہ نہیں
محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع　　آج اُس تلخ کلامی کا محل ہے کہ نہیں
علمِ افکار زمانے میں بڑا علم سہی　　علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہے کہ نہیں
موت اور اُس کے عواقب سے ڈرانے والے!　　موت کی طرح غمِ زیست اٹل ہو کہ نہیں
اے غزل کو غمِ محبوب سمجھنے والے!
یہ جو اب میں نے سنائی ہے غزل ہو کہ نہیں

دوسرا رُخ:- تجھ کو مجھ سے یہ گلہ ہے کہ مرا فکرِ جمیل　　بھاگ نکلا ہے تخیل کے سمن زاروں سے (صفحہ ۲۱)
"فکرِ جمیل" کی تذکیر یہاں وجدان پر گراں گزرتی ہو اور الفاظ کے توازن اور مصرعوں کی ساخت کے اعتبار سے "بھاگ نکلا ہے" بے جوڑ سا ہے!

تو جو کہتا ہے کہ یہ دور ہے انصاف سے دُور　　اتنی نایاب پھر انصاف کی دولت کیوں ہو (صفحہ ۳۴)
یہاں "نایاب" کا نہیں "کمیاب" کا محل ہے۔

نہیں کوئی شعر کا جو مقصد تو شعر گوئی ہے ژاژ خائی (صفحہ ۴۹)
"ژاژ خائی" کی ثقالت شعر کی سُبک رُوحی پر بار معلوم ہوتی ہے۔

یہ ضیا پھیلتی جاتی ہے زمیں پر ہر سو
فطرت آزاد ہے اس نور کی محبوس نہیں (صفحہ ۱۴)
"محبوس" کا استعمال یہاں ٹھیک نہیں ہوا، "پابند" کہنا چاہیئے تھا اور کہہ گئے "محبوس"

بزمِ کہنہ کو ہے اب ایک بہانہ درکار　　وہ اُجڑنے کا بہانہ تو نہیں رُک سکتا
پورا شعر ہی بے معنیٰ اور بے ربط ہے، "بہانہ کا رُکنا" اور عجیب تر ہے!

پھولوں کو نہ پیروں سے لتاڑو سنبھلو　　پودوں کو نہ اس طرح اُکھاڑو سنبھلو (صفحہ ۱۵۳)
معلوم ہوتا ہے شاعر کو "لتاڑنے" کے معنی ہی معلوم نہیں ہیں! "لتاڑنا" تو ڈانٹنے ڈپٹنے اور انتباہ و ملامت کو کہتے ہیں۔

تو اگر ملحق رہا سکوں کی جھنکاروں کے ساتھ　　وقت رکھے گا تجھے دُنیا کے غداروں کے ساتھ
"ملحق" نے شعر کی سادگی کا حسن ہی غارت کر دیا۔

جگن ناتھ آزاد کسی رئیس کی دعوت سے اُٹھ کر چلے آئے ہیں، ان تاثرات کو انھوں نے نظم میں پیش کیا ہے یہ نظم اُنکی شاہکار نظم ہے، اس میں شاعرِ عظمت و خودداری کی بلندیوں سے خطاب کر رہا ہے
تاج کی رنگت گزرتی ہے اگر دل پر گراں　　نوک سے جوتے کی ٹھکراتے ہیں ہم تاجِ شہاں

ایسی نظمیں کثرت سے لکھی جائیں اور محفلوں میں پڑھی جائیں تو ان بد دماغ رئیسوں اور مغرور امیروں کا دماغ درست ہو جائے، شاعر کے اس جذبہ خودداری کی ہم قدر کرتے ہیں:

شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات

"شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ: خلیق احمد نظامی، ضخامت ۲۱۲ صفحات، قیمت تین روپے چار آنے، ملنے کا پتہ:- احتشام احمد نظامی، نفیس منزل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (بھارت)

اسلامی دنیا میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ العزیز ورحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شخصیت آفتاب کی طرح روشن ہے، علم وفضل، فہم وبصیرت، سیرت کردار سبھی کچھ اللہ نے اُن کو دیا تھا اور اس جامعیت میں بہت کم علماء اُن کے ہمسر نکلیں گے، امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" کے بعد "حجۃ اللہ البالغہ" کو غیر معمولی شہرت اور قبول عام حاصل ہوا، شاہ صاحب کے گھرانے کا پاکستان اور ہندستان کے مسلمانوں پر احسان ہے کہ علم وفضل کے چشمے وہیں سے پھوٹ کر اطراف و اکناف میں پہنچے جن سے تشنگانِ دین وحکمت سیراب ہوئے۔ ولی اللہی خاندان حقیقت میں "مجددوں" کا خاندان تھا، جو ہر دور میں دین کی تجدید اور احیار کی خدمت انجام دیتا رہا:

حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ مفسر ہیں، محدث ہیں، مؤرخ ہیں، معلم اخلاق اور بے مثل ادیب و انشاپرداز ہیں لیکن اُن کی زندگی کا یہ رُخ بہت کم سامنے آیا ہے کہ ہندستان کی سیاسیات سے شاہ صاحب کا گہرا تعلق رہا ہے، اور اُن کی دینی زندگی صرف منبر و خانقاہ تک ہی محدود نہ تھی، قصر و ایوان اور رزمگاہوں پر بھی اُن کی شخصیت اثر انداز ہوئی ہے:

شاہ ولی اللہ رح اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں پیدا ہوئے، جب وہ چار سال کے تھے تو اورنگزیب کا انتقال ہو گیا بہادر شاہ اول کے عہد حکومت میں شاہ صاحب نو برس کے تھے اُس کے بعد سے شاہ عالم کے زمانے تک اُنھوں نے ایک دو نہیں نو بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور شاہ صاحب کی زندگی ہی میں احمد شاہ ابدالی نے سنہ ۱۷۴۷ء سے لیکر سنہ ۱۷۶۹ء تک نو حملے کئے:

اورنگزیب کے بعد مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو گیا، مغلیہ بادشاہ اپنے آباء اجداد کی جرأت و مردانگی کو کھو چکے تھے، عیش و عشرت نے اُن کو دارِ عمل سے حرکت چھین لی تھی، سازشوں اور ہنگامہ آرائیوں کا زور تھا، مرکز کو کمزور پاکر ماتحت صوبوں میں خود مختاریاں قائم ہو گئیں، شاہ عالم کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت کے اقتدار کا یہ عالم تھا:-

سلطنتِ شاہ عالم
از دہلی تا پالم

مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں نے ملک کے نظام حکومت کو تہ و بالا کر رکھا تھا، ان مفسدین کو مغلیہ حکومت ہی سے نہیں مسلمانوں سے بھی عداوت اور پرخاش تھی، حضرت شاہ ولی اللہ کفر کے اس غلبہ اور مسلمان حکومت کی ابتری کو برداشت نہ کر سکے، اُنھوں نے اس سلسلہ میں جو خطوط لکھے ہیں، یہ کتاب انھی مکتوبات پر مشتمل ہے:

"شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سیاسی مکتوبات" کا "تعارف" پروفیسر محمد حبیب صدر شعبہ سیاسیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور "تقریب" اسی یونیورسٹی کے صدر شعبہ تاریخ پروفیسر شیخ عبد الرشید نے لکھی ہے، مقدمہ خود فاضل مرتب نے تحریر کیا ہے جو نہایت جامع اور معلومات آفریں ہے ——— اُس کے بعد حضرت شاہ صاحب کے چھبیس (۲۶) خطوط درج ہیں جن میں سے ایک مختصر سے خط کے سوا جو عربی زبان میں ہے باقی تمام مکتوبات فارسی کے ہیں:

عوام کی سہولت کی خاطر جناب خلیق احمد نظامی نے ان خطوط کا اُردو میں ترجمہ بھی کر دیا ہے، پھر چند صفحے کے نہایت مفید اور کارآمد حواشی اور تعلیقات ہیں، آخر میں حضرت شاہ صاحب کے مختصر حالات اور احمد شاہ ابدالی، نجیب الدولہ، نواب مجد الدولہ اور مولانا سید احمد کے سوانحِ حیات ہیں!

فاضل مؤلف نے لکھا ہے کہ "پانی پت کا میدانِ کارزار حقیقت میں شاہ ولی اللہ صاحب کا سجایا ہوا تھا، اس کتاب میں وہ خط درج ہے جو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا، اور اس نے شاہ صاحب کی دعوت پر ہندستان میں آکر مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ بقول سر جادو ناتھ سرکار، مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صفِ ماتم نہ بچھ گئی ہو، لیڈروں کی پوری نسل ہی ایک معرکہ میں غائب ہو گئی۔ (صفحہ ۱۹)

حضرت شاہ صاحب نے ایک طرف احمد شاہ ابدالی کو ہندستان آنے کی دعوت دی دوسری طرف نجیب الدولہ کو جہاد کے لئے اُبھارا، نواب نجیب الدولہ کو شاہ صاحب "راس المجاہدین" اور "رئیس الغزاۃ" جیسے معزز اور مقدس القاب سے مخاطب فرماتے ہیں، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :—

"ارادۂ خدا تعالیٰ برہمہ غالب است، سخن صلح اگر کافراں بخدمت شریف بہر حیلہ عرض کنند گوش سخن ایشاں نباید داشت، اگر بعض مسلماناں کہ نیت ایشاں در اعلائے دین محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات ضعیف است اندیشہ ہائے دور و دراز مستولی کنند آں را نیز استماع نباید نمود ———"

یعنی اللہ تعالیٰ کا ارادہ سب پر غالب ہے اگر مخالفین مکر و حیلہ کے ساتھ صلح کی گفتگو کریں تو اُن کی باتوں پر کان نہ دھرنا، اگر بعضے ایسے مسلمان جن کی نیت اعلاءِ دین محمدی کے سلسلہ میں کمزور ہے لمبے چوڑے خطرے پیش کریں تو اُن کی بات بھی نہ سُننی چاہیئے، (صفحہ ۱۲۴)

بائیسواں خط وزیر الممالک آصف جاہ کے نام ہے، اس میں لکھتے ہیں۔ .. .. ..

"ہم لوگ آپ سے بڑی اُمیدیں قایم کئے بیٹھے ہیں کہ آپ کے ذریعہ دفع مظالم، تغیر رسوم بد، ترویج دین حق اقامت امرِ خیر اشاعت علم و نماز و روزہ یہ سب کچھ عُمدہ طریقہ پر ہوگا" .. .. .. فی الحال جس قدر طاقت ہو گرانی غلّہ دور کرنے میں سعیٔ بلیغ فرمائیں ——— (صفحہ ۱۴۷) ——— (ترجمہ)

اس کتاب کے صفحہ (۲۰۲) پر لکھا ہے :—

"نجیب الدولہ نے ۳۱ اکتوبر ۱۷۷۰ء کو انتقال کیا اس عدل گستری اور بالغ نظری کا یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا کہ جس وقت بستر مرگ پر آخری سانس لے رہا تھا تو اُس نے اپنی فوجوں کو (جو اس کے ساتھ ہاپوڑ کے مقام پر تھیں اور گڈھ کا میلہ ہو رہا تھا) حکم دیا کہ گنگا کے میلے میں آنے جانے والے ہندو یاتریوں کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے"۔

یہ وہی گڑھ مکتیشر کا میلہ ہے جہاں اب سے پانچ سال پہلے مسلمانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر دیا گیا، اسلام کی وہ وا داری اور احترامِ ہمسایگی اور کفر کا یہ ظلم و دغا!

" احمد شاہ مذہبی رُجحانات کا آدمی تھا، علماء و مشائخ کا ہجوم اُس کے گرد رہتا تھا، پشاور، لاہور اور بٹالہ کے مشائخ کی خدمت میں وہ اکثر حاضر ہوا ہے، دہلی، اجمیر اور پانی پت کے مزارات پر اس نے عقیدت سے حاضری دی ہے جنگِ پانی پت کے اگلے دن وہ حضرت بو علی شاہ قلندرؒ کے مزار پر نیاز مندانہ گیا تھا۔ .. .. .. (صفحہ ۱۹۱)

قبروں کو دیکھ کر موت کو یاد کرنا اور اہلِ قبور کے لئے مغفرت کی دعا کرنا تو درست ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے صحابہ سے یہ ثابت ہے مگر "مزارات پر بہ نیاز مندانہ حاضری" اور "شدید حال" خطرناک قسم کی عقیدت ہے!

جناب خلیق احمد نظامی کی یہ کوشش تحسین کی مستحق ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے اُن کو اجر عطا فرمائے گا، خلیق صاحب سے ہم اسی انداز کی کچھ اور کتابوں کی توقع رکھتے ہیں؛

مُسلمان اُندلس میں

"مُسلمان اندلس میں" از:- رشید اختر ندوی ضخامت ۳۸۷ صفحات چکنا کاغذ، مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت آٹھ روپے بارہ آنے، خاص جلد کی قیمت دس روپے، ملنے کا پتہ:- پبلشرز یونائیٹڈ چوک انارکلی، لاہور!

اندلس کی تاریخ مُسلمانوں کے عروج و زوال کی انتہائی عبرت انگیز داستان ہے، اندلس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے خود اُردو زبان میں متعدد کتابیں اس موضوع پر موجود ہیں مشہور ناول نگار جناب رشید اختر ندوی نے اس تاریخ کو دلکش انداز میں دہرایا ہے اور اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اُنھوں نے کافی محنت اور دقتِ نظر سے کام لیا ہے، مشرق اور مغرب کے مشہور مورخین کی کتابیں اُن کے پیشِ نظر رہی ہیں، ابن خلدون اور ابنِ اثیر سے لیکر امیر شکیب ارسلان تک کی تاریخوں سے لائق مصنّف نے استفادہ کیا ہے انہ یورپین مورخین میں ڈوزی، اسکاٹ، ڈاکٹر کونڈے اور ہنری اٹ کی کتابوں سے بھی فائدہ اُٹھایا ہے —— رشید اختر ندوی لکھتے ہیں "کہیں کہیں مجھے ڈوزی اور اسکاٹ سے بیحد اختلاف پیدا ہوا ہے اور میں نے ان کے مقابلہ میں علامہ مقری، ابن حیان، امیر شکیب ارسلان اور لسان الدین ابن خطیب پر اعتماد کیا ہے"

اس کتاب کی زبان سلیس اور پیرایۂ بیان شگفتہ ہے، مصنّف نے بڑے خلوص بلکہ عقیدت کے ساتھ اس تاریخ کو مُرتب کیا ہے، مسلمان ناموروں (H E R O E S) کے تذکرے میں مُصنّف نے احترام کو ملحوظ رکھا ہے، یہ کتاب کافی دلچسپ ہے اور معلومات آفریں بھی!

اُندلس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ "طوفانِ نوحؑ کے بعد جب نئی دُنیا بسائی گئی تو اس ملک میں جو قوم آباد ہوئی اس کا نام "اندلش" تھا، بعد میں آنے والے لوگوں نے "ش" کو "س" سے بدل دیا، اس وقت کی آبادی کا مذہب مجوسی تھا (صفحہ ۱۵)

اسپین کی عیسائی خانقاہوں میں راہبات (N U N S) مقدس پادریوں کا آلۂ تفریح اور سامانِ انبساط بن کر رہ گئی تھیں:- "یہ راہبات پادریوں کی غیر معمولی ترغیب کی بناپر پیشہ درویشی اختیار کرتیں ان میں سے اکثر وہ تھیں جو اپنے وقت کی حسین ترین عورتیں سمجھی جاتیں، یہ عجیب بات تھی کہ پادری حضرات کی نگاہِ انتخاب ان ہی عورتوں پر پڑتی جو حسن جمال میں مثال نہ رکھتیں وہ انھی عورتوں کو شعبۂ دینیات میں داخل کرتے جو اُن کو پسند آتیں۔ (صفحہ ۱۸)

ساحلِ اُندلس پر پہنچکر طارقؒ نے کشتیاں جلادیں تاکہ واپسی کا خیال ہی کسی کے دل میں پیدا نہ ہو اور فرمایا:- "... میں نے یہ کشتیاں جلادیں، میں نے یہ لوہے اور لکڑی کے جڑے ہوئے تختے آگ کی نذر کر دیئے، یہ اب میرے لئے بیکار تھے، ہم یہاں سے لوٹنے کے لئے نہیں آئے، ہمیں پھر واپس نہیں ہونا، آگے بڑھنا ہے اسلام نے ہمیں جو تعلیم دی ہے، ہمیں جو نور بخشا ہے اسے دُور دُور تک عام کرنا ہے، یاد رکھو پیچھے سمندر ہے اور آگے دشمن، پچھلی موت بزدلی کی موت ہے اور آگے کی موت بہادری کی موت —— وہ موت اگر ہمیں آئی تو ہمارے لئے خدا اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کا سبب ہوگی۔ ... اپنے ایمان پر بھروسا کرکے آگے بڑھو یہی اصل زندگی ہے۔" (صفحہ ۲۲)

زریاب اپنے زمانہ کا بہت بڑا مغنی گزرا ہی، عبدالرحمٰن فرمانروائے اندلس اُس کی بیحد قدر کرتا تھا، شاہی محلوں میں سے ایک محل زریاب کے رہنے کے لئے دیا اور اکرام و عطا کا اس پر مینھ برسا دیا، زریاب اُس دَور کا ایک فیشن ایبل آرٹسٹ تھا، اُس نے اُندلس کی شہری زندگی پر کافی اثر ڈالا ــــــ اور "یورپ والوں نے کانٹے چھری، شیشے کے برتن، میزیں کرسیاں، اور لباس اُسی سے لیا ہی، یہ زریابی کھانے ہیں جو یورپ میں کھائے جاتے ہیں اور یہ زریابی لباس ہی جس میں تھوڑی بہت ترمیم کرکے سارا یورپ پہنتا ہی۔ ۔ ۔ " (صفحہ ۱۵۸)

اُندلس کے شہروں اور وہاں کے انتظامات کی ایک جھلک :- "جو صفائی لندن، نیویارک، جینوا، روم، پیرس اور برلن جیسے شہروں کو آج کل نصیب ہی، یہ اندلس کے شہروں کو اُس وقت نصیب ہو چکی تھی، سارے یورپ کی سالانہ آمدنی کو ایک طرف رکھا جائے تو اندلس کی آمدنی اس مجموعی آمدنی سے دس گُنا تھی، صرف خراج سے ساڑھے آٹھ کروڑ روپیہ سالانہ شاہی خزانے میں داخل ہوتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک بھر میں کوئی صناع کوئی کاریگر اور مزدور بیکار نہ رہنے دیا جاتا، بیکاری سب سے بڑا عیب سمجھی جاتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک کے ہر حصے میں ہر شہر اور ہر قصبہ میں سرکاری خرچ سے ادارے قائم تھے جہاں محتاج، بیمار، اپاہج اور اسی طرح کے دوسرے مجبور لوگ رکھے جاتے، ان کا سارا خرچ حکومت کے ذمہ ہوتا، اندلس کے سارے یتیموں، بیواؤں کی تعلیم و تربیت اور دوسرے اخراجات بادشاہ آپ ادا کرتا، صرف قرطبہ میں ایسے کئی سو ادارے تھے جو یتیموں کی پرورش کرتے، یہ بچے بادشاہ کے بچے سمجھے جاتے اور اُن کے ساتھ امیروں کے بچوں کا سلوک کیا جاتا۔ ۔ ۔ ۔ شہر میں کوئی پھٹے لباس یا بُری حالت میں کبھی نہیں دیکھا گیا نہ کوئی شخص بھیک مانگتا ہوا ملا، ہر ایسے آدمی کو کھانا اور لباس عبدالرحمٰن الناصر اپنے پاس سے دیتے، شہر کے حدود سے باہر سات آبادیاں تھیں جہاں زیادہ تر سفید رنگ کے مکانات بنے تھے، ہر طرف سبزہ بچھا تھا، ہر طرف نہریں جاری تھیں، کئی میل تک تو صرف نارنگی کے درخت تھے، ہر سڑک کے کنارے پھولوں کی کیاریاں بنائی گئی تھیں، ہر چوک میں ستون بنے تھے جن پر گلاب کے پودے اُگائے گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں تعلیم مفت تھی ہر شہری کو کسی بھی مدرسہ میں ایک کوڑی بھی خرچ کرنی نہ پڑتی اور نیچے سے لیکر انتہائی تعلیم مفت تھی (صفحہ ۱۹۰، ۱۹۸، ۲۰۰)

علم و فن کی ترقیاں :- "قرطبہ یونیورسٹی کے مقامی کالجوں میں گیارہ ہزار طلبا روزانہ تعلیم پاتے، ان طلبا میں یہودی عیسائی، اندلسی اور غیر اندلسی سب ہی ہوتے، امرا کے بچوں کو چھوڑ کر، باقی ہر طالب علم کو یونیورسٹی کی طرف سے کتابیں بھی مفت ملتیں اور غیر مقامی طالب علموں کو رہائش خوراک اور لباس کی سہولتیں بھی مفت بہم پہنچائی جاتیں۔ ۔ ۔ ۔ قرطبہ اشبیلیہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کی نہ صرف عمارتیں قابلِ دید تھیں، ان کی تجربہ گاہوں اور معملوں (لیبارٹریز) کا سامان حیرت انگیز ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ قرطبہ میں الحکم ثانی کے زمانہ میں بیس ہزار دو کانیں صرف کتابیں بیچتیں، ان کتابوں کی جلدیں مُطلّا اور مُذہب ہوتیں، بعض جلدوں میں خوشبودار لکڑی بھی لگائی جاتی (صفحہ ۳۸، ۷ اور ۲۱۷)

اندلس کے نامور جغرافیہ داں :- "ابن حمید اور ابن جبیر نے جغرافیہ کی خاطر دُنیا بھر کی سیر کی، ابن بطوطہ جو بیس سال تک سیاحت کرتے رہے، عبیداللہ البکری کی آدھی زندگی اسی فن کی خاطر سیاحت میں گزری، ملاغہ کے ادریسی نے جغرافیہ میں بڑا نام پایا۔ ۔ ۔ ۔ ادریسی نے جو جغرافیہ لکھا وہ دُنیا کا سب سے پہلا صحیح جغرافیہ ہے۔ ۔ ۔ " (صفحہ ۲۴۲)

اور ایجادات کا یہ عالم تھا۔ ۔ ۔ "موجودہ کلاک (C L O C K) کی اصل بھی اندلسی

عربوں کی ایجاد ہے، گلیلیو کلاک کا موجد نہیں محض نقال ہے اس نے یہ فن اندلسی عربوں سے چرایا۔ الخازن اور ابن الہیثم نے دنیا میں سب سے پہلے شفق کے ثقل نوعی اور ایتھر سے متعلق بہت سے انکشافات کئے، بہ خصوص علمائے اندلس ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے گھومنے والے کرے، اصطرلاب[۵]، دھوپ گھڑیاں، پانی کی گھڑیاں، آب پیما، آلاتِ منظر و کواکب ودربیجات ایجاد کئے۔ ... ... تیزاب، شورہ، کبریت الکحل، نوشادر، پوٹاس، چاندی کا پانی اور فاسفورس کے ایجاد کرنے والے بھی اندلسی عرب ہیں، یہ لوگ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے وجود سے بھی آگاہ تھے اور اُن کے خواص کا بھی علم رکھتے تھے۔۔ ... ... جابر ابن حیان پہلے اندلسی سائنس داں ہیں جنھوں نے معدنیات کے تکسّد اور گاسون کا علم دنیا کو دیا۔ ... ... ابن العوام نے اپنی کتاب میں چھ سو ایسی بوٹیوں کے نام لکھے ہیں جو مختلف دواؤں میں استعمال کیجاتی تھیں، ابن بیطار نے تین سو دواؤں کو تیار کرنے کے نسخے قلمبند کئے۔۔۔۔"

"اندازہ کیا گیا ہے کہ سارے اندلس میں ریشم بننے والے بڑے کارخانوں کی تعداد آٹھ سو تھی، ان میں سے ایک ایک کارخانہ میں کئی کئی ہزار کرگھے تھے، ان کارخانوں میں جو کپڑا تیار ہوتا اس میں اس قدر صفائی اور پاکیزگی ہوتی کہ پورا تھان ایک چھلے میں گزارا جاسکتا تھا۔ ... ... ریشمی کپڑے کے علاوہ المیریا، ملاغہ اور غرناطہ میں سوتی کپڑا تیار کرنے والے کارخانے چار ہزار سے زائد تھے ــــــ سنہ ۱۶۹۰ء سے پہلے لندن میں کسی شخص کو معلوم نہ تھا کہ کاغذ کس طرح بنتا ہے حالانکہ سات سو سال پہلے اندلس کا ایک معمولی شہر شاطبہ روزانہ کئی ہزار ٹن کاغذ تیار کرلیتا تھا۔ ... ... المیریا کے کاریگر شیشہ سے ایسے حسین وجمیل برتن تیار کرتے کہ ان کے سامنے سونے اور چاندی کے برتن ماند پڑجاتے۔ ... ... مرسیہ کو اپنے ہال کے پردوں اور خوبصورت بیلوں کے سبب شہرت ملی، یہ بیلیں اور فیتے جو آج کل یورپ سے ہمارے ملک میں آتے ہیں، اُن بیلوں اور فیتوں کی نقل ہیں۔ ... ... لوہے کے صندوق اور سیف (SAFE) بنانے میں اندلس کے مسلمان ساری دنیا سے بازی لے گئے۔ ... ... "اور فنِ تعمیر میں تو اندلس کے عربوں نے سچ مچ سحر کاری کی ہے۔

بعض تاریخوں میں تاریخی سنین ([illegible]) کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ طبیعت کو وحشت ہونے لگتی ہے اس کے برخلاف "مسلمان اندلس میں" بعض اہم واقعات تاریخی سنین کے بغیر بیان کئے گئے ہیں ــــــ مصنف نے ہر جگہ "علانیہ" کو "اعلانیہ" اور "نبٹنے" کو "نپٹنے" لکھا ہے جو غلط ہے ــــــ (صفحہ ۲۰) "ستاروں نے آنکھیں جھپک لیں" ــــــ "ستاروں نے آنکھیں جھپکالیں" لکھنا تھا ــــــ (صفحہ ۲۱) "ساتھیوں نے ان سے ہم نوائی کی" ــــــ "ان کی ہم نوائی کی" درست ہے ــــــ (صفحہ ۳۰) "یہاں سے قرطبہ، ملاغہ، غرناطہ طلیطلہ کی راہیں پھوٹیں" چشمے پھوٹا کرتے ہیں راہیں اور راستے پھٹا کرتے ہیں، یوں بولتے ہیں فلاں مقام سے تین راستے پھٹتے ہیں (صفحہ ۶۲) "اپنے امیر کو شہید کرواکر واپس ہوئے" ــــــ "شہید کرواکر" وجدان کے لئے ناقابلِ برداشت ہے (صفحہ ۴۷) "ثعلبہ کا پلڑا بھاری تھا" "پلڑا" نہیں یہاں "پلہ" کا محل تھا ــــــ استورقہ، سرغوسہ، طرغونہ، بتلیطہ، شیدونہ، تلوانیا اور شنتمت اشتیان وغیرہ ناما...

---

۵ اس کتاب میں "اصطراب" لکھا ہے، جو یقیناً کتابت کی غلطی ہے۔

کے ساتھ اگر انگریزی نام بھی انگریزی رسم الخط میں لکھ دیئے جاتے تو تاریخ کے طالب علموں کو بڑی سہولت رہتی۔

(صفحہ ۸۵) "اور دشمن پر اس زور کا حملہ کیا کہ صفیں بگاڑ دیں" "صفیں تتر بتر کر دیں" یا اسی قبیل کا کوئی اور لفظ استعمال کرنا تھا ـــــ (صفحہ ۱۶۷) "امیر محمد نے ایک لاکھ دینار بھیج کر اپنے اس وزیر کو وہاں سے منگوایا" "چیزیں منگوائی" جاتی ہیں اور آدمی "بلائے" یا "بلوائے" جاتے ہیں، مصنف نے حیرت ہے کہ اس موٹے اور کھلے ہوئے فرق کو محسوس نہیں کیا ـــــ (صفحہ ۳۸۲) "جلے ہوئے شہر اور کھنڈرات سے ذوقِ شجاعت بڑھایا" اول تو کھنڈر کی جمع "کھنڈرات" ہی وجدان کی تشویش کے لئے کیا کم ہے اُس پر اِس جملہ کی ترکیب نے اور بے لطفی پیدا کر دی ـــــ (صفحہ ۴۲۰) "انھیں قومی ہمدردی سے کیا دلچسپی تھی" "ہمدردی سے دلچسپی کا ہونا" عجیب بات ہے ـــــ (صفحہ ۵۴۵) "اُنھوں نے بھی کثرتی بدن پایا تھا" "کثرتی" غلط املا ہے، "کسرتی" لکھنا چاہیئے تھا، ورزش (EXERCISE) کو "کثرت" نہیں "کسرت" کہتے ہیں ـــــ (صفحہ ۵۸۵) "یہ دولہے کے اونچے معیار کی دلیل تھی" "دولہے" غلط ہے "دولہا" لکھنا تھا ـــــ (صفحہ ۶۳۸) "اُس نے آدھا دریا اپنی طرف کر لیا تھا اور اندر ہی اندر آدھے سے زیادہ اُمرا ابوالحسن سے کاٹ لئے تھے" اس جملہ کا آخری حصہ روزمرہ کے خلاف ہے ایسے موقعوں پر "کاٹنا" نہیں "توڑنا" بولتے ہیں ـــــ (صفحہ ۳۰۵) "سارا یورپ جہالت اور بدتمیزی کے اندھیروں میں اُلجھا تھا" ـــــ "اندھیروں میں اُلجھنا" ہم نے آج تک نہیں سُنا ـــــ (صفحہ ۶۴۴) "خزانے دن پر دن خالی ہو رہے تھے" "خزانے روز بروز یا دن بدن[۹] خالی ہو رہے تھے" لکھنا تھا ـــــ (صفحہ ۴۸۸) "اور آٹھ ہزار عیسائی اس میدان میں کٹے، باقی بھاگ نکلے سپہ سالار بھی کٹا" یہ لفظ (کاٹنا) مصنف کی خاص پسند کا لفظ ہے، جسے بار بار استعمال فرمایا گیا ہے جہاں ذبح کرنے اور قتل ہونے کا محل ہے وہاں بھی یہی لفظ آیا ہے، بعض مقامات پر یہ لفظ ذوقِ سلیم پر بہت زیادہ گراں گزرتا ہے ـــــ اسی طرح "زلزلوں کو لہرا دینا" بھی بار بار استعمال کیا ہے یہ ترکیب ابھی تک اُردو دُنیا کے لئے نامانوس ہے۔

کوئی شک نہیں کہ اُندلس میں عبداللہ الزاغل جیسے دور اندیش، مدبر اور جرأت آزما فرمانروا اور حامد الزغری جیسے بہادر سپہ سالار بھی پیدا ہوئے جن کو تاریخ بھلا نہیں سکتی، مگر زوالِ اندلس کے ذمہ دار وہاں کے عیش پسند فرمانروا اور بے فکرے اُمرا ہیں، موسیٰ بن نصیر اور طارق جیسے اولوالعزم مسلمانوں کے لئے آنکھیں ترستی تھیں، وہاں کے درباروں میں مُطربوں، رقاصاؤں، سازندوں، داستان گویوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا، چنگ و عود کے نغموں اور شراب کے پیالوں کی کھنک پر روحیں جد کرتی تھیں، قصر الحمرا پر نقش کاریاں ہو رہی تھیں مگر سیرت و کردار کی عمارتیں ویرانوں میں تبدیل ہوئی چلی جا رہی تھیں، شمشیر و سناں رُخصت ہو چکے تھے طاؤس و رباب کا دور دورہ تھا، ایک وہ زمانہ تھا کہ عرب گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر بیٹھ کر اور جَو کے ستو پھانک کر کشور کشائی کرتے اور اب مسلمانوں کے جنگی میدان کے کروفر کا یہ عالم تھا:ـــ

"اندلس کی تاریخ میں پہلی بار امیر مراکش ابوالحسن اور امیر غرناطہ یوسف کے خیمے ایک ساتھ نصب ہوئے

ـــــ

۹۔ "دن بدن" کی ترکیب بھی غلط ہے مگر یہ روزمرہ میں داخل ہو چکی ہے۔

یہ خیمے دو بڑے بادشاہوں کے خیمے تھے اور اُن کی وہی شان تھی جو بادشاہوں کو زیب دیتی ہے، یہ دونوں خیمے نیلے اور قرمزی رنگ کے ریشم کے بنے ہوئے تھے جس کے حاشیوں پر سنہری بیل بوٹے کڑھے تھے، ان کے کلس خالص چاندی کے تھے ــــ" (صفحہ ۵۵۰)

اِسلامی تہذیب اور عربی تمدن کی سادگی جاتی رہی تھی، عجمی اور جاہلانہ رسم و رواج کی گرم بازاری تھی اندلس کے مسلمانوں کی زندگیوں میں جاہلیت سے قربت اور اسلام سے دُوری پیدا ہوگئی تھی ہر طرف مادیت ہی مادیت چھائی ہوئی تھی اُن کے نزدیک فخر کی چیزیں ریشمیں پردے، قیمتی قالین، باغیچے، فوارے، روشیں، شمع دان، آلاتِ طرب، شفاف ظروف اور حمام اور رصد گاہیں تھیں دین سے غفلت عام ہو چلی تھی، آخرت کا خوف دلوں سے نکل چکا تھا، اس چیز نے اُس جذبہ کو کمزور کردیا جس نے علیؓ ابن ابی طالب کو فاتح خیبر اور خالد بن ولید کو سیف اللہ بنایا تھا، دینی مرکزیت رخصت ہوئی تو بادشاہزادوں اور امیروں میں اختلافات پیدا ہوگئے، ہوا و ہوس نے طرح طرح کے فتنے کھڑے کردیئے یہاں تک کہ اندلس میں مسلمانوں کا ایسا زوال ہوا جس پر قرطبہ اور غرناطہ کے ویرانے آج تک آنسو بہاتے ہیں ؛

پاکستان کے اربابِ اقتدار اور عوام کے لئے اندلس کی تاریخ میں بے شمار بصیرتیں ہیں کاش! وہ اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ حقیقت اُن کے دل میں پیوست ہوجائے کہ مسلمانوں کا اقبال دینِ اسلام سے وابستہ ہے، اس وابستگی میں کمی نہ آنی چاہیئے کہ یہی مقصودِ حیات ہے! ؛

نیا انسان "نیا انسان" ترتیب دینے والے :- محمود رونق اور آمنہ زبیری، ضخامت ۱۱۱ صفحات قیمت ایک روپیہ (سکہ ہند) ملنے کا پتہ :- مکتبہ "نیا انسان" غریب خانہ گوشہ محل روڈ حیدرآباد دکن (ہندستان)

ایک چھوٹا سا کنکر بھی بیکار پیدا نہیں کیا گیا کوئی نہ کوئی مقصد اور افادیت اُس کے وجود سے ضرور وابستہ ہے جب کنکر اور پتھر کا یہ حال ہے تو "ادب" بے مقصد کس طرح ہوسکتا ہے ــــ آج دُنیا میں طرح طرح کے نظریے اور مقاصد پیش کئے جارہے ہیں، زاویوں اور نظریوں کا ایک ہنگامہ بپا ہے مرکزی فکر کے انتشار نے خیالات میں عجیب انتشار پیدا کردیا ہے، ان حالات میں کچھ اللہ کے بندے "اسلامی ادب" کا پرچم لے کر صحافت کے میدان میں نکلے ہیں، یہ وہ سعید روحیں اور خوش بخت نفوس ہیں جو انسانیت کو صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں ــــ

ــــ "نیا انسان" دو ماہی کتابی ایڈیشن کی شکل میں، انھی اسلام پسند ادیبوں نے پیش کیا ہے ؛

"نیا انسان" میں پانچ افسانے ہیں جو اسلامی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں، لکھنے والوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ افسانے لکھے ہیں، خاص طور سے جیلانی کا افسانہ "احوبہ" پڑھنے کے قابل ہے، تخیل جتنی بلند ہے، اتنا ہی اسلوبِ نگارش دلچسپ اور شگفتہ ہے، شعر و ادب کے میدان میں جس جس محاذ پر جاہلانہ ادب نے قبضہ جما رکھا ہے، مسلمان ادیبوں اور شاعروں کو اک اک محاذ پر جنگ کرنی پڑے گی اور انشاءاللہ وہ وقت آکر رہے گا کہ جاہلی ادب کے تمام مورچے ٹوٹ جائیں گے ؛

(صفحہ ۴۴)، "گاڑی کا سنگین دھواں" یہ "سنگین دھواں" کیا بات ہوئی؟ مہمل ترکیب!

(صفحہ ۴۸) "انسانی تخیل کی اس بہت پراسراریت کو انتہائی مصورانہ چابک دستی سے پتھر میں سمو دیا گیا ہے" پورا جملہ ہی کاواک قسم کا ہے مگر اس "پُراسراریت" نے تو اس "کریلے" کو "نیم چڑھا" بنا دیا ——— (صفحہ ۵۰) "محمود ایک خوابناک خاموشی اور کراہت آمیز اُلجھن کے ساتھ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتا چلا جا رہا تھا ... " "خوابناک" کی ترکیب جدان کو بہت زیادہ کھٹکتی ہے ——— (صفحہ ۵۱) "انسان کے مونہوں سے لقمے چھین کر ایک پتھر کے سامنے ڈھیر کر دیئے تھے ... ... " "منہ" کی جمع "مونہوں" ادبی بدمذاقی کا ثبوت ہے ——— (صفحہ ۵۲) "دھوئیں کا لہریلا گاڑھا پن بڑھ گیا" یہ کیا زبان اور کیا اندازِ نگارش ہے؟ توبہ! ———[9] (صفحہ ۵۷) "ایک وہ گدلا گدلا کتا جو ہمیشہ پھاٹک کے پاس اونگھتے اونگھتے خرخراتا رہا" پانی کو تو گدلا کہا جاتا ہے مگر کتے "کو گدلا" آج پہلی بار سننے میں آیا ——— (صفحہ ۷۰) "اخبار آنے پر اردگرد کا مجمع اور سکڑا، گردنیں ڈولتی ہوئی بطخوں کی طرح لہرائیں، آنکھوں میں پھائی ہوئی دیرانیاں ایک دم ناچ اٹھیں" ——— پڑھتے میں دم سا گھٹنے لگا، یہ تو زبان اور ادب کے ساتھ ایک طرح کا مذاق بلکہ ہم تو کہیں گے "ظلم" ہے ——— (صفحہ ۸۳) "جتنی دیر وہ اسٹیشن پر کھڑا اپنے علم زدہ شعور کے ساتھ تخیل کے میدان میں نضول سوچوں کے تانے بانے بنتا رہا تھا" ——— عجیب طرح کی انشا ہے، پھر "سوچ" کی جمع "سوچوں" اور زیادہ عجیب ہے! ——— (صفحہ ۹۱) "قصبہ کے پناہ گزینوں میں ہیضہ پھوٹ آیا تھا" ——— "پھوٹ پڑا تھا" لکھنا چاہیئے تھا ——— (صفحہ ۹۳) "ایکسا اور کرسی نے عقل بگھاری" "شیخی بگھارنا" تو بولتے ہیں مگر "عقل بگھارنا" آج زندگی میں پہلی بار سنا اور تکلیف ہوئی (صفحہ ۹۵) کوئی پیاز کی ایک گٹھلی کا خواہشمند تھا" ممکن ہے کہ افسانہ نگار نے ایسی عجیب غریب پیاز بھی دیکھی ہو جس میں گٹھلیاں نکلتی ہوں" ... !

اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں کی خدمت میں ہم اسلام کا واسطہ دے کر عرض کرتے ہیں کہ وہ خدا کے لئے نام نہاد "ترقی پسندوں" کی نقالی چھوڑ دیں یہ ایک غلط چیز کی نقل ہے جو "غلط در غلط" ہو جاتی ہے، اردو میں اسی الجھی ہوئی فکر، کاواک سلوبِ نگارش اور مضحکہ انگیز قسم کی جدّت کے سبب خود "ترقی پسند ادب" ناکام ہو چکا ہے۔ اس انداز اور پیرایہ میں ذرا سی بھی جان نہیں ہے، اسلامی ادب تو بہت سلجھا ہوا اور منجھا ہوا ہونا چاہیئے، یہ تو "ترقی پسندوں" ہی کو زیب دیتا ہے کہ جس لفظ کو جہاں چاہا لکھ مارا، اسلام پسند ادیبوں کے شعر و ادب اور تنقید و افسانہ میں الفاظ و تراکیب برمحل اور صحیح استعمال ہونے چاہئیں کہ اسلام نام ہی صحت و اصابت اور توازن و اعتدال کا ہے!

مکتبہ "نیا انسان" کے ناشرین کو چاہیئے کہ آئندہ افسانوں اور نظموں کے انتخاب میں ان باتوں کا خیال رکھیں، ان غلطیوں کے باوجود موجودہ صورت میں بھی منتخب افسانوں کا یہ دو ماہی کتابی ایڈیشن پڑھنے کی چیز ہے۔

---

[9] یہاں "میلا" "غبار آلود" یا اسی قسم کے کسی لفظ کا محل تھا۔

اَوراقِ نو ماہنامہ "اوراقِ نو" ادارہ :- ریاض قادر اور ناصر کاظمی، ضخامت ۹۰ صفحات، سرورق دبیز کاغذ کا، زرِ سالانہ آٹھ روپے، رجسٹری فیس تین روپے، قیمت فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "اوراقِ نو" ۳ ٹیمپل روڈ، لاہور !

جناب ریاض قادر اور ناصر کاظمی صاحب نے ماہنامہ "اوراقِ نو" کا بڑے اہتمام کے ساتھ آغاز کیا ہے، سرورق زیادہ خوشنما نہیں ہے مگر اس میں ندرت اور انوکھا پن ضرور پائی جاتی ہے، سفید کاغذ پر ٹائپ کی چھپائی بہت خوشنما لگتی ہے، تصویریں اور چہروں کے اسکیچ بھی ہیں، شعر و ادب، سائنس، آرٹ، معاشیات، صنعت و حرفت اور سیاسیات پر کافی دلچسپ مضامین سے یہ ماہنامہ مُزیّن ہے، اتنے اہتمام اور سلیقہ کے ساتھ اردو میں رسالے شاذ و نادر ہی نکلتے ہیں شروع میں سر شیخ عبدالقادر مرحوم کی تصویر ہے جس کے نیچے یہ عبارت درج ہے :-

"شیخ عبدالقادر مرحوم جنھوں نے "اوراقِ نو" کی بنیاد رکھی"

شیخ صاحب مرحوم کی تصویر کی پشت پر اختر شیرانی مرحوم کا عکسِ تحریر ہے جو انھوں نے اپنے وطن ٹونک سے ناصر کاظمی صاحب کو لکھا تھا، ہم نے پہلی بار اختر شیرانی کی تحریر دیکھی، اُن کا خط بہت پاکیزہ تھا!

اداریہ جناب ریاض قادر نے لکھا ہے جس میں کافی جان اور شدّتِ احساس پائی جاتی ہے، امریکہ اور انگلستان اور دوسری یورپین طاقتوں کی سامراجی ذہنیت پر "واقعات" اور تاریخی حقایق کی روشنی میں سخت تنقید کی ہے اور ہم فاضل مدیر سے متفق ہیں کہ مغربی طاقتیں ظلم و سازش کا بدترین نمونہ ہیں اور ان فرنگی شیشہ بازوں نے تمام دُنیا کو فتنہ و فساد میں اُلجھا رکھا ہے ——— اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے :-

"عوام اور خواص کا تفرقہ سوویٹ رُوس کے نظام میں ڈھل کر ماضی کی یادگاروں میں شامل ہو چکا ہے، چین میں انسانوں کی حکومت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔"

مگر ہم نیازمند بھی اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔

ہماری نگاہ میں انگلستان اور امریکہ پر جو فردِ جرم لگائی گئی ہے، وہی فردِ جرم سوویٹ رُوس پر بھی لگنی چاہیئے کہ وہ بھی سامراجی ذہنیت میں کسی سے پیچھے نہیں ہے، ترکی پر سوویٹ رُوس کی عرصہ سے للچائی ہوئی نگاہیں گڑ رہی ہیں، روسی حکومت بھی اپنے حدود و اقتدار کو وسیع کرنے کے لئے "زمین" چاہتی ہے اور وہ بھی دوسری سامراجی حکومتوں کی طرح "جوع الارض" کے مرض میں مبتلا ہے ——— سرمایہ و محنت کے جس فرق و امتیاز سے دنیا پریشان ہے وہ خود روس کی اشتراکی حکومت میں بھی پایا جاتا ہے ——— اور ہاں! مدیرِ اوراقِ نو نے یہ جو لکھا ہے کہ "فلسطین میں کس نے یورپ کے یہودیوں کو قابض ہونے میں مدد دی؟" تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہودیوں کی حکومت کو تسلیم کرنے میں سوویٹ روس سب سے پیش پیش رہا، اُس نے اس ظلم و ستم کے خلاف نہ صرف یہ کہ احتجاج ہی نہیں کیا بلکہ ظالموں کی ہم نوائی کی اور فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کے قتل نامہ پر اپنی رضامندی کی مُہر لگا دی ——— اشتراکی نظام کے قصیدہ خواں جب "پاکی داماں" کی حکایت کو بڑھانے لگتے ہیں تو ہماری نگاہ سوویٹ رُوس کے دامن اور بندِ قبا پر آپ ہی آپ پہنچ جاتی ہے۔

ہم صاف اور برملا کہتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے امریکہ، انگلستان اور سوویٹ رُوس کے نظامِ حکومت میں کوئی فرق نہیں ہے کہ یہ تمام حکومتیں اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے دستور سے بیگانہ ہیں!

سعادت حسن منٹو کا افسانہ ــــــ خالد میاں ــــــ دلچسپ ہے، زبان خاص طور سے سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے مگر اس افسانہ کی بنیاد اس تصور پر رکھی گئی ہے کہ خالد کا باپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں منتیں اور دُعائیں کرتا ہے مگر اُس کا بچہ پھر بھی مرجاتا ہے، یہ وہ افسانوی انداز ہے جو ٹیک ناک کے پُورے ساز و سامان کے ساتھ دلوں کو خدا اور مذہب کے بارے میں مشکوک اور مذبذب بناتا ہے ــــــ اس تصور کا جوڑ مُدیر کے اداریہ سے ملائیے جس میں مخلوقِ خدا اور خلقِ خدا کی معروف اصطلاح کو چھوڑ کر "مخلوق الارض" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

نثر کے مقابلہ میں نظم کا حصہ بہت زیادہ کمزور ہے ــــــ ریاض قادر کی پہلی رباعی کا پہلا شعر ہے:۔

یوں مجھ کو یہ دل دوز ترانے نہ سُنا
تانیں نئی بن راگ پُرانے نہ سُنا

نہ جانے یہ "بَن" ہے یا "بُن" ہے، اگر "بن" ہے تو بھی غلط ہے اور "بُن" ہے تو "تانیں بنا" اُردو میں تو بولتے نہیں ہیں!

میرا جی کی نظم کے چند شعر پڑھئے اور "اَوراقِ نو" ترتیب دینے والوں کے ذوق (؟) کی داد دیجئے:۔

گھٹا گرم جادو کسی رات کا مرے دل کی رگ رگ میں ساری ہوا
ترا پیرہن جسم سے ہٹ گیا تو رادھا ہنی میں پہاری بنا

جادو بھی کیا درختوں کی طرح "گھٹا" ہوا کرتا ہے؟ اور ساتھ ہی گرم بھی؟ آخر زبان و ادب کے ساتھ اس مذاق کو لوگ برداشت کس طرح کرتے ہیں کہ جو لفظ جہاں چاہا دھر گھسیٹا! آخر کے دو مصرعے کس قدر بے وزن، ہلکے اور غیر شاعرانہ ہیں! ــــــ ــــــ اور سُنیئے:۔

مگر رات کا خواب جب کھو گیا تو آئیں نظر میں کئی گوپیاں
ترا چاند نظروں سے اوجھل ہوا ستاروں کی دھارا تھی رسو دواں

اگر اسی "ابہام"، "رمزیت" اور "اشاریت" کا نام آرٹ ہے؟ تو اس آرٹ سے دُنیا بے آرٹ ہی بھلی! شاعر کو نہ اظہارِ خیال کا سلیقہ ہے، نہ لفظوں کے برتنے کے گُر سے وہ واقف ہے نہ اُس کو یہ خبر ہے کہ شاعری کی زبان کیا ہوتی ہے؟ بس ایک شخص ہے کہ جو دل میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے، اور حیرت اس پر ہے کہ اِن "حماقتوں" کے سراہنے والے بھی اس "ترقی یافتہ" دَور میں موجود ہیں ــــــ ہم نے سُنا ہے کہ ابھی "حضرت میرا جی صاحب" کی شاعری پر بعض اردو میں مقالے اور "Rhapsodies" بھی پڑھے جاتے ہیں! ہائے! جوہریوں کا وہ بازار جہاں ہیرے اور کنکر میں امتیاز ہی باقی نہ رہے۔

صفحہ (۲۷) پر جلی حروف میں "خواہش" لکھا ہے اور اُس کے نیچے چند بے ترتیب جملے درج ہیں، اور چونکہ حصۂ نظم میں اس کو شریک کیا گیا ہے تو اس کو "نظم" ہی سمجھا جائے گا، محمد صفدر صاحب اس کے مصنف ہیں، فرماتے ہیں اور نہ جانے کس مقام سے فرماتے ہیں:۔

دیوی! سنگیں دیواروں سے دور
وہاں جہاں سبزے کی نیلی موجوں میں
پھولوں کی شمعوں کے بوجھ سے چور

ہانپتے پیڑ کھڑے تھے —— ہر نوخیز کلی
ہر کونپل، ہر بوجھل شاخ کی رگ رگ میں
مست آسودہ خواہش خوں تھلکاتی تھی
جھیل کے عُریاں سینے کے آئینے میں
ابر کے ٹکڑے دوشیزہ یادوں کی طرح گزرتے تھے
دیوی! یادوں کے سوا اب کچھ بھی نہیں

سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر بیچارے پیڑ کیوں ہانپ رہے تھے؟ پھولوں کی شمعوں کا بوجھ کیا درختوں کو تھکا دیا کرتا ہے اور پیڑ اس طرح چور ہو کر ہانپنے لگتے ہیں؟ آخر یہ کس طرح کا شاہدہ ہے، کن جذبات کی ترجمانی ہے، کس دُنیا کی زبان ہے؟

"فوجی بینڈ" کا ایک بند ہے:—

دیکھتا ہے آج تجھ کو زندگی کا دیوتا
کچھ نہیں چڑھے گا اس پہ تیرے خون کے سوا
گرم خون، تیز خون
خون خون
خون
خون

اور لطف یہ ہے کہ "حلقۂ ارباب ذوق لاہور" میں اس "بکواس" کو ادیبوں نے سُنا اور پھر آپسے "اوراق نو" کے صفحات پر منتقل فرما دیا گیا کہ ان "شہ پاروں" سے اہل نظر کہیں محروم نہ رہ جائیں! اس قسم کی بے تکی باتوں سے اُردو زبان ذلیل اور رسوا ہوتی ہے۔

صفحہ (۶) پر "دشوار الحصول" کی نامانوس اور غلط ترکیب بھی نظر سے گزری —— منٹو کے افسانہ میں لفظ "CONVULSION" بار بار استعمال ہوا ہے، حالانکہ یہ انگریزی لفظ ٹرین، ہسٹیریا، اور ڈائننگ روم وغیرہ لفظوں کی طرح اُردو میں مستعمل نہیں ہے، اُردو لفظ "تشنج" استعمال کرنا چاہیے تھا، پھر "کنولشن" کو مؤنث کہا گیا ہے حالانکہ اسی قبیل کے انگریزی الفاظ "Concession" وغیرہ اُردو میں مذکر بولے جاتے ہیں —— ٹائپ کے حروف جوڑنے (Composition) میں بعض جگہ فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں مثلاً صفحہ (۱۴) کی آخری سطر میں "مقلد" —— "ملقد" چھپا ہے۔

بہر حال "اوراقِ نو" کا تنوع اُسے مقبول بنائے گا —— یہ ہمارا خیال ہے، پیش گوئی نہیں ہے، اس مجلّہ میں "کائنات" پر بہت کچھ ہے مگر "خالقِ کائنات" پر کچھ نہیں ہے۔ لیکن "خالقِ کائنات" پر ہوتا بھی کیوں؟ ہر ادیب اور شاعر کا دل تو اقبالؔ کی طرح نہیں ہوتا، جو پکارتا ہے:—

ہ اس "ایجاد بندہ" کی داد دیجئے!

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لَا اِلٰہ اِلّا اللہ "

اُصولِ دعوتِ اسلام

"اصول دعوتِ اسلام" از :- مولانا محمد طیب قاسمی، ضخامت ۹۶ صفحات، مجلد قیمت ایک روپیہ دو آنہ علاوہ محصول ڈاک، ملنے کا پتہ :- ادارہ "دعوت الحق" غریب خانہ گوشہ محل روڈ، حیدر آباد دکن۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم دار العلوم دیوبند) کی ذات علم و فضل اور سیرت و کردار کے اعتبار سے اُن علماً کا نمونہ ہے جن کو بجا طور پر "وارثِ انبیا" کہا جا سکتا ہے، خاص طور سے فنِ تقریر میں وہ آپ اپنی مثال ہیں، قاری صاحب شگفتہ بیان اور شیریں مقال ہیں، تقریر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علوم و معارف کا دریا موجیں مار رہا ہے۔

مولانا قاری محمد طیب صاحب نے کتاب و سنت کی روشنی میں اسلام کے دعوتی نظام کی وضاحت فرمائی ہے، اس موضوع پر اتنی جامع اور سیر حاصل کتاب کم از کم اُردو زبان میں تو دیکھنے میں نہیں آئی، دعوت و تبلیغ کی اہمیت اُس کی ضرورت، اُس کے آداب، مقامات، پیش کرنے کے طریقے ــــــ غرض اس سلسلہ میں تمام ضروری عنوانات پر فاضل مُصنّف نے عالمانہ مگر انتہائی دل نشین انداز میں گفتگو کی ہے، آج کل کی مروجہ اصطلاحوں کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصنف نے "علم النفس" کے نازک حقائق بیان کئے ہیں۔

واعظوں اور مقرروں کی تقریریں اسی لئے بے اثر رہتی ہیں کہ دعوت و تبلیغ کے صحیح مفہوم ہی سے وہ بے خبر ہیں، ہمارے یہاں مقرروں میں داعی اور مُبلّغ بہت کم ہیں ایکٹر اور داستان گو زیادہ ہیں جن کی تقریروں میں ضرورت سے زیادہ تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے ــــــ اس سلسلہ میں لائق مصنف نے کتنی اچھی بات کہی ہے :-

"بدعت تو بنانی پڑتی ہے جس کا حاصل تصنع ہے اور سُنت بنی بنائی چیز ہے جس کا صرف نقل کر دینا کافی ہے۔"

مُبلغ کی سیرت و کردار کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"مبلغ کے لئے جیسے علم و بصیرت، فہم و فراست اور دانش و خلق ضروری ہے، ایسے ہی عمل صالح اور تقویٰ و طہارت کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے بغیر تبلیغ کا کوئی اثر نمایاں نہیں ہو سکتا۔ ... ... نیک عمل مُبلغ حقیقتاً خدا کی حُجت اور اس کی آیات میں ایک آیت ہوتا ہے جسے دیکھ کر خود بخود ہزاروں دلائل سامنے آجاتے ہیں۔ ... "

"اُصولِ دعوتِ اسلام" دینی لٹریچر کی ایک مفید کتاب ہے، جو خاص و عام سبھی کے پڑھنے کی چیز ہے!

ادارہ "دعوۃ الحق" کی اس کوشش پر ہم اُسے مبارکباد دیتے ہیں ؛

اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں

"اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں" مترجم :- ضیاء الدین احمد برنی، ضخامت ۳۲ صفحات، قیمت چار آنہ، ملنے کا پتہ :- تعلیمی مرکز ۱-۵ گیند مل ٹیکراج روڈ، کراچی ؛

ڈاکٹر مسز اینی بسنٹ نے ہندستان میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کی بنا ڈالی تھی، "ہوم رول" کی مشہور سیاسی تحریک جس کے بارے میں چکبست لکھنوی نے کہا تھا :-

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے　　نہ لیں بہشت بھی ہم "ہوم رول" کے بدلے

اس کی رُوحِ رواں اور امیرِ کارواں بھی یہی مسز اینی بسنٹ تھیں۔

مسز اینی بسنٹ نے اپنی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۲ء میں ایک لیکچر دیا تھا جس کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ جناب ضیاء الدین احمد برنی (بی۔اے) نے پیش فرمایا ہے، اس کتاب میں مسز اینی بسنٹ نے اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے حضور خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، تحریر میں خلوص اور سادگی پائی جاتی ہے ——— مترجم نے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی ہے، اختلافی نوٹ بھی دیدیئے ہیں،

مسز اینی بسنٹ گاندھی جی اور مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اگرچہ مسلمان نہ تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اُن کو عقیدت تھی اور حضورؐ کے ذکر میں وہ مسرت و تسکین محسوس کرتے تھے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ آخرت میں اُن کے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے گا، بہر حال جس دل میں رسول اللہ کا احترام پایا جاتا ہے ہم اُن جذبات کی عزت کرتے ہیں ——— اور

؎ آخرت کی خبر خدا جانے۔

اُردو ادب کے معمار

"اُردو ادب کے معمار" ——— ضخامت ۱۵۲ صفحات، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر، خیرت آباد، حیدرآباد دکن!

"سب رس کتاب گھر" کے ناشرین اور منتظمین نے اُردو زبان کے مختلف تذکروں سے مضامین مقتبس کر کے، یہ مجموعہ کتابی شکل میں پیش فرمایا ہے جو اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے یقیناً ایک مفید پیشکش ہے، اُردو ادب کے اُن معماروں میں شبلی، حالی، اقبال اور پریم چند کی معروف ہستیوں کے ساتھ وجہی، غواصی، نصرتی اور ابنِ نشاطی کی شخصیتیں بھی شامل ہیں جن کو عوام تو بہت ہی کم جانتے ہیں اور خواص بھی اُن کے حالات سے برائے نام واقف ہیں؛

مرزا محمد رفیع سودا کا سن پیدائش ۱۱۲۵ھ ہے جو کتابت کی غلطی کے سبب ۱۲۲۵ھ ہو گیا ہے ——— اکبر الہ آبادی پر مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون خوب ہے، مگر اکبر الہ آبادی کو جو مولانا موصوف نے "میر صاحب" بار بار کہا ہے، اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ میر تقی میر کا ذکر ہو رہا ہے، اکبر الہ آبادی "میر صاحب" کے لقب سے مشہور نہیں ہیں ——— پریم چند پر مولانا عبد الماجد دریابادی کا مضمون اس کتاب کی جان ہے، اس مضمون میں ایک لفظ کھٹکتا ہے ——— "اب تک پریم چند کے جوڑ پر کوئی نظر نہیں پڑا"، شاید اس طرح بولتے ہیں "اب تک پریم چند کی جوڑ کا کوئی نظر نہیں پڑا" ——— صفحہ (۱۲۲) پر "چپکا" (بمعنی خاموش) کا املا "چپ کا" ایک تکلف آمیز بدعت سے کم نہیں ——— اور تخیل (ORIGINAL) کا ترجمہ "اپج" بھی محلِ نظر ہے ——— لالہ سری رام اور عظمت اللہ خاں اُردو زبان کے خدمت گزار تو ضرور تھے مگر معمار نہ تھے، میر امن، میر حسن، پریم چند، چکبست اور حالی و اقبال کی صف میں کھڑے ہو کر یہ بیچارے خود شرمائے سے جاتے ہیں۔

لالہ سری رام (صاحب "خمخانۂ جاوید") پر مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کا جو مضمون ہے اُس کے یہ جملے کتنے اثر انگیز ہیں۔

"میں حیدرآباد میں کسی سے ملنے تھوڑا آیا ہوں، مجھے تو داغ اور امیر مینائی کی قبروں پر پھول چڑھانے تھے جو یہاں آگیا ورنہ مجھے حیدرآباد سے کیا غرض" ——— اور اب بھارت میں اردو زبان ہی کو دفن کرنے کے سامان کئے جا رہے ہیں (انقلابات ہیں زمانے کے)

کیوپڈ و سائکی

"کیوپڈ و سائکی" مترجم:- ضیاء الدین احمد برنی ایم۔اے، ضخامت ۷۵ صفحات رنگین تصاویر کے ساتھ، مجلد (معہ گرد پوش) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ:- تعلیمی مرکز گیٹ ...ل لیکھراج روڈ، کراچی!

فرہاد و شیریں، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا اور نل و دمینتی کی طرح یورپ میں "کیوپڈ اور سائکی" کی کہانی بہت مشہور ہے، انگریزی میں ولیم وِ لنگٹن نے اس کہانی کو لاطینی زبان سے منتقل کیا اور سنہ ۱۵۶۶ء میں انگریزی ترجمہ سب سے پہلے شایع ہوا، اس کے بعد میسرز چیٹو اینڈ ونڈس نے سنہ ۱۹۱۴ء میں اس کہانی کو تصویروں کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ــــ اور اب ضیاء الدین احمد صاحب برنی نے اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

"کیوپڈ اور سائکی" حسن و محبت کی داستان ہے، جسے پُر لطف ہونا ہی چاہئے، اس کہانی میں یونان و روما کے علم الاساطیر و الاصنام (Mythology) کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، وینس، جوپیٹر اور شباب و موسیقی کے دیوتا اپالو کا تذکرہ ملتا ہے، طلسم و شعبدہ گری کی باتیں ہیں، عشق و رقابت کا بیان ہے ــــ یہ وہ ادب ہے جو تھوڑی دیر کے لئے آدمی کو چٹخاروں کے "پھول باغ" میں پہنچا دیتا ہے، ترجمہ بہت خوب ہے ــــ (صفحہ ۵۷) "دیوتا اپالو نے پسندیدہ طریقہ سے ستار بجائی" "ستار" بالاتفاق مذکر ہے! اور واؤ عطف کے ساتھ "پیار و محبت" بھی کھٹکتا ہے!

ماہنامہ "مشیر"

"ماہنامہ "مشیر" مرتبہ :- عبد الغفور بیگ حجم ۶۴ صفحات کتابت، طباعت دیدہ زیب خوبصورت سرورق، سالانہ چندہ دو روپے، فی پرچہ چار آنہ، ملنے کا پتہ :- دفتر ماہنامہ "مشیر" بندر روڈ کراچی!

ماہنامہ "مشیر" جب شروع شروع میں نکلنا شروع ہوا تھا تو ہم سمجھے تھے کہ یہ رسالہ دواؤں کے اشتہاروں کے لئے منظر عام پر آیا ہے مگر ہمارا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا اور خدا کرے کہ قوم و افراد کے بارے میں ایسے تمام اندیشے غلط ہی ثابت ہوتے رہیں۔

"مشیر" بڑی حد تک پاکیزہ ادب کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے مشوروں اور تجویزوں میں اسلامی تصورات کی جھلک ہوتی ہے، "مشیر" اپنے نام کی مناسبت سے ملک و ملت کا درد مند اور مخلص مشیر ہے، ادبی معیار بھی بلند ہوتا جا رہا ہے اور اس کا میلان اور رجحان "صالحیت" کی طرف ہے۔

ماہنامہ "مشیر" کی ترقی، مقبولیت اور کثرتِ اشاعت کی خبروں سے ہمیں خوشی ہوتی ہے اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ماہنامہ "مشیر" حق و صداقت کے اظہار میں ایک دن "ترجمان القرآن" اور "چراغِ راہ" کی سطح پر آ جائے۔!

"فاران" کے ایجنٹ صاحبان

جو بھارت میں ہیں، اُن کی دیانت و خوش معاملگی سے ہم اپیل کرتے ہیں کہ "فاران" کی بقایا رقم دفتر "الحسنات" رام پور کو جلد سے جلد بھیج دیں!

"منیجر"

Reg : No. S. 1262

فاران

ماہر القادری

جلد ۳ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شمارہ ۳

ماہنامہ

فاران

جون ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقامِ اشاعت

دفتر:۔ فاران کیمبل اسٹریٹ

کراچی ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

حکومتِ پاکستان کے دارالخلافہ ـــــــ کراچی میں "موتمر عالم اسلامی" کی عظیم الشان کانفرنس جس اہتمام اور طمطراق کے ساتھ منعقد ہوئی، اُس کی یاد بہت دنوں تک دلوں سے محو نہ ہو سکے گی، وہ شاندار عریض و طویل پنڈال، وہ حدِ نگاہ تک صوفوں کرسیوں اور بنچوں کی قطاریں، وہ خوشنما جھنڈیاں اور رنگ برنگ کے پھریرے، وہ برقی قمقموں کی جگمگاہٹ کہ جیسے آسمان سے زمین پر سچ مچ تارے اُتر آئے ہیں، وہ شاندار اسٹیج اور اس پر دَل بادَل شامیانہ کی انجمن آرائی، وہ حاضرین کی کثرت کہ جہاں تک نگاہ جاتی تھی سر ہی سر نظر آتے تھے۔

اسلامی اخوت کا یہ منظر شاید صدیوں کے بعد دیکھنے میں آیا کہ ٹیونس اور

الجیریا سے لیکر مارشیس اور انڈونیشیا تک کے مسلمان زعماء ایک اسٹیج پر جمع تھے، کوٹ پتلون بھی تھے، عبائیں اور قبائیں بھی تھیں، نیچے کرتے بھی تھے اور اونچی کُبش شرٹیں بھی! ـــــ اور مندیل، طربوش، سدا آرہ؎، جناح کیپ، عقال اور عمامہ نے منظر کو کافی متنوع بنا دیا تھا، اس اجتماع میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم شخصیت حضرت سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین کی تھی جن کی نورانی صورت کو دیکھ کر دل کہتا تھا کہ بس درود شریف ہی پڑھتے رہیے!

سبھی کی تقریریں پُرجوش اور اثر انگیز تھیں مگر مصر و شام کے خطیبوں نے تو دِل ہلا ہلا دئے، وہ اُن کے پُرشور جذبات، وہ قیامت آفریں لہجہ، وہ دل نشین اندازِ بیان اور سب سے بڑھ کر اسلامی جوش! "اللہ اکبر" کے نعروں سے زمین کی فضا گونج رہی تھی اور کیا عجب ہے کہ آسمان کے فرشتے بھی جھوم رہے ہوں؛

دُنیا کے تمام گوشوں سے اسلامی اخوت سمٹ سمٹا کر ایک مرکز پر آگئی تھی، ہر کسی کا ایک ہی عالم تھا، سب کے سب ایک ہی نشہ میں سرشار تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کانفرنس عرفات کے میدان میں ہو رہی ہے، وحدت و اخوت کے اس منظر کو دیکھ کر خوشی کے مارے عوام مسلمانوں کے سینوں میں دل بلیوں اُچھل رہے تھے، نگاہوں میں اُمید کی چمک پائی جاتی تھی اور کسی کسی کی آنکھوں میں شکر کے آنسو بھی آگئے تھے۔

تقریروں کا سب سے زیادہ تابناک پہلو یہ تھا کہ وطنیت اور قومیت کی خوب کھل کر نفی کی گئی اور مسلم زعماء کی تقریروں نے "پاکستان پاکستانیوں کے لئے" "الحجاز للحجازیین" اور "المصر للمصریین" کے جاہلانہ نظریہ کے بتوں پر کاری ضربیں لگائیں، اس کانفرنس نے دُنیا پر اس حقیقت کو ایک بار پھر واضح کر دیا کہ تمام دُنیا کے مسلمان رنگ و نسل اور زبان و جغرافیہ کے اختلاف کے باوجود ایک ہی کشتی کے سوار، ایک ہی درخت کی شاخیں، ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی ملت کے افراد ہیں، وہ سچ مچ ایک دیوار کی طرح ہیں جس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے؛

منافقوں کا ہم ذکر نہیں کرتے کہ مسلمانوں کے اتحاد کو دیکھ کر وہ سدا پیچ و تاب کھاتے رہے ہیں! مگر اہلِ ایمان کے لئے فرزندانِ اسلام کا یہ اتحاد اُن کے دل کی عین تمنا ہے، دنیا کے جس گوشہ سے بھی اتحاد و اخوت کی صدا بلند ہوتی ہے، مسلمانوں کے دلوں کی

؎ عراقی ٹوپی

دھڑکنیں اُس پر "لبیک" کہتی ہیں ـــــــ جہاں تک "موتمر عالم اسلامی" کی اس عظیم الشان کانفرنس کے اس مقصد کا تعلق ہے اُس کی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ ثابت اور مسلم! اس کانفرنس کا ایک ایک ریزولیوشن ہر مسلمان کے دل کی آواز! ہم خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ جن کی زبانوں میں اظہارِ حق کی طاقت ہے اُن کے بازوؤں میں بھی اتنی قوت آجائے کہ وہ قول کو عمل بنا سکیں۔

دُوسرا رُخ ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ تصویر کا ایک رُخ ہے اور ہم اُسی رُخ کو دکھا کر بات ختم کر دیں تو یہ حقیقت کی یک رُخی اور ناتمام ترجمانی ہوگی ـــــــ

دوسرا رُخ یہ ہے کہ "اتحاد و وحدت" یک جہتی اور اخوت کے ساتھ مسلمانوں میں "اسلامی انقلاب" کی شدید ضرورت ہے، اگر مسلمانوں کی سیرتوں اور زندگیوں میں اسلامی انداز پر تبدیلی نہ ہوئی تو موجودہ مسلمانوں کا اتحاد زیادہ مفید ثابت نہ ہوگا ـــــــ وہ اینٹیں جن میں صلابت اور سختی نہ ہو اور جو اُن اجزاء سے مرکب نہ ہوں جو اینٹ کی خصوصیات ہیں، ان اینٹوں کی دیوار بن بھی گئی تو وہ طوفانِ باد و باراں اور حوادثِ روزگار کے سامنے کتنے دن تک ٹھہر سکے گی؟

آج کے مسلمانوں میں اُس دینی روح کی کمی پائی جاتی ہے جس نے اُن کو "رات کا راہب" اور "دن کا شہسوار" بنا دیا تھا، عالم یہ ہے کہ جن میں "رات کے راہب" بننے کی تڑپ اور لگن ہے وہ "دن کا شہسوار" بننا نہیں چاہتے اور صرف "تسبیح و اعتکاف" پر ہی قناعت کئے ہوئے ہیں، اور جو "دن کے شہسوار" ہیں، وہ "رات کے راہب" بننے کی بجائے "رات کے جمشید" بننا چاہتے ہیں ـــــــ یہ تو خواص کا عالم ہے اور عوام نہ "رات کے راہب" ہیں اور نہ "دن کے شہسوار" ہیں، ہماری اکثریت نے اپنی خواہشوں کو اپنا "رب" بنا لیا ہے، آخرت کا تصور اتنا مدھم پڑ گیا ہے کہ بھولے سے اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ ہمیں ایک دن اللہ تعالےٰ کے روبرو حاضر ہونا بھی ہے! غفلت تن آسانی دین سے بے رغبتی، نام و نمود کی خواہش، جاہ طلبی اور نفس پرستی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے اسی لئے ہمارے معاشرے پر "جاہلیت" غالب آگئی ہے ـــــــ اور ہماری "اسلامی حکومتیں"؟ اُن کا حال نہ پوچھئے اور پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ ہر بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے! جہاں "ملوکیت" ہے، وہاں "ملوکیت" کی تمام لعنتیں موجود ہیں یہاں تک کہ حجاز کی مقدس سرزمین جہاں سے کبھی خیر و ہدایت کا چشمہ اُبلا تھا، وہاں بھی لمبی ڈاڑھیوں اور نیچی عباؤں کے ہجوم میں جاہلیت کو فروغ ہو رہا ہے ـــــــ اور جن خطوں میں مسلمانوں کی "جمہوری حکومتیں" ہیں وہاں زبانوں اور کاغذوں پر تو "اسلام" ضرور پایا جاتا ہے مگر عملی دُنیا میں اسلام کا وجود نہیں ملتا۔

طہران اور قاہرہ نے تفریح اور مغرب زدگی میں لندن اور پیرس کو بھی شاید کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے، ایران اور مصر کے مسلمانوں سے ہم فکر و نظر کا اسلامی اتحاد تو ضرور چاہتے ہیں مگر اُن کے موجودہ "تمدن" سے میل جول پسند نہیں کرتے کہ ہم میں اسلامی تمدن کے تھوڑے بہت آثار جو باقی رہ گئے ہیں کہیں وہ بھی نہ جاتے رہیں ؛

"اتحاد و اخوت" کی افادیت کے ہم منکر نہیں ہیں مگر جب تک خود مسلمانوں کی زندگیوں میں اسلامی انقلاب پیدا نہ ہو اور مسلمانوں کی حکومتیں جاہلانہ اثرات اور غیر اسلامی تصورات سے پاک نہ ہوں اُس وقت تک یہ اتحاد ایک کمزور قسم کا اتحاد ہوگا ——— اور دُنیا ہماری اس کمزوری سے واقف ہے، وہ جانتی ہے کہ اسلام کے یہ ڈھنڈورچی بس گفتار کے غازی ہیں، کردار کے غازی نہیں ہیں، یہی سبب ہے کہ "موتمر عالم اسلامی" کی اس عظیم الشان کانفرنس نے فلسطین کی حمایت میں جو قرارداد منظور کی تھی اُس کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی کہ یہودیوں نے شام کی سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، اور دنیا یہ بھی جانتی ہے کہ وہ حکومتِ پاکستان جو اپنے پڑوسی ہندوستانی مسلمانوں کو جبر و استبداد کے پنجہ سے نہیں چھڑا سکتی اور ان مظلوموں کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کر سکتی وہ ہزاروں میل کی دوری پر بسنے والے فلسطینی مسلمانوں کے کیا کام آسکتی ہے؟ ہاں! زبانی ہمدردی اور کاغذی احتجاج ہر وقت ممکن ہے اور یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر جس احتجاج کی پُشت پر کوئی موثر طاقت نہ ہو اُس احتجاج کو فلمی گانوں کے ریکارڈوں کی برابر بھی کوئی وقعت نہیں دیتا ؛

"موتمر عالم اسلامی" کی معرکہ آرا کانفرنس میں عرب زعماء نے کشمیر کے بارے میں جن پُرجوش عزایم کا اظہار فرمایا اُس کے لئے ہم پاکستانی اُن کے شکر گزار ہیں، مگر سیاست و عمل، فعل و حرکت اور واقعات کی دنیا میں لفظوں کو نہیں "عمل" کو دیکھا جاتا ہے، کون نہیں جانتا کہ عربوں کی غفلت، بے حسی اور جذبۂ ایمانی کی کمی کے سبب ارضِ قدس میں خدا کے مغضوب یہودیوں کی حکومت وجود میں آ گئی، تو جو عرب فلسطین مقدس کو پارہ پارہ ہونے سے نہ بچا سکے اور اسرائیلی حکومت جن کی غیرت اور شجاعت کو چیلنج دے رہی ہے اُن سے جہادِ کشمیر میں ہم آخر کیا توقع رکھیں؟

اس نوبت پر کہا جا سکتا ہے کہ تم ایسی کمزوری کی باتیں کر کے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کر دینا چاہتے ہو، تمھاری تحریر میں "رجائیت" کم اور "یاسیت" زیادہ ہے! خدا جانتا ہے کہ حق و صداقت کی کامیابی اور اسلام کے غلبہ کے بارے میں ہم سے زیادہ "رجائی" شاید ہی کوئی ہوگا، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کا دین ایک دن غالب ہو کر رہے گا اور فتح و نصرت تو حق کے لئے مقدر کر دی گئی ہیں مگر ان توقعات اور اُمیدوں کے

باوجود ہم سادہ لوحوں کی خیالی جنت میں رہنا نہیں چاہتے، واقعات، حالات اور حقایق کو ہم اُسی طرح دیکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح کہ وہ واقع ہوئے ہیں، پُر اُمید اور رجائی (optimist) ہونے کے یہ معنیٰ تو نہیں ہیں کہ پانی کے بلبلوں کو اُبھرتا ہوا دیکھ کر ہم یہ سمجھ لیں کہ یہ پہاڑ کی چٹانیں ہیں، اس قسم کی غلط توقعات اور موہوم اُمیدیں خود اُمیدوں کی دشمن اور توقعات کی غارت گر ثابت ہوتی ہیں۔

"موتمرعالم اسلامی" کے پروگرام کی اساس "اتحادِ عالم" کے ساتھ ساتھ "انقلابِ اسلامی" بھی ہونا چاہیے، مسلمانوں کے دینی جذبہ کو بیدار کیا جائے، اُن کی جاہلانہ اور نیم اسلامی معاشرت کو خالص اسلامی معاشرت بنایا جائے، زمین کے جن خطوں پر مسلمانوں کی حکومت ہے وہاں کا نظام کتاب وسنت کی بنیاد پر قایم کیا جائے، حکومت کی باگ ڈور صالح مسلمانوں کے ہاتھوں میں دی جائے ——— اُن مسلمانوں کے ہاتھوں میں جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو، جو آخرت کے محاسبہ سے ڈرتے ہوں، جن کی جلوت و خلوت پر اسلامی رنگ غالب ہو اور جن کی زندگیوں میں اسلام رچا ہوا ہو، ہم کھل کر کہتے ہیں کہ "کمال اتاترک" ٹائپ کے لیڈر نہیں چاہئیں، ہم ایسے قائدین کو چاہتے ہیں اور ہم کیا چاہتے ہیں خود اسلام اُن قائدین کو چاہتا ہے جن کی زندگیوں میں صدیق و فاروق اور حیدر و خالد (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین) کی سیرتیں جھلکتی ہوں۔

اِسلامی سیرت پیدا ہو گی تو "اتحاد بین المسلمین" کا جذبہ خود بخود اُبھرے گا اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کی کڑیاں آپ ہی ملتی چلی جائیں گی اُس وقت دردمندی اور اسلامی اخوت کا یہ عالم ہو گا کہ مشرق کے مسلمان کو پریشان دیکھ کر، مغرب کے مُسلمان اُس کی امداد کے لئے بے تابانہ دوڑ پڑیں گے، اظہار ہمدردی صرف "ریزولیوشنوں" تک محدود نہ ہو گا ——— اور اگر اسلامی سیرت کی کمی یا فقدان ہوا تو پھر غیر اسلامی سیرت رکھنے والے مسلمانوں اور جاہلانہ نظام پر چلنے والی مسلمان حکومتوں کا "اتحاد" موجِ سراب ثابت ہو گا، مسلمانوں کو مضبوط اور طاقتور بنانے والی چیز صرف "اسلام" ہے، جب زندگیاں "عملاً" اسلام کی نفی کر رہی ہوں تو اسلام کے نام پر سیاسی "اتحاد" کا انجام معلوم!

اسلام سے اپنے تعلق کو مضبوط کیجئے، اتحاد کا رشتہ خود بخود مضبوط ہو جائے گا، اسلامی کردار رکھنے والے مسلمانوں کا اتحاد ہی وہ اتحاد ہے جس میں زندگی ہے، جان ہے اور باقی رہنے اور غلبہ پانے کی صلاحیت اور طاقت ہے، جس دن یہ ہو جائے گا اُس دن مسلمانوں کی اقبال مندی کی وہ صبح طلوع ہو گی جسے کوئی انقلاب شام کے دھندلکے سے نہ بدل سکے گا۔

"موتمر عالم اسلامی" ہو یا کوئی دوسری جماعت ہو اُس کی کوششوں کا رُخ، دینِ حق کے قیام کی جانب ہونا چاہیئے کہ اسی میں اتحاد واخوت کی سعادتیں بھی موجود ہیں، غیر اسلامی

روایات کے سانچے ٹوٹ جانے چاہئیں تاکہ اسلام اپنی سادہ و حقیقی صورت میں دُنیا کے سامنے آجائے، نیکو کاروں اور صالحین کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت ہو اور "معروف" کے قیام اور "منکر" کے مٹانے کے لئے طاقت کام میں لائی جائے —— یہی اسلام کا مطالبہ اور دین کا تقاضا ہے، اسی میں اللہ اور رسولؐ کی خوشنودی اور رضامندی کا راز پنہاں ہے، اسی فریضہ کی تبلیغ کے لئے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا گیا، اہلِ ایمان پر انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے، کاش! اس کی اہمیت کو محسوس کیا جائے ؛

قرآنِ پاک میں اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے —— "واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً" (سب مل جُل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو) اس میں اتحاد و اخوت کی سب سے بڑی دعوت ہے، مگر سوچنا یہ ہے کہ یہ اتحاد کس لئے ہے؟ کیا یہ آج کل کی معروف اصطلاح کے مطابق کوئی سیاسی یا معاشی اتحاد ہے؟ کیا یہ وطنی اور قومی اجتماعیت کی دعوت ہے؟ یہ تو "حبل اللہ" کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا اتحاد ہے اور "حبل اللہ" کتاب و سنت اور دین اسلام ہی کو کہتے ہیں، پس اگر مسلمان ایک مرکز پر جمع تو ہو جائیں۔ مگر "حبل اللہ" اُن کے ہاتھوں میں نہ ہو تو اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ اتحاد کوئی وزن نہیں رکھتا —— اور یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ "حبل اللہ" کوئی رسّی یا زنجیر نہیں ہے جو آسمان سے زمین کی طرف لٹکا دی گئی ہے، یہ تو اسلام ہی کا دوسرا نام ہے، اور اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کے یہ معنیٰ ہیں کہ دینِ اسلام پر آدمی پُورے ثبات کے ساتھ قایم ہو، اس کی زندگی پُوری کی پُوری اسلامی ہو، یہ نہ ہو کہ کچھ زندگی تو اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر بسر ہو رہی ہو اور کچھ زندگی پر جاہلانہ اور کافرانہ تصورات سایہ فگن ہوں، اس ادھوری زندگی کو اسلام —— "نفاق" سے تعبیر کرتا ہے!

اسلامی اتحاد کا مقصد اور اُس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو دینِ حق کے قیام کے لئے ایک مرکز پر جمع کیا جائے، سب کا مرنا جینا صرف اللہ کے لئے ہو اور کفر و جاہلیت کے ایک ایک نشان کو مٹا دیا جائے، یہی ہونا چاہیئے اور اگر یہ نہیں ہو رہا ہے تو پھر ایک کروڑ مسلمانوں کی کانفرنس بھی کوئی مفید اثر مترتب نہیں کر سکتی ؛

یہ ایک کھلی ہوئی چیز اور واضح حقیقت ہے کہ مسلمان حکومتوں میں اسلامی نظام نافذ نہیں ہے، کہیں کہیں اس کی دُھندلی پرچھائیاں البتہ نظر آتی ہیں، خود حکومتِ حجاز کی ابتری کا جو عالم ہے، اُس کا حال ہم سُنتے ہیں تو سب سے زیادہ دُکھ ہوتا ہے اس لئے کہ حجاز کی امارت پر ہم "عمر ابن عبد العزیز" کو دیکھنا چاہتے تھے مگر یہ کم بخت آنکھیں کچھ اور دیکھ رہی ہیں —— شہنشاہِ ایران، شاہِ مصر اور سلطان نجد و حجاز کے شبستانِ عیش و عشرت کی طرف اُنگلی اُٹھانے کی کسی میں ہمت نہیں، مصر میں ایک مردِ مجاہد

——— حسن البنا پیدا ہوا تھا سو اُسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، پاکستان میں بھی عام طور پر مصلحتوں نے زبانوں پر مُہریں لگا دی ہیں، جن حق شناسوں کو اظہارِ حق کی توفیق نصیب ہے وہ "عتابِ شاہانہ" کی زد میں ہیں ——— جہاں تک ہمارے علم و اطلاع کا تعلق ہے "موتمر عالم اسلامی" نے مسلمان حکومتوں میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے کوئی پروگرام متعین نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو اس منزل میں ابھی تک ایک قدم بھی نہیں اٹھایا گیا ؛

حیدرآباد دکن میں ہماری تباہی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے ذاتِ شاہانہ کو حاکمیت اور اقتدار کا مرکز تسلیم کر لیا تھا، خدا نہ کرے کہ اس منحوس تصور کی پرچھائیں اُن ممالک پر بھی پڑے جہاں مسلمان بادشاہ برسرِ اقتدار ہیں، یہ جو پاکستان سے حکومتِ افغانستان بلا وجہ اُلجھ رہی ہے، اس میں بھی ملوکانہ اقتدار اور شاہانہ حاکمیت کی بدبختیاں اور نادانیاں شامل ہیں، شرقِ آردن میں "ہز مجسٹی" عبد اللہ کی ہوسِ اقتدار نے عرب ممالک کے مسائل کو عجیب طرح سے اُلجھا دیا ہے ؛

"موتمر عالمِ اسلامی" جو "اتحاد بین المسلمین" کے نام پر وجود میں آئی ہے اور جس کے سرپرستوں میں مفتیٔ اعظم فلسطین کی محبوب شخصیت بھی ہم کو نظر آتی ہے، اُس سے ہم خیر و فلاح کی اُمید رکھتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اُس کے ہر کارکن میں مفتیٔ اعظم جیسا اخلاص پیدا ہو جائے، جو لوگ نام و نمود، شہرت اور منصب کے خواہشمند ہیں، اور جن کی یہ تمنا رہتی ہے کہ بڑے آدمیوں کے ساتھ اُن کے فوٹو گروپ اخباروں میں چھپتے رہیں، جو "موتمر" کے سہارے اربابِ اقتدار میں اپنا رسوخ چاہتے ہیں، اُن سے "موتمر عالم اسلامی" کو بچانا چاہیئے کہ کارکنوں میں اخلاص کی کمی خود اصل مقصد کو ناکام بنا دیتی ہے، یقین، اخلاص، نیکوکاری، فراست اور جوشِ عمل، یہ ہیں اسلامی اداروں کے کارکنوں کی خصوصیات! جہاں یہ خصوصیات پائی جائیں گی وہاں ہر قدم کامیابی کی طرف اُٹھے گا، "موتمر عالم اسلامی" کو ہم اس مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں بیگانے اُس کی قاہرانہ قوت سے اور یگانے اُس کی شدتِ احتساب سے ڈرتے رہیں ؛

ماہر القادری
۲۵ مئی ۱۹۵۱ء

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ

نوجوانوں

سے

خطاب!

امام حسن البناء شہید کے رسالہ "الی الشباب" کا ترجمہ
قاضی خلیل الرحمان نعمانی کے قلم سے

"اسلام، دین بھی ہے، دولت بھی ہے، مصحف (کتاب ہدایت) بھی ہے اور سیف قاطع بھی!"

"مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ ہر بات میں دنیا کا امام نظر آئے اور قیادتِ عالم اور سیادتِ اُمم سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہو"

"اگر تم اپنے نفس سے جہاد میں ہی کامیاب نہ ہو سکے، تو پھر دیگر معاملات میں بھی عاجز و درماندہ رہو گے۔ بس اپنی تگ و تاز کا پہلا مورچہ اسی کو بناؤ"!

عرضِ حال

یہ رسالہ امام حسن البناء شہید کا ایک پیغام ہے جو انھوں نے نوجوانوں کو خطاب فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے ہم مرحوم کا یہ پیغام ان کی مطبوعات میں سے جو ہمارے سامنے ہیں نقل کرکے پیش کرتے ہیں اور اس کی طباعت واشاعت کی غایت یہی ہے کہ نوجوانوں اور قارئین کرام تک یہ پیغام پہونچ جائے۔

اور جب ہم اس پیغام پر عمل کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے تو گویا یہ ہماری طرف سے اسلام کی مقدس میراث کے حصول کے مقدس و پاکیزہ فریضہ پر صدائے لبیک ہوگی، اسی طرح لکھوکھا انسانوں کی آوازیں اس روحانی زادراہ اور علمی و ثقافتی متاع کے حصول کے لئے بلند ہوں گی!

اور امام مرحوم کا یہی اصلی ورثہ ہے!

آپ کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا کہ ہمیں یہ آواز دیر میں پہونچی۔ کیونکہ یہ عمل تو ایسا ہے کہ دیر سویر اول و آخر جب بھی کیا جائے گا خالصتہً لوجہ اللہ کیا جائے گا اور اس کا مقصد دینی دعوت اور اسلام کا فروغ ہی ہوگا!

ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس سے دائمی نفع بخشے اور ہمارے لئے مخلص باعمل لوگوں کا سا اجر مقرر فرمائے اور سچے قائدین کا سا بدلہ نصیب فرمائے!۔ نیز ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ وہ امام مرحوم کو نیک اور دائمی اجر سے نوازے، اور ان کی خدمات کا بہترین بدلہ نصیب کرے! آمین!

احمد انسی الحجاجی

مقدمہ

تقریباً دس سال گزرے حضرت مرشد عالم نے اس رسالہ کو شائع فرمایا اور نوجوانوں کو اس کی طرف توجہ دلائی!

پڑھنے والے کو اس کے مطالعہ کے بعد اس بات کا اندازہ ہوگا کہ اخوان المسلمون جو بات آج کہہ رہے ہیں وہی بات کل بھی کہتے تھے، ان کی دعوت و پیغام میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا! وہ اپنے اسی موقف پر کھڑے ہیں! البتہ لوگوں کی توجہات کا معیار ضرور بدل گیا ہے! اور یہ اللہ کے فضل کا ادنیٰ کرشمہ ہے! اس رسالہ میں کافی وضاحت کے ساتھ اخوان کا مطمح نظر اور ان کے وسائل کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے موقف کی صراحت کی گئی ہے! وہ موقف چاہے سیاسی ہو! یا اقلیت کے متعلق ہو، یا وطنی و قومی اُمور سے تعلق رکھتا ہو!

اس گزارش کے بعد ہم یہ رسالہ نوجوانوں اور ان حضرات کی خدمت میں پیش کرتے ہیں جو اس سے پہلے اخوان سے ناواقف تھے!

آپ کے لئے اس رسالہ میں بصیرت افروز اور لائق توجہ، اور قابلِ غور و فکر مضامین ہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ - والصلوٰۃ والسلام علی سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ ومن والاہ!

قل انما اعظکم بواحدۃ

الیٰ

انہ سمیع قریب

(پارہ ۲۲ رکوع ۱۲)

ترجمہ :-

"آپ یہ کہئے کہ میں تم کو صرف ایک بات سمجھاتا ہوں وہ یہ کہ تم خدا کے واسطے ایک ایک دو دو، کھڑے ہو جاؤ، پھر سوچو کہ تمھارے اس ساتھی کو جنون نہیں ہے، وہ تم کو ایک سخت عذاب آنے سے پہلے ڈرانے والا ہے!

آپ کہہ دیجئے کہ میں نے تم سے کچھ معاوضہ مانگا ہو تو وہ تمھارا ہی رہا (یعنی اپنے پاس ہی رکھو) میرا معاوضہ تو بس اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اور وہی ہر چیز پر اطلاع رکھنے والا ہے!

آپ کہہ دیجئے کہ میرا رب حق بات کو غالب کر رہا ہے! وہ علام الغیوب ہے!

آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل نہ کرنے کا رہا نہ دھرنے کا!

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں گمراہ ہو جاؤں تو میری گمراہی مجھی پر وبال ہوگی اور اگر میں راہ پر رہوں تو یہ اس قرآن کی بدولت ہے جس کو میرا رب میرے پاس بھیج رہا ہے، وہ سب کچھ سنتا، اور بہت نزدیک ہے"

نوجوانانِ عزیز!

میں تمھارے سامنے معبود برحق کی تعریف بیان کرتا ہوں، اور درود و سلام بھیجتا ہوں اپنے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو مصلحین کے امام، مجاہدین کے سردار ہیں! اور درود بھیجتا ہوں آپ کی آل و اصحاب اور تابعین پر!

نوجوانو!

کوئی نظریہ اسی وقت ضوفگن اور منعکس ہوتا ہے جبکہ اس پر پختہ ایمان ہو، اس کے لئے اخلاص وافر ہو، جرأت و ہمت، اور ایسی قوت موجود ہو جو ایثار و قربانی پر آمادہ کرنے نیز اسے معرض وقوع میں لانے کے لئے عمل پیرا ہو!

اور ایمان، اخلاص، بہادری، اور عمل جو اصول کا درجہ رکھتے ہیں نوجوانوں کا خاصۂ خصوصی ہوتے ہیں کیونکہ ایمان کی اساس قلبِ نکتہ رس، اخلاص کی بنیاد پاک ضمیر، اور جرأت کی اساس مضبوط اور طاقتور شعور ہوتا ہے، اور عمل کی اساس جواں عزم اور بلند ہمت پر ہوتی ہے، اور یہ ساری بنیادی خوبیاں نوجوانوں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں! اسی بنا پر نوجوان چاہے وہ گزشتہ زمانہ سے تعلق رکھتے ہوں یا موجودہ دور سے، ہر ملت و امت کی ترقی کے ستون رہے ہیں، اور ہر ترقی کی قوت کا وہی مصدر ہوتے ہیں، اور ہر نظریہ کے علمبردار بھی یہی ہوتے ہیں۔

ان ھم فتیۃ آمنوا بربھم وزدنا ھم ھدی — وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی۔

اسی وجہ سے تمہارے فرائض بھی بہت زیادہ ہیں، تمہارے متبعین میں تمہاری عظمت کا یہی سبب ہے یہی وجہ ہے کہ ملت کے حقوق بھی تم پر کئی گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اور اسی سبب سے امانت کا بوجھ بھی تمہاری گردنوں پر زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے تمہارے لئے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کافی غور و تدبّر سے کام لو، خوب کام کرو، اپنے موقف کی تجدید کرو، ملت کو مظالم سے چھڑانے کے لئے آگے بڑھو، اور اپنی جوانی سے ملت وقوم کا پورا پورا حق ادا کرو!

وہ قوم جس کی بنیادیں مضبوط ہوں اور جس کی تہذیب کو غلبہ حاصل ہو، اُس کے نوجوان تو شاید یہ کر سکتے ہیں کہ ملت کے معاملات سے زیادہ اپنے ذاتی معاملات پر متوجہ ہوں، اور کھیل کود میں وقت گزار کر قلب میں لذّت اور ضمیر میں ایک طرح کی طمانیت محسوس کریں ——— لیکن وہ اُمت جو جدوجہد کی کڑی آزمائشوں سے گزر رہی ہو، اور جس پر اغیار کا قبضہ و تسلط ہو، جس کی زندگی کے تمام گوشوں پر حریف کی مطلق العنانہ قوت قابض ہو، تو وہ اپنے امکان بھر اس بات کی جدوجہد اور کوشش میں لگی رہتی ہے کہ وہ اپنا چھینا ہوا حق، غصب کی ہوئی میراث ضائع کردہ آزادی، بلند مرتبت بزرگی، واپس لے!

اس وقت تمام فرائض سے بڑھ کر جو فرض مسلمان جوانوں پر عاید ہوتا ہے وہ یہ کہ وہ تن آسانی چھوڑ دیں اپنے نفس و ذات سے زیادہ اُمت کے معاملات کی طرف توجہ دیں، اور اگر وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ہمہ تن لگ جائیں تو انہیں نہ صرف میدان کامرانی میں فوری بھلائی ہی نصیب ہو گی۔ بلکہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے بہتر اور پائیدار بدلہ بھی ملے گا۔!

اور غالباً ہمارے لئے یہی بات بہترین ہو گی کہ ہمارا شمار فریق ثانی میں ہو! کیونکہ ہماری آنکھیں اس اُمت کی آغوش میں وا ہوئی ہیں جو جہاد میں مشغول ہے، اور جو حق و صداقت اور آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہی ہے!

پس اے لوگو! مستعدی سے کام لو کیونکہ مدد و نصرت کی قربت مومنین ہی کے لئے موعود ہے! اور حق کی مدد و نصرت سے بڑھ کر عاملین کے لئے اور کیا کامرانی ہو گی!

نوجوانانِ عزیز!

خطرہ ہے کہ کہیں اس اُبھرنے والی ملت میں جو ابھی اپنے عہد طفولیت ہی میں ہے اختلاف دعوات اور مختلف صداؤں کے اختلاط، راستوں کے تعدد، طریق اور لائنوں کے اختلاف، اور قیادت و سیادت کے دعوے داروں کی کثرت کے سبب راستہ ہی گم نہ ہو جائے، اور یہ سب جدوجہد کسی تفریق پر منتج ہو کر نہ رہ جائے، جس سے ملت کی قوت پارہ پارہ، اور منزلِ مقصود تک پہنچنا دشوار ہو جائے، اسی وجہ سے ان مختلف دعوات کو پرکھنا اور ان سب میں موازنہ کرنا، ان لوگوں کے لئے جو اصلاحِ اُمت کا ارادہ رکھتے ہوں ایک بنیادی امر ہے!

اسی وجہ سے میرا فرض ہے کہ آپ کے سامنے اپنے مقصد، اپنی غایت، اپنے وسائل، اور اپنے طبعی

رجحان اور اپنے پیغام کی حقیقت کی ایسی مختصر مگر جامع توضیح پیش کردوں جو آپ کے لئے کافی واضح اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہو!

اخوان المسلمون کی دعوت

نوجوانانِ ملت!

ہم ایسے ایمان کے حامل ہیں کہ اس میں کوئی جھگڑا ہے نہ ہی اس میں ریب و شک کی گنجائش! اور ہم نے وہ عقیدہ اختیار کیا ہے جو پہاڑوں سے محکم تر اور دلوں کی گہرائیوں سے زیادہ گہرا ہے، گویا وہ ایک کامیاب نظریہ ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں! یہی نظریہ مبتلائے عذاب دنیا کو نجات، اور بھٹکتی ہوئی انسانیت کو راہِ ہدایت و کامرانی دکھائے گا، اور لوگوں کو سیدھے راستے کی ہدایت کرے گا!

اور یہ نظریہ اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی نشر و اشاعت کی راہ میں یا اس کی بشارت و خوش خبری دینے کے لئے ایثار و قربانی سے کام لیا جائے، اور لوگوں کو اس کے لئے اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے، اور ہر سستی اور مہنگی قربانی پر اکسایا جائے۔ اور یہ نظریہ **اسلام** ہے، جس میں نہ کوئی کجی ہے نہ اس کے ساتھ کوئی شر و فساد وابستہ ہے، اور نہ اس کے ماننے والوں کو بھٹک جانے کا خوف اور امکان ہے۔

شهد الله انه لا اله الا هو،	اللہ نے گواہی دی ہے کہ بجز اس کی ذات کے کوئی معبود نہیں
والملئكة واولوا العلم قائما بالقسط	اور فرشتوں اور اہلِ علم نے بھی (یہی گواہی دی) اور معبود بھی وہ
لا اله الا هو العزيز الحكيم۔ ان	اس شان سے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں۔
الدين عند الله الاسلام	ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست حکمت والے

ہیں۔ بلاشبہ دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے!

اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي	آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کردیا۔
ورضيت لكم الاسلام دينا	اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا۔ اور میں نے اسلام کو

تمہارا دین بننے کے لیے پسند کرلیا۔

اسی لئے ہمارا زاویۂ نگاہ اسلام کی سادگی ہے، اسلام ہی ہمارا مرکزِ عمل ہے، اسلام ہی سے ہم استمداد چاہتے ہیں اسی کے لئے ہماری ساری جد و جہد ہے، اور اسی کا کلمہ بلند کرنے کے راستہ میں ہم کام کرتے ہیں، نظامِ اسلامی کا ہم پلہ نہ کوئی نظام ہے اور نہ اسلام کی امامت کے علاوہ کسی دوسرے کی امامت و قیادت پر ہم راضی ہیں! اور نہ اسلام کے احکام کے سوا کسی اور حکم کی ہم پابندی کریں گے۔

ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن	اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب
يقبل منه	کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا۔

اسلام اور مسلمانوں پر ایسا دور بھی گزرا ہے جبکہ وہ پے بہ پے حوادث و مصائب کا شکار بنے اور اسلام کے دشمنوں نے اس کی برکات کو مٹانے، اس کی آب و تاب کو ماند کرنے کی سر توڑ کوششیں کیں، اسلام کے فرزندوں کو گمراہ کرنے، ان کی حدود کو بیکار و معطل کرنے، اور ان کے عساکر کو کمزور بنانے نیز اس کی تعلیمات و احکامات میں تحریف

کرنے کی جو ساعی کیں، تو اس کے لئے کبھی یہ صورت اختیار کی گئی کہ ان تعلیمات واحکامات کو کم کر کے ظاہر کیا، کبھی کچھ اضافہ کر کے، یا پھر دور از کار تاویلات کا جال بچھا کر!

اسی کے ساتھ ان کی یہ کوشش بھی رہی کہ اسلام کی سیاسی قوت کو ضائع کر دیا جائے، اسلام کی عالمی حکومت وشوکت کو پارہ پارہ اور جیوش محمدی کو منتشر کر کے اُمّت محمدیہ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کو اہلِ کفر کے قبضہ میں دیدیا جائے! تاکہ وہ ذلت وغلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوں!

اس لئے برادرانِ محترم! ہمارا پہلا فرض یہ ہوگا کہ ہم اسلام کی واضح وکامل اور صاف حدود لوگوں کے سامنے بیان کریں، جن میں نہ کمی ہو نہ بیشی، اور نہ اس میں کوئی التباس ہو! یہ ہماری سوچ بچار کا نظری جزو ہوگا اسی کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں سے اس کی تحقیق کا مطالبہ کریں، اور اُس کے نفاذ کے لئے لوگوں کو ابھاریں اور اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو یہ اسس نظریہ کا عملی جز کہلائے گا!

اور اس پورے معاملے میں ہمارا بھروسہ یا ہمارے لئے روشنی کا معیار اللہ کی وہ کتاب ہے جس کے نہ سامنے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے! یا پھر وہ سنت صحیح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور اس کے بعد اس اُمت کے سلف صالحین کی پاک سیرۃ لائقِ اعتماد ہے!

ہم خدا کی رضا، ادائے واجب، ہدایت بشر، اور لوگوں کی رہنمائی کے سوا کسی اور شے کے خواہش مند نہیں، ہم انشاء اللہ اپنے نظریہ کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں رہیں گے، اور جب تک زندہ رہیں گے اس کے لئے جد وجہد کرتے رہیں گے! اور تمام لوگوں کو اسی طرف بلاتے رہیں گے، اور اس کے راستہ میں اپنی ساری توانائیاں خرچ کرتے رہیں گے! پس ہم جئیں گے تو عزت کی زندگی جئیں گے، اور مریں گے تو عزت کی موت مریں گے!

ہمارا دائمی شعار یہ ہوگا:-

اللہ غایتنا	اللہ ہمارا منتہائے مقصد ہے!
والرسول زعیمنا	اور رسولؐ ہمارا قائد ہے!
والقرآن دستورنا	اور قرآن ہمارا دستور ہے!
والجہاد سبیلنا	اور جہاد ہمارا راستہ ہے!
والموت فی سبیل اللہ اسمی امانیتنا	اور خدا کی راہ میں مرنا ہماری بہترین تمنا ہے!

نوجوانانِ عزیز!

اللہ تعالےٰ نے اپنی نسبت کا اعزاز - اپنے ساتھ ایمان لانے کا اکرام تمہیں عطا فرمایا - اپنے دین پر تمہیں پختگی نصیب فرمائی - اور اسی بنا پر دنیا کی قیادت کے مرتبہ پر تمہیں کو فائز کیا اور قائدینِ عالم کا رتبہ نصیب فرمایا اور وہ بزرگی اور بڑائی مرحمت فرمائی جو ایک استاذ کو شاگرد پر ہوتی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ	تم لوگ اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو

اور اللہ تعالےٰ پر ایمان لاتے ہو!

اور وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ — اور ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنا دی ہے جو نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ رہو۔

پس پہلی چیز جس کی طرف ہم تم کو بلاتے ہیں یہ ہے کہ تم ایمان کو اپنے دلوں میں پختہ کرو، اپنی قدر و منزلت پہچانو۔ اور یہ عقیدہ رکھو کہ تم دنیا کے قائد ہو، اگرچہ تمہارے دشمن تمہارے لئے ذلت کے خواہاں کیوں نہ ہوں!

اور اس بات پر جمے رہو کہ تم ہی کل کائنات کے استاد ہو، اگرچہ دنیاوی زندگی میں اس کا اُلٹ ہی کیوں نہ ظہور پذیر ہو۔ کیونکہ عاقبت کی کامگاری متقیوں ہی کے لئے ہے!

نوجوانانِ عزیز! اپنے ایمان کی تجدید کرو، اپنی زندگی کی غرض و غایت متعین کرو!

پہلی قوت ایمان ہی ہے اور اسی کا نتیجہ وحدت و یگانگت ہے، اور اس وحدت و یگانگت کا لازمی ثمرہ کھلی کھلی کامیابی و کامرانی اور فتح ہے! پس صحیح مومن بنو، آپس میں بھائی چارہ اختیار کرو اور سرگرم عمل ہو جاؤ، اس کے بعد اس نصرت و کامرانی کی توقع رکھو! **وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ!**

پورا عالم انسانیت سرگرداں، پریشاں، اور مضطرب ہے! اور جو نظام بھی دنیا کے پاس ہے وہ اس سرگردانی اور پریشانی و اضطراب کے علاج سے عاجز ہے! کیونکہ اس مرض کا علاج سوائے اسلام کے اور کچھ نہیں پس اللہ کا نام لیکر دنیا کو مصائب اور پریشانیوں سے نجات دلانے کے لئے آگے بڑھو، پوری انسانیت نجات دہندہ کی منتظر ہے!

مصائب سے رہائی دلانے کا طریقہ صرف اسلام کی تبلیغ ہے۔ وہ اسلام جس کی مشعل تم اُٹھائے ہوئے ہو اور جس کے ذریعہ دُکھی دنیا کو خوشخبری کا پیغام دے رہے ہو!

نوجوانو!

اخوان المسلمون کے کام کا راستہ معین، اور اس کے نشانات واضح ہیں، ہم اپنے ارادوں سے بخوبی واقف ہیں، اور ان ارادوں کی تکمیل و تحقیق کے وسائل بھی ہم سے پوشیدہ نہیں!

ہمارا اوّلین ارادہ و خواہش یہ ہے کہ انسان اپنے نظریات، عقاید، اخلاق، رجحانات اور اپنے اعمال و اشغال کے اعتبار سے صحیح معنی میں مسلمان ہو! اور اس کو ہم تکوین انفرادی کا درجہ دیتے ہیں اس کے بعد ہماری دوسری خواہش یہ ہے کہ پورے مسلم گھرانے میں یہی اوصاف پیدا ہوں اس لئے ہماری توجہ کا مرکز عورتیں اور بچے بھی بالکل اسی طرح ہیں جس طرح مرد، اور نوجوان! اور ہم اس کو تکوین عائلی کہتے ہیں! اس کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ تمام کے تمام مسلمان ان سب اوصاف کے حامل ہو جائیں۔ اس کے لئے ہماری کوشش ہے کہ ہماری دعوت گھر گھر پہونچے، اور ہر جگہ ہماری آواز سُنی جائے اور ہمارے نظریہ کی اشاعت ہو!

خواہ وہ بادیہ ہو، یا گاؤں، قصبہ ہو یا شہر، کوئی مرکز ہو یا دار السلطنت، ہر جگہ اس کا غلغلہ بلند ہو اس کے لئے ہم اپنی یہ کوشش برابر جاری رکھیں گے، اور کوئی ذریعہ و وسیلہ بھی باقی نہ چھوڑیں گے!

اور ان سب (جزوی و انفرادی) اصلاحات کے بعد ہمارا جو مطمح نظر ہے وہ ہے حکومت مسلمہ! (اسلامی حکومت) جس کے ذریعہ ہم ان تمام گروہوں کو مسجد کی طرف لائیں گے اور ان کو ایسا ہی ہدایتِ اسلام

کا حامل بنائیں گے جیسا کہ اب سے پہلے حضرتِ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بنایا تھا۔ اسی لئے ہم کسی ایسے نظامِ حکومت کو جس کا مرکز اساسی اسلام نہ ہو، نہ تسلیم کرتے ہیں نہ اس سے کسی قسم کی مدد کے طالب ہیں۔ اور نہ موجودہ سیاسی گروہ بندیوں سے ہمارا کوئی تعلق! اور نہ ان تقلیدی اور پامال شکلوں کو قبول کرتے ہیں جن کو اہلِ کفر اور اعدائے اسلام نے ہم پر مسلط کیا یا جن کا وہ حکم دیتے ہیں، یا جن پر ان کا عمل ہے، ہماری کوشش اور جد و جہد تو انشاء اللہ یہ ہوگی کہ نظامِ حکومت اسلامیہ کو اس کے تمام ظاہری و باطنی صُور و اشکال کے ساتھ زندہ کیا جائے اور اسی نظام کی اساس پر حکومت اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی جائے!

اس کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ اپنے اسلامی وطن کے تمام ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملا دیں جس کو مغربی سیاست نے ٹکڑے ٹکڑے کیا اور مغربی استعماریت نے جن کی وحدت کو غارت کیا، اسی لئے ہم نہ ان سیاسی تقسیموں کو مانتے ہیں نہ ان دولی اتفاقات و اتحادات کو تسلیم کرتے ہیں، جس کے ذریعہ وطنِ اسلامی ہی کو پارہ پارہ کر کے چھوٹی چھوٹی دولتیں قایم کی گئی ہیں، تاکہ غاصبین کے لئے اُن کا ہڑپ کر جانا سہل ہو!

ہم ان گروہوں کی آزادی سلب کر لینے اور غیروں کے استبداد و تسلط قایم کر لینے پر کبھی خاموش نہیں بیٹھیں گے، پس مصر و شام، عراق، حجاز، یمن، طرابلس، تونس، الجزائر، مراکش، اور زمین کا وہ بالشت بھر ٹکڑا جس میں مسلمان موجود ہیں، اور جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں، یہ سب کا سب ہمارا وطن کبیر ہے، جس کی آزادی، نجات، اور ایک دوسرے کے اجزاء کو باہم ضم کر دینے کے لئے ہم کوشش کریں گے!

اگر ایک جرمن باشندہ اپنے آپ کو ہر اس شخص کا حامی و مددگار سمجھتا ہے جس کی رگوں میں جرمنی خون ہے، تو عقیدہ اسلامی تو اس سے کہیں بڑھ کر ہر مسلمان پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر اس ہستی کا حامی و مددگار سمجھے جس کا نفس تعلیماتِ قرآنیہ سے سیراب ہو۔ اسی لئے اسلام میں یہ جائز نہیں کہ رابطۂ محبت و اخوت میں عوامل ایمانی سے عوامل عنصری قوی تر ہوں، اسلام میں عقیدہ ہی سب کچھ ہے۔ اور ایمان کیا ہے؟ الحب للہ و البغض للہ!

اس کے بعد ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اللہ کے بلند و بالا پھریرے کو دوبارہ ان مقامات پر اڑتا دیکھیں جو کسی زمانہ میں سعادت اسلام سے مالا مال تھے، جہاں موذنوں کی تہلیل و تکبیر کے آوازے گونجتے تھے، جو شوئی قسمت کا شکار ہوئے، ان سے ان کی روشنی کو چھین لیا گیا اور وہ اسلام کے بعد کفر کی آغوش میں چلے گئے!

پس اندلس، صقلیہ (سسلی) بلقان، جنوبی اٹلی، جزائر بحرِ روم، یہ سب کے سب اسلامی مستعمرات میں شامل تھے، جن کا اسلام کی گود میں واپس لوٹنا ضروری ہے، اور یہ بھی ضروری و لازمی ہے کہ بحر اسود و بحر احمر دونوں اسی طرح اسلامی ہوں جیسے کہ اس سے پہلے تھے!

اور اگر سائنور مسولینی اس کو اپنا حق سمجھتا ہے کہ رومی شہنشاہیت کا دور واپس لائے، (حالانکہ یہ شہنشاہیت جس کے خواب دیکھے جا رہے ہیں کوئی پرانی چیز نہیں۔ بلکہ اس کی بنیاد تو طمع و خواہشِ نفسانی کی بنیادوں پر استوار کی گئی تھی) تو ہمارا بھی یہ حق دنیا کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہم سلطنت اسلامیہ کی وہ عظمت و شوکت اور بزرگی و عزت واپس لوٹا لائیں جس کی بنیاد عدالت و انصاف پر قایم کی گئی تھی اور

اور جو نور و ہدایت کا پیغام لوگوں تک پہنچاتی اور پھیلاتی تھی !

اس کے بعد ہمارا ارادہ یہ ہے اور اسی کا ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم اپنی دعوت کا دنیا بھر میں اعلان کریں گے اور پوری انسانیت کو اس کی تبلیغ کریں گے، اور اس کو دنیا کے گوشے گوشے میں عام کر دیں گے، اور ہم ہر جابر و ظالم کی گردن کو اس پاک و مقدس دعوت کے سامنے جھکا دیں گے، "تاکہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے، اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے! اور اس روز مومن اللہ کی امداد سے شاداں و فرحاں ہوں گے !

وہ جس کو چاہے غالب کر دیتا ہے، اور وہ زبردست ہے، رحیم ہے۔

ان مختلف مراحل میں سے ہر مرحلہ کے لئے علیحدہ راستہ، مختلف فروع اور جدا جدا وسائل ہیں ہم اُس کو اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں، اللہ ہمارا مددگار ہو اُسی کی ذات ہمارے لئے کافی ہے اور وہی ہمارا ناصر و وکیل ہے۔

کم ہمت اور بزدل لوگ کہتے ہیں کہ اس قسم کا خیال رکھنا فضول اور ایک ایسا وہم ہے جو ان لوگوں (یعنے اخوان) پر مسلط ہو گیا ہے۔ لیکن ان لوگوں کا ایسا کہنا ایک ایسی کمزوری ہے جو نہ ہمارے پاس تک پھٹکی ہے اور نہ اسلام میں اُس کا کوئی وجود ہے !

یہ وہ کمزوری ہے جو اس قوم کے دلوں میں جاگزیں ہو گئی ہے، اور جس کے سبب اُس قوم پر اس کے دشمنوں نے غلبہ و تسلط پا لیا ہے، اور اسی کمزوری نے ان کے دلوں کو ایمان کی روشنی اور قوت سے محروم کر دیا ہے اور یہی کمزوری مسلمانوں کے تنزل کا سبب بنی !

ہم کھلے اور واضح طور پر اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ پر جس مسلمان کا ایمان ہو اور وہ اس کے حصول کے لئے جدوجہد نہ کرے، تو اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اُسے چاہیئے کہ وہ اپنا کوئی دوسرا نظریہ بنالے، جو اس کا دین ہو، اور وہ اسی کے مطابق عمل کرے !

نوجوانو !

تم ان لوگوں سے ضعیف و کمزور نہیں ہو جن کے ہاتھوں اللہ تعالےٰ نے اپنے اس مقدس مقصد کو تقویت و توانائی عطا فرمائی، پس تم نہ بزدلی کا مظاہرہ کرو، نہ ضعف و کمزوری دکھاؤ، اپنا مطمح نظر اللہ کے اس فرمان کو بنالو۔

الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا و قالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

یہ ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں نے اِن سے کہا کہ اُن لوگوں نے تمھارے لئے سامان جمع کیا ہے سو تم کو اُن سے اندیشہ کرنا چاہیئے تو اس نے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا اور کہدیا کہ ہم کو حق تعالےٰ کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے !

ہم اپنے نفوس کی ایسی نہج پر تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے ثمرات مرد مومن کی شکل میں ظاہر ہوں اور اپنے گھر میں وہ فضا پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے سبب ہمارا گھر نہ مسلمان کیا جائے، اور اپنے طبقوں کی تربیت

ایسے طریقے پر کرنا چاہتے ہیں کہ مصر کے تمام گروہ صحیح معنی میں مسلمان بن جائیں، اور ہم ثبات قدمی سے اُن تمام مراحل کو طے کریں گے جن کو اللہ ہی نے مقرر کیا ہے، نہ کہ ان طریقوں اور راستوں پر جن کو خود ہمارے نفوس نے تراشا یا جنم دیا ہے! اور خدا کی مدد اور سہارے سے ہم انشاءاللہ اس کے ذریعہ کامیابی و کامرانی کی منزل کو ضرور پالیں گے!

ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون　　اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچادے مانے گا نہیں گو کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اور اس مقصد کے لئے ہمیں ان چیزوں کو مہیا کرنا ہے، غیر متزلزل ایمان! عمل پیہم، اور اللہ پر ایسا بھروسہ جو کمزور نہ پڑ سکے! اور ایسی نیک روحیں جو اللہ سے ملنے کے لئے اس کے راستہ میں شہید ہونے کی تڑپ سے سرشار ہوں!

پس ہماری داخلی اور خارجی سیاست کا اصل الاصول اور محور یہی اصول ہونے چاہئیں، کیونکہ ہمیں اسلام سے اسی چیز کا پتہ ملتا ہے، اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ یہ دین و سیاست کی تفریق، اسلامی تعلیمات میں اس کا کہیں وجود نہیں اور نہ پکے اور سچے مسلمان اس تفریق کے قائل تھے جو دین کا صحیح فہم رکھتے تھے اور دین کی حقیقی رُوح اور اس کی تعلیمات سے واقف تھے!

پس جو شخص بھی ہمیں اس صحیح راستہ سے منحرف کرنے کا ارادہ رکھتا ہو ہمیں اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیئے کیونکہ ایسا شخص یا اسلام کا دشمن ہے یا اسلام کی تعلیمات سے جاہل ہے! ان دو باتوں کے علاوہ تیسری اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی!

نوجوانانِ عزیز!

وہ شخص غلطی پر ہے جو یہ گمان کرتا ہے کہ اخوان المسلمون درویشوں کی ایک جماعت ہے، جس نے اپنے آپ کو عبادات اسلامیہ کے محدود دائرہ میں محصور کر رکھا ہے اور ان کی ساری مساعی صرف نماز، روزہ، ذکر و تسبیح، تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں!

اخوان المسلمون اسلام کو انہیں چند وظائف میں محصور نہیں مانتے، اور نہ وہ اس طریقہ کا اسلام لائے ہیں! ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا جامع و مکمل نظامِ زندگی ہے جس میں عقائد و عبادات بھی شامل ہیں، وطن دوستی اور جنسی حمایت بھی اس میں داخل ہے،

اور اخلاقی، مادی، ثقافتی اور قانونی، عزت و قوت حاصل کرنا یہ سب ایمان کا جز ہیں۔

اخوان المسلمون کا تو یہ عقیدہ ہے کہ اسلام ایسا نظام ہے جو ہر مسلمان پر پورے پورے مظاہر حیات کی ذمہ داریاں ڈالتا ہے، اور امور دنیا بھی اس کے نزدیک اتنے مہتم اور قابل توجہ ہیں جتنے کہ اُمور آخرت!

وہ اس کو نظام عملی کے ساتھ ساتھ روحانی برتری کا نظام بھی تسلیم کرتے ہیں!

چنانچہ اخوان کے نزدیک دین اسلام دین بھی ہے، دولت بھی، مصحف (کتاب ہدایت) بھی ہے سیف قاطع بھی! اسی لئے وہ نہ عبادات سے جی چراتے ہیں اور نہ ان کو بیکار سمجھتے ہیں، اور نہ اُن فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی و تساہل کرتے ہیں جو ان کے رب نے ان پر فرض کر دیئے ہیں! وہ نمازوں کو باحسن وجوہ ادا کرتے

والے ہیں، اللہ کی کتاب کی تلاوت میں مشغول رہتے ہیں، اور فرمان رب کے مطابق ہی ذکر و تسبیح میں بھی مصروف رہتے ہیں! نیز عبادات میں اُن حدود کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں!
نہ اُن میں غلو کرتے ہیں نہ زیادتی!
پس زیادہ ہرائی میں نہ جاؤ، اور بال کی کھال نہ نکالو!
اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو بخوبی جانتے ہیں۔

ان ھذا الدین متین فادخل فیہ بوفق ان المنبت لا ارضا قطع ولا ظھراً ابقی!

یہ دین، ایک مضبوط دین ہے، اس میں نرمی و سہولت سے داخل ہو! کارواں سے بچھڑا ہوا مسافر، نہ منزل طے کر سکتا ہے نہ سواری کو آرام پہنچا سکتا ہے!

اسی وجہ سے وہ دنیا میں سے اتنا ہی حصہ اختیار کرتے ہیں جو اُن کی آخرت کو خراب نہ کرے! اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر عمل پیرا ہیں!

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق

آپ فرمائیے کہ اللہ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے!

اخوان المسلمون یہ بھی جانتے ہیں کہ بہترین جماعت کے لئے بہترین وصف وہی ہے جو اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ یعنی

رھبان باللیل وفرسان بالنہار

رات کے عبادت گزار، دن کے شہسوار

اخوان بھی ایسے ہی اوصاف سے متصف ہونے کی فکر و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کا مددگار ہو! اور جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اخوان المسلمون وطن یا وطنیت کے دشمن ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں! حالانکہ اخوان تو اپنے وطن کے مخلص ترین لوگ ہیں، وہ اپنے آپ کو اپنے عزیز وطن کی خدمت کی راہ میں فنا کرنے والے ہیں، اور ہر اس شخص کا دلی احترام کرتے ہیں جو خلوص سے وطن کی خدمت کرتا ہو! یہ ضرور ہے کہ وہ وطن عزیز کی خدمت، اور قوم و ملت کی عزت و سر بلندی کی حدود سے بخوبی واقف ہیں اور ہر ایک کے لئے حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی خدمات انجام دینے میں کوشاں رہتے ہیں!
البتہ اخوان المسلمون اور وطنیت کے داعیوں میں ایک فرق ضرور ہے، وہ یہ کہ اخوان المسلمون وطنیت کی اساس اسلامی عقیدہ کو قرار دیتے ہیں، پس مصر کے لئے ان کا کام کرنا، مصر کے راستہ میں جہاد کرنا، اور اس جہاد میں اپنے آپ کو فنا کر دینا صرف اس لئے ہے کہ مصر ارض اسلام، اور مسلمان قوم کا ماویٰ و مسکن ہے! اسی شعور و عقیدہ کی بنا پر وہ مصر کی ہی حدود پر بس نہیں کرتے ہیں بلکہ اس جد و جہد وطنیت میں ہر ارض اسلامی اور ہر وطن اسلامی کو شریک کرتے ہیں، اس کے برخلاف محض وطن پرست انسان اپنی جماعت و قوم کے وطن کی اسی سرحد پر رک جاتا ہے جہاں وہ قوم بستی ہے! یا جہاں وہ جماعت خاص بود و باش رکھتی ہے! اس کے اندر خدمت

وطن کا جذبہ اور کام کرنے کی دُھن یا تو کسی کی دیکھا دیکھی ہوتی ہے، یا اس کے پیش نظر بڑائی اور ناموری ہوتی ہے، یا کچھ اور منافع و فوائد دنیاوی، وہ خدمتِ وطن کو ایسا فریضۂ خداوندی تصور نہیں کرتا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے مقرر کر دیا ہے! اخوان المسلمون کے جذبۂ وطنیت کے ثبوت کے لئے یہ امر کافی ہے کہ وہ یہ عقیدہ راسخ رکھتے ہیں کہ ہر اس بالشت بھر قطعہ زمین کو جس میں کوئی مسلمان سکونت پذیر ہو، اور دشمنوں نے اس پر جابرانہ تسلط و قبضہ جما لیا ہو۔ دشمنوں سے واپس نہ چھین لے، یا واپس لینے کی کوشش میں خود لقمۂ اجل نہ ہو جائے، ایک ایسا جرم ہے کہ جس سے غفلت ناقابل معافی ہے۔ اور واپس نہ لے لینے کے علاوہ کسی اور اقدام سے نجات اور چھٹکارے کی کوئی توقع نہیں!

اور وہ بھی غلط کار ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اخوان المسلمون قنوطیوں اور بے عملوں کی جماعت ہے، اخوان ہر وقت اس کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ مسلمان کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ وہ ہر بات میں دنیا کا امام نظر آئے! اور قیادتِ عالم و سیادتِ اُمم سے کم کسی چیز پر راضی ہی نہ ہو،

ہر چیز میں پوری تن دہی، جد و جہد، اور مُسابقت کے جذبہ کو کارفرما بنائے، چاہے وہ علم و قوت کا میدان ہو، یا صحت و دولت کا سوال، ان باتوں میں سے کسی بات میں بھی کوتاہی یا سہل انگاری ہمارے نظریہ کے لئے بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے، اور ہماری دینی تعلیمات و روایات کے خلاف بھی ہے!

اس لئے اگر ہم گمراہ مادیت سے لوگوں کو بچنے کی تلقین کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں پھنس کر آدمی اپنے نفس کا غلام ہو جاتا ہے، اس کی تمام قوتیں، اور تمام مساعی، اپنی ذات کے گرد گھومنے لگتی ہیں، پھر وہ نہ کسی دوسرے کے لئے کوئی کام کرتا ہے اور نہ ہی ملت و قوم کے کسی کام سے دلچسپی اور اعتنا کرتا ہے، حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم — جو مسلمانوں کے کام نہ آئے وہ مسلمانوں میں سے نہیں۔

یا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے:۔

ان اللہ کتب الاحسان علی کل شئ — اللہ نے ہر کام کو مکمل طریق پر ادا کرنا فرض قرار دیا ہے۔

اور وہ لوگ بھی خطاکار ہیں جو یہ گمان بد کرتے ہیں کہ اخوان المسلمون طبقات اُمت کے مابین تفریق کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے جتھ بندی کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام نے بنی نوعِ انسان کے درمیان رابطہ انسانیت عامہ پر کتنی توجہ دی ہے! اور اسلام کے نزدیک یہ جذبہ کس قدر محترم ہے!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ و جعلنٰکم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ — اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو!

اور کائنات کی سب سے بہتر ہستی، عالمین کے لئے سراپا رحمت کا ارشاد گرامی ہے:۔

ودین ھذہ مھمتہ ابعد الادیان — اس دین کا مسلک اس امر میں کہ لوگوں کے دلوں

عن تفریق القلوب وایغار الصدور — میں تفرقہ پیدا کی جائے، اور سینوں میں بغض بھڑکایا جائے،
اور دینوں سے بالکل جدا ہے،
اسی لئے قرآن کریم میں ایسی وحدت و یکجہتی کا حکم دیا گیا ہے، اور کافی تاکید کی گئی ہے، اس کی مثال ذیل کا فرمان باری تعالےٰ ہے:-

لانفرق بین احد من رسلہ — ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اور اسی لئے اسلام نے ظلم و زیادتی کو حرام قرار دیا ہے، حتیٰ کہ حالت غضب اور لڑائی جھگڑے کے وقت بھی ظلم و زیادتی کی اجازت نہیں، ارشاد خداوندی ہے:-

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لاتعدلوا اعدلوا۔ — کسی خاص قوم سے بغض اس کا باعث نہ بن جائے کہ تم عدل نہ کرو! تمہیں (ہر حال میں) عدل کرنا چاہیئے۔

اسلام نے تو ظلم و زیادتی کے بجائے ہم وطنوں سے نیکی اور بھلائی اور احسان کی وصیت کی ہے، اگرچہ ان کے عقاید و ادیان مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ قرآن کا حکم ہے:-

لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروا وتقسطوا الیھم۔ — اللہ تعالےٰ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان و انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا، جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔۔۔۔۔۔۔۔

اور ذمیوں سے انصاف کرنے اور اُن سے حُسن معاملہ کا حکم دیا، کہ
"جو اُن کے لئے نفع بخش ہے وہی ہمارے لئے، اور جو چیز ان کے لئے نقصان رساں ہے وہی ہمارے لئے"
ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں پس ہم نہ کسی فرقہ پرستی کی دعوت دیتے ہیں، اور نہ گروہی عصبیت کی طرف بلاتے ہیں البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ہم اس وحدت کو اپنا ایمان دیکر نہیں خریدتے، نہ اس وحدت کی راہ میں ہم اپنے عقیدوں کا معاملہ کرتے ہیں، نہ اس کی وجہ سے عام مسلمانوں کی مصلحتوں کو رائیگاں کرتے ہیں! ہم اس وحدت کو ہمیشہ حق و انصاف کے ساتھ خریدنے کے طلبگار رہتے ہیں۔
اور اگر کوئی اس کے علاوہ اور راستہ اختیار کرے تو ہم اس کو اسی معاملہ کی حد تک محدود رکھتے ہیں، (رائی کا پہاڑ یا میل کا بیل نہیں بناتے) اور جس غلط سمت وہ جا رہا ہے اس کا غلط ہونا اس پر ضرور واضح کر دیتے ہیں!
"عزت تو اللہ، اس کے رسول، اور مومنین ہی کیلئے ہے"
اور وہ لوگ بھی غلطی کرتے ہیں جو یہ گمان کرتے ہیں کہ اخوان المسلمون کسی خاص جماعت کے آلۂ کار، یا کسی خاص سوسائٹی کی چشم و ابرو پر رقص کرنے والے ہیں!
حالانکہ اخوان کی جدوجہد کا حاصل اپنے رب کی طرف سے نازل شدہ ہدایت کی منزل کو پالینا ہے، اور ان کا مقصد اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کوئی کام کریں جو ہر زمان و مکان میں اسلام و فرزندانِ اسلام کے لئے مفید ہو! اور وہ اُن تمام قوتوں کو جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں صرف اللہ کی مرضی حاصل کرنے کے لئے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور اخوان اس پر فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے اب تک کسی فرد کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا، اور نہ کسی فرد یا سوسائٹی

یا جماعت سے کوئی اعانت طلب کی!

نوجوانانِ عزیز!

ہم آپ سب کو انہیں پختہ اصولوں اور انھیں عظیم الشان تعلیمات کی دعوت دیتے ہیں اگر آپ ہمارے نظریہ کو تسلیم کرلیں ہمارے قدم بقدم آپ بھی رواں دواں ہوجائیں اور اسلام کے سیدھے راستہ پر آپ بھی ہماری معیت اختیار کرلیں، اور اس نظریہ کے علاوہ تمام نظریات سے خالی الذہن ہوجائیں، اور آپ کی تمام کوششوں کا محور آپ کے یہی معتقدات ہوجائیں تو آپ کے لئے یہ دین و دنیا دونوں میں بہتر ہے!

اور جن برکات و ثمرات کا ظہور دورِ اوّل میں آپ کے اسلاف کرام پر ہوا تھا وہی ثمرات انشاء اللہ آپ بھی حاصل کرلیں گے، اور آپ میں سے ہر وہ آدمی جو سچائی سے کام کرنے والا ہو، اخوان میں ایسے لوگوں کو موجود پائے گا جو اس کی کوششوں کو سراہنے والے اور اس کی حوصلہ افزائی کرنے والے ہوں گے، اور وہ ہر کام میں نہایت خوشی و مسرّت محسوس کریگا! اگر طلب و جذبہ صادق ہو!

اور اگر آپ اس دعوت سے انکار کریں، یا آپ کو تذبذب و اضطراب گھیرلے، اور آپ ان منتشر و پراگندہ خیال دعوتوں، اور بے کار و بے مقصد، راستوں ہی کے چکّر میں پھنسے رہنا گوارا کریں۔ تو اللہ کا لشکر تو بہر صورت رواں دواں رہے گا، اُسے نہ قلت کی پرواہ ہے نہ کثرت کی!

"اور نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکیم ہیں"

توجیہات

(۱)

برادرانِ گرامی!

تمہاری اس دعوت کی بنیاد تین اُصولوں پر قائم ہے!

(۱) اللہ کی معرفت (۲) نفس کی اصلاح (۳) مخلوق خدا سے محبّت!

اللہ کی معرفت ذکر و مراقبہ سے حاصل ہوتی ہے، نفس کی اصلاح کے لئے طاعت و مجاہدہ ضروری ہے اور مخلوق سے محبت کا درجہ نصیحت و ایثار سے حاصل ہوتا ہے!

سب سے پہلے میں جس چیز کا آپ سے عملی مطالبہ کرتا ہوں اور جس کو میں نظریہ کا نام دیتا ہوں یہ ہے۔ کہ

(۱) تم میں سے ہر شخص روزانہ تھوڑا بہت قرآن شریف ضرور پڑھے، اور کم سے کم ایک آیت روزانہ حفظ یاد کرے۔

(۲) روزانہ سونے سے پہلے ہر شخص اپنے اعمال کا محاسبہ کرے، اور دن بھر جو کام کئے ہیں ان پر غور و فکر کرے، اگر وہ نیک کام ہوں تو ان کی ادائیگی پر اللہ کا شکر بجالائے، اور اگر کسی ناپسندیدہ فعل کا مرتکب ہوا ہے تو تلافی کا عزم و سعی کرے،

(۳) پانچوں نمازوں کو وقت پر ادا کرنے کا التزام کرے، تعدیلِ ارکان کے ساتھ ان کو اچھی طرح خشوع و

خضوع کے ساتھ ادا کرے، نماز میں قرآن مجید کا جو حصہ تلاوت کیا جاتا ہے اس کے معانی و مطالب پر غور کرے!
نوافل معینہ میں کوتاہی نہ کرے، جہاں تک بس چلے نماز مسجد میں اور باجماعت ادا کرے اور حتی الامکان فجر کی نماز اپنے وقت پر التزام سے ادا کرے، کیونکہ اس نماز کے بارے میں ارشاد باری ہے!
ان قرآن الفجر کان مشہودا — بے شک صبح کی نماز (فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔

(۲)

جوانانِ اخوان!
تمہارا پہلا میدان عمل تمہاری اپنی ذات ہے۔ اگر تم اپنی ذات و نفس پر قابو یافتہ ہوگئے تو پھر دوسری چیزوں پر بھی قادر ہو جاؤگے!
اور اگر تم اپنے نفس سے جہاد میں ہی کامیاب نہ ہوسکے تو پھر دیگر معاملات میں بھی عاجز و درماندہ رہوگے! پس، اپنی تگ و تاز کا پہلا مورچہ اسی کو بناؤ!
یاد رکھو کہ ساری دنیا نوجوانوں کے اسی ممتاز گروہ کی جو پاک باطن، اور بہترین اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہوں راہ دیکھ رہی ہے! مایوس نہ ہو، انشاء اللہ تم ہی وہ نوجوان گروہ ثابت ہوگے، جس کے لئے دکھی دنیا چشم براہ ہے!
اپنا نصب العین رہبر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو بنالو! آپ نے فرمایا:۔
"تم میرے لئے چھ باتوں کے ضامن بن جاؤ، میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں (۱) جب بولو سچ بولو (۲) جب وعدہ کرو پورا کرو (۳) امانت میں خیانت نہ کرو، (۴) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو (۵) اپنی نظریں نیچی رکھو (۶) اپنے ہاتھوں کو (ایذا دہی سے) روکو!"
پھر تم دیکھنا کہ تم کیا بنتے ہو!
فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمومنون وستردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون ـــــ
"سو ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالےٰ، اس کا رسول، اور اہل ایمان اور ضرور تم کو اُسی کے پاس جانا ہے، جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلادے گا!"

(۳)

اخوان المسلمون کے جوانو!
تین چیزیں نجات بخش ہیں ان کو غنیمت جانو! اور تین چیزیں ہلاکت خیز ہیں اُن سے بچو
چنانچہ نماز، قرآن، اور مراقبہ (محاسبۂ اعمال) پر مداومت دنیا میں باعث نجابت و شرف اور آخرت میں

موجب سعادت ہے! لہٰذا نمازوں کو ان کے اوقات کی پابندی اور جماعت کے ساتھ التزاماً ادا کیا کرو، اس کے مسائل سے واقفیت پیدا کرو، اور نماز میں جو کچھ آیات و اذکار پڑھتے ہو ان پر غور کرو۔ اطمینان قلب، اور خشوع و خضوع سے اُنہیں ادا کرو،

اور جتنی توفیق ہو غور و تدبر کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرو!

اور اپنی تمام حرکات و سکنات کا اللہ کو حاضر ناظر جان کر مراقبہ (محاسبہ) کرو

جو اللہ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، اللہ بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے!

اور شراب، جوا، اور بے لگام شہوت، دنیا میں ہلاکت کا سبب، اور آخرت میں شدائد شقاوت کا باعث ہوتی ہیں!

جام و مینا سے بچو، بیہودہ اور بیکار لوگوں کی محفلوں سے اجتناب کرو،

اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو، بُرے ساتھیوں، نوجوان چنچل چھوکریوں سے دور بھاگو، اور شیطانی وسوسوں اور فریب کاریوں سے بچو!

دس حکمت کی باتیں ——— پند و نصائح

پڑھو، سوچو، اور عمل کرو!

۱- جب اذان سنو فوراً نماز کے لئے اُٹھ کھڑے ہو، چاہے کتنے ہی مصروف ہو!

۲- قرآن مجید کی تلاوت کرو، یا مطالعہ و سماعت میں لگے رہو، یا ذکر اللہ میں مصروف رہو، اپنے وقت کا کوئی حصہ بے فائدہ باتوں میں ضائع نہ کرو!

۳- صحیح و فصیح عربی میں گفتگو کی کوشش کرو، کیونکہ یہ اسلام کی نشانیوں میں سے ہے!

۴- کسی بھی مقصد کے لئے جھگڑا نہ کرو، کیونکہ جھگڑے میں کوئی بھلائی نہیں!

۵- زیادہ نہ ہنسو، کیونکہ جو دل اللہ سے وابستہ ہو اس کو پُر سکون اور باوقار ہونا چاہیئے!

۶- ٹھٹھا مخول نہ کرو، کیونکہ مجاہد قوم کا طرۂ امتیاز سنجیدگی اور وقار ہوتا ہے!

۷- مجمع میں سامعین کی ضرورت سے زیادہ بلند آوازی کا مظاہرہ نہ کرو، کیونکہ یہ رعونت کی علامت اور ایذادہی کا باعث ہوتی ہے!

۸- لوگوں کی غیبت سے پرہیز کرو، تحریکوں اور جماعتوں پر نکتہ چینی سے بچو، اور بھلائی کے سوا کوئی کلمہ منہ سے نہ نکالو!

۹- تم کو اپنے ہر ملنے والے بھائی سے اپنا تعارف کرانا چاہیئے، وہ چاہے اس کی خواہش کرے، یا نہ کرے کیونکہ ہماری دعوت کی بنیاد ہی باہمی محبت اور آپس کی جان پہچان پر ہے!

۱۰۔ ذائض اور ذمہ داریاں زیادہ ہیں، اوقات کم! پس وقت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے دوسروں کے ساتھ تعاون کرو!
اگر تمھیں کوئی ضرورت درپیش ہو تو اس کو پورا کرنے کے لئے اختصار سے کام لو!

عبدالحمید ارشد

احادیثِ رسولؐ

قرآن کی روشنی میں ——!

اسلام کے اندرونی اور بیرونی دشمن تو ہمیشہ سے چلے آرہے ہیں۔ یہود، نصاریٰ، مجوسس اور مشرکین وغیرہم تو اس کے ظاہری اور بیرونی دشمن ہیں۔ اور منافقین، متمردین، زنادقہ اور ملحدین (جو بظاہر اسلام کا دعویٰ بھی کرتے ہیں) اس کے اندرونی دشمن ہیں۔ ان ہی اندرونی دشمنوں میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو قرآن اور احادیثِ صحیحہ ثابتہ میں اختلاف دکھلانے کی مفسدانہ کوشش کرتے ہیں۔ اور اس طرح اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام میں تفریق کرتے ہیں اور اللہ کے اور قرآن کے نام پر اللہ کے آخری رسولؐ کے ارشادات کو جھٹلاتے ہیں اور جس گمراہی میں خود پڑے ہوئے ہیں، اس میں دوسروں کو بھی ڈھکیلنا چاہتے ہیں۔ چکڑالویوں، مرزائیوں نے تو اپنے اپنے وقت میں اس قسم کی کوششیں کیں اور بفضلہ تعالےٰ ناکام ہوئے۔ اب پرویزیوں اور جیراجپوریوں نے اس سلسلے میں ہاتھ پیر مارنے شروع کئے ہیں۔ کہ جو کام وہ ادھورا چھوڑ گئے تھے یہ اُسے پورا کریں۔

یریدون لیطفؤا نور اللہ بافواھھم۔ واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون ۝

(الصف) چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھائیں۔ اور اللہ تعالےٰ کو اپنی روشنی پوری کرنی ہے۔ خواہ منکر برا مانیں۔

اسلم جے راجپوری، غلام احمد پرویز اور اُن کی پارٹی آج کل پوری قوت کے ساتھ "انکارِ حدیث" کی گمراہی پھیلانے میں مصروف ہے، پرویز صاحب نے تو اپنی تصنیف "معارف" کی چار جلدوں میں یہی کوشش کی ہے کہ "فرمودہٗ رسُولؐ" کو "دین" سے خارج کر دیا جائے، لیکن پرویز صاحب جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں اُس کو "دین" سمجھا جائے" دین کے نام پر بے دینی کی ایسی مفسدانہ کوشش تاریخ کے کسی دور میں شاید ہی کبھی کی گئی ہو۔

کراچی کا ماہنامہ طلوعِ اسلام (برعکس نہند نام زنگی کافور) "انکارِ حدیث" کے فتنہ کو ہوا دے رہا ہے، اور اُس کی انشاپردازی کا سارا زور اسی پر صرف ہو رہا ہے کہ کسی طرح رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مسلمانوں کی نظر میں بے اعتبار ہو جائیں (ہم اس تصوّر سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں)!

زعم یہ ہے اور دعویٰ اس بات کا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر اب تک صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، محدثین، ائمہ اور فقہائے قرآن کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ ناقابلِ اعتبار ہے، قرآن کو سمجھا ہے تو علامہ جے راجپوری اور جناب پرویز کی بارگاہِ دانش اور دبستانِ علم و عرفان میں حاضر ہو کر زانوئے تلمذتہ کرد کہ یہاں علوم و معارف کے چشمے اُبل رہے ہیں —— ہائے یہ "جہلِ خرد" اور اس کی فتنہ سامانیاں!

نئے جال لائے پرانے شکاری!

طلوعِ اسلام۔ ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں اسلم جے راجپوری نے بڑا تیر مارا ہے۔ کہ جامع ترمذی اور بخاری شریف کی چند صحیح حدیثوں کو "قرآنِ عزیز" کا مخالف بتایا ہے۔ حالانکہ وہاں نہ کوئی مخالفت ہے اور نہ تضاد۔ بلکہ عین مطابقت اور موافقت ہے۔ "تضاد" اور مخالفت جو کچھ ہے وہ جے راجپوری صاحب کے دماغ اور ذہن میں ہے۔ کہ وہ اسے قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں۔

ہم اس فرصت میں مولانا اسلم جے راجپوری کی بیان کردہ ۱۴ احادیث میں سے جنہیں اُنھوں نے قرآن کا مخالف یا دوسری احادیث سے متعارض بتایا ہے۔ یا علم و عقل کا مخالف ظاہر کیا ہے آج صرف پہلی تین حدیثوں کا مختصر سا ذکر کئے دیتے ہیں۔ تاکہ اس مزعومہ "مخالفت بالقرآن" کا پردہ چاک ہو جائے۔

(۱) واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ ط قال اولم تؤمن۔ قال۔ بلیٰ۔ ولٰکن لیطمئنّ قلبی۔

اور یاد کر اس واقعہ کو جبکہ ابراہیمؑ نے کہا۔ اے رب! دکھا مجھے۔ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا رب نے کیا تو اس پر ایمان نہیں لایا؟ کہا۔ ہاں لایا ہوں لیکن (چاہتا ہوں کہ اسے آنکھوں سے دیکھ لوں) تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

اب بخاری شریف کی حدیث میں ہے:۔ (بروایت ابوہریرہ رض)

نحن احق بالشک من ابراھیم اذ قال رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ ط قال اولم تؤمن۔ قال بلیٰ۔ ولٰکن لیطمئن قلبی۔!

ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ حقدار ہیں شک کے (یعنی اگر وہاں کوئی شک ہو سکتا تھا تو پھر ہم بھی شک کرتے۔ لیکن شک نہ وہاں تھا۔ نہ یہاں) جبکہ اُنھوں نے کہا۔ اے رب! مجھے دکھلا دے تو مردوں کو کیسا زندہ کرے گا۔ (آخر تک)

اب جے راجپوری کے اعتراض کا حاصل یہ ہے۔ کہ یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ ابراہیمؑ کو شک تھا۔ اور "قرآنِ پاک" نے "بلیٰ" کہہ کر اُن کا یقین ثابت کیا ہے۔ اور ویسے بھی مومنوں کو "احیائے موتےٰ" پر یقین و ایمان ہے۔ شک نہیں۔ ثم لم یرتابوا (پھر شک نہیں کیا) مومنوں کی شان میں قرآنی صراحت ہے۔ لہٰذا حدیث خلافِ قرآن اور خلافِ عقل ہے۔ کہ وہ اولوالعزم پیغمبروں کے متعلق شک کو ثابت کرتی ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست

حدیث میں تو عمدہ پیرایہ اور تعریض کی صورت میں شک کی نفی فرمائی گئی ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس درخواست کرنے میں کوئی شک نہیں تھا۔ محض مزید اطمینان مقصود تھا اور علم الیقین کے ساتھ عین الیقین جمع کرنا مطلوب تھا۔ تاکہ کافروں کے سوال کرنے پر کہ "کیا تم نے کبھی مُردہ زندہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟ یہ جواب دے سکیں: کہ ہاں میں نے آنکھوں سے بھی ایسا ہوتے دیکھا ہے۔"

حدیث بالا کے سلسلہ میں امور ذیل پر غور کرنا چاہئیے:-
(۱) حدیث میں ابراہیم علیہ السلام کے شک کا کوئی ذکر نہیں۔ محض تواضعاً و ادباً اپنے "احق بالشک" ہونے کا ذکر ہے۔
(۲) سامعین (صحابہ کرامؓ) اور سب مومنین اس بات کو بالیقین جانتے ہیں۔ کہ نبی اکرمؐ نے کبھی "احیائے موتے" کی رویت کا سوال بارگاہِ ایزدی میں نہیں کیا۔ بلکہ اس سلسلہ میں استدلال و نظر اور ایمان و عرفان کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام یا عزیر علیہ السلام کی رویت و شہادت (جس کا ذکر قرآنِ پاک میں ہے) آپؐ اور باقی سب انبیاءؑ اور ان کے متبعین کے لئے اطمینان و تسلّی کا موجب بنی۔
(۳) اب اِن دونوں باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے حدیث کا مطلب سمجھئے۔ فرما رہے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ ہمیں شک کرنے کا حق پہنچتا۔ لیکن واقعات بتا رہے ہیں اور تم دیکھ رہے ہو۔ کہ میں نے "احیائے موتے" کے بارے میں کبھی ادنیٰ سا شک بھی نہیں کیا۔ بلکہ ہمیشہ ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتا رہا:-

بلیٰ وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذلک علی اللہ یسیرۃ (تغابن)

ہاں، ہاں مجھے اپنے رب کی قسم تم سب ہی دوبارہ زندہ کرکے اُٹھائے جاؤگے۔ اور جو کچھ بھی تم نے کیا وہ سب تم کو بتایا جائے گا۔ اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر بڑی آسان ہے۔

جب میں نے شک نہیں کیا۔ تو جان لو کہ ابراہیم علیہ السلام بھی شک سے بالاتر ہیں۔ اور محض اطمینان کے درجے کے طالب۔ اور یہ بعینہٖ وہی مقصد ہے۔ جسے "قرآنِ پاک" بیان فرما رہا ہے۔ لہذا قرآن و حدیث مخالف نہیں۔ بلکہ موافق و بغلگیر ہیں۔ اور دشمن ان میں مخالفت ثابت کرنے میں ناکام و نامراد۔ اور خسر الدنیا والآخرۃ ط کے مصداق ہیں۔ والحمد للہ!

کلامِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوئی پرویزی یا جیراجپوری کلام تو ہے نہیں۔ بلکہ وہ "افصح العرب و العجم" کا جامع کلام ہے۔ جو مخصوص "طرزِ استدلال" اور "قوتِ بیان" کا حامل ہے۔ جو ان "منکرینِ حدیث" کے طویل اور لایعنی مباحث سے (جن کے یہ خوگر ہیں) کوئی مشابہت نہیں رکھتا بلکہ اس کا ہر انداز جداگانہ شان والا اور نرالا ہے۔ اور ان کے طبائع سے (جنہیں وہ کج بحثی سے بگاڑ چکے ہیں) ارفع و اعلیٰ ہے۔ لہذا ان کا اسے نہ سمجھنا یا سمجھکر دیدہ و دانستہ، جھٹلانا تعجب انگیز نہیں۔

؎ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

(۴) اس "صحیح توجیہ" کے علاوہ یہ توجیہ بھی درست ہے۔ کہ یہاں "شک" کا لفظ محض استعارۃً و مجازاً اُس حالت کے لئے استعمال ہوا ہے۔ جس میں انسان ایک بات کا یقین رکھتے ہوئے بھی اس کے لئے مزید اطمینان و عرفان کا طالب ہوتا ہے۔ سو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرما دی کہ ایسے اطمینان کے حاصل کرنے کی جیسے ابراہیم علیہ السلام کو ضرورت تھی ویسے (بلکہ اس سے زیادہ) ہم کو ضرورت ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ایمان کا درجہ اِذعان و ایقان سے بڑھ کر اطمینان و عرفان اور "معرفتِ اشیاء علی وجہ العیان" تک پہنچا ہوا ہے۔ اطمینان سے کم درجہ کو خواہ وہ ایمان

ویقین کا درجہ بھی ہو، اپنے علوِ مرتبت کے لحاظ سے شک کا درجہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس پر قانع نہیں ہوتے۔ تاآنکہ عین الیقین اور حق الیقین کا اطمینان بخش درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ خواصِ اُمت کے ایمان کا مقام اور ان کے یقین و اذعان کا درجہ انبیاء علیہم السلام کے ایمان و عرفان کی ابتدائی منزل ہے۔ اور قوت و رسوخ کے لحاظ سے انبیائے کرامؑ کا درجہ بلند تر ہے۔ پس "شک" کا لفظ "ایمان" کے مقابلے میں نہیں کیونکہ وہ تو محلِ بحث نہیں اس کا تو فیصلہ اولم تؤمن۔ قال بلیٰ سے قطعی ثبات سے دیا جا چکا ہے۔ بلکہ یہاں "شک" "اطمینان" کے مقابلے میں مستعمل ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شک کے ہم زیادہ حقدار ہیں یعنی اس کے ازالہ اور رفع کرنے اور اس کی جگہ اطمینان کا بلند مقام حاصل کرنے کے ہم زیادہ حقدار ہیں۔ یا بالفاظ دیگر یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ جس حالت کو ابراہیم علیہ السلام شک قرار دیکر (خواہ وہ ایمان کا درجہ بھی ہے) اس سے بلند تر مقام "اطمینان" کے طالب ہوئے۔ ہم زیادہ حقدار ہیں کہ اس حالت کو "شک" سے تعبیر کرتے ہوئے "درجۂ اطمینان و معرفت بالعیان" تک پرواز کریں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے ایمان کا بلند مقام یہی درجۂ "اطمینان" ہے۔ اس سے کم پر وہ قانع نہیں ہوتے جو بفضلہ تعالےٰ امام الانبیاء علیہ السلام کو بھی خلیل اللہ علیہ السلام اور انبیائےؑ سابقین کی طرح بوجہ اتم ایمان میں یہی "درجۂ اطمینان" حاصل ہے والحمد للہ ـــ یاد رکھئے گا کہ "عام ایمان" اور اس کا خاص اور بلند درجہ "اطمینان علی الایمان" کا ذکر اور اُن کا فرق تو اسی آیتِ زیرِ بحث میں بصراحت موجود ہے۔ قال اولم تؤمن ؟ قال بلیٰ۔ ولکن لیطمئن قلبی۔ دیکھئے ایمان کے ہوتے ہوئے اطمینان کے طالب ہیں جو انہیں عطا ہوا۔ پس رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے بھی "ایمان کے اندر اطمینان کے" رفیع ترین مقام پر پہنچکر اس سے کم کو اپنے حق میں "استعارۃً" "شک" سے تعبیر فرما کر اس سے اپنیؐ اور ابراہیم علیہ السلام کی کلی برارت کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پس "شک" کا خواہ کوئی معنیٰ ہو۔ اس کی نفی مقصود ہے۔ نہ اثبات۔ سبؐ کا مقصود "مقامِ اطمینان" ہے۔ جو بفضلہ تعالےٰ انہیںؑ حاصل ہے ـــ والحمد للہ۔

خلاصہ یہ کہ قوت و رسوخ کے لحاظ سے ایمان کے درجات متفاوت ہیں۔ اور ہر نچلا درجہ اوپر والے درجہ کے لحاظ سے "شک" سے مجازاً تعبیر کیا جا سکتا ہے (جہاں حقیقت میں کوئی ریب اور شک نہیں ہوتا) اور چونکہ انبیاء علیہم السلام کا منتہائے مقصود ایمان کا بلند ترین درجہ "اطمینان" ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے کمتر "مدارجِ ایمانیہ" پر وہ قانع نہیں ہوتے۔ بلکہ اسے "شک" سے تعبیر فرماتے ہوئے رسوخ و اذعان کے بلند مقام (اطمینان) پر جا کر دم لیتے ہیں۔ یہی تڑپ سیدنا ابراہیم ؑ میں بھی پائی جاتی تھی اور امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی تھی یہ اور بات ہے کہ ایک نے ربّ ارنی کیف تحیی الموتیٰ ؟ کہہ کر "اطمینان" کا سامان فراہم کیا۔ اور دوسرے نے "ربّ زدنی علماً" سے اس مقام کو سر کیا۔ راہوں میں چاہے قدرے اختلاف ہو۔ مگر نصب العین اور منزلِ مقصود ایک ہی ہے۔

(۵) ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے۔ اور وہ یہ کہ نحن احق بالشکِ (الحدیث) میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شک کا متعلق نہیں بتلایا۔ معترض اس بنا پر شک کو ایمان کے منافی معنی میں لیکر "احیائے موتیٰ" سے اسے متعلق کرتا ہے۔ حالانکہ یہ بات قطعاً مراد نہیں ہے۔

جیساکہ اوپر کی سطروں میں ہم پوری وضاحت سے اسے لکھ چکے ہیں۔ لہذا لفظ "شک" اگر ظاہری معنی پر بھی رکھا جائے تو یقیناً اس کا تعلق کسی ایسی چیز سے ہے جو ایمان و یقین کے منافی نہیں۔ مثلاً یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایک التجا بارگاہِ ایزدی میں رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ ط کہہ کر پیش کی۔ لیکن اللہ تعالےٰ جلّ شانہ کی "شانِ صمدیت و غناء" کے پیشِ نظر جب تک فخذ اربعة من الطیر ـــــ کا فرمان صادر نہ ہوا (یعنی چار پرندے لے لے ـــ الخ) تب تک اس بات کا کھٹکا تھا۔ کہ دیکھئے میری التجا کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اور اطمینان کا کونسا ذریعہ حاصل ہوتا ہے ـــ؟ اپنی آرزوؤں اور التجاؤں اور دعاؤں کی قبولیت اور عدم قبولیت کے بارے میں یہی اضطراب، شک یا بچینی اللہ تعالےٰ کے "عبادِ صالحین" کو لاحق رہتی ہے۔ اور باوجود "مستجاب الدعوات" ہونے کے اللہ کی بے نیازی سے ڈرتے رہتے ہیں۔ اور بحیثیتِ مجموعی نصرت و تائید الٰہی کا یقینِ کامل رکھتے ہوئے بھی اپنی ہر ایک دعا یا التجا کے متعلق یہ اندازہ نہیں لگاتے کہ خواہ مخواہ قبول ہوگی۔ جب تک کوئی دعا شرفِ قبولیت حاصل نہ کرلے تب تک تو فطرۃً ایک گونہ شک۔ تردد یا اضطراب اس کے متعلق رہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ معاملہ بہت اہمیت والا ہو۔ سو حاصل یہ ہوا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام جب، خوفِ خداوندی سے اپنی دعا یا التجا کے بارے میں شک کی سی صورت میں متردد و مضطرب رہ سکتے ہیں۔ تو ہم بھی اپنی نیک آرزوؤں اور دعاؤں کے بارے میں خدائے برتر و توانا پر کسی بات کو لازم و واجب نہیں ٹھہراتے۔ بلکہ نیازمندانہ التجا کے ساتھ ساتھ نتیجہ و مآل کے لئے بیتابانہ اشتیاق کے ساتھ منتظر رہتے ہیں۔ حاصل یہ ہے۔ کہ "شک" کا تعلق "احیائے موتیٰ" یا کسی "ایمانی اور دینی عقیدہ" سے نہیں۔ بلکہ اپنی التجا اور دُعا کے مآل، نتیجہ اور اس کے جواب کے متعلق ہے۔ کہ دیکھئے بارگاہِ شہنشاہی (جلّ مجدہٗ) سے کیا جواب ملتا ہے؟

واللہ اعلم بالصواب،

(۲) دوسرا اعتراض

ان زلزلۃ الساعۃ شیئ عظیم ۝ یوم ترونھا تذھل کل مرضعۃ عما ارضعت و تضع کل ذاتِ حملٍ حملھا۔ الآیہ (الحج)

بیشک قیامت کا زلزلہ بڑی چیز ہے۔ جس دن تم اس کو دیکھوگے (اس کی ہولناکی کے باعث) ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی۔ اور ہر حاملہ اپنا بچہ جن دیگی اور تو لوگوں کو مدہوش دیکھے گا۔ اور درحقیقت وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہوگا۔

رسول کریم ﷺ نے قیامت اور اس کے ہولناک زلازل، اور خطرناک احوال و شدائد کی تفصیل کے سلسلے میں اس آیۂ کریمہ کی مناسبت سے (سفر کے) ایک موقع پر ارشاد فرمایا:۔

اللہ عز و جل قیامت کے دن آدم علیہ السلام کو بلائیں گے "وہ لبیک و سعدیک" کہتے ہوئے حاضر ہوں گے۔ رب تعالیٰ بلند آواز سے انہیں حکم دیں گے۔ کہ اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ نکال لو۔ وہ عرض کریں گے۔ کس قدر؟ رب تعالیٰ اعلان فرمائے گا۔ ہزار میں سے ۹۹۹ تب حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔ اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ اور (اے دیکھنے والے) تو لوگوں کو مدہوش سمجھے گا ـــــ (آخر تک)

صحابہ کرام کو یہ خبر سخت گراں اور دشوار گزری۔ یہاں تک کہ ان کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ تب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (تسلی کے لئے) فرمایا (دیکھو) یا جوج ماجوج (تمہارے مقابلے میں، ہزار میں سے) ۹۹۹ ہیں۔ اور تم ایک ـــ (الحدیث)

(بخاری، مسلم، نسائی بروایت ابو سعیدرضؓ)

اب جے راجپوری صاحب کو حدیث پر اعتراض ہے۔ کہ یہ قرآن کی مخالف ہے ـ اعتراض کا ملخص یہ ہے:۔

(۱) قرآن میں ذہول اور وضع حمل کی علت زلزلہ کی ہولناکی ہے۔ اور اس روایت میں جہنم کا حصہ نکالنے کے حکم کی گرانی۔ قرآن میں اس کا وقت ہے۔ یوم ترونہا جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے۔ اور روایت میدانِ قیامت میں محاسبہ کا وقت اس کے لئے معین کرتی ہے۔ جہاں کسی زلزلہ کا ثبوت نہیں۔

(۲) قیامت میں مؤنثوں کے حمل کس وقت کے ہوں گے؟ جو گریں گے۔ اور کس لئے؟

(۳) "وضع حمل" سے مجازی معنیٰ "شدتِ خوف" (استعارۃً) لینے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ حقیقی معنیٰ بن سکتے ہیں۔

(۴) آیت سے "متبادر الی الذہن" یہ ہے۔ کہ یہ حالت دنیا میں نفخ صورِ اول کے وقت ہوگی۔ لیکن روایت (حدیث) اس کو نفخ صورِ دوم کے بعد میدانِ قیامت کا حال قرار دیتی ہے جو آیت کے سراسر خلاف ہے۔ اس لئے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہرگز نہیں ہو سکتا۔

جواب قرآن عزیز کی آیۂ مذکورہ میں ایک ہولناک واقعہ یعنی "زلزلۂ قیامت" اور اس کے خطرناک نتائج و شدائد کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور یہ احوالِ قیامت میں سے ہے۔ خواہ صورِ اول پھونکنے کے وقت ہو یا صورِ دوم کے وقت۔ اور حدیث مذکور نے بھی قیامت کے ہولناک واقعات میں سے ایک سخت یاس انگیز اور مصیبت خیز واقعہ کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ اولادِ آدمؑ میں سے ایک کے مقابلے میں (جو جنتی ہوگا) ۹۹۹ کو جہنم میں بھیجے جانے کا حکم ملے گا۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جیسا "زلزلۂ ساعت" اپنی ہولناکی کے باعث ذہول اور حمل

گر جانے کا باعث ہوگا- جہنمیوں کی اکثریت کے حق میں یہ اعلان بھی اس سے کچھ کم تباہی خیز ثابت نہیں ہوگا- یہ دونوں واقعات اُمورِ ذیل میں باہم مشابہت رکھتے ہیں:-
(۱) دونوں احوالِ قیامت میں سے ہیں- خواہ ایک (یعنی زلزلہ) شروع قیامت میں ہو اور دوسرا (مذکورہ اعلان) اس سے کچھ عرصہ بعد ہو-
(۲) دونوں واقعات سخت ہیبت اور عذابِ شدید کے مظاہر میں سے ہیں-
(۳) دونوں کے ہولناک نتائج کو قریب قریب الفاظ میں (یعنی حمل گر جانے وغیرہ سے) تعبیر کیا گیا ہے-

بس- بات اتنی سی تھی کہ چونکہ ان دونوں ہولناک واقعاتِ قیامت کو ایک دوسرے سے مشابہت تھی- اور ان میں کئی ایک باتیں مشترک تھیں- اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "آیتِ زلزلہ" کی تلاوت کے وقت اس سے مشابہ ایک اور ہولناک حالت کا ذکر فرمادیا ہے- تاکہ قیامت کی متعدد اور مبہم ہولناکیوں کا کچھ اندازہ کرایا جاسکے-

حدیث آیہ کریمہ کے الفاظ کی تفسیر اس طرح سے نہیں ہے- کہ دونوں ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں- بلکہ حقیقت یہ ہے- کہ یہ دونوں واقعات الگ الگ ہیں اور ان پر نتائج بھی علیحدہ علیحدہ مرتب ہوں گے- لیکن چونکہ یاس انگیزی اور ہولناکی میں ایک دوسرے سے بہت قریبی مشابہت رکھتے ہیں- اس لئے ایک کے ذکر کے وقت دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے- اور اس طرح گویا ایک واقعہ دوسرے کی تفسیر بن جاتا ہے- اسی قریبی مناسبت کی بنا پر محدثین رح اور مفسرین رحمہ نے "آیت مبارکہ" مذکورۃ الصدر کے ذیل میں "حدیث مبارک" بالا کو ذکر فرمایا ہے-

"وضعِ حمل" (حمل گر جانے) کو "آیۃ کریمہ" میں حقیقی معنی پر حمل کیا جاسکتا ہے- لیکن حدیث میں اس کا مجازی معنی "شدتِ خوف و ہراس" مراد ہے- کیونکہ "بخاری شریف" میں اس سے آگے کا جملہ "و یشیب الولدان" (اور بچے بوڑھے ہوجائیں گے) قرینۂ مجاز ہے- اور قرآنِ کریم میں بھی قیامت کے متعلق یوماً یجعل الولدان شیباً (مزمل) یعنی ایک ایسا دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا (سخت ہولناک ہوگا) وارد ہوا ہے-

قرآن نے ایک واقعہ بیان فرمایا ہے- اور حدیث نے ایک اور- لیکن چونکہ دونوں میں بہت کچھ قدرِ مشترک تھا اس لئے گویا ایک دوسرے کی تفسیر ٹھہرا-

دونوں میں ایک ہی واقعہ کا ذکر نہیں- وضع حمل کی علت جس طرح "زلزلہ" ہوسکتا ہے اسی طرح "اکثریت کے حق میں جہنمی ہونے کا اعلان" بھی اس کی علت بن سکتا ہے- زلزلہ کے وقت اگر یہ خوفناک حالت طاری ہوسکتی ہے- تو "اعلان بالا" کے وقت اس کا طاری ہونا بھی علم اور عقل کے عین مطابق ہے- پس حدیث قرآن کے عین موافق ہے-

معترض کا اعتراض اس پر مبنی ہے کہ حدیث میں جس "وضع حمل" کا ذکر ہے- یہ بعینہ وہی

ہے۔ جس کا ذکر قرآن میں ہے اور وہ نتیجہ ہے "زلزلہ" کا۔ اور حدیث اسے "اعلان" کا نتیجہ بتاتی ہے۔
جواب کا حاصل یہ ہے۔ کہ یہ دو الگ الگ نتیجے ہیں۔ الگ الگ واقعات کے۔ جو ایک ہی عبارت سے بیان ہوئے ہیں۔ اور چونکہ وہ واقعاتِ قیامت باہم مشابہ ہیں اس لئے ایک کو دوسرے کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ہر چیز اپنی نظیر سے متبیّن ہوتی ہے۔ والحمد للہ

قیامت کا دن بڑا لمبا ہوگا

یہ بات تو "قرآنِ عزیز" سے بصراحت ثابت ہے کہ قیامت کا دن بڑا لمبا یعنی پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ اور اس میں طرح طرح کے ہولناک احوال اور گوناگوں متخالف اور متشابہ مصائب و شدائد یکے بعد دیگرے پیش آتے رہیں گے۔ پس "زلزلۃ الساعۃ" یا نفخ صورِ اوّل کے وقت "شدّتِ عذاب" کے باعث "شدّتِ خوف اور سراسیمگی" کی یہ حالت ہوگی کہ دودھ پلانے والی اپنے بچہ کو بھول جائے گی۔ اور حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے اور لوگ مدہوش سے نظر آئیں گے۔ اور اولادِ آدمؑ میں سے ہر ہزار میں سے ۹۹۹ کو نفخِ صورِ دوم کے بعد میدانِ حشر میں جہنم بھیجے جانے کا "اعلان" بھی اتنا ہی ہیبت اور ہولناک ہوگا کہ اس کے سنتے ہی "شدّتِ خوف وہراس" کا وہ عالم ہوگا۔ اور سراسیمگی اور بدحالی کا وہ نقشہ ہوگا جس کی صحیح تعبیر ان الفاظ میں کی جاسکتی ہے۔ کہ "حمل والیوں کے حمل گر جائیں گے۔ اور بچے فوراً بوڑھے ہوجائیں گے اور لوگ عام مدہوشی کی سی حالت میں ہوں گے۔ لیکن حقیقت میں وہ مدہوش نہیں ہوں گے۔ بلکہ اللہ کے سخت عذاب کی شدّت کے احساس سے ان پر سُکر سا طاری ہوگا"

بات صاف ہے۔ اعتراض کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ حدیث میں "وضعِ حمل" کو مجازاً "شدّتِ خوف" کے لئے استعمال فرمایا گیا ہے۔ اور "قرآنِ عزیز" میں حقیقت و مجاز میں سے کوئی سا پہلو بھی لیا جاسکتا ہے۔ دونوں درست ہوسکتے ہیں۔ دونوں "ہولناک واقعات" میں شدّتِ مشابہت کی وجہ سے ان پر متفرع نتائج کو قریب قریب الفاظ میں پیش فرمایا گیا۔ اور اس قُرب و مشابہت کی وجہ سے ایک کو دوسرے کے لئے بمنزلہ تفسیر و تبیین قرار دیا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تیسرا اعتراض

ولقد آتینا موسیٰ تسعَ آیاتٍ بیّناتٍ (بنی اسرائیل)
اور یقیناً ہم نے موسیٰؑ کو کھلی نشانیاں دیں۔

سورۂ بنی اسرائیل کے علاوہ سورۂ نمل میں بھی "تسع آیات" کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ کہ ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف یہی نو نشانیاں دیکر بھیجا۔
اب یہ نشانیاں کیا ہیں؟ سورۂ اعراف میں "آیاتٍ مفصّلاتٍ" کے سلسلے میں یہ نو نشانیاں بتائی گئی ہیں:۔
عصا، ید بیضا، قحط، نقصِ ثمرات، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک، خون۔
لیکن ایک حدیث جسے امام احمدؒ، ترمذی وغیرہ نے بروایتِ عبداللہ بن سلمہ عن صفوانؓ بن عسال المرادی (صحابی) بیان کیا ہے۔ "تسع آیات" کے سلسلے میں حسب ذیل احکام کو (یہودی کے سوال کرنے پر) گنواتی ہے۔

۱. اللہ کا کوئی شریک نہ بناؤ، ۲. چوری نہ کرو، ۳. زنا نہ کرو، ۴. خونِ ناحق نہ کرو، ۵. جادو نہ کرو، ۶. سود نہ کھاؤ، ۷. کسی بے گناہ کو قتل کرانے کے لئے کسی صاحبِ اقتدار کے پاس اس کی چغلی نہ کھاؤ، کسی پاک دامن عورت پر تہمت نہ لگاؤ۔ یا فرمایا۔ میدانِ جنگ (جہاد) سے نہ بھاگو۔ (شعبہ راوی کو اس آٹھویں حکم میں شک ہے) اور اے یہود خاص تمہارے لئے ہے یہ (نواں حکم) کہ سبت کی بے حرمتی مت کرو۔

(منقول از تفسیر ابن کثیر جلد ۳ صفحہ ۶۷)

جیراجپوری صاحب کا اعتراض

حدیث بالا پر اسلم جے راجپوری صاحب کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ (۱) قرآن پاک "تسع آیات" کی تفصیل عصا، ید بیضا، قحط وغیرہ (حسب تفصیل سابق) بتاتا ہے۔ اور حدیث میں اُس کی تفسیر مذکورہ بالا نو احکام سے کی گئی ہے۔ لہذا حدیث قرآن کی مخالف ہے۔ اور اس وجہ سے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

(۲) یہ نو نشانیاں موسیٰ علیہ السلام کو اس وقت مل چکی تھیں جبکہ انہیں فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا۔ اور اس وقت تک توریت شریف اور اس کے احکامِ عشرہ (ایک کی زیادتی سے اصل نو احکام دس ہو گئے۔ ارشد) نازل بھی نہیں ہوئے تھے۔ سو یہ کیسے ممکن ہے کہ اُن "نو نشانیوں" کی تعبیر احکام مذکورہ حدیث سے کی جائے۔

جواب

اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو حافظ ابن کثیر رحمہ نے اپنی تفسیر میں اسی "آیت" کے تحت دیا ہے۔ کہ حدیث صحیح ہے۔ راوی عبد اللہ بن سلمہ کے حفظ میں "کمی" کے باعث اس میں اشکال سا پیدا ہو گیا ہے۔ کہ "آیاتِ تسعہ" "احکامِ عشرہ" کے ساتھ (جو وصایائے توریت ہیں) اُن پر مشتبہ ہو گئے ہیں۔ یہودیوں نے "احکامِ عشرہ" کے متعلق دریافت کیا اور ان کو تسلی بخش جواب مل گیا۔ جس پر (وہ دونوں یہودی) آپؐ کے ہاتھ پاؤں کو بوسہ دینے لگے اور آپ کی نبوت کی شہادت دی۔ (لیکن ایمان اور اتباع سے یہ عذر پیش کر کے باز رہے کہ یہودی ہم کو قتل کر دیں گے) راوی عبد اللہ نے "احکامِ عشرہ" کی بجائے اس حدیثِ نبویؐ کو "تسع آیات" کے ساتھ چسپاں کر دیا ہے۔ کہ یہودیوں نے "تسع آیات" کے متعلق دریافت کیا اور آپؐ نے اُن کو یہ جواب دیا۔ حدیث اپنی جگہ صحیح ہے۔ اور واقعہ سچا ہے۔ صرف اس کا تعلق بتلانے میں "وہم" ہو گیا ہے۔ کہ اس کا تعلق "احکامِ عشرہ" سے ہے۔ نہ کہ "آیاتِ تسعہ" سے۔

(تفسیر ابن کثیر رحمہ جلد ۳ صفحہ ۶۷)

لیکن جے راجپوری صاحب کہتے ہیں "کہ اس حدیث کا صحیح ہونا ممکن ہی نہیں" ——

کیا یہ دیانتداری ہے؟

اغلب یہ ہے۔ کہ حدیثِ بالا پر اعتراض تفسیر ابن کثیر وغیرہ دیکھ کر کیا گیا ہے۔ لیکن وہاں جو جواب درج ہے۔ اُس کے ذکر کر دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اسی طرح دوسری احادیث پر بھی جو اعتراضات کئے

گئے ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر تفاسیر اور شروح احادیث کی کتابوں سے لئے گئے ہیں۔ جہاں ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی درج ہیں۔ اور اس "ظاہری تعارض" کو رفع کرنے کے لئے "وجوہِ مطابقت" ساتھ ہی بیان کردیئے گئے ہیں۔ لیکن معترض کی دیانتداری ملاحظہ ہو۔ کہ انہیں اس انداز میں پیش کرتا ہے۔ کہ گویا یہ اعتراضات اس کی اپنی "تحقیقات" اور "کاوشِ دماغ" کا نتیجہ ہیں۔ اور لاینحل ہیں۔ وہ نہایت بے باکی سے اعتراض تو (نقل کرکے) جڑ دیتا ہے۔ لیکن جواب کو چھپا لیتا ہے۔ تاکہ "کم علم عوام" یہ سمجھیں۔ کہ واقعی سوال لاجواب اور اعتراض لاینحل ہے۔ اور احادیث (معاذ اللہ) لائق اعتماد اور قابلِ وثوق نہیں۔ گویا وہ "تخریب" میں اتنا منہمک ہے۔ کہ "تعمیر" کی طرف سے یکسر غافل ہے۔ وہ بگاڑنا جانتا ہے۔ سنوارنے سے اسے کوئی سروکار نہیں۔

ان لوگوں کا مقصد یہ ہے

کہ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و آثارِ صحابہؓ کو درمیان میں سے ہٹا کر "آیاتِ قرآنی" سے جیسا کھیل چاہیں کھیل سکیں، اور "اسالیبِ عربیت" سے بھی قطع نظر کرکے "اپنی خواہشات" کو "قرآن" بتانے کے مواقع مہیا کرسکیں۔ کیونکہ حدیث اور فقہِ اسلامی کے ہوتے ہوئے (جو قرآن اور دینِ حق کی صحیح اور معیاری علمی و عملی تفسیر و تبیین ہیں) ان کو "دین" کے ساتھ اور "قرآن" کے ساتھ "من مانی کارروائی" کا موقع نہیں مل سکتا۔ لیکن کیا اب ان کو اس "بدترین مقصد" میں (جو "فتنۂ قرآن پاک" کے نام سے اُٹھایا گیا ہے۔ اور جس میں قرآن کی معنوی تحریف سے "دینِ حق" کا تمسخر اُڑایا گیا ہے) کامیابی ہوگی؟ حاشا وکلاّ!!

بجز بے عمل، بدکردار اور بدعقیدہ "نام نہاد مسلمان" کے جو در پردہ "ملحد" ہوگا۔ اور "مذہبِ حق" کے عملی ارکان و فرائض (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ) میں پیہم کوتاہی برتے گا۔ کوئی "سمجھدار مسلمان" ان کا ہمنوا نہیں ہوسکتا۔

کہنے کو تو یہ لوگ کہتے ہیں۔ "قرآن کافی ہے" لیکن ان کا "سارا لٹریچر" صاف بتاتا ہے۔ کہ وہ "اپنی خواہش" اور "اپنی بودی تحقیقات" کے سوا کسی چیز کو نہیں مانتے۔

تحقیقی جواب

دوسرا تحقیقی جواب یہ ہے۔ کہ "آیات" آیۃ۔ کی جمع ہے۔ اور "قرآنِ عزیز" میں "آیۃ" کا لفظ چند معنوں میں مستعمل ہے۔ مثلاً "قرآنی آیت" "نشانِ صداقتِ پیغمبر" "نشانِ قدرتِ اللہ عزوجل، حکمِ خداوندی۔ اور معجزہ وغیرہ۔ پس "تسع آیات" کے اندر جہاں معجزات اور نشانہائے صداقت (عصا، ید بیضا وغیرہ) مراد ہیں۔ وہاں نو احکام (جو بعد میں ایک کے اضافہ سے دس کردیئے گئے۔ اور وہ ایک غالباً ہمسایہ کے ساتھ حسنِ سلوک سے متعلق ہے) بھی مراد ہیں۔ جو بوقت بعثت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے۔ اور بعد میں تورات شریف کے اندر بھی نازل کئے گئے کیونکہ کوئی پیغمبر خالص توحید اور عمدہ اخلاق کی دعوت کے بغیر مبعوث نہیں ہوا۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت ط

(نحل) ہم نے ہر امت کے اندر رسول بھیجا۔ کہ ایک اللہ کی بندگی کرو۔ اور (بہکانے والے) شیطان سے دور رہو۔

خود موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے :-

اذھب الیٰ فرعون انہٗ طغیٰ ○ فقل ھل لک الیٰ ان تزکیّٰ ○ واھدیک الیٰ ربک فتخشیٰ ○ (النازعات)

(اے موسیٰؑ!) فرعون کی طرف جا۔ وہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اُسے کہہ۔ کیا تو چاہتا ہے۔ کہ (شرک و معصیت چھوڑ کر) سنور جائے؟ اور میں تجھے رب تعالیٰ کی راہ بتلاؤں پس (اس کی نافرمانی سے) ڈر جائے۔

تزکیہ، ہدایت اور خشیۃ کے اندر عقاید اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے سب اصولی احکام اور بنیادی واجبات (اوامر و نواہی) مندرج ہیں۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ فرعون کی طرف بعثت کے وقت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معجزات اور دلائل و براہین صداقت کے ساتھ دین کے بنیادی احکام بھی دیئے گئے ہوں۔ اور "بنی اسرائیل کی آزادی" کے مطالبے کے ساتھ فرعون اور اس کے متبعین کی اصلاح بھی مقصود ہو۔ اور وہ یہی نو حکم (حسب تفصیل سابق) ہوں، جو بعد میں ایک کے اضافہ سے "احکامِ عشرہ" (یا وصایائے توراۃ) کے نام سے مشہور ہوئے۔

آیۂ آؤس جہاں "تسع آیات" سے "آیاتِ مفصلات" جن کی تفصیل سورۂ اعراف میں (عصا، ید بیضا، قحط وغیرہ) آچکی ہے۔ مراد ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح اس سے "احکام تسعہ" بھی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ اور یہود کا سوال معجزات کے متعلق نہیں تھا۔ کیونکہ ان کی تفصیل تو مکی آیات (سورۂ اعراف) میں آچکی تھی۔ اور وہ حد شہرت کو پہونچ چکے تھے۔ بلکہ ان کا سوال "احکامِ تسعہ" (وہی ایک کے اضافے سے احکام عشرہ) کے متعلق تھا۔ کہ دیکھئے "نبی اُمی" صلعم جو توراۃ پڑھے ہوئے نہیں ان احکام کی تفصیل بتاسکتے ہیں یا نہیں ـــــ درآیت چونکہ دونوں کی محتمل ہے۔ اس لئے آیت کے تعلق میں احکام کی تفصیل بتانا درست ہے۔ اس طرح آیت اور حدیث ایک دوسرے کے عین مطابق ہیں۔ عبداللہ بن سلمہ راوی حدیث کو اس میں کوئی [illegible] نہیں ہوا۔ اور نہ اس نے خلط ملط کیا ہے۔ حدیث صحیح ہے اور قرآن کی آیت بالکل مطابق۔

پس معلوم ہوا کہ امام ترمذی کا اس حدیث کو "حسن صحیح" کہنا "محققانہ فکر و نظر" کا نتیجہ ہے۔ اور درست ہے۔ الحمد للہ۔

رہا یہ سوال۔ کہ حدیث میں ہے۔ سود نہ کھاؤ۔ جادو نہ کرو۔ میدانِ جہاد سے نہ بھاگو۔ اور موجودہ تورات (بائبل) میں ان کی جگہ تین اور حکم ہیں :-

جھوٹی قسم نہ کھا، ماں باپ کو عزت دے۔ اپنے ہمسایہ کی جورو کو مت چاہ۔ تو اس اختلاف کا جواب یہ ہے۔ کہ ان کتابوں میں قرآن پاک کی صراحت کے مطابق بہت کچھ تحریف ہوئی ہے۔ لہذا حدیث

ل اور وہ اس طرح کہ "آیات" سے مراد "نشانہائے صداقت" ہوں عام ازیں کہ وہ معجزات ہوں یا احکام حقہ و صادقہ خداوندی۔ کہ ایسے "سچے احکام" کا لانا بجائے خود "مستقل نشانِ صداقت" ہے ـــــ ارشد

صحیح ہے۔ اور اشکال سے خالی۔ اور اس پر اعتراض لائق التفات نہیں۔

ہم نے اوپر جن حدیثوں کے بارے میں گفتگو کی ہے اُن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ کہ قرآن کی آیتوں اور ان حدیثوں کے درمیان تضاد نہیں پایا جاتا، تضاد اور مخالفت کا یہ وسوسہ "منکرین حدیث" کے ذہنوں کا پیدا کیا ہوا ہے، یہ لوگ اسی قسم کے الزام تراشتے رہتے ہیں، اُن کا کام اور مشن ہی یہ ہے کہ حدیثوں کے بارے میں شبہات پیدا کریں اور انشاپردازی کے زور سے رسول اللہ کے ارشادات کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنادیں۔

"فتنۂ انکارِ حدیث" کا شکار وہی لوگ ہو سکتے ہیں اور ہو رہے ہیں جو نبوت ورسالت کے منشاء اور اُس کے منصب ومقام سے بے خبر ہیں، جو "دین" میں اپنی خواہشوں کے مطابق رخصتیں اور سہولتیں چاہتے ہیں اور جو سیّد الاولین والآخرین سیدنا وشفیعنا حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو ایک "ریفارمر" سمجھتے ہیں ـــــــ مگرجس مردِ مومن کا "وجدان" منصبِ نبوت کو پہچانتا ہے، جس کی فطرت کو دین سے مناسبت ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے رسول اللہ کی ذاتِ اقدس پر اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا اور اللہ کے بعد تمام عزتیں حضورؐ ہی کو سزاوار ہیں اور سرکارؐ ہی کی گرامی شخصیت حق وصداقت کا معیار ہے، وہ اس فتنہ (انکارِ حدیث) سے انشاء اللہ محفوظ رہے گا اور ابلیس کی یہ نازک اور پُرپیچ چالیں اُسے اپنے دام میں نہ لاسکیں گی!

مکاتیبِ حبیب

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم کے خطوط

مولانا مسعود عالم ندوی کے نام

[نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کے چند غیر مطبوعہ خطوط یہاں درج کیے جاتے ہیں، یہ خطوط اگرچہ بہت زیادہ مختصر ہیں مگر اِن سے خط لکھنے والے کے ادبی ذوق اور علمی شغف کا پتا چلتا ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شیروانی مرحوم خطوں میں کام کی باتیں لکھا کرتے تھے، اور ذراسی بات کو طول دیکر افسانہ نہ بناتے تھے۔

مولانا مسعود عالم ندوی (جن کے نام یہ خط ہیں) کی شخصیت علمی دنیا میں کسی خاص تعارف کی محتاج نہیں ہے، دارالعلوم ندوہ جن چند شخصیتوں پر ناز کرسکتا ہے، اُن میں سے ایک شخصیت مولانا مسعود عالم ندوی کی بھی ہے!

مولانا موصوف عربی کے بہترین انشاپرداز ہیں ان کے مضامین مصر و شام کے مشاہیر ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کرچکے ہیں اور ہم سے عربی زبان و ادب کے مستند ماہرین نے کہا ہے کہ مولانا مسعود عالم ندوی عربی انشاپردازی میں "ہندوستان کے شکیب ارسلان ہیں ——"!

مولانا موصوف کو ترقی اور نمود حاصل کرنے کے بہت سے مواقع حاصل تھے مگر اللہ تعالےٰ نے اُن کو "جماعتِ اسلامی" کی رفاقت اور مساعدت کی توفیق وسعادت عطا فرمائی، انھوں نے اپنا "علم" شہرت و نمود اور جاہ و منصب ...... کی طلب میں ضائع نہیں کیا، وہ اُس سے خدمتِ دین کا کام لے رہے ہیں، صحت انتہائی خراب ہے، ضیق النفس کے دورے پڑتے ہیں تو بعض اوقات دیکھنے والے اُن کی زندگی کے بارے میں اندیشہ محسوس کرنے لگتے ہیں —— مگر یہ مردِ مجاہد اس عالم میں بھی اسلام کی خدمت سے غافل نہیں رہتا،

کاش! ہماری قوم میں بہت سے "مسعود عالم" ہوتے!] م - ق

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو ندوہ میں بارہا دیکھنے کا اتفاق ہوا، پر گفتگو اور ملاقات کے مواقع دیر میں میسر آئے۔ وہ دارالعلوم میں ایک افسر کی حیثیت سے آتے اور عام طور پر طلبہ کو ان سے ملنے جلنے کا موقع کم ہی ملتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اخلاق، میانہ روی اور مرنجان مرنج روش کا ہم لوگوں پر بڑا اثر تھا۔ ندوہ کی سیاسیات میں وہ "سمجھوتہ" کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ نصابِ تعلیم اور مروجہ نظام کے اصلاح کے باب میں وہ استاذ الاساتذہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی روش پر تھے، اور اس لئے ہم لوگوں میں محبوب و مقبول —— ان کی ایک تقریر کسی طرح نہیں بھولتی۔ تقریباً بیس برس ہوگئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی بات ہے۔ ندوہ میں معقولات کا یونانی اثاثہ اور

معقولیوں کے طرز پر لکھی ہوئی نحو و معانی کی کتابیں[1] پسند نہیں کی جاتی تھیں۔ مگر بعض مدرس اور معلم ان اوراق پارینہ کے شیدائی تھے۔ دارالعلوم کے شاندار ہال میں مولانا شیروانی کی اسی موضوع پر زوردار تقریر ہوئی اور ایسی کہ مخالفوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں ——————

یہ پہلا دن تھا کہ شیروانی صاحب کا علمی وقار و دبدبہ راقم نے محسوس کیا، جس کا اثر آج تک باقی ہے۔

اس کے بعد ۳۲ء میں راقم نے ماہانہ عربی رسالہ "الضیاء" جاری کیا، تو مرحوم سے کبھی کبھی مراسلت ہونے لگی۔ کبھی نقد و نظر کبھی داد و تحسین، اور کبھی عام مشوروں سے مستفید فرماتے۔ افسوس کہ اس دور کے خطوط "الضیاء" کے دفتر میں دوسرے کاغذات کے ساتھ ضائع ہو گئے۔

ان ہی دنوں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی پر مرحوم کا مقالہ شائع ہوا، جو علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ والد ماجد مولانا عبدالشکور مدظلہ (مولود ۱۲۹۰ھ) بھی درس لطف اللہی سے فیض یاب ہیں۔ اس لئے راقم کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ ایک دن موقع پاکر نواب صاحب سے عرض کیا اور والد ماجد مدظلہ کی زبانی سنی ہوئی بعض باتیں بیان کیں، تو بہت خوش ہوئے —————— یہ پہلا باضابطہ تعارف تھا۔

۲

دسمبر ۳۷ء میں راقم ندوہ چھوڑ کر پٹنہ چلا آیا اور وہیں خدابخش اورینٹل لائبریری میں ملازمت کر لی۔ راقم لائبریری میں تقریباً سات سال رہا۔ یہ خطوط (ایک کو چھوڑ کر) سب اسی دور کے ہیں۔ شیروانی صاحب کو کتاب خانوں سے عشق تھا۔ خود بھی ایک بے مثال کتاب خانہ کے بانی اور مالک تھے۔ خدابخش خاں، پٹنہ لائبریری کے بانی سے ان کی ذاتی راہ و رسم بھی تھی ان کے زمانے میں مرحوم پٹنہ کی عزت افزائی کر چکے تھے۔

راقم کے قیام پٹنہ کے دوران میں شیروانی صاحب صرف ایک مرتبہ تشریف فرما ہوئے، مگر ان چند دنوں کی بعض غیر فانی صحبتیں نہیں بھولتیں۔ افسوس جو جگہیں خالی ہوتی ہیں، وہ پُر نہیں ہوتیں۔ جو تہذیب مٹ رہی ہے، وہ خواب و خیال ہو جائے گی۔ جو نقش اُبھر رہا ہے، اسے اپنے ماضی سے دور کی بھی نسبت نہیں۔

شیروانی صاحب، ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔ اکتوبر ۳۸ء کا ذکر ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بڑے طمطراق سے ہو رہا تھا۔ استاذِ محترم حضرت سید صاحب قبلہ (مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ) بھی تشریف فرما تھے، اور حسب معمول مولانا ریاض حسن خاں خیال کے ہاں قیام تھا۔ محب عزیز علی میاں (مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی) نے بھی تکلیف کی تھی اور وہ اپنے بچھڑے ہوئے دوست اور نیازمند کے ہاں فروکش تھے۔ کانفرنس تو خیر جیسی بھی رہی اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ مقالات کے شعبے میں راقم نے "خدابخش لائبریری" پر ایک تحریر پیش کی تھی، جسے علی میاں نے پڑھ کر سنایا۔ خاص صحبتیں مولانا ریاض حسن خاں کے دولت کدے پر منعقد ہوئیں۔ ریاض حسن خاں صاحب، مولانا شبلی کے خاص دوستوں اور قدردانوں میں تھے اور ان کی یہ وضعداری حلقہ شبلی کے تمام وابستگان کے ساتھ قائم رہی۔ سید صاحب قبلہ تو خیر، اس چمنستان کے گل سر سبد ہی تھے، شہر میں قریبی عزیزوں کے ہوتے ہوئے

[1] جیسے شرح جامی اور مختصر المعانی

ہمیشہ انہیں کے ہاں ٹھہرتے۔ یہ گنہگار بھی اپنی فقیری اور بے نیاز طبیعت کے باوجود ان کی کوٹھی پر ہفتہ وار حاضری ضرور دیتا۔ شیروانی صاحب تشریف لائے، تو پھر کیا کہنے؟ حسنِ محبت، حسنِ اخلاق، حسنِ مدارات اور حسنِ کلام کے ایسے مرقعے دیکھنے میں آئے کہ باید و شاید۔ وہ شام کبھی نہیں بھولے گی، جب شیروانی صاحب، اپنی پوری "شخصیت" کے ساتھ ریاض حسن خاں صاحب کے بنگلے پر تشریف لائے۔ دونوں بھائیوں (اعجاز حسن خاں اور ریاض حسن خاں) کا عجیب عالم تھا اپنی کبر سنی کے باوجود فرش راہ ہوئے جاتے تھے۔ "آنکھیں بچھانا" اور "فرش راہ" ہونا کہیں مجاز ہوگا، مگر یہاں حقیقت تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اور عش عش کر رہا تھا کہ دونوں بھائی کس طرح بچھے جا رہے ہیں۔ مجلس میں سید صاحب، مولانا تمنا عمادی، شاہ حسین میاں مرحوم پھلواروی، اور متعدد اہلِ علم و فضل موجود تھے، مگر حسن اخلاق اور حُسنِ ملاطفت کے ان پیکروں کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ مسعود بے نوا اور علی باصفا کا کیا ذکر، ہمارے بڑے (سید صاحب قبلہ) بھی وہاں چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ ہائے کیا لوگ تھے!

بات پر بات نکلتی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور دلچسپ صحبت کا ذکر کرکے یہ تحریر ختم کرتا ہوں۔ علی میاں کو کتاب خانہ کے نوادر کا شوق تھا۔ اطمینان تھا کہ چلتے چلتے دیکھ لیں گے۔ راقم کے ہوتے ہوئے کیا مشکل؟ حُسنِ اتفاق سے ایک شام کو ادھر سے گزر ہوا۔ تو کتاب خانہ خلافِ معمول کُھلا نظر آیا۔ باہر دو تین موٹریں جانی پہچانی نظر آئیں۔ میں نے کہا:۔ "علی میاں! موقع اچھا ہے۔ شیروانی صاحب اور ریاض حسن خاں صاحب وغیرہ کتاب خانہ کا معائنہ کر رہے ہیں۔ لطف آجائے گا:۔" بس، پھر کیا تھا۔ ہم دونوں دبے پاؤں اندر پہونچے۔ چپراسی کو اشارہ کیا۔ دو اور کرسیاں گول میز کے گرد رکھ دی گئیں۔ ہم دونوں مؤدبانہ سلام کرکے بیٹھ گئے۔ شیروانی صاحب کی نگاہ اُٹھ گئی۔ بڑی شفقت سے بولے:۔ "علی! تم ادھر آؤ" اور "مسعود! تم ادھر آؤ" اور ہم دونوں کو دو بچوں کی طرح دائیں بائیں بٹھا یا۔ اور کتابیں دکھانے لگے، نکتے کی باتیں بتاتے اور خاص انداز میں پوچھتے:۔ "کہو! شیروانی کی ضرورت باقی ہے"؟ ——— یہ سلسلہ ذرا دراز ہوا اور کتاب خانہ کے سکرٹری اُکتانے لگے۔ دوسرے انہیں کچھ حیرت بھی تھی۔ وہ راقم سے خاصے مرعوب تھے۔ وہ سوچنے لگے:۔ "یہ ندوی تو دوسروں کی رہنمائی کرتا ہے۔ مخطوطات کے شعبہ کا انچارج ہے۔ اسے نواب صاحب کیا بتائیں گے"؟ آخر ان سے نہ رہا گیا اور بول اُٹھے، "نواب صاحب" ندوی تو یہاں کیٹلاگر ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔ شیروانی صاحب خاص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے:۔ "یہ آپ کے ہاں کیٹلاگر ہے۔ ہمارے ہاں نہیں"۔

باتیں کہنے اور سننے کی بہت ہیں، پر اب وہ بساط ہی اُلٹ گئی۔ کہاں ندوہ اور کہاں پٹنہ کی یگانہ روزگار لائبریری اور کہاں مسعود بے نوا! اللہ بس باقی ہوس!

(مسعود عالم ندوی)

CATALOGUER

ol -

حبیب گنج - ضلع علی گڑھ
۲۸ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

عزیز القدر سلمہٗ السلام علیکم و رحمۃ اللہ

خدابخش خاں لائبریری میں ایک نسخہ دیوانِ حافظ کا ہے، جس پر شاہانِ چغتائیہ[1] نے اپنی فالیں لکھی ہیں کہ کس موقع پر فال دیکھی - کیا فال نکلی -

میں چاہتا ہوں کہ صرف وہ غزلیں جن کا فال سے تعلق ہے مع عبارت شاہی یہاں کے لئے نقل کرادی جائیں - خوش خط ہوں - اُجرت ادا کر دی جائے گی -

اس طرح نقل ہو، تو بہتر ہو گی -

(عبارت فال) غزل علیٰ ہذا القیاس

جواب سے ممنون کیجئے - اُمید ہے کہ آپ مع الخیر مصروفِ مشاغلِ مفیدہ ہوں گے -

الحمد للہ یہاں خیریت ہے - نیاز کیش :-

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج - ضلع علی گڑھ
۱۶ر نومبر ۱۹۳۸ء

عنایت فرما السلام علیکم

عنایت نامہ کا شکر - فالیں نقل ہو کر آگئیں - شکر مکرر - اُجرت جو طے ہوئی ہو، لکھیے تاکہ بھیج دی جائے -

میں نے نقل پر آپ کے اہتمام نقل کی یادداشت لکھدی ہے، تاکہ یادگار رہے -

الحمد للہ مع الخیر ہوں - مسٹر شہاب الدین[2] خدابخش خاں کو میرا اسلام شوق - موصوف کے اخلاق کا نقش

ایک فال کا عنوان ہے "بجہت کسی خان عالم کہ حافظ حسن نام داشت الخ"

یہ دیکھیے کہ زیرِ خط کشیدہ لفظ یہی ہے یا اور کچھ - اس موقع پر "کس" کا مفہوم ذہن میں نہیں آیا -

زحمت دہی معاف ہو - حبیب الرحمٰن

حبیب گنج - ضلع علی گڑھ
۲ر دسمبر ۱۹۳۸ء عید مبارک

عنایت فرما السلام علیکم

شکر یادآوری - "کس" کے معنی میں نے بھی قیاساً خادم ہی تجویز کیے ہیں - اس قیاس سے کہ جب یہ کہیں (اُردو میں) حامد کا آدمی آیا تھا تو خادم مراد ہو گی -

---

[1] شاہان مغلیہ - زیادہ تر فالیں جہانگیر کی ہیں -
[2] بانی کتاب خانہ خدابخش خاں مرحوم کے منجھلے بیٹے - عرصہ ہوا، ان کا بھی انتقال ہو چکا -

کتابت کی اُجرت آپ تجویز کیجئے - نیز مصارف ڈاک لکھئے - مولوی ریاض حسن[۹۱] صاحب کی علالت کا علم پہلے سے تھا - ان کے بھائی سے مراسلت تھی - آپ کے خط میں "بہت علیل ہیں" پڑھ کر تردد ہوا - اعجاز حسن صاحب کو خط لکھا ہے - آپ بھی حال لکھیں - شفاہ اللہ تعالیٰ - علمی ذوق کے لحاظ سے اُن کی ذات بیش بہا سرمایہ ہے

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج - ضلع علی گڑھ
۱۸ر جنوری ۱۹۳۹ء

عزیز القدر　　مولوی مسعود عالم صاحب

السلام علیکم - سردار سرور خاں گویا[۹۲] افغان اکیڈمی کے لٹریری سیکشن کے ڈائریکٹر، ہندوستان کتاب خانوں کے شوق میں آئے ہیں - پٹنہ تشریف لا رہے ہیں - ظاہر ہے کہ آپ کی توجہ کارفرما ہوگی -
شرف[۹۳] الدین صاحب (فرزند مولوی خدابخش صاحب مرحوم) انچارج لائبریری سے تعارف کردیجئے میری جانب سے بھی -

حبیب الرحمٰن

گرامی قدر　السلام علیکم -　مولوی ریاض الحسن خاں صاحب اور ان کے بھائی صاحب کی علالت کی خبریں پھر آرہی ہیں - آپ تھوڑی سی تکلیف کریں - میری جانب سے جاکر مزاج پرسی کیجئے، اور کیفیت مجھ کو لکھئے - آمد و رفت کا صرفہ میرے ذمہ رہے - اُمید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے - الحمدللہ یہاں خیریت ہے -

حبیب الرحمٰن

۱۵ر فروری ۳۹ء

حبیب گنج - ضلع علی گڑھ　۸۶
۱۱ر اگست ۱۹۳۹ء

عزیز القدر مولوی مسعود عالم صاحب ندوی

السلام علیکم - پٹنہ لائبریری میں منجملہ کلام حاجی محمد جان قدسی مشہدی اُن کی مثنوی ظفرنامہ شاہجہانی ہے، جو فتوحِ شاہجہانی پر نظم کی گئی - ناقص رہی - کلیم نے اُس کی تکمیل کی - کلیاتِ قدسی یا دیوانِ قدسی کے ساتھ ایک نثر ہے جس میں قدسی کے حالات ہیں - ان دونوں کی نقل مطلوب ہے - کیا آپ کی توجہ سے یہ ممکن ہے ؟ ہے، تو اُجرت وغیرہ کا تخمینہ کیا ہوگا ؟
الحمدللہ بخیریت ہوں - آپ کی عافیت کا طالب - سکرٹری صاحب کتاب خانہ کی خدمت میں سلام رساں -

والسلام -　　حبیب الرحمٰن

---

[۹۱] مولانا ریاض حسن خاں خیالؔ (درسولپور - منظفرپور - بہار) کا شمار اس دور کے مغتنمات سے ہے - مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے خاص دوستوں اور قدردانوں میں تھے - اسی نسبت سے مولانا شروانی سے بھی راہ و رسم تھی - یہ دو بھائی تھے - بڑے کا نام اعجاز حسن تھا - دونوں علم و ادب کے ہر شعبے میں بحرِ ذخار - بڑے کی وفات پٹنہ میں ہوئی (۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء) - ریاض حسن خاں صاحب غالباً ابھی بقیدِ حیات ہیں - ملک کی تقسیم اور انقلاب نے ایسا شیرازہ منتشر کردیا کہ اب بزرگوں کی خیریت بھی نہیں معلوم ہوتی [۹۲] آقائے سرور خاں گویا کابل کے مشہور ادیب و نغز گو شاعر [۹۳] شہاب الدین صاحب مرحوم کا نام شرف الدین لکھ گئے ہیں ؎

۱۸ ستمبر ۱۹۳۹ء

گرامی قدر مولوی مسعود عالم صاحب سلمہٗ

السلام علیکم۔ غلام مصطفےٰ خاں ایم۔ اے پروفیسر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی علم و تحقیق کے شائق ہیں۔ اس لئے مجھ کو عزیز ہیں۔ یہاں قیام کرکے اس کا ثبوت دے گئے ہیں اور لے گئے ہیں۔ سید حسن غزنویؒ کے کلام کا ریسرچ کر رہے ہیں۔ اسی سلسلے میں پٹنہ آئیں گے، میرے اس تعارف کے ساتھ۔ آپ جس قدر ان کو مدد دیں گے۔ میرا دل خوش ہوگا۔ ان کی احتیاط پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ——— کرم فرما سکرٹری صاحب کی خدمت میں سلام شوق۔

نیاز کیش: حبیب الرحمٰن

۷۸۶

گرامی قدر سلمہٗ۔ السلام علیکم

غلام مصطفےٰ خاں کا خط آیا۔ آپ کے حسن سلوک کے مداح ہیں۔ جزاک اللہ تعالیٰ خیرا۔

صبح صادق مؤلفہ محمد صادق اصفہانی کے بہت مداح ہیں۔ ضخیم کتاب۔ نقل ہو، تو کیا اجرت ہوگی۔ سرسری تخمینہ بتا دیجئے۔

بخیریت ہوں۔ طالب خیریت ہوں۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ محمد حبیب الرحمٰن ۹ ۱۱/۳۹

گرامی قدر سلمہٗ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ خط آیا۔ جزاک اللہ۔ نسخہ حاشیہ شرح آداب المریدین دیکھنے کو بھیجد یجئے۔ مصارف میرے ذمہ۔

بانکی پور میں ۱۳۲۲ھ میں مطبع الپنچ میں شرح آداب المریدین چھپی ہے، اول اس پر یہ حاشیہ بھی چھپا ہے۔ عید مبارک۔ حج و زیارت بھی نصیب ہو۔ مکرمی مولوی ریاض الحسن خاں صاحب کی خیریت کی تشنگی ہے۔ دل چاہا کہ کلکتہ سے واپسی میں ایک وقت پٹنہ اتروں۔ خود خیریت پوچھوں، مولوی صاحب اور ڈاکٹر سید محمود[۵۱] صاحب کی! وہاں قیام زیادہ ہوگیا۔ الحمد للہ یہاں خیریت ہے۔ حبیب گنج حبیب الرحمٰن

۱۸ جنوری ۱۹۴۰ء

۷۸۶

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم ۱۹ ستمبر ۱۹۴۰ء

اخباروں سے ولی الدین[۵۲] خدابخش خاں صاحب مرحوم کی خبر وفات دریافت ہوکر افسوس ہوا۔ ان کی تعزیت کس سے کی جائے؟ اُن کی جگہ کون ہوا۔ مولوی ریاض الحسن خاں صاحب کا مزاج اب کیسا ہے۔

حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ

۷۸۶

۲۷ ستمبر ۱۹۴۰ء مکرمی السلام علیکم

شکر کرم۔ مکرمی ریاض حسن خاں صاحب کی خیریت سے دل خوش ہوا۔ ابھی خط لکھا ہے۔ شہاب الدین صاحب کو خط لکھتا ہوں۔ آپ دوسرے کے فعل پر نادم کیوں ہوں۔ مہتمم کتاب خانے سے دریافت کیا، تو آداب المریدین مولوی

---

[۵۱] ڈاکٹر سید محمود، وزیر تعلیم بہار ——— ان دنوں وزارت معطل تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب، پٹنہ ہی قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ علی گڑھ کے شاگرد تھے۔ اسی لئے حلقہ شبلی کے بزرگوں سے وابستگی رہی۔

[۵۲] ولی الدین خدابخش مرحوم (خدابخش خاں) بانی کتاب خانہ کے چھوٹے بیٹے تھے اور وقف کے مطابق وہی سکرٹری تھے۔ ان کے بعد ان کے منجھلے بھائی شہاب الدین خدابخش (ریٹائرڈ ایس۔پی) سکرٹری ہوئے۔ ان کا بھی انتقال ہوگیا، تو بانی کتابخانہ کے بھتیجے قاسم حسن

غلام یحییٰ کا یہاں آنا پایا نہیں جاتا۔ اگر کر سکے، تو عین عنایت ہو۔

للہ الحمد بخیر و جویائے خیر۔ حبیب الرحمٰن

جبیب گنج ضلع علی گڑھ

۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم

ممنون ہوں گا اگر اپنے کتاب خانہ کے نسخہ رباعیات سحابی نجفی کی بابت حسب ذیل سوالوں کا جواب آپ لکھیں گے۔

(۱) کیا نسخہ پورا ہے یعنی اوّل آخر ہے؟

(۲) کاتب کا نام و سن کتابت درج ہے؟

(۳) رباعیوں کی تعداد کیا ہے؟

(۴) سوائے رباعیوں کے کوئی اور صنف کلام بھی ہے۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ الحمد للہ خیریت ہے۔ آپ کے بتلائے ہوئے پتے پر مولوی ریاض حسن خاں صاحب سے مراسلت ہوتی ہے۔

جبیب الرحمٰن

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم۔ انجمن ترقی اردو تذکرہ قدرت اللہ شوق سنبھلی کی اشاعت کا انتظام کر رہی ہے۔ آپ کے کتاب خانے میں کوئی نسخہ ہے، تو لکھیے۔

نیز اپنی خیریت اور کتاب خانے کی خیریت۔ الحمد للہ یہاں خیریت ہے۔

حبیب الرحمٰن جبیب گنج ضلع علی گڑھ

۲۹ اپریل ۱۹۴۱ء

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم ۹ مئی ۱۹۴۱ء

کارڈ کا شکریہ، مولوی حاجی معین الدین[۱] صاحب مرحوم کی رحلت سے افسوس ہوا۔ بلحاظ آپ کی قرابت ندوہ کے تعلق اور مرحوم کی علمی خدمات اور مناقب کے ــــــ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنات نعیم میں مقام بخشے۔ عزیزوں کو صبر اور اجر۔

حبیب الرحمٰن

---

۲۶ اپریل ۱۹۴۲ء

گرامی قدر سلمہٗ السلام علیکم

ایک محترم فرمائش کی تعمیل میں لکھتا ہوں کہ آیا پٹنہ لائبریری میں کتاب "اخبار الاخیار" حضرت شیخ دہلوی" کا نسخہ بخطِ مؤلف ہے؟ الحمد للہ خیریت ہے۔ آپ کی خیریت کی تمنا۔

محمد حبیب الرحمٰن

صدر یار جنگ

---

[۱] حاجی معین الدین ندوی مرحوم (پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ، پٹنہ)، مصنف "خلفائے راشدین، و مہاجرین، حصہ اول۔

حبیب منزل - علی گڑھ

۶ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۴ھ

گرامی قدر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

آپ کا خط آگیا - جواب لکھنے سے پہلے دو[1] سوال کروں - پٹنہ کیوں چھوڑا ؟ وہاں آپ کی جگہ کس نے لی ؟ اب صدر کتاب خانے کی کمیٹی کا کون ہے ؟

شرح طیبی کی طبع کا عزم مصمم ہے - اللہ تعالےٰ پورا فرمائے - نسخہ کی ایک سے زائد نقلیں ہو چکی ہیں - اور مقابلے کا اہتمام پیش ہے - اگر آپ کے دوست[2] کے پاس کچھ سامان اس کا ہے تو حبیب گنج بھیجدیں - مستعار بھیجیں گے تو بعد کاربرآری واپس ہوگا - ورنہ قیمت پیش کردی جائے گی -

تاخیر جواب معاف کرنا - گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے ہوئی -

حبیب الرحمٰن

---

[1] راقم نے عریضہ جالندھر سے لکھا تھا - مکتوب الیہ کو عاجز کے پٹنہ چھوڑنے کی اطلاع اسی خط سے ہوئی - کتاب خانے کی محبت میں یہ سوال فرما رہے ہیں - [2] مولانا عطاء اللہ حنیف، مدرسہ تقویۃ الاسلام - لاہور -

۱۲۵ء لارنس روڈ
پاکستان کالونی، کراچی
۲ر مئی ۱۹۵۱ء

ہماری تنقید پر تنقید

محبِ مکرم ! السلام علیکم - مئی کے "فاران" میں "ہماری نظر میں" کے زیر عنوان دو باتیں نظر میں کھٹکیں - انہی کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔

(۱) لمحاتِ جاوداں :- جناب محمد ہادی حسین صاحب کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے :-

"یہ گریہ بھی زہر خند بھی ہے" جس نظم کا عنوان ہے وہ طویل نظم ہادی صاحب نے رباعی کے اوزان میں کہی ہے اور اس جدت کا سہرا قدرت نے اُن کے سر باندھ دیا ہے۔"

رباعی کے اوزان میں مسلسل نظم ہادی صاحب کی جدت نہیں ہے - ان سے پہلے جناب امجد حیدر آبادی بھی ایسی نظمیں لکھ چکے ہیں - اولیت کا سہرا غالباً حضرت اکبر الٰہ آبادی کے سر ہے جن کی ایک لاجواب نظم تیتریوں کے متعلق رباعی کے اوزان میں موجود ہے - پہلا شعر ہے ؎

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

اور آخری شعر ؎

اس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے داماںِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

یہ نظم رباعیاتی مثنوی ہونے کے علاوہ مطالعۂ فطرت اور حسنِ بیان کے لحاظ سے بھی ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

(۲) ستاروں سے ذروں تک :- جگن ناتھ آزاد کے اس مجموعہ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے :-

"پھولوں کو نہ پیروں سے لتاڑو سنبھلو پودوں کو نہ اس طرح اکھاڑو سنبھلو

معلوم ہوتا ہے شاعر کو "لتاڑنے" کے معنی ہی معلوم نہیں ہیں - "لتاڑنا" تو ڈانٹنے ڈپٹنے اور انتباہ و ملامت کو کہتے ہیں"

یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے - ڈانٹنا ڈپٹنا اور انتباہ و ملامت "لتاڑنے" کے مجازی معنی ہیں - لغوی معنی "پامال کرنے" ہی کے ہیں - یہ لفظ ملتانی الاصل ہے اور اس کا جزو اول "لت" ہے جس سے اُردو کا لفظ "لات" بنا ہے - اس اشتقاق کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ذرا بھی شبہ نہیں رہ سکتا کہ "لتاڑنا" پامال کرنے کے مترادف ہے۔

بہادر شاہ ظفر نے ایک شعر میں اس لفظ کو صاف اسی معنی میں استعمال کیا ہے ؎

کبھی لکھیں ہم اگر حالِ پائمالیِ دل رہے ہمیشہ قلم کی لتاڑ میں کاغذ

لہٰذا جگن ناتھ آزاد نے "لتاڑو" بالکل صحیح لکھا ہے - البتہ "لتاڑو" کے ساتھ "پیروں سے" کی تخصیص محلِ نظر ہے کیونکہ لفظ کے اندر "لات" کا مفہوم موجود ہوتے ہوئے "پیروں" کا ذکر صریحاً زائد ہے - عین اس طرح جیسے کوئی "پامال کرنے" کے بجائے "پاؤں سے پامال کرنا" لکھ دے۔

والسلام

مخلص : اسد

ہم نے اربابِ فن اور اہلِ نقد و نظر کی خدمت میں بارہا گزارش کی ہے کہ ہماری فروگزاشتوں پر ہمیں مطلع فرمایا جائے تاکہ "فاران" کے ناظرین کے سامنے ہم اُن کو پیش کرتے رہیں، ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی غلطیوں کے اعتراف میں ہچکچاتے ہیں، اس معاملہ میں انشاء اللہ ہم ہمیشہ فراخدل ثابت ہوں گے، اپنی تحقیق کو نعوذ باللہ ہم — "وحیِ آسمانی" نہیں سمجھتے ہیں اور نہ ہمیں "سندِ آخر" کی حیثیت حاصل ہے، خود ہم سے بھی بھول چوک ہوتی رہتی ہے!

جناب اسد ملتانی کا مکتوب جوں کا توں شائع کیا جا رہا ہے جس کے لئے ہم اُن کے شکرگزار ہیں کہ صاحب موصوف نے ہمیں استفادہ کا موقع بخشا، اسد صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ واضح اور محکم ہے، اُن کے اس خط کو پڑھ کر ہمیں اس بات کی خوشی ہوئی کہ اسد صاحب جیسے مستند شاعر، ادیب اور اہلِ تحقیق "فاران" کو اس قدر توجہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

تنقید و تبصرہ میں ہم بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں، جس چیز کے بارے میں ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے اُسے چھوڑ دیتے ہیں کہ "مشتبہ" چیز چھوڑ دینے ہی کے لائق ہوتی ہے، مذہب کی طرح "علم و ادب" کے "متقین" کی بھی یہی روش ہونی چاہیئے —— واقعہ یہ ہے کہ لفظ و بیان اور زبان و معانی کے اتھاہ سمندر کا اور چھور نہیں ملتا، اس وادی میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی کوئی شخص تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا، تحقیق و تفحص کی کوئی حد ہی نہیں ہے، جتنا نیچے جایئے یہ دریا اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس اعتراف کے بعد ہم "لتاڑ" کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں، اس بحث کے ساتھ "متروکات" کی بحث بھی آپ سے آپ چھڑ جاتی ہے اور اسی پر ہم آج گفتگو کر رہے ہیں —— اُردو زبان کی پیدائش کے بارے میں لوگ بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیتے ہیں مگر ہماری رائے میں یہ دُنیا کی سب سے زیادہ کمسن زبان ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں ہے، یہ زبان مختلف مرحلوں اور تجربوں سے گزرنے کے بعد ہم تک پہونچی ہے، اور ہم آج جس زبان کو بولتے اور لکھتے ہیں وہ "معیاری زبان" ہے۔

قلی قطب شاہ نے جس زبان میں شاعری کی ہے وہ زبان دکّی (دکنی یا گجراتی) کے یہاں آ کر اور زیادہ نکھر جاتی ہے مگر دکّی کی زبان "معیاری" نہ تھی اُسے ابھی اور زیادہ منجھنا اور نکھرنا تھا، یہاں تک کہ میر تقی میر کا دور آ گیا، اور اردو زبان میں "معیاری" بننے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، ہم آج جو کچھ بولتے ہیں اُس میں اور میر کی زبان میں بہت ہی کم فرق ہے، لیعنی زبانِ میر کے چند متروکات کو نکال دیا جائے تو میر کی زبان اور ہمارے اس موجودہ دور کی زبان میں مشکل ہی سے فرق محسوس کیا جا سکے گا۔

"کسو" "اُن نے" وغیرہ لفظ اور ترکیبیں قطعاً متروک ہو چکی ہیں، میر کا ایک شعر ہے :-

جہاں اب خارزاریں ہو گئی ہیں
وہاں پہلے بہاریں ہو گئی ہیں

اب "خارزار"، "لالہ زار"، "سبزہ زار" وغیرہ الفاظ مذکر بولے جاتے ہیں اور اس خصوص میں میر کی زبان کا کوئی اتباع نہیں[1] متروکات کی ایک تو یہ صورت ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے مگر کچھ متروکات ایسے ہیں جن کو شاعروں نے شاعری کی دنیا

[1] ہم "طرزِ نگارش" کا نہیں "زبان" کا ذکر کر رہے ہیں (م - ق)

سے خواہ نخواہ "دیس نکالا" دیدیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مثلاً "تلک" "سدا" (ہمیشہ کے معنی میں) "سو" "پر" (مگر اور لیکن کے معنیٰ میں) وغیرہ الفاظ شاعری میں متروک سمجھے جاتے ہیں، حالانکہ یہ الفاظ کسی اعتبار سے بھی چھوڑ دینے کے لائق نہیں ہیں، غالب کا بہت مشہور شعر ہے :- بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں "سو" میں لطفِ معنوی اور نازکیٔ بیان کی ایک دنیا بند ہے! ہمارے خیال میں یہ تمام متروکات شاعری ہی نہیں عام بول چال میں بھی رواج پانے چاہئیں ۔۔۔۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میر نے جو کہا ہے :-

سرہانے میر کے آہستہ بولو　　ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے

تو یہ "ٹک" بھی زبان میں باقی رہنا چاہیئے، اس میں بڑی لطافت ہے! اسی طرح "فی الفور" کے معنیٰ میں "تُرت" بھی ضرور بولنا چاہیئے، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے ہم کراچی کے ایک مشاعرہ میں آئے تھے اُس وقت ایک پمفلٹ ہماری نظر سے گزرا تھا جس میں فرسٹ ایڈ (FIRST AID) کا ترجمہ "ترت امداد" کیا گیا تھا، اس ترجمہ کو پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا اور مترجم کے لئے دل سے آفرین کے ساتھ دُعا بھی نکلی ۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ "جائیاں" اور "کھائیاں" جیسے متروکات کو واپس لاؤ ۔ عرض کرنا یہ ہے کہ "ٹک" "ترت" اور "تلک" جیسے سلیس و سادہ لفظوں کو شہر بدر نہ کرو، یہ لفظ اپنی بناوٹ اور معنویت کے اعتبار سے اس قابل ہیں کہ زبان میں ان کو باقی رکھا جائے ۔

کچھ اور الفاظ بھی ہیں جن کو اجلاف اور کمینوں کی زبان سمجھا جاتا ہے مثلاً مولانا شبلی نعمانی نے "کمتی" کو "موازنۂ انیس و دبیر" میں "اراذل و انفار" کی زبان لکھا ہے، ہمیں قطعیت کے ساتھ یاد نہیں ہے کہ انیس اور دبیر میں سے کس نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے ۔ بہر حال ان دونوں نامور اور باکمال شاعروں میں سے کسی ایک نے ضرور اس لفظ کو برتا ہے، ناطق لکھنوی کہتے ہیں :-　　زہر ہی زہر کی دوائی ہے

کوئی شخص غیر معمولی محتاط ہو تو اُس کی دوسری بات ہے مگر ہمارے خیال میں "کمتی" اور "دوائی" جیسے الفاظ بولنے میں کوئی ہرج نہیں ہے، کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ زبان میں نئے نئے لفظوں اور جدید ترکیبوں کا اضافہ ہو نہ یہ کہ مستعمل لفظوں کو بھی زبان سے خارج کر دیا جائے ۔

اصل گفتگو "لتاڑ" پر ہونی چاہیئے تھی مگر درمیان میں دوسری باتیں نکل آئیں لیکن یہ باتیں غیر متعلق نہ تھیں ۔۔۔ ۔۔۔ "لتاڑ" کے بارے میں ہم کو سو فی صدی یقین تھا کہ اس کے معنی "انتباہ و ملامت" ہی کے ہیں، ہم نے اس لفظ کو "پامال" کرنے کے" معنیٰ میں نہیں سُنا مگر حضرت اسد ملتانی کا مکتوب آنے کے بعد ہم نے تحقیق شروع کی ۔ لغت کی کتابوں میں اس لفظ کے بیشک یہ معنیٰ (پامال کرنا و روندنا) بھی ملتے ہیں، ناسخ لکھنوی نے بھی یہ لفظ انھی معنیٰ میں استعمال کیا ہے ۔۔۔۔ پھر ہم نے شاعروں، ادیبوں اور زباندانوں سے پوچھا اور سب نے یہی کہا کہ "لتاڑنا"، ڈانٹنے ڈپٹنے ہی کو کہتے ہیں، اور تو اور مولانا سید سلیمان ندوی اور حضرتِ جگر مرادآبادی نے بھی "لتاڑ" کے یہی معنی (انتباہ و ملامت) بتائے اور "پامال" کے معنیٰ سُن کر شدید حیرت کا اظہار کیا ۔

اس لفظ (لتاڑ) کی اب صورت یہ ہے کہ خواص اور عوام اسے صرف "ڈانٹ ڈپٹ اور انتباہ و ملامت" کے معنیٰ میں لیتے ہیں اور "پامال" کرنے کے" معنیٰ میں نہیں بولتے اس لئے اس معنیٰ (پامال کردن) میں یہ لفظ اب قطعاً متروک ہوچکا ہے اور جس معنیٰ میں

عاصی کرنالی

رگ و نشتر

روحِ منظر نہ بنے، جانِ بہاراں نہ بنے
لوگ کانٹوں سے گزر کر بھی گلستاں نہ بنے

انقلابات نے بھی روح نہ پھونکی ہم میں
ہم سمندر رہیں بھی ہنگامہ طوفاں نہ بنے

ہوئے پورے نہ بہاروں کے تقاضے ہم سے
ہم گریباں تو بنے، چاکِ گریباں نہ بنے

نعمتِ درد سے محروم رہے قلب و نظر
بن گئے لوگ فرشتے، مگر انساں نہ بنے

اے ستارو ہمیں کیا یاد کرو گے تم بھی
ہم اگر مطلعِ خورشیدِ درخشاں نہ بنے!

ایسے کتنے ہی گریباں ہیں جو فصلِ گل میں
چاک ہو کر بھی ترا گوشۂ داماں نہ بنے

واقعاتِ غمِ دنیا سے بصیرت نہ ملی
یہ شرارے بھی چراغِ دلِ انساں نہ بنے

ہمیں فرصت ہی نہ دی نالۂ دل نے عاصیؔ!
کسی محفل میں بھی ہم سازِ غزل خواں نہ بنے

شفیق جون پوری نے محسوس کیا:-

بہار آیا کرے دل میں مسرت کا گزر کیا ہو
تمہیں گھر سے چلے تو رونقِ دیوار و در کیا ہو

چمن کے دوستوں کی کم نگاہی پر نظر کیا ہو
یہ پھولوں ہی سے غافل ہیں تو کانٹوں کی خبر کیا ہو

تجھے تو ایک شب رونا تھا اے شمعِ سحر رخصت!
جو ساری زندگی روئے وہ تیرا ہمسفر کیا ہو

مبارک آپ ہی کو آپ کا دورِ مسیحائی
کہ سب بیمار ہیں کوئی کسی کا چارہ گر کیا ہو

چمن ہی لُٹ رہا ہے تو قفس کیا نشیمن کیا
بہاریں جانے والی ہیں تو فکرِ بال و پر کیا ہو

جگہ دی جا رہی ہے انجمن میں بے نگاہوں کو
تمہارے دور میں اب پرسشِ اہلِ نظر کیا ہو

شفیقؔ اب ہند سے ملکِ عرب تک تیری شہرت ہے
مگر تیرے وطن کے ناشناسوں کو خبر کیا ہو

قابل اجمیری

دو غزلیں

رنگ و بو کو نگہِ شوق کا حاصل نہ بنا
ہر تعین سے گزر جا کوئی منزل نہ بنا

شورشِ غم سے عبارت ہے سکونِ ہستی
کشتیِ شوق کو آسودۂ ساحل نہ بنا

نہ ہوا وجہِ سکوں گریۂ پیہم نہ ہوا
نہ بنا موج کی آغوش میں ساحل نہ بنا

سعیِ تخلیق نہ کی اہلِ وفا نے کیا کیا
بن گیا دل کی جگہ درد مگر دل نہ بنا

تیری رحمت کے تصدق، تری بخشش کے نثار
میں تہی دست ہی اچھا مجھے سائل نہ بنا

(۲)

زندگی طوفان ہے، دریا میں رہ، موجوں سے کھیل
اپنی کشتی کو نہ بارِ خاطرِ ساحل بنا

رونقِ آئینہ خانہ اور کچھ بڑھ جائے گی
حُسنِ خود آرا کو تو آئینہ دارِ دل بنا

خود ہوئی آوارہ، جلوؤں کو بھی برہم کر دیا
اور مُشتِ خاک کو انوار کا حامل بنا؟

اشکِ خوں پائندہ باد و برقِ جلوہ زندہ باد
ہم تری تصویر کھینچیں تو ہمارا دل بنا

تنگ دل ہیں اہلِ دل بدبیں ہیں اربابِ نظر
ایسے عالم میں نہ مجھ کو جوہرِ قابل بنا

جذبات

شوق کھنڈوی

مری بربادیوں کا سلسلہ برہم نہیں ہوتا
مگر اس پر بھی ذوقِ شعر و نغمہ کم نہیں ہوتا

فضائے شامِ غم کس درجہ داغِ دل سے روشن ہے
کسی کی صُبحِ عشرت کا بھی یہ عالم نہیں ہوتا

رُباعی

ساغر وارثی

سورج بدلی میں مسکرائے جیسے
فانوس میں شمع جگمگائے جیسے

عارض پہ دمکتا ہے جوانی کا خون
شیشہ میں شراب جھلملائے جیسے

انجم فردوسی

افکارِ پریشاں

کوئی علاجِ حالِ پریشاں ٭ تو ہی بتا اے گردشِ دوراں

اپنی ضرورت، اپنی عظمت ٭ کیا جانے اس دور کا انساں

یاد تو کر اے بھولنے والے ٭ روزِ ازل کے عہد و پیماں

عشق سراپا معصومیت ٭ حسن سراسر فتنہ ساماں

دُنیا کا تو کام ہے ہنسنا

میں کیوں سی لوں چاکِ گریباں

ماہر القادری

سیٹھ صاحب!

وہ سیٹھ صاحب تھے، خان بہادر تھے، دسیوں انجمنوں کے پریسیڈنٹ، وائس پریسیڈنٹ اور کسی کسی سوسائٹی کے خازن بھی! پبلک اداروں کے عہدے وہ روپیہ دے کر خریدتے، محلہ کی شاندار مسجد کے صدر دروازے پر جو سنگِ مرمر کا کتبہ لگا تھا اُس پر بھی سیٹھ صاحب کا نام لکھا تھا، وہ تو میونسپلٹی کے ممبروں میں پھوٹ پڑ گئی، ورنہ یہ تجویز پاس ہی ہو چکی تھی کہ سیٹھ اللہ بخش کا مجسمہ بڑے بازار کے چوراہے پر نصب کرا یا جائے ——— مگر سیٹھ صاحب کا یہ داؤں خالی نہیں گیا، یہ دوسری بات ہے کہ شکار کرنے چلے تھے ہرن کا اور مار کر لائے خرگوش! میونسپلٹی کے اجلاس میں سیٹھ صاحب کے اسٹیچو (STATUE) نصب کرنے کی تجویز تو منظور نہ ہو سکی مگر اس کی جگہ یہ قرار داد بہ اتفاق آرار پاس ہو گئی کہ سیٹھ صاحب کی کوٹھی جس سڑک پر واقع ہے اُس کا نام "اللہ بخش روڈ" رکھ دیا جائے ——— روپیہ میں بڑی طاقت ہے، یہ ستارِ عیوب بھی ہے اور قاضی الحاجات بھی، اس کے زور سے شیطان کو لوگ فرشتہ کہنے لگتے ہیں اور "علیہ ما علیہ" مرنے کے بعد کبھی کبھی "رحمۃ اللہ علیہ" بھی بن جاتا ہے۔

شاعروں نے اپنے قصیدوں کے زور سے سیٹھ صاحب کو "امیر ابنِ امیر" بنا دیا تھا وہ "امیر" تو ضرور تھے مگر "ابنِ امیر" ہرگز نہ تھے، اُن کے دادا مویشیوں کے بازار میں گائے بھینسوں اور بیلوں کی دلالی کرتے تھے، پورا کنبہ تھا آمدنی کم تھی بڑی تنگی ترشی سے بسر ہوتی تھی اور سیٹھ صاحب کے باپ گھوڑا گاڑی چلاتے تھے، سیٹھ صاحب کے دادا نے ایک گھٹیا درجہ کی طوائف کو گھر میں ڈال لیا تھا، مگر خوشامدیوں نے سیٹھ صاحب کا نسب نامہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملا دیا اُن کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے جاتے کہ سیٹھ اللہ بخش صاحب کا خاندان عزت و شرافت کا گہوارہ ہے اور اس خانوادے نے اہلِ ہنر کی سدا قدردانی کی ہے ——— اور سیٹھ صاحب کے باپ اور دادا کی قبروں پر شرمندگی چھائی جا رہی تھی!

سیٹھ صاحب کے باپ دادا تو اتنے غریب تھے پھر یہ خود اتنے مالدار کیسے ہو گئے؟ یہ نہ پوچھئے اس پر پردہ پڑا رہے تو اچھا ہے، مگر جب آپ سیٹھ صاحب کی زندگی کے حالات بیان کر رہے ہیں تو یہ کہاں کی دیانتداری ہے کہ کچھ باتیں تو آپ بیان کر دیں اور کچھ باتیں چھپا دیں؟ اچھا! صاحب آپ نہیں مانتے تو راوی روایت کرتا ہے کہ سیٹھ صاحب شروع شروع میں ایک پردیسی بیوپاری کے ساتھ غلہ کی تجارت کرتے تھے، روپیہ اس بیوپاری کا تھا اور محنت سیٹھ صاحب کی تھی! سیٹھ صاحب کو اُس کا منیب سمجھئے، ساجھی سمجھئے، مشیر سمجھئے، بہر حال دونوں میں خوب میل جول تھا، شہر میں طاعون کی وبا کا زور ہوا، اور یہ بیوپاری دو تین روز بیمار رہ کر چل بسا، اس کا سارا مال اسباب سیٹھ صاحب نے ہتھیا لیا، دو تین مہینے بعد اس کے عزیز و اقربا آئے تو سیٹھ صاحب نے اس طرح گفتگو کی جیسے مرنے والا خود اُن کا مقروض تھا، اور اُس بیچارے کے کفن دفن کا انتظام بھی ہمارے لکھ لٹ اور سخی دل سیٹھ صاحب نے اپنے پاس سے کیا تھا، لکھت پڑھت کچھ تھی ہی نہیں، متوفی کے ورثاء اپنا سا منہ لیکر رہ گئے۔

اس پردیسی بیوپاری کا مرنا تھا کہ سیٹھ صاحب کی قسمت کا ستارہ ایکا ایکی چمک اُٹھا، مفت کا روپیہ تھا، بے جگری کے ساتھ بڑے بڑے سودے کئے اور اُن میں کافی نفع ہوا، مقدّر زور پر تھا سیٹھ صاحب مٹی کو چھوتے اور سونا بن جاتی ـــــ اور پھر داؤں پیچ، ہتھ پھیری، سٹہ بازی! سرکاری افسروں کی مٹھی گرم کی جاتی، اُن کے یہاں ڈالیاں بھیجی جاتیں، ریلوے کا پُل جو سیلاب میں ٹوٹ گیا تھا اُس کا ٹھیکہ سیٹھ صاحب ہی کو ملا، ریلوے انجنیر کی خدمت میں سیٹھ صاحب نے نئے ماڈل کی ایک شیورلیٹ کار پیش کی ـــــ یہی ہوتا رہتا تھا ڈالیوں، پارٹیوں اور تحفے تحائف کے بل پر کام چلتا تھا، نئے ڈپٹی کمشنر ذرا رنگین طبیعت واقع ہوئے تھے اُن کے یہاں گانے بجانے کی جو محفلیں ہوتیں تو اُس کا سارا بار سیٹھ صاحب کی جیب پر پڑتا اور وہ بڑی خوشی کے ساتھ اسے گوارا کر لیتے۔

یہی سیٹھ صاحب جو افسروں کے لئے رقص و سرود کی محفلوں اور کاک ٹیل پارٹیوں کا انتظام فرماتے اُن کو "سیرت النبی" کے جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے بھی دیکھا گیا، وہ مسجدوں کے سنگِ بنیاد بھی رکھتے اور تھیٹروں اور سینما ہالوں کا افتتاح بھی کرتے، اُن کو شہرت اور نام و نمود کی ضرورت تھی، اب یہ چیزیں جہاں بھی اور جس طرح بھی ملتیں، اُنھیں حاصل کیا جاتا۔

علمائے کرام اور واعظین شیریں بیان سیٹھ صاحب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے، خدائی ڈاڑھیوں کو مُٹھیوں میں پکڑ پکڑ کر ارشاد ہوتا ـــــ "سیٹھ صاحب نے اس زمانہ میں حضرت عثمان غنی رض کی سخاوت کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان کے دل میں دین کی محبت ڈال دی ہے، اِن کے لئے جنت الفردوس میں محل تیار ہو رہے ہیں ـــــ اور ایک صوفی باصفا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اولیائے کرام کی محفل جمی ہوئی ہے اور سیٹھ اللہ بخش صدر میں بیٹھے ہیں اور اُن کے سر پر نورانی تاج جگمگا رہا ہے ـــــ سیٹھ صاحب اگر پیری مُریدی شروع کر دیتے تو کیا عجب ہے بہت سے مولوی اُن کے دستِ حق پرست (؟) پر بیعت کر لیتے

سیٹھ صاحب کے ایک دو نہیں دسیوں کاروبار تھے، کارخانے، ٹھیکے، آڑھت، موٹر بسیں، کمپنیوں میں حصہ داری، سیکڑوں نوکر کام کرتے تھے! ایک دن وہ گودام کے قریب دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک بوڑھی عورت دو بچوں کو لئے دفتر میں گھس گئی، نوکر روکتے ہی رہے مگر بڑھیا نے کسی کی ایک نہ سُنی ـــــ بڑھیا ـــــ ہڈیوں کا پنجر، بدن پر کپڑوں کی دھجیاں تھیں یا پھر سوکھی ہوئی جھریاں تھیں اور بچے، فاقہ زدہ گھبرائے ہوئے، پریشان حال جیسے مہینوں سے یہ بیچارے مُسکرائے تک نہیں ہیں۔

ـــــ سرکار! اپنی جان مال کا صدقہ: اپنے بچوں کی نچھاور، یہ بچے دو وقت کے بھوکے ہیں.....

.....حضور! ـــــ سیٹھ صاحب آپ کی ڈبل ڈاڑھی بنی رہے ----- (اور سیٹھ صاحب کے ماتھے پر شکنیں اُبھر آتی ہیں، نکالو اس مردود عورت کو، اسے دفتر میں آنے کیسے دیا یہ یہاں گھس کس طرح آئی ---- یہ بھک منگے سب کے سب ایک ہی طرح کی بولی بولتے ہیں اور سب یہی کہتے ہیں کہ "دو وقت سے کھانا نہیں ملا، کپڑے پھٹ گئے ہیں، بچہ بیمار ہے اور اس کی دوا دارو کے لئے ایک

پیسہ تک پاس نہیں ہے ۔۔۔" جھوٹے اور مکار کہیں کے! سیٹھ اللہ بخش کو اللہ میاں کی گائے سمجھ رکھا ہے کہ چلو اُسے چل کر بے وقوف بنائیں، میرے پاس بانٹنے کے لئے فالتو دولت نہیں ہے اور ۔۔۔۔۔۔)

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے، ملازم آلہ اٹھاتا ہے، پھر قدرے گھبرا کر ریسور سیٹھ صاحب کو یہ کہتے ہوئے دیتا ہے ـــــ "محکمہ سپلائی کے سکرٹری صاحب حضور سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں" اور دونوں میں گفتگو ہونے لگتی ہے :ـــ

ـــــ سکرٹری صاحب ہیں! آداب عرض کرتا ہوں

ـــــ تسلیمات، کیسے مزاج ہیں سیٹھ صاحب کے!

ـــــ آپ کا کرم ہے، پرورشس ہے!

ـــــ بھئی! دیکھنا! ۲۰ مارچ کو سوائے ہوٹل میں جو ڈانسنگ پارٹی ہو رہی ہے اُس کا انتظام آپ کے ذمہ رہے گا، (ہلو ۔۔۔ ہلو) آپ کے ذمہ! سن رہے ہیں آپ!

ـــــ بہت اچھا! جو حکم! مگر میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

ـــــ جی کہئے، آپ اور عرض کریں، کیا فرما رہے ہیں سیٹھ صاحب! آپ تو ارشاد فرمایا کرتے ہیں

ـــــ پارٹی اور دعوت کے اہتمام کا کام کسی اور کے سپرد کر دیا جائے تو بہتر ہے، مصارف یہ آپ کا نیاز مند ادا کر دے گا، کتنے کا چیک حاضر کر دوں ـــــ

ـــــ آپ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے، آپ کی مصروفیتیں بھی تو بے اندازہ ہیں، آپ پر ایک ہی بار ڈالا جائے گا ۔۔۔۔ ہاں تو چیک ـــــ کتنے کا (چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد)

ـــــ جی! چھ ہزار کا چیک سردست بھیج دیجئے ۔۔۔ خدا جلد ـــ

ـــــ ایک بجے سے پہلے پہلے چھ ہزار کا چیک آپ کی خدمت میں پہونچ جائے گا اور کوئی حکم؟

ـــــ شکریہ ـــــ خدا حافظ

سیٹھ صاحب چھ ہزار روپیہ کے چیک پر دستخط فرما رہے تھے، بڑھیا باہر ایک وقت کے کھانے کے لئے چیخ رہی تھی اور معصوم بچوں کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔

روحِ انتخاب

اسلامی اقتدار اور اسلامی تمدّن

اسلامی اقتدار اور اسلامی تمدن کے اثرات ونتائج

پہلی صدی ہجری میں اسلامی تمدن کا اپنی پوری روح اور مظاہر کے ساتھ ظہور اور اسلامی حکومت کا اپنی صحیح شکل و نظام کے ساتھ قیام، مذاہب واخلاق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز اور سیاست واجتماع کی دنیا میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا، اس انقلاب سے تمدن کے دھارے کا رُخ اور دنیا کے سفر کی سمت بدل گئی، اسلام کی یہ عظیم الشان فتح جاہلیت کے لئے ایک ایسی آزمائش اور خطرہ تھا جس سے اس کو اس سے پہلے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا، ابھی تک اس کے حریف (اسلام) کی حیثیت ایک دینی اور روحانی دعوت سے زیادہ نہ تھی، اب دفعتہً وہ سب کچھ ہو جاتا ہے، سعادت ونجات کا پورا نظام، روحانیت ومادیت کا مکمل مجموعہ زندگی اور قوت کا پورا مظہر ایک مکمل تمدن اور اجتماع ایک طاقتور حکومت ایک کامل نظام سیاسی۔

اب ایک طرف ایک ایسا معقول سہل الفہم اور ممکن العمل دین تھا جو سراسر حکمت ومعقولیت تھا، دوسری طرف محض اوہام وخرافات اور قصہ کہانیاں، ایک طرف آلہی شریعت اور آسمانی وحی تھی اس کے مقابلہ میں محض قیاسات اور انسانی تجربہ اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون۔

ایک طرف ایسا بلند وبرتر تمدن تھا جس کی بنیاد غیر متزلزل اور جس کے اصول غیر متبدل خوفِ خدا احتیاط وامانت کی روح اس کے پورے نظام میں ساری تھی، اس کے حلقہ میں، دولت وعزت کے مقابلے میں اخلاق وپارسائی اور کھلے مظاہر کے مقابلہ میں روح اور اصلیت کی عزت وقیمت زیادہ تھی، لوگوں میں مساوات تھی اور اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل تھی تو محض تقوے کے بنا پر لوگوں کی بڑی توجہ اور اصل کوشش آخرت کے لئے تھی اس لئے طبیعتوں میں اطمینان اور دلوں میں قناعت تھی، زندگی کے سامان واسباب میں کوئی حرص ومسابقت اور دنیا کی دولت پر پروانہ وار وارفتگی نہیں تھی، اس کے مقابلہ میں جاہلی تمدن تھا، پُرشور اور پُر تلاطم متزلزل اور مضطرب بڑا چھوٹے پر ظلم کرتا تھا اور طاقتور کمزور کو کھائے ڈالتا تھا۔ لہو ولعب اور بداخلاقی میں مسابقت اور جاہ ودولت اور سامان عیش وراحت کے حصول میں سخت مقابلہ تھا۔ یہاں تک کہ دنیا ایک میدانِ جنگ اور زندگی عذابِ جان بن کر رہ گئی تھی۔

ایک طرف عادل اسلامی حکومت تھی جو اپنی رعیت کو ایک نظر سے دیکھتی تھی کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلاتی تھی، لوگوں کے گھروں اور جان ومال کی طرح ان کے اخلاق کی نگرانی وحفاظت بھی اپنا فرض سمجھتی تھی،

ان میں سب سے بہتر ان کے حکام تھے اور سب سے زاہدانہ زندگی اُن لوگوں کی تھی جن کو سب سے زیادہ عیش و راحت کا سامان اور اس کے مواقع حاصل تھے، اس کے مقابلہ میں جاہلی حکومتیں تھیں جہاں ظلم و ستم رانی کا بازار گرم تھا جس کے کارکنان حکومت نے خیانت اور ظلم پر گویا کمر باندھ رکھی تھی جس کے افراد لوگوں کا مال ناحق کھانے اور ان کی بے آبروئی و خونریزی میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا چاہتے تھے اور اپنے عمل کا نمونہ پیش کر کے لوگوں کے اخلاق خراب کرتے تھے، ان میں سب سے بدتر حکام اور بادشاہ تھے ان کی حکومت میں انسان بھوکوں مرتے اور ان کے جانور اور کتے شکم سیر ہوتے، ان کے محل زرنگار پردوں میں ملبوس ہوتے اور لوگوں کو تن ڈھکنے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہوتا۔

اب لوگوں کو اسلام میں کوئی رکاوٹ اور اس کے قبول کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی اور جاہلیت میں کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی تھی، آدمی کو اسلام قبول کرنے پر کچھ کھونا نہیں پڑتا تھا اور سب کچھ حاصل ہو جاتا تھا، اس کو یقین کی ٹھنڈک ایمان کی شیرینی، اسلام کی قوت ایک طاقتور حکومت کی سرپرستی اور ایسے دوستوں اور مددگاروں کی حمایت حاصل ہو جاتی تھی جو اس پر اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، اطمینانِ قلب اور موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں اعتماد و سکون حاصل ہوتا تھا، لوگ آسانی کے ساتھ جاہلیت کے محاذ سے اسلام کے محاذ کی طرف منتقل ہونے لگے جاہلیت کے علاقہ میں اسلام پھیلنے لگا اور اسلام کو طاقت اور اقتدار حاصل ہوتا گیا، یہاں تک کہ کمزور طبیعتوں کے لئے بھی کفر و اسلام کے بارے میں کوئی کشمکش باقی نہیں رہی، اور خالص اللہ کی فرماں برداری آسان ہو گئی۔

اس انقلاب کا اثر بہت وسیع اور گہرا تھا، خدا پرستی کی راہ جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں دشوار اور خطرات سے بھری ہوئی تھی اب بہت سہل اور محفوظ ہو گئی، جاہلیت کے حلقہ اور ماحول میں خدا کی اطاعت مشکل تھی، اب اسلامی ماحول میں خدا کی نافرمانی مشکل ہو گئی، کل تک برسر بازار اور ڈنکے کی چوٹ پر فسق و فجور اور جہنم کی طرف دعوت دی جاتی تھی، اب ایسا کرنا مشکل تھا، کل تک خدا کی ناراضی اور اس کی نافرمانی کے اسباب و مواقع بکثرت اور بالاعلان تھے اب اُن پر بڑی پابندیاں اور ان کے لئے بڑی رکاوٹیں تھیں کل تک اللہ کی زمین میں اللہ کی طرف دعوت دینا ایک جرم تھا جس کے لئے بڑی احتیاط اور راز داری کی ضرورت تھی، اب وہ ایک ایسا کار خیر تھا جس کے لئے کسی راز داری اور پردہ کی ضرورت نہ تھی، نہ دعوت دینے والوں کو کوئی خطرہ تھا اور نہ قبول کرنے والوں کو، قرآن مجید نے اس فرق کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاٰوٰکم و ایدکم بنصرہٖ ورزقکم من الطیبات لعلکم تشکرون ○
(الانفال - ع ۳)

اور وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے تم اُس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اُچک نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اپنی مددگاری سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تاکہ تم شکر گزار ہو۔

اس اقتدار و طاقت کی وجہ سے مسلمان لفظی و لغوی معنیٰ میں امر بالمعروف و عن المنکر کرنے لگا اور حکم و ممانعت کی قوت ان کو حاصل ہو گئی ــــــ جس طرح موسم بہار میں نباتات اور انسانوں کے مزاج موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح محسوس اور غیر محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار و تمدن کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں متغیر اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں دلوں میں گداز اور نرمی پیدا ہونے لگی اسلام کے اصول و حقائق دل و دماغ میں پیوست ہونے لگے، اشیاء کی قدر و

قیمت کے بارے میں لوگوں کا نقطۂ نظر بدلنے لگا، کل تک جن چیزوں اور جن صفات کی لوگوں کی نگاہ میں بڑی وقعت اہمیت تھی اب وہ جاتی رہی اور جو چیزیں بے وقعت تھیں اب وہ وقیع بن گئیں، پُرانے معیاروں کی جگہ نئے معیاروں نے لی، جاہلیت، رجعت پسندی اور جمود کی علامت بن گئی اور اس کے متبعین میں احساسِ کمتری پیدا ہوگیا۔ اسلام کی طرف انتساب اس کے شعائر اور خصوصیات کو اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف کی چیز بن گئی، دنیا اسلام سے آہستہ آہستہ قریب ہورہی تھی جس طرح جہاز کے مسافروں کو اپنے چلنے کا اور کرۂ ارض کے رہنے والوں کو سورج کے گرد گھومنے کا احساس نہیں ہوتا، اسی طرح ان قوموں کو اور ان کے افراد کو اسلام کی طرف اپنے رجحانات اور اس کے اندرونی اثرات کا احساس نہیں ہوتا تھا، ان اثرات سے نہ علم و فلسفہ خالی تھا نہ مذاہب و تمدن، لوگوں کے ضمیر اور اُن کے باطن ان اثرات کی شہادت دیتے تھے اور ان کے اصلاحی میلانات اس کی غمازی کرتے تھے مسلمانوں کے تنزل کے بعد بھی جو صلاحی تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلامی اثرات اور اسلامی خیالات کا نتیجہ ہیں۔

اسلام نے توحید کی دعوت پیش کی اور بُت پرستی اور شرک کی ایسی مذمت اور ہجو کی کہ بُت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہوگیا، لوگوں کو اس سے شرم آنے لگی اور اس سے وہ اپنے کو بری ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگے، یا تو وہ بڑی جرأت اور صفائی کے ساتھ اس کا اقرار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے اجعل الالھۃ الھا واحدا ان ھذا الشئ عجاب۔ یا اب اپنے مذہب کے مشرکانہ اجزا و اعمال کی تاویل و توجیہ اور اس کی تشریح کی ایسی کوشش کرنے لگے کہ وہ توحید سے ملتی جلتی چیز نظر آئے عیسائیوں میں ایسے گروہ پیدا ہوئے جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا انکار اور عقیدۂ تثلیث کی توحید نما تشریح کرتے تھے، ان میں ایسے مصلح بھی پیدا ہوئے جو عیسائیوں کے مذہبی گروہ اور اہلِ کلیسا کے اللہ اور بندے کے درمیان وساطت کے منکر تھے ان پر سخت تنقیدیں کرتے تھے اور ان کے مخصوص حقوق کو نہیں مانتے تھے آٹھویں صدی عیسوی میں یورپ میں ایک ایسا گروہ ظاہر ہوا جو پادریوں کے سامنے اپنے گناہوں کے اقرار کرنے کی مخالفت کرتا تھا اور جس کی دعوت تھی کہ صرف اللہ کے سامنے دعا و استغفار اور اپنے سابقہ گناہوں کا اعتراف و اقرار کرنا چاہیئے اور اس میں کسی انسانی وساطت کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح آٹھویں صدی سے نویں صدی تک یورپ میں اس تحریک کا بڑا زور رہا ہے کہ تصاویر اور بُت ایک خلاف مذہب فعل ہے اور ان میں کوئی تقدیس نہیں، اس تحریک نے اتنا زور پکڑا اور اتنا اثر و اقتدار حاصل کرلیا کہ لیو سوم قسطنطین پنجم اور لیو چہارم جیسے عظیم الشان شاہان روما نے اس کی حمایت اور پشت پناہی کی، اول الذکر نے ۷۲۶ء میں ایک فرمان صادر کیا جس میں سرکاری طور پر تصویروں اور بتوں کی تقدیس کی ممانعت کی گئی تھی، دوسرے فرمان میں اُس کو اُس نے بت پرستی قرار دیا تھا مسیحی، اور بت پرست یورپ، اور رومی یونانی تمدن (جس کی تصویر نوازی اور بُت تراشی شہرۂ آفاق ہے) میں تصویروں اور بتوں کے خلاف یہ انکار و جہاد یقیناً اسلام کی بت شکنی اور اعلانِ توحید کی صدائے بازگشت تھی جو مغرب میں اسلامی اندلس اور اسلامی تبلیغ و اثرات کے ماتحت پہونچی، اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلوڈیس جو تورین کا لاٹ پادری اور اس تحریک و دعوت کا بڑا پُرجوش علم بردار تھا (یہاں تک کہ وہ اپنے حلقۂ اثر میں تصویروں اور صلیبوں کو جلا دیا کرتا تھا) اس کے متعلق تاریخی طور پر معلوم ہے کہ اس کی ولادت اور نشو و نما اندلس میں ہوا ہے اور دوسری صدی ہجری کا زمانہ ہے جب وہاں مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں

کا تمدن اپنے عروج پر تھا، یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی تاریخ کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے ذہنی اثرات سے، اور بت سے نوشتے اور نظیریں ملیں گی خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی، اور مورخین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے تھے، اسی طرح مسیحی یورپ اور بت پرست ہندوستان[1] کی قوموں کے اخلاق و معاشرت اور قانون سازی میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئیں گے، عورت کا احترام اور اس کے حقوق کا اعتراف، مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مساوات کا اُصول، اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے اختلاط کے ابد سے روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا، غرض متمدن اور آباد دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثتِ محمدیؐ اور ظہور اسلام کے بعد یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔

اسلامی حکومت اور اسلامی تہذیب کے دورِ انحطاط میں بھی اسلام کی سابقہ دعوت اور قوت کے آثار اور یادگاریں باقی تھیں، انھیں میں سے ایک "خدا شناسی" تھی جو پوری اسلامی دنیا میں عام تھی، خدا کا خیال مسلمان کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اس طرح اُتار دیا گیا تھا کہ وہ ہر قسم کے انقلابات و تغیرات اور دینی تنزل میں بھی نہیں نکل سکا، مسلمان کے لئے فسق و فجور ممکن تھا (اور مسلمانوں کے دورِ تنزل میں اس کا اچھی طرح ظہور ہوا) مگر خدا کا خیال دل و دماغ سے دور نہیں ہو سکا۔ نفسِ لوامہ کی ملامت، ضمیر کی سرزنش خدا کی موجودگی کا خیال اور آخرت کا کھٹکا بدمستی اور خود فراموشی کے عالم میں بھی دل میں چٹکیاں لیتا تھا اور کبھی کبھی اپنا کام کر جاتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ فساق و فجار بعض اوقات دفعۃً فسق و فجور سے توبہ کر کے صالحین و متقین کے گروہ میں شامل ہو جاتے رندانِ خرابات ایک ٹھوکر سے ہوشیار ہو کر کعبہ کی راہ لیتے، بڑے بڑے شاہزادے اور نازپروردہ امیرزادے ایک معمولی سی غیبی تنبیہ سے (جس سے ہزار درجہ زیادہ تنبیہیں مادیت و کفر کے دور میں بے اثر ثابت ہوتی ہیں) تخت و تاج اور حریر و دیباج چھوڑ کر فقر و درویشی اور صلاح و تقوے کی زندگی اختیار کر لیتے تھے۔ بعض مرتبہ قاری نے قرآن مجید کی آیت

الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللّٰہ وما نزل من الحق ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتٰب من قبل فطال علیھم الامد فقست قلوبھم وکثیر منھم فٰسقون۰

(الحدید، ع ۲)

کیا ایمان والوں کے لیے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دینِ حق نازل ہوا ہے اُس کے سامنے جھک جائیں اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان کے قبل کتاب ملی تھی پھر اسی حالت میں اُن پر زمانہ دراز گزر گیا پھر اُن کے دل سخت ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بہت سے آدمی ان میں نافرمان ہیں۔

پڑھی اور بعض لوگ ایسا معلوم ہوا کہ سوتے سے چونک گئے اور ان کی زندگی میں ہمیشہ کے لئے انقلاب ہو گیا، تاریخ ان مثالوں سے لبریز ہے ـــــــ بغداد کے انتہائی تعیش اور غفلت کے دور میں صاحبِ تاثیر واعظوں اور صاحب دل ناصحوں کی مجلس مشکل سے ایسے واقعات سے خالی ہوتی تھی ـــــــ مشہور عرب سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) جس نے ۵۸۰ھ میں بغداد دیکھا ہے، شیخ رضی الدین قزوینی کی مجلس وعظ کا حال بیان کرتا ہے کہ اثنار وعظ میں آنکھوں سے آنسوؤں کی

[1] ہندوستان کے مذاہب و خیالات، رسوم و عادات پر اسلام کے اندرونی اثرات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر تاراچند کی کتاب "INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE"

جھڑیاں جاری تھیں، لوگ پروانوں اور متوالوں کی طرح توبہ کے لیے ان کے ہاتھ پر گر رہے تھے اور اپنے بال کاٹ رہے تھے
حافظ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ (م ۵۹۷ھ) کی مجلس وعظ میں تو یہ حال تھا کہ لوگ چیخ مار مار کر روتے تھے، لوگوں پر غشی طاری ہو جاتی تھی اور بیہوش ہو ہو کر گرتے تھے اور لوگ ہاتھوں میں اٹھا کر لے جاتے تھے، اپنی پیشانی کے بال ان کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ سر پر ہاتھ پھیرتے تھے[1]۔ ابن بطوطہ نے متعدد ہندوستانی واعظین کی تاثیر کے ایسے ہی واقعات لکھے ہیں۔

حافظ ابن جوزی رح نے ایک موقع پر تخمینہ لکھا ہے کہ ایک لاکھ انسانوں نے ان کے ہاتھ پر توبہ کی ہے[2]۔ پانچویں صدی کے ایک محدث شیخ اسمٰعیل لاہوری کے متعلق مورخ کے الفاظ ہیں "ہزار ہا مردم در مجلس وعظش مشرف باسلام شدند"[3] کفر و بے دینی کے تسلط اور غلبہ کے زمانے میں اثر پذیری کی ایسی مثالیں عنقا ہوتی ہیں اس دور میں مؤثر سے مؤثر دینی خطابت اور اخلاقی نصائح بے اثر ہوتے ہیں۔

خدا کا خیال اس وقت زندگی میں داخل تھا جس سے کسی قوم یا مذہب یا فرقہ و خیال کا آدمی خالی نہ تھا، زبان و ادب میں خداشناس طرز ادا اور مذہبی تعبیرات اور وحی و رسالت کی زبان، روح اور خون کی طرح ساری ہو گئی تھی کہ اس زبان و ادب کو اس سے معرا نہیں کیا جا سکتا تھا، اسلامی تعبیرات دینی آداب اور جملے غیر مسلموں کی زبان پر اس طرح جاری ہو گئے تھے اور وہ ان کے اس درجہ خوگر ہو گئے تھے کہ دوسرے ہم معنیٰ جملوں سے ان کی تشفی نہیں ہوتی تھی، غیر مسلم ادیب اور فاضل قرآن مجید حفظ کرتے تھے، مشہور ادیب اور کاتب ابواسحاق صابی کے متعلق منقول ہے کہ وہ رمضان مبارک کے روزے بھی رکھتا تھا۔

خدا طلبی کا ذوق ساری اسلامی دنیا میں عام تھا، ہزاروں لاکھوں اشخاص اسلامی ملکوں اور شہروں میں دین کی طلب اور مردانِ خدا کی تلاش میں صحراؤں پہاڑوں اور وادیوں کو عبور کر کے دنیا کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ میں پہونچتے تھے۔ خدا کی طرف بلانے والوں کی ذات مرجع خلائق اور ان کے مقامات طالبین خدا کے ہجوم سے معمور رہتے تھے اور ان کی آبادی و رونق حکومت کے مرکزوں اور اہل حکومت کے دفاتر سے کہیں بڑھ کر تھی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مجلس خلفاء عباسیہ کے دربار سے زیادہ پرہیبت اور بارونق تھی۔ محدث ابن جوزی کا بیان ہے کہ حضرت شیخ احمد رفاعی کی خانقاہ میں میں نے پچاس ہزار انسانوں کا قیام دیکھا ہے، امراء اور اغنیاء بھی دین کے خیال اور خدا طلبی سے خالی نہ تھے، سوانح و تراجم کی کتابیں ایسی مثالوں سے پر ہیں۔

دین حق کی قوت و شوکت دیندار سلاطین اور احکام شریعت کی عمومی اشاعت سے دنیا میں عمومی اور خصوصی طور پر جو فوائد و برکات انسانوں کو پہونچتے ہیں اور اس کے جو روحانی باطنی ذہنی اور اخلاقی نتائج و اثرات ہوتے ہیں ان کا استقصا کرنا بہت مشکل ہے اس کا کچھ اندازہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے دین کے عروج و تنزل کے دونوں دور اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں یا گہری نظر سے اور صحیح حس کے ساتھ موسم بہار اور موسم خزاں کے تغیرات کا مطالعہ کیا ہو۔　　　(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

[1] رحلۃ ابن جبیر ص ۳۰۱　[2] صید الخاطر، لفتۃ الکبد　[3] تذکرہ علماء

فاران

ماہر القادری

خدا کا شکر ہے کہ

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ - کراچی

کے دونوں جہاز

"سفینۂ عرب" و "سفینۂ مراد"

کراچی اور بمبئی سے حجاج کی خدمت میں مصروف ہو گئے ہیں - یہ جہاز مسافروں کے لئے
نہایت موزوں اور آرام دہ ہیں -

اس کمپنی کے حصص برائے فروخت موجود ہیں

فی حصہ ۱۰۰ روپیہ

فارم اور پراسپیکٹس ذیل کے پتہ سے منگوائیے :-

پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ

- بندوق والا بلڈنگ - میکلوڈ روڈ - کراچی

تار : الصادق

ٹیلیفون [illegible]

جلد ۳ —— شمارہ ۴

ماہنامہ

فاران

جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) —— فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) —— فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ اول

بھارت کی "لادینی حکومت" (SECULAR STATE) کو ہزار ہزار بدھائی اور لاکھ لاکھ دھن باد کہ اس کے پوتر استھان اجودھیا جی میں ایک طرف "ملیچھ مسلمانوں" سے مسجد چھین لی جاتی ہے اور دوسری طرف "سومنات" کے مندر کی رسمِ افتتاح میں بھارت راج کے حاکمِ اعلیٰ شری راجندر پرشاد جی بہ نفسِ نفیس شرکت فرماکر "شیولنگم" پر "سرکاری چھاپ" لگادیتے ہیں، جس طرح ہاتھی کے دانت کھانے کے اور، دکھانے کے اور ہوتے ہیں، شاید نہیں بلکہ یقیناً بھارت کے کرتا دھرتاؤں کے کہنے کی زبان اور ——— اور کرنے کی زبان اور ہے، اور یہ وہ "دھرماتما" اور "مہاپرش" ہیں جو کل تک انگریز کی منافقت، فریب کاری اور دوغلی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کیا کرتے تھے کہ انگریز کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے ؛

بھارت کے بے بس اور مظلوم مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر وہ خاموش ہیں، کہیں تو کس سے کہیں "

"وہی منصف، وہی شاہد وہی خود قاتل ہے
اقربا میرے کریں خون کا دعوےٰ کس پر"

بھارت راج کے عدل و انصاف کا تماشا وہ چار سال سے دیکھ رہے ہیں، کچھ نہ کہنے پر بھی بیچاروں کو "ناکردہ گناہی" کی سزا بھگتنی پڑ رہی ہے، جان و مال اور عزت و ناموس کی قربانی دینے کے بعد بھی ان کی "وفاداری" آج تک مشتبہ ہے ؛

ہمارا دل کہتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو اور راج گوپال آچاریہ کو سومنات کے مندر کی اس عجیب و غریب مذہبی تقریب میں صدر جمہوریہ ہند کی شرکت ناگوار گزری ہوگی، کیا عجب ہے کہ انھوں نے زبان سے بھی کہا ہو، اور زبان

سے نہیں کہا تو اُن کے دل تو ضرور کہتے ہوں گے کہ ہز شری راجندر پرشاد جی! سیکولر حکومت کے سب سے بڑے حاکم اس تقریب میں شریک دیکھ کر، دُنیا کیا کہے گی؟ اور کیا سمجھے گی؟ ایک طرف ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہماری حکومت "لادینی" ہے اور دوسری طرف ہمارا یہ عالم ہے کہ مہنتوں، پنڈتوں، جٹا دھاریوں اور سیوا سنگھیوں کے اشاروں پر ہم پھر کنی کی طرح گھوم رہے ہیں، آپ ایشور کے لئے وہاں نہ جائیے، ہماری تاریخ اقتدار کے شروع کے اوراق کو اتنا زیادہ داغدار تو نہ ہونے دیجئے ——

—— مگر یہ سب نصیحتیں، مشورے، گزارشیں اور ناگواریاں دھری کی دھری رہ گئیں، مہا سبھا کے نیتاؤں کی فتح ہوئی اور ٹنڈن جی، ڈاکٹر کھرے اور شری گول والکر جی کا سر پُر غرور اور اونچا ہو گیا، اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بھارت میں ہوا کا رُخ کدھر ہے؟

مندر بن سکتے ہیں، مورتی پوجا ہو سکتی ہے سنکھ بجائے جا سکتے ہیں اور یہ سب کچھ ہو ہی رہا ہے ——

—— مگر "سومنات" کے مندر کی تعمیر جس اعلان کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور اس سلسلہ میں جو باتیں کہی گئی تھیں اُن میں تلخی اور دل آزاری کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں، مسلمانوں کو "چنوتی" دی گئی، اُن کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا گیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا جو ایک عالی ظرف اور شریف قوم کے شایانِ شان نہ تھا —— اس کا ردِّ عمل "پاکستان" کے اخباروں میں یہ نظر آیا کہ جس دن سومناتھ کے مندر کا شاہانہ پھاٹک کھل رہا تھا اور "شیو لنگم" کو ڈنڈوت کی جا رہی تھی اُس دن بہت سے "محمود" پاکستان میں جنم لے رہے تھے۔

سومنات کے مندر کی تعمیر پر برافروختہ ہونے والے "محمود غزنویوں" سے ہم پوچھتے ہیں کہ تم نے کبھی اپنے دل کی طرف بھی جھانک کر دیکھا ہے کہ تم خود اپنے اندر "سومنات" لئے ہوئے بیٹھے ہو، تم نے سچ مچ بُت فروشی اور بُت گری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے، تمھیں معلوم ہے کہ تمھارے "سومنات" کے بُت اینٹ، پتھر، لکڑی، سیمنٹ اور چونے کے بنے ہوئے بتوں سے زیادہ مضبوط ہیں —— آہ! تمھاری خواہشوں کے یہ سنگین و متحرک بُت، جن کو تم ہر آن پوج رہے ہو! —— اور تمھاری تمناؤں کے یہ معبود جن کے آگے تم پیشانیاں گھس رہے ہو!

تم نے اپنے جن بچوں کا نام "محمود" رکھا ہے جب وہ "بُت تراشی" کے ماحول میں پرورش پائیں گے تو اُن سے "بُت شکنی" کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ تم دنیا سے زیادہ خود اپنے نفس کو دھوکا دے رہے ہو۔ صرف لفظوں اور زبانی دعوؤں سے انقلاب برپا نہیں ہوا کرتا، ذہنی جھنجلاہٹ سے قوموں کی تقدیریں نہیں بدلا کرتیں، جہاں تک ناموں کا تعلق ہے تو تمھارے یہاں "صلاح الدین"، "محمود"، "طارق"، "عباس"، "حسین"، "حمزہ"، "علی" اور "فاروق و صدیق" کی پہلے سے بھی کمی نہیں ہے، مگر آہ! یہ نام کے "علی" اور "فاروق"! سچ مچ "زنگیوں" اور "حبشیوں" نے اپنا نام "کافور" رکھ لیا ہے! تمھارے کردار اور سیرت کی نسبت سے یہ مقدس نام بھی شرمائے جاتے ہیں ——

"سومنات" کی تعمیر پر "سرکہ جبیں" ہونے والو! پہلے اپنے دل کے صنم خانوں کی تو خبر لو، خدا کے خوف کی دل میں کوئی رمق باقی رہی بھی ہے؟ آخرت کا بھولے سے خیال بھی آتا ہے؟ دُنیا کے دلچسپ اور پُر شور ہنگاموں میں احتساب نفس کے لئے فرصت کا ایک لمحہ بھی نصیب ہوتا ہے؟ کبھی سوچا ہے کہ اعمال و کردار اور طریق حیات

عہ اس "تم" میں ان سطور کا لکھنے والا بھی شامل ہے (م - ق)

کے اعتبار سے تم میں اور کافروں میں کونسی چیز وجہ امتیاز رہ گئی ہے؟ تمھیں میں ایسے عجیب و غریب "توحید پرست" بھی ہیں جو درگاہوں اور قبروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور اُن سے مُرادیں مانگتے ہیں

؎ یہ مسلماں ہیں جنھیں دیکھ کے شرمائیں ہنود

وعظوں اور جلسوں میں خیبر و مدائن کی فتح پر "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے لگانے والو! غور بھی کیا کہ جن کے کارناموں پر تم فخر کرتے ہو وہ کیا تھے؟ اور تم کیا ہو؟ تمھارے بوڑھوں تک کا یہ عالم ہے کہ حسن و شباب کے معصیت آلود نظاروں کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور اُن کے جوانوں کی یہ کیفیت تھی کہ اُن کی نگاہیں شرم و حیا کے مارے ہر دم جھکی رہتی تھیں، وہ بازاروں سے گزرتے تھے تو دیکھنے والے محسوس کرتے تھے کہ پاکبازی، نیکوکاری اور بھلائیاں چل پھر رہی ہیں! تمھارے طلباء "گریٹا گاربو" اور "مدھوبالا" کے نسب ناموں اور سوانح حیات کے حافظ ہیں اور اُن کے نوجوان کتاب و سنت سے شغف رکھتے تھے، تمھارے نوجوان فلموں اور ڈراموں کی "ٹیک نک" کو جانتے ہیں اور اُن کے نوجوان مشیت کے تیوروں کو پہچانتے تھے اور قرآن و حدیث کے منشا کو سمجھتے تھے، وہ اللہ سے راضی تھے اور اللہ اُن سے راضی تھا اور تم اپنے اعمال سے اللہ کی ناراضگی کو دعوت دیتے ہو۔

اُن کی قناعت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ دُنیا اُن کے پیچھے بھاگتی تھی اور اقبال مندیاں اور کامرانیاں اُن کی رکابیں تھام کر چلتی تھیں اور تمھاری حرص و ہوا کی یہ حالت ہے کہ تم دُنیا کے پیچھے دوڑتے ہو مگر دُنیا کسی طرح ہاتھ نہیں آتی، تم تقدیر کے شکوہ سنج ہو اور وہ خود "تقدیر یزداں" بن گئے تھے، وہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور تم پان، سگریٹ اور سینما بینی کے اخراجات میں بھی ایک پائی کی کمی گوارا نہیں کرسکتے — وہ متحد تھے، تم پراگندہ ہو، وہ سراپا اخلاص تھے اور تم مجسّم تصنّع ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی سے نہ ڈرتے تھے اور تم دُنیا کی ہر چیز سے ڈرتے ہو بس ایک اللہ ہی سے نہیں ڈرتے، تمھاری محفلیں فرمائشی قہقہوں سے گونجتی ہیں اور تمھاری آنکھیں اللہ کے خوف سے رونا شاید بھول گئی ہیں۔

تم سر سے پیر تک قول ہی قول اور گفتار ہی گفتار ہو اور وہ از فرق تا بقدم عمل ہی عمل اور کردار ہی کردار تھے، تم شکم سیر ہو کر بھی اللہ کا شکر نہیں بجا لاتے اور وہ تین تین وقت کے فاقے کی حالت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے تھے، اُن کا جینا اور مرنا اللہ کے لئے تھا اور تمھارا جینا اور مرنا اپنے نفس کے لئے ہے۔ جب یہ حالات ہوں تو پھر "تعمیرِ حرم" کیوں ہونے لگی، تمھیں ذلیل و رسوا کرنے کے لئے "سومنات" ہی بننا چاہیئے تھا! اللہ کا عذاب پتھروں، بجلیوں، زلزلوں اور خون اور چیخ کی صورت ہی میں سدا نازل نہیں ہوا کرتا، ظالموں کا "تسلط" خود بہت بڑا عذاب ہے۔

دعوتِ فکر و عمل!

غفلت اور درماندگی کی انتہا ہو چکی، آخر یہ مدہوشیاں کب تک؟ تم کو تو دُنیا کی قیادت اور خدا کی زمین پر چھا جانے کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور تم ہو کہ دبے جا رہے ہو گویا کہ تم کبھی سربلند ہی نہ تھے، تم نے قوموں کو پستیوں سے بلندی کی طرف اُچھالا ہے اور تم اب خود ہی پست ہوئے جا رہے ہو جیسے کہ تم سدا سے پست ہی رہے ہو — ایسا

کیوں ہے؟ کبھی سوچا، غور کیا، اپنی حالت کا جائزہ لیا؟ ناگوارِ خاطر نہ ہو تو ہم عرض کریں، اور خدا کی قسم جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں اُسے تم خود بھی جانتے ہو، ہم تمھیں غافل تو سمجھتے ہیں مگر انجان نہیں سمجھتے، تمھیں اپنے مرض کی دوا معلوم ہے لیکن تم اُسے استعمال نہیں کرتے، مگر ہم جیسے سرپھرے تیماردار تمھیں دوا پلا کر چھوڑیں گے چاہے دُعاؤں کی جگہ تم ہمیں گالیاں ہی کیوں نہ دیتے رہو ؛

ہم تم سے مایوس نہیں ہوئے کہ تمھاری خاکستر میں "شررِ زندہ" ہمیں دکھائی دے رہے ہیں، تمھاری "کشتِ ویراں" سے نا اُمیدی نہیں ہے، یہ مٹی بڑی زرخیز ہے بس ذرا اُس کے نم ہونے کی دیر ہے، اللہ تعالیٰ سے اگر اب بھی تم اپنا تعلق اُستوار کر لو اور اپنی زندگیوں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال لو تو پھر اللہ کی فتح و نصرت کے آنے میں دیر کیوں ہونے لگی؟ ؛

تمھارے عوام ہی کو نہیں حاکموں کو بھی بدلنا ہے، تمھارے جاہلوں ہی کی نہیں عالموں، واعظوں اور دانش وروں کی زندگیوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے، "خواجہ بلند بام" ہی کو نہیں "فقیر کوچہ گرد" کو بھی تبدیل ہونا ہے —— یہ تبدیلی جتنی جلد ہو گی، اُتنی ہی جلد تم اپنے کو سربلند اور اُبھرا ہوا پاؤ گے، اور "سومنات" کی تعمیر پر ٹنڈن نے جو بڑے بول بولے ہیں، اُس کا جواب بھی انشاء اللہ ہاتھ کے ہاتھ مل جائے گا، وقت کا دھارا مُڑنے ہی والا ہے کہ ظلم اپنے کمال کو پہنچ چکا ؛

ہم پھر کہتے ہیں اور تاکید کے ساتھ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کام رُکے گا نہیں، تم اگر نااہل ثابت ہوئے تو اللہ کسی دوسری قوم کو تمھاری جگہ کھڑا کر دے گا ...... مگر ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ کام تمھارے ہی ہاتھوں کیوں نہ انجام پائے؟ اور انشاء اللہ تم ...... ہاں! ہاں! تم ہی اس کو انجام دو گے، اللہ کی غیرت اور تمھاری حمیت یہ دونوں ساتھ ہی ساتھ جوش میں آئیں گی ...... اور پھر بشارتیں ہی بشارتیں، سعادتیں ہی سعادتیں، فتحمندیاں ہی فتحمندیاں! یہاں تک کہ ساری زمین اللہ کے دین سے معمور ہو جائے گی ؛

یہ بھی سُن رکھو کہ "باطل" آپ ہی آپ نہیں مٹا کرتا، "حق" آتا ہے اور پوری قوت اور ضروری ساز و سامان کے ساتھ آتا ہے، تب "باطل" مٹتا ہے، اور "حق" زمین سے خودرو سبزے کی طرح بھی نہیں اُگتا، اُسے قوتِ عمل اور جوشِ ایمانی کے ساتھ قایم کیا جاتا ہے، خود حرمِ کعبہ میں صدیوں تک بتوں کی پوجا ہوتی رہی ہے مگر جب تک مکہ فتح نہیں ہو لیا اور "حق" قوت بن کر نہیں آیا اُس وقت تک "بت" ہٹ نہیں سکے اور باطل مٹا نہیں —— اس راز کو تم نے سمجھ لیا اور "جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا" اگر تم قوت و عمل کی زبان سے دُہرانے کے قابل ہو گئے تو پھر "سومنات" کے مندر، "اجودھیا" کی مسجد اور کشمیر و فلسطین کے مسئلے آن کی آن میں حل ہو جائیں گے حق کے سامنے باطل ٹھیر ہی نہیں سکتا، شمع جلتی ہے تو اندھیرا آپ ہی آپ غائب ہو جاتا ہے، پس تمھیں اس باطل پرست دنیا میں نشانِ حق و صداقت بننا ہے تاکہ باطل اور اُس کی دراز دستیاں مٹ جائیں اور دُکھی انسانیت کو آسودگی میسر آسکے ؛

ماہر القادری

۱۵ / جون ۱۹۵۱ء

ترجمہ :- منتخب الحق برکاتی
(پروفیسر اردو کالج)

امامِ ابو یوسفؒ کا مکتوب

خلیفہ ہارون الرشید کے نام!

عوام سوچیں علماء سمجھیں اور
اربابِ حکومت اس آئینہ میں
اپنے چہروں کو دیکھیں!

وہ دستور

جس کی سیاہی بارہ سو برس کے بعد بھی
خشک نہیں ہوئی ——!

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(یہ وہ مکتوب ہے جس کو (امام) ابو یوسف رح نے امیر المومنین ہارون الرشید کے پاس بھیجا)

—×—×—×—×—×—×—

اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی حیات دراز فرمائے، اور پوری نعمتوں اور دائمی کرامتوں کے ساتھ غلبہ و عزت کو اُن کیلئے جاوداں بنائے، اور ان پر جو نوازشیں ارزانی فرمائی اس کو ناختتم اور غیر فانی نعیم آخرت کے ساتھ متصل کر دے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت سے سرفراز فرمائے ؛

امیر المومنین (ایدہ اللہ تعالیٰ) نے مجھ سے یہ خواہش کی ہے اُن کے لئے ایک ایسی جامع کتاب مرتب کروں جو خراج اور عشور اور صدقات اور جزیہ کے لئے، اور ان کے علاوہ ان تمام امور کے لئے جن پر نظر رکھنا اور جن کو بروئے کار لانا امیر المومنین پر واجب ہے، ایک دستور العمل کا کام دے۔ اس درخواست سے امیر المومنین کا مقصد صرف یہ ہے کہ رعایا سے ظلم و زیادتی دُور کی جائے۔ اور اُن کے حالات کو سدھارا جائے۔ اللہ تعالیٰ امیر المومنین کو توفیق دے، اور سیدھی راہ چلائے اور انکی ذمہ داریوں میں ان کی مدد فرمائے اور خوف و اندیشہ سے محفوظ رکھے، اور امیر المومنین نے یہ خواہش کی کہ میں اُن کے لئے دستور العمل کو بیان کردوں اور اس کی شرح و تفسیر بھی کردوں، چنانچہ میں نے شرح و تفسیر کردی ہے ؛

امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے (ساری تعریفیں اسی کے لئے ہیں) عظیم الشان ذمہ داری کا طوق آپ کے گلے میں ڈالا ہے، اس کا ثواب بڑا ثواب ہے، اور اس کا عقاب شدید ترین عقاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کی ذمہ داریوں کا طوق آپکے گلے میں ڈالا ہے، اور خدا نے جن لوگوں کا آپ کو نگہبان بنایا ہے، اور جن کی امانت آپ کو سونپی ہے، اور جن کو آپ کے لئے امتحان

کی کسوٹی بنایا ہے، اور جن کے معاملات کا آپ کو والی مقرر فرمایا ہے اُن کثیر التعداد مخلوق کے لئے آپ ہر صبح و شام ایک عمارت بناتے ہیں اور وہ عمارت جس کی بنیاد تقویٰ پر نہ رکھی گئی ہو دیرپا نہیں ہوتی، (بلکہ ایسی عمارت کے لئے یہ اندیشہ بعید نہیں ہے کہ) اللہ تعالیٰ اس کے ستونوں کو توڑ ڈالے، اور اس عمارت کو بانی، اور اس کے مددگاروں کے اوپر گرا دے۔ پس اس اُمت (مسلمہ) اور دوسری رعایا کی ذمہ داریوں کا قلادہ جو آپ کو پہنایا گیا ہے اس کو ہرگز ضائع نہ کیجئے۔ اس لئے کہ ساری قوتیں باذنِ الٰہی (اچھے) عمل ہی میں ہیں۔

آج کا کام کل کے لئے نہ اُٹھا رکھیئے، جب آپ ایسا کریں گے تو (اپنی ذمہ داری کو) ضائع کر دیں گے، آرزوؤں کی نسبت موت قریب تر ہے، موت کی طرف (توشہ) عمل کے ساتھ قدم بڑھائیے، اس لئے کہ موت کے بعد کوئی (موقع) عمل نہیں، اور "دُعاۃ" (سلاطین) اپنے (رب) آقائے حقیقی کی بارگاہ میں اسی طرح جوابدہ ہیں جس طرح ایک چرواہا اپنے آقا کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے، پس جن اُمور کی ذمہ داریاں آپ کو ایک گھڑی کے لئے بھی سونپی گئی ہوں ان میں اقامتِ حق کیجئے، اس لئے کہ قیامت کے دن خدا کے نزدیک سعید ترین راعی وہ ہے جو اپنی رعایا کے لئے وجہ خوش نصیبی ہو، (کبھی حق سے) کجی اختیار نہ کیجئے ورنہ آپ کی رعایا کجرو ہو جائے گی، اور خواہشِ نفس کے ماتحت حکم دینے سے اور داعیۂ غضب کے ماتحت مواخذہ کرنے سے پرہیز کیجئے۔ اور جب ایسے دو امر آپ کو نظر آئیں جن میں سے ایک دنیا کے لئے مفید ہو اور دوسرا آخرت کے لئے تو آپ اس کو اختیار کیجئے جو آخرت کے لئے مفید ہے، کیونکہ آخرت باقی ہے اور دنیا فانی ہے، اور خدا سے پُرحذر اور پُرخوف رہئے، اور احکامِ الٰہی میں قریب و بعید تمام لوگوں کو ایک درجہ پر رکھئے، اور (احکام) الٰہی کے معاملہ میں کسی کی ملامت کا خوف نہ کیجئے، اور (خدا سے) ڈریئے، ڈرنا دل سے ہوتا ہے، زبان سے نہیں ہوتا، اور مواخذۂ الٰہی سے بچئے، یہ بچاؤ (معاصی سے) اجتناب کے ذریعہ ہوتا ہے، اور جو بچاؤ کی راہ اختیار کرتا ہے خدا اس کو بچاتا ہے، عمل کیجئے اس مقررہ وقت کے لئے جو یقینی ہے، اور اس راہ کے لئے جس پر چلنا ہے، اور اس طریق کے لئے جس کو اختیار کرنا ہے، اور اس گھاٹ کے لئے جس پر اترنا ہے، اس لئے کہ یہی وہ موردِ حق اور موقفِ اعظم ہے جہاں دل لرزتے ہیں اور جہاں حجتیں دابِ شاہی کی وجہ سے منقطع ہو جاتی ہیں، وہ بادشاہ (حقیقی) جس کے جبروت نے سب کو مغلوب کر دیا ہے، اور جس کے سامنے ساری مخلوق سرنگوں ہے، اور اس کے فیصلہ کی منتظر اور اس کی عقوبت سے ترساں ہے، اور یہ ہونے والے واقعات (ایسے یقینی ہیں) کہ گویا ہو چکے، اس دن اس بڑی پیشی کے وقت اس شخص کے لئے انتہائی حسرت و ندامت ہے جس نے جانا اور عمل نہیں کیا، وہ ایسا دن ہوگا جس میں قدم لڑکھڑائیں گے، اور رنگ متغیر ہو جائیگا، اور قیام طویل ہوگا اور حساب شدید ہوگا، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:- وان یوماً عند ربك كالف سنة مما تعدون۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:- ھذا یوم الفصل جمعنا کم والاولین۔

اور فرماتا ہے:- ان یوم الفصل میقاتھم اجمعین۔

اور فرماتا ہے:- کانھم یوم یرون مایوعدون لم یلبثوا الّا ساعة من نھار۔

اور فرماتا ہے:- کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیة او ضحاھا۔

یہ گردشِ لیل و نہار ہی ہے جو ہر نئے کو پرانا کر دیتی ہے، اور ہر بعید کو قریب کر دیتی ہے، اور ہر موعود کو موجود کر دیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کے کسب و عمل کا بدلہ دیتا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ سریع الحساب ہے، اللہ اللہ، بقا تھوڑی ہے، کام عظیم الشان ہے، دنیا اور اہلِ دنیا سب فنا پذیر ہیں اور آخرت ہی دار القرار ہے، کل خدا سے ایسی حالت میں ملاقات نہ کیجئے کہ آپنے حد سے

تجاوز کرنے والوں کی راہ اختیار کی ہو، اس لئے کہ فیصلہ کے دن کا منصف حقیقی اعمال کے پیش نظر فیصلے نافذ فرمائے گا، دُنیوی مرتبہ کے لحاظ سے نہیں، خدا نے آپ کو خطرات سے ڈرایا ہے، آپ ڈرئیے، اس لئے کہ آپ نہ عبث پیدا کئے گئے ہیں اور نہ بیکار چھوڑے گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ آپ کے حالات و اعمال کی آپ سے باز پرس کریگا، آپ اپنے جواب پر غور کر لیجئے، اور یہ جان لیجئے کہ کل خدائے برتر کی بارگاہ میں بندے کے قدم باز پرس کے بعد ہی اپنی جگہ سے ہٹنے پائیں گے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن کسی بندے کے قدم اپنی جگہ سے اس وقت تک ہٹنے نہیں پائیں گے جب تک اُس سے چار چیزوں کے متعلق باز پرس نہ ہولے:-

۱ : اُس کے علم کے متعلق کہ کس حد تک اس کے مطابق عمل کیا،

۲ : اُس کی عمر کے متعلق کہ کس (دُھن) میں اس کو ختم کیا،

۳ : اور اُس کے مال کے متعلق کہ کہاں سے حاصل کیا اور کس میں خرچ کیا،

۴ : اور اُس کے (پیرھن) جسم کے متعلق کہ اس کو کس طرح پُرانا کیا،

اے امیر المومنین ان سوالوں کے جواب تیار کر رکھیے، آپ جو عمل بھی کرتے ہیں چاہے وہ کتنے ہی پوشیدگی کے ساتھ کئے جائیں۔ کل آپکے سامنے اس کو پڑھا جائے گا، آپ علیٰ رؤس الاشہاد خدا کے سامنے اپنے پردہ کے چاک ہونے کو یاد کیجئے۔

امیر المومنین! اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی حفاظت کا آپ سے مطالبہ فرمایا ہے میں اُنکی حفاظت کی اور جن چیزوں کی نگہبانی آپ سے طلب کی ہے میں اس کی نگرانی کی آپ کو ہدایت کرتا ہوں، اور میں آپ کو یہ ہدایت بھی کرتا ہوں کہ آپ کی توجہ صرف خدا کی طرف ہو اور آپکو صرف اُسی کی خوشنودی مطلوب ہو، اس لئے کہ اگر آپ ایسا نہیں کریں گے تو شاہراہ ہدایت کی سہولت دشوار گزار بن جائے گی، اور اس کے نشانات آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے بلکہ مٹ جائیں گے، اور اس کی کشادگی تنگی سے بدل جائے گی، اور دین کی اچھی باتیں بُری معلوم ہونے لگیں گی، اور بُری باتیں اچھی معلوم ہونے لگیں گی، پس آپ اپنے نفس کا مقابلہ کیجئے، ایسا مقابلہ جو اس کو مغلوب کرنے والا ہو، ایسا نہیں جو اس کو غالب کرنے والا ہو۔ اس لئے کہ زیاں کار راعی ہلاکی و نقصان کا ضامن ہوتا ہے، اگر وہ چاہتا تو ہلاکت اور خطرہ سے نکال کر زندگی اور خلاصی کے مقام پر لے آتا، لیکن جب اُس نے (اپنی غفلت کی وجہ سے) ایسا نہیں کیا تو وہ زیاں کار ہوا، اور اگر وہ اپنی رعایا کی نگہبانی چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مشغول ہو جائے تو ہلاکی بڑی سُرعت سے آتی ہے اور سخت ضرر رساں ہوتی ہے۔

سید عبدالقدوس ہاشمی

احادیث کی شرعی حیثیت

ایک سال سے بھی زیادہ مدت گزری کہ میرے ایک دوست نے مجھے منکرین حدیث کی بعض تحریریں مطالعہ کے لئے دی تھیں، میں نے اس سے پہلے بھی بعض ایسے مضامین پڑھے تھے، اب بھی میں نے شوق اور توجہ کے ساتھ ان تحریروں کو پڑھا، اس کے بعد میں نے بعض رسائل کی جلدیں حاصل کیں، اور بعض کتابیں منگوائیں، اُن کو دیکھا، میں نے اس فرقہ کی مخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے عمداً ترک کیا، اور شاید ایک تحریر بھی پوری نہیں پڑھی، تاکہ مجھے آزاد رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے ۔

اس کے بعد میں نے کتب احادیث، اصول، اور رجال کا مطالعہ شروع کیا، میں نے اپنے پچھلے مطالعہ پر بھروسہ نہیں کیا، طالب علم کا یہ کام نہیں، اُسے اپنے مطالعہ کو تازہ کرتے ہی رہنا چاہیئے۔ بہرحال! اس ایک سال میں میری پچھلی بیس بائیس سال کی طالب علمانہ زندگی میں خصوصیت کے ساتھ اس کا موقع میسر آسکا۔ مجھے مہارتِ فن اور وسعتِ مطالعہ کا دعویٰ نہیں ہے، یہ حیثیت کہ مجھے پچھلے بیس سال تک کتب خانوں ہی میں رہنے، اور گیارہ سال تک مسلسل علم رجال و تراجم کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی حاصل نہ ہو سکی ہو، اب ایک سال میں کیا حاصل ہو جاتی، لیکن مجھے منکرینِ حدیث کی جرأت بیجا پر تعجب ضرور ہوا۔

کسی چیز کا اقرار کرنے کے لئے علم محدود بھی کافی ہے۔ لیکن انکار کے لئے تو بہت بڑے مطالعہ کی ضرورت ہے، اتنے وسیع مطالعہ کی جس سے اس مسئلہ سے متعلق تمام جزئیات علم میں آجائیں، اور مطالعہ کرنے والے کی نظر تمام ماخذوں پر حاوی ہو سکے۔ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ کوئی بے علم خود علامہ اصول حدیث کی ایک کتاب "نخبۃ الفکر" یا جزائری کی "توجیہ النظر" سامنے رکھ لیں اور بیسیوں صفحات میں ایک مضمون حوالۂ قلم فرمادیں کہ "احادیث حجت شرعی" نہیں ہیں، مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر کوئی شخص صرف یہ دعویٰ رکھتا ہو کہ "حجۃ اللہ البالغہ" شاہ ولی اللہ رح کی تصنیف ہے تو اس کے لئے اتنا محدود علم بھی کافی ہے کہ اس نے "حجۃ اللہ البالغہ" کا کوئی نسخہ دیکھا ہو جس پر شاہ ولی اللہ رح کا نام بحیثیت مصنف درج ہو، شاہ ولی اللہ رح کے کسی سوانح نگار نے انکی تصنیفات میں اس کتاب کا ذکر کیا ہو، لیکن اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ "حجۃ اللہ البالغہ" شاہ صاحبؒ کی تصنیف نہیں ہے، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ شاہ صاحب کی ساری تصانیف سے واقف ہو، انکی پر سوانح عمری، اس کی نظر سے گزر چکی ہو، اور سب سے زیادہ یہ کہ جب "حجۃ اللہ البالغہ" کا کوئی نسخہ اُس کے سامنے رکھا جائے تو وہ بتا سکے کہ اگر شاہ صاحب کی نہیں تو پھر یہ کس شخص کی تصنیف ہے، یا داخلی و خارجی شہادت سے یہ ثابت کر سکے کہ "حجۃ اللہ البالغہ" شاہ صاحب کی تصنیف نہیں ہو سکتی ۔

انکار کے لئے مطالعہ کا زیادہ وسیع ہونا ضروری ہے، اور علمی مسائل میں یہی طریقہ رائج ہے، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ اپنے وقت کا کوئی لمحہ مطالعہ پر صرف کئے بغیر بڑے سے بڑے مسلمات سے انکار کر دیتے ہیں، اور پھر اس انکار کو ایک مذہب و مسلک قرار دے کر دنیا کو اس کے قبول کی دعوت دیتے ہیں۔ فضلوا واضلوا،

علم حدیث ایک مستقل اور وسیع فن ہے، اس کے ساتھ علم الروایۃ، اصول حدیث، علم الرجال، اور علم التراجم وغیرہ کا گہرا تعلق ہے، کسی مدرسہ کا نصاب ختم کر لینے کے بعد، یا دو چار کتابوں کی اُلٹ پھیر سے ہم اس قابل نہیں ہو سکتے کہ فیصلہ کن

انداز میں حاکمانہ تحریریں لکھ سکیں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ عمر کے قیمتی لمحات مطالعہ اور فکر پر صرف کئے جائیں، ہاں! اگر اس کے بعد کوئی رائے قایم کریں تو چاہے وہ ساری اُمت کے خلاف کوئی رائے ہو، ایک قابلِ وقعت رائے ہوگی۔ خضری کی محاضرات کا ترجمہ کر کے کوئی شخص اپنے آپ کو "تاریخِ اُمت" کا مورخ تو بنا سکتا ہے، لیکن صرف "توجیہ النظر" کا مطالعہ کر کے امام الحدیث نہیں بن سکتا۔

اس فن کی وسعت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حدیث کے رواۃ، حدیث کے الفاظ، حدیث کی تاریخ، حدیث کی جانچ پڑتال، حدیث کے مدارج، حدیث سے استنباط کے طریقے، اور اس طرح کے متعلقہ مسائل میں سے ہر ایک پر متعدد ضخیم کتب اور مجلدات موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص سمجھنا چاہتا ہے، اور اس کی طلب ہی چاہتی ہے تو اسے چاہئے کہ عمر کا ایک بڑا حصہ اس کے لئے صرف کرے، پڑھے اور سمجھے، پھر اقرار کرے یا انکار، شکایت نہیں۔ شکایت تو یہ ہے کہ لوگ محنت نہیں کرتے ہیں، اور بڑی بڑی باتیں بناتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے لکھ دیا کہ عہدِ صحابہ میں کسی نے کوئی حدیث لکھی ہی نہیں حالانکہ ایسے ۳۹ صحابہ کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے حدیثیں لکھ کر رکھی تھیں، اور اب تو خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی جا چکی ہے۔ ایک دوسرے صاحب ہیں جنھیں قربانی کی کوئی روایت نہیں مل سکی۔ شاید وہ حدیث کی کتابوں میں تلاش ہی نہ کر سکے ہوں، ایک تیسرے صاحب نے دعویٰ کیا کہ مغرب کی نمازوں میں دو رکعت سنت کسی روایت سے ثابت نہیں

ہیں۔ بزرگ اپنے اساتذہ سے یہ سنا ہے کہ اس قسم کے دعاوی سے پرہیز کرنا چاہئے، اور اپنے علم کو محیط علم کا مقام نہیں دینا چاہئے، اس لئے مجھے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ آئندہ سطور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، وہ سب کچھ ہے، اور اس سلسلے میں جتنی معلومات کی ضرورت ہے وہ سب مجھے حاصل ہیں۔ نہ اس مختصر مضمون میں معلومات کی تفصیل پیش کرنا مقصود ہے بلکہ میں اپنی طالب علمانہ کوششوں سے جس نتیجہ تک پہنچ سکا ہوں، وہ اس سلسلہ میں انتہائی اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں، اور پیش کرنے سے پہلے یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں ہر ایسے شخص کو جو احادیث کے "حجۃ شرعی" ہونے سے انکار کرتا ہے، "گم کردہ راہ" سمجھنے پر مجبور ہوں۔

منکرین حدیث کی تمام تحریروں کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

(۱) حدیثیں "حجت شرعی" نہیں ہیں، بلکہ ان کی حیثیت صرف تاریخ کی ہے، اور ان سے صرف تاریخی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، ان کو کسی مسئلہ میں بطور "حجت شرعی" پیش نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) قرآن مجید میں جتنی جگہ اطاعتِ رسول کا حکم ہے، اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت مرکزِ ملت اطاعت مراد ہے، اور آپ کے بعد جو خلیفہ یا امیر ہو، اُس کی اطاعت اس سے مُراد ہوگی۔

(۳) حدیثوں کو حجتِ شرعی کی حیثیت عہدِ بنو امیہ میں دی گئی جب کہ خلفاء بادشاہ بن گئے تھے،

(۴) حدیثیں تیسری صدی ہجری میں مدوّن ہوئیں، اسی لئے "قابلِ اعتماد" نہیں ہیں،

یہ تو ہیں ان کے دعاوی، باقی لمبی لمبی بحثیں، ان اُصول کو تسلیم کر لینے کے فوائد پر مشتمل ہیں، کچھ ائمہ جرح و تعدیل کے اقوال ہیں۔ یہ چیزیں قابلِ بحث نہیں، کتب تراجم و رجال میں ہر طرح کے اقوال و احوال ہیں، ان لوگوں نے تو سہل انگاری کی وجہ سے دو چار مشہور اقوال ہی پیش کئے ہیں، ورنہ شاید اور بہت سے مل جاتے، لیکن جو حدیثوں کو قابلِ استناد قرار نہ دے اُسے ان اقوال کے پیش کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں، کیونکہ ان کی نسبت اپنے کہنے والوں کی طرف خود احادیث سے

زیادہ مستند تو یقیناً نہیں ہے۔ رہ گئے وہ فوائد جو ان کے اصول کو قبول کرنے سے ہو سکتے تھے، وہ تو بہر حال اب حاصل ہو سکے، اور اب خدانخواستہ اس کی اُمید کی جا سکتی ہے کہ کرۂ زمین پر پھیلے ہوئے سارے مسلمان ان کا مسلک اختیار کر کے وہ مزعومہ فوائد حاصل کر سکیں گے، اس لئے ساری گفتگو منحصر ہو جاتی ہے، مذکورہ بالا چاروں اصول پر، آیئے ذرا ان کا علمی محاسبہ کریں،

اوّل ، حدیثوں کی حیثیت دینی تاریخ کی ہے، "حجت شرعی" کی نہیں ،

یہ "دینی تاریخ" اور "حجتِ شرعی" یا بقول جناب حافظ محمد اسلم جیراجپوری "دینی حجت" میں فرق کیا ہے ؟ یہ الفاظ کی بازی گری نہیں تو اور کیا ہے، عملی زندگی میں کیا فرق رہے گا، ایک تاریخی واقعہ ثابت ہے تو احکام کی تطبیق اس کے مطابق ہی تو ہو گی، مثلاً پاکستان میں ایک قانون بنایا جاتا ہے کہ عہدِ جہانگیری کی تمام عمارتوں کو محکمۂ آثارِ قدیمہ اپنی تحویل میں لے لے، کیا کسی عمارت کا یہ تاریخی ثبوت کہ جہانگیر نے اپنے زمانہ میں اسے تعمیر کرایا تھا، محکمۂ آثارِ قدیمہ کے لئے اس عمارت کو اپنی تحویل میں لینے کی حجت نہیں ہو گی ؟ -

تاریخی طور پر یہ ثبوت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بنی المصطلق میں نمازِ قصر پڑھی تھی، بطور "حجتِ شرعی" نہیں پیش کیا جا سکتا؟ تاریخ کا یہ واقعہ کہ قبیلۂ بنی تجیب کے تیرہ اشخاص جب زکوٰۃ لے کر دربارِ رسالت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے حضورؐ سے کچھ مسائل بھی پوچھے تھے، اور آپ نے ان کے جوابات لکھوا کر انکو دیدیئے تھے، ـــــ اگر یہ واقعہ ہے، اور "دینی تاریخ" کا مسلمہ واقعہ ہے تو ان احکام کی حیثیت کیا ہو گی، "حجت شرعی" یا "دینی حجت" کی نہ ہو گی ؟

ایک اور صُورت فرض کیجئے اگر کسی شخص کو تاریخی ثبوت سے یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں مکان اس کے باپ نے بنوایا تھا، اور کسی کو فروخت یا رہن نہیں کیا، تو ایسا شخص اس مکان پر وراثت کا دعویٰ نہیں کرے گا، اور وہی تاریخی ثبوت کیا اس کی وراثت کا ثبوت نہیں قرار پائے گا ؟

ہر واقعہ چاہے دینی ہو یا لادینی، تاریخ ہوتا ہے، اور ہر تاریخ اپنے اپنے موقع اور محل پر حجت فرعی یعنی قانونی دلیل بن سکتی ہے۔ عملی زندگی سے کتنی شدید بے خبری ہے جس کی وجہ سے لوگ اتنی گھٹیا درجہ کی لفظی بازی گری کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ لوگ اُن کے اس لفظی اُلجھاؤ کو "نظریہ" اور "کلیہ" کی حیثیت سے قبول کر لیں !

"دینی حجۃ" اور "دینی تاریخ" تو منکرین حدیث کے الفاظ ہیں، اصل سوال یہ ہے کہ حدیثوں کو منشاءِ قانون اور مأخذِ فقہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے یا نہیں ؟ اگر یہ لوگ اصولِ قانون کا مطالعہ کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ اسلامی قانون یعنی شرعِ اسلامی کے مأخذ دو ہی ہو سکتے ہیں، ایک "کتاب اللہ" اور دوسری سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ،

منکرین حدیث یہ طعنہ دیتے ہیں کہ اُمت نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر حدیثوں کو اختیار کر لیا، اور حق یہ ہے کہ یہ ان کی ناواقفیت ہے، ورنہ اُمت نے کسی زمانہ میں، کسی دور میں اور کسی جماعت میں قرآن کریم کے مقابلہ میں یا اس کے برابر احادیث کو مرتبہ نہیں دیا۔ بلکہ یہ اُصول مسلّمہ قرار دیا کہ نصِ قرآنی موجب علم یقینی اور نص قطعی ہے اور احادیث نصوص ظنیہ ہیں، یہ حجتِ شرعی تو ہیں لیکن نصِ قطعی نہیں۔ اگر کوئی حدیث صحیح ترین سند سے بھی مروی ہو، مگر نصِ قرآنی کے معارض واقع ہو تو عمل نصِ قرآنی پر ہو گا، حدیث چھوڑ دی جائے گی یا نصِ قرآنی سے منسوخ سمجھی جائے گی۔ یہی طریقہ عہدِ صحابہ میں تھا، یہی تابعین میں رہا، اسی کو فقہائے کرام نے اختیار کیا، اور یہی آج تک مسلمانوں میں رائج ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر قانون شریعت کا تصور تمام تر نادانی ہے۔ ایک نکتہ یاد رکھئے کہ اسلام ایک منظم مذہب ہے، اس میں عقاید کلیسا سے، اور قوانین سولن سے نہیں لئے جاتے، اسلام عقاید و افکار کا مجموعہ نہیں بلکہ عقاید و اعمال کا مجموعہ ہے۔ اسی لئے ضروری ہے کہ احکام خداوندی کی عملی تعبیر ہمارے سامنے ہو، انسان کسی عملی نمونہ کے بغیر صحیح راستہ پر نہیں چل سکتا، اسی لئے قرآن حکیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو "اُسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے، اور حق یہ ہے کہ اگر یہ جامع حکم موجود نہ ہو تو اسلام ایک دماغی کاوش اور چند بے جان عقاید کا مجموعہ رہ جاتا، مذہبِ اسلام میں جامعیت رُسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت سے پیدا ہوتی ہے، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں حیاتِ انسانی کے گوناگوں پہلو نظر آتے ہیں، اس لئے ہر شخص کو زندگی کے ہر موڑ پر سیرتِ طیبہ سے ہدایت مل جاتی ہے، چاہے وہ شخص حاکم ہو، یا محکوم، چاہے امیر ہو یا غریب،

آپ کا دل چاہے تو اسے دینی تاریخ قرار دیں، یا تاریخِ دین، اُمت اسلامیہ کے لئے تو یہ عملی نمونۂ زندگی ہے جس کی اتباع کے بغیر آدمی دیندار نہیں ہوتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سلسلہ میں کسی تفصیلی اور طویل بیان کی ضرورت ہے، اور نہ اس کی حاجت ہے کہ دلائلِ عقلی و نقلی کا انبار لگا دیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، اور تقریر کو چھوڑ کر یا اس کے نمونۂ عمل، اور مأخذ قانون ہونے کی حیثیت سے انکار کر کے "دینِ اسلام" ایک نظریہ سے زیادہ کچھ باقی نہیں رہ سکتا۔

دوم — قرآن مجید میں جتنی جگہ اطاعتِ رسول کا حکم ہے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت مرکزِ ملت اطاعت مراد ہے اور آپ کے بعد جو خلیفہ یا امیر ہوگا، اس کی اطاعت اس سے مراد ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم، شارع بھی تھے، مفسّرِ قرآن بھی، اور مرکزِ ملت بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عملی نمونہ تھے ساری دنیا کے لئے، آدم علیہ السلام کی ساری اولاد کے لئے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں آپکی اطاعت کا حکم دیا ہے، اس میں آپ کی کامل اور ہر جہتی اطاعت کا حکم ہے۔ خلیفہ اور امیر کی اطاعت کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں لفظ اولی الامر قرآن حکیم میں موجود ہے، اور اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے بعد یہ لفظ آیا ہے، حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے تو جرأت کی حد کر دی ہے کہ اپنے مضمون مندرجہ رسالہ طلوع اسلام کراچی بابتہ ماہ نومبر ۱۹۵۰ء صفحہ ۶۸ میں یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ "اطاعت عربی میں کہتے ہیں زندہ کی فرماں برداری کو" ان کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد حضور کی اطاعت کا سوال باقی نہیں رہا۔

خدا جانے حافظ صاحب نے کون سی عربی لغت میں اطاعت کے یہ معنی دیکھے ہیں، مجھے تو معلوم ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور اپنی بیعت کے بعد جو خطبہ دیا ہے، اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ کہ:- اطیعونی ما اطعت اللہ و رسولہ فاذا عصیت اللہ و رسولہ فلا طاعۃ لی علیکم (سیرۃ ابن ہشام ج ۳ صفحہ ۴۷۳، الطبری ج ۳ صفحہ ۲۰۳، عقد الفرید ج ۲ صفحہ ۲۴۷، عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۲ صفحہ ۲۳۴)

اس جگہ حضرت ابو بکرؓ نے اپنی اطاعت کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ جب تک وہ خود اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کریں، ایک ہی مصدر اطاعت دونوں جگہ استعمال فرمایا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات کے بعد کا ہے۔

اس خطبہ سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ صحابہ نے اطاعتِ رسول کا کیا مطلب سمجھا تھا حضرت ابو بکرؓ نے یہ نہیں کہا کہ اب آئندہ سے میری اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت سمجھی جائے گی، لغت کی بحث اس جگہ مقصود نہیں ورنہ زمانہ جاہلیت کے درجنوں اشعار پیش کر دیے جاتے جن میں لفظ اطاعت متوفی کی اطاعت کے لئے استعمال ہوا ہے،

صحابۂ کرام اطاعتِ رسولؐ سے کیا مطلب لیتے تھے، اور قانونِ اسلامی کا ماخذ اُن کے نزدیک کیا تھا، یہ اس حکم سے بھی ظاہر ہے جو حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے محکمۂ قضا (عدالت) قایم کرتے ہوئے اپنے قاضیوں کو دیا تھا، اس میں مرقوم ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ میں دیکھو اگر اس میں تم کو کوئی حکم صریح نہ مل سکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تلاش کرو، اور اگر وہاں بھی تم کو کوئی حکم نہ ملے تو پھر خود اجتہاد کرو۔ (حوالہ کے لئے دیکھئے طبری، جلد چہارم، ابن الاثیر جلد دوم)

سوم۔ "حدیثوں کو حجتِ شرعی کی حیثیت عہدِ بنی امیہ میں دی گئی جب کہ خلفاء بادشاہ بن گئے تھے" یہ بیان تاریخ اسلامی سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ عہدِ بنی امیہ بہت سی باتوں کے لئے مشہور سہی، مگر یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس عہد میں حدیثوں کو دینی حجت، یا حجتِ شرعی کا مقام دیا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضرتِ ابو بکرؓ حضرتِ عمرؓ، حضرتِ عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں بھی حدیثوں کو یہی حیثیت حاصل تھی، یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں سارے واقعات، ان کے فتاویٰ اور خلفائے راشدین کے سارے فیصلے نقل کر دیے جائیں اس لئے چند واقعات کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے، تفصیل اگر مطلوب ہو تو تاریخ الطبری، ابن الاثیر، اور صحاح و مسانید میں دیکھ لیجئے کہ ان کی دینی تاریخ کی حیثیت تو بہر حال منکرین حدیث کے نزدیک بھی مسلم ہے۔

حضرت ابو بکرؓ نے وراثت کے مسئلہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ کی روایت تسلیم کر کے اس پر عمل کیا، اور وراثت دلوا دی۔

حضرت عمرؓ نے کئی بار حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرتِ ابو سعید الخدری، اور حضرتِ عبداللہ بن مسعود کی روایتیں سُن کر ان کے مطابق احکام دیئے۔

حضرتِ عثمانؓ نے بیعت لیتے ہی یہ اقرار کیا کہ پہلے کتاب اللہ، اس کے بعد سنت رسول اللہ پر عمل ہوگا۔ اور نہ صرف اقرار کیا بلکہ حضرت عبداللہ بن العباس، اور حضرت مغیرہ کی روایتوں پر عمل کیا۔

حضرتِ علی مرتضیٰؓ نے اس زمانہ میں بھی جب وہ مدینہ منورہ میں قاضی تھے، اور اس وقت بھی جب وہ کوفہ میں خلیفہ اور امیر المومنین تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرتِ بی بی عائشہ صدیقہ اور حضرت عبداللہ بن العباس کی روایتوں پر فتوے دیئے اور احکام صادر فرمائے۔

اسی طرح جو صحابہ عدالتی فرایض کی انجام دہی پر مامور تھے وہ سب سے پہلے کتاب اللہ میں حکم صریح تلاش کرتے تھے، اور اس کے بعد حدیثوں میں، اپنی محفوظات و مکتوبات میں یا دوسرے صحابہ کی محفوظات و مکتوبات میں، اور جب وہاں بھی حکم نہیں ملتا تھا تو اپنی رائے سے اجتہاد فرماتے تھے، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض صحابی نے اجتہاد کیا، اور حدیث انھیں نہیں پہنچی۔ اس طرح کے دوسرے معاملہ میں کسی دوسرے صحابی کو حدیثِ رسولؐ مل گئی یا خود ان کے پاس محفوظ تھی انھوں نے اس کے مطابق حکم دیا، اس طرح صحابہ کے مابین اختلاف دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ بارہا ایسا

بھی ہوا کہ صحابہ نے حدیث مل جانے پر اپنی رائے بدل دی، (حجۃ اللہ البالغہ مطبوعہ مصر ۱۳۵۲ھ جلد اول صفحہ ۱۴۰)

چہارم: "حدیثیں تیسری صدی ہجری میں مدون ہوئیں، اس لئے قابل اعتماد نہیں ہیں"

میں اس مضمون کے ابتدا میں لکھ آیا ہوں کہ یہ لوگ محنت سے اور وقت صرف کرکے مطالعہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اسلام کی ادبی، اور ثقافتی تاریخ سے ناواقف ہیں، اور کہیں ادھر اُدھر کی باتیں جو دیکھ لیتے ہیں اُنہیں نادر معلومات سمجھ کر پیش کر دیتے ہیں۔

حدیثیں دوسری صدی ہی میں باب واری ترتیب کے ساتھ کتابوں کی شکل میں مدون ہو چکی تھیں، کتاب ابن جریج، کتاب الموطا، کتاب الربیع بن صبیح، اور متعدد کتابیں حدیث کی مرتب ہو چکی تھیں، ان کے علاوہ مختلف علما کے پاس اپنے مرویات ومسموعات کی کتابیں بغیر ترتیب موجود تھیں، مسانید میں سے چھ مسانید موجود تھے، محمد اسحاق المتوفی ۱۵۱ھ کی کتاب سیرۃ النبی موجود تھی،

پہلی صدی ہجری میں ایسے متعدد تابعین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے مختلف صحابہ سے اپنی مسموعات کو کتاب کی شکل میں لکھ کر محفوظ کر رکھا تھا، اور خود عہدِ صحابہ میں ۳۹ صحابۂ کرام کا ذکر ملتا ہے جنہوں نے حدیثیں لکھ کر رکھی تھیں۔

ان لوگوں کو غلط فہمی اس سے ہوئی ہے کہ صحیحین کے مصنف امام بخاری اور امام مسلم کی وفات ۲۵۶ھ اور ۲۶۱ھ میں ہوئی ہے۔ ان بزرگوں نے فقہی ابواب پر حدیثوں کی ترتیب کی، اور تنقیح وتنقیدِ روایات کے فرائض انجام دیئے۔ اُنہوں نے اپنے زمانہ کے اساتذہ سے مسانید، موطا، اجزاء حدیث، کراسات، سنن کا علم حاصل کیا اُن پر تنقیح وتنقید کی، اور کتابیں قانونی ابواب پر جمع کرکے تیار کیں، اسی لئے ان کو جامعینِ حدیث کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ان سے پہلے کتابیں مدون نہیں ہوئی تھیں، بخاری اور مسلم سے پہلے کی بعض کتب حدیث کے قلمی نسخے تو اب تک متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں۔ عبداللہ بن المبارک المتوفی ۱۸۱ھ کی کتاب الزھد والرقائق کا نسخہ فاس کی جامع قروین میں اور سندھ ضلع نواب شاہ میں پیر جھنڈو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ مصنف عبدالرزاق کا نسخہ مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن العاص السہمی المتوفی ۶۳ھ کی مرویات کا ایک نسخہ قسطنطنیہ میں آغا البشیر کے کتب خانہ میں موجود ہے، مجاہد بن جبر المکی المتوفی ۱۰۳ھ کی مسموعات کا مجموعہ قاہرہ مصر میں موجود ہے، محنت وکاوش کے ساتھ تلاش کی جائے تو اُمید ہے کہ ایسے مجموعہ ہائے حدیث کے درجنوں نسخے آج بھی مل جائیں گے۔

تیسری صدی ہجری کے ساتھ علم حدیث کی ترتیب، تبویب، اور تنقیح کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اس وقت تمام مجموعے اور اجزا ان بزرگ محدثین نے جمع کرکے بڑی بڑی کتابیں بنا دیں، بعض نے سب کچھ جمع کیا، بعض نے خاص خاص شرائط کے ساتھ جمع کیا، بعض نے شرائط سخت رکھیں، اور بعض نے نرم، اسی لئے یہ کتابیں مختلف مدارج کے مجموعے سمجھے جاتے ہیں، علمائے اُمت کا یہ احسان ہے، اور صداقت شعاری ودیانت داری کی عجیب وغریب مثال ہے کہ انھوں نے بہر حال! ہر رطب ویابس کو جمع کر دیا، تاکہ آنے والی نسلیں خصوصاً غیر مسلم اقوام یہ طعنہ نہ دیں کہ رسول اللہ صلعم کے اقوال میں سے وہ روایتیں مسلمانوں نے ضائع کر دیں جن پر نقد وجرح کی جا سکتی ہے!

آج بھی جو علما ووقت، فکر اور ہمت صرف کرکے تلاش حدیث کریں، اور بغیر کسی تعصب کے حدیث سے مسائل کو مستنبط کرنا چاہیں، ان کو سارا سامان اور مکمل مواد مل سکتا ہے۔ روایت، درایت، تاریخ جس جس طرح ہو چھان بین کی جائے،

اور ہمیشہ سے کی جارہی ہے۔

(مذکورہ بالا بیانات کے لئے ملاحظہ ہو ابن عبد البر کی کتاب مختصر جامع بیان العلم، معرفۃ علوم الحدیث، محولہ کتب خانوں کی مطبوعہ فہرستیں، اور کتاب تذکرۃ النوادر)

الغرض، اسلام کی ادبی و ثقافتی تاریخ، اور قانون اسلامی کے مطالعہ سے کسی عالم کو منکرین حدیث کے بے جا دعاوی کی ساری حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ میرے جیسے ایک طالب علم کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ،

(۱) حدیثیں کتاب اللہ کے بعد فقہ اسلامی کا مأخذ، اور حجت شرعی ہیں اور مفید عمل ہیں، اب تک مسلمانوں میں سے کسی نے ایسا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ حدیثیں کتاب اللہ کی طرح نص قطعی کا درجہ رکھتی ہیں۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، اور احوال کی اطاعت واجب ہے، اس کے بغیر نہ ایمان مکمل ہوتا ہے اور نہ عمل کی بنیاد مہیا ہو سکتی ہے۔ یہ اطاعت عہد رسالت میں بھی واجب تھی، اور آج بھی بقدر امکان دا لیتا ان نسبت واجب ہے۔

(۳) خلیفہ اور امیر کی اطاعت بھی ضروری ہے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ اس کا حکم اللہ و رسول کے حکم کے خلاف نہ ہو، اس کے لئے قرآن مجید میں تصریحی حکم موجود ہے،

(۴) حدیثیں عہد رسالت ہی میں بذریعہ تحریر منضبط ہو چکی تھیں، اگرچہ بذریعہ تحریر منضبط ہونا ہی مستند ہونے کی واحد دلیل نہیں۔ زبانی روایت اگر اہتمام کے ساتھ ہو تو تحریر سے کم قابل وثوق نہیں ہوتی۔ بہر حال! یہ حدیثیں قابل اعتماد ہیں اور بقدر طاقت بشری چھان بین کر کے ان پر اعتماد کرنا چاہیئے، کیونکہ عملی زندگی میں ان سے زیادہ مستند خبریں ہم تک کبھی نہیں پہونچتی ہیں، اور ہم عملاً ان پر اعتماد کرنے کے عادی ہیں۔ اور صبح سے شام تک ہم اس سے کمتر درجہ کے بیانات اور روایتوں پر اعتماد کر کے ان کے مطابق عمل کرتے ہیں، ہم میں سے کوئی شخص تمدنی زندگی میں خبروں کو اس پیمانہ پر نہیں جانچتا جن پر حدیثیں پرکھی اور جانچی جاتی ہیں،

(۵) احادیث کے جو مجموعے آج موجود ہیں، ان میں بحث و نظر کا ہر صاحب علم اور صاحب نظر کو اختیار حاصل ہے، لیکن یہ اختیار کسی کو حاصل نہیں کہ مجموعی طور پر سارے سرمایۂ حدیث کو ناقابل استناد قرار دے، ایسا شخص فتنہ پرور اور جاہل ہے، چاہے اُس کے سر پر فضیلت کے ہزاروں طرّے ہی کیوں نہ جگمگاتے ہوں!

ڈاکٹر عشرت حسن انور، ایم اے پی ایچ ڈی
(لکچرار مسلم یونیورسٹی)
علی گڑھ

فلسفہ اور مذہب

اس مضمون کے محرک ماہرالقادری مدیر "فاران" ہوئے ہیں، موصوف نے میرے ایک مضمون "فلسفہ کیا ہے"[ا] پر مخصوص مذہبی زاویۂ نگاہ سے کچھ روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ غور و فکر اُس طریقِ حیات اور اس تعلیم کا پابند ہونا چاہیے جو تعلیم انبیاء کرام نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے"

اس بلیغ اور حکیمانہ جملہ کی وضاحت کے لئے یہ خیال پیدا ہوا کہ فلسفہ اور مذہب میں جو امتیاز ہے اس کو کسی قدر واضح کیا جائے:

فلسفہ حقیقت کی تلاش ہے، اس تلاش میں عقل و فکر کو بروئے کار لایا جاتا ہے، ——— ہوسکتا ہے کہ اس تلاش میں تعقل و تفکر درماندہ ہوکر رہ جائے اور فلسفی یہ اعلان کر بیٹھے کہ عقل و حکمت کے ذریعہ عین حقیقت تک نہیں پہونچا جا سکتا، جرمنی کا مشہور عالم فلسفی کانٹ اسی نتیجہ پر پہونچا تھا، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بھی عقل و حکمت اور فلسفہ کے متعلق یہی رائے رکھتے تھے؛ ——— ہوسکتا ہے کہ فلسفی عقل و حکمت کی خیال آرائیوں سے گھبرا کر غایت حقیقت کا انکار ہی کر بیٹھے، بہت سے حکماء مثلاً:- شاپن ہار، نطشے غایت حقیقت کے منکر ہیں ——— ہوسکتا ہے کہ فلسفی عقل و فکر کے ذریعہ غایت حقیقت کی تلاش میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ غایت حقیقت کا نہ انکار ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ اقرار، مثلاً سوفسطائی حکماء نے یہی کہا تھا ——— لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عقل و حکمت کو آزمانے اور کائناتِ عالم کا پورا پورا جائزہ لینے کے بعد فلسفی اس نتیجہ پر پہونچے کہ ایک غایت حقیقت کا وجود تسلیم کرنا لازمی ہے، مثلاً ڈی کارٹز، اسپنوزا، برکلے وغیرہ نے اسی بات پر زور دیا ہے،

ایک فلسفی جو صحیح معنی میں فلسفی کہلائے جانے کے قابل ہے مذکورہ بالا تمام امکانات کی روشنی میں غور و فکر شروع کرتا ہے، وہ فطرتاً اپنی تلاش اور طلب میں بیحد مخلص ہوتا ہے بغایت محتاط اور صادق ہوتا ہے، وہ اپنی تلاش اور جستجو میں ہر ایک نظریہ اور عقیدہ اور خیال کو بار بار پرکھنے اور جانچنے بلکہ اگر ضرورت ہو تو بدلنے اور ترمیم کرنے کے لئے بھی آمادہ رہتا ہے اس غیر معمولی کاوش فکر اور سعی ادراک میں اُسے خود کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کن حقایق پر پہونچے گا، اس عمل فکر کو ہی مقام حیرت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اسی حیرت کو فلسفہ کی جان سمجھا گیا ہے، اسی کو افلاطون نے تمام فلسفہ اور حکمت کے آغاز کا باعث بتایا ہے، قرآن کریم میں جہاں جہاں غور و فکر کرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہاں اس حیرت کی تلقین بھی مقصود ہے مثلاً ان فی خلق السمٰوات والارض واختلاف الیل والنہار وما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ و تصریف الریح والسحاب المسخر بین السماء والارض لآیات لقوم یعقلون ۝

بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے لوٹ پھیر میں اور اُن جہازوں (کے چلنے) میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزیں لیکر چلتے ہیں اور بارش کے پانی میں جس کو اللہ اوپر سے اتارتا اور زمین کے مردہ ہونے کے بعد پھر اس پانی سے اس کو زندہ کرتا

[ا] "فاران" کے ماہ مئی کے شمارہ میں شایع ہوا ہے اور آخر میں فاضل مدیر نے اپنے اشارات و ارشادات سے مستفیض فرمایا ہے۔

ہے اور اس نے زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلا رکھے ہیں اور وہ ہواؤں کو چلاتا ہے اور بادلوں کو آسمانوں اور زمین کے مابین تسخیر کر رکھا ہے ان تمام باتوں میں نشانیاں ہیں اہلِ عقل کے لئے۔

یا مثلاً ! وما خلقنا السمٰوات والارض وما بینھما لٰعبین ما خلقنٰھما الا بالحق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون۔ یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طرح نہیں بنایا کہ ہم کوئی فعل عبث کر رہے ہوں ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

یا مثلاً ! ھو الذی انزل من السماء ماء لکم منہ شراب ومنہ شجر فیہ تسیمون ط ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات ط ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون ۝

یعنی وہ ایسا ہے جس نے تمہارے واسطے آسمان سے پانی برسایا جس سے تم کو پینے کو ملتا ہے اور اس سے درخت ہیں جن میں تم چرنے چھوڑ دیتے ہو اس سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے، اس میں غور کرنے والی قوم کے لئے واقعی نشانِ قدرت ہے (۱۶-۹)

یا مثلاً ! یخرج من بطونھا شراب مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس ط ان فی ذالک لآیۃ لقوم یتفکرون ۝ یعنی شہد کی مکھی کے پیٹ سے مختلف رنگوں کے پینے کی چیز نکلتی ہے جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے اس میں غور کرنے والی قوم کے لئے نشانِ قدرت ہے۔

قرآن پاک کے ان ارشادات کا مطلب عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ قرآن کریم غور و فکر کرنے کی ہدایت تلقین کرتا ہے، یہ صحیح ہے مگر اس تلقین میں ایک یہ بھی پہلو ہے کہ کائنات کی ہر شے کو دیکھ کر مسلمان کو وہ حیرانی پیدا ہونی چاہیئے جو تمام تعقل و تفکر کی جان ہے، قرآن کریم کے ارشادات کے اس پہلو پر لوگ عام طور پر متوجہ نہیں ہوئے ہیں، صحیح غور و فکر کے لئے جس حیرانی، بےچینی اور دردمندی کی ضرورت ہے اس پر اکثر نظر نہیں گئی ہے، اسی وجہ سے بعض اصحاب کا یہ خیال ہوا ہے کہ "قرآن کریم غور و فکر کرنے سے نہیں روکتا مگر یہ غور و فکر اس تعلیم کا پابند ہونا چاہیئے جو تعلیم انبیاء کرام نے دنیا کے سامنے پیش کی ہے" نعوذ باللہ یہاں یہ کہنا کسی طرح مقصود نہیں ہے کہ خاکم بدہن غور و فکر تعلیم انبیاء سے قطعی طور پر آزاد ہونی چاہیئے، ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ غور و فکر حیرانی و ذہنی بےچینی اور طلبِ صادق کا نتیجہ ہونا چاہیئے، اس صورت میں فلسفی میں نہایت، دردمندی اور صدق پیدا ہو جاتا ہے، پھر اس کی تلاش اس کی پوری شخصیت اور اس کے قلب کی دردمندانہ جستجو کی آواز ہوتی ہے، اس صورت میں گمراہی کے امکانات (گمراہی سے یہاں ہمارا مطلب صرف اس قدر ہے کہ غایت حقیقت تک نہ پہنچا جا سکے) قطعی طور پر پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر خدانخواستہ پیدا بھی ہوں تو اس کی قوی امید ہوتی ہے کہ ایک نہ ایک دن طالبِ حقیقت صحیح راستہ پر آ سکے گا آغاز فکر میں فلسفی کو بالکل آزاد ہونا ضروری ہے[۵]، فکر کا پہلا عمل اگر کسی

[۵] اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی "محض فلسفی" ہو اور کچھ نہ ہو! اگر ایک مسلمان فلسفی جب کائنات اور اس کے مکنونات اور اسرار میں غور کرتا ہے تو یہ عقیدہ اور تصور اس کے تفکر و تعقل کے ساتھ ساتھ رہتا ہے کہ "اس کائنات کو اللہ تعالیٰ نے خلق فرمایا ہے" اس عقیدہ اور تصور سے خالی الذہن ہو کر وہ سوچ ہی نہیں سکتا ——— اور کلیات سے جزئیات تک پہونچنا اور اس انداز پر سوچنا خود فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے بھی معیوب نہیں ہے! اس عالمِ اسباب اور متمدن دنیا میں فکر و تعقل کی "مطلق آزادی" قریب قریب ناممکن ہے، آدمی زندگی کے ہر دور میں کسی سے متاثر ہوتا ہے یا کسی کو متاثر کرتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ کسی کے ذہن و فکر نے ارسطو، افلاطون، ڈیکارٹ، برگساں کے افکار کا اثر قبول کیا ہو اور کسی کے دل و دماغ پر محمد رسول اللہ کی تعلیمات اثر انداز ہوئی ہوں (م - ق)

مخصوص نظریہ یا عقیدہ کا پابند ہوگیا تو اس فلسفی کے بلکہ اس قوم کے (جس سے وہ فلسفی متعلق ہے) ترقی کے تمام راستے ختم ہوجائیں گے، غور و فکر کا آخری عمل "یقین" کی ضرور پرورش کرسکتا ہے اور یہ بات اولیٰ ہے کہ فلسفی تعقل و تفکر کے تمام منازل طے کرنے کے بعد کسی عقیدہ کا پابند ہوجائے اور اگر صحیح معنیٰ میں فلسفی ہے تو ایسا ہونا ضرور ہے، تاریخ فلسفہ اس بات کی شاہد ہے، ہم آگے چل کر اس بات کو واضح کریں گے، ہمارا خیال ہے کہ ہر ایک فلسفہ لازماً مذہب میں پہنچکر ختم ہوتا ہے مگر مذہب سے یہاں ہماری مراد صرف "منزل یقین" ہے کوئی رسم و رواج کا ذخیرہ نہیں۔

فلسفہ کا مقصود جیسا کہ مذکورہ بالا بیان سے کسی قدر واضح ہوتا ہوا معلوم ہوگا یہی ہے کہ انسان شک و ریب اور اندیشہ ہائے گوناگوں سے گزر کر "منزل یقین" تک پہونچ سکے، ...[۱] ... ماہرالقادری صاحب کا یہ ارشاد ایک بہت گہری حقیقت کا آئینہ دار ہے، کہ "وہ غور و فکر کس کام کا جس سے یقین کی جگہ شک و ریب پیدا ہو"... بیشک شک و ریب ہی فلسفہ کا غایت مقصود نہیں، شک و ریب تو تمام فلسفہ کے "آغاز" کا موجب ہوتا ہے، خود عین مقصود نہیں قرار دیا جاسکتا، انہیں شک و شبہات و ریب و گمان و حیرانی کو مٹانے کے لئے فلسفہ معرض وجود میں آتا ہے سوفسطائی حکماء اور بعض اسلامی مفکرین نے بھی فلسفہ کے مقصود کو غلط سمجھا، ان کا خیال تھا کہ فلسفہ کے لئے شک و شبہات و ریب و گمان ہی غایت مقصود ہے، حکماء اسلام میں اس شک و شبہ کی ابتدا کسی حد تک معتزلہ نے کی اور ان میں سے بعض مثلاً نظام[۲] اور ابوہاشم بصری غلطی سے اسی کو عین مقصود بھی تصور کر بیٹھے، یہ ایک بڑی بھاری غلطی تھی اور اسی وجہ سے ان کا تمام نظام فکر حقیقت کی نقاب کشائی سے قطعی طور پر محروم رہا، یہ لوگ غور و فکر کی ابتدائی منزل (شک و شبہات) سے گزر کر "یقین" کی منزل تک (جس کی خاطر غور و فکر کی ابتدا کی تھی) نہیں پہونچ سکے اور اسی وجہ سے "قلب و نظر" سے محروم رہے "یقین سے محرومی" جناب ماہرالقادری صاحب کے قول کے مطابق (جو رومی، برگساں، اور اقبال کی تائید میں ہے) بیشک قلب و نظر کی موت ہے"

منزل یقین تک

غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نازک نکتہ کو بہت گہرے طور پر محسوس کیا تھا ان کے فلسفہ کی ابتدا شک و شبہ و ریب اور حیرانی سے ہی ہوئی تھی، وہ اس "مقام حیرت" سے آگے بڑھنے کی خاطر ہر ایک کاوش فکر کے لئے تیار ہوئے تھے، اپنے ہر ایک عزیز ترین "خیال" "تصور اور" "عقیدہ" پر شک کرتے کرتے آخر کار اس جستجو میں پڑے کہ کسی طرح اس شک و شبہ کی منزل سے گزر کر یقین کی منزل تک پہونچا جاسکے، چونکہ بہرحال شک و شبہ کے مقام کو عین مقصود نہیں قرار دیا جاسکتا، اس سے آگے بڑھنا لازم ہے مگر یہ عجب اتفاق ہے کہ غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ "یقین" جس کی خاطر تمام عمل فکر کی ابتدا ہوئی تھی، فلسفہ و حکمت کے گورکھ دھندوں میں میسر نہیں ہوسکا، پھر بھی فلسفہ و حکمت کا ایک بہت بڑا فائدہ ہوا، کم سے کم اس قدر ضرور معلوم ہوگیا کہ منزل یقین تک پہونچنے کے لئے عقل و حکمت کی مسافت طے کرنا ناکافی ہے اس منزل تک پہونچنے کے لئے کچھ اور سفر ضروری ہے، شاید یہ منزل جس کی تلاش میں تمام تعقل و تفکر کی ابتدا ہوئی تھی عقل و حکمت کی سرحد کو پار کرنے کے بعد ہی حاصل ہوسکے گی، غزالی رح کے فلسفہ کی تعبیر کے لئے یہ نتائج بہت اہم

---

[۱] فاضل مضمون نگار نے اپنی محبت سے مجھ ہیچمداں سے وہ "القاب" منسوب کردیئے ہیں، جنھیں پڑھ کر میں پسینہ پسینہ ہوگیا، یہ انشاپردازی بھی عجیب چیز ہے کہ لوگ "جاہلوں" کو "عالم" سمجھنے لگتے ہیں (ماہرالقادری)، [۲] تاریخ فلسفۂ اسلام مترجم ڈاکٹر عابد حسین صفحہ ۶ [۳] ایضاً ص ۶۶

تھے، عقل و فکر کے ذریعہ حقائق تک پہونچنے کی یہ ناکامیاب کوشش غزالی رح کے لئے خود ایک بڑی کامیابی تھی، اس سے کم سے کم یہ پتہ ضرور چل گیا کہ طلب صادق کی عقل و فکر کے ذریعہ سیرابی نہیں ہوتی یا شاید نہیں ہو سکتی، اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عقل و فکر انسانی شخصیت کا ایک جزو ہے، یہ پوری شخصیت کی حامل نہیں ہے انسانی قوت ادراک کے علاوہ قوتِ عمل اور قوتِ احساسات و جذبات کا بھی حامل ہے، موخر الذکر دونوں قوتیں عمل فکر میں اکثر شامل نہیں ہوتیں اس لئے نری عقل آرائی ان کی سیرابی نہیں کرسکتی،

حکمائے یورپ میں یہ بات سب سے پہلے کانٹ نے واضح کی تھی، اس نے فلسفہ اور حکمت کی حدود کو بہت ہی واضح طور پر متعین کر دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ عقل کی رسائی بہت[1] محدود ہے، ایک مقام پر پہونچکر عقل کا ہر ایک بیان قابل تردید ٹھیر سکتا ہے، مثلاً ذاتِ باری، ذاتِ نفسِ انسانی، خود مختاری، معاد، حشر وغیرہ کا اثبات اسی قدر مشکوک ہے جس قدر کہ ان کا انکار ہے، عقل و فکر کے ذریعہ نہ ان کا انکار ہی ہو سکتا ہے اور نہ اقرار، یہ مقام عقل کے لئے "ایک طرح سے عالم برزخ کا مقام ہے، اسی مقام کو اقبال رح نے فلاطون کا ذکر کرتے ہوئے "اعراف" سے تعبیر کیا ہے

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور
ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

عقل ہم کو یہیں تک لیجا سکتی ہے، اس کے آگے عقل و فکر کے پر جلتے ہیں، مگر انسان نری عقل ہی کا حامل نہیں ہے، وہ قوتِ فکر کے علاوہ قوتِ عمل اور جذبات و احساسات کا بھی حامل ہے، وہ نیک اخلاق اور اعلیٰ ترین شخصیت کا بھی حامل ہونا چاہتا ہے، جس طرح عقل کی سیرابی انسان کے لئے ایک فطری ملکہ ہے اسی طرح نیک اخلاق کی پرورش اور اعلیٰ ترین شخصیت کا حاصل کرنا بھی اس کی فطرت میں ہے، عقل کے ساتھ ساتھ اس فطری طلب کی بھی سیرابی ہونا ضرور ہے، انسان کتنا ہی "عقلِ محض" ہو کر کیوں نہ بیٹھ جائے مگر پھر بھی وہ اس کا خواہشمند رہتا ہے کہ اس کی شخصیت کی اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر تعبیر ہو سکے بالفاظ دیگر نرا تعقل و تفکر انسان کے دل اور دماغ کو مطمئن نہیں کر سکتا، یہ اطمینان اسی وقت میسر ہو سکتا ہے جبکہ انسان لحظہ بہ لحظہ یہ "محسوس" کر سکے کہ اس کے "اخلاق" اور "شخصیت" کی تعمیر ہر عملی قدم کے ذریعہ اعلیٰ سے اعلیٰ طور پر ہو رہی ہے، بالآخر ترقی کرتے کرتے انسان یہ بھی محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ تخلیق اخلاق و کردار کی تمام کوشش اس ارضی زندگی میں مکمل نہیں ہو سکتی، اس کے لئے حیات بعد ممات کا "یقین" کرنا لازم ہے، یہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس انسانی کوشش اور حوصلہ کو کامیاب بنانے اور بارور کرنے کے لئے کسی ایسی ذات کا "اقرار" کیا جائے جو ہر فرد کے عمل کو دیکھ سکے بالفاظ دیگر "بصیر" ہو "خبیر" ہو جو انسان کی دلی اور فطری خواہش آرزوں اور تمناؤں کے شور کو سن سکے، بالفاظ دیگر "سمیع" ہو، جو انسان کی کوشش اور اس کے حوصلوں میں اس کی امداد فرما سکے اس پر رحم و کرم کر سکے بالفاظ دیگر "رحیم" اور "کریم" ہو وغیرہ وغیرہ

اس طرح ہر ایک فلسفی جو فلسفہ کے مفہوم کو صحیح طور پر سمجھ سکا ہے لازماً مذہب کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، نرا تعقل اور نرا استدلال ایک مخصوص مقام تک پہونچنے کے لئے ضرور معاون ہے مگر اس مقام کو "منزل یقین"

[1] یہاں یہ لفظ بہت ہی وسیع معنے میں استعمال کیا گیا ہے۔

اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب انسان اپنی پوری شخصیت اور تمام صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اگرچہ چاہے تو عقل کے سہارے ہی آگے بڑھتا جائے اور فلسفہ کا جو اصل مقصد یعنی "یقین" اور اطمینانِ روح کا حاصل کرنا ہے اس کو فراموش نہ کرے، حیرانی فلسفہ کی ابتدائی منزل ہے مگر ایک لازمی مقام ہے، شروعات یہیں سے ہونی چاہیئے مگر اس حیرانی میں خلوص ہو، نیک نیتی ہو، حقائق کے سمجھنے کا عزم راسخ ہو مگر اس "مقام حیرت" کو منزل اقصیٰ سمجھنا غلطی ہے، منزل غایت بہرحال "یقین" کا پیدا کرنا ہے، اس کے بغیر عقل و فکر پراگندہ رہتے ہیں، زندگی بےچین رہتی ہے، دل، دماغ سب درد مند اور دکھی رہتے ہیں، اسلام میں اس بیان کی شہادت میں عمر خیام کی زندگی پیش کی جاسکتی ہے، یقین کی منزل سے محروم رہ کر اس کا دل اور دماغ ایک دوسرے سے کبھی ہم آہنگ نہیں ہونے پاتے، اس کو کبھی اطمینان قلبی میسر ہی نہیں ہوتا، بالفاظِ دیگر اس کی پوری شخصیت کسی ایک مرکز پر منضبط نہیں ہوتی وہ عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔

ہمارے اس مختصر بیان سے کسی حد تک دو باتیں ضرور متعین ہو گئی ہیں اوّلاً یہ کہ مقام شک یا حیرت فلسفہ کی ابتدائی منزل ہے اور تمام فلسفہ و حکمت کا آغاز اسی مقام سے ہوتا ہے بلکہ ہونا ضروری ہے، اگر کوئی فلسفی "یقین" کے مقام بالفاظ دیگر "عقیدہ" سے چل کر فلسفہ کی ابتدا کرے گا تو فلسفہ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قوم و ملت کے ساتھ بھی بے انصافی کرے گا چونکہ اس طرح علم، حکمت، سائنس اور فنون کی ترقی کے تمام راستے مسدود ہو جائیں گے۔

ثانیاً یہ کہ منزل یقین فلسفہ کی آخری منزل ضرور ہے ابتدائی مقام نہیں، البتہ "مذہب" کے لئے "مقام یقین" پہلی منزل ہے، مذہب "یقین" سے بالفاظ دیگر "ایمان بالغیب" سے ابتدا کر کے "وصل حقیقت" کا حوصلہ رکھتا ہے ہم اس نکتہ کو اگلے مقالہ میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے، مذہب کا حوصلہ یہ ہے کہ کسی طرح سے بنی نوع انسان غایت حقیقت سے واصل ہو سکے، اس کے حصول کے لئے پہلا قدم "یقین" اور "ایمان" کا ہونا ضروری ہے اس وصل کے بغیر ذہنی فکری، روحی اور قلبی بے چینی دور نہیں ہو سکتی، فلسفہ ذہن کو سکون پذیر کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے لیکن اگر انسان نری عقل ہی کا حامل ہوتا تو شاید یہ ذہنی سکون اور فکری اطمینان میسر ہو سکتا، فنونِ لطیفہ روحی اور قلبی اطمینان پیدا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں لیکن اگر انسان صرف جذبات و احساسات ہی کا حامل ہوتا تو شاید فنون لطیفہ کو اپنی کوشش میں مکمل کامیابی ہو سکتی، اب انسان نہ "عقل محض" ہے اور نہ صرف جذبات و احساسات ہی کا مرید ہے اس میں عقلی شعور کے علاوہ قلبی شعور کی بھی صلاحیت ہے نیز ذوقِ عمل و شوقِ کردار کا بھی جذبہ ہے، ان تمام گوناگوں صلاحیتوں اور حوصلوں کی بیک وقت کس طرح تسکین ہو

یہ مقصد مذہب کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے

اسی لئے بنی نوع انسان کے لئے مذہب کی سب سے زیادہ اہمیت، ہونی ضروری ہے، اس کے بغیر نسل آدم ایک نہ ایک لحاظ سے نامکمل اور ناقص رہ جائے گی، اسی خیال کی رو سے ... ... ماہر القادری صاحب کا یہ ارشاد قطعی درست ہے کہ "غور و فکر کو تعلیم انبیا کا پابند ہونا چاہیئے" مگر ہم اس پر اتنا اضافہ کرنے کی ضرور جرأت کریں گے اور اس کیلئے معافی کے خواستگار ہوں گے کہ یہ پابندی اس طرح عمل میں آئے کہ عقل و فکر خود بھی اطمینان پا سکے اور انسانی فطرت بحیثیت کل سیراب ہو سکے! ●

مسعود احمد برکاتی

مذہب اور سائنس

آج دنیا کی علمی سائنسی اور تمدنی ترقیاں انسان کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ایجادات واختراعات اور انکشافات واکتشافات نے آنکھوں کو خیرہ کردیا ہے۔ زمان و مکان کی قیود و حدود ختم نہیں تو قریب الختم ضرور ہیں۔ زمانی اور مکانی فاصلے دن بدن مسخر ہوتے جارہے ہیں۔ اور ہوتے جائیں گے۔ زمانہ سمٹتا جارہا ہے اور زمین کی طنابیں کھنچتی جارہی ہیں۔ ترقیاں ہو رہی ہیں، ایجادات کا سلسلہ جاری ہے، اور پستیاں بلند تر ہوتی جارہی ہیں۔ یہ ترقیاں، یہ ایجادات اور یہ معلومات خدا کی طرف سے انسانوں کے لئے نعمت ہیں، رحمت ہیں، برکت ہیں کس کی ہمت ہے جو ان کی خوبیوں سے انکار کرے کون ہے جو ان کے فوائد و برکات کا معترف نہ ہو؟ لیکن اس حقیقت کو جھٹلانے والا بھی کون ہے کہ ان تمام تہذیبی، تمدنی اور مشینی ترقیوں کے باوجود امن وسکون سے دنیا محروم ہے؛ ہر دل مضطرب اور ہر روح پریشان ہے۔!

یہ تضاد عقل انسانی کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے ایک طرف یہ ترقی دوسری جانب یہ بدامنی؟ کیا بدامنی، ترقی کا لازمی نتیجہ ہے؟ کچھ عقلاء (؟) نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر ترقی کو ہی موردِ الزام ٹھیرانا شروع کردیا۔ ان کے نزدیک یہ تمام بحران اور ناہمواریاں اس ترقی کے اثرات ونتائج ہیں۔ اس سے وہ اس فطری ترقی کے مخالف بن گئے ان کے نزدیک اس "کیفیتِ بحران" کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں کہ تمام سائنسی ایجادات اور تمدنی ترقیوں کا گلا گھوٹ کر دنیا کو پھر اسی ابتدائی تمدنی دور میں پہنچا دیا جائے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنا ضروری تو ہے ہی مگر ممکن العمل بھی ہے اس کے برخلاف ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ یہ سب ترقیاں تو درست ہیں بدامنی کی وجہ وہ "روک" ہے جو مذہب نے دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصے پر اپنے مخصوص عقاید کی وجہ سے لگا رکھی ہے۔ ان کے نزدیک خرابی کی اصل جڑ اور بس کی گانٹھ یہی مذہب ہے کیوں کہ ان کے خیال میں مذہب ہی انسانی ترقی کی رکاوٹ اور بدامنی وفساد کا ذمہ دار ہے۔ اس کا علاج وہ یہی تجویز کرتے ہیں کہ انسان کی راہ سے مذہب کا یہ روڑا ہٹا دیا جائے اور انسان کو آزادانہ اور غیر ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنے کے مواقع دیئے جائیں!

لیکن جذبات سے بالا ہو کر اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے واضح ہو جائے گی کہ فی الحقیقت یہ دونوں تشخیصیں اور تجویزیں "افراط وتفریط" کا نتیجہ ہیں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر سائنس ومذہب کو ایک دوسرے کا نقیض سمجھ لیا گیا ہے ورنہ ان میں ہم آہنگی (HARMONY) اور مفاہمت (Re-conciliation) پیدا کرنا آسان ہے۔ ہم اسی مسئلہ پر اجمالی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ مذہب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اور سائنس اور مذہب کے تعلق پر کچھ لکھتے ہوئے مذہب سے میری مراد اسلام ہے، کسی دوسرے مذہب کے متعلق کچھ کہنے کا نہ مجھے حق ہے اور نہ اس کی اہلیت پھر

چونکہ مذہب سے مراد اس زمانہ میں جو کچھ لی جاتی ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جس میں چند مخصوص رسوم و عبادات اور اوراد و وظائف شامل ہیں، مذہب خدا اور انسان کا درمیانی معاملہ ہے انسان اور انسان کے متعلق اور انسان اور سماج کے معاملات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں! اس کے برعکس "اسلام" جہاں خدا اور انسان کے درمیان معبود و عبد کا رشتہ دیکھنا چاہتا ہے اور انسان کی انفرادی زندگی میں اللہ کے بھیجے ہوئے ضابطہ ہدایت کی تعمیل چاہتا ہے وہاں اجتماعی اور قومی معاملات و تعلقات میں بھی احکام الٰہی کی پیروی و اتباع لازمی سمجھتا ہے اس لئے "اسلام" کا نام لیتے ہوئے مذہب کے اس تصور کو ذہن سے نکال دینا چاہیئے اور اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

"کلیسا اور سائنس کا تصادم"

"مذہب" و "سائنس" کی یہ کشمکش اور یہ دشمنی دراصل نتیجہ ہے اس کشمکش کا جو اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے دوران میں "سائنس" کی ترقی اور صنعتی نشو و نما کی وجہ سے سائنس دانوں اور مذہب کے علمبرداروں کے درمیان اپنے گروہی مفاد کے تحفظ کے لئے برپا ہوئی! ایک جانب اہلِ کلیسا تھے جو اپنے اقتدار کی خاطر ہر قسم کی ترقی اور ایجاد اور ہر نئی چیز کی مخالفت کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ انسان کے دماغ میں علم و عقل کی روشنی پہونچی اور مذہبی عقائد کی قلعی کھلی مذہب کے نام پر جو اقتدار اور جو فائدے ان کو حاصل تھے وہ اس طرح ختم ہوتے تھے! دوسری طرف تمدن و سائنس کا ناگزیر ارتقا تھا جس کے علمبردار "سائنس داں" اور "مفکر" تھے جن کی پشت پر پورا تاریخی پس منظر تھا! اس کشمکش و نزاع کے نتیجہ میں صورتِ حال یہ ہوگئی کہ سائنس دانوں کو دن بدن عوام کی حمایت حاصل ہوتی چلی گئی اور ان کے نزدیک ہر وہ چیز جو مذہب کی طرف سے پیش کی جائے یا جس کو مذہب کی حمایت حاصل ہو غلط ٹھیری اور "مذہب دشمنی" کی بنیاد پر علوم و فنون اور سیاسی افکار کا ارتقا شروع ہوا،

یہ ہے وہ مختصر تاریخی پس منظر جس نے مذہب اور سائنس کی دشمنی کو جنم دیا اور جس میں سائنس نے بجا طور پر کامیابی حاصل کی اس بیان سے ہی یہ بات ظاہر ہے کہ اس کشمکش (Conflict & Struggle) کے پیدا کرنے میں حقیقتاً مذہب اور اس کے فطری اصولوں کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ دراصل یہ نتیجہ ہے مذہب کے جاہل اور خود غرض علمبرداروں کی ذہنیت اور رویہ کا! پھر اس میں ان سائنس دانوں اور مفکرین کی جہالت کو بھی دخل ہے جنہوں نے خود مذہب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اہلِ مذہب کی باتوں ہی کو بلا چون و چرا مذہب کا درجہ دے دیا اور ان کی مذہب کی ترجمانی اور نمایندگی پر بھروسہ کر کے خود مطالعہ و تحقیق کی ضرورت نہ سمجھی، پھر انھوں نے عصبیت میں مبتلا ہو کر مذہب کی ہر بات کو غلط ٹھیرایا۔

یہی صورتِ حال ہمارے یہاں بھی پیدا ہوگئی ہے یعنی مذہب کے محدود تصور اور تنگ ذہنیت کی وجہ سے بعض مولوی صاحبان بھی جدید[1] تعلیم تمدنی ترقی اور سائنسی ایجادات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن اوپر کی تشریح

[1] "جدید تعلیم" میں تو بیشک نقائص پائے جاتے ہیں (م - ق)

سے یہ بات واضح ہوگئی ہو کہ "اسلام" اس قسم کا مذہب نہیں ہو، یہ "پاپائیت" یا "برہمنیت" یا "ملائیت" اور چیز ہے اور اسلام اور ہے، "اسلام" ترقی کا مخالف نہیں ہے اور نہ اسلام کے اُصول منجمد و غیر متحرک ہیں، اسلام کے اصول زمان و مکان پر حاوی ہیں وہ تمدنی اور سائنسی ترقی کا نہ صرف ساتھ دے سکتے ہیں بلکہ ترقی تو اسلام کا عین تقاضا ہو کوئی مسلمان اپنی خداداد صلاحیتوں اور فطری جوہروں کو اگر تربیت نہ دے اور ذہنی و عقلی قوتوں کو مجلّٰی نہ کرے بلکہ ان کو معطل کر رکھے تو وہ خدا کے سامنے اس کے لئے جواب دہ ہوگا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ہے کہ

"حکمت و دانائی کہیں ملے اس کو لے لو اس لئے کہ وہ تو مومن کی گم شدہ متاع ہے، اس لئے اگر وہ کسی اچھی ایجاد، کسی مفید تحقیق اور نئے علم اور ہنر کو نہیں اپناتا اور اُس سے فایدہ نہیں اُٹھاتا تو درحقیقت اُس نے اسلام کا کچھ یُوں ہی سا اوپری مطالعہ کیا ہے اور اسلام کی "حرکی استعداد" سے وہ بیچارہ نابلد ہو!

اسلام ایجادات و اختراعات سے ہرگز نہیں روکتا وہ تو چاہتا ہو کہ قدرت کی توانائیاں زیادہ سے زیادہ مسخر کی جائیں ——— مگر ہاں! اسلام نے انسان کو بے راہ روی اور غلط کاری سے بچانے کے لئے کچھ اصول، حدود اور ضوابط مقرر کر دیئے ہیں، اسلام کا مطالبہ ہے کہ جو چیز جس کام کے لئے وضع کی گئی ہے اُس سے ٹھیک وہی کام لیا جائے، سائنس کی ایجادات کا رُخ "تخریب" کی طرف نہیں "تعمیر" کی جانب ہونا چاہیئے۔

جو بھی کہتا ہے، غلط کہتا ہے کہ دُنیا کی بدامنی اور پریشان حالی کا سبب "مذہب" ہے! یہ تصور مجنونانہ اور جاہلانہ ہے ——— ہم پوچھتے ہیں گزشتہ ۴۰ سال کے عرصہ میں یورپ میں جو عظیم الشان جنگیں اور خوفناک خونریزیاں ہوئی ہیں، کیا اُن کا محرک مذہب تھا؟

ہم پھر کہتے ہیں کہ اسلام اور سائنس کے مابین کوئی ٹکراؤ نہیں ہے، اور جو ایسا سمجھتا ہو وہ اگر مسلمان ہو تو اُس کی "ایمانی فراست" مشتبہ ہے، اسلام ہر اُس ایجاد کا ساتھی ہے جس سے خلق خدا کو فائدہ پہونچتا ہو اس لئے کہ خود اسلام اپنی ذات سے فلاح و بہبود اور رفاہِ عام کا سرچشمہ واقع ہوا ہے!

فضا ابن فیضی

بنگال کا ایک گمنام شاعر

اکمل علی اکمل مرحوم اُن اکابر ہستیوں میں تھے جن کا بنگال میں اُردو زبان و ادب کی توسیع و اشاعت اور ترویج و ترقی کے سلسلہ میں بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ ۱۸۷۶ء میں کلکتہ (مغربی بنگال) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں وفات پائی۔

اکمل مرحوم اُردو اور فارسی زبان پر یکساں قدرت رکھتے تھے فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی زبان میں کافی عبور حاصل تھا۔ ۱۹۱۸ء پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر بنگلور کے زمانۂ قیام میں انگریزی گرامر د ۔ ہندستانی گرامر (Lesson in Hindustani Grammar) تصنیف کرکے اپنی قابلیت کا ثبوت دیا یہ کتاب انگریزی داں ادیب اور افسرانِ اعلیٰ کے ریویو کے ساتھ چھپ کر انگریزی اور اُردو داں طبقوں میں کافی مقبول ہوئی۔ اس سے انگریزوں کو اُردو سیکھنے میں خاص طور سے مدد ملی۔ انگریز طالب علموں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔ اور آج بھی یہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نصاب میں شامل ہے۔

اکمل کو شاعری سے قدرتی لگاؤ اور فطری مناسبت تھی۔ موزونی طبع کے باعث بچپن ہی سے شعر کہنے لگے۔ عبدالغفور خاں نسّاخ کے صاحبزادے ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس مرحوم کے شاگرد تھے۔ شمس کو فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اپنی خداداد ذہانت اور غیر معمولی صلاحیت کے باعث بہت جلد اصلاح سے بے نیاز ہوگئے۔ آغازِ شاعری میں بیشتر وقت شعر گوئی میں صرف کیا کرتے تھے اور ایک ہی نشست میں بہت سے اشعار موزوں کر لیا کرتے تھے۔

فارسی میں بھی شعر کہتے اور خوب کہتے تھے لیکن فارسی کی نسبت اُردو شاعری کی طرف طبیعت زیادہ مائل تھی ابتداء سے خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق کے کلام کا تتبع فرماتے رہے یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں داغ کی سی سادگی کے باوجود ذوق کا رنگ غالب ہے۔ ان کے کلام میں وہ خوبیاں موجود ہیں جو پختہ مشق اور خوش گو شاعروں کے کلام میں ہوا کرتی ہیں۔ نظم، غزل، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس وغیرہ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے جو قابلِ تحسین ہے لیکن مجموعی حیثیت سے ان کے کلام کا سب سے زیادہ حصّہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اکمل کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ لطف بھی ہے، بیان میں صفائی اور سلجھاؤ پایا جاتا ہے اور یہ بڑی بات ہے۔

اکمل کے سارے کلام (فارسی اور اُردو) کو جمع کیا جائے تو کم از کم پانچ ضخیم دیوان مرتب ہو سکتے ہیں اب تک صرف ایک دیوان مرتب ہو کر شائع ہو سکا ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام جو غیر مطبوعہ ہے اور جس کی نقل میرے پاس محفوظ ہے؛ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، اُسی دیوان سے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کرتا ہوں :-

نمونۂ کلام

قابلِ قدر یا تو میں نہ رہا یا کوئی صاحب نظر نہ ہوا

کی رہزنی اندیشۂ انجام نے اکملؔ شوقِ دلِ مضطر ابھی رہبر نہ ہوا تھا

کیا گلے مل مل کے روئی آج میری بیکسی اک دلِ تنہا پہ اتنی غم کی کثرت دیکھ کر
جب سے وہ میرا شریکِ غم ہو اکملؔ کیا کہوں کیا خوشی ہوتی ہے مجھکو غم کی صورت دیکھ کر

جب پیار کی نظر سے وہ دل کو دیکھتے ہیں ہم اپنی آنے والی مشکل کو دیکھتے ہیں

دل کا آجانا بھی کیا کچھ اختیاری بات ہو مبتلا آفت میں کوئی جان کر ہوتا نہیں

وہ تو مختار تھے مختاری سے کیا کام لیا ہم تو مجبور تھے کہیئے تو بھلا کیا کرتے

غم خوار نہیں کوئی دمساز نہیں کوئی کیا وقت پڑا یارب ہمراز نہیں کوئی

سننے کے قابل بات تھی اے کاش سنتے آپ بھی جو کہہ رہا تھا ہم نے دل اور کہہ رہے تھے دل سے ہم

تری راہِ شوق میں یوں مٹا کہ نشان تک نہ رہا مرا جو بچی تھی خاک پسِ فنا کچھ اِدھر گئی کچھ اُدھر گئی

کام تھا دشوار جینا ہجر میں میرے لئے ایک وعدے سے ترے لیکن یہ آسان ہو گیا

مرے حصے میں اے اکملؔ عجب افسردگی آئی نہ اب تنہائی بھاتی ہے نہ جی لگتا ہے محفل میں

اکملؔ مشاعروں میں تحت اللفظ اپنے مخصوص موثر انداز میں پڑھتے تھے کلکتہ کا کوئی مشاعرہ وحشتؔ اور اکملؔ کی شرکت کے بغیر کامیاب نہ سمجھا جاتا تھا، پہلے شمسؔ، حمیدؔ شاگردِ نساخؔ، نادرؔ تلمیذ غالبؔ اور کوکبؔ وغیرہ کے ہمراہ اکثر مشاعروں میں شرکت فرماتے تھے لیکن ان اساتذہ کے انتقال کے بعد ان کا دل مشاعروں سے اُچاٹ ہو گیا۔ اس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے ؎

گئیں شمسؔ و کوکبؔ کے شامل وہ باتیں
وہ زورِ طبیعت اب اکملؔ کہاں ہے

۷ بہ معنی مع ساتھ"

لیکن پھر بھی خان بہادر رضا علی صاحب وحشتؔ کی محبت کا یہ کرشمہ تھا کہ آخر دم تک ادبی صحبتوں میں حصہ لیتے رہے، اکملؔ کی شاعری بہت زیادہ تفصیل چاہتی ہے، میں نے نہایت اجمال سے کام لیا ہے، مگر اہلِ ذوق ان لکیروں سے یقین ہے "مرقع" بنا لیں گے!

عبدالحکیم
(ایم-اے، بی، ٹی علیگ)

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ

(اور سورج اپنے مستقر کی طرف رواں ہے یہی اُس عزیز اور علیم نے اس کے لئے مقدر فرمایا ہے)

اس دنیائے آب وگِل میں جو انقلابات و تغیرات بھی رونما ہوتے ہیں سورج کا ہاتھ ان سب میں براہ راست یا بالواسطہ ضرور ہوتا ہے۔ جاڑا گرمی، بہار برسات پھر ہر موسم کی فصلیں، پیداوار اور میوے ہر قسم کی غذا اور لباس کوئی چیز بھی بغیر سورج کے ممکن نہیں زندگی، نباتی ہو یا حیوانی جو شکل و نوعیت بھی رکھتی ہے اور وجود و نمود کے لئے محتاج ہے قدرت کے اس حیرت انگیز چراغ کی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں سورج نہ ہو، زندگی، غذا اور لباس کی جستجو یکسر بے سود ہے۔ ہم اس کرۂ خاکی کے جس مقام پر بھی رہتے ہوں، جو مشاغل اور کاروبار بھی رکھتے ہوں ہم محسوس کریں یا نہ کریں لیکن ہے یوں کہ یہ سب نتائج ہوتے ہیں سورج کے نہایت خاموش مگر قومی اثر و عمل کے اور عجیب تر یہ کہ اس مخزن نور و حرارت سے خارج ہونے والی توانائیوں کا یہ لاکھواں حصہ بھی نہیں ہوتا جو اس خاکدان ارضی کی جملہ ضروریات کے لئے پوری طرح کفایت کرتا ہے۔

فاصلہ اور جسامت

سورج کا اوسط فاصلہ زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ پانچ ہزار میل ہے اور تین لاکھ تیس ہزار زمینیں مل کر سورج کے برابر ہو سکیں گی۔ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے۔ اگر آپ زمین میں ایک میخ ٹھوکیں یہاں تک کہ آپ کی یہ میخ زمین کے اندرونی مرکز سے گزرتی ہوئی زمین کی دوسری جانب جا نکلے تو اس کی لمبائی تقریباً آٹھ ہزار میل ہوگی، سورج کا قطر اس لمبائی کا ۱۰۹ (ایک سو نو) گنا ہے سورج کی بیرونی سطح کا درجہ حرارت بارہ ہزار فارن ہائٹ ہے اور اندرونی حصوں کا ٹمپریچر لاکھوں درجے سے متجاوز ہے۔ سورج اور زمین کا فاصلہ اتنا موزوں اور مناسب ہے کہ زندگی کی نشو و ارتقا کے لئے ہر طور سے ممد و معاون ہے اگر آفتاب چند کروڑ میل ہم سے قریب تر ہو جائے تو یہ ہمارا حقیر سا کرۂ ارض جل کر خاکستر ہو جائے اور چند کروڑ میل دور تر ہو جائے تو ہم سب منجمد ہو کر رہ جائیں اور آج بھی قطب شمالی اور قطب جنوبی کے قریب کی سرزمین انسانوں کے لئے اس لئے بیکار ہے کہ سورج کی گرمی اور روشنی مناسب مقدار میں وہاں نہیں ملتی۔ انٹار کٹکا کا پورا براعظم جو رقبہ میں ہندوستان کا بارہ گنا ہے ابھی برفانی دور سے گزر رہا ہے اور حیوانی زندگی تو خیر ابھی نباتی زندگی سے بھی یکسر محروم ہے۔ پورے کرۂ ارض کا یہی حال ہو جائے اگر سورج کا چراغ گل ہو جائے کوئی ہم سے اس کو چھین لے جائے۔

بیرونی سطح

جیسا کہ معلوم ہے سورج ایک آتشیں کرہ ہے جو گرم اس قدر ہے کہ وہاں کوئی شے ٹھوس یا رقیق حالت میں نہیں رہ سکتی چنانچہ سورج تمام تر گیس ہی گیس ہے اور اگرچہ بظاہر بالکل گول نظر آتا ہے لیکن دوربینوں سے دیکھنے پر آگ کی بے شمار اور عظیم الجثہ لوئیں ہر طرف بڑھتی ہوئی نظر آتی

ہیں۔ کامل سورج گرہن کے موقع پر سورج کی یہ آتشیں زبانیں اچھی طرح دیکھی جاسکتی ہیں جو نہایت درجہ ہیبتناک منظر پیش کرتی ہیں رنگ میں بالکل سرخ ہوتی ہیں لیکن شکل اور جسامت میں مختلف ہوتی ہیں ان کی لمبائی ہزاروں میل ہوتی ہے ۱۹۱۹ء کے سورج گرہن کے موقع پر ایک آتشیں زبان کی لمبائی چار لاکھ پچھتر ہزار میل پائی گئی اور عظیم الجثہ اس قدر تھی کہ متعدد کرۂ ارض کو بیک وقت نگل جاسکتی تھی۔ مختصر اور ہلکی لویں بھی ہوتی ہیں جو گرہن کے موقع پر ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے چاند کے قرص کے چاروں طرف لعل ٹکے ہوئے ہیں۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی لپٹیں کیوں اٹھتی ہیں؟ سر جیمس جینس (SIR JAMES JEANS) کا خیال ہے کہ سورج کا اندرونی حصہ ایک زبردست پاور اسٹیشن ہے اور جو توانائی اس طرح پیدا ہوتی ہے سورج کو بے حد گرم کردیتی ہے پھر حرارت کی بڑی مقدار اندرونی حصوں سے باہر کی طرف خروج کرتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس مقدار میں اور جس سرعت کے ساتھ حرارت پیدا ہوتی ہے فضا میں اسی سرعت کے ساتھ خارج نہیں ہوپاتی اسی بنا پر یہ لپٹیں پیدا ہوتی ہیں جو فضا میں ہر طرف ہزاروں میل اور کبھی کبھی لاکھوں میل تک پھیل جاتی ہیں۔ بعض دوسرے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ گرم مادے کے ستون ہیں جو سورج کے اندرونی حصوں کی بے حساب گرمی سے اُبل کر سطح پر نمودار ہوتے رہتے ہیں مشہور فلکی چیویلر (CHEVALIER) ان لپٹوں کو سمندر کی دم بدم اُبھرنے والی موجوں سے تشبیہ دیتا ہے جو ہر دم رواں دواں رہتی ہیں اور ہر لحہ نئے قطرات آب پر مشتمل ہوتی ہیں۔

آفتابی حلقے کامل سورج گرہن کے موقع پر جب چاند قرص آفتاب کو پوری طرح ڈھک لیتا ہے تو موتی جیسے سفید رنگ کا ایک حلقہ قرص آفتاب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے نظر آتا ہے لیکن اس حلقے کی چوڑائی ہر مقام پر یکساں نہیں ہوتی کسی جگہ زیادہ چوڑا ہوتا ہے اور کہیں تنگ سفید پٹی سی دکھائی دیتی ہے، یہ حلقہ اصل میں روشنی کے انتشار سے پیدا ہوتا ہے اس سفید اور درخشاں حلقے کے اندر بھی ایک حلقہ اور ہوتا ہے جو تقریباً قرص آفتاب کو لمس کرتا نظر آتا ہے یہ دوسرا حلقہ چمکدار زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ ان آفتابی حلقوں کی روشنی کچھ زیادہ نہیں ہوتی اسے ماہ کامل کی روشنی کے نصف کے برابر سمجھنا چاہیئے۔

روشنی اور گرمی سورج کی روشنی ماہ کامل کی روشنی کی تقریباً پانچ لاکھ گنا ہے یعنے پانچ لاکھ ماہ کامل اکٹھا ہوں تو ایک سورج بنے اس طرح ۹۰ کروڑ زہرہ (جب کہ سب کی سب پوری آب و تاب سے چمک رہی ہوں) مل کر ایک سورج کے برابر ہوسکیں گی اور سورج کی سطح کے ہر مربع سینٹی میٹر سے آنے والی روشنی ایک نو ہارس پاور والے انجن کے برابر قوت خارج کرتی ہے اس حساب سے مجموعی طور پر 0.58×10^{24} ہارس پاور کی مقدار کے برابر مسلسل قوت کا اخراج سورج سے ہورہا ہے اگر یہ ساری قوت سورج کے اندرونی خزانۂ حرارت ہی کی بدولت خارج ہورہی ہے تو پھر سورج کا ٹمپریچر ہر سال بقدر ایک درجے کم ہوجانا چاہئے اور سورج کی بقیہ زندگی چند ہزار سال سے زیادہ ہونی چاہیئے لیکن طبقات الارض کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کرۂ ارض پر نامیاتی زندگی کا وجود کروڑوں سال سے ہے اور بلاشبہ صدیوں اور قرنوں کے اس اثنا کے پیش نظر سورج کی حرارت میں ایک درجہ فی سال کا تغیر نہیں ہوسکتا پھر اس بات کی قطعی شہادت موجود

ہے کہ گزشتہ قرنوں کے مقابلہ میں سورج کی حرارت میں کوئی غیر معمولی تبدیلی نہیں ہوئی ہے پس ضروری ہوا کہ سورج کے اندرونی خزانۂ حرارت کے سوا اور کوئی مقام ہو جہاں سے وہ مسلسل مطلوبہ حرارت فراہم کرتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مقام ہے کہاں؟ اور سورج کیوں کر وہاں سے گرمی حاصل کرتا ہے؟ بہتر ہے کہ اس سوال کی خلش ہم سب کے دلوں میں رہے اور ہم سب پوری سنجیدگی اور تدبر کے ساتھ اسے حل کرنے کی کوشش کریں۔

سیر و گردش

زمین کی طرح سورج بھی اپنے محور پر گردش کرتا ہے زمین چوبیس گھنٹے میں یہ گردش تمام کرتی ہے اور سورج کی گردش پچیس سے لے کر ستائیس دنوں میں تمام ہوتی ہے پھر یہ بھی ہے کہ مختلف عرض البلاد میں سورج کی گردشِ محوری مختلف ہوتی ہے اور یہ ایک تازہ ثبوت اس بات کا ہے کہ سورج ہنوز ایک گیسی کرّہ ہے۔ سورج کی ایک رفتار اور بھی ہے اور وہ سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے ۱۳ میل فی سکنڈ کی رفتار سے یا ۸۰۰ میل فی منٹ کے حساب سے سورج برج جاثی (HERCULES) کی سمت میں اپنے پورے کنبہ یعنے عطارد۔ زہرہ۔ زمین، مریخ، مشتری۔ زحل۔ یورے نس نیپچون اور پلوٹو سب کو لئے ہوئے رواں ہے سورج کی اس رفتار کا پتہ سب سے پہلے Sir William Herschel) سر ولیم ہرشل نے لگایا اس نے اپنے تجربات و مشاہدات کی بنا پر بتایا کہ برج جاثی کی سمت والے ستارے باہم پھیلتے، بکھرتے اور چھٹکتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور اس کے سمت مخالف والے ستارے باہم سمٹتے اور قریب تر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس کا ایک ہی سبب ہو سکتا ہے وہ یہ کہ سورج پورے نظام شمسی سمیت برج جاثی کی طرف حرکت کر رہا ہے اس کی تصدیق بعد کے تجربات اور تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔

آفتاب کے داغ

یہ بات کہ آفتاب میں بھی داغ ہیں ۱۶۱۱ء سے لوگوں کو معلوم ہے لیکن بالکل ممکن ہے کہ قدما بھی اس حقیقت سے واقف رہے ہوں کیونکہ بعض تحریریں ملتی ہیں جو اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ داغ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک تو مرکزی حصہ جو نہایت تاریک ہوتا ہے اور ایک اس تاریکی کے گرد کا مدھم حلقہ تاریک حصے کو ایک گہرا سوراخ سمجھنا چاہیئے۔ گرد کے حلقے کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے بہت سارے خطوط ہیں جو مرکزی حصے کی طرف رواں ہیں یہ آفتابی داغ ہزاروں میل لمبے چوڑے ہوتے ہیں انہیں ایسے ہیبتناک غاروں سے تشبیہ دی جاسکتی ہو جن میں ہمارے کرۂ ارض جیسے متعدد کرے بیک وقت بھر دیئے جائیں تو بھی جگہ خالی رہے چھوٹے داغوں کے مرکزی دائروں کا قطر ایک ہزار میل تک ہوتا ہے اور بڑے داغوں کا پچاس ہزار سے ساٹھ ہزار میل ہو سکتا ہے کبھی کبھی سطح آفتاب پر اتنے سارے داغ ابھر آتے ہیں کہ بیرونی سطح کا ایک قابلِ لحاظ حصہ انہیں کی نذر ہو جاتا ہے۔

باوجود اس کے کہ ان آفتابی داغوں کا مطالعہ بڑی دیدہ ریزی سے کیا گیا ہے لیکن ان کی ماہیت پوری طرح اب تک سمجھی نہیں جا سکی ہے ان داغوں کو دیکھنے والا ہر شخص دیکھتا ہے کہ ان کے کنارے جو ابھی نمایاں اور بالکل واضح تھے تیزی کے ساتھ گر کر ہموار ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہائڈروجن اور کیلشیم کے بادل جو غاروں کے اوپر موجود ہوتے ہیں ان میں از خود بھرتے جا رہے ہیں۔ اندر کا گرم مادہ بھی ان میں ابلتا ہے اور بیرونی فضا کی نسبتاً ٹھنڈی گیس بھی ان میں گھستی جاتی ہے۔ داغوں کی حقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کسی عارضی حادثے کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہیں بلکہ سورج کی ساخت اور اس کے جملہ احوال و کیفیات کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں شوئیب (SCHWABE) نے بتایا کہ آفتاب کے داغوں کے

ظاہر ہونے اور پھر غائب ہو جانے کا پورا ایک دور گیارہ سال کا ہوتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس زمانے میں ان داغوں کی کثرت ہوتی ہے مقناطیسی طوفان کثرت سے آتے ہیں اور ضوء شمالی (aurorae) بھی اکثر و بیشتر اسی زمانے میں نمودار ہوتی ہے زمین کے کرۂ ہوائی پر بھی ان کا کچھ اثر ہوتا ہے یعنی اس کی حدت۔ دباؤ اور نمی وغیرہ پر اثر پڑتا ہے لیکن جیسا کہ اے۔ آر ہنک (A. R. HINK) کا خیال ہے آفتاب کے داغوں، مقناطیسی طوفانوں اور ضوء شمالی وغیرہ میں کوئی خاص تعلق نہیں ہے بلکہ یہ سب کے سب مظاہر ہیں کسی زیادہ دقیق اور پیچیدہ حقیقت کے جس کا پتہ ماہرین اب تک نہیں لگا سکے ہیں

آفتاب کی ترکیب

منظار اللون (spectroscope) سے آفتاب کی شعاعوں کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے آفتاب میں بہت سارے عناصر تو وہی ہیں جو زمین میں پائے جاتے ہیں مثلاً ہائڈروجن۔ آکسیجن ہیلیم، کاربن، کیلسیم لوہا۔ تانبا جست، چاندی، سیسہ وغیرہ مگر ان کے علاوہ دوسرے بہت سے اجزا کی موجودگی بھی سورج میں مسلم ہے البتہ ان کے بارے میں اب تک ہمیں قطعی معلومات نہیں حاصل ہو سکی ہیں۔ رصدگاہ گرین وچ (لندن) میں تقریباً روزانہ بشرطیکہ فضا صاف ہو سورج کے فوٹو تفصیلی مطالعہ کے لئے لئے جاتے ہیں ہر ممکن طور پر سورج کا مشاہدہ ہوتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیفۂ فطرت کے اس روشن شاہکار کے عجائبات شاید کبھی ختم ہی نہ ہوں!

سورج کا کنبہ

سورج کا پورا ایک گھرانا ہے جس کا سردار خود سورج ہے اس گھرانے میں وہ نو سیارے شامل ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ان کے سوا ہزاروں چھوٹے چھوٹے سیارے اور بھی ہیں جو مریخ اور مشتری کے مسیر کے درمیان واقع ہیں یہ بھی دوسرے سیاروں کی طرح سورج کے گرد گردش کرتے ہیں اور سورج کے گھرانے کے افراد ہیں۔ یہ عظیم الشان گھرانا تجاذب مادی کے نظام محکم کا پابند ہے ان میں کا ہر جرم دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ قوت کشش کا دارومدار دو چیزوں پر ہے جسامت جس قدر زیادہ ہوگی قوت کشش بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوگی البتہ فاصلہ دو سیاروں کا جس قدر زیادہ ہوگا ایک کی کشش کا اثر بھی دوسرے پر اسی کی نسبت سے کم ہوگا اب سورج اور سیارے اپنے حجم کے لحاظ سے اس درجہ متناسب ہیں اور ان کے باہمی فاصلے اتنے موزوں کہ ایک توازن اور اعتدال کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور سب اپنے اپنے دائروں میں گردش کرتے ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی سیارہ اپنا توازن کھو بیٹھے اور کسی دوسرے سے ٹکرا جائے یا سورج میں جا گرے۔ الشمس والقمر بحسبان والنجم والشجر یسجدان

جس خدا نے سورج کو بنایا اور نظام شمسی کو خلق فرمایا ہے، اُس کی عظمت و کبریائی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے، ہم اس کی عظمت کے آگے اپنی جبینِ عبودیت جھکاتے ہیں، فہم و بصیرت اور تلاش و جستجو کی بلندیوں پر پہونچنے کے بعد بھی بندہ کا یہی فرض ہے کہ معبود کے سامنے عجز عبدیت پیش کرے کہ اسی سے انسانیت کا شرف وابستہ ہے!

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:-

۱- جنرل اسٹرانومی- مؤلفہ ہیرلڈ اسپنسر جونز HEROLD SPENCER JONES
۲- اسٹرانومی (ہنک) HINKS
۳- اسٹرانومی فار کالجز
۴- ہیئت جدید حصہ اول- پروفیسر برکت علی منہاج الدین صاحبان
۵- متفرق مضامین رسالہ سائنس (انجمن ترقی اردو)

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

فروغِ شمع تو باقی رہے گا صُبحِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

ماہ مئی کے فاران میں اس الم انگیز عنوان کے تحت دل کی کچھ چوٹیں کاغذ پر منتقل کی تھیں اور ابھی تک وہ چوٹیں کسک رہی تھیں کہ کچھ اور نئے داغ اُبھر آئے، اُردو زبان کے مُحسنوں کی موت کے یہ تابڑ توڑ حادثے بہت غمناک ہیں، مرحومین کے ورثار اور پس ماندگان سے زیادہ خود اُردو "پُرسے" کی مستحق ہو کہ ہر حادثہ اُس کا بہت بڑا نقصان ہے!

مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی

ہندستان کے جن بڑے آدمیوں کا نام بچپن ہی سے سُن رکھا تھا، اُن میں ایک نام مولانا حسرت موہانی مرحوم کا بھی تھا، حسرت صاحب کی قومی سرگرمیوں کا آغاز علی گڑھ سے ہوا تھا، اور علی گڑھ میرے وطن سے بہت قریب ہے اس لئے اُن کے بارے میں بہت سی باتیں سُننے میں آتی رہتی تھیں، مسٹر ڈول علی گڑھ کالج کے پرنسپل اور ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم ریاضی کے پروفیسر تھے، علی گڑھ کالج کے انتظامی معاملات میں مولانا حسرت موہانی کو ان صاحبوں اور اُن کے ساتھیوں کی روش سے سخت اختلاف تھا، چنانچہ حسرت مرحوم نے —— "مسٹر ڈول کی شرارت اور ڈاکٹر ضیاء الدین کی حماقت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس پر مخالفین کی طرف سے بڑی لے دے ہوئی، یہ تنقید محمڈن کالج علی گڑھ سے متعلق تھی مگر اربابِ حکومت نے محسوس کیا کہ اس کی زد ہماری سیاسیات پر آکر پڑ رہی ہے اُس دورِ استبداد میں یہ بہت بڑی جُرأت تھی اور حسرت موہانی کی اس جرأت، بے باکی اور صاف گوئی میں کمی نہیں آئی، یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا —— اُن دنوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا حسرت سیاسیات میں اپنے کو لوکمانیہ تلک (بال گنگا دھر) کا شاگرد بتاتے ہیں یہ وہ زمانہ تھا جب گاندھی جی کی شہرت شیر خواری کے عالم میں تھی۔

مولانا حسرتؔ کے دیکھنے کی بڑی آرزو تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر کر دیا ہے، وقت سے پہلے کسی کی کوئی آرزو پوری کیسے ہو سکتی ہے، قدرت کا نظام لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا پابند نہیں ہو ——— ہاں! تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں خود مولانا حسرتؔ موہانی کے اہتمام سے کانپور میں ایک سیاسی کانفرنس منعقد ہوئی، ڈاکٹر کنور محمد اشرف (جو اب کمیونسٹوں کے لیڈر ہیں اور سُنا ہے کہ ان دنوں انگلستان میں براجمان ہیں) اس کے صدر تھے، سید حسن ریاض صاحب (سابق مُدیر روزنامہ "ہمت"، "منشور" اور "ڈان") سے مولانا حسرتؔ موہانی کو خاص ربط تھا اس لئے وہ اس کانفرنس میں بہت پیش پیش تھے، مولانا نصر اللہ خاں عزیزؔ، سید صلاح الدین صاحب بہاری اور میں بجنور سے چل کر کانپور آئے اور کانفرنس میں شرکت کی، زندگی میں پہلی بار کانپور آنا ہوا، مچھلی بازار کی مسجد دیکھنے کا بڑا شوق تھا، یہی وہ مسجد تھی جس کا تھوڑا سا بیرونی حصہ شہید ہو جانے پر غیرت مند مسلمانوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، مولانا شبلی نعمانی کی یہ نظم

ع ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

اسی خونیں واقعہ کی یادگار ہے، یہ انگریزوں کا دور تھا، اور اب ہندوؤں کے دور میں مسلمانوں کی نہ جانے کتنی مسجدیں ڈھا دی گئیں اور کتنی غیر مسلموں کے قبضہ میں ہیں مگر "صدائے برنخاست" اور "گوشِ فلک خانے نہ شنید" ——— "ظالم مارے اور رونے نہ دے" اس ضرب المثل کو اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھ لیا اور نہ جانے کیا کیا دیکھنا باقی ہے!

ذکر تھا مولانا حسرتؔ موہانی کا اور بات نکل آئی مچھلی بازار کی مسجد کی! مگر میں غزل اور قصیدہ نہیں "مرثیہ" لکھ رہا ہوں اور "فریاد" کی کوئی "لے" نہیں ہوا کرتی، اب دل کی جو خلش بھی بیان ہو جائے! اس بے ربطی پر مجھے معذور سمجھا جائے۔

کانفرنس کے بعد سیرۃ النبی کے جلسوں کے لئے رُکنا پڑا، سات آٹھ دن کانپور میں قیام رہا اور مولانا حسرتؔ موہانی کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی، گھنٹوں گفتگو رہتی، شعر و ادب پر، سیاست پر اور مذہب و تصوف پر! مولانا کے مکان کی بیٹھک کا نقشہ اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے ایک پلنگ بچھا تھا جس کی ملگجی چادر اور میلے تکیے صاحبِ خانہ کی عُسرت کی کہانی زبانِ حال سے سُنا رہے تھے، چھوٹی سی میز پر چند کتابیں دھری تھیں، تین چار کرسیاں اور غالباً سرکنڈے کے مونڈھے بھی تھے، پلنگ کے سرہانے دیوار میں جو طاق تھا اُس میں کرشن جی کی ایک مورتی بھی رکھی تھی ——— مٹی کی بنی ہوئی مورتی جو اُس زمانہ میں دو تین پیسہ میں آتی تھی، بہت ممکن ہے کہ گھر کے بچوں نے اس کھلونے کو وہاں رکھ دیا ہو ——— مگر یہ بھی حقیقت ہے جو میں نے خود حسرتؔ کی زبان سے سُنی ہے کہ کرشن جی سے مرحوم کو عقیدت تھی وہ بندرابن (متھرا) جایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "وہاں مجھے رُوحانی کیف حاصل ہوتا ہے ۔ ۔ ۔"!

آموں کی رُت تھی، سستے کا زمانہ تھا، دسہری آم کی ایک ڈھیری بہت سے بہت سات آٹھ آنہ میں آتی تھی، بالٹی میں برف ڈال کر آم بھگو دئے جاتے اور پھر بالٹی کے آس پاس یارانِ طریقت بیٹھ کر نہ ڈھیری بیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے (۳۳) آم نکلتے تھے!

آم کھاتے، مولانا حسرت موہانی کے ہاتھ میں چاقو ہوتا اور بڑے شوق سے آم تراشتے اور تعریفیں کرتے جاتے ...... خوب ... ہے ..... "بہت اچھا ...... ہے ...." ! پاکستان میں آموں کی یاد آتی ہے تو قوتِ ذائقہ ہاتھ جوڑ کر کہتی ہے کہ "خدا کے لئے وہیں لوٹ چلو" ــــ ہائے ! لذّت کا مارا ہوا انسان !

کان پور کی جس کانفرنس کا اوپر ذکر کیا ہے، اُس کے اجلاسوں کا اعلان شہر میں والنٹیروں کے سپرد تھا، ان میں ایک والنٹیر ہندو نوجوان تھا، متھرا کے قریب کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا، آدمی بے باک اور منچلا تھا، خود کانگرس کو بے نقط گالیاں سناتا کہ کانگریس کو برلا اور ڈالمیا نے اپنے روپے سے خرید لیا ہے ــــ اسی شخص نے کانفرنس کے جلسوں کا اعلان کرتے کرتے "دیا کھیان" دینا بھی شروع کر دیا، انگریزی حکومت کو خوب بُرا بھلا کہا، پولیس نے اسے دھر لیا، کانفرنس کے دوسرے کارکن صاف کنّی کاٹ گئے، مولانا حسرت موہانی اُسے ضمانت پر چھڑا کر لائے، کچہریوں میں اُس کے ساتھ پیدل پھرتے تھے، اور وہ جانگلو والنٹیر بھی بڑا ستم ظریف تھا، ہوٹلوں میں مولانا حسرت کو لے کر گھس جاتا اور طرح طرح کی چیزیں کھاتا، اُس کے چٹورپن کا بار اس "مردِ قلندر" کی جیب پر پڑتا، ہم تو چند دن کے بعد کان پور سے چلے آئے نہ جانے حسرت مرحوم کو اس بلا سے کب نجات ملی !

مولانا حسرت موہانی مرحوم سے پھر نیاز حاصل ہوتا ہی رہا، سیاسی جلسوں میں، مشاعروں میں، دعوتوں اور پارٹیوں میں ! ایک بار اُن کے ساتھ ہم سفری کا موقعہ بھی میسّر آ گیا، میں دہلی سے حیدرآباد دکن جا رہا تھا، مولانا مرحوم کانپور سے آ رہے تھے، جھانسی کے ریلوے جنکشن پر وہ اُسی ڈبّہ میں اتفاق سے سوار ہو گئے جس میں راقم الحروف بھی بیٹھا ہوا تھا، سیّد حسن ریاض صاحب اُن کے ساتھ تھے ــــ اُن کے اسبابِ سفر کا حال بھی لگے ہاتھوں سُن لیجئے، ٹین کا چھوٹا سا بکس تھا جس میں کپڑوں کے دو جوڑے رکھے تھے، معمولی لٹھے کے دو پاجامے، گھٹیا قسم کی ململ کے دو کرتے جن پر سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں "میرے خیال میں یہ کپڑے گھر ہی میں ہاتھ کے دُھلے ہوئے تھے" پانچ چھ پیسہ والا لکڑی کا کنگھی، سرمہ دانی، چند کتابیں ــــ اور بستر ؟ شکستہ دری، ایک تکیہ اور بہت ہی فرسودہ کمبل، یہ تھی "شہنشاہ متغزلین" کے سفر کی کل کائنات !

۱۹۳۹ء (غالباً) کا ذکر ہے، جبل پور میں بہت بڑے پیمانہ پر ستی مسلم لیگ کی طرف سے کانفرنس منعقد ہوئی تھی، جبل پور میں ایک پُرجوش قومی کارکن تاج الدین (اللہ اُن کی مغفرت فرمائے) تھے، انھی کی کوششیں اس کانفرنس کی رُوحِ رواں تھیں، پٹنہ کے سید عبد العزیز مرحوم (سابق وزیر عدالت حکومت دکن) کو سب سے پہلے اسی جلسہ میں دیکھا اور نہ صرف دیکھا بلکہ اُن کی تقریر بھی سُنی، مسٹر فضل حق سابق وزیر اعظم بنگال بھی تشریف لائے تھے، اُن دنوں اُن کی شہرت اپنے شباب پر تھی اور وہ "شیرِ بنگال" بنے ہوئے تھے مگر اُنھوں نے اپنی شخصیت کی موت اپنی زندگی ہی میں دیکھ لی ...... (اللھم احفظنا من الحور بعد الکور ......) !

اس مضمون کے پڑھنے والوں کے ذہن میں یہ بات غالباً کھٹک رہی ہوگی کہ ایک شاعر اور لیڈروں کا کیا جوڑ ؟ تو آپ کی یہ کھٹک بھی دُور ہوئی جاتی ہے، سنیئے ! اسی کانفرنس کی طرف سے ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، مجھے اسی کے لئے حیدرآباد دکن سے بلایا گیا تھا، حیدرآباد دکن سے جبل پور کا قریب کا راستہ ناگپور اور گوندیا ہو کر تھا، مگر میں نے اپنی بے خبری کے سبب (اسے حسن بے خبری کو آپ حماقت بھی کہہ سکتے ہیں) اٹارسی کا راستہ اختیار کیا، اُن دنوں اٹارسی خاکسار تحریک کا

مرکز بنا ہوا تھا، اٹارسی جنکشن پر پہونچ کر معلوم ہوا کہ جبل پور کے لئے ٹرین جانے میں ابھی کئی گھنٹہ کی دیر ہے، سیر و سیاحت اور نئے مقامات دیکھنے کا مجھے سودا ہے، چھوٹے سے گاؤں میں بھی جانا ہوتا ہے تو اُس کی گلیوں کو گھوم پھر کر دیکھ لیتا ہوں، ویٹنگ روم میں پڑے پڑے جی بھی گھبرانے لگا، میں اٹارسی کی بستی دیکھنے چلا گیا، وہاں چند خاکساروں نے مجھے پہچان لیا، اور پھر وہ میرے ساتھ ہولئے، ہم نے اسٹیشن پر ساتھ ہی کھانا کھایا، خاکسار تحریک کے بارے میں وہ مجھ سے پوچھنے لگے، میں نے کہا:-

"اگر آپ لوگوں نے اپنے لیڈر کی زبان و قلم پر قابو نہ رکھا تو یہ تحریک تباہ ہو جائے گی۔۔۔"

چنانچہ یہی ہوا کہ عنایت اللہ خاں صاحب مشرقی کی زبان و قلم کی بے اعتدالی اور غیر ذمہ داری کے سبب خاکسار تحریک کو ناکامی بلکہ زوال و غارت گری کا منہ دیکھنا پڑا۔

کہاں سے کہاں پہونچ گیا؟ جبل پور کے جس مشاعرے کا میں ذکر کر رہا ہوں اُس کی صدارت سید علی متقی صاحب نے فرمائی جو اُس وقت جبل پور میں سب جج تھے، پھر وہ ترقی کر کے سشن جج ہو گئے اور آجکل کراچی میں ڈپٹی کسٹوڈین ہیں، مشاعرے کے علاوہ کانفرنس کے ہر اجلاس میں مجھ سے "سلام"[۵] بھی سُنا گیا ——— مولانا حسرت موہانی مرحوم نے کانفرنس میں ایک طویل تقریر کی، وہ اچھے مقرر نہ تھے، آواز قدرتی طور پر پست تھی اور لہجہ اور تلفظ میں ژولیدگی پیدا ہو جاتی تھی، مگر بات صاف، کھری اور دو ٹوک کہتے تھے، خلوص اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا، قول و عمل میں یکسانی تھی، اس لئے اُن کی تقریر کا سننے والوں پر اثر ہوتا تھا۔

حسرت مرحوم ان دنوں لندن کے سفر سے واپس آئے تھے، میں نے وہاں کے حالات پوچھے تو فرمایا کہ وزیر ہند سے ملنے کے لئے میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے ذکر کیا تو کسی نے رائے دی کہ وزیر ہند کے یہاں "وزیٹنگ بک" میں اپنا نام لکھ کر آؤ، کسی نے کہا اس طرح اور ان لفظوں میں اُن سے ملاقات کی درخواست کرو۔۔۔ مگر میں نے تو بھائی! ایک کارڈ (لفافہ نہیں۔۔ کارڈ"! حسرت نے لندن میں بھی سادگی کی وضع کو نباہا) لکھ دیا، اور وہاں سے مجھے بلا لیا گیا، اور میں نے کانگرس اور مسلم لیگ کی پوزیشن وزیر ہند پر اچھی طرح واضح کر دی۔

زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ نام نہاد "ترقی پسند ادب" کی سب سے زیادہ مخالفت اس عاجز نے کی ہے، بمبئی جو اِن "ترقی پسندوں" کا گڑھ ہے، وہاں اپنے زمانہ تک میں نے اِن کی چلتی نہیں چلنے دی ——— عجیب اتفاق ہے کہ قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کی وفات کے بعد میں نے حیدرآباد دکن ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا، نواب صاحب کی "مرگِ بے ہنگام" کے بعد دل اُچاٹ سا ہو گیا، مگر دکن میں میری زندگی کے کم و بیش تیرہ سال گزرے تھے، وہاں کے ماحول سے گونہ تعلقِ خاطر تھا، اس لئے سال میں ایک دو بار وہاں کا پھیرا ضرور ہو جاتا۔

میں مدراس کے کسی مشاعرے سے واپس آیا تھا، اتفاق کی بات کہ مولانا حسرت موہانی بھی اُن دنوں بلدۂ حیدرآباد میں قیام فرما تھے، ادارہ شرقیہ میں ایک مشاعرے کے انعقاد کی تجویز عمل میں آئی، میں نے مشاعرے کے کارکنوں سے کہا کہ مولانا حسرت موہانی یہاں آئے ہوئے ہیں، اُن کی موجودگی سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے، مشاعرے کے بعد مولانا کی صدارت میں ایک جلسہ ہونا چاہیئے جس میں "ترقی پسند ادب" کی خرافات اور لغویات کو واضح کیا جائے!

سب نے میری رائے سے اتفاق کیا، میرا خیال نہیں یقین تھا کہ حسرت مرحوم کی شاعری کا سارا سرمایہ "غزل" کے سوا اور کچھ

۵ـ　سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی

نہیں ہو، پھر وہ بڑے پکے مذہبی آدمی ہیں اور "قدامت" تو اُن کی پیشانی پر بہ خطِ جلی لکھی ہوئی ہو، میں نے اُن سے مشاعرے میں شرکت اور جلسہ کی صدارت کے لئے درخواست کی اور مولانا مرحوم نے بغیر کسی تامل کے اپنی محبت سے "ہامی" بھر لی۔

ادارۂ شرقیہ، صادق جنگ کی ڈیوڑھی میں تھا، وسیع صحن، لمبا چوڑا ہال، مشاہیر شعراء کا اجتماع، اربابِ ذوق کا جمگھٹا، مہذب اور مودب محفل! مولانا حسرت موہانی مرحوم غزل سنانے کے لئے اسٹیج پر تشریف لائے اور چھوٹتے ہی کہنے لگے کہ "ماہرالقادری نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی مگر میں اُن کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔۔۔ وہ ہوسناک شاعری کی مخالفت کرتے ہیں مگر میں کہتا ہوں۔۔۔ شعر و ادب میں ہوس کو لاؤ، ہوس کو لاؤ (اس تکرار کو ذہن میں رکھئے اور ساتھ ہی مولانا حسرت کے لہجہ کو بھی۔۔۔) پھر خود اپنی شاعری کی "اقسام" گنانا شروع کیں، جن میں سے ایک قسم "فاسقانہ شاعری" بھی تھی۔۔۔ سب لوگ حیرت کے ساتھ اُن کا منہ تک رہے تھے، پھر فرمایا "اور مذہب اور خدا! تو جب میں علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا، وہاں میرے ایک ساتھی کہا کرتے تھے کہ زمین کو کس نے بنایا آسمان کو کس نے خلق کیا۔۔۔ یہاں تک کہ خدا کو کس نے بنایا۔۔۔"

مولانا حسرت کے اس جملہ پر مجمع بہت برہم ہوگیا، جیسے تیسے مشاعرے کے کارکنوں نے لوگوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا، اس کے بعد میں نے تقریر کی، میں بہت پُر دل تھا، میں نے اسٹیج پر آتے ہی کہا کہ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو حق اور باطل کے درمیان سمجھوتا چاہتے ہیں، حق اور باطل ایک نہیں ہوسکتے۔۔۔ پھر میں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جب لوگ زمین و آسمان کی تخلیق کے بارے میں سوال کریں گے اور پھر یہاں تک کہیں گے کہ (العیاذ باللہ) "اللہ کو کس نے بنایا" سو حضورؐ کے ارشاد کی تصدیق ہم اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں۔۔۔"

کہاں یہ ہیچمدان اور کہاں مولانا حسرت موہانی! اگر جذبۂ حق کی عمر دراز، جس نے مجھ میں غیر معمولی جرأت پیدا کردی؛ مولانا حسرت کا ظرف بھی قابلِ تعریف ہو کہ اس واقعہ کے بعد جب پہلی بار ملنا ہوا تو ہمیشہ کی طرح تپاک اور محبت سے ملے اور اس سلسلہ میں ایک لفظ بھی مجھ سے نہیں کہا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مولانا حسرت (اللہ اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) سے آخری بار ملاقات یہیں کراچی میں ہوئی، پارسال حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر وہ کراچی تشریف لائے، شیخ محمد حاضر صاحب نے مولانا کے اعزاز میں پُرتکلف عصرانہ دیا، شیزان ہوٹل کے ہال کا تین چوتھائی حصہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا، پھر میں مولانا کی فرودگاہ پر حاضر ہوا، میری گزارش پر مولانا نے چند غزلیں اپنے مخصوص ترنم میں سُنائیں، میں نے عرض کیا "حضرت! آپ اپنا پچھلا کلام کبھی نہیں سناتے" اس پر بولے "میں ہر مشاعرے کے لئے نئی غزل کہتا ہوں، اب یہ مشاعرے والوں کی تقدیر ہے، جیسی بھی غزل ہوجائے ——" حسرت مرحوم سے میری یہ آخری ملاقات تھی!

مولانا حسرت کی قومی اور سیاسی خدمات بھلائی نہیں جاسکتیں، انھوں نے اُس وقت انگریزی سامراج کے خلاف علمِ احتجاج بلند کیا ہو جبکہ ایک برص زدہ "ٹامی" کو دیکھ کر اچھے اچھوں کے حواس باختہ ہوجاتے تھے، انگریز دشمنی "حسرت کی گھٹی میں پڑی تھی، وہ اُس زمانہ میں جیل میں گئے ہیں جبکہ ہندستان کے بڑے بڑے

---

۵ اس ادارے میں مشرقی علوم کے امتحانات کے لئے طلباء کو تیار کیا جاتا تھا، مولوی حمید الدین قمر فاروقی سنبھلی اسکے بانی اور پرنسپل تھے، جو آجکل دکن کی جمعیۃ علماء کے صدر ہیں! نہ جانے زوالِ حیدرآباد کے بعد اس ادارے کا کیا حشر ہوا؟

لیڈر خس خانوں اور شبستانوں میں رہا کرتے تھے، حسرت اپنی جگہ کوہِ وقار و ثبات تھے، کسی قیمت پر بھی وہ خریدے نہیں جا سکتے تھے ــــــ ناگپور میں آل انڈیا کانگریس کا معرکہ آرا سالانہ اجلاس ہوا تو حسرت موہانی نے گاندھی جی کی شدید مخالفت کی، وہ "تشدد" پر ایمان رکھتے تھے اور گاندھی جی "اہنسا" کے قایل تھے، جیت گاندھی جی ہی کی ہوئی مگر دنیا نے ایک مسلمان مردِ مجاہد کے حوصلہ کو تو دیکھ لیا!

قایدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح مرحوم دُھن کے پکے اور بات کے پُورے تھے، جس بات پر جم جاتے اُس سے پھر اُن کو کوئی طاقت اور مخالفت ہٹا نہ سکتی تھی، اپنی ذات پر اُن کو غیر معمولی اعتماد تھا، مسلم لیگ کے وہ پریسیڈنٹ ہی نہیں بلکہ سیاہ و سفید کے مالک تھے، قایدِ اعظم کے ساتھیوں میں اکثریت ان کے نیاز مندوں ہی کی تھی، نواب محمد اسمٰعیل خاں، مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی اور تیسرے مولانا حسرت موہانی مرحوم ان کے بارے میں سُنا ہے کہ اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے چاہے وہ رائے قائدِ اعظم کی کسی تجویز اور منشا کے مخالف ہی کیوں نہ ہو، ان تینوں میں مولانا حسرت سب سے زیادہ جری اور صاف گو تھے، ایک طرف "محمد علی جناح" اپنی جگہ چٹان سے زیادہ مضبوط اور دوسری جانب "فضل الحسن حسرت" جذبات کا پُر شور سمندر ۔۔۔۔۔ !

ع میانِ پختہ کاراں بود بحثِ خویشتن داری

سُنا ہے کہ حسرت مرحوم بعض اوقات قائدِ اعظم کی ذات پر بھی تنقید کر جاتے تھے مگر قایدِ اعظم اس مخلص رفیقِ کار کی تنقید کا بُرا نہ مانتے تھے۔

مولانا حسرت موہانی فرنگی محل کے خاندان سے سلسلہ طریقت میں نسبت رکھتے تھے اور اس طرح اُن کا سلسلہ حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ تک پہونچتا ہے، عرسوں کے تو عاشق تھے، شاید ہی کوئی ایسا مہینہ گزرتا ہو جس میں کسی بزرگ کے عُرس میں نہ جاتے ہوں، اس معاملہ میں وہ بریلوی عقاید سے متاثر تھے، اس لئے علما، دیوبند سے خوش عقیدہ نہ تھے ــــــ غلو کا یہ عالم تھا کہ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کو مخاطب کرکے معروضہ کرتے ہیں۔

ع دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للہ

ایک طرف عرس، فاتحہ، قوالی، تسبیح و درود کی وہ شوراشوری اور دوسری طرف یہ بے تکلفی کہ اُن کی بیگم صاحبہ برقعہ تو پہنتی تھیں مگر چہرہ کُھلا رکھتی تھیں اور یہ وہ زمانہ تھا جبکہ کسی مسلمان عورت کا بغیر پردے کی سواری میں برقعہ پہن کر سفر کرنا بھی معیوب سمجھا جاتا تھا، پہلی بیوی کی وفات کے بعد مولانا نے دوسری شادی کی اور ان دوسری بیوی کو "کھلے چہرہ" نہیں دیکھا گیا، بہت ممکن ہو بے حجابی کی بُرائیاں دیکھ کر مولانا حسرت پر اپنی رائے کی غلطی واضح ہو گئی ہو۔ یا پھر اُن کی بیگم صاحبہ ہی اس بے اعتدالی کے لئے تیار نہ ہوئی ہوں!

وہ حضرات جو مولانا حسرت موہانی سے بہت قریب رہے ہیں اُن کی زبانی میں نے سُنا ہے کہ انگریزوں کے زمانہ میں انارکسٹوں کی جو پارٹی ہندستان میں پائی جاتی تھی، اس کے بعض ارکان سے مولانا حسرت کا ملنا جلنا رہتا تھا، حسرت مرحوم فطرتاً انتہا پسند واقع ہوئے تھے، طبیعت میں ذضوبیت کی چنگاریوں کی گرمی تھی، "تشدد" پر شروع ہی سے اُن کا یقین تھا، انگریز کی دشمنی میں وہ شاید سب سے آگے تھے، یہی اسباب تھے کہ وہ "کمیونزم" سے خاصے متاثر تھے اور اس مسئلہ میں کسی کی بھی نہ سنتے تھے ــــــ نہ جانے مولانا سید سلیمان ندوی کا

یہ جملہ اُن تک پہونچا کہ نہیں "کمیونزم بہ یک وقت بادشاہ کو تخت سے اور خدا کو عرش سے اُتار دینا چاہتا ہے ۔"

مولانا حسرت موہانی کی شعر و ادب کی خدمات بے اندازہ ہیں، عروض و بیان اور معانی و تنقید پر انھوں نے گرانقدر مضامین لکھے ہیں، قدیم اساتذہ کے کلام کے انتخابات شائع کئے ہیں اور اپنی غزلوں[1] سے اردو شاعری کی عزت بڑھائی ہے، ہم اللہ کے فضل سے تناسخ کے قایل نہیں ہیں ورنہ کہتے کہ حکیم مومن خاں نے زیادہ حسین اور طرحدار ہو کر حسرت موہانی کی شخصیت میں جنم لیا ہے، اُن کی شاعری سچ مچ "تغزل" کی جان ہے!

حسرت موہانی کی اخلاقی زندگی کے بارے میں کوئی ایک مشتبہ بات بھی ہم نے نہیں سُنی، یوں بھی دیکھنے میں اُن کے چہرے پر "حیرت ما اضطراب" کا عالم تو طاری رہتا تھا مگر اُن کے تیوروں سے "شاعرانہ بے اعتدالی" ظاہر نہ ہوتی تھی لیکن اُن کی غزلوں میں "معاملہ بندی" کے اتنے بہت سے اشعار ہیں کہ اُن کو ہم بالکل "رد ا بنی" بھی نہیں کہہ سکتے خاص طور سے اس قسم کے شعر :- ؎

وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

سُنے سُنائے نہیں ہو سکتے، ان میں "آپ بیتی" جھلک رہی ہے! غزل کے لئے کہیں نہ کہیں طبیعت کا اٹکاؤ تو بہر حال چاہیئے!

مولانا حسرت موہانی اُردو اور فارسی کے پہلے اور شاید آخری شاعر ہیں جنھوں نے "غزل" میں سیاسی افکار کی ترجمانی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ تغزل کی سبک روح پر یہ ترجمانی گراں نہیں گزرتی، اُن کی بعض غزلوں میں "ظالم" "بیداد گر" "عربدہ جو" اور "قاتل و ستمگر" سے "انگریز" اور "برطانوی سامراج" مراد ہے! تاریخی سن کا ٹھیک تعین تو بہت مشکل ہے، مگر یہ اب سے غالبؔ تیس سال پہلے کی بات ہے، جب مولانا حسرت مرحوم جیل خانہ میں تھے اور چکّی کی مشقت کے ساتھ مشقِ سخن بھی جاری تھی، عوام نے احتجاجی جلسے منعقد کئے اور حکومتِ برطانیہ سے حسرت کی رہائی کے لئے مطالبہ کیا، مولانا کی یہ غزل :-

لطف کی اُن[2] سے التجا نہ کریں
ہم نے ایسا کبھی کیا نہ کریں

اُسی دور کی یادگار اور اُنھی تاثرات اور واردات کی آئینہ دار ہے ——— پھر عوام نے مولانا حسرت کی رہائی کے لئے "یوم دُعا" منایا، حسرت کے کان تک یہ خبر پہونچی، تو بیساختہ پُکار اُٹھے :-

طبع محبوب کے خلاف نہ ہو
لوگ میرے لئے دعا نہ کریں

"تسلیم و رضا" کا یہ وہ مقام ہے جہاں اکابر صوفیا کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔

اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ حسرت انتہا پسند واقع ہوئے تھے، مزاج میں فوضویت تھی اور طبیعت باغیانہ پائی تھی،

[1] میں اُن کے گزشتہ کلام کا ذکر کر رہا ہوں، آٹھ دس سال اِدھر کی غزلوں میں پہلا سا رنگ نہیں ہے، بعض غزلیں تو بہت زیادہ پھیکی ہیں، اگر اُن کی آخری عمر کا کلام کوئی صاحب چھپوائیں تو اُس کا انتخاب بہت ضروری ہے، پورے کا پورا کلام چھاپ کر وہ حسرت کی شاعرانہ شہرت اور عظمت پر ظلم کریں گے۔

[2] یہاں "اُن" کا مرجع انگریزی حکومت ہے!

جیل خانوں میں وہ جان جان کر وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے اور اس کی پاداش میں اُنہیں بڑی سخت سزائیں بھگتنی پڑتیں۔ سُنا ہے کہ ایک دو بار کال کوٹھری میں بھی رہنا پڑا، حکومت کے اعلیٰ اور ذمہ دار عہدیداروں نے حسرت مرحوم سے سخت باز پرس کی کہ آپ جیل خانہ کے ڈسپلن کا خیال نہیں رکھتے، اس پر حسرت نے کہا کہ میں جیل خانہ میں یہاں کے ڈسپلن کو برقرار رکھنے کے لئے نہیں بلکہ اسے توڑنے اور درہم برہم کرنے کے لئے ہی آیا ہوں ——— یہ مصرعہ چاہے اور کسی پر صادق آتا ہو یا نہ آتا ہو مگر حسرت مرحوم کی زندگی پر اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ پورا اُترتا ہے۔ کہ ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

حضرت آرزو لکھنوی

میرا ادبی ذوق ابھی "مراہقت" کے عالم ہی میں تھا کہ آرزو لکھنوی مرحوم کے نام اور کلام سے میں آشنا ہو چکا تھا، مگر یہ تعارف اور شناسائی ادھوری سی تھی، لکھنؤ سے اُن دنوں "سخن سنج" نام کا ایک رسالہ نکلتا تھا جس میں صرف غزلیں چھپتی تھیں اُسی رسالہ کی بدولت حضرت آرزو کی چند غزلیں نظر سے گزریں ——— یہ سنہ۱۹۲۲ء اور سنہ۱۹۲۳ء کا ذکر ہے، اُن دنوں لکھنؤ کے تمام شاعروں میں سب سے زیادہ شہرت اور قبولِ عام عزیز لکھنوی کو حاصل تھا اور اُن کے مجموعہ کلام ——— "گُل کدہ" کا بہت چرچا تھا۔

حیدر آباد دکن میں جناب حیرت بدایونی نے ایک دن یہ شعر سُنایا:—

قاتلِ جہاں معشوق جو تھے، مرقد میں پڑے اُن کے سونے
یا مرنے والے لاکھوں تھے، یا رونے والا کوئی نہیں

اس شعر کو سُن کر طبیعت پھڑک اُٹھی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آرزو لکھنوی کا یہ شعر ہے، اور اُس کے بعد سے مرحوم کا کلام جس رسالہ میں بھی نظر آجاتا، شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ——— کلکتہ سے ایک فلمی رسالہ "عکاس" نکلتا تھا، آرٹ پیپر پر، پوری رعنائیوں اور ظاہری دلچسپیوں کے ساتھ! اُس میں حضرت آرزو کا کلام اکثر و بیشتر چھپتا تھا، اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے حضرت آرزو اس رسالہ کے نگران اور سرپرست تھے!

مشاہیر شعراء سے مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں لیکن جناب آرزو لکھنوی سے ملنے کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی، وہ فلم انڈسٹری سے تعلق پیدا ہونے کے سبب گوشہ گیر سے ہو گئے ——— اور یہ بھی تھا کہ مشاعروں میں عام طور پر "گلے باز" شاعروں کو بُلایا جاتا تھا، میں "ترنم" سے شعر پڑھنا جانتا تو شاید خود میری پوچھ بھی نہ ہوتی ———

ہندستان پر ایک ایسا دور بھی گزرا ہے جبکہ بعض نیک نہاد اور امن پسند افراد کسی نہ کسی تقریب سے اتحاد اور یگانگت کا اظہار چاہتے تھے اور اس کے لئے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر موقع نکالتے تھے، سنہ۱۹۴۱ء میں ہندوؤں، مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں نے مل جُل کر بمبئی میں "یوم اکبر اعظم" منایا، اس سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا، جناب ضیاءالدین برنی اس مشاعرے کے منتظم تھے، میں حیدر آباد دکن سے چل کر بمبئی آیا اور مشاعرے میں شرکت کی ——— میں سنہ۱۹۳۳ء عیسوی (عراق جانے کے لئے) میں بمبئی آچکا تھا مگر اس طرح کہ کسی نے جانا، اس مشاعرے میں پہلی بار میں نے بمبئی میں اپنا کلام سُنایا اور پھر دعوتوں اور پارٹیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بمبئی کے دوران قیام میں ایک ایکٹرس نے اپنے یہاں شب کے کھانے کی دعوت دی اور خاص طور پر کہا گیا کہ حضرت آرزو لکھنوی جو اُسی فلیٹ میں رہتے تھے اُس دعوت میں شرکت فرما رہے ہیں، میرے لئے اس دعوت میں سب سے بڑی کشش یہی تھی کہ اس بہانہ آرزو مرحوم سے ملاقات ہو جائے گی ——— اُسی پُر تکلف دعوت میں سب سے پہلی بار آرزو مرحوم سے نیاز حاصل ہوا، بڑی گرمجوشی اور تپاک کے ساتھ ملے جیسے وہ مجھے بہت دنوں سے جانتے ہیں۔

اس دعوت میں جناب جوش ملیح آبادی بھی تھے، کھانے کے بعد شعر خوانی ہوئی اور ایک شاعر جن پر شراب کا نشہ سوار تھا، اُن سے اور مجھ سے باتوں باتوں میں شدید بدمزگی کی نوبت آگئی، سارا لطف ہی مکدر ہو گیا ——— یہ رنگ دیکھ کر لوگوں نے یہ کیا کہ حضرت آرزو، جوش صاحب اور مجھ کو اشارے سے اُٹھا کر ایک کمرے میں لے گئے اور اُن شاعر صاحب سے کہہ دیا کہ وہ تینوں صاحبان تو چلے گئے اس بدمزگی کے بعد محفل کا ختم کر دینا ہی مناسب سمجھا گیا، مطلب اُن "شاعر صاحب" کا وہاں سے دفع کرنا تھا، وہ چلے گئے تو پھر نئے سرے سے محفل جمی اور حضرت آرزو لکھنوی کی زبان سے زندگی میں پہلی بار اُن کا کلام سُنا، کیا سنجیدگی اور متانت تھی، کیا وقار تھا، داد و تحسین پر اُلٹے شرما شرما سے جاتے!

اس کے بعد میرا بمبئی برابر آنا جانا ہوتا رہا، کئی کئی مہینے وہاں میں نے قیام بھی کیا اور حضرت آرزو سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہے اور موقع میسر نہ آتا تو میں خود اُن کے یہاں جاتا اور اُن کی صحبت سے مستفید ہوتا، کسی نئے آدمی سے آرزو مرحوم میرا تعارف کراتے، یا یوں بھی میرا ذکر کرتے تو یہ جملہ ضرور کہتے "اِن (میری طرف اشارہ کرکے) کے کلام کی صحت کا میں قایل ہوں، اور اس زمانہ میں یہ بہت بڑی چیز ہے ... "!

جے جے ہسپتال (بمبئی) کے قریب جو چوراہا ہے اُسی کے پاس ایک حکیم صاحب کے مطب میں حضرت آرزو شام کے وقت اکثر آکر بیٹھا کرتے تھے اور وہاں اُن سے ملاقات ہو جایا کرتی تھی، بمبئی کے بعد پھر ملاقات "ڈان" کے مشاعرے میں ہوئی اور ملاقات کیا ہوئی، دور ہی دور سے علیک سلیک ہو کر رہ گئی، اسٹیج پر بہت مجمع تھا، کسی سے ملنے کے لئے بیسیوں سروں کو پھلانگ کر گزرنا ہوتا تھا، مشاعرے کے بعد میں آرزو مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا، طعامستان (الٰہی بخش کالونی کا ایک ہوٹل) میں قیام تھا، بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی، میں نے عرض کیا کہ حضرت! پاکستان ہی میں رہ جائیے" فرمایا میں یہاں رہنا چاہتا ہوں مگر ایک بار بمبئی جانا بھی ضروری ہے، وہاں میری گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے، اُس میں مجھے شرکت کرنا ہوگی ——— اور وہ پھر اسی "ارضِ پاک" کا پیوند ہو کر رہ گئے، سن طبعی عمر سے کافی متجاوز ہو چکا تھا مگر ہزار برس کی عمر کے بعد بھی مرنا کوئی نہیں چاہتا، آخری سانس تک دنیا کی اُمیدیں آدمی کو اُلجھائے رکھتی ہیں۔

یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں کہ دُنیا ہیچ ہے
مرتے دم تک آدمی بے آسرا ہوتا نہیں

پچھلے جاڑوں میں لائل پور کاٹن ملز کی طرف سے سالانہ مشاعرہ ہوا تھا فیض صاحب جھنجانوی اس کے مہتمم تھے، اُنھوں نے مجھے لکھا کہ حضرت آرزو لکھنوی کو (جیسے بنے مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے راضی) کرو، میں مرحوم سے جا کر ملا، کہنے لگے اِس بڑھاپے میں اتنا طویل سفر کیسے کروں گا... .. پھر قدرے تامل کے بعد فرمایا کہ آپ مشاعرے والوں کو میرا پتہ لکھ دیجئے، وہ براہ راست مجھ سے خط و کتابت کر لیں گے، پھر میں جاؤں اور وہ جانیں ——— ! ——— حضرت آرزو کے ساتھ آخری مشاعرہ "خیر پور میں پڑھا"!

سن اسّی سال سے متجاوز تھا، بلڈ پریشر کے مریض تھے، ذرا ذرا دیر کے وقفہ سے طبیعت بگڑتی رہتی، خوراک بہت ہی کم رہ گئی تھی، چہرے پر شدید اضمحلال کے آثار پائے جاتے تھے مگر دماغ کی صحت کا وہی عالم تھا، علمی اور ادبی مسائل پر بڑی ذمہ داری کے ساتھ اظہار رائے فرماتے!

مجاز صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ مرنے سے چند دن پہلے میں اُن سے ملنے کے لئے گیا میرے ہاتھ میں "فاران" دیکھ کر لے لیا اور "نقشِ اوّل" پڑھنے میں منہمک ہو گئے، مضمون پڑھنے کے بعد مجھ سے کہا ... "ماہر" ... تک میرا یہ پیام پہونچا دو کہ میں اُن کی رائے سے حرف بہ حرف متفق ہوں ---"

مالی حالات سازگار ہوتے تو میرا یقین ہے کہ حضرتِ آرزو فلم انڈسٹری سے تعلق پیدا نہ کرتے، اُن کے منصب سے یہ فروتر چیز تھی مگر یہ "احتیاج" بُری بلا ہے "شیر دل" کو "روباہی" کرتے دیکھا گیا، اُردو زبان کی سب سے پہلی بولتی تصویر "عالم آرا" تھی اُس کے بعد اور چند تصویریں منظرِ عام پر آئیں مگر وہ سب گھٹیا قسم کی تھیں، ہندستان کی فلمی دُنیا میں سب سے پہلی ترقی یافتہ تصویر "پورن بھگت" تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرتِ آرزو لکھنوی اُنھی دنوں میں کلکتہ چلے گئے اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے ——— یہ ابتدائی دور تھا فلمی کہانی اور گانے لکھنے والوں کی آج کی برابر قدر نہ تھی، بہت ہی کم معاوضہ پر کہانیاں، مکالمے اور گانے لکھوائے جاتے تھے ——— پھر جب آرزو کلکتہ سے بمبئی آئے تو "دھوک" جیسے "فلمی کویوں" کی شہرت کا ستارہ چمک رہا تھا اور "یہ راگ ہیں درد بھرے" اور "آنکھوں میں دل اُڑ گیا" جیسے بولوں پر لوگ جھومتے تھے، یہی اسباب تھے کہ حضرت آرزو لکھنوی فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے باوجود خاطر خواہ مالی منفعت حاصل نہ کر سکے، ورنہ اتنے زمانہ تک فلمی انڈسٹری سے جس شاعر کا تعلق رہے اُس کے پاس لاکھوں روپیہ ہونے چاہئیے تھے ——— فلم انڈسٹری میں جا کر آرزو نے کھویا زیادہ اور پایا کم!

حضرتِ آرزو مسلّم الثبوت اُستاد جلالؔ لکھنوی کے صحیح جانشین تھے، فنِ عروض میں اُن کی ٹکر کے ہندستان اور پاکستان میں دو چار ہی شاعر ہوں گے، لکھنؤ کے مکتبِ شاعری کے وہ صحیح نمایندے تھے، اُردو شاعری کو اُنھوں نے سلاست دی، سادگی بخشی اور گیسوئے اُردو جو منت پذیرِ شانہ تھا اُسے سلجھایا اور سنوارا، اُردو زبان میں شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر آرزو ان شاعروں میں سے تھے جن کا کلام سند میں پیش کیا جا سکتا ہے،

فنِ موسیقی میں بھی اُن کو درک تھا اور اس کی جھلک اُن کے شعروں میں پائی جاتی ہے!

شوق
(کھنڈوی)

جنتِ آدم!

اندھے ریشم کے جال بنتے ہیں
گونگے گاتے ہیں بہرے سنتے ہیں

پاسباں ہیں حرم کے بُت خانے
گلستاں کی بہار ویرانے

ذرّے سورج پہ مُسکراتے ہیں
بلبلے کشتیاں چلاتے ہیں

آس پھولوں کی شعلہ زاروں سے
اُوس کی آرزو شراروں سے

نغمے گونجے ہوئے ہیں تاشوں کے
بن رہے ہیں محل بتاشوں کے

ہر طرف ہے ستم کی سلطانی
ظلم و جور و جفا کی ارزانی

موج در موج اک تلاطم ہے
زندگی حرص و آز میں گم ہے

پھیلتی جا رہی ہے گمراہی
ہائے فکر و نظر کی کوتاہی

سر بہ زانو ہیں ولولے کیا کیا
راہ میں گم ہیں قافلے کیا کیا

دام بر دوش ہے ریاکاری
رشوتوں کی ہے گرم بازاری

عرش پر ہے شرارتوں کا دماغ
کِھل رہے ہیں جراحتوں کے باغ

عقلِ چالاک کے تماشے ہیں
کیسے کیسے صنم تراشے ہیں

رُک گئی ہے خیال کی پرواز
دب گئی ہے ضمیر کی آواز

سرنگوں علم و ہوش کے پرچم
صاعقہ بار کوثر و زمزم

عافیت دربدر ہے آوارہ
زندگی شورشوں کا گہوارہ

رُوح شرما گئی جہنم کی
ہائے! جنت یہ ابنِ آدم کی

انور اعظمی

جذباتِ انور

(۱)

تمہارے غم کے امیں! مدرسہ نہ میخانہ
یہ بے نیاز جنوں، وہ فغاں سے بیگانہ
ادھر یہ رنگ کہ غیروں سے بھی شناسائی
اُدھر یہ حال کہ اپنے سے بھی ہیں بیگانہ

(۲)

خبر نہیں ہے کہ محمل کا رخ کدھر ہوگا
اک اور رقص سہی! اے غبار دیوانہ
یہ بات کیا ہے نشہ جب اُتر گیا ساقی
تو کر رہا ہوں دعائے شکست پیمانہ

پیام

ساغر وارثی

قفس سے چھوٹ کر بھی ہم صفیرو ابھی بہت بندشیں ہیں باقی
چمن میسر ہوا بھی تو کیا چمن برنگ چمن نہیں ہے

تمہاری تہذیب کے مراکز یہ غیر نا اہل کیوں ہیں قابض
اُٹھو کہ بلبل کا آشیانہ برائے زاغ و زغن نہیں ہے

یہ کیوں ہے ٹھہراؤ حوصلوں میں روانیوں پہ جمود کیسا
کہیں یہ دریا نہ سوکھ جائے کہ پے بہ پے موجزن نہیں ہے

تجھے یہ تنقید خوش نہ آئے مگر یہ تنقید ہے حقیقت
تری تمنا کی رفعتوں میں خلوص کا سادہ پن نہیں ہے

حقائق

رفیق تشنہ

چھلکنے دے ابھی ساغر کھنکنے دے یہ پیمانے
ذرا پینے دے رندوں کو خبر کل کی خدا جانے

زمانے کی یہی رفتار ہے غیروں سے کیا شکوہ
یہ دنیا ہے یہاں اپنے بھی ہو جاتے ہیں بیگانے

نوبنو

ماہر القادری

محبت عرش و گردوں ساز بھی ہے
محبت فرشِ پا انداز بھی ہے

خموشی پردہ دارِ راز بھی ہے
یہی ظالم مگر غماز بھی ہے

ادب! اے جوشِ غم، جوشِ تمنا
حریمِ دل، حریمِ ناز بھی ہے

سکوتِ لالہ و گل پہ نہ جانا
اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے

یہی انجام کا مارا ہوا دل
ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے

نور کی تحریر ہے ہر خطِ پیمانہ مجھے
یاد ہے اب تک طلوعِ صبحِ میخانہ مجھے

ایک ہی عنوان پر ترتیب دینا ہے ضرور
ایک افسانہ تمہیں اور ایک افسانہ مجھے

بھیج اے دل! چشمِ ساقی کے تصور پر درود
ہر نفس میں ہے میسر عیشِ میخانہ مجھے

بزم میں احساسِ فرقت اور ہو جاتا ہے تیز
مار ڈالے گا یہ ربطِ شمع و پروانہ مجھے

راستے پُر پیچ، منزل دور اور تنہا سفر
ہر بگولے کو امیرِ کارواں سمجھا تھا میں

روحِ انتخاب

آدمؑ و حوّاؑ

نعیم صدیقی

زمین کو فطرت نے آہستہ آہستہ ایک آراستہ و پیراستہ گھر بنا دیا۔ پہاڑ اس گھر کی دیواریں تھیں، آسمان اس کی چھت بنا، میدانوں اور صحراؤں کی سطح اس کا فرش تھی اور گھاس نے اس میں قالین بچھائے، بارش اس میں چھڑکاؤ کرتی تھی، آندھیاں اس میں جھاڑو دیتی تھیں، پرندے اس میں چنگ و رباب نغمہ پیرا تھے، سمندر اس گھر کا حوض تھا، دریا اور ندیاں اس کی بدرویں اور نالیاں تھیں، سورج، چاند، ستارے اس کے فانوس اور چراغ تھے، آتش فشاں پہاڑ اس کی انگیٹھیاں تھیں، بڑے بڑے جنگلات اور مرغزار اس گھر کے پائیں باغ بنے۔ گھوڑے، گدھے، خچر گائے بیل اس گھر میں کام کرنے والے لونڈی غلام تھے، شیر، چیتے اور ہاتھی اس کے پالتو جانور تھے۔ افق اس گھر کی آرٹ گیلری تھی جس میں تنوع پسند فطرت اپنے فنی شاہکار آراستہ کرتی اور پھر ان کو لمحہ بلمحہ بدلتی رہتی تھی۔

مکان تھا مگر مکیں نہ تھے، شاہی محل آراستہ تھا مگر کوئی شاہی خاندان نہ تھا، دربار تھا مگر کوئی اس کی زینت نہ بنا تھا، رنگینیاں لٹ رہی تھیں اور کوئی آنکھ نہ تھی جو ان کی قدر شناس ہو، پھول کھلتے تھے مگر وہ گلچیں کو ترستے ترستے مرجھا جاتے تھے، نغمے بکھر رہے تھے لیکن کوئی صاحبِ ذوق نہ تھا، فطرت اپنی تجلیات کھُل کھُل کر بکھیر رہی تھی مگر کوئی نگاہ نہ تھی جو اس سحر سے مسحور ہوتی، کتنی ہی آیات چار جانب گھونگٹ اتارے رقصاں تھیں مگر کوئی نہ تھا کہ ان کے جمال سے حیرت زدہ ہو کر "سبحان ربی الاعلیٰ" کہہ اٹھے۔ سحر کرنے والا تھا، صید موجود تھے، صیاد کا خلا باقی تھا، حسن و جمال تھا، لیکن عشق ناپید تھا، شمعیں روشن تھیں لیکن پروانے نہ تھے۔ منزلیں تھیں اور راستوں پر سنگِ میل نصب ہو چکے تھے لیکن کوئی کارواں گام زن نہ تھا۔ طوفانی موجیں تھیں لیکن ان کا سینہ چیر کر گزرنے والا شناور کہیں نہ تھا ——— کائنات کا پورا جسم بن گیا لیکن اس میں دھڑکنے والے دل کی جگہ خالی تھی۔

کائنات کا ایک ایک حصہ اور ایک ایک عنصر تخلیقی خلاء کو محسوس کر رہا تھا اور کسی آنے والے کا لمبا انتظار جاری تھا!

کائنات کو تعمیر کرتے کرتے اور اس کے ہر گوشے کو آراستہ کرتے کرتے اور زمین کو "کسی" کے لئے سازگار بناتے بناتے فرشتوں کو کئی دور بیت گئے۔ ان کا حال ان انجینیروں، معماروں اور مزدوروں کا سا تھا جو صرف کثیر سے کسی نامعلوم مقصد کے لئے شاہی حکم کے تحت ایک عمارت بنانے میں اپنی عمریں کھپا رہے ہوں۔ وہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے لیکن کسی کو پتہ نہ تھا کہ یہ کون ہوگا جس کے لئے وہ اتنے پاپڑ بیل رہے ہیں۔ وہ کوئی تصوّر نہیں کر سکتے تھے کہ تخلیق کا قدم آگے کدھر اٹھنے والا ہے۔

خالقِ کائنات ایک لمبے منصوبے کو سامنے رکھ کر دنیائیں کی دنیائیں تعمیر کر رہا تھا۔ "مکان" کی خالی تختی پر اس کا قلم برابر نو بنو نقوش بنا رہا تھا، زمانے کے پردے پر زندگی کی فلم حرکت کرتی جا رہی تھی۔

پہلے خالق کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اس سرچشمۂ تخلیق نے جب چاہا تو ازجی کا ایک طوفان فضا میں پھیل گیا۔ پھر اس نے جب چاہا تو یہ ازجی برقیوں کا غیر مادی غبار بن گئی ہے، لیکن یہ غبار اتنا پرسکون تھا کہ اس کے وجود کو عدم سے متمیز کرنا کسی مخلوق

کے لئے ممکن نہ ہو سکے۔ پھر جب اس نے چاہا تو غبار کے اس فضا گیر سمندر کا کہیں سے کوئی ایک قطرہ متحرک ہو گیا۔ بس اب کیا تھا، ایک قیامت آگئی اور حوادث کا ایک طوفان اُبل پڑا۔ بناؤ اور بگاڑ، جوڑ اور توڑ، کشش اور مدافعت کا کھیل شروع ہو گیا۔ اب انرجی مادے میں بدلنے لگی، اور مادہ ہی وہ مسالہ تھا جس سے فطرت نے پیکر تراشی کا آغاز کیا پہلے اس مسالہ سے بڑے بڑے اجرام تیار ہوئے، پھر ہر جرم ایک آرٹ اسٹیڈیو" بن گیا اور نازک قسم کے فنون کا سلسلہ شروع ہوا۔ جمادات کا نظم نسق درست ہونے کے بعد نباتات، اور نباتات کے ساتھ ساتھ حیوانات اٹھا کھڑے کئے گئے۔

فطرت کے آرٹسٹ نے نقشہ سازی، صورت گری، رنگ اور پالش، پیکنگ وغیرہ فنون میں تنوع کا اتنا کمال دکھایا کہ کوئی ایک وجود دوسرے سے کامل مماثلت رکھنے والا نہ بنا۔ ایک جاندار کے دو بچے اور ایک درخت کے دو پتے کامل مشابہت سے بالاتر تھے۔ یہ سب کچھ صفات الٰہی کا ظہور تھا اس کا ہر مظاہرہ جمال دوسرے سے مختلف تھا صفاتِ الٰہی کا سب سے کم پرتو جمادات پر پڑا، نباتات کو کچھ زیادہ حصہ ملا اور حیوانات کچھ اور زیادہ لے اُڑے لیکن ایک صفت ایسی بھی کہ اس کی تجلی کو سہ لینے کی تاب کسی میں نہ تھی۔ پوری کائنات جانتی تھی کہ ایک امانت اور باقی ہے جسے کوئی اٹھانے والا چاہیئے۔ لیکن تمام موجودات اپنی کوتاہیوں کی زبان سے کہہ رہے تھے کہ یہ بوجھ ہمارے اُٹھائے نہ اُٹھے گا۔ یہ تھی امانتِ اختیار! امانتِ حیات!

اس کے لئے "احسن تقویم" پر پیدا ہونے والے کسی نئے وجود کی ضرورت تھی اور اس کا خلا شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا!

آفاق میں خبر اُڑی کہ ایک نیا پیکر بن رہا ہے۔

یہ پیکر مٹی سے بن رہا تھا، اور بن گیا۔ قالب کی تکمیل کے بعد خالق نے اس کے رگ وپے میں ایک "روح" جاری وساری کردی۔ ——— یہ روح پہلے کسی وجود کو نہ ملی تھی!

یہی تھا آدم!

یہ جمادات سے بنا تھا، یہ نباتات سے بھی مشابہ تھا، اور اس میں حیوانات کے سے بعض انداز بھی تھے، لیکن یہ خانوادۂ مخلوقات کے ان تینوں طبقات سے الگ اور بالاتر بھی تھا۔

اس میں دوسرے موجودات کی طرح طاعت موجود تھی مگر اس کے ساتھ بغاوت کا رجحان بھی تھا۔ اس میں قبول تو انکار بھی تھا۔ اس میں رحم تھا تو ظلم بھی تھا، اس میں محبت تھی تو عداوت بھی تھی۔ اس میں انفرادیت تھی تو اجتماعیت بھی تھی۔ اس میں ایک طرف جمود پسندی تھی دوسری طرف ارتقا طلبی، ایک طرف خود بینی تھی دوسری طرف خدا بینی۔ ایک طرف کبر تھا، دوسری طرف انکسار۔ ایک طرف خلوت کا ذوق، دوسری طرف جلوت کا رجحان۔ ایک طرف سکون پسندی، دوسری طرف ہنگامہ آرائی کی صلاحیت۔ درد اور دوا، زخم اور مرہم، آگ اور پانی، پھول اور کانٹا جب ایک ہی جگہ جمع کردئیے گئے تو نام تجویز ہوا آدم!

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات بتا رہے تھے کہ یہ چیز کیا ہے۔ پیکر نو کے تیور دیکھ کر جاننے والے جان گئے کہ کتنی بڑی قیامتِ حیات آنے والی ہے۔ فرشتوں نے جب اِن اسلحہ کو دیکھا جس سے یہ خدائی فوجدار آراستہ تھا تو وہ سمجھ گئے کہ بڑے معرکے ہونے والے ہیں۔ یہ ایک کشمکش کا سامان کیا جا رہا ہے۔

اور وہ خالق کے حضور حیرت واستعجاب کے ساتھ بالآخر یہ کہہ ہی گزرے کہ کائنات کا خلا پُر کرنے کے لئے کیا ایسا ہی وجود موزوں تھا کہ جس کے ہاتھوں خون خرابے ہوں، توڑ پھوڑ ہو، ہنگامہ ہائے من وتو بپا ہوں! ——— ہم تو کچھ اور سمجھ رہے تھے!

مگر ان کو جواب یہ ملا کہ تم نئی مخلوق کے جذبات کی ترکیب ہی کو دیکھ کے نہ رہ جاؤ، اسے "علم" بھی دیا جارہا ہے! ـــــ اسے سوچ اور ایجاد کی وہ قوتیں عطا ہوئی ہیں جو تم کو حاصل نہیں۔ اختیار کا تقاضا یہی ہے کہ ایک طرف جذبہ ہو اور دوسری طرف علم و فکر۔ اختیار کے معنی ہی ہوتے ہیں کشمکش! پس خون خرابے تو ہونے ہی تھے، لیکن اس کشمکش اور خون خرابوں کی آزمائش میں آدم کو ڈالنا اس لئے مطلوب تھا کہ وہ ارتقا کر سکے۔ اس میں شر کے رجحانات اس لئے پیدا کئے گئے تھے کہ ان سے تصادم کرتے ہوئے اس کی قوتِ "خیر" نشوونما پائے۔ نشوونما و ارتقاء کشمکش کے بغیر نہیں ہوا کرتا۔

آدم کو منصب نیابت پر سرفراز کرتے ہوئے ایک تقریب منائی گئی۔ فرشتوں کی ایک مجلسِ عام میں اعلان کیا گیا کہ ہم اس پیکرِ نو کو کرۂ ارضی میں اختیارات دے کر مامور کرتے ہیں، اور اعلان کا مدعا یہ تھا کہ تکوینی نظم و نسق کے ہر شعبے کے انچارج کو ہمارے قوانین کے مطابق اپنے ذرائع و وسائل کے ساتھ ہمارے نائب سے تعاون کرنا ہوگا۔ پھر مطالبہ کیا گیا کہ اس اعلان کو قبول کرنے کا مظاہرہ کرنے کے لئے ہمارے نائب کے سامنے سرِ طاعت خم کیا جائے۔

اور تمام فرشتوں نے قبولِ اعلان کا مظاہرہ کر دیا۔

مگر ایک ابلیس اکیلا اکڑ گیا۔ اور اس کی جذباتیت کو احساس کہتری کی چنگاری نے بھک سے اڑا دیا۔

خطاب اگرچہ اس سے براہِ راست نہیں تھا لیکن چونکہ زمین کے انچارج فرشتوں کے قبولِ حکم سے زمین کے ساتھ تعلق رکھنے والی ساری ہی قوتوں کا قبولِ حکم از خود ہو جاتا تھا، لہذا ابلیس کا مثبت جذبۂ بغاوت معاً ابھرا اور اس نے آگے بڑھ کر اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ میں شعلۂ شرر کی نسل کا ایک فرد ہوتے ہوئے بر عبادت و طاعت کی کئی دادیاں طے کر چکا ہوں، مٹی سے پیدا ہونے والے ایک نئے پیکر کے سامنے ہیٹا ہو کر کیسے رہ سکتا ہوں۔ مجھے اگر مہلت کار دے دی جائے تو پھر دیکھئے کہ میں کس طرح ثابت کر کے دکھاتا ہوں کہ یہ فی الواقع ایک نا اہل مخلوق ہے۔

اس نے مہلت کی بھیک مانگی اور اسے مل گئی!

اب اس نے بھری محفل میں چیلنج کیا کہ میں بنی نوعِ آدم کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے آ کر بہکاؤں گا اور اسے سبز باغ دکھاؤں گا، تو پھر دیکھئے گا کہ کتنے ایسے رہ جاتے ہیں جو آپ کی نیابت کا حق ادا کریں۔

جواب دیا گیا کہ جو کچھ تجھے کرنا ہو کر لے، یاد رکھ کہ جو میرے بندے بن بائیں گے ان پر تیرا کوئی بس چلنے کا نہیں۔

یوں کشمکشِ خیر و شر کے لئے ایک محرک قوت میدانِ عمل میں آ گئی!

کائنات کی بنیادی منصوبہ بندی جن اصولوں پر کی گئی ان میں سے ایک زوجیت کا اصول ہے۔ دنیا میں کوئی چیز نہیں جو تنہا اور یکتا ہوتے ہوئے مکمل ہو سکتی ہو۔ وہ اپنے بالمقابل اپنا ایک ثانی مرحال چاہتی ہے۔ ہر موجود اپنے لئے کسی ہمدم و ہم نفس کا محتاج ہے۔ سورج چاہتا ہے کہ کوئی چاند بھی ہو، پھول کا تقاضا ہے کہ عندلیب چہچہائے، شمع کی ضوباریاں افسردہ رہتیں اگر پتنگے نہ ہوتے، دن اداس ہوتا اگر رات نہ ہوتی، ـــــ اور آدمی تو پھر آدمی ہے کہ جس کا از روئے فطرت یہ حال ہے کہ:۔

آدمی اندر جہانِ ہفت رنگ ہر زماں گرمِ فغاں مانندِ چنگ
آرزوئے ہم نفس می سوزدش نالہ ہائے دل نواز آموزدش

وجودِ آدم کا ظہور خود مکتفی نہیں تھا، بلکہ "کسی" اور کو بھی چاہتا تھا۔
یہ "کوئی اور" بھی منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہو گیا —— یہ حوّا تھیں!
اب انسانیت کی گاڑی کے دونوں پہیے مہیا ہو گئے، اور گاڑی چل پڑی

آدم و حوا کو زمین کا چارج دینے سے پہلے ایک وقفے کے لئے جنت میں بھیج دیا گیا، جہاں کشمکشِ خیر و شر کی ریہرسل ہونے والی تھی۔ ان کو جنت سے استفادہ کرنے کے پورے اختیارات دیئے گئے تھے، لیکن صرف ایک "شجرِ ممنوعہ" ایسا تھا کہ اس کے قریب جانے سے روک دیا گیا۔ یوں ایک "نہی" کے ہونے کی وجہ سے جنت کی زندگی امتحان بن گئی، اور ابلیس کے لئے میدانِ کار پیدا ہوا۔

اب یہ نمایندۂ عصیاں پوری خود اعتمادی کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ سب سے خطرناک دشمن وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو خیر خواہ بنا کے سامنے لائے، چنانچہ یہ خیر خواہِ انسانیت آگے بڑھا اور اس نے آدم کو اطمینان دلایا کہ سجدے کا جھگڑا تو آپ سے نہ تھا، وہ تو میرا اور میرے خالق کا معاملہ تھا، آپ کا تو میں خیر خواہ ہوں۔ میرے پاس تجربہ ہے، معلومات ہیں، میں جنت کے نشیب و فراز سے واقف ہوں، حقایقِ ازلی کا رازداں ہوں، مجھ سے جو خدمت بن آئے میں حاضر ہوں۔ میں اس وقت ایک راز سے آگاہ کرنے حاضر ہوا ہوں۔ اس جنت کی اصل جان وہی شجر ہے جسے آپ شجرِ ممنوعہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کبھی اس کا پھل چکھ کے دیکھئے تو، کہ کیا ہوتا ہے۔ اللہ میاں کا آخر اس میں کیا بگڑے گا۔
مگر آدم نہ پسیجا!

ادھر جب انگلی دھنستی نظر نہ آئی تو ابلیس نے صنفِ نازک کی طرف رخ کیا۔ یہ راز ابلیس ہی کا دریافت کردہ ہے کہ مرد کے سینے میں نقب لگانے کے لئے عورت بہترین آلہ بن سکتی ہے۔ وہ پیکرِ تعقل جتنی سنگینیاں رکھتا ہے، انہیں نسوانی جذبانیت گھلا کر پانی کر دیتی ہے۔ وہاں جو خودداری ہوتی ہے اس کا زعم اگر توڑا جا سکتا ہے تو ادھر کے لاابالی پن سے۔ اس فولاد کو اگر چیرا جا سکتا ہے تو اسی ہیرے کی کنی سے!
اور حوّا اثر پذیر ہو گئیں۔

وہی بات جو ابلیس استدلال سے کہہ رہا تھا اور آدم کو اپیل نہ کر سکی جب آدم کے نصفِ ثانی نے اپنے تبسموں اور آنسوؤں کے لفظوں میں کہا تو یارائے انکار نہ رہا۔

پہلی مرتبہ انسانیت نے معصیت کا پھل چکھ لیا! اس میں ایک نشہ تھا، اس نشے کی حالت میں جنت کا لباسِ عزت اتر گیا۔
نشہ اترا تو فضا بدلی ہوئی محسوس ہوئی۔

ریہرسل مکمل ہو چکی تھی اور رزمِ خیر و شر کا آغاز ہو چکا تھا۔ اب انسانیت کے مادر و پدر زمین پر منتقل کر دیئے گئے۔ ان کو آنے والے حالات کا عملی تجربہ کرا دیا گیا۔ اور ساتھ کے ساتھ واضح کیا گیا کہ اب اگر اپنے اصل مقام —— جنت —— کو حاصل کرنا چاہو تو آزمایش کا ارضی دور کامیابی سے گزار کر حاصل کر سکو گے۔ اب جنت میں وہی آئے گا جو زمین پر خیر و فلاح کی جنت آباد کرے اور اس خالقِ حیات کے قوانین و ضوابط کا احترام ملحوظ رکھے۔ اب انسانی قوتیں دو صفوں میں تقسیم ہو کر باہم آویزاں رہیں گی —— ایک ابلیس کے جھنڈے

---

[1] مقصدِ کلام عیسائیت کے تصورِ نسائیت کا اثبات نہیں کہ عورت مجسّم گناہ ہے اور وہ ساری انسانیت کو مبتلائے معصیت کرنے کی ذمہ دار

تلے جمع ہونے والی صف اور دوسری مزاحمت کرنے اور حق کا بول بالا کرنے والی صف!

آدم و حوا نے اس حادثے کو بہ شدت محسوس کیا جس کے پیدا کرنے کی ذمہ داری خود ان پر تھی۔ ان میں ندامت اور پشیمانی کے جذبات اُبھرے، لیکن یہ جذبات اپنے ظہور کے لئے الفاظ نہ پا سکے۔ دل کی بے چینیاں کھول رہی تھیں مگر باہر نکلنے کا راستہ نہ تھا۔ ضمیر وں میں قیامت بپا تھی مگر اُسے اُگلنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ عبودیت کی اس کیفیتِ مطلوب کو تکمیل دینے کے لئے رب کائنات کی شانِ کریمی خود آگے بڑھی اور اس نے پیشانیوں کو عرقِ انفعال دیا، آنکھوں کو طریقۂ ندامت سکھلایا اور ہونٹوں پر الفاظ نازل کئے ـــــ یہاں تک کہ دردِ دل پھوٹ کر بہنے لگا۔

ابلیس اور آدم کا فرق پوری طرح نمایاں ہوگیا۔ ایک وہ تھا کہ غلطی کی اور اس پر اکڑ گیا اور دوسرا وہ تھا کہ لغزش ہوئی اور فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

توبہ و انابت کے جذبات کے ساتھ از سرِ نو طاعت و عبودیت کا عہد باندھ کر ارضی زندگی کا افتتاح کیا گیا۔ اپنی کمزوریاں بھی سامنے تھیں اور حریف کی چابک دستیاں بھی۔

ہر آدم اور ہر حوا اسی کشمکش میں مبتلا ہے۔ دونوں اسے اپنے بعد والوں کے لئے وراثت میں چھوڑ رہے ہیں۔

احترامِ ماہ حرام

کراچی کی اطلاع ہے کہ سارے صوبۂ سندھ میں رمضان بھر شراب وغیرہ کی دوکانیں بند رہیں گی۔ یاد ش بخیر شبلی بھی خوب شاعر تھے کہتے تھے مگر ان کے طنزیہ اشعار خوب ہوتے تھے انھوں نے کہا ہے ؎

تیس دن کے لئے ترک مئے و ساقی کرلوں　　واعظ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں

"اطاعت" کے بجائے "احترام" اور ملوکیت کی یادگار ہے چنانچہ رؤسا اور امراء جنھیں شاید پیدائشی طور پر حدود و پابندی سے بری سمجھا جاتا تھا۔ انہیں ان کے وظیفہ خوار اس قسم کے مشورے دیا کرتے تھے اور وہ لوگ ایسا کر دیا کرتے تھے اس میں کیا خرچ ہوتا ہے عوام خوش ہوجاتے ہیں اور کرنا کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر "دینداری کی دھاک" ان داموں (اس قسم کے احکام حضور والا کی خدمت سے جاری ہو جانا) یہ سودا بُرا نہیں۔

لیکن اس دورِ جمہوریت میں ملوکیت کے نشان اور متمدن آزادی رائے کے زمانے میں وظیفہ خواروں کے یہ مشورے قابل تعجب ہیں پھر قرار داد مقاصد کے پاس ہو جانے کے بعد واعظ سادہ کو راضی کرنا ایک لعنت ہے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ سب سے قبل خواص یعنی حکام میں سے اس قسم کے رندان مے آشام کو سرزنش کر دی جاتی اور غیر صالح لوگوں کو تنبیہ کرنی تھی تب شاید عوام کو یہ احساس ہوتا کہ بتدریج حکومت پاکستان اسلامی حکومت بن رہی ہے۔

بزعم خود کاش اب بھی لوگ اطاعت اور احترام کا فرق سمجھیں اور جد و جہد کریں کہ پوری زندگی نظام اطاعت میں داخل ہوجائے۔ .... اور دین حق کے تمسخر کا دور ختم ہو!

(الانصاف الہ آباد)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷ کا) ہے بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ انسانیت تو نام ہے آدم و حوا کے مجموعے کا، اور ابلیس نے اس مجموعے پر پہلے ایک رخ سے حملہ کیا اور ناکام ہونے پر پھر دوسری جانب سے وار کیا۔ راستہ اس نے چاہے جدھر سے بھی نکالا ہو، بہر حال یہی کہ "فازلھما" یعنی دونوں لپیٹ میں آگئے۔ ان سطور کو لکھتے ہوئے بائبل میرے پیشِ نظر نہیں تھی، بلکہ صنفین کی فطری صلاحیتیں سامنے تھیں مرد کے مقابلہ میں عورت تأثر و انفعال کے لحاظ سے پیش پیش ہے اور ترغیب

ہماری نظر میں!

شمشیر و سناں

"شمشیر و سناں" از:- مظہر الدین صابری ضخامت ۱۳۲ صفحات (بائیس ۲۰×۳۰ کے سائز پر) سفید چکنا کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب، مجلد، رنگین گرد پوش کے ساتھ قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:- قومی کتب خانہ ریلوے روڈ، لاہور

"شمشیر و سناں" جناب مظہر الدین صاحب صابری کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے، جسے قومی کتب خانہ (لاہور) نے آب و تاب کے ساتھ شایع کیا ہے ـــــ اس کا انتساب کس قدر ولولہ انگیز ہے:-

" انتساب

اُس مردِ مجاہد کے نام

جو

مشرقی پنجاب کی کسی

"ویران مسجد"

میں سب سے پہلے اذان دے گا"

"شمشیر و سناں" کا دیباچہ جناب حفیظ جالندھری نے لکھا ہے جو دلچسپ ہے، مگر اُس میں اس قسم کے:-

"افواجِ غالب کے ہاتھوں مغلوب پر ظلم و ستم کے ہولناک تذکرے موجود ہیں"

ناپختہ جملے بھی کہیں کہیں آ گئے ہیں ـــــ "اُن کے والد ولی کامل، ایک عارف باللہ، ایک عالمِ باعمل اور جذب و سلوک و تصوف کے ایسے جید پیکر تھے جن کا مثیل آج نظر نہیں آتا" ـــــ اس جملہ میں "جید" اور "مثیل" وجدان کو کھٹکتے ہیں، اس لئے نہیں کہ غلط استعمال ہوئے ہیں، جملہ کی در و بست اور لفظوں کے توازن کے اعتبار سے وہ بے جوڑ سے معلوم ہوتے ہیں شعر و ادب میں سارا کھیل لفظوں ہی کا تو ہے!

جناب مظہر صابری فطری طور پر آتش بہ جاں واقع ہوئے ہیں، تقسیم ہند کے بعد پنجاب میں جو خونیں حوادث رونما ہوئے، اُنہوں نے اس آگ پر اور پٹرول چھڑک دیا مظہر نے ساحل پر کھڑے ہو کر اس طوفانِ آتش و خون کا تماشا نہیں دیکھا بلکہ وہ خود اس آگ کے دریا سے گزرے ہیں، اُن پر خود بیتا آ کر پڑی ہے اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے اہلِ ایمان کی قتل و غارتگری کے ہوشربا مناظر دیکھے ہیں، یہی آپ بیتی اور ذاتی مشاہدات شعر کے قالب میں ڈھل کر تند و بے باک

شعلوں کی زبان بن گئے ہیں!

منظر صابری کی شاعری میں "نوحہ وزیاد" کم اور ولولہ انگیزی زیادہ ہے، کہیں کہیں انھوں نے مرثیہ خوانی بھی کی ہے مگر رجز خوانی کا انداز غالب ہے، وہ بیوہ عورت کی طرح رونے اور واویلا کرنے کے لئے نہیں بیٹھ جاتے، اُن کے لبوں پر نعرۂ تکبیر اور ہاتھوں میں شمشیر نظر آتی ہے، اُن کی نظموں میں عزم ہے، جوشش ہے، رجائیت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قلبِ مومن کا درد اور گداز ہے، وہ بار بار روحِ غزنوی کو آواز دیتے ہیں، حنین و بدر کی داستانیں سناتے ہیں اور اسوۂ شبیرؓ، شجاعتِ حیدریؓ، اور سُنتِ بوذرؓ و سلمانؓ کا درس دیتے ہیں ـــــ ان چند شعروں کے تیور دیکھئے :-

ہمیں بھی معرکہ درپیش ہے پرموکؔ و خندق کا
ہمیں بھی قوتِ بازوئے یارانِ پیمبرؐ دے

تصدق شوکتِ کونین میری شانِ ہجرت پر
نصیبِ بوذرؓ و تقدیرِ سلمانؓ کے لئے آیا ہوں

آگ پھر وقت کے نمرود نے بھڑکائی ہے
کسی فرزندِ براہیمؑ کو دینا آواز

کوئی فرزندِ علیؓ ہی نہیں ہم میں ورنہ
ہر قدم معرکۂ کرب و بلا آج بھی ہے
قوم کی بیٹیاں اب بھی ہیں رداسے محروم
شیخ کے جسم پہ ریشم کی قبا آج بھی ہے

فلاح و فوز دعاؤں میں ڈھونڈنے والے!
خدا نصیب کرے تجھ کو ہمتِ مرداں

نہ کام دے گی سیاست نہ گرمئ تقریر
زبانِ تیغ ہی کھولے گی عقدۂ کشمیر

بہ اندازِ جنوں کشمیر میں پرچم کشا ہو جا
کہاں تک انتظارِ "مجلسِ اقوام" اے غازی

وہ لُٹی لُٹی مساجد، وہ تباہ خانقاہیں
شب و روز تک رہی ہیں مرے غازیوں کی راہیں

مجھے ہے معرکہ درپیش، مجھ کو ہیں درکار
بہادروں کے عساکر، مجاہدوں کے جنود

ہر انقلاب کے دھارے پہ بہتے جاتے ہیں
خبر نہیں یہ مسلماں ہیں یا خس و خاشاک

اے دوست! ہیں تیرے بندے ہم، ملّاؤں سے کیا کام ہمیں
ہم تیرے سہارے زندہ ہیں، ہم تیرے سہارے ڈوبیں گے

دوسرا رُخ :- یں حیاتِ یم بداماں تو جمودِ مرگ ساماں مری زندگی تلاطم، تری زندگی خطر میں (صفحہ ۱۰)

"یم بداماں" کی ترکیب وجدان کو کھٹکتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اور مصرعہ ثانی کے اس آخری ٹکڑے نے (تری زندگی خطر میں) مفہوم کو گنجلک بنا دیا، جمود میں "خطرہ" کہاں! خطرہ تو "تلاطم" میں ہے، اور زندگی خطروں کے طوفان سے گزر کر ہی بیحد و بیکراں بنتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اقبالؔ کہتا ہے

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ آشیاں کہ نہیں جس کی گھات میں صیاد

شاعر شاید کہنا یہ چاہتا ہے کہ تجھ پر چونکہ جمود طاری ہے اس لئے تیری زندگی نقصان میں جا رہی ہے، یہ مفہوم لفظوں سے ادا نہیں ہوتا۔

سرِ کفر توڑنا ہے مجھے اے خدا عطا کر کسی غزنوی کے بازو، کسی غزنوی کی باہیں (صفحہ ۴۲)

"سرِ کفر توڑنا ہے" میں پست قسم کی جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے۔

یہ سلگتی ہوئی بیوہ، یہ سسکتے بچے یہ قیادت کے کرشمے یہ امارت کے اصول (صفحہ ۷۹)

نام نہاد "ترقی پسندوں" نے تو "سلگتی ہوئی شام" لکھا تھا مگر مظہر صاحب اُن سے دو قدم اور آگے بڑھ کر "سلگتی ہوئی بیوہ" کہتے ہیں، یہ ترکیب وجدانِ صحیح پر شاق گزرتی ہے "سلگتی ہوئی بیوہ" سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بیچ مچ کوئی دو دھوا چتا میں بیٹھی ہوئی سُلگ رہی ہے! شاعر کہنا یہ چاہتا ہے "وہ بیوہ جو آتشِ غم سے سلگ رہی ہے" اس قسم کے "مقدرات" اور "محذوفات" شعر کے حُسن کو غارت کر دیتے ہیں!

ان کو ضو ریزو طرب ناک بنانا ہے مجھے توڑ کر لاؤں گا افلاک کے سینے سے نجوم (صفحہ ۱۰۸)

"سینہ" کی جگہ "ماتھا" ہوتا تو اچھا تھا ؎ توڑ کر لاؤں گا افلاک کے ماتھے سے نجوم

طوبےٰ کی سربلندیاں جن کے حضور سرنگوں
عرش کی رفعتوں سے بھی جن کا بلند ہے مقام (صفحہ ۱۱۶)

طوبیٰ کا "الف" ناگوار حد تک دبتا ہے۔

"شمشیر و سناں" میں شروع سے آخر تک "جہاد" کی رُوح کارفرما ہے، شاعر موجودہ حالات میں "صلح" کو "پیکار" پر اور "ساز" کو "ستیز" پر ترجیح دیتا ہے، اور اس کو یقین ہے کہ چھنی ہوئی مسجدوں میں پھر سے اذانیں گونجیں گی اور ہم ایک دن اپنی آنکھوں سے "فتح مکہ" کا سماں دیکھیں گے (انشاء اللہ) ملت کو مظہر صابری جیسے رجز خوانوں کی بیش از بیش ضرورت ہے!

میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء

"میر حسن اور اُن کے خاندان کے دوسرے شعراء" مرتبہ :— محمود فاروقی ضخامت ۲۷۳ صفحات (بانگِ درا کا سائز) مجلّد،

گردپوش کے ساتھ، قیمت پانچ روپے آٹھ آنے، ملنے کا پتہ :- پبلشرز پنجاب اینڈ فرنیٹر بک ڈپو، اردو بازار، راولپنڈی۔

میر حسن اردو ادب کے معمار ہیں، اُن کی شاعری نے اردو کے حسن میں چار چاند لگائے ہیں، اردو زبان کی تاریخ میں اُن کا نام سدا یادگار رہے گا، جناب محمود فاروقی اردو دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے میر حسن کے خاندان کو تذکرہ نویسی کے لئے منتخب فرمایا، یہ وہ گھرانا ہے کہ شاعری جس کے یہاں کی کنیز تھی، اس تذکرے میں میر امامی ہروی سے لیکر پیارے صاحب رشید اور عارف تک کے حالات درج ہیں ـــــ اور ساتھ ہی نمونہ کلام بھی! ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے مؤلف کو بڑی کدو کاوش اور تحقیق و جستجو کرنی پڑی ہوگی!

میر حسن دلّی میں پیدا ہوئے اور بارہ تیرہ برس کی عمر میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ فیض آباد چلے گئے اور وہیں آباد ہو گئے، میر حسن کے بیٹے میر مستحسن خلیق اور خلیق کے نامور فرزند میر انیس فیض آباد ہی میں پیدا ہوئے، میر انیس کا مولد و منشا اودھ تھا مگر وہ اپنے "دہلوی" ہونے پر فخر کرتے تھے اور لکھنؤ میں بیٹھ کر کہتے تھے کہ "یہ میرے گھرانے کی زبان ہے ـــــ!"

اس تذکرے کا تین چوتھائی سے زیادہ حصہ میر حسن کے سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر مشتمل ہے، لائق مولف نے میر حسن کی مثنوی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، کتاب کا یہ حصہ خاصہ دلچسپ ہے! اس تذکرے کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ میر حسن کو تمام اصناف سخن پر قدرت حاصل تھی، اُنھوں نے مثنوی، غزلیں، رباعیاں، قصیدے، ترجیع بند، غرض سبھی کچھ کہا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کی طبیعت کے جوہر مثنوی ہی میں جا کر کھلتے ہیں!

میر انیس کے مرثیوں کے سلسلہ میں مؤلف نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے :-

"میر انیس کے مرثیوں میں جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے، وہ عربوں کے عادات و خصائل اور اُن کے رسم و رواج سے میر انیس کی عدم واقفیت ہے، واقعۂ کربلا ان کے مرثیوں کے لئے ایک تاریخی پس منظر معلوم ہوتا ہے جس کی آڑ لیکر گویا وہ اپنے شاعرانہ کمالات کے اظہار کی سعی کرتے ہیں، بعض اوقات تو یہاں تک گمان ہوتا ہے کہ جیسے کربلا کا میدان لکھنؤ کے مضافات میں کہیں واقع ہے اور حق و باطل کی یہ جنگ عراق میں نہیں درااصل ہندستان کے ایک گوشہ میں لڑی جارہی ہے، وہی ہندستانی آب و ہوا ہے، وہی ہندستانی خوبو ہے، لکھنؤ کی بیگمات کا لب و لہجہ ہے اور لکھنؤ کے شرفاء کے گھروں کی رسومات ہیں ــ ــ ــ ــ" (صفحہ ۳۰۲)

(صفحہ ۵) "میر حسن کے زمانہ میں اُردو کا لڑکپن تھا، الفاظ بے خراد ے روڑوں کی طرح تھے ۔۔۔۔" "روڑے" خراد پر نہیں چڑھائے جاتے ——— صفحہ ۲۶۷ پر "سلاطین دکن" کو "سلطانانِ دکن" لکھا ہے ——— (صفحہ ۳۶۱) "بہ حساب آب و تاب بخشا"۔ "آب و تاب بخشی" لکھنا چاہئے تھی کہ "آب و تاب" بالاتفاق مونث ہے ——— صفحہ ۳۶۸ پر "ماخذات کی فہرست لکھا ہے" "ماخذ" کی جمع "مآخذ" ہے "ماخذات" غلط ہے، پھر ماخذات" کے "الف" پر "مد" (ہ) بھی نہیں ہے، جسے ہم "جمع الجمع" ہی سمجھ لیتے، معلوم ہوتا ہے کہ مولف "ماخذ" کی جمع "مآخذ" سے بے خبر ہے ——— (صفحہ ۳۶۴) "اس خاندان کی شاعری پلٹا کھانے پر آمادہ ہو چکی تھی" اس جملہ میں ضرورت سے زیادہ تکلف پایا جاتا ہے۔

(صفحہ ۳۵۶) "عارف کے بعد اس خاندان کے جو افراد شاعر نظر آتے ہیں وہ دراصل اس شاعری کا جنازہ اپنے کاندھوں پر لئے تھے، جس نے عارف کے ساتھ ہی دم توڑ دیا ۔۔۔۔" عارف کے ساتھ کس نے دم توڑ دیا؟ "شاعری کے جنازے نے"! کیا خوب؟ "جنازہ کا دم توڑنا ایک "مضحکہ" سے کم نہیں!

میر حسن کے خاندان کے افراد کے سلسلہ میں عارف اور خالق تک کا ذکر آ گیا ہے لیکن حیرت ہے کہ میر انیس کے پوتے دولھا صاحب عروج کا نام تک نہیں لیا، دولھا صاحب عروج کے انتقال کو زیادہ دن نہیں ہوئے، وہ اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ نامور مرثیہ گو تھے اور پڑھنے میں تو جواب نہ رکھتے تھے، مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیراعظم دکن جنھوں نے میر انیس کو مرثیہ پڑھتے دیکھا تھا، ہم سے کہتے تھے کہ دولھا صاحب کے پڑھنے کا انداز میر انیس سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا!

غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں، ان کمزوریوں کے باوجود یہ کتاب معلومات آفریں ہے اور مرتب و مؤلف کی محنت اور کاوش دادوستائش بلکہ قدردانی کی مستحق ہے!

سنگدل

"سنگدل" از:- یحییٰ صدیقی، ضخامت ۳۰۸ صفحات، لکھائی چھپائی اچھی، مجلد گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:— کتاب منزل، لاہور!

"سنگدل" ایک دلچسپ ناول ہے جس میں ناول نگار نے معاشرت کی عکاسی کی ہے، اندازِ بیان پُر لطف ہے اور مصنف نے کہیں کہیں تو "نفسیات" کو ہو بہو مصور کر دیا ہے! ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے اور "پلاٹ" میں بھی خواہ نخواہ "دور کی کوڑی" لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

صفحہ ۱۲ "صرف بے مدعا مجھے گھورتی رہیں" کسی پر ایک آدھ اُچٹتی ہوئی نگاہ تو بغیر کسی مدعا کے پڑ سکتی ہے مگر گھورنا قطعی "بے مدعا" ممکن نہیں، یہ نفسیاتِ انسانی کے خلاف ہوا!

اس جملہ میں "صرف" بھی زائد اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے ــــــ صفحہ (۳۹) "دوسری طرف ثریا کو فاقے دیتے" "فاقے دینا" زبان و محاورہ کے اعتبار سے غلط ہے ــــــ (صفحہ ۵۴) "وہ بے مدعا خلا میں گھورتے بڑی دیر تک بیٹھے رہے" معلوم ہوتا ہے کہ "بے مدعا گھورنا" ناول نگار کا "محبوب جملہ" ہے جسے بار بار استعمال کیا جاتا ہے ــــــ (صفحہ ۲۲۲)

"میری حلق سوکھی جارہی ہے ----" "حلق" کو مؤنث آج پہلی بار سُنا ــــــ اس قسم کی بعض غلطیاں کتاب میں ملتی ہیں۔

مجموعی طور پر یہ ناول عام سطح سے بلند ہے، جناب یحییٰ صدیقی سے ہم اس سے زیادہ دلچسپ ناولوں کی توقع رکھتے ہیں۔

کھوٹے سکے

"کھوٹے سکے" از:- پروفیسر عاصی ضیائی، ضخامت ۲۸۸ صفحات جلد، خوبصورت گرد پوش کے ساتھ، قیمت تین روپے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ افکارِ نو، یعقوب خاں روڈ کراچی -!

جناب عاصی ضیائی، اُن خوش نصیب افراد میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے زبان و قلم کے ذریعہ اسلام، اخلاق اور انسانیت کی ترجمانی کی توفیق عطا کی ہے' ضرب المثل یہ مشہور ہے "برعکس نہند نام زنگی کافور" مگر یہاں اس کا اُلٹ نظر آتا ہے کہ ایک نیک آدمی نے اپنا تخلص "عاصی" تجویز کیا ہے اور عاصی، دنیا کو پاکبازی اور نیکوکاری کا درس دیتا ہے!

شروع میں چند مضامین "طنزیات" کے عنوان سے ہیں اور بہت خوب ہیں، عاصی صاحب نے مسکرا مسکرا کر چٹکیاں لی ہیں اور نہ جانے کس کس کی زندگی کے چہرے سے نقاب اُٹھا دی ہے ــــــ پھر افسانے شروع ہوتے ہیں ــــــ مختصر بھی اور طویل بھی! ہر افسانہ کوئی نہ کوئی مقصد رکھتا ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ ہر مقصد بلند اور مفید ہے۔

(صفحہ ۳۳) "اس کے تئیں لازم ہے کہ وہ ہم حُلیہ بھی اس سے ہو کر مماثلت زائد سے زائد پیدا کرے ----" "حلیہ" پر اعراب لگانے کی ضرورت نہ تھی اور اعراب لگائے تھے تو اُس کی صحت لازمی تھی "حُلیہ" "پیش" کے ساتھ لکھا گیا ہے جو قطعاً غلط ہے، "حِلیہ" کی "ح" پر پیش (ضم) نہیں زیر (کسرہ) ہے! پھر "ہم حلیہ" کی ترکیب بھی نامانوس ہے، "ہم شباہت" یا "شبیہ" لکھنا چاہیئے تھا۔

(صفحہ ۸۲) "اُس کے شانے پھیلنے لگے تھے" یہ جملہ کتاب میں بار بار دُہرایا گیا ہے جس کی تکرار بھلی نہیں لگتی ــــــ صفحہ ۸۶، ۸۷) "خون کی شُست بوندیں" اور "بے حس آہنی آنکھیں" یہ "ترقی پسندوں" کا وہ اندازِ بیان ہے جس نے زبان و ادب کے حُسن کو غارت کر دیا ــــــ صفحہ ۵۰ پر "اونچی محرابیں" جس افسانہ کا عنوان ہے اُس میں افسانہ کے ہیرو کی بے تابی اور بے چینی کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اُس میں ضرورت

سے زیادہ تکلف پیدا ہوگیا ہے جس میں "آورد" اور "تصنع" کا رنگ غالب ہے۔
(صفحہ ۱۰) "مکڑی کے جالے کی طرح! یہ میری رگوں کو جما کر رکھ دیں گے" لکھنا اس طرح چاہیئے تھا "میری رگوں کو جکڑ کر رکھ دیں گے"۔ ——— (صفحہ ۱۲۲) "ایک دم بادل پر جھرجھری سی دوڑ گئی" "پر" کی جگہ "میں" ہونا چاہیئے تھا، گرامر کی اس غلطی کے علاوہ "بادل" کے ساتھ "جھرجھری" کی کیفیت کا حال سُن کر وجدان کچھ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ واقعی ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں! ——— (صفحہ ۱۲۶) "زمانہ کہاں کا کہاں پہونچ گیا" زیادہ فصیح اور با محاورہ "کہاں سے کہاں" ہے! ———

اسلامی ادب کے نمایندوں کے یہاں زبان وبیان کی غلطیاں دیکھ کر ہمیں بہت دُکھ ہوتا ہے اس ظالم "ترقی پسندی" نے میخانوں اور رقص گاہوں ہی میں نہیں مسجدوں اور خانقاہوں میں بھی نقب لگایا ہے۔

"کھوٹے سکے" ایک دلچسپ اور مفید پیش کش ہے، اس میں فکر و تخیّل کے بھی بعض اچھے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

سفینہ وساحل

"سفینہ وساحل" از :- عزیز وارثی، ضخامت ۱۲۸ صفحات، کتابت وطباعت دیدہ زیب، مجلد، مصوّر گرد پوش کے ساتھ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ :- مکتبہ شانِ ہند، دہلی۔

جناب عزیز وارثی بھرایونی ایک نوجوان شاعر ہیں جن کا مجموعہ کلام مکتبہ شانِ ہند دہلی نے پیش کیا ہے، سرورق کے بعد کے صفحہ پر شاعر کی تصویر ہے اور اُس پر اوگھٹ شاہ صاحب وارثی کا "دُعا نامہ" درج ہے جس کا آخری جُملہ ہے :- "میری یہ دُعا ہے کہ خداوند تعالےٰ جلد انہیں ہندوستان کے مایۂ ناز شعراء میں شامل کرے" ہم اوگھٹ شاہ صاحب کی اس دُعا پر صدقِ دل سے "آمین" کہتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ "ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر" بننے سے پہلے عزیز صاحب نے اپنا کلام منظرِ عام پر لانے کی جُرات آخر کیوں کی؟

"سفینہ وساحل" پر چند تقریظیں بھی ہیں، پیش لفظ علامہ پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے اور موصوف کے نام کے ساتھ "بابائے اُردو" کا خطاب درج ہے، یہ "اُردو زبان" کے دو دو "بابا" کیسے! یہ لقب تو مولوی عبدالحق صاحب کے نام کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے، علامہ کیفی اپنے عقیدت مندوں اور مداحوں کی اس "جدّت" کو غالباً خود بھی پسند نہ فرماتے ہوں گے!

اُسے ہٹانے کی سعیٔ پیہم فضول ہے والیانِ گلشن
تڑپ کے بجلی گری ہو جس پہ تصورِ آشیاں سے پہلے

یہ "والیانِ گلشن" شاید "والیانِ ریاست" معلوم ہوتے ہیں، اس ترکیب نے شعر کو بے مزہ کر دیا۔

میں نے قدموں پہ کسی کے سر رکھا تھا فقط تا   کیا خبر تھی فرض یہ بھی بن۔گی ہو جائے گی (صفحہ ۴۴)

"فطرتاً" یہاں بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، کہنا یوں چاہیئے تھا کہ میں نے دوست کے قدموں پر وجد و شوق کے عالم میں سر رکھ دیا تھا......!

بدل دیا ہے نگاہوں سے رُخ زمانے کا تھا اپنے دل پہ کبھی اتنا اختیار مجھے (صفحہ ۵۶)

"تھا" کا "الف" بہت بُری طرح دب رہا ہے!

میں ازل سے آدمی ہوں، میں سراپا عاجزی ہوں
نہ کسی سے دُشمنی ہے نہ کسی سے دوستانہ (صفحہ ۶۱)

افسوس ہے کہ اتنے پست شعروں پر ہمیں تنقید کرنی پڑ رہی ہے ـــــ اس شعر کی کوئی چُول ہی درست نہیں ہے، اوّل تو روزِ ازل سے آدمی کا آدمی ہونا ہی محلِ نظر ہے پھر "ایسی بے تعلقی کہ نہ کسی سے دشمنی ہو اور نہ کسی سے دوستی" یہ آدمی کی نہیں جمادات اور نباتات کی خصوصیت ہے!

اگر گرنا ہو تجھ کو برقِ غم یہ سوچ کر گرنا ابھی ناواقفِ غم ہے چمن میں آشیاں میرا (صفحہ ۳۲)

"اگر۔گر" ہی اول تو سماعت کے لئے تکلیف دِہ ہے، پھر آشیاں کو "ناواقفِ غم" کہنا ٹھیک نہیں، "ناواقفِ حوادث" یا "ناآشنائے انقلاب" کہنا تھا۔

وہاں اب کھینچ کر لایا مجھے دردِ نہاں میرا جہاں کا ذرہ ذرہ ہو گیا ہے جانستاں میرا

اس قسم کے ناپختہ اور بے مزہ شعروں کی اس مجموعہ میں کمی نہیں ہے!

حضرت حاجی وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کو "مُشکل کشا" اور "عالم کا داتا" کہا گیا ہے! عقیدت کا یہی وہ غلو ہے جو بندوں کو "خدا" بنا دیتا ہے، قرآنِ پاک میں بار بار اس غلط تصور اور عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔

ایک نظم پنڈت جواہر لال نہرو کی مدح میں ہے، جس کا ایک شعر ہے:-

سیکڑوں کو تجھ پہ ہوتا ہے فرشتہ کا گماں
اے جواہر لال! اے پروردۂ امن و اماں

حالانکہ کسی ایک آدمی کو بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی ذات پر "فرشتہ کا گماں" نہیں ہوتا، یہ قطعاً غیر واقعی تعریف اور تصنّع آمیز مبالغہ ہے!

جناب عزیز وارثی کے اس مجموعۂ کلام (سفینہ و ساحل) میں شگفتہ اشعار بھی ہیں، اور اُن کے شاعرانہ مستقبل سے ہم اچھی اُمید رکھتے ہیں لیکن اپنے کلام کے چھپوانے میں اُنہیں اتنی جلدی نہ کرنی چاہیئے تھی! اُن کی مشق ابھی تجربہ، ناپختگی اور آغاز کے عالم میں ہے یہ دَور گزر جاتا پھر مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آتا تو اُس وقت اُن کے شاعرانہ جوہر کی خاطر خواہ قدر ہوتی!

فاران

ماہر القادری

جلد ۲ ــــ شمارہ ۵

ماہنامہ

فاران

اگست ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر:
"فاران" کیمبل اسٹریٹ
کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

صفحہ

حصۂ نظم

Z

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ "فاران" دو سال پانچ ماہ سے بغیر کسی وقفہ کے مہینہ کے مہینہ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، "فاران" کا یہ انتیسواں ۲۹ شمارہ قدردانوں کے ہاتھوں میں ہے، اور اس مدت میں یہ بالکل پہلا موقعہ ہے کہ ہم نے دو مضمون کتابت ہو جانے کے بعد بدل دیئے!

"نقشِ اوّل" ہم نے "جمعیۃ الفلاح" پر لکھا تھا، اس مضمون کی نہ صرف یہ کہ کتابت ہو چکی تھی بلکہ مطبع کی پلیٹ پر جم بھی چکا تھا ——— "جمعیۃ الفلاح" کے نام سے عوام مسلمان ناواقف نہیں ہیں، کراچی اس جمعیۃ کا مرکز ہے اور پاکستان کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے پریسیڈنٹ آنریبل مولوی تمیزالدین خاں صاحب اس کے صدر ہیں، ابھی حال میں جمعیۃ مذکور کا ایک منشور اخباروں میں شائع ہوا تھا، جس میں جمعیۃ کے قیام کی سب سے اہم غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ "جمعیۃ الفلاح مسلمانوں کی معاشرت سے غیر اسلامی اثرات کو دور کر کے خالص اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کے لئے جدوجہد کرے گی" اس مقصد کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے، ہم نے عرض کیا تھا کہ "معاشرہ" میں چھوٹے اور بڑے سبھی ہوتے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ "اصاغر" کی زندگیوں پر "اکابر" کا کردار بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے، پس "جمعیۃ الفلاح" کے ارکان

کو چاہیے کہ جھونپڑوں اور خس پوش مکانوں کے ساتھ کوٹھیوں، بنگلوں، ایوانوں اور شبستانوں کو بھی اپنے پروگرام میں شامل رکھیں، اور اس کے لئے بھی جد وجہد کریں کہ "برائی" (منکر) کو قانون اور طاقت کے ذریعہ روک دیا جائے، جب تک یہ چیز نہ ہوگی اُس وقت تک صرف وعظوں، تقریروں، شوروں اور گزارشوں سے "اسلامی معاشرہ" وجود میں نہیں آسکتا ــــــــ

ہفتہ دار "جہانِ نو" اسلامی نظام کا نقیب ہے، حکومتِ کراچی نے چھ ماہ کے لئے اس جریدہ کو جو بند کر دیا ہے، دوسرے مضمون میں ہم نے اس پر احتجاج کیا تھا اور بتایا تھا کہ حضرتِ فاروق اعظمؓ کو جب بر سرِ منبر ٹوکا جا سکتا ہے، تو پھر وہ کون ایسا عزت والا ہے جو اپنے کو تنقید سے بلند اور بالاتر سمجھتا ہے ــــــــ موجودہ سیاسی اور جنگی حالات کے پیشِ نظر ہم نے ان دونوں مضمونوں کی اشاعت روک دی، اور نزاکتِ حال کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے وقت، دماغی محنت اور پیسہ کا نقصان گوارا کرلیا، وقت کے تقاضوں کو نہ سمجھنا بہت بڑی بے دانشی ہے اور مسلمان کی فراست اس بے وقوفی کی مرتکب نہیں ہوسکتی!

ہم نے "نقشِ اوّل" میں (جسے بدل دیا گیا) یہ بھی لکھا تھا کہ اربابِ حکومت کو جو ہم ٹوکتے رہے ہیں، وہ ہمارے گھریلو معاملات ہیں، پاکستان کی مدافعت اور بقاء کا جہاں تک تعلق ہے، ہم میں اور اُن میں کوئی اختلاف نہیں ہے، جن پر ہم نے تنقید کی ہے اُنھی اربابِ حکومت کی قیادت میں ہم اسلام اور پاکستان کی حفاظت کے لئے انشاء اللہ سرفروشانہ جہاد کریں گے ــــــــ

پاکستان کی سرحدوں پر

آج جولائی کی ۲۷ تاریخ ہے، خبریں آرہی ہیں کہ ہندستانی فوجیں دھڑا دھڑ پاکستان کی سرحدوں کے قریب جمع ہوتی جارہی ہیں، ٹینک، توپیں اور بکتر بند گاڑیاں حرکت میں ہیں، بھارت نے اپنی قریب قریب تمام فوج پاکستانی سرحدوں پر لگا دی ہے، حالات ہر لمحہ نازک سے نازک تر ہوتے چلے جارہے ہیں، نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے؟

پریس کانفرنس میں کسی صحافی کے سوال کے جواب میں وزیرِ اعظم پاکستان نے بہت خوب بات کہی کہ "بھارت کی فوجیں گولیاں کھیلنے اور راوی میں نہانے اور تفریح کرنے کے لئے نہیں آئیں" ــــــــ ایک خونچہ فروش بھی جانتا ہے کہ کسی ہمسایہ حکومت کی سرحد کے قریب فوجوں کی نقل و حرکت کی غرض و غایت یا تو "مدافعت" ہوتی ہے یا "پیش قدمی"! اس حقیقت میں ذرا سی بھی پیچیدگی اور ابہام نہیں ہے کہ بھارت کے لئے مدافعت کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی، پاکستان کی فوجیں اپنے اپنے مستقر اور مرکزوں پر تھیں، نہ اِدھر سے جنگ کی کوئی دھمکی دی گئی، نہ پاکستانی فوجیں اپنی جگہ سے ہلیں، نہ فوجی تیاریوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا، اُس پر یہ "مدافعت" کا وہم اور "احتیاطی تدابیر" کے نام پر بھارت کے جودھاؤں اور سیناؤں کی یہ چلت پھرت یقیناً کسی خطرناک عزم کا اتا پتا دیتی ہے!

کہا جاتا ہے کہ بھارت کے معاشی اور اقتصادی حالات بہت خراب ہیں، وہاں بہت سی پارٹیاں ہیں اور اُن میں شدید کشمکش ہے، حکومت کی مخالفت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، وہی جواہر لال جن کے لئے کبھی لاکھوں آنکھیں فرشِ راہ ہوجایا کرتی تھیں اب اُن کا سیاہ جھنڈیوں سے استقبال ہوتا ہے، اور الیکشن کا زمانہ بھی قریب ہے اس لئے عوام کی توجہ کا رُخ دوسری طرف موڑنے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی، اگر یہ بات اپنی جگہ صحت اور وزن رکھتی ہے تو پھر بھارت کے کرتا دھرتا پانی کی موجوں سے بچنے کے لئے آگ کے شعلوں سے کھیل رہے ہیں، اور اُن کا یہ " S T U N T " بڑا ہی خوفناک ہے۔

پنڈت نہرو نے پاکستان پر الزام لگایا ہے کہ وہاں "جہاد" کے لئے زور شور سے پروپیگنڈا ہو رہا ہے مگر نہ جانے یہ کس قسم کا "جہاد" ہے کہ مجاہدوں کی ایک پلٹن بھی تیار نہ ہوسکی، اگر مسلمان اس نوبت پر "جہاد" کو ناگزیر سمجھتے تو "لیاقت نہرو معاہدہ" کی اس شدت کے ساتھ پابندی اور احترام نہ کرتے۔

کیا قیامت ہے کہ اپنا الزام دوسرے کے سر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، صورتِ حال بالکل اس کے برعکس ہے، جب سے ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی ہے اور پاکستان بنا ہے، بھارت کی اکثریت انگاروں پر لوٹتی رہی ہے، ہندو مہاسبھا نے ایک دو دفعہ نہیں دسیوں بار اس بات کا اعلان کیا ہے کہ بھارت کی تقسیم کو ہم نے قبول ہی نہیں کیا، ہم بھارت کے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر رہیں گے، "لیاقت نہرو معاہدہ" پر بھارت کے اخباروں نے نفرت آمیز انداز میں تنقید کی، ہندو مہاسبھا نے بار بار ہندستان کی حکومت سے مطالبہ کیا کہ پاکستان کے مقابلہ میں سختی سے کام لیا جائے، بھارت کے پریس ہی نے نہیں وہاں کے ریڈیو نے بھی پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے کیا کیا خبریں تراشیں۔

نام نہاد "پختونستان" کے جلسے بھارت ہی کے راج میں ہوتے رہتے ہیں اور بھارت ریڈیو سے ان جلسوں کی کارروائی نمایاں انداز میں نشر کی جاتی ہے، کیا یہ میل ملاپ کی باتیں ہیں، کیا یہ دوستی اور صلح و مروت کے آثار ہیں ——— نیپال میں گڑبڑ شروع ہوتی ہے اور وہاں کے اخباروں میں یہ شرانگیز خبر شائع ہوتی ہے کہ نیپال کے اس خلفشار میں "پاکستان" کا ہاتھ ہے ——— بھارت اپنے سکّہ کی شرح کم کردیتا ہے مگر پاکستان اپنے سکّہ کی قیمت جوں کی توں رہنے دیتا ہے، اس پر بھارت کے اچھے خاصے ذمہ دار افراد اخباروں میں بیان دیتے ہیں کہ پاکستان اس طرح اقتصادی طور پر ہندستان کو تباہ کرنا چاہتا ہے ——— یہ نہ تہمت ہے اور نہ اس حقیقت میں ذرّہ برابر مبالغہ ہے کہ بھارت میں عام طور پر "اینٹی پاکستان" ذہنیت کارفرما رہی ہے اور وہاں کا پریس، ریڈیو یہاں تک کہ بعض سرکاری ذمہ دار افراد تک اس کوشش میں لگے رہے ہیں کہ پاکستان کو بھارت کی اکثریت کے سامنے "دشمن" بنا کے پیش کیا جائے اور بھارت کی جنتا کے دلوں میں یہ بات بٹھادی جائے کہ پاکستان، بھارت کا مستقل دشمن ہے! برِصغیر ہند کی تقسیم کے بعد یقیناً شدید تلخیاں پیدا ہوگئی تھیں اور بھارت میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان تلخیوں کی یاد دلوں میں باقی رہے، دل جو پھٹ گئے ہیں وہ پھٹے ہی رہیں کسی طرح جُڑنے نہ پائیں، یہ سب کچھ جان کر کیا گیا، غرض یہ تھی کہ پاکستان کے خلاف بھارت کی اکثریت کے جذبات ہمیشہ مشتعل رہیں، اور جذبات کی اس تلخی اور اشتعال سے بروقت کام لیا جاسکے اور اس کا وقت شاید اب آگیا ہے!

پاکستان نے بھارت کی طرف ہمیشہ تعاون اور دوستی کا ہاتھ بڑھایا صلح و آشتی کے معاہدے کے لئے ہمارے وزیر اعظم نے پہل کی اور اُنھوں نے دوستی اور میل ملاپ کی خاطر بھارت کی راجدھانی میں پہونچ کر جُرات و حوصلہ مندی کا ثبوت دیا، "جُرات" ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اسی دہلی کی سرزمین پر گاندھی جی اپنی قوم کے ہاتھوں گولی کا نشانہ بن چکے ہیں، ہندو مہاسبھا نے پرچار کے ذریعہ اُس قوم کو تیار کیا ہے جس کے دل میں کیڑوں مکوڑوں کے لئے رحم ہے مگر مُسلمان کے لئے رحم کی جگہ عداوت، نفرت اور بیزاری ہے۔

صُلح و اتحاد کے جذبہ کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہوسکتا ہے کہ پاکستان نے کشمیر میں اُس وقت جنگ بند کی اور اُس کی طرف سے "CEASE FIRE" کا اعلان ہوا جبکہ پاکستان کی فوجوں کی جیت ہو رہی تھی اور ہمارے کانوں تک تواتر کے ساتھ یہ خبریں پہونچی ہیں کہ کشمیر میں چند دن اور جنگ جاری رہتی تو لڑائی کا پانسہ ہی پلٹ جاتا، ہم نے دوستی اور امن کی خاطر ایک سُنہری موقعہ کو کھو دیا۔

ہم حیدرآباد اور جوناگڑھ کے واقعات سے یہاں مثالیں پیش کرنا نہیں چاہتے صرف کشمیر کے مسئلہ ہی کو پیش کرتے ہیں ——— اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ بھارت کشمیر میں "استصواب رائے عامہ" کی تجویز کو منظور کر چکا ہے مگر اس تجویز پر عملدرآمد کرتے ہوئے کتراتا ہے، بھارت اچھی طرح جانتا ہے اور اُس کے سیاسی مبصرین یہ بات معلوم کر چکے ہیں کہ کشمیر کے الحاق کے سلسلہ میں جو آزاد رائے شماری ہوگی اُس میں پاکستان کا پلّہ بھاری رہے گا، شیخ عبداللہ نے کشمیر میں تمام جتن کرکے دیکھ لئے ——— لالچ سے لیکر دھمکی تک! مگر کشمیر کے عوام کے دل پاکستان کے ساتھ ہیں ——— اس صورتِ حال کا جائزہ لینے اور ان حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھارت "آزاد رائے شماری" کی راہ میں طرح طرح سے روڑے اٹکا رہا ہے اور اب اُس نے اپنے وعدے اور معاہدے کو نئی نئی تعبیروں میں اُلجھا کر اُس سیدھے سادے مسئلہ کی نوعیت ہی بدل دی ہے، یہی باتیں جو آج کہی جارہی ہیں اُس وقت کہنے کی تھیں جبکہ "استصواب رائے عامہ" کی تجویز بھارت نے منظور کی تھی، کشمیر میں اُس وقت بھارت کی فوجی پوزیشن زیادہ مضبوط نہ تھی، اب جبکہ وہ سمنٹ کی سڑکیں، مضبوط چوکیاں اور مستحکم مورچے بنا چکا ہے اُس کے لہجہ میں تبدیلی پیدا ہوگئی، اب نئی طرح کی دلیلیں ہیں، تہمت سازیاں اور الزام تراشیاں ہیں، اُلٹا پاکستان ہی کو مُجرم ٹھیرایا جارہا ہے! دلیلوں کی اس دُنیا میں کمی نہیں ہے، ہر انصاف اور ہر ظلم کے لئے دلیلیں موجود ہیں ہٹلر نے جب پولینڈ پر ظالمانہ حملہ کیا تھا تو اُس کے لئے دلیلیں ہی پیش کی تھیں اور جب وہ دوستی کے معاہدہ کو ایکا ایکی توڑ کر اپنے حلیف روس کی مملکت میں داخل ہو رہا تھا تو اُس وقت بھی اُس کے پاس دلیلوں کی کمی نہ تھی، جب کوئی یہ طے ہی کرلے کہ مجھے اپنی ہی من مانی کرنی ہے اور کسی کی بات میں مانوں گا نہیں تو پھر اس قسم کی ذہنیت کو رشی منی اور پیر پیغمبر بھی مطمئن اور متاثر نہیں کرسکتے۔

یو۔ این۔ او اور ....

جب دو آدمیوں، دو جماعتوں اور دو حکومتوں میں کسی بات پر اختلاف ہوتا ہے تو حکم اور ثالث ([illegible]) کے ذریعہ اس اختلاف کو دور کیا جاسکتا ہے، بڑے سے بڑا نازک مسئلہ صلح کرانے والوں کے ذریعہ سے سُلجھ سکتا ہے، آج دنیا میں ثالث اور حکم کا پارٹ مجلس اقوام ادا کر رہی ہے ——— یو، این، او ——— مگر اس یو، این، او (U. N. O.)

کا حال ہم کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے پاس حق و انصاف کا کوئی معیار نہیں ہے، اُس کے سامنے مصلحتیں، خود غرضیاں اور سیاسی توڑ جوڑ ہیں، فلسطین کی گتھی کو یو، این، او کے ناخنِ تدبیر نے جس طرح سلجھایا اُس کے زخم عدل و انصاف کے کلیجہ میں اب تک موجود ہیں، مجلسِ اقوام قوت اور دولت کی ساتھی ہے، مظلوم کی وہ نہیں سُنتی اور سُنتی بھی ہے تو اُس کا اثر نہیں لیتی ——— کشمیر کا مسئلہ کئی سال سے کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، یو، این، او کو سب کچھ معلوم ہے، کشمیر کے معاملہ کو شاید وہ ہم سے زیادہ جانتی ہے مگر اُس کی مصلحتیں اس گتھی کو سلجھانا نہیں چاہتیں، اُس کی خواہش ہے کہ یہ کشمکش جاری رہے، بین الاقوامی سیاسی توازن کے لئے یہ خلفشار ضروری ہے، کشمیر کے مسئلہ پر کیا کیا بحثیں ہوئی ہیں، بیان و تقریر اور استدلال کے کیا کیا معرکے رہے ہیں، مگر نتیجہ؟ یہ نہ پوچھئے، ہر بار ایک نہ ایک نئی پیچیدگی نکل آتی ہے، ڈکسن صاحب کے بعد مسٹر گراہم تشریف لائے ہیں، کمیشنوں اور ثالثوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا بلکہ اُسے جاری رکھا جائے گا، مجلسِ اقوام کے نمائندوں کا ضمیر پاکستان کو حق بجانب سمجھتا ہے مگر یہ لوگ ضمیر کی بات سنتے کب ہیں، وہ تو اپنی مصلحتوں کے پجاری ہیں، بھارت طاقتور ہے اس لئے وہ اُسے خفا کرنا نہیں چاہتے، بھارت کی دوستی سب کو مطلوب ہے، جہاں مصلحتیں اور ذاتی اغراض کارفرما ہوں وہاں کسی سے انصاف کی توقع ہی رکھنا حماقت ہے، نہ جانے اس حماقت میں ہم کب تک مبتلا رہیں گے!

روس، امریکہ اور برطانیہ بساطِ سیاست کے سب سے زیادہ اہم مُہرے ہیں، امریکہ اور برطانیہ کی ڈپلومیسی اپنی خود غرضی کی وجہ سے کوئی شک نہیں کہ بہت زیادہ بدنام ہے مگر روس بھی غرض پرستی میں اپنے ان حریفوں سے کم نہیں ہے، ایک طرف روس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ سرمایہ پرستی کا سب سے بڑا دشمن اور سامراج کا سب سے زیادہ مخالف ہے اور دوسری طرف یہ عالم ہے کہ اسرائیلی حکومت کا جب قیام عمل میں آیا تو روس نے سب سے آگے بڑھ کر اسرائیلی حکومت کو "خوش آمدید" کہا، روس جس ملک کے ساتھ دوستی کرتا ہے اس دوستی کی قیمت بڑی مہنگی دینی پڑتی ہے دوستی کے پردے میں "کمیونزم" بھی ساتھ ساتھ آتا ہے، روس کی دوستی سے وہی حکومت فائدہ اُٹھا سکتی ہے، جس میں "کمیونزم" کے سیلاب کو روکنے کی طاقت موجود ہو، ہٹلر نے روس سے دوستی کی، روس اور جرمنی ایک دوسرے کے حلیف رہے مگر ہٹلر نے جرمنی میں "کمیونزم" کو قدم رکھنے نہ دیا، اور قدم رکھا بھی ہو تو وہ جم نہ سکا، امریکہ اور برطانیہ بڑے شاطر واقع ہوئے ہیں، بھارت اور پاکستان کے سیاسی معاملات پر امریکہ اور برطانیہ کے افکار کی پرچھائیں پڑتی ہے، انگریز ہندستان اور پاکستان سے جانے کے بعد بھی یہاں کے حالات پر اپنا اثر و نفوذ رکھتا ہے، پاکستان کا ان دونوں میں سے کوئی دوست نہیں ہے، لہٰذا یہ توقع رکھنا کہ نازک وقت میں یہ طاقتیں پاکستان کے کام آسکیں گی، ایک غلط اور بے بنیاد قسم کی توقع ہے، امریکہ اور برطانیہ بھارت کے ساتھی ہو جائیں تو ہو جائیں مگر پاکستان کیساتھ ان کا تعاون مشکل ہے، "مسلم دشمنی" ان کی فطرت میں داخل ہے! ان ملکوں کے اخبارات کی بھی عجیب پالیسی ہے، کبھی بھارت کو خوب کھری کھری سُناتے ہیں، اور پھر نہ جانے اُن کے کان میں کون؟ کیا پڑھ کر پھونک دیتا ہے، کہ کچھ اور طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں، وہ ہوا کا رُخ دیکھتے ہیں، اور اس سے اُن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ

؎ باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی!

امریکہ اور برطانیہ سے کسی طرح کی اُمید رکھنا نہ صرف یہ کہ بیکار ہے بلکہ سراسر نادانی اور حماقت ہے، ان کی شاطرانہ

چالوں کا پورے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرتے رہنا چاہیئے اور اس خام خیالی کو بھی دل سے نکال دینے کی ضرورت ہے کہ ہماری "مظلومیت" سے دنیا کی حکومتیں متاثر ہو کر ہمارا ساتھ دیں گی، کمزور کا اس دنیا میں کون ساتھ دیا کرتا ہے؟ دنیا تو بنے کی ساتھی ہوتی ہے اور ہر کوئی طاقتور کا ساتھ دیتا ہے، بس ہمیں "مظلوم" نہیں طاقتور بننا ہے، اتنا طاقتور کہ ظالم کی اینٹ کا جواب ہم پتھر سے دے سکیں!

موت یا فتح!

مستقبل کے بارے میں کون حکم لگا سکتا ہے کہ کیا ہوگا؟ ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو خواہ مخواہ کی ہنگامہ آرائی چاہتے ہیں —— صلح و آشتی بہر حال جنگ سے اچھی چیز ہے! مگر ہم حقائق سے بھی آنکھیں بند نہیں کر سکتے، حالات یہ ہیں کہ پاکستان کی سرحدوں پر بھارت کی فوجیں کیل کانٹے سے تیار اور ہتھیاروں سے لیس کھڑی ہیں، ہر وقت خطرہ ہے کہ بھارت کی یہ نام نہاد "مدافعت" کہیں "پیش قدمی" نہ بن جائے، یوں سمجھنا چاہیئے کہ جنگ ہمارے دروازوں پر دستک دے رہی ہے!

ساری دنیا میں پاکستان ہی صرف وہ حکومت ہے جس نے آئینی طور پر اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اُس کا دستور کتاب و سنت کی بنیاد پر مرتب ہوگا اس لئے وہ "اسلامی حکومت" ہے اور اُس کی مدافعت ہمارا دینی فرض ہے اور اس فرض کو ہم پوری ذمہ داری، سرفروشی اور جرات و بے باکی کے ساتھ انجام دیں گے!

پاکستان کے بعد ہم آخر جائیں گے بھی کہاں؟ یہ ہماری آخری پناہ گاہ ہے، اس کے بعد سمندر ہے اور اُس کی پُرشور موجیں —— بس ہمیں پاکستان کی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنی جانیں پیش کرنی ہوں گی، جب تک ہم زندہ ہیں پاکستان کی سرحد سے اِدھر کسی غیر کا ایک قدم بھی نہیں بڑھ سکتا!

قوم کی سب سے بڑی طاقت اخلاق اور حوصلہ (Morale) کی طاقت ہے، حوصلہ اگر موجود ہے اور اخلاق کی کمی نہیں ہے تو پھر "قلت"، "کثرت" پر فتح پا سکتی ہے، ہماری گزشتہ تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے، اُن کو —— "حیدرآباد پولیس ایکشن" پر گھمنڈ ہے اور ہم "بدر و حنین" پر ناز کرتے ہیں، وقت بڑے بول بولنے کا نہیں کام اور تیاری کرنے کا ہے، ہم اس سلسلہ میں کچھ اور زیادہ کہنا نہیں چاہتے۔

موت زندگی سے زیادہ یقینی چیز ہے، کوئی شخص موت سے بھاگ کر آخر کہاں جا سکتا ہے! بس موت کا خوف دل سے نکال دینا چاہیئے! توپوں کی گرج اور بموں کے شعلوں میں بھی تیور ملول نہ ہونے چاہئیں، جرات، استقامت، فرض کا احساس، بے باکی، اللہ کی ذات پر بھروسا! یہ عزم کہ اللہ کے دین کی عظمت کے لئے زندہ رہیں گے اور اُسی کے لئے مریں گے —— اور "جانیں" خود ہماری ہیں کہاں جو اُن کے جانے کا رنج ہو، وہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں بک چکی ہیں!

مردِ مومن کی یہ شان ہوتی ہے کہ وہ فتح و نصرت کے وقت نہ تو "مغرور" ہوتا ہے اور نہ پسپائی اُسے "مایوس" بناتی ہے، اللہ کی مشیت تکوینی کو ہم نہیں بدل سکتے، جو صورت بھی پیش آئے مگر ہمیں اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیئے، جنگ کی حالت میں حدود اللہ کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے، ہمارا مذہب ظلم اور بے اعتدالی نہیں سکھاتا، اسلام کا قانونِ جنگ دوسروں کے آئینِ جنگ سے بالکل مختلف ہے —— مجاہدین اس بات کو گرہ میں باندھ لیں اور حرزِ جان کر لیں کہ اسلام کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب "فتح مکہ" ہے! انسانیت پھر اسی تاریخ کا اعادہ چاہتی ہے!

توکل علی اللہ کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ مادی اسباب و ذرائع کو پس پشت ڈال دیا جائے یہ غلط قسم کا توکل ہے، زیادہ

سے زیادہ کوشش اور تمام ضروری مادی اسباب و وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اللہ کے فضل و کرم پر بھروسا رکھنا اور اُس سے مدد و نصرت چاہنا یہ ہے "توکل علی اللہ"! پس جس کے پاس لوہے کی ایک کیل ہے اسے بھی جہاد فی سبیل اللہ میں صرف
ارباب اقتدار کی خدمت میں ہم گزارش کریں گے کہ اسلامی ماحول پیدا کرنے کے لئے یہ بڑا اچھا وقت ہے، لوگوں کے دل عام طور پر "انابت" کی طرف مائل ہیں، پس تمام ممکنہ ذرائع اس کے لئے صرف کر دینے چاہئیں، فوجی طاقت کے پیچھے اسلامی اخلاق کی قوت جب ہوگی تو پھر پاکستان کی سرزمین کا ایک ایک ذرہ "بنیانِ مرصوص" بن جائے گا ——— اسلام میں نامحرم مردوں اور عورتوں کے اختلاط سے روکا گیا ہے، عورتوں کو حجاب کی تاکید فرمائی گئی ہے، مردوں کو غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے پس عورتوں کے وہ تمام مظاہرے روک دینے چاہئیں جن میں نامحرم مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہوتا ہو اور اسلامی حجاب کے حدود ٹوٹتے ہوں، جو عورت کھُلے بندوں سینہ تان کر فوجی سلامی دیتی ہے یا بازاروں سے "مارچ" کرتی ہوئی گزرتی ہے اُس کا ہر قدم اسلام کے ناموس کو
جنگ کی حالت میں عوام کو سراسیمہ نہ ہونا چاہیئے، ایک آدمی کی بدحواسی دس آدمیوں کے حوصلے پست کر دیتی ہے، جو جہاں ہے بس وہیں جما رہے! زیادہ سے زیادہ ایثار و محنت اور کم سے کم آرام کی ضرورت ہے، جنگ کے زمانہ میں "نفع خوروں" اور "بلیک مارکیٹ کرنے والوں پر کڑی نگرانی رکھنی چاہیئے! ہر شہری آدمی اپنے کو "سپاہی" سمجھے گویا وہ میدانِ جنگ ہی میں ہے ——— "موت یا فتح" یہ ہے وہ عزم جو نبرد آزما ہی نہیں صف شکن بھی ہے ——— اور ان سب سے بڑھ کر اللہ تعالےٰ کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار، استغفار و توبہ، ندامت پشیمانی، سجدے، آنسو، رو رو کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے استقامت کی توفیق طلب کرنا، اور سرفگندگی اور عاجزی کے ساتھ دعائیں مانگنا کہ مالک! ہم تیرے دین کی حفاظت کے لئے جہاد کر رہے ہیں، ہمارا مقصد نہ کسی کو ستانا ہے اور نہ کسی پر ظلم کرنا ہے اور نہ ہم اپنی بڑائی چاہتے ہیں، ہمیں نہ اپنی فوجوں پر ناز ہے اور نہ اپنی مادی طاقتوں پر گھمنڈ ہے، ہمارا بھروسا تو صرف تیری ذات پر ہے اور تیرے ہی کرم کے اعتماد پر ہم ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے نکلے ہیں، تو نے جب چاہا تو کمزور چڑیوں نے ہاتھیوں کے لشکر کو بھُس کی طرح چورہ چورہ کر دیا تھا ——— ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ دشمن کی فوج اور ہتھیاروں کی تعداد ہم سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے مگر خود تو نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے کہ "کم من فئۃٍ قلیلۃ غلبت فئۃً کثیرۃً باذن اللّٰہ" بس یہی سہارا ہمیں میدان میں لیکر آیا ہے، ہمارا یہ منہ نہیں ہے جو تیرے محبوب رسولؐ فاتح بدر و حنین کی طرح یہ دُعا مانگیں کہ بارالٰہا! یہ مٹھی بھر نفوس اگر مٹ گئے تو حشر تک تیری پرستش نہ ہوگی" نہ ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ (خدانخواستہ) ہمارے مٹ جانے سے تیرا دین ہی مٹ جائے گا، بس اتنی گزارش ضرور ہے اور وہ بھی ہم تیرے حضور ہزار بار معافی مانگ کر عرض کرتے ہیں کہ جو زد بھی پاکستان پر آکر پڑے گی اُس سے تیرا بھیجا ہوا "دینِ اسلام" متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔
پروردگار! ہم تیرے امتحان کے قابل نہیں ہیں، ہم تجھ سے تیرے فضل و کرم کی بھیک مانگتے ہیں۔ ہم لاکھ گنہ گار اور نافرمان سہی مگر تجھ سے اور تیرے آخری نبی محمدِ عربی (ارواحنا لہم الفداء) سے نسبت تو رکھتے ہیں، بس اسی مقدس نسبت کو ہم درمیان میں لاتے ہیں، لاج اسی "نسبت" کی لاج!

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ؕ

ماہر القادری
۲۷ ربیع الاول سنہ ۵۱ء

ترجمہ: حسن مثنیٰ ندوی

انسان "تاریخ ساز" ہے

مگر ....؟

روحانیت کے بغیر کوئی "تمدن" جوان اور صحت مند نہیں ہو سکتا

تاریخ میں پراگندگی کا زمانہ وہی رہا ہے جس میں عورتوں نے گھر چھوڑ دیئے

خدائے واحد ہی کی پرستش میں اطمینان و سکون مل سکتا ہے!
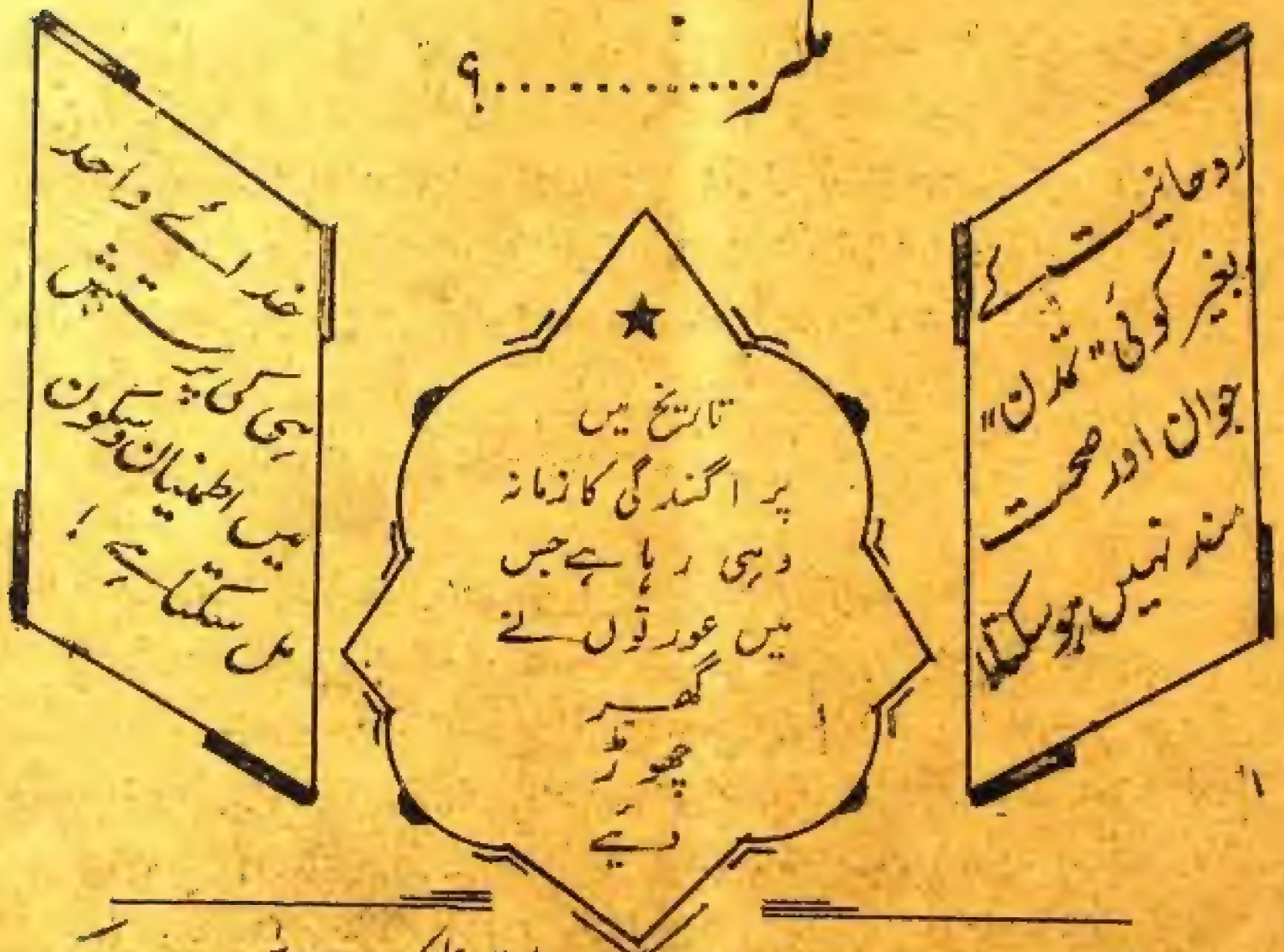
مجبی ... ماہر القادری مدیر فاران	السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ مجھ سے بیحد خفا ہوں گے میں جانتا ہوں، تلافی کے طور پر ایک مضمون ارسال خدمت ہے، امید خوش ہو جائیے، بات یہ ہے کہ میں کوئی فضول مضمون لکھنے کا قایل نہیں ہوں، اس صدی کے مشہور مسلم الثبوت مغربی مورخ، ماہر نفسیات و مفکر پروفیسر ٹوئن بی کا ایک مضمون نظر سے گزرا اور بعض لحاظ سے بڑا قیمتی معلوم ہوا۔ فوراً آپ یاد آ گئے، لیجیے اردو میں حاضر ہے، فاران کے لئے!

حصول پاکستان کی جدوجہد پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت قایم ہو جائے بلکہ مغرب کے مادی و غیر روحانی اثرات و تصورات سے بچا کر مسلمانوں کو ایک ایسی جگہ پہونچانا تھا جہاں وہ "اپنے ماضی" پر نہیں بلکہ اسلام اور روحِ اسلام پر اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر نو کریں، ——— "ماضی" کا تصور دطنیت، قومیت

کے مغربی نظریات کا حامل ہے اور پچھلی جدوجہد میں ہم سب انہیں نظریات کی تردید کرتے رہے ہیں۔ اسلام نے توحید، اور توحید کے ذریعے وحدتِ آدم اور وحدتِ عالم کا تصور عطا کیا ہے جو مغربی تصورات سے نہ کلیات میں کہیں میل کھاتا ہے نہ جزئیاتِ زندگی میں۔ ـــــ اسی حقیقت کو منظرِ عام پر لانے کے لئے مسلمانوں کو اپنی ایک علیحدہ دنیا، علیحدہ مملکت کی صورت میں درکار تھی، ہمارا پڑھا لکھا طبقہ، جس میں مشرقی و مغربی دونوں علوم والے داخل ہیں، محسوس یا غیر محسوس طریقہ پر دانستہ یا نادانستہ، مغربی تصورات سے متاثر و مرعوب ہوتے رہے ہیں، اور ان کی وجہ سے عوام پر بھی بڑا خراب اثر پڑتا رہا ہے، کم از کم اب تو ایسا نہ ہو، بس یہی باتیں ذہن میں تھیں جن کے پیشِ نظر پہلے بھی کچھ پیش کیا تھا اور آج بھی پیش کر رہا ہوں، یہ مضمون اہم ہے، اس لئے کہ جو باتیں پاکستان کے مفکرین کی زبان سے ادا ہونی چاہیئے تھیں، وہ ایک مغربی مفکر نے پیش کی ہیں، ع پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے ؟ اس مسیحی مفکر نے اگرچہ اخیر میں مسیحی اقتدار کے احیا کے لئے بھی اپنی تڑپ ظاہر کی ہے، لیکن ہمیں اس سے کیا بحث، ہمیں تو صرف ان باتوں سے بحث ہے کہ :۔

(۱) ماڈرن انسان میں روحانی (spiritual) تبدیلی ضروری ہے،

(۲) کوئی تمدن اس وقت تک اپنے شباب کو نہیں پہونچ سکتا جب تک اس میں روحانیت کا احیاء نہ ہو،

(۳) انسان اپنے خودساختہ بتوں اور معبودوں کی پرستش سے توبہ کرے،

(۴) یہ مشینری، یہ قومی پرچم، یہ اقتصادیات و معاشیات اور سائنس، سبھی معبودانِ باطل[1] ہیں،

(۵) وطن پرستی (Patriotism) بت پرستی ہے ع ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے،

(۶) اخوتِ انسانیہ کا تصور اس وقت تک بے معنی اور ناممکن العمل ہے جب تک "ایک خدائے مافوق الزمان والمکان" (Transcendent God) پر لوگوں کا ایمان نہ ہو، ـــــ

(۷) انسانیتِ عامہ کی محبت ہی تاریخ کی سب سے بڑی طاقت رہی ہے بشرطیکہ انسانیتِ عامہ کی یہ محبت اللہ کی محبت اور بے پناہ و بے اندازہ محبت کے نتیجے کے طور پر دلوں میں پیدا ہو،

(۸) مادی ترقیوں نے انسان کی ذہنی و فکری، اخلاقی و روحانی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے اور یہ سب سے بڑا تنزل ہے،

(۹) ایمان باللہ ـــــ صحیح معنوں میں اگر ہو ـــــ تو سرچشمۂ تخلیق و ایجاد ہے، موجبِ ترقیٔ فکر و نگاہ ہے

(۱۰) عالمی مسائل کا حل مادیات میں نہیں روحانیات میں ہے، کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

---

[1] ان سے استفادہ تو کرنا چاہیے مگر انہی کو مقصودِ حیات سمجھ لینا درست نہیں۔ (مدیر)

اسلام اس کے سوا اور کیا کہتا ہے ؟ کم از کم اسلام والے تو اس کو سمجھیں ؟ یہ کیوں نہیں سمجھتے ، اسلام کا کلمۂ طیبہ اور کیا ہے ، یہی تو ہے کہ ـــــ " انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں اور دستور العمل اور طریقہ ہائے کار کی مدد سے جتنی بھی کوشش حصول مدعا ـــــ اخوت انسانیہ ـــــ کے لئے کی جائے گی ، اتنی ہی زیادہ ان سے ـــــ ان بتوں سے ـــــ نجات مشکل ہوتی چلی جائے گی "۔

لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ ،

خیر ، یہ مضمون اپنے قارئین کو پڑھنے کے لئے دیجئے ، شاید ان میں کوئی ایسا موجود ہو جو اس پر غور کرے اور اپنی قوم کو سیدھے رُخ پر لگانے کی کوشش کرے ۔ اور سمجھائے کہ مغرب " ٹکنکل قابلیت و صلاحیت " کا مجسمہ سہی ، لیکن بقول پروفیسر ٹوئن بی ـــــ " ٹکنکل قابلیت ، بجائے خود ، نہ تو " ہوش و خرد " کی دلیل ہے ، نہ " حفظ و بقا " کی ضمانت " !

اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا ۔ اور آپ مجھ سے کم از کم اب اتنے خفا نہ رہیں گے جتنے اب تک رہے ہیں ، والسلام !

مخلص ۔ حسن مثنیٰ ندوی

اگر یہ سوال کیا جائے کہ بنی نوع انسان کی گاڑی کبھی پہلے بھی اسی طرح کہیں بیچ راستے میں پھنسی تھی جیسی آج ہمارے اس دور جدید میں پھنسی ہے ؟ ـــــ تو جواب یہ ہے کہ پھنسی تھی اور بارہا پھنسی تھی ، ہم آج جس راستے پر گامزن ہیں اس پر ہم سے پہلے دوسرے بھی گزر چکے ہیں ،

البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ اگلے زمانے میں لوگ گدھے گاڑیوں میں سفر کرتے تھے یا پیدل چلا کرتے تھے ، اس لئے تصادم اگر ان کے زمانے میں کوئی ہوتا بھی تھا تو مہلک اور تباہ کن نہ ہوتا تھا ، لیکن آج حالت یہ ہے کہ اسی راستے پر اگر ہم اپنی جدید ترین کار میں بیٹھ کر ، اسّی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتے ہوئے ، ذرا بھی بہک جائیں اور اصول و قواعد کو بالائے طاق رکھ دیں تو یقیناً بہت ہی بڑی اور ہولناک تباہی برپا ہو جائے گی ۔

" ٹکنکل قابلیت " بجائے خود ، نہ تو " ہوش و خرد " کی دلیل بن سکتی ہے نہ " حفظ و بقا " کی ضمانت ، ـــــ یہ حقیقت ابتدائی عہد تاریخ کے بارے میں بھی اتنی ہی درست ہے جتنی آج ، مثلاً عہد حجری جدید کی تحتانی نسل (Lower Neolithic) کی ساری توجہ اپنے عہد کے سامان حرب کو بہتر سے بہتر اور موزوں و مفید بنانے پر مرکوز رہی اس لئے وہ اس کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکی ، اس کی زندگی اسی عالم میں تمام ہو گئی ۔ اس کے برخلاف عہد حجری قدیم کی فوقانی نسل (Upper Palaeolithic) کو نہ دیکھئے (جو اس سے پہلے گزری) تو ان کو اس نے کبھی ہاتھ

ــــ میں آپ سے کبھی خفا نہ تھا ، وہ تو ایک " نازِ دوستانہ " تھا جسے آپ نے خفگی سمجھ لیا ۔ (ماہر القادری)

سے جانے نہ دیا، اس لئے اس کے آلاتِ جنگ اور سازوسامان نسبتاً خام ہی رہے لیکن اس کی عام تہذیب و ثقافت (کلچر) جو آج بھی غاروں کے نقش و نگار میں بچی کھچی موجود ہے، وہ بلند قسم کی تھی،

بہر حال ساری تواریخ عالم کا ایک ہی سبق ہے، اور وہ یہ کہ —— دنیاوی طاقت و کامرانی کی طرح کوئی چیز بھی کام و نامراد نہیں رہی" —— میں نے دنیا کے اکیس تمدنوں (civilizations) کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس یقینی نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ تہذیبیں اور ثقافتیں (cultures) صرف اسی وقت تک مفید اور صحت مند ہیں جب تک ان کے اندر ایجاد و تخلیق کی صفت موجود ہے، اور یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہر دعوتِ مبارزت اور ہر للکار کا جواب، نو بہ نو تخلیق و اجتہاد سے دے سکیں،

چھوٹے معاملات میں یہ اصول آپ کو بالکل درست اور واضح طور پر نظر آئے گا، مثلاً پیڈل اسٹیمر (Paddle steamers) امریکہ والوں نے ایجاد کیا تھا مگر وہ اپنے اس ایجاد سے مسحور ہو کر کھو سے گئے، اسی اثنا میں یورپ کی قوموں نے اس سے بھی بہتر، اسکرو پرابلر (Screw Propeller) کا انکشاف کیا، اور اس کی بدولت امریکہ کی جہاز راں کمپنیوں (shipping companies) سے کہیں آگے بڑھ گئیں، یعنی ایک چھوٹی سی کامیابی بھی، کسی بہتر اور مفید تر چیز کی تلاش و تحقیق اور ایجاد و اختراع کے جوش کو ٹھنڈا اور صلاحیت کو مفلوج کر کے رکھ دے سکتی ہے، اسی لئے ہم جو آج مشینوں کے بڑے ماہر، اور ایجاد و اختراع کے خداوندانِ با اختیار بنے ہوئے ہیں فی الحقیقت شدید ترین خطرے میں مبتلا ہیں۔

بُت پرستی، انسان کو بہکانے اور غلطتے اور بھانے والی چیزوں میں، سب سے زیادہ طاقتور اور مؤثر ثابت ہوئی ہے، اس لئے سرچشمہ تخلیق و ایجاد کو خشک و بے فیض کر دینے والی اس سے زیادہ یقینی چیز کوئی اور نہیں ہو سکتی جتنی کہ اپنے ماضی کے کارناموں اور کامرانیوں کی پرستش ہوتی ہے، چنانچہ وطن پرستی (patriotism) اس سلسلہ میں ایک قابلِ توجہ نکتہ ہے،

ہمارا یہ دور جن اسباب و وجوہ کی بنا پر خطرناک ہے، ان میں ایک بڑا سبب یہی ہے، ہمیں تعلیم یہ دی جاتی رہی ہے کہ اپنی قوم کی پرستش کریں، اپنے جھنڈے کی پرستش کریں، اپنے ورثہ ماضی کی پرستش کریں، حالانکہ پرستش آدمی خدائے واحد ہی کی، انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ کر سکتا ہے، لیکن ہم جب اپنے "ماضی" کو بت بنا کے سامنے رکھ لیں تو پھر ناکامی یقینی ہے،

وطن پرستی (patriotism)، عہد جدید کا ایک ایسا جنون ہے جس کا پتہ ہمیں انقلاب فرانس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ اس زمانے میں جبکہ لوگ واقعی خدا کو پوجتے تھے اور خدا پرست ہوتے تھے، مملکت کے ساتھ ان کی "وفاداری" محدود قسم کی ہوا کرتی تھی، بس اتنی ہی جتنی کہ خود ہم آج اپنے شہری نظم و نسق کے ساتھ رکھتے ہیں، یعنی مملکت کو اس کی اجازت ہرگز نہ ہوتی تھی کہ وہ ان کے ضمیر پر بھی حکومت کرنے لگے۔

وطن پرستی، اس عہد جدید میں، مذہب کی جانشین بن گئی ہے —— اور میری رائے میں یہ بدترین جانشین

؎ اگر خوش قسمتی سے کسی قوم کا "ماضی" صالح اور تابناک ہو تو اس کی صالحیت دلیل راہ بن سکتی ہے۔ (مدیر)

ہے ـــــ ہٹلر اور مسولینی اسی تہذیب" کے علمبردار تھے، یہ مذہب ان کے ہاتھوں اپنی انتہائی منطقی حدود تک پہنچ گیا، ان دونوں نے صاف اعلان کیا کہ "مملکت اپنی رعایا کی تمام تر وفاداری چاہتی ہے" ان دونوں نے اپنی اپنی رعایا سے یہ مطالبہ کیا کہ "اپنی قوم کو بت بنالو، اسے پوجو" ـــــ مگر اب تو عہد جدید کے تمام باشندگان ممالک اس غلط روی میں ان کے برابر کے شریک ہیں،

پھر اس بت پرستی کا دوسرا خطرناک رخ یہ ہے کہ ہم تجربات ماضی کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنے کے اسی پست قسم کے تصور و اعتقاد میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ہمارے موجودہ مشکلات و مسائل کا حل سائنس سے حاصل ہو سکتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ہماری حالیہ سائنٹفک ترقی، نظام کارخانہ داری و صنعت گری (Industrialism) کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھی اور بہت عمدہ جواب تھی، مگر یہ مشکلات جن کا سامنا ہمیں اب ہے، اس قسم کے بالکل نہیں ہیں کہ ان کا جواب ہماری تجربہ گاہوں اور معملوں (Laboratories) سے پیدا ہو سکے، یہ مشکلات، اخلاقی ہیں اور سائنس کو مسئلہ اخلاق سے مطلق کوئی سروکار نہیں ہے۔

بحرالکاہل کی قوموں (Polynesians) نے جہازرانی میں مہارت پیدا کی، قطب شمالی کے آس پاس بسنے والے ماہی گیروں (ESKIMOS) نے سمک ت کو اپنا فن بنایا، اسپارٹا کے باشندوں (Spartans) نے فن سپہ گری میں کمال حاصل کیا اور بدویوں (NOMADS) نے گھوڑے سدھانے کے فن میں اور شہسواری میں نام پیدا کیا مگر ان میں سے ہر ایک میں صلاحیت و ہنرمندی ایک ہی کارفرما رہی، اسی پر ان کا انحصار رہا اور اسی پر وہ قانع رہے اور اس وقت بھی قانع رہے جبکہ حالات ان سے، جدید اور تخلیقانہ و مجتہدانہ جدوجہد کے متقاضی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ثقافتیں آگے نہ بڑھ سکیں،

زندگی اس قدر آسان بالکل نہیں ہے کہ کامیابی کا کوئی واحد دستور و ضابطہ (Formula) قلمبند کر کے رکھ لیا جائے، بلکہ ہر جدید چیلنج متقاضی ہوتا ہے کہ افراد یا سوسائٹی کی طرف سے کوئی برجستہ و برمحل اور جدید تر جواب پیش کیا جائے،

لیکن انسان کاہل ہے، جب پرانی چیزیں اس کے ہاتھ میں موجود ہوتی ہیں، تو پھر نئی چیزوں اور نئے حل کا حصول تو درکنار، وہ ان کی نسبت کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ ماڈرن انسان، عالمی مسائل کے حل کے لئے بھی ابھی تک مادیات ہی سے لو لگائے بیٹھا ہے، حتیٰ کہ اس امید موہوم سے دست بردار ہونا بھی اس کے لئے مشکل ہو گیا ہے حالانکہ ان ماہرین (Specialists) کے ہاتھوں کسی سیاسی حل کے حصول کی توقع ایک نہایت ہی خطرناک فریب ہے، فطرت و کائنات (Nature) کو مسخر کرنے میں تو انسان نے بڑی چابک دستی اور ہوش گوش کا ثبوت دیا ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ خود اپنے اوپر قابو رکھنے کا فن اسے بالکل نہیں آتا، وہ اس معاملہ میں بہت پیچھے ہے،

بہرکیف مسائل حاضرہ متقاضی ہیں کہ ماڈرن انسان میں کوئی روحانی (Spiritual) تبدیلی پیدا ہو، نیز یہ بھی واضح ہے کہ ہم اس مہم کو کسی "سول سروس کلاس" (Civil Service Class)

کے سپرد ہرگز نہیں کر سکتے، یہ فرض ہم میں سے ہر ایک کو خود ہی انجام دینا پڑے گا، بہ ظاہر یہ توقع پریشان کن ضرور معلوم ہوگی لیکن اس حقیقت کو نہ بھولئے کہ دنیا کا ہر بڑا تمدن (civilization) اپنے بلوغ و شباب کو جب ہی پہونچا ہے کہ جب اس کے اندر روحانیت (spiritualism) کا احیاء ہو۔

اس کے لئے سب سے بڑی شرطوں میں سے ایک اہم شرط یہ ہے کہ ہم اپنے زمانے کے خود ساختہ بتوں اور معبودوں کی پرستش سے توبہ کریں، یہ شنیری، یہ قومی پرچم، یہ اقتصادیات و معاشیات اور سائنس، سبھی معبودان، باطل ہیں، ورنہ ہم اپنے انسانی ہاتھوں کے تراشے ہوئے بتوں اور دستور العمل اور طریقہ ہائے کار کی مدد سے جتنی بھی کوشش حصول مدعا کے لئے کریں گے، اتنی ہی زیادہ ان سے نجات ہمارے لئے مشکل ہوتی چلی جائے گی، اور جن لوگوں کا تعلق عہد حاضر کی بلند مقام اور کامیاب قوموں سے ہے وہ کسی عالمی نظام حکومت کے قیام کی خاطر — خود اپنی وطن پرستی سے دست برداری کو خصوصیت کے ساتھ سب سے زیادہ کٹھن محسوس کریں گے۔

ہمارے سامنے ان مسائل کی ایک نظیر موجود ہے، چوتھی، تیسری اور دوسری صدی قبل مسیح میں یونان کی شہری ریاستوں کو اپنی بقا کے لئے ایک سیاسی وفاق (Political federation) کی بڑی شدید ضرورت لاحق ہوئی تھی، اور اسی طرح لاحق ہوئی تھی جس طرح آج ہمیں درپیش ہے، انھوں نے باہمی طور ایک متحرک اور تیز رو تجارت کا سلسلہ بھی باقاعدہ شروع کر رکھا تھا، ظاہر ہے کہ اس ارتباط کے بعد دوسرا قدم وحدت سیاسی (Political union) ہی کا تھا لیکن سیاسی وفاق کا نسخۂ کیمیا حاصل کرنے کے لئے یونان کے بڑے بڑے دانش وروں نے صدیوں جدوجہد کی، سینکڑوں جتن کر ڈالے، اپنی کوششوں کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، پھر بھی ناکام ہی رہے، آخر کیوں ناکام رہے؟ —— صرف اس لئے کہ عصبیت شہری کا غرور بیچ میں حائل تھا، ایتھنز والوں کو اپنے ایتھنز کی تاریخ ماضی پر بڑا گھمنڈ تھا، وہ اپنی شہری وفاداری کو کسی حال میں بھی، وسیع مملکت یونان کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ تھے، یہی حال کارنتھ والوں کا اور اسپارٹا والوں کا تھا، غرض یونان کے شہروں نے علحدہ علحدہ ایک مستقل وحدت ہونے کی وجہ سے وفاق کی اس مہم کو سر نہ ہونے دیا، مگر دوسری طرف یہی وفاق، بغیر کسی بڑی دشواری کے، کارتھیج، سیریا، مصر اور اٹالیہ کے شہروں میں، اپنی اپنی وسعت و حدود کے اندر، ان ہی صدیوں میں جنم لے رہا تھا،

شہنشاہیوں کے ان ہرادوں نے بالآخر خود یونان کے قدیم شہروں تک میں اپنے مفادات کی جڑیں مضبوط کرلیں، اور انھیں گہنا دیا، کیونکہ کارناموں کی کوئی تاریخ ماضی، ان جدید شہروں کی راہ میں بالکل حائل نہ تھی، وہ اپنے مسائل کا حل خود پیدا کرنے کے لئے پوری طرح آزاد تھے،

" وحدت عالم " کی مہم آج بھی انجام کو پہونچ سکتی ہے، مگر صرف ان ہی ملکوں کے ہاتھوں، جن کے باشندوں کے دماغ میں اپنے ماضی کی چند گنی چنی صدیوں کا فخر و غرور اور تعصب اور گھمنڈ بھرا ہوا نہ ہو،

وہ قومیں جن کے نزدیک قدیم نظریہ قومیت (nationalism) کسی خوشگوار تجربے کی سی حیثیت نہیں رکھتا، آج صرف وہی اس قابل ہو سکتی ہیں کہ دنیا کے سامنے اس کی مشکلات کا تازہ حل پیش کریں، وہ حل جس کی دنیائے حاضر کو انتہائی شدید ضرورت ہے، کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ آگے آنے والی یہ قومیں شاید امریکہ کے کینیڈین فرانسیسی (French canadian) اور ایشیا کے چینی ہوں ... ... اور

یہی کچھ کریں تو کریں،

وحدتِ عالم کی اس مہم کو یقیناً ایک دن انجام تک پہونچ کے رہنا ہے، اور بہر صورت و بہر نقطۂ نظر پسندیدہ یہی ہے کہ یہ مہم پُرامن طریقے سے، رضاکارانہ طور پر، انجام تک، پہونچے، ورنہ اگر صرف اتحاد ہی ہمارا مقصد نگاہ ہوتا کہ اب، جیسے بھی ہو اور جس قیمت پر بھی ہو، اسے حاصل ہی کر لیا جائے تو پھر ہٹلر کی اس پیش کش ہی کو نہ قبول کر لیتے کہ، آؤ بزور شمشیر سارے یورپ کو فتح کر کے متحد کر دیں،

اس اتحاد کی قیمت اگر بہت زیادہ اونچی ہوئی، تو دنیا ہرگز اس کو خریدنے کے لئے تیار نہ ہوگی۔ رومن امپائر نے ازمنۂ قدیم کی دنیا میں امن قایم کر دیا تھا، مگر یہ سب جانتے ہیں کہ یہ امن، روحانیت کی عظیم الشان بھینٹ چڑھنے کے بعد حاصل ہوا تھا، اور یہ بڑا مہنگا سودا تھا، مجھے یقین ہے کہ اخوت انسانیہ کا تصور اس وقت تک قطعی ناممکن العمل سی چیز ہے جب تک لوگ ایک خدائے مافوق الزمان و المکان (Transcendent God) کے عقیدہ و ایمان کے رشتے میں نہ منسلک ہو جائیں،

خود ہمارے اپنے مغربی تمدن (Western Civilization) کی بنیاد بھی اُن لوگوں کے ہاتھوں نہیں رکھی گئی تھی جو اقتصادی و معاشی ترقی، یا سیاسی وحدت وغیرہ قسم کی سی پست چیزوں کے طلب گار ہوں، یہ چیزیں تو ازمنۂ وسطیٰ میں رونما ہوئیں، اور اس زمین پر حکومت الٰہیہ قایم کرنے کی جد وجہد میں، نتائج کے طور پر اتفاقیہ رونما ہوئیں۔

یہ قطعی ہے کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کی وہ ساری تخلیقی جد وجہد، جو ہم نے خالص مادّی طریقے پر کی ہے، ناکام و نامراد ثابت ہو چکی، اور ہمارے تمام جرأت مندانہ عزایم نسخ بلکہ مضحکہ خیز ہو کر رہ گئے: ہم کہتے ہیں کہ محنت و مشقت سے بچانے والی ان مشینوں کے ایجاد و ترقی میں ہم نے بے انتہا کاوشیں اور جاں فشانیاں کی ہیں لہٰذا یہ ہمیں عزیز ہیں، لیکن اس ترقی کے جہاں اور طرح طرح کے نتایج رونما ہوئے ہیں وہاں ایک نتیجہ یہ بھی تو نکلا کہ آج عورتوں کے سر کاموں کا ہجوم اتنا زیادہ ہے کہ اتنا کبھی نہ ہوا تھا، آج کی عورتیں دوہرے کام کر رہی ہیں، ایک تو گھر کے اندر بیوی اور ماں بن کر، دوسرے باہر کسی دفتر یا کارخانے میں ملازم ہو کر،

یہ رجحان اور یہ روش یقیناً اُمید افزا نہیں ہے، تاریخ میں تفریق و تشتت اور پراگندگی کا زمانہ وہی رہا ہے جس میں عورتوں نے گھر چھوڑ دیئے، پانچویں صدی کے یونان کو تاریخ عالم کے معیاری زمانوں (Classical Periods) میں بڑا اونچا مقام حاصل ہے، اس عہد میں عورتیں گھروں کی ذمہ دار تھیں اور گھروں کے اندر ہی رہتی تھیں، لیکن عہد سکندر کے بعد، جبکہ شہری ریاستوں کا شیرازہ بکھر رہا تھا، تحریک آزادیٔ نسواں اسی زور شور کے ساتھ چل رہی تھی جیسے آج ہمارے عہد میں چل رہی ہے، پھر ہم نے معاشرتی خرابیوں اور بیماریوں کے لئے جو علاج تجویز کیا اور اس علاج کے دائرے سے خدا کو بالکل خارج کر کے جو جد وجہد شروع کی تو اس سے اور بھی زیادہ اندوہناک اور پُرہول قسم کی ناگہانیاں رونما ہو گئیں،

دنیا کے اکیس تمدنوں (Civilizations) کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ستے انسانیت عامہ کی محبت ہی دراصل تاریخ کی سب سے بڑی طاقت رہی ہے بشرطیکہ انسانیت

عامہ کی یہ محبت ــــ اور شدید محبت ــــ کے نتیجے کے طور پر دلوں میں پیدا ہوا۔"

بس آج ماڈرن دنیا کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ما فوق الفطرت عقیدہ و ایمان اس کے دل میں پھر سے پیدا ہو ورنہ اس کے بغیر یہ انسان ــــ اخلاق عالیہ سے معرا انسان ــــ ہرگز کسی اعتماد کے قابل نہیں ہے، اس کے ہاتھوں میں عمل گاہوں (dalaratories) کے پیدا کردہ خطرناک کھلونوں کو ہرگز چھوڑا نہیں جاسکتا۔

اس قسم کے مسیحی اقدار کی تجدید و احیاء اگر ممکن ہے تو صرف ان ہی قوموں کے ذریعے ممکن ہے جو پسماندہ (Back ward) کہلاتی ہیں اور جو بلفظ دیگر عصبیت و غرور اور خود پرستی (Self idolatory) کی اندھی تقلید کا شکار نہیں ہیں۔

بعض اُن قوموں میں، جنھوں نے حال حال میں مسیحی مذہب کی روحانیت کا مفہوم سمجھا اور اسے قبول کیا ہے، بڑی بڑی طاقتیں اور صلاحیتیں پنہاں ہیں، مثلاً امریکن حبشی اور خانماں برباد لوگوں (Displaced persons) کے افراد، یا افریقہ اور ایشیا کے ان ممالک کے باشندے جن کو کبھی کوئی موقع و منصب پہلے میسر نہیں آیا۔ یہ صرف تاریخی ہی نہیں بلکہ انجیلی صداقت بھی ہے کہ "خلافت ارضی کے وارث ضعفا ہوں گے"

مگر اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہماری وہ قومیں جن کو آج سب کچھ حاصل ہے، علحدہ اور سبکدوش ہوجائیں، ہٹ جائیں، یہ واقعہ کہ بعض پہلی تہذیبیں بھی اس قسم کے مسائل کو حل کرنے میں اسی طرح ناکام رہی ہیں جس طرح آج ہم ناکام ہیں، کسی طرح بھی اس نتیجہ کا حامل نہیں سمجھا جاسکتا کہ "ہمارا بھی حشر وہی ہو جو اُن کا ہوا"

ہم اب بھی اپنے مستقبل کی تعمیر و تشکیل بدستور کرسکتے ہیں۔ اب چاہے "شر" کے لئے کریں یا "خیر" کے لئے، "بقاء" کے لئے کریں یا خودکشی و فنا" کے لئے ــــ میں بحیثیت مورخ اگر کسی امر کی بابت کوئی قطعی رائے رکھتا ہوں تو وہ یہی ہے کہ "تاریخ کبھی خود بخود واقع نہیں ہوجایا کرتی بلکہ لوگوں کے آزادانہ عزائم اور فیصلے اس کو وجود میں لاتے ہیں، اب یہ فیصلے چاہے اپنے افراد کے پیش نظر، حوصلہ مندانہ ہو یا بزدلانہ ❊

(ڈائجسٹ، اگست ۱۹۴۹ء)

ــ فاضل مضمون نگار نے اپنے مضمون میں "ترقی" اور "روحانیت" اور "امن و سکون" کی جس ضرورت پر زور دیا ہے، اُس کی تکمیل اسلامی نظام حکومت کرتا ہے!

(م - ق)

ماہر القادری

نقد و نظر

"شعر" پر ——!

معیاری تنقید کے چند نمونے!

ہر تحریک کا اپنا منفرد مزاج اور اُس کے خاص رجحانات ہوتے ہیں اور انھی رجحانات کے اردگرد اُس کے ادبی، سیاسی، معاشی اور سماجی تصورات گھومتے رہتے ہیں —— "شکست و ریخت"، "توڑ پھوڑ"، "بے چینی پھیلاؤ اور اُس سے فائدہ اُٹھاؤ" —— یہ چیز "کمیونزم" کا عین مزاج ہے، یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے لئے کسی ثبوت و برہان کی ضرورت نہیں ہے، کمیونزم کے ماضی اور حال کی تاریخ دنیا کے سامنے ہے، اب کوئی بصیرت اور بصارت سے بالکل ہی محروم ہوچکا ہو تو دوسری بات ہے ورنہ چشمِ بینا کمیونزم کی تاریخ کو ہر وقت پڑھ سکتی ہے!

ہم روسی زبان نہیں جانتے اور اُس کا جو لٹریچر ہم تک پہونچا ہے وہ انگریزی زبان کے واسطے سے پہنچا ہے، ترجمانی ناقص اور ادھوری بھی ہوسکتی ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ بیچ والوں نے کسی کسی جام میں اپنی طرف سے "کچھ ملا دیا ہو" —— ہمارے سامنے اُردو زبان کا "ترقی پسند ادب" ہے اور اسی پر ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

اس بات کو ہر کوئی جانتا ہے کہ اُردو زبان میں "ترقی پسند ادب" کے موجد، بانی حامل اور علمبردار وہی اہلِ قلم اور اربابِ فکر ہیں جو یا تو پورے "کمیونسٹ" ہیں یا کمیونزم سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہیں، اُردو کی سرزمین میں نام نہاد "ترقی پسندی" کا بیج انھی اشتراکیت زدوں نے بویا تھا اور اس بیج سے جو پودا اُگا ہے اس کی مرجھائی ہوئی ڈالیوں پر یہی لوگ پانی چھڑک رہے ہیں۔

اوپر کہا جاچکا ہے کہ "توڑ پھوڑ" کمیونزم کا مزاج ہے اس لئے کمیونسٹ لٹریچر میں بھی لازمی طور پر اسی قسم کے رجحانات، داعیات اور محرکات پائے جاتے ہیں —— بے اعتدالی عدمِ توازن، مار دھاڑ کی ترغیب، خونیں انقلاب کی دعوت، سازشوں کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرنا، فحاشی اور بدکاری کا پرچار، خدا اور مذہب کے خلاف بغاوت اور بیزاری —— انھی تصورات کے تانے بانے سے "اشتراکی ادب" تیار ہوتا ہے!

کیمونزم کی فطرت ہی خشونت اور جھنجلاہٹ ہے اس لئے اُس کا ادب نرمی نزاکت اور صلح و آشتی سے محروم ہے، کیمونزم " توڑ پھوڑ " کی دعوت دیتا ہے لہٰذا اس کے لٹریچر میں تعمیری عناصر کی کمی بلکہ فقدان نظر آتا ہے، کیمونسٹ ادب میں " بناؤ " سے زیادہ " بگاڑ " پایا جاتا ہے، کیمونزم کے پاس نشتر تو ہے مگر مرہم نہیں ہے، وہ فصد کھولنا تو جانتا ہے مگر نشتر زدہ رگ کے خون کو بند کرنے کی تدبیر اُسے معلوم نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ کیمونزم مجاہدوں کے ہاتھوں میں تلوار تو دیتا ہے لیکن " قرآن " نہیں دیتا، دے کہاں سے ؟ اُس کے پاس ہے ہی نہیں ! یُوں سمجھو کہ وہ " رفع نزاع " اور " بسطِ امن " کے باہمی ربط اور ان کے توازن کے فلسفہ ہی سے نا آشنا ہے !

جس طرح انسانی جسم میں تناسبِ اعضا سے حُسن پیدا ہوتا ہے یہی حال شعر و ادب کا بھی ہے کہ لفظوں کا تناسب، عبارت کو موزوں اور حسین بناتا ہے ——— اور " کیمونزم " کو سب سے زیادہ بیر " تناسب " اور " اعتدال " ہی سے ہے اس لئے اُردو کا " ترقی پسند ادب " جو کیمونزم کا ساختہ پرداختہ ہے، ظاہری اور باطنی حُسن سے یکسر محروم ہے اُس میں بے ربطی ہے، ژولیدگی ہے بے ڈھنگا پن ہے، شتر گربگی اور کجی ہے! اس " ترقی پسندی " نے بیچاری اُردو زبان کے حلیہ کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے، تسنیم و کوثر میں دُھلی ہوئی زبان پر ان " انقلابیوں " نے نجاست کی تہیں جما دی ہیں۔

ان " ترقی پسندوں " کے اعصاب پر بھوک اور شہوت کا بھوت سوار ہے، اس لئے " اظہارِ ہوس " کا سلیقہ بھی ان کو نہیں ہے، یہ " زہرِ عشق " بھی نہیں لکھ سکتے ہاں ! " لحاف " اور " بُو " تصنیف کر سکتے ہیں، غزالانِ ختن کی کلیلوں کی تصویر کشی ان سے نہیں آتی ہاں ! کتوں اور ریچھوں کے جنسی اختلاط کی مُصوری فرما سکتے ہیں۔..... غالب نے یہ کوئی اچھا شعر نہیں کہا

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

مگر " فرائڈ " کے یہ عقیدت مند اس " پیش دستی " کی اشاریت پر بھی بس نہیں کرتے وہ " پیش دستی " کی تفصیل مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ جبینِ غیرت عرق عرق ہو جاتی ہے، پچھلے شعراء " معشوقوں " کو اپنے حُسنِ تخیل کے زور سے طرح طرح کے خوش نما لباس پہناتے تھے، وہاں جھومتے ہوئے موباف، اڑتے ہوئے آنچل، سمٹے ہوئے دوپٹے، اور جھرد کے اور چلمنیں تھیں مگر یہ ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار، معشوقوں کے جسموں سے لباس نوچ نوچ کر اُن کو ننگا کئے دیتے ہیں ——— نظام رام پوری کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

اس میں " لطفِ ہوس " کے ساتھ ساتھ " شرم و غیرت " کا بھی ایک پہلو ہے، کوئی " ترقی پسند " شاعر ہوتا تو وہ یُوں نہ کہتا کہ ـــ دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ ..... بلکہ وہ اس طرح اظہار خیال کرتا

کہ "مجھے دیکھ کر اُس نے اپنے سینہ کو اور اُبھار دیا۔"

جن شعراء کے خیالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اخلاقی نقطۂ نگاہ سے وہ اشعار کچھ مستحسن نہیں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اُن میں پھر بھی ایک طرح کا حجاب، شرم و حیا، رمزیت، اشاریت، اجمال اور دبے دبے جذبات ہیں لیکن اِن "ترقی پسندوں" نے تو اس "افشردہ" میں اور نجاست گھول دی ہے، آدمی سے بھول چوک بھی ہو سکتی ہے، وہ ہوائے ہوس پر بھی اُتر آتا ہے مگر یہ "ترقی پسند" اس تاک جھانک، اور چھیڑ چھاڑ، کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ "لغزش گاہ گاہ" آخر کیا چیز ہے آدمی کو پُورا "شیطان" ہونا چاہیئے!

شعر و ادب کے بارے میں "ترقی پسند" ایسے ایسے عجیب و نادر نظریوں کو جنم دیتے ہیں کہ سنئے تو ہنسی کے مارے لوٹ لوٹ جائیے۔ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" یہ ضرب المثل ان پر پُوری طرح صادق آتی ہے، جس بات میں جتنی زیادہ اعجوبیت، بے دانشی اور ژولیدگی ہوگی، وہ بات ان لوگوں کے نزدیک اتنی ہی "ترقی یافتہ" سمجھی جائے گی، ہم نے بے عقلوں اور پاگلوں کو بھی دیکھا ہے مگر دماغوں کے سانچے اس طرح تو نہیں اُلٹ جایا کرتے ——— اب سے چند سال قبل "غزل" کے بارے میں "ترقی پسندوں" کی بارگاہ سے یہ فتویٰ شائع ہوا تھا کہ "غزل" جاگیردارانہ دور کی یادگار ہے اور اب نئی بات یہ سننے میں آرہی ہے کہ "غزل" شاعری کی کوئی صنف نہیں ہے! قربان اور نچھاور ہو ہو جائیے اس فکر و دانش کے! یہ لوگ "جنس" "نوع" اور "صنف" کی معمولی اصطلاحات سے بھی واقف نہیں ہیں اور دعوے اتنے بڑے بڑے گویا کہ "افلاطون" اپنی عبا انھی حضرات کو اُڑھا گیا ہے!

؎ بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو!

اس کاداک ذہنیت کے افراد کو ہم قابلِ خطاب ہی نہیں سمجھتے، مگر افہامِ عام کے لئے عرض کرتے ہیں کہ "شاعری" (کلی اور مجموعی طور پر) "جنس" ہے، رزمیہ اور بزمیہ شاعری اُس کی "انواع" ہیں، اور غزلؔ قصیدہ رباعی وغیرہ "اصناف" ہیں!

"غزل" سے ان نام نہاد "ترقی پسندوں" کو بیر کس لئے ہے؟ جی "غزل" ہی سے نہیں ہر "بنی بنائی چیز" اور ہر "تعمیر" سے ان کو عداوت ہے ؎ مقتضائے طبیعتش این است والا مضمون ہے، ہر "بناؤ" ان کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے "بگاڑ" اور "فساد" ان کی فطرت بن چکا ہے، یہ بیچارے اپنی طبیعت اور فطرت سے مجبور ہیں ——— اور یہ بھی ہے کہ "غزل" فکر و ذہن کا سلجھاؤ، خیال و اظہار (Idea and Expression) میں ربط، الفاظ کا برمحل استعمال اور توازن چاہتی ہے، اور یہ جنس ان کے بازاروں میں ڈھونڈے نہیں ملتی، یہ ان کا "عجز" "نارسی" "پسپائی" اور "احساسِ کمتری" ہے جو جھنجلا جھنجلا کر "غزل" کے خلاف آوازے بلند کرتا اور طرح طرح کی بولیاں بولتا ہے، یہ اُس کوز پشت بڑھیا کی طرح ہیں جو چاہتی تھی کہ اُس کی پیٹھ تو سیدھی نہ ہو مگر دوسرے اُس کی طرح کبڑے ہو جائیں۔

ان "ترقی پسندوں" کی "سمرو پابُریدہ" "شاعری دیمک ورس" اُردو بولنے والوں میں فروغ نہ پا سکی حالانکہ اُس کی ——— "ٹیپ ٹک" سمجھاتے سمجھاتے ان کے منہ میں جھاگ آ گئے دل و دماغ اس "بکواس" کو قبول نہیں کرتے، وہ اُن کے جذبات کو اپیل نہیں کرتی

کسی قسم کی جاذبیت اور کشش نہیں ہے ــــــ پس اس پر ان کو جھنجلاہٹ آتی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور شکست خوردہ ذہنیت "غزل کے مقابلہ پر اپنا پھٹا ہوا لنگوٹ کس کر بار بار میدان میں آن دھمکتی ہے ــــــ ان لوگوں کو اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے کہ اُن کی تمام "رومان آفریں" شاعری، غالب کے تنہا اس مصرعہ کا جواب پیش نہ کرسکی

؎ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

وہ جانتے ہیں کہ اُن کی تمام باغیانہ اور انقلابی نظمیں، ایک طرف اور اقبال کا یہ شعر ایک طرف :ــــ

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

ان گنتی کے چند شعروں پر اُن کے سیکڑوں "ماوراء" اور ہزاروں "نقشِ فریادی" بے دریغ قربان کئے جاسکتے ہیں:ــ

(۱) شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا (امیر مینائی)

---

(۲) چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہوجائے (اصغر گونڈوی)

---

(۳) اے شمع! تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح (ناطق لکھنوی)

---

(۴) بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے (حفیظ جونپوری)

---

(۵) خارِ حسرت بیان سے نکلا دل کا کانٹا زبان سے نکلا (داغ دہلوی)

بے دانشی اور کور ذوقی کی انتہا ہے کہ اُن "تنک بندوں" کی شاعری اور اُس کے آرٹ پر مضامین لکھے جاتے ہیں جن کو شعر گوئی کا سلیقہ ہی نہیں ہے اور اگر تھوڑا بہت ہے تو وہ اس نام نہاد "ترقی پسندی" کی لپیٹ میں آکر "کاواک" بن چکا ہے ــــــ ان لوگوں نے "دھڑے بندی" قایم کر رکھی ہے، آپس میں ایک دوسری کی شاعری اور انشاپردازی پر مضامین لکھتے ہیں، پروپیگنڈے کا فن ان کو خوب آتا ہے اور اسی پروپیگنڈے کے زور پر انھوں نے اُن لوگوں کو "صدر" میں بٹھا دیا ہے جو صفِ نعال میں بھی مشکل ہی سے بیٹھنے کے قابل ہیں، تعصب، پارٹی بندی اور جانبداری میں پادریوں، پنڈتوں اور مولویوں اور ملّاؤں کو ان "ترقی پسندوں" نے کوسوں پیچھے چھوڑ دیا، اپنے ٹھیکروں کو یہ لوگ مانجھ مانجھ کر بازار میں لاتے ہیں اور دوسروں کے لعل و گوہر کو چاہتے ہیں کہ گمنامی کے گرد و غبار میں دبے پڑے رہیں اور اُس پر دعوے یہ کہ ہم طبقوں اور فرقوں کی تعصب آمیز تقسیم کو مٹا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ خود انتہا درجہ کے متعصب فرقہ پرست اور گروہ ساز واقع ہوئے ہیں۔

تنقید نگاری

ان نام نہاد "ترقی پسندوں" نے اُردو ادب میں "فن تنقید" کی بھی مٹی پلید کر رکھی ہے، ان کے تنقیدی مضامین پڑھئے آپ کو محسوس طور پر بے ربطی، ژولیدگی اور پریشان خیالی نظر آئے گی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہنا چاہتے ہیں ——— بس "سماج" "پرولتاری" "بوژروا" "پس منظر" "قدریں" اور اسی قسم کی چند اصطلاحیں ہیں جو بار بار بیان کی جاتی ہیں اور کچھ نہیں کھلتا کہ لکھنے والے کا آخر منشا اور مقصود کیا ہے، پورا مضمون ایک گورکھ دھندا اور چیستاں نظر آتا ہے!

"تنقید" کا فن سچ مچ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، یہ احساسِ ذمہ داری، دیانت اور اصابتِ رائے کے ساتھ ساتھ وسعتِ مطالعہ بھی چاہتا ہے ——— فکری اور نظری مطالعہ! کتابوں ہی کا نہیں صحیفۂ فطرت کا بھی! تنقید نگار کے فکر و ذہن کا مربوط اور سلجھا ہوا ہونا بہت ضروری ہے!

کتابوں کا مطالعہ خود اپنی جگہ ایک فن ہے، ہر شخص میں "مطالعہ" کی خاطر خواہ صلاحیت اور استعداد نہیں ہوتی، بہت سے لوگ کتاب تو پڑھتے ہیں مگر اُس کے مضامین کو ہضم نہیں کر سکتے، اس کے ماسوا کتاب پڑھنے والے میں اس چیز کی بھی صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ صاحب کتاب کی رائے اور مشورت میں موازنہ اور محاکمہ کر سکے، اس کی اپنی گرہ میں عقل بھی ہونی ضروری ہے، یہ نہ ہو کہ ذہن و فکر کتابی مضامین ہی کے بالکل پابند اور نرے غلام ہو کر رہ جائیں، دوسروں کے اقوال کا نقل کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور یہ "نقل" بھی اُس "وجدان" کو چاہتی ہے جو دوسروں کے اقوال اور ملفوظات میں امتیاز اور انتخاب کر سکے۔ ہر "قول" دہرائے جانے اور بیان کئے جانے کے قابل نہیں ہوتا، کتابوں میں مہمل باتیں بھی لکھی ہوتی ہیں، مصنفوں کے پائے قلم سے لغزش بھی ہو جاتی ہے!

شاعری پر تنقید کرنا اور بھی زیادہ دشوار اور نازک تر کام ہے، اگر تنقید نگار شاعر نہ ہو تو کم سے کم اُس کا مزاج تو شاعرانہ ہو، اُس کے قلم میں روانی اور شگفتگی کا ہونا نہایت ضروری ہے، اور ساتھ ہی اُس کے وجدان کو شعر کے حُسن و قبح کا نباض ہونا چاہیئے۔

علامہ شبلی نعمانی کی "تنقید" میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم نظر آتی ہیں، یہ نام نہاد "ترقی پسند" جو "ترقی" اور "جدت" کے دعویدار ہیں شبلی کی گرد کو بھی نہیں پہونچ سکتے، شبلی نعمانی کی روانیِ بیان اور زورِ کلام کے سامنے یہ لوگ "طفلِ مکتب" نظر آتے ہیں، وہ جن کی زبان ابھی تک تتلاتی ہو اور جن سے لفظوں کے ٹھیک طرح ہجے کرنے بھی نہ آتے ہوں۔

شبلی نعمانی نے بھی مشرق و مغرب کے ناقدین اور اربابِ فکر سے استفادہ کیا ہے اور اُنکی آراء اپنی کتابوں میں نقل کی ہیں ——— مگر انہوں نے شاخ شاخ سے پھولوں کو چُنا ہے یہ نہیں کیا کہ پھولوں اور کانٹوں کو گڈ مڈ کر کے اُن کا پشتارہ باندھ لیا ہو، شبلی نے خزف ریزوں کے ڈھیر سے موتی رول رول کر اُن کی دیدہ زیب مالائیں تیار کی ہیں اسی لئے ان کی تنقید کی ہر سطر "عقد الفرید" بن کر رہ گئی ہے ——— اس کی مثالیں ملاحظہ کیجئے:-

احساس کیا ہے؟

"احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں ہے، اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی موثر واقعہ پیش آتا ہے

تو وہ متاثر ہو جاتا ہے، غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے، خوشی میں سرور ہوتا ہے، حیرت انگیز بات پر تعجب ہوتا ہے، یہی قوت جس کو احساس انفعال یا فیلنگ سے تعبیر کر سکتے ہیں، شاعری کا دوسرا نام ہے، یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے تو شعر بن جاتا ہے ——— حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً شیر گونجتا ہے، مور جھنکارتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں، انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعہ سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی، اس لئے جب اس پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں، اسی کا نام "**شعر**" ہے!

خطابت اور شاعری کا فرق!

خطابت اور شاعری کے فرق کو کس قدر دل نشین اور نفسیاتی انداز میں ظاہر کیا گیا ہے :—

"حقیقت میں شاعری اور خطابت بالکل جدا جدا چیزیں ہیں، خطابت کا مقصود حاضرین سے خطاب کرنا ہوتا ہے، اسپیکر حاضرین کے مذاق، معتقدات اور میلانِ طبع کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کے لحاظ سے تقریر کا ایسا پیرایہ اختیار کرے جس سے ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکے اور اپنے کام میں لائے، بخلاف اس کے شاعر کو دوسروں سے غرض نہیں ہوتی وہ نہیں جانتا کہ کوئی اُس کے سامنے ہے بھی یا نہیں؟ اُس کے دل میں جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ بے اختیار ان جذبات کو ظاہر کرتا ہے جس طرح درد کی حالت میں بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے، بے شبہ یہ اشعار اوروں کے سامنے پڑھے جائیں تو اُن کے دل پر اثر کریں گے، لیکن شاعر نے اس غرض کو پیش نظر نہیں رکھا تھا، جس طرح کوئی شخص اپنے عزیز کے مرنے پر نوحہ کرتا ہے تو اس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ لوگوں کو سنائے لیکن اگر کوئی شخص سن لے تو ضرور تڑپ جائے گا۔"

مصوری اور شاعری کا فرق!

مصوری اور شاعری کا فرق "صاحبِ شعر العجم" نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے :—

"ایک بڑا فرق عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں یہ ہے کہ تصویر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ جس چیز کی تصویر کھینچی جائے اُس کا ایک ایک خال و خط دکھایا جائے ورنہ تصویر ناتمام اور غیر مطابق ہوگی، بخلاف اس کے شاعرانہ مصوری میں یہ التزام ضروری نہیں، شاعر اکثر صرف اُن چیزوں کو لیتا ہے اور اُن کو نمایاں کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات پر اثر پڑتا ہے، باقی چیزوں کو وہ نظر انداز کرتا ہے یا ان کو دھندلا رکھتا ہے کہ اثر اندازی میں اُن سے خلل نہ آئے، فرض کرو ایک پھول کی تصویر کھینچنی ہو تو مصور کا کمال یہ ہے کہ ایک ایک پنکھڑی اور ایک ایک رگ و ریشہ دکھائے، لیکن شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں، ممکن ہے کہ وہ ان چیزوں کو اجمالی اور غیر نمایاں صورت میں دکھائے تاہم مجموعہ سے وہ اثر پیدا کر دے جو اصلی پھول کے دیکھنے سے پیدا ہو۔

ایک اور بڑا فرق، مصوری اور محاکات میں یہ ہے کہ مصور کسی چیز کی تصویر کھینچنے سے زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو خود اس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا، لیکن شاعر باوجود اس کے کہ تصویر کا ہر جز نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے زیادہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے، سبزہ پر شبنم دیکھ کر وہ اثر نہیں پیدا ہو سکتا جو اس شعر سے ہو سکتا ہے،

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

تصویر کا اصلی کمال یہ ہے کہ اصل کے مطابق ہو اور اگر مصوّر اس امر میں کامیاب ہو گیا تو اُس کو کامل فن کا خطاب مل سکتا ہے، لیکن شاعر کو اکثر موقعوں پر دو مشکل مرحلوں کا سامنا ہوتا ہے یعنی نہ اصل کی پوری پوری تصویر کھینچ سکتا ہے کیونکہ بعض جگہ اس قسم کی پوری مطابقت احساسات کو برانگیختہ نہیں کر سکتی، نہ اصل سے زیادہ دور ہو سکتا ہے ورنہ اس پر اعتراض ہوگا کہ صحیح تصویر نہیں کھینچی، اس موقع پر تخئیل سے کام لینا پڑتا ہے، وہ ایسی تصویر کھینچتا ہے جو اصل سے آب تاب اور حسن و جمال میں بڑھ جاتی ہے لیکن وہ قوت تخئیل سے سامعین پر یہ اثر ڈالتا ہے کہ یہ وہی چیز ہے، لوگوں نے اسکو امعان نظر سے نہیں دیکھا تھا اس لئے اس کا حسن پورا نمایاں نہیں ہوا تھا،

تخئیل (IMAGINATION) پر صرف چند سطریں "شعر العجم" سے پیش کی جاتی ہیں :-

" چاند کی نسبت ایک ہیئت داں کو ان مسائل سے غرض ہے کہ وہ کن عناصر سے بنا ہے؟ آباد ہے یا ویران؟ روشن ہے یا تاریک؟ سمندر کے مدوجزر سے اس کو کیا تعلق ہے؟ وغیرہ وغیرہ لیکن شاعر کو چاند سے صرف یہ غرض ہے کہ وہ معشوق کا روئے روشن ہے،

شاعر کے سامنے (قوت تخئیل کی بدولت) تمام بے حس اشیا، جاندار چیزیں بن جاتی ہیں، اس کے کانوں میں ہر طرف سے خوش آیند صدائیں آتی ہیں، زمین آسمان ستارے بلکہ ذرہ ذرہ اُس سے باتیں کرتا ہے،

قوت تخئیل کے ذریعہ سے اکثر شاعر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے اور خیالی دلائل پیش کرتا ہے، ممکن ہے کہ ایک منطقی اس دلیل کو تسلیم کرے لیکن جن لوگوں کو وہ قوت تخئیل کے ذریعہ سے معمول کر لیتا ہے وہ اس کے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں کر سکتے، مثلاً ایک شاعر کہتا ہے،

دوش از برم چو رفتی اگر نگشتم آرے　　عمرے در رفتن عمر آواز پا نہ دارد

یعنی معشوق جو گود ہی سے نکل کر چلا گیا تو مجھکو خبر نہیں ہوئی، کیونکہ معشوق عاشق کی زندگی ہے، اور زندگی کے جانے کے وقت جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی، اس دلیل کے دو مقدمے ہیں، " معشوق عاشق کی زندگی ہے" " زندگی کے جانے کی آہٹ نہیں معلوم ہوتی" ان دونوں میں سے تم کس کا انکار کر سکتے ہو،

محاکات

" محاکات " پر علامہ شبلی نعمانی نے جو کچھ لکھا ہے، وہ خود اپنی جگہ ایک " صحیفۂ تنقید " ہے! مولانا شبلی نے ان جابوں کو اس قدر احتیاط و نرمی کے ساتھ چھوا ہے کہ حباب ٹوٹنے نہیں پائے :-

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن ایک صحبت میں کسی نے کلیم کا یہ شعر پڑھا،

سر بہ بستان چو دہد جلوۂ لیغائی را　　اول از سرو کند جامۂ رعنائی را

والد مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے، میں نے کہا کپڑا اتارنے کو جامہ کشیدن بھی کہتے ہیں اس لئے شاعر اگر کند کے بجائے " کشد " کہتا تو زیادہ فصیح ہوتا، جامہ کندن گو صحیح ہے لیکن فصیح نہیں، سب چپ ہو گئے، والد مرحوم نے ذرا سوچ کر کہا کہ " نہیں یہی لفظ (کند) شعر کی جان ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق باغ میں جب غارتگری کی شان دکھاتا ہے تو پہلے سرو کی رعنائی کا باس اتار لیتا ہے، لباس اتارنے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ

مثلاً کوئی شخص گرمی وغیرہ کی وجہ سے کپڑا اُتار کر رکھدے یا اُس کا نوکر اُتار لے، دوسری یہ کہ سزا کے طور پر کسی کے کپڑے اُتروالئے جائیں یا نچوالئے جائیں فارسی میں ان کے لئے دو مختلف لفظ ہیں، جامہ کشیدن، اور جامہ کندن، چونکہ یہاں مقصود یہ ہے کہ معشوق، ذلت کے طور پر رقیب کا کپڑا اُتار لیتا ہے اس لئے یہاں جامہ کندن کا لفظ جامہ کشیدن سے زیادہ موزوں ہے، تمام حاضرین نے اس توجیہ کی بے ساختہ تحسین کی،

علی قلی کا یہ شعر ہے،

بگذشت ز پیشِ من و غیرش بہ حکایت　　　پیچید کہ ہرگز نتواند بہ قفا دید

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق سامنے سے جا رہا تھا، رقیب بھی ساتھ تھا، اُس نے اس طرح اس کو باتوں میں لگا لیا کہ معشوق مڑ کر پیچھے نہ دیکھ سکا (ورنہ شاید میری طرف بھی اُس کی نگاہ پڑ جاتی) "پیچید" کے لفظ سے واقعہ کی صورت جس طرح ذہن میں آجاتی ہے اور کسی لفظ سے نہیں آسکتی،

سکندر نے جب دارا کو برابری کے دعوے سے خط لکھا ہے تو دارا کو سخت رنج اور حیرت ہوئی، اس موقع پر نظامی کہتے ہیں،

بخندید و گفت اندراں زہر خند　　　کہ افسوس بر کار چرخ بلند
فلک بیں چہ ظلم آشکارا کند　　　کہ اسکندر آہنگ دارا کند

جو کوئی کمینہ شخص کسی معزز آدمی سے برابری کا دعویٰ کرتا ہے، تو بعض وقت اُس کو غصہ میں ہنسی آجاتی ہے، یہ ہنسی، رنج، غصہ، اور حیرت کا گویا مجموعہ ہوتی ہے، فارسی میں اس ہنسی کو زہرخند کہتے ہیں، دارا پر سکندر کے خط سے جو حالت طاری ہوئی، زہرخند کے لفظ کے سوا اور کسی طریقہ سے اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتی تھی، اسی طرح خاص خاص محاورے اور اصطلاحیں، خاص خاص مضامین کے لئے مخصوص ہیں، ان مضامین کو ان کے سوا اور طریقہ سے ادا کیا جائے تو پوری محاکات نہیں ہو سکتی،

محاکات کے کمال کے لئے عالم کائنات کی ہر قسم کی چیزوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے، شاعر کبھی لڑائیوں اور معرکوں کا حال لکھتا ہے، کبھی قوموں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچتا ہے، کبھی جذباتِ انسانی کا عالم دکھاتا ہے، کبھی شاہی درباروں کا جاہ و حشم بیان کرتا ہے، کبھی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑوں کی سیر کرتا ہے، اس حالت میں اگر اس نے عالم کائنات کا مشاہدہ نہ کیا ہو اور ایک ایک چیز کی خصوصیات اور قابلِ انتخاب باتوں کو دقت آفرینی سے نہ دیکھا ہو، تو وہ ان مرحلوں کو کیونکر طے کر سکتا ہے، شکسپیر تمام دنیا کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لوگوں کے اخلاق و عادات کی تصویر کھینچی ہے اور اس طرح کھینچی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، اس شرط کی کمی کی وجہ سے بڑے بڑے شعرا کے کلام میں علانیہ رخنے نظر آتے ہیں نظامی خدائے سخن ہیں تاہم دارا کے خط میں جو سکندر کے نام تھا لکھتے ہیں،

دگر نہ چنانت دہم گوش پیچ　　　ورنہ میں تیرے ایسے کان ملوں گا
کہ دانی تو ہیچی و کمتر ز ہیچ　　　کہ تو جان جائے کہ تو ناچیز سے بھی ناچیز ہے

نظامی گوشہ نشین شخص تھے، شاہی درباروں میں آنے جانے کا کم اتفاق ہوا تھا، شاہانہ آداب اور طریق

گفتگو سے واقف نہ تھے، اس لئے وہی عام بازاری لفظ "گوش پیچ" (کان اینٹھنا) لکھ گئے، اس نقص کی وجہ سے واقعہ کی صحیح تصویر نہ اتر سکی، بخلاف اس کے فردوسی نے سیکڑوں ہزاروں مختلف واقعات لکھے ہیں لیکن کہیں اس فرض کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں جانے پاتا، متعدد اور مفصل مثالیں آگے آئیں گی یہاں صرف مطلب کے ذہن نشین کرنے کے لئے ہم ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں، :-.....

ایرانیوں کی روایت ہے کہ فریدوں نے اپنے بیٹوں کی وصلت شاہِ یمن کی لڑکیوں سے کرنی چاہی چنانچہ قاصد کو پیغام دیکر شاہِ یمن کے پاس بھیجا شاہِ یمن نے اپنے درباریوں سے کہا کہ تین صورتیں ہیں، اگر قبول کرلوں تو مجھکو سخت صدمہ ہوگا، اگر جھوٹ وعدہ کرلوں تو یہ شان سلطنت کے خلاف ہے، انکار کردوں تو فریدوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں،

فردوسی مجوسی النسل تھا اور قومیت کا اس کو سخت تعصب تھا چنانچہ جہاں جہاں عرب کا نام آتا ہے انکو حقیر کرنا چاہتا ہے، تاہم چونکہ شاعری کے فرض کا خیال تھا اور عرب کے کیرکٹر (اندازِ طبیعت) سے واقف تھا، اس لئے درباریوں کی زبان سے کہتا ہے:

کہ ما ہمگنان کیں نہ بینیم رائے	ہم لوگوں کی یہ رائے نہیں
کہ ہر باد را تو بہ جنبی زجائے	کہ جو ہوا چلے آپ کو ہلا دے
اگر شد فریدوں چنیں شہریار	فریدوں بادشاہ ہے تو ہو
نہ ما بندگانیم باگوشوار	ہم بھی کچھ اس کے حلقہ بگوش غلام نہیں ہیں
سخن گفتن و رنجش آئین ماست	گویائی اور جھلاہٹ ہماری فطرت ہے،
عنان و سناں باختن دین ماست	گھوڑا دوڑانا اور برچھی چلانا ہمارا دین ہے
بہ خنجر زمیں را میستان کنیم	ہم زمین کو تلوار سے لال کردیں گے
بہ نیزہ ہوا را نیستان کنیم	اور برچھیوں سے ہوا کو نیستاں بنادیں گے

یہ باتیں عرب کا خاص کیرکٹر ہیں، عرب، کسی دوسری قوم کو، گو کسی درجہ کا ہو، بیٹی دینا عار سمجھتے تھے، اس لئے گو بادشاہ نے مصلحت ملکی سے فریدوں کی درخواست کا رد کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن، درباریوں نے وہی آزادانہ جواب دیا جو عرب کی طینت اور ان کا جوہر ہے:

محاکات میں نہایت فرق مراتب ہے اور اسی فرقِ مراتب کی بنا پر شاعری کے مدارج میں نہایت تفاوت ہے، اس کو پہلے محسوسات کے ذریعے سے ذہن نشین کرو مثلاً اگر سوتے ہوئے شخص کی تصویر کھینچی جائے تو ایک معمولی مصور تصویر میں صرف اس قدر دکھائے گا کہ آنکھیں بند ہیں، جس سے ظاہر ہو کہ وہ شخص سو رہا ہے، لیکن ایک دقیقہ رس مصور ان خصوصیتوں کا بھی لحاظ رکھے گا کہ کس قسم کی نیند ہے؟ گہری ہے یا معمولی؟ یا نیم خوابی؟ اس سے بڑھکر اس بات کو بھی ملحوظ رکھے گا کہ سونے کی حالت میں اعضاء کی جو حالت ہے، وہ بھی نمایاں کی جائے، بے خبری میں لباس اور اعضاء کی حالت یا ہیئت میں جو بے ڈھنگا پن پیدا ہو جاتا ہے وہ بھی ظاہر ہو، بچوں، جوانوں، عورتوں اور مردوں کی نیند میں جو فرق ہے اس کی خصوصیات بھی نظر آئیں، اسی طرح جس قدر زیادہ فنِ تصویر میں کمال ہوگا اسی قدر تصویر میں باریکیاں پیدا ہوتی جائیں گی:

" یونان میں ایک دفعہ ایک مصوّر نے ایک آدمی کی جس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے تصویر بنا کر موقع عام پر آویزاں کی، تصویر اس قدر اصل کے مطابق تھی کہ پرندا انگور کو اصلی سمجھ کر اس پر گرتے تھے اور چونچ مارتے تھے، تمام نمائش گاہ میں غل پڑ گیا اور لوگ ہر طرف سے آآکر مصوّر کو مبارک باد دینے لگے؛ لیکن مصوّر روتا تھا کہ تصویر میں نقص رہ گیا، لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کمال ہو سکتا تھا، مصوّر نے کہا بے شبہ انگور کی تصویر اچھی بنی ہو لیکن جس آدمی کے ہاتھ میں انگور ہے اس کی تصویر اچھی نہیں ورنہ پرندا انگور پر ٹوٹنے کی جرأت نہ کرتے،"

تخئیل کی تفصیلی بحث

" اگرچہ محاکات اور تخئیل دونوں شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہو کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہو محاکات میں جو جان آتی ہو تخئیل ہی سے آتی ہو ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ نہیں، قوت محاکات کا یہ کام ہو کہ جو کچھ دیکھے یا سنے اس کو الفاظ کے ذریعہ سے بعینہ ادا کرے، لیکن ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا، تناسب اور توافق کو کام میں لانا، ان پر آب و رنگ چڑھانا، قوتِ تخئیل کا کام ہو، قوتِ تخئیل مختلف صورتوں میں عمل کرتی ہو،

(۱) شاعر کی نظر میں عالم کائنات، قوتِ تخئیل سے ایک اور عالم بن جاتا ہو، ہم کائنات کی دو قسمیں کرتے ہیں حسّاس اور غیر حسّاس لیکن شاعر کے عالم تخئیل کا ذرہ ذرہ جاندار اور ہوش و عقل و جذبات سے لبریز ہو، آفتاب، ماہتاب، ستارے، صبح، شام، شفق، باغ، پھول، پتے، سب اس سے ہم زبانی کرتے ہیں، سب اس کے رازدار ہیں، سب سے اس کے تعلقات ہیں، وہ شب وصل اور صبح وصل سے یوں خطاب کرتا ہو:-

اے شب! اگرت ہزار کار است مرو　　　اے رات تجھ کو آج ہزاروں کام سہی، لیکن نہ جا
وے صبح گرت ہزار شادی است مخند　　　اے صبح! تجھکو ہزاروں خوشیاں سہی، لیکن نہ ہنس

شب وصل میں وہ آسمان سے کہتا ہو:-

نہ گویم اے فلک کز کجروی ہایت تو بر گردی　　　اے آسمان میں تجھ سے یہ تو نہیں کہتا کہ تو اپنی کجروی سے باز آ
شب وصل است، خواہم ایں قدر آہستہ تر گردی　　　لیکن اتنا کہ آج شب وصل ہو، ذرا آہستہ چل کہ جلد صبح نہ ہو

عالم فطرت شاعر کے اثر میں ہو، وہ سب پر حکومت کرتا ہو اور ان سے کام لیتا ہو، اس کو اپنے ممدوح کے تاج پر موتی ٹانکنے کی ضرورت پیش آتی ہو تو کارکنانِ فطرت کے نام احکام صادر کرتا ہے،

عَلَم برکش اے آفتابِ بلند　　　اے آفتاب بلند ہو،
خراماں شو اے برشکیں پرند؟　　　اے بادل چل،
بیار اے ہوا، قطرۂ ناب را　　　اے ہوا پانی برسا،
بگیر اے صدف، در کنار آب را　　　اے سیپ اس پانی کے قطرہ کو موتی بنا
برآ اے گہر از قعر دریائے خویش　　　اے موتی دریا کی تہ سے نکل
بہ تاج سر شاہ کن جائے خویش　　　اور بادشاہ کے تاج پر جا کر جگہ لے

نثر میں "شاعری" کا لطف دیکھنا ہو تو شبلی کے اندازِ بیان پر طویل و مفصل نہ سہی ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈالتے جائیے:-

" اس عالم میں شاعر کی تاریخ زندگی عجب دلچسپیوں سے بھری ہوتی ہو، بلبل نے اسی عالم میں اس سے زمزمہ سنجی کی

تعلیم پائی ہی، پروانے اس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، شمع سے وہ رات بھر سوزِ دل کہتا رہا ہی، نسیم سحری کو اکثر اس نے قاصد بنا کر محبوب کے یہاں بھیجا ہی، اُس نے غنچہ کی ہمیں اُس وقت پردہ دری کی ہو جب وہ معشوق کا تبسم چرا رہا تھا..."

"شاعر بعض وقت خود اقرار کرتا ہو کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہو ممکن ہو کہ وہ واقعی نہ ہو، صرف اُسی کو ایسا نظر آتا ہے، لیکن اس بات کو بھی وہ اس انداز سے کہتا ہو کہ اُس کے متاثر ہونے سے سب متاثر ہو جاتے ہیں

دارد جمالِ روئے تو امشب تماشائے دگر　　　تیرا حُسن ہی آج کی رات کچھ بڑھ گیا ہے

یا آں کہ من می بینمش بہتر ز شب ہائے دگر　　　یا کچھ مجھی کو اور راتوں کی بہ نسبت زیادہ خوشنما معلوم ہوتا ہو

"علت و معلول اور اسباب و نتائج کا عام طرح پر جو سلسلہ تسلیم کیا جاتا ہو شاعر کی قوت تخییل کا سلسلہ اس سے بالکل الگ ہی، وہ تمام اشیاء کو اپنے نقطۂ خیال سے دیکھتا ہو اور یہ تمام چیزیں اس کو ایک اور سلسلہ میں مربوط نظر آتی ہیں، ہر چیز کی غرض، غایت، اسباب محرکات، نتائج، اس کے نزدیک وہ نہیں جو عام لوگ سمجھتے ہیں۔ مثلاً"

در عدم، ہم زعشق شورے ہست　　　گل گریباں دریدہ می آید

پھول جو کھلتا ہو اُس کو گریبان دریدہ کہتے ہیں، شاعر کہتا ہو کہ عدم میں بھی عشق کا چرچا ہو اور وہاں بھی لوگ عشق اور محبت کے جوش میں کپڑے پھاڑ ڈالتے ہیں، چنانچہ پھول جو عالم عدم سے آیا ہو گریبان دریدہ آیا ہو،

بُرقع بہ رُخ افگندہ برد ناز بہ باغش　　　تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

معشوق جالی کا نقاب پہنکر باغ کی سیر کو نکلا، شاعر کو قوت تخییل سے یہ نظر آتا ہو کہ معشوق چونکہ نہایت نازک اور لطیف الطبع ہو اس لئے چاہتا ہو کہ پھولوں کی خوشبو دماغ میں آئے تو چھنکر آئے اس لئے اس نے جالی کا نقاب پہن لیا ہو،

تخییل کی بے اعتدالی

شبلی شاعروں کے صرف قصیدہ خواں اور منقبت سرا ہی نہیں ہیں، وہ اُن کے نکتہ چیں بھی ہیں، جہاں کہیں کمزوری نظر آتی ہے اُس پر انگلی بھی رکھ دیتے ہیں:-

تخییل کی بے اعتدالی کا بڑا موقع استعارات اور تشبیہات ہیں۔ استعارے اور تشبیہیں جب تک لطیف قریب المآخذ، اور اصلیت سے ملتے ہوتے ہیں شاعری میں حُسن پیدا کرتے ہیں لیکن جب تخییل کی بے اعتدالی کا موقع ملتا ہو تو وہ دور از کار اور فرضی استعارات اور تشبیہیں پیدا کرتی ہو اور پھر اُس پر اور بنیادیں قائم کرتی جاتی ہو، مثلاً مرزا بیدل کہتے ہیں،

تبسم کرد بہ خونِ بہار تیغ کشید　　　کہ خندہ بر لب گل نیم بسمل افتادہ است

اصل خیال اس قدر تھا کہ معشوق کا تبسم پھول کے نیم شگفتہ ہونے کی حالت سے زیادہ خوشنما ہو، اس مضمون کو یوں ادا کیا ہو کہ تبسم ایک قاتل ہو، اس نے بہار کی خونریزی کے لئے تلوار کھینچی ہو، اس کا وار خندۂ گل پر پڑا، خندۂ گل نیم بسمل ہو کر رہ گیا،

اس تخییل میں جو بے اعتدالی ہو استعارات کی وجہ سے ہو، بہار کا خون تبسم کی تلوار، خندۂ گل کا بسمل ہونا، دور از کار استعارات ہیں،

تشبیہ کی تعریف

"اگر ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص نہایت شجاع اور بہادر ہے، تو اگر انہیں لفظوں میں اس مضمون کو ادا کریں تو یہ معمولی طریقہ ادا ہے، اسی بات کو اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر کے مثل ہے" تو یہ تشبیہ ہوگی اور معمولی طریقہ کی بہ نسبت کلام میں کچھ زیادہ زور پیدا ہو جائے گا، اگر یوں کہیں کہ "وہ شخص شیر ہے" تو زور اور بڑھ جائے گا، لیکن اگر اس شخص کا مطلق ذکر نہ کیا جائے اور یوں کہا جائے کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اس سے مراد وہی شخص ہو تو استعارہ ہے، اسی مطلب کے ادا کرنے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ شیر کا نام بھی نہ لیا جائے بلکہ شیر کے جو خصائص ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کئے جائیں مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدانِ جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی (ڈکارنا خاص شیر کی آواز کو کہتے ہیں) یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے طریقہ کی بہ نسبت زیادہ لطیف ہے،

ہر تشبیہ ابتداء میں نادر اور پُر لطف ہوتی ہے، لیکن بار بار کے استعمال سے اس کی تازگی اور ندرت جاتی رہتی اور بے اثر ہو جاتی ہے، اس لئے شاعر کا فرض یہ ہے کہ نادر اور جدید تشبیہیں اور استعارے ڈھونڈھ کر پیدا کرے، بڑے بڑے شعرا کا معیارِ کمال ہی یہ ہے کہ ان کے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے پائے جاتے ہیں، مثلاً بوسہ کو ایشیائی شعرا، شیریں، شکریں، گلوسوز، کہتے آئے ہیں، لیکن یورپ کا جادو طراز کہتا ہے کہ "وہ ایک پیمانِ وفا ہے جو مجسم بن جاتا ہے" "ایک رازِ نہاں ہے جو سامعہ کے بجائے ذائقہ سے کہا جاتا ہے" "ایک نسیم ہے جو دل کی خوشبو لاتی ہے" "لذت آلود نگاہیں ہیں جو سمٹ کر لفظ بن گئی ہیں" اس قسم کے نازک اور لطیف استعارے فارسی زبان میں، عرفی اور طالب آملی کے ہاں مل سکتے ہیں، عرفی نے ایک قصیدہ میں بہت سی چیزوں کی قسم کھائی ہے اس میں ایک موقع پر کہتا ہے، ع

بہ بر شگفتنِ امروز، و غنچہ گشتنِ دے

کل کا دن جو گزر گیا اور آج کا دن جو شروع ہو رہا ہے اس کو کھلنے والے پھول اور مرجھانے والی کلی سے تشبیہ دی ہے؛

تناسبِ الفاظ

"یہ تمام بحث، الفاظ کی انفرادی حیثیت سے تھی، لیکن اس سے زیادہ تر دم الفاظ کا باہمی تعلق اور تناسب ہے، یہ ممکن ہے کہ ایک شعر میں جس قدر الفاظ آئیں الگ الگ دیکھا جائے تو سب وزنی اور فصیح ہوں لیکن ترکیبی حیثیت سے ناہمواری پیدا ہو جائے اس لئے یہ نہایت ضروری ہے، کہ جو الفاظ ایک ساتھ کسی کلام میں آئیں اُن میں باہم ایسا توافق، تناسب، موزونی اور ہم آوازی ہو کہ سب مل کر گویا ایک لفظ یا ایک ہی جسم کے اعضا بن جائیں یہی بات ہے جس کی وجہ سے شعر میں وہ بات پیدا ہوتی ہے جس کو عربی میں انسجام کہتے ہیں اور جس کا نام ہماری زبان میں سلاست، صفائی اور روانی ہے، یہی چیز ہے جس پر خواجہ حافظ کو ناز ہے اور جس کی بنا پر اپنے حریف کی شان میں کہتے ہیں، ع

صنعت گرست اما شعرِ رواں ندارد

اور اس نام نہاد "ترقی پسندی" میں اسی "انسجام" کا فقدان پایا جاتا ہے اور اسی کمزوری پر پردہ ڈالنے کیلئے ترقی پسند ناقدین عجیب عجیب "ادبی نظریے" تراشتے رہتے ہیں!

بادِ سحر کے جھونکے، آبِ رواں کی رفتار، پھولوں کی شگفتگی، غنچوں کا تبسم، سبزہ کی لہلہاہٹ، خوشبوؤں کی لپٹ، بادل کی پھوار، بجلی کی چمک، یہ منظر آنکھ کے سامنے ہوں تو دل پر وجد کی کیفیت طاری ہو جائے گی، شاعری، ان مناظر کو بعینہٖ پیش کر دیتی ہے، اس لئے اس کی تاثیر سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے،

شاعری، صرف محسوسات کی تصویر نہیں کھینچتی بلکہ جذبات اور احساسات کو بھی پیش نظر کر دیتی ہے، اکثر ہم خود اپنے نازک، اور پوشیدہ جذبات سے واقف نہیں ہوتے یا ہوتے ہیں تو صرف ایک دھندلا دھندلا سا نقش نظر آتا ہے، شاعری، ان پس پردہ چیزوں کو پیش نظر کر دیتی ہے، دھندلی چیزیں چمک اٹھتی ہیں، مٹا ہوا نقش اُجاگر ہو جاتا ہے، کھوئی ہوئی چیز ہاتھ آ جاتی ہے، خود ہماری روحانی تصویر، جو کسی آئینہ کے ذریعے سے ہم نہیں دیکھ سکتے، شعر ہم کو دکھا دیتا ہے،

شعرا، دل کو آگ سے مشابہت دیتے ہیں اور یہ عام مضمون ہے لیکن اوّل جب یہ خیال ادا کیا گیا تو اس کی یہ صورت تھی،

احوالِ دلم مپرس کاں بیچارہ	میرے دل کا حال نہ پوچھو، وہ ایک لکڑی
چوبے است درو فتادہ آتش، دل نیست	ہے جس میں آگ لگ گئی ہے،

اسی خیال کو متاخرین نے یوں ادا کیا، ع

یک پارہ آتشے است، دلش نام کردہ اند

ایک ذرا سے تغیر سے مصرعہ چست ہو گیا، چوب کا لفظ بھدا تھا وہ نکل گیا، اس کے بجائے پارۂ آتش نے لطافت پیدا کر دی، "نام کردہ اند" نے اس لطافت کو اور بڑھا دیا یہ مضمون کہ "معشوق گو نامہربان اور دشمن ہو، تاہم اس کی محبت دل سے نہیں جاتی" اوّل اوّل فرخی نے اس کو یوں ادا کیا تھا،

ہمہ دشمنی از تو دیدم ولیکن	میں نے تجھ سے ہمیشہ دشمنی کا برتاؤ دیکھا،
نگویم کہ تو دوستی را نشائی	تاہم میں نہیں کہتا کہ تو دوستی کے ناقابل ہے،

اسی خیال کو سعدی ادا کرتے ہیں،

بلطف و خوبی او در جہاں ندیدم کس	میں نے معشوق کی لطافت اور خوبی کے برابر دنیا میں کسی کو
کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید	نہیں دیکھا، کہ دشمنی کرتا ہے اور باوجود اس کے محبت بڑھتی ہے،

یہ تنقید اس بات کا ثبوت ہے کہ شبلی نعمانی نے کس قدر نزاکت آفریں طبیعت پائی تھی اور اُن کو شعر کی کتنی اچھی پرکھ تھی، اس قسم کے نازک فرق کو محسوس کر لینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں!

اہلِ عجم، اہلِ عرب سے متاثر ہوئے ہیں اور یہ تاثر تمدن و تہذیب سے لیکر شعر و ادب تک پھیلا ہوا ہے، اس خیال کو شبلی نے کس قدر شاعرانہ انداز میں ظاہر کیا ہے:-

"روایت اور استشہاد کی حاجت نہیں خود عجم کی شاعری شہادت دے رہی ہے کہ اُس نے عرب کی اُنگلی پکڑ کر چلنا سیکھا ہے"

آب ہوا اور مناظر قدرت کا اثر!

یہ بدیہی بات ہے کہ ملک کی آب و ہوا، سرسبزی، اور شادابی کا اثر، خیالات پر پڑتا ہے اور اس ذریعہ سے انشا پردازی اور شاعری تک پہونچتا ہے، عرب جاہلیت کا کلام دیکھو تو پہاڑ، صحرا، جنگل، بیابان، دشوار گزار راستے، مٹے ہوئے کھنڈر، ببولوں کے جھنڈ، پہاڑی، جھاڑیاں، یہ چیزیں ان کی شاعری کا سرمایہ ہیں، لیکن یہی عرب جب بغداد میں پہنچے تو ان کا کلام چمنستان اور سنبلستان بن گیا، ایران ایک قدرتی چمن زار ہے، ملک پھولوں سے بھرا پڑا ہے، قدم قدم پر آب رواں، سبزہ زار اور آبشاریں ہیں، بہار آئی اور تمام سرزمین تختۂ زمردیں بن گئی، بادِ سحر کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبلوں کی چہک، طاؤس کی جھنکار، آبشاروں کا شور، وہ سماں ہے جو ایران کے سوا اور کہیں نظر نہیں آسکتا۔

اس حالت کا اثر ہوا کہ ایران کی تمام انشا پردازی پر رنگینی چھا گئی۔ کسی چیز کی خوبی یا کمال کو بیان کرنا چاہیں تو رنگ و بو کے ذریعہ سے کام لیں گے۔ فردوسی جس کی زبان سے پہلوانی اصطلاحات اور الفاظ کے سوا کوئی لفظ نہیں نکل سکتا۔ فوج کی تعریف میں کہتا ہے،

سوئے شہر ایراں نہادند روے سپاہی بداں گونہ بارنگ و بوے

اسی بنا پر رنگین سخنی، رنگین نوائی، رنگین ادائی کے محاورات پیدا ہوئے، اس لفظ نے بہت سی اصطلاحیں پیدا کر دیں۔ رنگ بر روئے کار آوردن کسی کام کو آب و تاب سے کرنا۔

رنگ ریختن۔ و رنگ زدن۔ و رنگ بستن۔ تعمیر کرنا۔

ع زرنگ چہرۂ ما ریخت رنگ خانہ مارا۔

رنگ بر آب ریختن۔ منصوبہ باندھنا۔

ع ساقی ما باز رنگ تازۂ بر آب ریخت۔

رنگ داشتن از چیزے۔ کسی چیز سے فائدہ اٹھانا،

ع سلیم از ما کسی رنگے ندارد۔

رنگ کے استعمالات کو دیکھو۔ رنگ گرفتن۔ رنگ گزاشتن۔ رنگ نہادن رنگ ماندن۔ رنگ چیدن۔ رنگ مالیدن۔ رنگ پوشیدن۔ رنگ خندیدن۔ رنگ برخاستن۔ رنگ شکستن۔ رنگ گسیختن۔ رنگ گردانیدن۔ رنگ جستن۔ رنگ بردن۔

غرض جس مصدر کو چاہیں رنگ کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ رنگینی کا خیال کس قدر طبیعتوں پر چھایا ہوا ہے کہ جو بات زبان سے نکلتی ہے رنگین ہو کر نکلتی ہے۔ اسی طرح پھولوں کی افراط نے گل کے لفظ کو اس قدر عام کیا کہ کوئی چیز گل سے خالی نہیں۔ چراغ میں گل۔ آنکھ میں گل۔ شراب میں گل۔ پیکاں میں گل۔ صبح کا گل۔ چاند کا گل،

فیضے عجب دریں گل صبح از صبا رسید بیرون کشیم رخت، کدورت صفا رسید
صاف دل را نبود رنگ زوال گل مہتاب نمی گردد خشک

صاف دل آدمی کو زوال کا زنگ نہیں لگتا۔ چاند کا پھول خشک نہیں ہوتا،

خوش آں مستی کہ از رخسار زیبایت نقاب افتد   بجائے پردہ بر روئے تو گلہائے شراب افتد

دو چار قدم ٹہلنا ہو تو گلگشت کہیں گے، گویا ہر قدم پر پھول بچھے ہوئے ہیں کہ جو قدم پڑتا ہے پھولوں پر پڑتا ہے، زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا ہو تو گل زمین کہیں گے،

یک دل ہزار زخم نمایاں نہ داشت است   یک گل زمین ہزار خیاباں نہ داشت است

کسی چیز کے ظاہر ہونے یا راز کے فاش ہونے کو گل کہتے ہیں، ع

عاقبت راز بلبلاں گل کرد

فساد کرنے کو گل در آب کردن کہتے ہیں۔ ع

بادہ نوشاں گل در آب دماکتاب اندختیم

جب کسی موقع پر کوئی شخص کوئی عمدہ بات کہتا ہے تو سب بول اٹھتے ہیں کہ گل گفتی۔ یعنی خوب گفتی۔ پہلوان جب حریف سے کشتی کا پیام دیتے ہیں تو پھول بھیجدیتے ہیں،

دریں بہار نشد کس حریفِ فریادم   بہ بلبلانِ چمن ہم گلے فرستادم

چھوٹے جال کو گلدام کہتے ہیں۔

ان باتوں سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ملک میں لالہ و گل کی کس قدر بہتات ہے کہ بات بات میں پھول جھڑتے ہیں، اسی طرح ملک کے سبزہ زار ہونے نے سیکڑوں محاورے پیدا کئے۔

سبز پیشانی۔ سبز چہرہ۔ سبز پوش۔ سبز کردن۔ سبز شدن۔ سبز شدن آفتاب۔ سبز شدن بخت۔ سبز شدن اختر۔ سبز کردن حرف۔

اے خوش آں روز کہ آں سیب ذقن سبز شود   ہر چہ می گفتمت اے عہد شکن سبز شود

وہ دن کیا اچھا ہوگا کہ تیرا سیب ذقن سبز ہو جائے گا، اور جو بات میں کہتا تھا سر سبز ہوگی

آسماں جز از رہ افتادگی   سبز نتواند شدن در کوئی یار

آسمان تیری گلی میں   صرف خاکساری سے سرسبز ہو سکتا ہے

اس نکتہ آفرینی اور نازک بیانی پر شیراز و اصفہان کی فضائیں وجد کرتی ہوں گی!

حسنِ ترکیب

ہلاکِ طرزِ آں بیگانہ خوئے آشنا رویم
کہ با این بیوفائیہا وفادار است پنداری

"آشنا رو" وہ شخص جس کے دل میں محبت کا کچھ اثر نہ ہو لیکن چہرہ سے محبت ظاہر ہوتی ہو، شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اس معشوق پہ مرتا ہوں جس کی آشنا روئی کا اثر یہ ہے کہ واقع میں بیوفا ہے لیکن دھوکا ہوتا ہے کہ باوفا ہے، اس خیال کو "بیگانہ خو" اور "آشنا رو" ان دو الفاظ نے کس خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے،

فغاں از قاصدانِ بے تصرف   زخود یک بار پیغامے نہ سازند

"بے تصرف"، وہ قاصد جو اپنی طرف سے کچھ گھٹاتے بڑھاتے نہیں، بلکہ جو کچھ سُنا اُس کو بے کم و کاست آکر ادا کر دیا، مطلب یہ ہے کہ میں بے تصرف قاصد سے نالاں ہوں، معشوق نے کوئی تسلی بخش بات نہیں کہی تھی تو قاصد کو چاہیئے تھا کہ اپنے دل سے گھڑ کر کوئی بات بنا تا کہ کسی طرح سے میرا دل خوش تو ہو جاتا۔

چہ خوش است با دو یک دل سرِ حرف باز کردن — گلہ گزشتہ گفتن سخن دراز کردن

اثرِ عتاب بردن ز دلِ ہم اندک اندک — بہ بدیہہ آفریدن، بہ بہانہ ساز کردن

اعتراض کے جواب میں جھٹ پٹ بات گھڑ لینے کو "بدیہہ آفریدن" کہتے ہیں، شعر کا مطلب یہ ہے کہ "وہ بھی کیا لطف کا موقع ہوتا ہے جب دو دوست اکٹھے ہوتے ہیں، ایک پرانے گلے کر رہا ہو اور بات کو طول دیتا جاتا ہے دوسرا اس ناراضی کو اس طرح آہستہ آہستہ دل سے مٹاتا ہے کہ ہر شکایت کے جواب میں جھٹ پٹ کوئی معقول عذر گھڑ تا جاتا ہے۔

قمریاں پاس غلط کردہ خود می دارند — ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

"پاس غلط کردہ داشتن" کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص ناواقفیت سے کوئی غلط بات کہہ جائے اور واقف ہونے کے بعد بھی اپنی بات کی پچ کرتا رہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمریوں نے غلطی سے کہدیا تھا کہ سرو معشوق کے قد کا ہمسر ہے، اب ان کو اپنی غلطی معلوم ہو گئی، لیکن بات کی پچ کرتی ہیں ورنہ یہ ظاہر ہے کہ کوئی سرو معشوق کے اندام کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس شعر میں "پاس غلط کردہ خود داشتن" نے ایک وسیع مضمون کو مختصر لفظوں میں ادا کر دیا۔

جائے مشام دیدہ کشودم بوئے گل — پنداشتم کہ گرد رہِ یار می رسد

یعنی "پھولوں کی جو خوشبو آئی تو میں نے بجائے اس کے کہ شامہ سے کام لیتا، آنکھیں کھول دیں میں سمجھا کہ معشوق کے راستے کی گرد ہے" اس لطافتِ خیال کو دیکھو، کوچۂ معشوق کی گرد، لطافت کی وجہ سے بوئے گل ہے: اس لئے پھولوں کی جو خوشبو آئی تو دھوکا ہوا کہ کوئے یار کی گرد ہے، یہ خیالات اس قدر لطیف ہیں کہ تابِ اظہار نہیں لا سکتے، گویا حباب ہیں کہ چھونے سے ٹوٹ جاتے ہیں، میں اردو میں ترجمہ کرتا ہوں اور افسوس آتا ہے کہ تمام لطافت خاک میں مل جاتی ہے،

واقعہ نگاری

مثنوی کا اہم الاوصاف واقعہ نگاری ہے، واقعہ نگاری میں جو نقص عموماً اکثر شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اُن کی تفصیل ہم اس لئے لکھتے ہیں، کہ ان سے واقعہ نگاری کی اصلی حقیقت سمجھ میں آئیگی، یعنی صحیح واقعہ نگاری وہ ہے جس میں یہ نقص نہ ہوں،

(۱) اکثر شعراء جب کسی چیز کا بیان کرتے ہیں تو اُس کے لیے عام اور مبہم اوصاف بیان کرتے ہیں جو تقریباً ہر چیز کی نسبت منسوب کئے جا سکتے ہیں اور جن کو ہر عامی سمجھ سکتا اور بیان کر سکتا ہے، دقیق اور نازک باتیں نہیں بیان کرتے، مثلاً ایک اعلیٰ درجہ کے خوشنویس کے قطعہ کی تعریف کی جائے تو یہ کہنا کہ نہایت عمدہ ہے، لاجواب ہے، بے نظیر ہے، نظر فریب ہے، آنکھوں میں کھبا جاتا ہے، دیکھ کر حیرت چھا جاتی ہے، عام اوصاف ہیں، یعنی ہر عمدہ چیز کی نسبت یہ اوصاف استعمال

کئے جا سکتے ہیں، اور جو شخص فن خوشنویسی سے مطلق واقف نہ ہو، وہ بھی ان الفاظ میں حسن خط کی تعریف کر سکتا ہے، لیکن ماہر فن، دائروں کی باقاعدگی، حرفوں کی کشش، کرسیوں کی نشست، نقطوں کی موزونی، قلم کے زور کی تعریف کرے گا اور اس علمی طریقہ سے کرے گا جو فن خطاطی کا اصول ہے، ایک برجستہ شعر سنکر ایک عامی بھی بیساختہ سبحان اللہ کہہ اٹھتا ہے، اور عام الفاظ میں تعریف کرتا ہے، لیکن یہ تعریف عامیانہ تعریف ہوتی ہے، بخلاف اس کے ایک ماہر فن، مضمون کی جدت، بندش کی صفائی، طرز ادا کی خوبی الفاظ کی شستگی، جملوں کی دروبست، بلاغت کے اسلوب کا ذکر کرتا ہے،

واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے جس طرح ایک ماہر فن کرتا ہے، یعنی اس کے تمام اصلی خصوصیات اور جزئیات بیان کی جائیں، ہمارے شعرا جب دو پہلوانوں کی لڑائی باندھتے ہیں، تو زمین آسمان کو ہلا دیتے ہیں، لیکن یہ نہیں بیان کرتے کہ دونوں حریف کس طرح بڑھے، کیوں کر وار کیا، کیا کیا داؤں پیچ کئے، تلوار کے کیا کیا ہاتھ نکالے؟ نیزے کے بند کیونکر باندھے؟ کمان کیونکر چڑھائی؟ تیر کیونکر جوڑا؟، ڈھال کیونکر سر پر لی؟ وغیرہ وغیرہ،

چونکہ شاعری درحقیقت ایک قسم کی مصوری ہے، اس لئے جب تک واقعہ نگاری میں اس قسم کی خصوصیات نہ دکھائی جائیں، کسی واقعہ کی اصلی اور صحیح تصویر ذہن میں نہیں آسکتی،

۲۔ واقعہ نگاری کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات نظر انداز کر دئے جائیں، ہمارے شعرا سمجھتے ہیں کہ جزئی باتوں کا بیان کرنا عامیانہ پن ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ اکثر موقعوں پر ایک خفیف اور جزئی بات سے واقعہ کی تصویر اس طرح کھنچ جاتی ہے کہ بڑے بڑے واقعات کی ادا کرنے سے نہیں کھنچ سکتی تھی چنانچہ اس کی تفصیل ہم، شاعری کی بحث میں محاکات کے عنوان میں لکھ آئے ہیں،

۳۔ شاعر جب کسی بات کو واقعہ کی حیثیت سے لکھتا ہے تو گو وہ فرضی ہو لیکن اس کا فرض ہے کہ بیان میں ایسی کوئی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے فی نفسہ ناممکن ہوتا ہے مثلاً یہ واقعہ کہ جب رستم چلتا تھا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا کبھی ناممکن نہیں ہوتا لیکن موقع، وقت۔ اور حالات کے لحاظ سے ناممکن معلوم ہوتا ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ کیکاؤس نے عقابوں کے ذریعے سے آسمان پر چڑھنا چاہا تھا، کیکاؤس کے جو حالات اور واقعات شاہنامہ میں مذکور ہیں ان سے وہ اس قدر احمق نہیں ثابت ہوتا کہ ایسی بیہودہ کوشش کا ارادہ کرے،

غرض واقعہ نگاری کا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ واقعہ کو اس صورت میں ظاہر کیا جائے کہ دل میں اتر جائے،

یہ مضمون اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ ارباب ذوق علامہ شبلی نعمانی کی تنقید اور نام نہاد ترقی پسندوں کے "Criticism" کا مقابلہ کر کے دیکھیں اور دونوں کے فرق کو محسوس کریں،

"ترقی" کے یہ جھوٹے دعویدار حقیقت میں "تنزل" کے علمبردار ہیں، اردو ادب کو انھوں نے اس کے مقام سے اور نیچے گرا دیا ہے اور گرائے چلے جا رہے ہیں! آخر شعر و ادب کے بازار میں یہ کھوٹے سکے کب تک چلتے رہیں گے۔

——— وقت آگیا ہے کہ بازارِ سخن میں کھرے سکوں کا چلن عام ہو جائے اور جعلی اور کھوٹے سکوں کو قبول نہ کیا جائے!
ہم یہ نہیں کہتے کہ نئی لائنوں پر سوچا ہی نہ جائے، پچھلوں نے جو کچھ لکھا ہے وہی سب کچھ ہے اُس پر اضافہ ہو ہی نہیں سکتا ——— "اضافہ و ترقی" کی ضرورت کا کون منکر ہو سکتا ہے، شعر و ادب میں "اجتہاد" کے لئے بھی ہر وقت گنجائش موجود ہے، زبان و ادب کو ہم جامد اور غیر نامی نہیں سمجھتے" ... مگر یہ سب کچھ ایک اصول و ضابطہ کے تحت ہو، کہی ہوئی باتوں میں ربط، تسلسل اور توازن کا ہونا ضروری ہے، یہ نہیں کہ جو جی میں آیا بکتے چلے گئے، بے راہ روی اور بے تکے پن کو جدت اور ترقی نہیں کہتے، سادگی، پُرکاری، حُسنِ ترتیب اور جمال و توازن "ترقی" کے اجزا ہیں جن کے بغیر ترقی ممکن نہیں!

مظفر حسین شمیم

علامہ موید الاسلام

(تذکرہ کلکتہ کا ایک ورق)

سید جلال الدین موید الاسلام کو کلکتہ میں عام طور پر لوگ "آغا جلال" کے نام سے جانتے تھے۔ یہ ایران کے ایک مقام کاشان کے رہنے والے تھے۔ بچپن ہی سے اِن کا دل اہلِ ایران اور تمام مسلمانوں کی زبوں حالی پر کڑھتا تھا، جب ایران میں سید جمال الدین افغانی سے اِن کی ملاقات ہوئی تو یہ اُن کے ساتھ ہوگئے اور اُن کے خیالات کی اشاعت میں اُن کے مددگار بن گئے، جب جمال الدین افغانی کے شاگرد رضا کرمانی نے ناصر الدین شاہ قاچار والیٔ ایران کو گولی مار کر ملکِ عدم کی سیر کرائی تو ایران میں ہر طرف دھر پکڑ کا بازار گرم ہوگیا۔ جمال الدین افغانی نے درگاہِ شاہ عبد العظیم میں پناہ لی، اور سید جلال الدین نے عراق کی راہ پکڑی اور وہاں سے ترکی چلے گئے۔ جب اُنہوں نے ترکی میں اپنے لئے ناموافق حالات دیکھے تو وہاں سے مصر گئے اور پھر مصر سے حجاز ہوتے ہوئے بمبئی آنکلے۔ بمبئی میں یہ گرفتار ہوگئے لیکن کسی نہ کسی طرح اِس قید سے نجات حاصل کرکے سنگاپور کا رُخ کیا۔ پھر سنگاپور سے ہانگ کانگ اور شنگھائی چلے گئے اور وہاں سے کچھ عرصہ بعد پٹنہ عظیم آباد آگئے اور نواب نصیر حسین خیال مرحوم کے والد بزرگوار نواب میر نوروز حسین کے مہمان ہوئے۔ سید جلال الدین پٹنہ میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد کلکتہ پہونچے اور یہاں سے "حبل المتین" نامی ایک ہفت روزہ فارسی اخبار جاری کیا۔ نہ معلوم یہ ایک اتفاق تھا یا کوئی سوچی بوجھی ہوئی اسکیم تھی کہ جس وقت کلکتہ سے "حبل المتین" نکلا اُسی وقت جمال الدین افغانی نے "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے پیرس سے ایک جریدہ جاری کیا اور پرنس ملکم خاں نے لندن سے "قانون" نکالا۔ تینوں اخبارات کا مقصد اتحاد بین المسلمین تھا۔ "حبل المتین" میں قاچاریہ حکومت کے خلاف سید جلال الدین کے قلم سے مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ "حبل المتین" کا ہر لفظ قاچاریہ حکومت کے تابوت میں ایک کیل کا کام کرتا تھا۔ کلکتہ کے ایرانی سفیر نے حکومتِ ہند سے "حبل المتین" کی شکایت کی۔ انگریزی حکومتِ ہند پہلے ہی سے سید جلال الدین کو نہایت خطرناک آدمی سمجھتی تھی اور اُس کے محکمۂ سراغ رسانی کے افسر رات دن اُن کی نگرانی کیا کرتے اور اُن سے ملنے جلنے والوں کے نام نوٹ کرلیا کرتے تھے اب اُس نے اُن کی اور زیادہ کڑی نگرانی شروع کردی۔ لیکن سید صاحب ایران کے متعلق اِس طرح قلم بچا کر مضامین لکھا کرتے تھے کہ انگریزی حکومت لاکھ کوشش کرنے کے باوجود اُن پر ہاتھ نہ ڈال سکتی تھی۔ اِس سلسلے میں ایک لطیفہ یاد آیا۔ سید جلال الدین کی وفات کے کچھ عرصہ بعد میں دلی گیا تھا وہاں اُس زمانہ میں کونسل آف اسٹیٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں آنریبل مسٹر محمود سہروردی سے ملنے اُن کی قیام گاہ پر گیا اُنہوں نے دوسرے دن رات کو مجھے کھانے پر بلایا میں جب وقت مقررہ پر وہاں پہونچا تو بعض دوسرے اصحاب کے ساتھ ایک انگریز بھی وہاں

موجود تھا وہ اس زمانہ میں حکومتِ ہند کے محکمۂ اطلاعات کا ناظم تھا، اور غالباً اُس کا نام کوٹ مین تھا۔ محمود سہروردی صاحب نے اُس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہیں یہ بھی کہہ دیا کہ ان کا "حبل المتین" کے ایڈیٹر سے بھی تعلق رہا ہے۔ وہ انگریز بجا یک چونک پڑا اور گھبراہٹ میں انگریزی زبان میں اُس کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ "میں اس اندھے ایڈیٹر سے خوب واقف ہوں، وہ ہمارا بڑا دشمن تھا ہم اُسے ہزار پکڑنے کی کوشش کرتے تھے مگر وہ مضمون کچھ ایسے پیچ سے لکھتا تھا کہ ہم اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے تھے"۔ اس کے بعد میں جب تک وہاں رہا وہ انگریز مجھ سے اس طرح جھجک جھجک کر باتیں کرتا رہا گویا اُس پر کوئی مصیبت نازل ہوگئی ہے۔ بہرحال جب سید جلال الدین کی تحریروں سے ایران میں حکومتِ وقت کے خلاف شورش برپا ہوئی اور حکومتِ ایران نے دیکھا کہ انہیں قابو میں لانے کے لئے اُس کے پاس اور کوئی حربہ نہیں تو اُس نے اپنے سفیر کے ذریعہ انہیں بطور رشوت لاکھوں روپیہ دینا چاہا لیکن اُنہوں نے ایسے عالم میں اِس رشوت کو ٹھکرا دیا جب کہ یہ انتہائی مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور انہیں کبھی کبھی اخبار چھاپنے کے لئے مشین اپنے ہاتھ سے چلانی پڑتی تھی۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان سیاسی لیڈروں اور ایڈیٹروں کو جو "قوم" "قوم" کے نعرے بلند کرتے ہیں سید جلال الدین کی زندگی کے اِس رُخ سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جب حکومتِ ایران نے دیکھا کہ اُس کا یہ وار بھی خالی گیا تو اُس نے "حبل المتین" کا داخلہ ایران میں ممنوع قرار دیدیا اب یہ اخبار "انگلش مین" اور "اسٹیٹس مین" لپیٹ کر ایران بھیجا جانے لگا۔

"حبل المتین" جمعہ کی نماز کے بعد خطبے کے بجائے مسجدوں کے منبروں پر سے نمازیوں کو سنایا جانے لگا۔ دنیا کے مختلف حصّوں میں جو ذی اثر اور مالدار ایرانی تاجر مقیم تھے وہ اِس اخبار کے اعزازی ایجنٹ قرار پائے اپنے زمانے میں اس اخبار نے جو اثر و اقتدار حاصل کیا اِس کی نظیر دنیائے صحافت میں بہت کم دیکھنے میں آئی ہے۔ "ادارۂ حبل المتین" سے "حبل المتین" کے علاوہ بہت سی اعلیٰ فارسی مطبوعات وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں۔ علاوہ بریں یکے بعد دیگرے "آزاد" اور "مفتاح الظفر" کے نام سے دو اخبار علیحدہ علیحدہ شائع کئے گئے اِس طرح ملک و ملت کے نام سے ایک انگریزی اخبار بھی جاری کیا گیا (اس اخبار کے ایڈیٹر مسٹر عبدالرحیم مقرر ہوئے، مسٹر عبدالرحیم آئندہ چل کر سر عبدالرحیم کے نام سے مشہور ہوئے ایک عرصہ تک مدراس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے پھر حکومت بنگال کے ہوم ممبر اور قائم مقام گورنر مقرر ہوئے۔ سر عبدالرحیم آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے تقسیم ہند کا مطالبہ سب سے پہلے انہوں نے ہی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کیا تھا۔ بعد کو یہ غیر منقسم ہندوستان میں سنٹرل اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے اور اب کراچی میں گوشہ نشین ہیں) جب حکومتِ ایران سید جلال الدین کو دباؤ یا لالچ سے قابو میں نہ لاسکی تو پھر اُس نے نیا پینترا بدلا اور اپنے سفیر کے ذریعہ انہیں یہ پیغام دیا کہ آپ دنیا بھر کی سیاست پر جو چاہے لکھئے لیکن ایران کی سیاست پر کچھ نہ لکھئے، اُس کے معاوضہ میں آپ کی خدمت میں پچیس لاکھ روپے پیش کئے جائیں گے جب اُنہوں نے شاہِ ایران کا یہ پیغام سُنا تو ان کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا اور اُنہوں نے ڈانٹ کر ایرانی سفیر کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اب ایرانی حکومت کے ترکش میں سید جلال الدین پر آزمانے کے لئے اور کوئی تیر باقی نہ رہا تھا چنانچہ اُس نے ایران میں "حبل المتین" پر سے داخلہ کی پابندی

بشائی اور اُنہیں مویدالاسلام کے لقب سے ملقب کیا اور اُن کے اخبار کو نامۂ مقدس کا خطاب عطاء کیا۔ مگر "حبل المتین" کی پالیسی میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ ایران کی ترقی کے لئے اُن کا قلم پہلے ہی کی طرح سرگرم عمل رہا۔ ایران کے لئے مویدالاسلام کے قلم نے وہی کام کیا جو فرانس کے لئے روسو کے قلم نے کیا تھا۔ اِن کی تحریروں سے ایران کی کایا پلٹ ہوگئی، جب تک ایران سے قاچاریہ خاندان کا خاتمہ نہ ہوا یہ سیاہ پوش رہے۔ جس روز اِس خاندان کا خاتمہ ہوا اُنہوں نے سفید لباس اختیار کیا، جب رضا شاہ پہلوی نے اہلِ ایران کے لئے ایک ہی لباس قرار دیا تو پُرانے خیال کے بہت سے لوگوں نے مخالفت کی لیکن مویدالاسلام نے "حبل المتین" میں "اسلام لباس ندارد" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تو تمام معترضین کی زبانیں بند ہوگئیں، اسی طرح جب ایران میں یہ تحریک جاری ہوئی کہ فارسی[۱] سے دوسری زبانوں کے غیر ضروری الفاظ نکال کر اُن کی جگہ اصل فارسی الفاظ جاری کئے جائیں تو کئی مجتہدوں نے یہ کہہ کر مخالفت کی کہ عربی کے الفاظ کو اِس قاعدے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے کیونکہ یہ ایک اسلامی زبان ہے۔ جب مویدالاسلام کی نظر سے یہ اعتراض گزرا تو اُنہوں نے "اسلام زبان ندارد" کے عنوان سے "حبل المتین" میں نہایت عالمانہ مضامین کا ایک سلسلہ جاری کیا اور ثابت کیا کہ عربی میں قرآن شریف اس لئے نازل ہوا تھا کہ اسلام کے مخاطب اوّلین عرب تھے چونکہ عربوں کو خدا کے احکام اُن ہی کی زبان میں سمجھائے جاسکتے تھے اِس لئے قرآن شریف عربی میں نازل ہوا ورنہ قرآن کا پیغام دنیا کے ہر ملک کے لئے ہے، قرآن میں خدا نے اپنے آپ کو عربوں کا رب نہیں کہا ہے بلکہ "رب العالمین" کہا ہے اِس لئے کسی ایک ملک کی زبان کو "اسلامی زبان" نہیں کہا جاسکتا علاوہ بریں عرب اور شمالی افریقہ کے اُن علاقوں میں جہاں عربی بولی جاتی ہے عربوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی بھی آباد ہیں اور اُن کی مادری زبان بھی عرب مسلمانوں کی طرح عربی ہے اِس لئے صرف عربی ہی کو "اسلامی" زبان قرار دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ اگر عربی کو اِس لحاظ سے اسلامی زبان کہا جائے کہ اسلام کے متعلق اِس میں بہت سی کتابیں موجود ہیں تو پھر یہ بات فارسی، اور اُردو کو بھی حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ مویدالاسلام کی اِن مدلل تحریروں سے اُن لوگوں کی زبان بند ہوگئی جو فارسی زبان کے نشو و ارتقاء کی راہ میں روڑے بنے ہوئے تھے۔ اِن میں سے دو تین مضامین کے ترجمے اُسی زمانے میں اُردو کے مشہور انشاپرداز نواب نصیر حسین خیالؔ عظیم آبادی نے کئے تھے جو اُس دور میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ ایک بار لاہور کے دورانِ قیام میں مجھ سے ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم سے اِن مضامین کا تذکرہ آگیا، ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ میں "حبل المتین" ہمیشہ دیکھتا رہا ہوں، یہ مضامین اور مویدالاسلام کے دوسرے ایسے تمام مضامین جن کی کچھ مستقل حیثیت ہو اگر مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کئے جائیں تو اِن سے مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوگا۔ مسلمانوں میں مویدالاسلام جیسے

[۱] مگر ایران میں یہ تحریک عجمی عصبیت پر مبنی تھی (مدیر)

روشن دماغ انسان خال خال پیدا ہوا کرتے ہیں۔

شروع شروع میں جب سرسید نے علی گڑھ کالج قایم کیا تو انہیں بھی وہاں آنے کی دعوت دی۔ یہ چند روز علی گڑھ میں رہے مگر سرسید اور ان کے سیاسی خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا اس لئے یہ جلد کلکتہ آ گئے۔ موید الاسلام سے ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں سے خاص تعلقات تھے مگر غیر ملکی ہونے کی وجہ سے انہوں نے براہ راست کبھی ہندوستانی سیاست میں حصہ نہ لیا لیکن انہیں ہندوستان اور خاص طور پر مسلمانوں کی سیاست سے بڑی گہری دلچسپی تھی اور یہ عموماً تمام ہندوستانی لیڈروں اور خاص طور پر مسلمان سیاسی رہنماؤں کو اپنی سیاسی بصیرت سے محروم نہ رکھتے تھے۔

گاندھی جی اور موید الاسلام

جب گاندھی جی نے اول اول ترکِ موالات کی اسکیم بنائی تھی تو اس پر رائے لینے کے لئے انہوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کیا تھا اور مختلف الخیال سیاسی اربابِ بصیرت سے اپنی اسکیم کے بارے میں رائے لی تھی۔ جب گاندھی جی مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے کلکتہ پہونچے تو وہاں موید الاسلام سے بھی ملے اور ان کے سامنے اپنی اسکیم پیش کی اور ان کی رائے طلب کی۔ موید الاسلام نے گاندھی جی سے صاف صاف کہدیا کہ آپ کی اسکیم میں ایسی چیزوں کی کمی ہے جن سے کسی ملک کو سوراجیہ مل سکتا ہے، اس لئے آپ کو ترک موالات کی اسکیم سے اور تو سب کچھ مل سکتا ہے لیکن سوراجیہ نہیں مل سکتا۔

آغا خاں اور موید الاسلام

آغا خاں کا خاندان کاشان کا رہنے والا ہے۔ اس رشتے سے آغا خاں موصوف کو "چچا" کہا کرتے تھے اور ان کی والدہ مرحومہ "حبل المتین" کی پانسو کاپیاں خرید کر لوگوں میں تقسیم کیا کرتی تھیں، جب موید الاسلام کلکتہ سے بمبئی آئے تو آغا خاں کی والدہ نے ان کی بہت بڑی دعوت کی اور ان کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا، آغا خاں کبھی کلکتہ جاتے تو موید الاسلام کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے تھے۔

موید الاسلام دُبلے پتلے اوسط قد کے آدمی تھے۔ جب کبھی باہر جاتے مجتہدینِ ایران کا لباس زیب تن فرمایا کرتے ان کی بعض عادتیں عجیب سی تھیں مثلاً یہ کہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے تھے اور وہ بھی دوپہر کو۔ ان کا کھانا ہر موسم میں دہی، روٹی، ادرک اور لکڑی پر مشتمل ہوتا۔ کسی کسی روز ایک آدھ پھل کا اضافہ ہو جاتا۔ صبح کو صرف کافی پیتے تھے۔ میں نے جب انہیں پہلے پہل دیکھا تھا اس وقت ان کی آنکھوں کی روشنی کچھ کچھ باقی تھی۔ بعد میں چل کر یہ بالکل نابینا ہو گئے تھے۔ مضامین خود نہ لکھتے تھے بلکہ لکھوایا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں جب یکایک کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے اور کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا تو انہوں نے "حبل المتین" میں ایک مضمون شایع کیا جس میں اس فساد کی ذمہ داری برٹش گورنمنٹ پر رکھی ان سے انگریز تو خار کھائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً انہیں ہندوستان چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ انہوں نے بھی اللہ توکلی پچاسی برس کی عمر میں رختِ سفر باندھنے کی تیاری کی۔ یہ خبر تمام دنیائے اسلام میں آگ کی طرح پھیل گئی فوراً امان اللہ خاں، رضا شاہ اور مصطفےٰ کمال نے انہیں اپنے اپنے ملک میں آکر بقیہ زندگی بسر کرنے کی دعوت دی ادھر سارے بنگال میں آگ لگ گئی، اور اہلِ بنگال

کا ایک عظیم الشان جلسہ سر عبد الرحیم کی صدارت میں کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں حکومتِ برطانیہ کے اس فیصلہ کی مذمت کی گئی، جب انگریزی حکومت نے یہ رنگ دیکھا تو اس نے اپنے اس حکم کو واپس لے لیا اور پھر جب تک یہ زندہ رہے اِن سے چھیڑ خانی نہ کی ـــــــ اب سے بیس اکیس برس پہلے کلکتہ میں موید الاسلام کا انتقال ہوگیا اور ان کی وفات کے چند ماہ بعد اِن کا جنازہ رضا شاہ پہلوی کی خواہش پر ایران بھیجا گیا اور وہاں شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا، ایران کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی پر موید الاسلام کا جو گہرا اثر پڑا ہے وہ مدتوں باقی رہے گا، میں نے مسلمانوں میں اب تک اِن سے زیادہ فاضل آدمی اور کوئی نہیں دیکھا!

محمد شبیہ الحسن بختیاری
سروش!

.... باقی ہے؟

مسلماں کے عزائم کی ابھی تکمیل باقی ہے
ابھی میرِ عرب کے حکم کی تعمیل باقی ہے

ابھی قابیل انجامِ ستم سے بے خبر سا ہے
ابھی انعامِ صدقِ فطرتِ ہابیل باقی ہے

ضرورت ہے کوئی پھر موسئِ دریا شگاف آئے
ابھی فرعون زندہ ہے عبورِ نیل باقی ہے

سرِ شک ہاجرہ سے صرف زمزم ہی نہیں پیدا
بآلِ اشکہائے چشمِ اسمٰعیلؑ باقی ہے

ابھی غارِ حرا میں گونج ہے فرمودۂ حق کی
فضا میں ارتعاشِ آمدِ جبرئیلؑ باقی ہے

پیامِ لا الٰہ کے شور سے دنیائے باطل میں
قیامت آچکی ہے صورِ اسرافیلؑ باقی ہے

ابھی انسانیت کا پاسباں ہے گنبدِ خضرا
شبِ تاریک میں یہ نور کی قندیل باقی ہے

مٹانی ہے دلوں سے تیرگی عہدِ غلامی کی
ضمیرِ ملتِ آزاد کی تشکیل باقی ہے

خدا کی مملکت کے زور و استحکام کی خاطر
کتابِ زیست کے ہر باب کی تکمیل باقی ہے

ترے قلب و نظر کی پھر ضرورت ہے زمانے کو
تو وہ اجمال ہے جس کی ابھی تفصیل باقی ہے

سروشؔ اہلِ وفا کے واسطے آیاتِ قرآں کی
نئی تفسیر باقی ہے نئی تاویل باقی ہے

نازش پرتاب گڑھی

مردِ مومن سے!

اسیرِ حلقۂ زنجیر بن جانا بھی آتا ہے
سنان و خنجر و شمشیر بن جانا بھی آتا ہے

ضرورت ہو تو خلوت گیر بن جانا بھی آتا ہے
نہیں تو جراتِ شبیرؓ بن جانا بھی آتا ہے

تری ہستی وہ ہستی ہے کہ جھک جائے تو شاخِ گل
جو تن جائے تو پھر شمشیر بن جانا بھی آتا ہے

ابھر جائے تو پھر تو ہم نشینِ مہر ہو جائے
جو مٹ جائے تو پھر اکسیر بن جانا بھی آتا ہے

بٹھا کر اونٹ پر خادم کو چل سکتا ہے پیدل بھی
سوارِ مرکب تو قیر بن جانا بھی آتا ہے

بنامِ رحم خود اپنے ہی قاتل کو رہا کر دے
بپاسِ معدلت شمشیر بن جانا بھی آتا ہے

ذرا سی دیر میں جو قلعۂ کسریٰ کو لرزا دے
تجھے وہ نعرۂ تکبیر بن جانا بھی آتا ہے

کماں ٹوٹی ہے اور خالی ہے ترکش بھی تو کیا پروا
تری اک اک نظر کو تیر بن جانا بھی آتا ہے

مشاہدات

شبنم رومانی (بی کام)

میری آنکھوں نے وہ دیکھے ہیں مناظر کہ نہ پوچھ
نوجوانوں کی مچلتی ہوئی فطرت کا مزاج
اک تبسم پہ تڑپ اُٹھتے ہیں لاکھوں بیمار
گرلز اسکول کی نوخیز حسیناؤں میں
آہ وہ حُسن جو ہے داغِ رخِ صنفِ لطیف
حُسن کو ہے فقط آرائشِ مقبول سے کام
اگر آزادیٔ مستور یہی ہے تو یہاں
"بے حجابی" میں نہیں کچھ بھی تباہی کے سوا

کیا کہوں میں جو کراچی میں ہوا کرتا ہے
اب بزرگوں کی جہالت کا گلا کرتا ہے
ایک اندازِ ہزاروں کی دوا کرتا ہے
تذکرہ "ضبطِ ولادت" کا ہوا کرتا ہے
ہائے وہ عشق جو توہینِ وفا کرتا ہے
عشق بس شاہدِ رنگیں کی دعا کرتا ہے
وہی ہوگا کہ جو پیرس میں ہوا کرتا ہے
ڈر رہا ہوں کہ خدا دیکھئے کیا کرتا ہے

"نظر آتے ہیں"

ابوالبیان حماد

اب کہاں حق کے وہ دیوانے نظر آتے ہیں
ایک عبرت کا سماں اپنے جلو میں ہیں لئے
اُن کی تکمیل ابھی خونِ جگر سے ہو گی
اپنی تاریخ کے صفحات درخشاں ہیں ندیم!
پھر ہوا ذوقِ جنوں سلسلہ جنباں شاید

صرف فرزانے ہی فرزانے نظر آتے ہیں
یہ جو اُجڑے ہوئے کاشانے نظر آتے ہیں
نامکمل سے جو افسانے نظر آتے ہیں
سرفروشی ہی کے افسانے نظر آتے ہیں
وادیٔ نجد میں دیوانے نظر آتے ہیں

اپنا دُکھ درد بھلا کِس کو سناؤں حماد
آج اپنے بھی تو بیگانے نظر آتے ہیں

نظرؔ سیہوری

دو غزلیں

۱

کہاں تک غم سہیں گے غم رسیدہ
رہے گا دل سے دل کب تک کشیدہ

ہمیشہ چشم حسرت آبدیدہ
محبت اور اتنی غم رسیدہ

بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا
نہ ہو جائے کوئی خاطر کبیدہ

حقیقت سے جو تھے ناآشنا دل
محبت سے رہے دامن کشیدہ

چھپایا ہم نے راز غم تو کیا ہے
کہ سب کچھ کہہ گیا رنگ پریدہ

نہ جانے رات کیا گزری چمن میں
سحر کے وقت تھے گُل، آبدیدہ

ازل میں جب محبت منتخب کی
تو فطرت نے دئے غم چیدہ چیدہ

غزل میں بندشِ مضمونِ شوخی
کہ جیسے کوئی آہوئے رمیدہ

نظرؔ کو دیکھنے والے پرکھ لے
"شنیدہ کے بود مانند دیدہ"

۲

قدمِ شوق، سرِ خار تک آپہنچے ہیں
قافلے منزلِ دشوار تک آپہنچے ہیں

رخ ہواؤں کا بدل جائے تو شاید بچ جائیں
وہ سفینے کہ جو منجدھار تک آپہنچے ہیں

الغرض بات کی تحقیق میں آخر کچھ لوگ
آپ کی چشم فسوں کار تک آپہنچے ہیں

بسکہ گرنے ہی کو ہے ہوش و خرد پر بجلی
تبصرے جلوہ گہہ یار تک آپہنچے ہیں

سمجھے جاتے تھے جو اسرارِ محبت کے امین
وہ بھی اندیشۂ اظہار تک آپہنچے ہیں

تابِ یک جنبشِ پردہ بھی نہ تھی کل جنکو
آج وہ دعوتِ دیدار تک آپہنچے ہیں

غم و آلام کی تلخی کے حقائق اے دوست
نشۂ بادۂ گلنار تک آپہنچے ہیں

ٹوٹنے والی ہے آخر یہ حدِ ضبط نظرؔ
لختِ دل دیدۂ خونبار تک آپہنچے ہیں

قمر جلالوی

لمعات

اپنوں کی اُمیدیں لائیں تھیں اپنوں سے اُمیدیں ٹوٹ گئیں
اتنا تو زمانہ برہم ہے اب اور بھی برہم کیا ہوگا

یہ رنج تو ہم سے پوچھ کہ ہم گلزار سے لٹ کر آئے ہیں
اللہ ترے گھر کو رکھے صیاد تجھے غم کیا ہوگا

آغازِ بزم کا کیا کہنا انجامِ بزم ارے توبہ!
جب شمع کے رونے والے نہیں پروانوں کا ماتم کیا ہوگا

اِس وقت تو خوش بیٹھے ہو قمر مہمان ہے وہ شبِ وصل کی ہے
جب صبح کا تارا چمکے گا، اُس وقت کا عالم کیا ہوگا

ساغر اجمیری

جُرعات

اے مقدر تا بکے بے کیف صبح و شام بس
جان ہے بیزار تن سے گردشِ ایام بس

کن اُمیدوں پر گزاروں زندگی کے روز و شب
صبحِ ناکامی کرم کر اے شامِ غم آشام بس

ہے یہ خطرہ ان کی نظروں سے نہ گر جاؤں کہیں
اب نہ کر اے جذبۂ اُلفت مجھے بدنام بس

تیرے شوقِ بے حجابی سے ہے نادم ذوقِ عشق
اے نمائش خواہ اے حُسنِ تماشہ کام بس

یادِ ماضی نے کیا ہے دل میں اک محشر بپا
کر دیا دشوار جینا یادِ خوش ایام بس

اضطراب و اضطرار و وحشت و دیوانگی
اس سے زائد کیا عطا ہوں گے مجھے انعام بس

چرخ کی گردش سے اب تک بھی نہ چھٹکارا ملا
آہِ بے تاثیر بس فریادِ بے ہنگام بس

ہوش میں آ اب تو اے ساغر خدا کو یاد کر
ہو چکا ہے ختم میخانہ بس دورِ جام بس

ظفر قریشی

"ہم نے کچھ کلیاں چنی ہیں اُن کے دامن کیلئے!"

یہ کس کے ادا آشنا ہو گئے ہم!
ز سر تا بپا مدعا ہو گئے ہم

حقیقت کے پردہ کشا ہو گئے ہم
خود اپنے ادا آشنا ہو گئے ہم

خودی نے اگر اور تھوڑا نوازا!
بتا دیں گے ہم بھی کیا ہو گئے ہم

ترے التفاتِ محبت کے صدقے
ذرا سی توجہ سے کیا ہو گئے ہم

کہیں عشق نے ہم کو سر پر بٹھایا
کہیں حُسن کا نقشِ پا ہو گئے ہم

چلے کیوں نہ پیہم حوادث کی آندھی
چراغِ رہِ ارتقا ہو گئے ہم

سرور بھوپالی

تجھکو دیکھیں کہ ترے حُسن کا جلوا دیکھیں
اب نگاہوں کو یہ شکوہ ہے کہ کیا کیا دیکھیں

آبھی جا سامنے اے جانِ چمن روحِ بہار
اور کب تک نگہِ شوق کو رسوا دیکھیں

دنیا کا تماشا دیکھ لیا، دنیا کا تماشا کیا کہئے
اب کوئی تمنا دل میں نہیں، اک انکی تمنا کیا کہئے

جب کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں ساقی کا کرم یاد آتا ہے
اک بوند کہ تھی اشکوں سے گراں لیکن وہ زمانہ کیا کہئے

ہر چند کہ تم سے دور ہیں ہم، مانا کہ بہت رنجور ہیں ہم
مرنا ہے بہت آسان مگر، جینے کی تمنا کیا کہئے

میں تو ہر حال میں راضی بہ رضا ہوں اے دوست
غم نہ کر ہوتی ہے دنیا مری ویراں ہو جائے

گو تری چشم مروت ہے بظاہر کامیاب
اک حقیقت کو مگر کب تک چھپا سکتا ہوں میں؟

ایک دل کی کیا حقیقت ایک جاں کی کیا بساط
اک تبسم پر ترے دنیا لٹا سکتا ہوں میں

آہ یہ بے تاب نظریں ہائے یہ مایوس دل
کون کہہ سکتا ہے اب بھی مسکرا سکتا ہوں میں

سرور سرحدی

یہ چاک سینۂ غنچہ یہ گریۂ شبنم
یہی سحر ہے تو ایسی سحر سے در گزرے

ہمیں پہ رہتی ہے صیاد کی نظر ہر دم
ہم اپنی دلکشیٔ بال و پر سے در گزرے

نکہت بریلوی

وہ زمانہ بھی کیا زمانہ تھا
آشیانہ ہی آشیانہ تھا

اُف یہ مجبوریاں محبت کی
اس طرف ہم اُدھر زمانہ تھا

ماہر القادری —!

موت کی چھاؤں میں!

رشید چھریرے بدن کا خوش منظر نوجوان تھا، مسیں پوری طرح بھیگ چکی تھیں اور رخساروں پر سبزہ کا آغاز شباب کی قیامت آفرینیوں کا اعلان کر رہا تھا، بیسویں صدی کے نوجوان عام طور پر بھنسوڑ اور چنچل ہوتے ہیں اور قدرے غیر ذمہ دار بھی! ہمارے "شعر و ادب" نے اُن کے دل میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ "جوانی دِوانی" ہوتی ہے، اس زمانہ میں ہر کسی سے لغزشیں ہوا کرتی ہیں بلکہ ہونی چاہئیں ——— جس جوانی میں ہنگامے نہ ہوں وہ جوانی کا ہیکو ہے، اُسے تو بڑھاپا کہنا چاہئے ——— مگر رشید کے تیوروں سے متانت کی تراوش ہوتی تھی اور اُس کی پیشانی میں وقار و سنجیدگی کی شمعیں جھلملاتی تھیں؛ وہ انتہائی شرمیلا اور مہذب تھا، سڑکوں، پارکوں، بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں عورتوں کو دیکھ کر مرد اُن سے قریب بلکہ قریب تر ہونے کی کوشش کرتے ہیں، کہ بھیڑ بھاڑ میں کم سے کم کسی عورت کے شانہ سے شانہ تو مس ہو جائے گا، اور ہوس کی تسکین اور جذبات کی سیرابی کے لئے یہ "لطف سرراہے" بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔

لیکن رشید کو کہیں عورتیں آتی جاتی نظر آتیں تو وہ اُن سے بچنے اور دُور دُور رہنے کی کوشش کرتا، نیم عریاں باہوں اور پنڈلیوں کو دیکھ کر اُس کی نگاہیں شرم کے مارے آپ ہی آپ جھک جاتیں، بے حیائی اور آزادی کی یہ باتیں اُسے طبعاً ناپسند تھیں، رشید کے شرمیلے پن کو دیکھ کر، بے تکلف دوست اُسے "دُلہن" کہا کرتے تھے! ساتھیوں کی چھیڑ چھاڑ کا وہ بُرا نہ مانتا، ہر طنز اور پھبتی پر اُسے مسکراتا دیکھا گیا!

رشید کا بچپن، دوسرے بچوں سے مختلف تھا، اُس کے ساتھی مٹی کے گھروندے اور کاغذ کی ناؤ بناتے، کوئلہ سے دیواروں پر لکیریں کھینچتے، آنکھ مچولی، کبڈی، لب شادیاں اور دوسرے کھیل کھیلتے ——— مگر رشید بانس کا ٹکڑا کاندھے پر رکھ کر فوجی سپاہی کی طرح "مارچ" کرتا ہوا چلتا، چھوٹے پستول کی لبلبی دبا کر "اللہ اکبر" کا نعرہ لگاتا اور فضا میں پستول چلنے کی دھیمی سی آواز تھوڑی سی گونج پیدا کر دیتی۔

چھوٹے بچوں سے عام طور پر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ بڑے ہو کر تم کیا بنو گے ——— جواب ملا کرتے ہیں ——— "تھانیدار بنوں گا" ——— "ریل کا گارڈ، جس کی جھنڈی ہلانے سے ریل چلا کرتی ہے" ——— "سیٹھ" ——— "موٹر چلاؤں گا" ——— "اسکول ماسٹر" جو بچے شرارت کریں گے اُن کی بیچی سے خبر لوں گا (چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے)' لوگ معصوم بچوں کی ان سیدھی سادی باتوں پر مسکراتے ہیں! رشید سے جب کوئی پوچھتا کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے؟ رشید سینہ تان کر جواب دیتا "اسلام کا سپاہی" پھر وہ اپنا ننھا منا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے حلقوم کی طرف اشارہ کرتا، مقصد یہ تھا کہ "اللہ" کے لئے گردن کٹانے سے بھی گریز نہ کروں گا ———

——— وہ بچپن ہی سے غازی اور مجاہد تھا، اُس کی تربیت ہی اسی انداز پر ہوئی تھی! غازیوں اور مجاہدوں کا سا کردار بھی تھا، شرم و حیا، خودداری، بلند نظری، بے باکی، جرأت، حوصلہ مندی، چھچھور پن اور بُری باتوں سے نفرت!

شہر میں ایک تھیٹر کمپنی آئی ہوئی تھی جس میں ایک ناچنے والی کی بڑی دھوم تھی کہ وہ ناچتی کیا ہے لوگوں پر جادو

کرتی ہے حُسن ہے، جوانی ہے، ناز و انداز ہیں اور ان سب سے بڑھکر ناچنے اور تھرکنے کا "آرٹ" ہو! ایک مخلوق تھی جو تھیٹر دیکھنے کے لئے ڈھلی جا رہی تھی، رشید کے ساتھیوں نے اُسے بھی اُبھارا، جو دیکھ کر آئے تھے اُنھوں نے تھیٹر کی وہ وہ تعریفیں کیں کہ رشید کے دل میں کھیل دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا، خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہو ——— اُس نے اپنے باپ سے ڈرتے ڈرتے دبی زبان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر ہی دیا ——— باپ نے خشونت آمیز تیوروں کے ساتھ بیٹے سے کہا:-

"رشید! تم تو کہا کرتے تھے کہ بڑا ہو کر میں "اسلام کا سپاہی" بنوں گا! مگر تمہیں معلوم ہے کہ "اسلام کے سپاہی" ناچ نہیں دیکھا کرتے اور راگ رنگ سے دُور رہتے ہیں!"

باپ کی نصیحت سعادت مند بیٹے کے دل میں گھر کر گئی، رشید کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو باپ سے چھپ کر تھیٹر دیکھنے کی کوشش کرتا اور اُس کی یہ کوشش کامیاب بھی ہو سکتی تھی، خود اُس کے یار دوست اس کام میں اُس کی مدد کرتے مگر رشید اس چوری اور دھوکے کے لئے تیار نہ تھا، ایسی باتوں سے اُس کو نفرت تھی!

پلک جھپکاتے اور بات کرتے، زمانہ کہاں سے کہاں پہونچ جاتا ہو، بجلی کی رفتار بھی شاید وقت کی تیزی اور سُرعت کا مقابلہ نہیں کر سکتی، رشید جوان ہو گیا، میٹرک میں کامیاب ہونے کے بعد کالج میں داخل ہوا اور ایف۔ اے کرنے کے بعد فوج میں لے لیا گیا ——— سعی سفارش سے نہیں! اپنی صحت، تنومندی، ذہانت اور فوجی اسپرٹ کی بدولت! ملٹری بورڈ نے اُس میں اُن تمام اوصاف کو پایا، جو ایک فوجی افسر کے لئے ضروری تھیں!

فوج میں بھرتی ہونے کے بعد رشید کے جوہر کھلے، عہدیداروں نے محسوس کیا کہ رشید کو حرب و ضرب سے فطری مناسبت ہو اگر اُسے فوج میں نہ لیا جاتا تو اُس کی صلاحیت پر بڑا ظلم ہوتا، وہ خوش اخلاق تھا، نیک کردار تھا، فرض شناس، ذمہ داری کا احساس کرنے والا، محنتی، جفاکش، پھرتیلا، جسور اور بے باک! بہت ہی کم مدت میں اُسے ترقی مل گئی، اب وہ سیکنڈ لفٹنٹ نہیں لفٹنٹ تھا،

جس سال اُس کی ترقی ہوئی ہے، اُسی سال اُس کی شادی ہو گئی، جاڑے کی رُت تھی، بیاہ ہوئے مشکل سے چار پانچ دن گزرے تھے، شادی کی چوتھی رات تھی، رات کے کوئی نو بجے تھے، میاں بیوی ہنسی خوشی کی باتیں کر رہے تھے ——— اتنے میں رشید نے ریڈیو کا سوئچ گھمایا، اور اُس کے کانوں نے پہلی آواز جو سُنی وہ یہ تھی:-

"دشمن کی فوجوں نے ہمارے ملک کی سرحد پر چھیڑ چھاڑ شروع کر دی، ہماری فوج بھی نقل و حرکت میں آ گئی، طاقت کا جواب طاقت سے دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے ۔ ۔ ۔"!

رشید ایک دم کھڑا ہو کر فوجی وردی پہننے لگا، نئی نویلی دُلھن حسرت اور حیرت کے ساتھ اُس کا مُنہ تک رہی تھی ۔ ۔ ۔ تھوڑی دیر کمرے میں سکوت طاری رہا ———

"میں جا رہا ہوں ۔ ۔ ۔ (بیوی نے زبان سے کچھ نہ کہا، مگر اُس کا اُترا ہوا چہرہ خود اپنی جگہ علامت استفہام (؟) بنا ہوا تھا ۔ ۔) جنگ کے میدان میں! ایک منٹ کی تاخیر بھی مناسب نہیں، ناصرہ! یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری محبت سے میرا دل خالی ہو مگر فرض مجھے آواز دے رہا ہے، میں نہیں رُک سکتا، نہیں رُک سکتا، کل کا دن اور رات سفر میں بسر ہو گی اور دوسرے دن اللہ نے چاہا تو میدانِ جنگ میں پہونچ چکا ہوں گا، جیتا رہا تو پھر یہی عیش دسترس ہوگے

دن رات ہوں گے، موت آگئی تو انشاء اللہ جنت الفردوس میں ملنا ہوگا (ناصرہ کی آنکھیں بے اختیار بھیگ جاتی ہیں) ناصرہ! تم رو رہی ہو، یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا وقت ہے، تمہارا شوہر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے جا رہا ہے، یہ بہت بڑی سعادت ہے، موت سے مسلمان نہیں ڈرا کرتا، صبر سے کام لو، اللہ تعالیٰ اس کے لئے تمہیں اجر عطاء فرمائے گا.... "

پھر وہ ماں کی خدمت میں پہونچا، بڑی بی مصلّے پر بیٹھی ہوئیں وظیفہ پڑھ رہی تھیں بیٹے کو فوجی وردی پہنے دیکھ کر، بڑی بی کو بڑا اچنبھا ہوا، ابھی تو ایک مہینہ کی رخصت کے آٹھ دن بھی پورے نہ ہوئے تھے ——— رشید نے ادب کے ساتھ ماں سے کہا۔

" اماں جان! دودھ معاف کر دو، اور میری خطائیں بھی! سرحد پر جنگ چھڑ چکی ہے میں نے ابھی ابھی ریڈیو سے سنا ہے ——— میں جا رہا ہوں، آپ تنہا میرے لئے ہی نہیں تمام مجاہدین کے لئے دعا فرمائیں، صبر و استقامت کی دعا! جرات و سرفروشی کی دعا! اس کی دعا کہ اللہ کے راستہ میں قدم جمے رہیں ڈگنے نہ پائیں (بوڑھی ماں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے" آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور لبوں پر مناجات تھی...... ناصرہ بھی دوپٹہ کا آنچل منہ پر کئے ہوئے ایک طرف چپ چاپ کھڑی تھی —)!

بڑی بی نے پھر رشید کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا، وہ ہاتھ جس پر بڑھاپے کی جھریاں ابھری ہوئی تھیں رشید سلام کرکے روانہ ہوا، ماتا آنسو بن کر ٹپ ٹپ گر رہی تھی، ناصرہ دیوار سے لگی ہوئی بت کی طرح کھڑی ہوئی تھی اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے، وہ بار بار ان پر زبان پھیرتی تھی اس کا بس چلتا تو شوہر کو روک لیتی نہ جانے دیتی ——— رشید کا فرض شناس دل تعلق و محبت کی ہر زنجیر سے نکل کر، خدا کی راہ میں چل کھڑا ہوا، بڑا ہی سخت مرحلہ تھا، ماں کی محبت عزیزوں کی محبت، نئی نویلی بیوی کی محبت، خود اپنی جان کی محبت ——— مگر احساس فرض ہر محبت پر غالب آکر رہا، وہ ایک ہی جست میں تمام خندقوں کو پھاند گیا۔

رشید مکان سے چل کر سیدھا ملٹری بارک میں پہونچا اور دوسرے دن صبح سویرے پہلی فوجی ٹرین کے ساتھ اسے محاذ جنگ پر روانہ کر دیا گیا، دوسرے دن شام کو اس نے وار فرنٹ پر پہونچکر اپنی جگہ کا چارج لے لیا۔

یہ کوئی کھیل تفریح نہیں جنگ تھی اور وہ بھی سکندر اور پورس کی لڑائی نہیں بیسویں صدی عیسوی کی سائنس زدہ جنگ! جہاں آن کی آن میں ایک بم کا دھماکا پوری پلٹن کا صفایا کر سکتا تھا۔

دس دن تک مسلسل لڑائی ہوتی رہی، بم، آتشبار طیارے، ٹینک، توپیں، رائفلیں، مشین گنیں سبھی حرکت میں تھیں، دن رات آگ برس رہی تھی، چاروں طرف بس موت ہی موت دکھائی دیتی تھی، زخمیوں کی اسپتالیں کاریں آ جا رہی تھیں، ان بیچاروں کی کراہیں، جنھیں وہ ان کے جھلسے ہوئے اور کٹے ہوئے بدن! موت کا فرشتہ شاید آج کی برابر کبھی مصروف نہ رہا ہو!

جنگ کے میدان کی وہ بھیانک اور ہولناک راتیں! خوف و دہشت کے مارے پیڑوں کی ڈالیاں تک کانپ رہی تھیں اور پہاڑوں کی چٹانوں کے سینے شق ہوئے جاتے تھے، دشمن کی فوج تعداد میں بہت زیادہ تھی، اسلحہ کی بھی بہتات تھی، اس طرف سے دباؤ بڑھتا ہی چلا آ رہا تھا، مجاہدین پوری استقامت اور پامردی کے ساتھ لڑ رہے تھے

بڑا خوفناک تصادم تھا، اِدھر سے ایک گولی کے جواب میں اُدھر سے سو گولیاں تڑ تڑ کرتی ہوئی آتیں۔

مجاہدین کا لشکر ایک دن کافی آگے بڑھ گیا مگر غنیم کی تازہ دم کمک آگئی، اور توپوں نے اس قدر آگ برسائی کہ میدان میں پاؤں جمانا مشکل ہوگیا، سپاہی اپنے افسروں کا حکم پاکر پیچھے ہٹنے لگے، کسی ٹیلہ کی آڑ کی تلاش تھی، اس وقت کی سب سے بڑی مصلحت یہی تھی کہ موت کے منہ سے فوج کو صحیح سلامت نکال لیا جائے، آج کے دن کی مردمی اور بہادری بڑھنا نہیں پیچھے ہٹنا تھا!

اتنے میں رات ہوگئی، مگر لڑائی جاری تھی، دشمن مُجاہدوں کی پسپائی سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، ایک دستہ نے مُجاہدین کے میمنہ اور میسرہ کو توپوں کی زد پر دھر لیا، صفیں تتر بتر ہونے لگیں، ایک کو ایک کی خبر نہ تھی، رات اتنی اندھیری کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا ——— صبح ہوئی تو رشید نے اپنے کو سو سوا سو سپاہیوں کے ساتھ ایک پہاڑی کے دامن میں ٹھہرا ہوا پایا، یہ مقام بہت غنیمت تھا، میدان کے مقابلہ میں یہاں پناہ اور بچاؤ کی بہرحال اُمید تھی!

ان سپاہیوں میں سب سے بڑا افسر لفٹنٹ رشید ہی تھا، اُس نے مجاہدین کی ہمت بڑھانے کے لئے ایک پُرجوش تقریر کی، سپاہیوں سے کہا کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیئے، وہ چاہے تو ہم مٹھی بھر مُسلمان لڑائی کا نقشہ بدل سکتے ہیں، اور میں تو بھائیو! یہ دیکھ رہا ہوں کہ مجاہدینِ اسلام کی گزشتہ تاریخ ہمارے ہی ذریعہ دُہرائی جانے والی ہے، فتح و نصرت کے نشان مجھے نظر آرہے ہیں ——— اور اگر موت ہی قسمت میں لکھی ہے تو بُزدل بن کر کیوں مریں، بہادری کے ساتھ لڑ کر جان کیوں نہ دیں، اللہ کے راستہ میں موت اور زندگی دونوں مُبارک ہیں، ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مشکل ہے، موت کا خوف دل سے نکال دو، صرف اللہ کا خوف اور اُس کی نصرت و تائید کی اُمید! بس پھر بیڑا پار ہے، میرا دل آپ ہی آپ اُمید سے لبریز ہوا جا رہا ہے!

تین دن تک اُسی پہاڑی پر ٹھیرنا پڑا، تھوڑا بہت راشن اور پانی جو پاس تھا ختم ہوگیا، اب بھوک پیاس تھی اور اللہ کا نام تھا، رشید نے بھوکے پیاسے فوجیوں کو حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کی تشنگی یاد دلا کر اُن کی ڈھارس بندھائی، یہ بھی کہا کہ جب صحابہ کرام کے دوش بدوش ہمارے آقا حضور نبی کریم (ہماری جانیں آپ کے نام پر قربان ہوں) خندق کھود رہے تھے تو حضور کے شکم مُبارک پر تین پتھر بندھے تھے یعنی سرکار کو تین دن کا فاقہ تھا، اللہ تعالیٰ ہمارا امتحان لے رہا ہے، اس امتحان میں ہم پورے اُترگئے تو پھر جیت ہی جیت اور کامیابی ہی کامیابی ہے، دنیا میں بھی اور دین میں بھی!

بڑی تلاش کے بعد پہاڑی کی ایک کھوہ میں پانی ملا، مگر بہت گدلا، کائی جمی ہوئی، لیکن اس عالم میں یہ میلا اور گدلا پانی بھی آبِ حیات سے کم نہ تھا، مجاہدوں نے پھونکوں سے اور ہاتھوں سے کائی ہٹا ہٹا کر اور نتھار کر پانی پیا، اس اُمید و بیم کے عالم میں نمازوں کے خشوع و خضوع کا عالم نہ پوچھیئے، وہ گڑگڑا کر دعائیں، وہ اپنے معبود کے حضور عجز و نیاز کے سجدے، وہ دستِ طلب کی لرزشیں، وہ بہتے ہوئے آنسو، وہ دلوں کا اضطراب! اگر یہ سب اسی پہاڑی پر کھیت رہتے اور ان میں سے ایک متنفس بھی زندہ نہ بچتا تو ان تین دنوں میں اللہ کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوا تھا وہ خود اپنی جگہ "فتح مبین" سے کم نہ تھا، دوسرے لوگوں کے پاس فتح و شکست اور کامیابی و ناکامیابی کے پیمانے ہیں اور

مسلمانوں کے پاس صرف ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ پیمانہ " اللہ کی رضا کا ہے !

تیسرے دن صبح کے وقت غنیم کی فوج پہاڑی کی جانب بڑھتی ہوئی نظر آئی، رشید نے سپاہیوں سے کہا کر غازیو! حق و باطل کی یہ آخری کش مکش ہے جس سے ہم دو چار ہو رہے ہیں، بس جمے رہنا، ہمت نہ ہارنا، پھر اللہ نے چاہا تو میدان ہمارے ہاتھ ہے !

مجاہدین کو مختلف مقامات پر پہاڑ کی چٹانوں کی اوٹ میں بٹھا دیا گیا، دو تین جگہ لکڑی کے انبار لگا دئے گئے تھے کہ جب موقعہ ہو اور ضرورت پیش آئے تو ان میں آگ لگا دی جائے، کچھ کپڑے بھی پھاڑ کر ایک جگہ رکھ لئے تھے، اور اس میں بھی ایک زبردست مصلحت تھی !

کوئی ایک گھنٹہ بعد غنیم کی پیدل فوج پہاڑی کے نیچے سے گزری، لفٹنٹ رشید نے اشارہ کیا اور مجاہدین نے گولیوں کی باڑھ پران کو رکھ لیا، لکڑی کے انباروں میں آگ لگا دی گئی اور کپڑے درختوں کی شاخوں پر لٹکا دئے گئے، دشمن کے سپاہیوں نے دیکھا کہ پہاڑی پر آگ جل رہی ہے، درختوں پر کپڑے پھیلے ہوئے ہیں اور گولیوں کی تابڑ توڑ بوچھاریں آئی چلی جارہی ہیں ـــــــ وہ سمجھے کہ پہاڑی پر نہ جانے کتنی مخالف فوج پڑی ہوئی ہے، ہمتیں ٹوٹ گئیں، حوصلے پست ہو گئے، سخت بدحواسی طاری ہو گئی، لشکر میں بھگدڑ مچ گئی جس کا جدھر کو منہ اٹھا بھاگنے لگا، راستہ میں خود ان کے تازہ دم سپاہی ملے تو ان بھاگتے ہوؤں کو دیکھ کر انہوں نے بھی پسپائی کو غنیمت جانا،

دوپہر کے بہت بعد تک رشید نے احتیاطاً پہاڑی سے نیچے اترنے سے گریز کیا مگر اب میدان صاف تھا، غنیم کی فوج راہِ فرار اختیار کر چکی تھی، رشید مجاہدین کو لیکر نیچے آیا، گھاٹیوں میں جگہ جگہ کافروں کی لاشیں پڑی تھیں، کچھ دم توڑ رہے تھے، بندوقیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں بھری ہوئی تھیں، تھوڑی دور جاکر " اللہ اکبر" کی صدائیں کان میں آئیں فاتحین کی اور ڈھارس بندھ گئی، ایک گاؤں کے پاس چند سو مجاہدین پڑاؤ ڈالے پڑے تھے، وہ بھی آن ملے، اچھی خاصی جمعیت ہو گئی !

دشمن کا مورچہ ٹوٹ چکا تھا اب شہر سامنے تھا اور اس کے بعد یہ مہم سر تھی، رشید نے فوجیوں کے سامنے پُر جوش تقریر کی :-

" مجاہدو! جانتے ہو تم کون ہو (سپاہی ۔۔۔ ایک آواز) سپاہی تو سب کی فوجوں میں ہوا کرتے ہیں یوں کہو " اللہ کے سپاہی "، غازیو! اللہ کا سپاہی دوسری فوجوں اور لشکروں کے سپاہی سے اپنے کردار میں ممتاز ہوا کرتا ہے، اب پہلے امتحان سے زیادہ سخت امتحان آرہا ہے (سپاہی ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شہر میں شاید پھر دشمن کی فوج سے مڈبھیڑ ہونے والی ہے) امتحان اس بات کا کہ فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر کہیں اللہ تعالیٰ کی حدود کو نہ توڑ دینا اگر ایسا کیا تو پھر یہ فتح نہیں ہماری شکست ہے ! اگر شہر کے لوگ امن و امان کے طالب ہوں تو ان سے ذرہ برابر تعرض نہ کیا جائے، کسی عورت کی بے آبروئی نہ ہو، بچوں اور بوڑھوں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، فصلیں نہ اجاڑی جائیں، اور بھائیو! یہ فتح کہیں تمہیں مغرور نہ بنادے، کبر و غرور تو اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے، یہ تو سب اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی عنایت ہے !

رشید کی قیادت میں اسلامی فوج شہر میں داخل ہوئی، پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ! شہری آبادی

امن واماں کی درخواست کر چکی تھی، لہذا اُن کو اماں دی گئی، بڑے بازار کے نکڑ پر کچھ شریر لوگوں نے سپاہیوں سے چھیڑ چھاڑ اور مقاومت کی اُس کا جواب ہاتھ کے ہاتھ دیدیا گیا پھر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا، مفتوح آبادی محسوس کر رہی تھی کہ فاتحین کے بھیس میں عدل ونیکی کے فرشتے یہاں آگئے ہیں، وہ توخوف و دہشت کے مارے کانپ رہے تھے کہ نہ جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے، کیا کیا بے عزتی اور تباہیاں دیکھنی نصیب ہوتی ہیں لیکن اسلامی فوج نے "فتحِ مکہ" کی یاد کو تازہ کر دیا ــــ

ایک ماہ بعد رشید اپنے گھر واپس آیا، اب محاذ پر اُس ضرورت نہ رہی تھی اور ضرورت کہاں سے رہتی فتح کے بعد محاذِ جنگ ہی ختم ہوگیا، ماں نے فاتح ومنصور بیٹے کی چٹ چٹ بلائیں لیں، فرطِ مسرت سے آنسو بھی نکل آئے ــــــــ اور ناصرہ! اُس کی خوشی کا کیا پُوچھنا، مسرت تھی اور بے اندازہ تھی، پاؤں کہیں رکھتی تھی اور پڑتا کہیں تھا ــ

ــــــ کمانڈر صاحب کو ایک عدد "فوجی سلام" ــــــ ناصرہ نے مُسکراتے ہوئے ہاتھ کو جنبش دی،

ــــــ ہم عورتوں کی "فوجی سلامی" کے قایل نہیں ہیں ــــــ رشید نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا اور شب خوابی کے کمرہ کے در ودیوار پر محبت اٹھکھیلیاں کرنے لگی ــــ!

روحِ انتخاب!

انعام الرحمٰن خاں!

مادہ پرستی اور خدا پرستی کے ملتے جلتے اخلاق

میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے

عِلم النفس کا وہ جدید ورق جو شاید پہلی مرتبہ لکھا گیا!

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اچھائیاں ایسی ہیں جن کو انسانیت ہمیشہ سے اچھا جانتی آئی ہے اور بعض برائیاں ایسی ہیں جن سے انسانی ضمیر ہمیشہ سے نفرت کرتا رہا ہے جھوٹ، بدعہدی اور خیانت ہر زمانے میں قابلِ نفرت ہی رہی ہیں اور اس کے مقابلے میں صداقت وفاءِ عہد، اور امانت قابلِ تحسین رہے ہیں رحم انصاف اور شجاعت کو کبھی کسی نے بُرا نہیں کہا اور ظلم، بے انصافی اور بزدلی کی کبھی کسی نے عزت نہیں کی لیکن یہ اسی علم و دانش سے آراستہ زمانے کا کمال ہے کہ اس میں معروف اخلاقیات کی قدریں تبدیل ہی نہیں ہوئیں بلکہ الٹ گئیں آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک صفت اگر ایک حلقہ میں فضائلِ اخلاق میں شمار ہوتی ہے تو دوسرے حلقہ میں وہی صفت جُرم سمجھی جاتی ہے یا اگر ایک طرزِ عمل کو ایک کے ساتھ ظلم سمجھا جاتا ہے تو اسی طرزِ عمل کو دوسرے کے ساتھ انصاف سمجھا جاتا ہے ایک فعل اگر ایک فرد سے سرزد ہو تو وہ قابلِ تعزیر ہے اور وہی فعل اگر ایک قوم انجام دے تو وہ اس کا کارنامہ شمار ہوگا یہ چیزیں آج کل اتنی عام ہیں کہ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہر شخص دیکھ ہی نہیں بھگت رہا ہے۔ آئیے آج غور کریں کہ ایسا کیوں ہے؟ کوئی فعل خواہ اچھا ہو یا برا اس کے کرنے یا نہ کرنے کے لئے کوئی ایک محرک ہوتا ہے اور وہ محرک ہے فائدہ یا لذت کا لالچ اور نقصان یا تکلیف کا خوف جب یہ بات ہے تو پھر محرکات کو تلاش کرنا چاہیئے کہ اس چیز کو پیشِ نظر رکھ کر جو ہم غور کرتے ہیں تو ۲ دو محرکات ہم کو ملتے ہیں اور نتیجہ میں اخلاق کی دو قسمیں قرار پاتی ہیں۔ ایک وہ جن کی پشت پر خدا کا تصور اس کی پوری صفات کے ساتھ ہو۔ اس عقیدہ کے ساتھ آدمی کو نیکی پر آمادہ کرنے والا محرک خدا کی خوشنودی اور اس کے انعام کا لالچ ہوتا ہے اور بدی سے روکنے والا خدا کے غضب اور اس کی سزا کا خوف دوسری قسم وہ جس میں خدا کا کوئی تصور نہیں ہوتا یا ہوتا بھی ہے تو بہت ناقص اور محدود۔ اس تصور کے ساتھ انسان کو نیکی پر آمادہ کرنے والا جذبہ مادی فائدے

کا لالچ اور برائی سے باز رکھنے والا مادی نقصان یا قانونی سزا کا خوف ہوتا ہے انہی کو ہم مختصر الفاظ میں خدا پرستانہ اخلاق اور مادہ پرستانہ اخلاق کہہ سکتے ہیں۔

مادہ پرستانہ نقطۂ نظر میں چونکہ خدا اور سزا و جزاء کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور اس کی بنیاد تمام تر مادی نفع و نقصان پر ہوتی ہے۔ اس لئے حالات کی تبدیلی کے ساتھ معیار اخلاق بھی بدلتا رہتا ہے جب مطلوب مادی فائدہ ہی ٹھیرا تو جس عمل کے نتیجہ میں فائدہ نظر آئے تو وہی عین اخلاق ہے آج اگر صداقت میں فائدہ نظر آرہا ہے تو صداقت نیکی ہے کل اگر جھوٹ میں فائدہ نظر آیا تو جھوٹ نیکی ہو جائے گا اگر ایک تاجر ساکھ جمانے کی غرض سے اپنے کاروبار میں سچ بولتا ہے اور اس سچ سے فائدہ اٹھاتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہ دوسرے معاملات میں ایسے موقعہ پر بھی سچ پر ہی قایم رہے جب کہ سچ بولنے میں اس کو نقصان کا اندیشہ ہو کوئی وجہ نہیں کہ یہاں وہ سفید جھوٹ بولنے سے خواہ مخواہ پرہیز کرے اگر ایک مظلوم کے ساتھ ہمدردی کرنے میں کسی شخص کو اپنا یا اپنی قوم کا فائدہ نظر آتا ہے تو اس کی نظر میں یہ ایک نیک کام ہوگا اور اگر اس طرح کے مظلوم کے ساتھ ہمدردی کرنا کسی وقت میں اس کے یا اس کی قوم کے لئے نقصان دہ ——— خالص مادی اعتبار سے نقصان دہ ——— ہے تو اس وقت اس مظلوم پر مزید ظلم کرنا نیک کام یعنی قومی خدمت ہوگا خدا کے تصور اور اس کے سامنے جواب دہی کے احساس کے بغیر محض مادی نقطۂ نظر سے جب اخلاقی قدریں متعین کی جائیں گی تو اس میں رنگا رنگی ہونا ایک لازمی چیز ہے کیونکہ نفع اور نقصان بذات خود کوئی حقیقت ہے نہیں وہ تو اضافی چیزیں ہیں ایک ہی چیز ایک شخص کی نظر میں نفع اور دوسرے کی نظر میں نقصان ہو سکتی ہے یا ایک طرح کے حالات میں ایک چیز نفع بخش ہے تو دوسری طرح کے حالات میں وہی چیز نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

پھر چونکہ ہر فرد کا ہر طبقہ کا ہر قوم کا مفاد ایک دوسرے سے مختلف ہے اس لئے ان میں سے ہر ایک کا معیار اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہے اسی وجہ سے اس زمانہ میں اخلاق کی بیشمار قسمیں پائی جاتی ہیں مزدور اور سرمایہ دار کاشتکار اور زمیندار گاہک اور دوکاندار وکیل اور موکل افسر اور ماتحت سکریٹری اور وزیر، فوجی جرنیل اور قومی لیڈر یا اور ایسے بیسوں گروہ ہیں جن کی اخلاقی قدریں ایک دوسرے سے مختلف ہیں کیونکہ ہر ایک کا مفاد علیحدہ علیحدہ ہے جب اصل مطلوب یعنی مادی فائدہ جلدی جلدی بدلنے والا ہے تو اس کے حصول کا ذریعہ یعنی اخلاق اور معیار کا اس سے زیادہ صورتیں بدلنا ضروری ہے اور اس قسم کے اخلاق کے حاملین کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والا

یہی وجہ ہے کہ آج ساری دنیا میں ایک کشمکش برپا ہے سوسائٹی کے افراد اور چھوٹے چھوٹے طبقوں سے لیکر بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق تعاون کا نہیں بلکہ تصادم کا ہے کوئی ایک بھی اپنے دوسرے ہمجنس کی طرف سے مطمئن نہیں ہے کیونکہ ہر ایک کا اپنا خدا یعنی مفاد علیحدہ ہے کوئی ایک مقصد یا ایک طاقت ان غریبوں کو حاصل ہی نہیں ہے جس کے گرد سب جمع ہو سکیں جس میں سب کا یکساں فائدہ ہو تاکہ ان سب میں وحدت و ہم آہنگی پیدا ہو سکے اور سب مل کر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے زندگی کا دور جانے کی ضرورت نہیں خود اپنے ملک[1] کو دیکھ لیجئے چھوٹے سے چھوٹے کارکن سے لے کر بڑے سے بڑے لیڈر اور وزیر تک ہر ایک ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا نظر آئے گا ہر ایک اپنے مفاد کا پجاری بنا ہوا ہے کسی کو ذرہ برابر پرواہ نہیں کہ میرے تھوڑے سے فائدے کے بدلے میں قوم و ملک کو کتنا بڑا نقصان پہنچا ہے کوئی شخص اپنے مفاد کے سوا کسی کا وفادار نظر نہیں آتا کل تک جو لوگ جنگ آزادی کے جانباز سپاہی تھے آج اپنے تھوڑے سے فائدہ پر ملک کو بھینٹ چڑھا دینے میں ان کو ذرا تامل نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً ان ہی کے دوسرے ساتھی پالش کھرچ کر ان کی اصل شکل و صورت دنیا کو بتلاتے رہتے ہیں۔

اخلاقی بے قیدی کے اس طوفان کو نہ سخت سے سخت قانونی سزا کا خوف روک سکا ہے نہ بڑے سے بڑے لیڈر کی اپیل نے کوئی اثر دکھایا

[1] مضمون نگار بھارت کے رہنے والے ہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اب مکار و دغاباز جھوٹے اور خود غرض آدمی ہی پیدا ہوتے ہیں اور سچے اور ایثار پیشہ آدمیوں کا پیدا ہونا بند ہوگیا ہے بلکہ اس کی وجہ یہی ہے کہ اخلاق کا سرچشمہ بدل گیا ہے فائدہ بالذات کا لالچ جو انسان کو کسی کام پر آمادہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہی مادی نفع ہے جو حالات کے اعتبار سے تبدیل ہوتا رہتا ہے اس طرح نقصان یا تکلیف کا خوف جو آدمی کو کسی چیز سے باز رکھنے کا واحد ذریعہ ہے یہی مادی نقصان یا قانون کی گرفت کا خوف رہ گیا ہے جس کی رو سے تھوڑی رشوت یا سفارش بچا سکتی ہے۔

جو قومیں یا جماعتیں مادہ پرستانہ نقطہ نظر رکھتی ہیں ان کے یہاں اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں حتیٰ کہ مقصد تک کو ذبح کر ڈالنا کوئی عجیب بات نہیں ہے مثال کے طور پر جو جماعت سرمایہ داری کو ختم کرکے اور غریب و محنت کش طبقہ کو اٹھا کر معاشی مساوات قائم کرنا اپنا مقصد قرار دیتی ہے وہی اپنی جدوجہد میں اس قسم کی توڑ پھوڑ کو جائز سمجھتی ہے جس میں سراسر غریب و محنت کش طبقہ ہی کو نقصان پہونچتا ہے وہ بلاتکلف ریلوں کو الٹ دیگی محض اس لئے کہ کسی طرح ان برسر اقتدار لوگوں کو پریشان کرسکے جن سے وہ برسرپیکار ہے۔ چاہے ان ریلوں میں وہی عوام سوار ہوں جن کی خدمت کے لئے وہ اُٹھی ہے ان کو آتش زنی اور لوٹ مار میں قطعاً تامل نہیں ہوگا تاکہ اپنے حریفوں کو کسی قدر دردسر میں مبتلا کرسکیں خواہ ان کے اس عمل کا شکار وہی عوام کیوں نہ ہوں جنکی خدمت ان کا مقصد ہے کتنی عجیب ہے یہ خدمت اور کیسے عجیب ہیں یہ خادم۔

یہ ہے مادہ پرستانہ اخلاق اب اس اخلاق کو لیجیے جس کی جڑوں کو خداپرستی کے چشمہ سے غذا ملتی ہے اس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے کہ ہمارا اور اس تمام کائنات کا پیدا کرنے والا، پالنے والا، اور حفاظت کرنے والا ایک خدا ہے جو ہر ڈھکی چھپی بات کو جانتا ہے کوئی کام کیسے ہی چھپ کر کیا جائے اس کے علم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا وہ دلوں تک کا حال جانتا ہے وہی انسان کو ہدایت دینے والا ہے صرف وہی جانتا ہے اور انسان کو بتاسکتا ہے کہ اس کے لئے نیکی یا مفید چیز کیا ہے اور بدی یا مضر کیا۔ انسان اس دنیا میں غیر ذمہ دار اور خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ ذمہ دار اور جوابدہ ہے دنیا کی موجودہ زندگی اس کی کل زندگی نہیں ہے بلکہ اس کی طویل زندگی کا بہت ہی مختصر حصہ ہے۔ اس مختصر زندگی کے بعد اس کو خدا کی جناب میں حاضر ہوکر اپنے چھوٹے سے چھوٹے اچھے بُرے عمل کا حساب دینا ہے جو بندے ذمہ دارانہ زندگی بسر کریں گے اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کریں گے ان کو وہ ابدی انعام سے سرفراز کرے گا اور جو نافرمان بندے اس کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے ان کو سزا ملے گی۔ وہ خدا جس کے سامنے یہ جواب دہ ہیں اتنی لامحدود طاقت کا مالک ہے کہ اس کی گرفت سے کوئی شخص بھاگ نہیں سکتا۔ نہ وہاں کسی کی سفارش چل سکتی ہے۔

اس عقیدہ کی بنیاد پر اخلاق کی جو عمارت تعمیر ہوتی ہے وہ چاہے بعض ظاہری اشکال میں اس عمارت کی طرح ہو جو مادی نفع نقصان کی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے لیکن وسعت و استحکام میں اس کو اس سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔

اس گروہ میں اگر کوئی شخص سچ بولتا ہے تو اس لئے نہیں بولتا کہ اس کی تجارت خوب چمکے گی بازار میں اس کی ساکھ قائم ہوگی یا یہ کہ وہ سچا اور معزز آدمی کہلائے گا بلکہ وہ صرف سچ اس لئے بولتا ہے کہ اس کے خدا نے اس کو سچ بولنے کا حکم دیا ہے اس لئے وہ ہر حال میں سچ ہی بولیگا وہاں بھی وہ سچ ہی پر قائم رہے گا جہاں اس کو بڑے سے نقصان حتیٰ کہ جان تک کا اندیشہ ہو وہ اگر چوری سے پرہیز کرے گا تو اس لئے نہیں کہ اس کو جیل جانے کا خوف ہے بلکہ وہ اس لئے چوری سے باز رہے گا کہ اس کے خدا نے اس فعل شنیع سے اس کو منع کیا ہے اور اس کو یقین ہے کہ خواہ اس کے چھپانے میں وہ کتنا ہی اہتمام کرے لیکن خدا سے نہیں چھپا سکتا نہ اس کی گرفت سے کہیں بھاگ سکتا ہے نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے نہ کسی کی سفارش اس کو بچا سکتی ہے وہ کسی شخص کو ستائیگا نہیں اس لئے نہیں کہ اس کو اس شخص یا اس کے قبیلے یا اس کی قوم کی طرف سے انتقام کا اندیشہ ہے بلکہ وہ اس لئے

کسی کو نہیں ستائے گا کہ اس کا خدا ظالموں کو پسند نہیں کرتا وہ اپنے خاندان کی اپنی پارٹی کی اپنی قوم کی ناجائز باتوں میں حمایت نہیں کرے گا چاہے یہ سب اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہو جائیں کیونکہ اس کے خدا نے اس کو ایسا ہی حکم دیا ہے وہ اپنی جان کے پیاسے دشمنوں کو بھی معاف کرنے کے لئے تیار رہے گا محض اس لئے کہ خدا درگزر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے غرض یہ کہ وہ جتنے اچھے کام کرے گا تو اس میں اس کے پیش نظر کوئی مادی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ اپنے خدا کی رضا مطلوب ہوگی اور وہ جتنی برائیوں سے پرہیز کرے گا تو کسی مادی نقصان کے خوف سے نہیں بلکہ خدا کا خوف اس کو ایسے افعال سے باز رکھے گا حتیٰ کہ اگر وہ کسی بیمار کی خدمت، ہمسایہ کی اعانت، ضرورت مند کی مدد اور مظلوم کی امداد یا کوئی بھی نیک کام کرے گا تو اس نیک کام کا اشتہار دینے کے بجائے اس کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرے گا کیونکہ اس کو دنیا والوں سے نہیں بلکہ اس خدا سے اس کا اجر لینا ہے جو ہر بات سے یہانتک کہ نیتوں تک کے حال سے واقف ہے۔

پھر اس طبقہ کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کا ماننے والا خود نیک بن جانے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ تمام عالم انسانی کو آواز دے گا کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے آؤ انھیں قائم کریں اور پروان چڑھائیں اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی آئی ہے۔ آؤ انھیں دبائیں اور مٹائیں اس طرح اپنے خون و پسینے سے سینچ کر ایسا باغ لگانے کی کوشش کرے گا جس سے دوسرے لوگ پھل کھائیں۔

مختصر یہ کہ اس کا ہر نیک کام مادی نقطۂ نظر رکھنے والے کے اسی طرح کے نیک کام سے اپنی وسعت و گہرائی نوعیت و نتائج کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوگا کیونکہ ان دونوں میں جوہری فرق ہوگا۔

خدا پرستانہ اخلاق انسان میں جو احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک امیر رات کو چراغ کی روشنی میں جماعت کا کام کر رہا ہے اس وقت ایک شخص اس کے پاس آتا ہے اور اس کے ذاتی معاملات کے متعلق گفتگو کرتا ہے امیر اتنی دیر کے لئے چراغ گل کر دیتا ہے جب اس سے اس کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ اس چراغ میں اُمت کے بیت المال سے تیل جل رہا ہے مجھ کو حق نہیں تھا کہ اس کی روشنی میں اپنے ذاتی معاملات کی گفتگو کرتا ایسے بہت سے واقعات مثال میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اب تھوڑے سے تامل سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ دو مختلف سرچشموں سے نکلنے والے اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے معاشرے ایک دوسرے کی ضد ہوں گے بہ ظاہر بعض باتوں میں چاہے ان میں مماثلت ہو لیکن مقصدی اختلاف ہونے کی وجہ سے دونوں میں بعد المشرقین ہوگا صورت و شکل کے اعتبار سے بالکل ایک طرح کے ایک کام کی غرض و غایت ایک کے یہاں ایک ہوگی اور دوسرے کے یہاں اس کے خلاف بالکل دوسری[۱]

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں　　　　کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

مادہ پرستانہ اخلاق پر جو سوسائٹی بنتی ہے اس کو تو آج ہر شخص دیکھ رہا ہے اور اس کے جو پھل انسانیت کو مل رہے ہیں وہ بھی ہر شخص کے سامنے ہیں کیونکہ اس زمانے میں اسی نظریہ کا چلن ہے۔ کہیں کہیں جو خدا کا نام زبانوں پر آجاتا ہے اور بہ ظاہر خدا پرستی نظر آتی ہے وہ یا تو خدا پرستی سرے سے ہے ہی نہیں خود پرستی ہے خدا کا نام محض استعمال کیا جاتا ہے یا اگر ہے تو بہت محدود ـــــ انفرادی معاملات تک محدود ہے ـــــ یا پھر اس میں بہت سے خدا شریک ہیں جس سے وہ نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے جو اس خالص خدا پرستی سے ظاہر ہوتے ہیں جو زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے ایسی خدا پرستی سے جو اخلاق پیدا ہوتا ہے وہ خالص مادہ پرستانہ اخلاق سے مختلف نہیں ہوتا اس لئے یہ بھی اسی نظام اخلاق کی بیشمار دوسری قسموں میں سے ایک قسم ہے ہاں تو مادی اخلاق کو تو آج ہر شخص برت رہا ہے اور بھگت رہا ہے البتہ خدا پرستانہ اخلاق پر جو سوسائٹی بنتی ہے سر دست وہ دنیا میں موجود نہیں ہے[۱] اگر اس کو دیکھنا ہو تو اس کی تصویر تاریخ کے صفحات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یا آنکھیں بند کر کے عالم تصور میں نظر آ سکتی ہے ـــــ اخلاق کی دونوں قسمیں آپ کے سامنے ہیں اور ان دونوں کے ثمرات و نتائج بھی آپ دیکھ سکتے ہیں اب ٹھنڈے دل سے غور کر کے فیصلہ کیجئے کہ آپ کس کو پسند کرتے ہیں؟ (سہ روزہ "الانصاف" الٰہ آباد)

[۱] وہ سرے سے مفقود نہیں ہے ہاں نادر الوجود ضرور ہے۔ (مدیر)

ہماری نظر میں

آپ حج کیسے کریں

"آپ حج کیسے کریں؟" — مرتبہ:- محمد منظور نعمانی — ضخامت ۳۱۱ صفحات، کتابت نظر افروز، طباعت دیدہ زیب، خوبصورت گردپوش سفید چکنا کاغذ، مجلّد قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:- کتب خانہ "الفرقان" گوئن روڈ لکھنؤ (بھارت) — "زیارۃ حرمین شریفین" اور "مناسک حج" پر یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی "جذب القلوب الی دیار المحبوب" کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں اُردو زبان میں خاص اہمیت رکھتی ہیں:- (۱) "فضائل حج" — مولانا زکریا صاحب (شیخ الحدیث) (۲) "زیارۃ الحرمین" — مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (۳) "معلم الحجاج" — مفتی صاحب مظاہر العلوم (۴) "سفر نامۂ حجاز"[1] — مولانا عبدالماجد دریابادی۔ (۵) "رفیقِ حج" — مولانا احتشام حسین کاندھلوی — اور جناب الیاس برنی کا سفر نامہ!

ان کتابوں کی افادیت اپنی جگہ مسلّم، مگر مولانا محمد منظور نعمانی مدیر "الفرقان" نے "حج" پر جو کتاب (آپ حج کیسے کریں؟) مُرتب فرمائی ہے، وہ اپنی جگہ ممتاز اور منفرد ہے! فاضل مرتب کے قابلِ قدر اور مفید مضامین کے علاوہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا احتشام الحسن کاندھلوی اور ڈاکٹر میر ولی الدین (پی، ایچ، ڈی) کے مقالے[2] بہت خوب ہیں!

مولانا محمد منظور نعمانی کو اللہ تعالیٰ نے قلب دردمند عطا فرمایا ہے، اس لئے اُن کے سیدھے سادے اندازِ بیان میں بھی تاثیر ہوتی ہے، اُن کا قلم برسوں سے تبلیغِ دین کی خدمت انجام دے رہا ہے یہ گراں قدر کتاب بھی اسی جذبہ کی مظہر ہے!

عیدین اور جنازے کی نماز کی ترکیب ہی سے جب مُسلمان عام طور پر بے خبر ہیں تو "حج" جس کی سعادت ہزاروں میں دو چار کو زندگی میں ایک بار سے زیادہ میسر نہیں آتی، اُس کے مسایل کسے یاد رہتے ہیں، اس کتاب میں نہایت تفصیل اور شرح وبسط کے ساتھ حج کے آداب، طریقے اور مسایل بیان کئے گئے ہیں — "شوط" "رمل" "رمی" "استلام" "تلبیہ" اور "اضطباع" جیسی اصطلاحات کی عام فہم تشریح کی گئی ہے، یہ وہ فقہی اصطلاحیں ہیں جن سے آج کل کے عوام مسلمانوں کے کان افسوس ہے کہ نا آشنا ہیں!

صفحہ ۲۳۹ پر "گیت" کی جمع "گیتیں" لکھی گئی ہے، ممکن ہے "لفظ" کی طرح لکھنؤ اور اُس کے مضافات وحوالی میں گیت کو بھی مونث بولتے ہوں — مولانا سید ابوالحسن علی نے اپنے مقالہ کے حاشیہ پر اس روایت کو نقل کیا ہے — "ایک صاحب نے تقریر کرتے ہوئے کہا "من یطع اللّٰہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصہما فقد غوی" (جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرے، راہِ راست پر ہوا اور جوان دونوں کی نافرمانی کرے وہ گمراہ ہوا) حضورؐ نے اس کو ناپسند کیا کہ اللہ کا اور آپ کا ذکر اس طرح ایک لفظ میں کیا جائے جس سے دونوں کی برابری محسوس ہو، آپ نے فرمایا "بئس الخطیب قوم انت" "تم بہت بُرے مقرر ہو" — مگر اسی مضمون کے صفحہ ۱۵۸ پر مولانا علی میاں نے اس مصرعہ کو نقل فرمایا ہے

؎ صد شکر کہ ہستند میانِ دو کریم

---

[1] اس سفر نامہ کا دوسرا ایڈیشن ہمارے پاس تبصرہ کے لئے آیا ہے، جس پر آئندہ اشاعت میں ان شاء اللہ تبصرہ کیا جائے گا!

[2] اس کتاب میں مقالوں کے علاوہ نظمیں بھی ہیں، لفظوں کی اوّل تو کوئی خاص ضرورت ہی نہ تھی اور نظمیں رکھی گئی تھیں تو اُن کو مقالوں سے گھٹ کر نہ ہونا چاہیئے تھا۔

"من یعصمہا" اور "دو کرم" کی ایک ہی صورت ہے، عقیدت کے اسی غلو سے حضورؐ نے روکا تھا!

یہ کتاب "حجاج" کے لئے بہترین گائیڈ کی حیثیت رکھتی ہے، یہ اگر ساتھ رہے تو پھر کسی معلم کی رہنمائی کی ضرورت نہیں "آپ حج کیسے کریں؟" یوں بھی عام مسلمانوں کے پڑھنے کی چیز ہے، بعض مقامات پر پڑھنے والے کی پلکیں بھیگے بغیر نہیں رہ سکتیں، خدا کے خوف اور رسولؐ کی محبت میں دو چار آنسو بھی نکل جائیں تو یہ کیا کم سعادت ہے؟

المکالمۃ الاعظمیہ

حصہ اول و دوم مع کلید صفحات ۱۶۳ و ۱۶۰، مصنفہ محمد حسن الاعظمی شائع کردہ رابطۃ التالیف والترجمہ حیدر آباد دکن ــ ملنے کا پتہ:- انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدر آباد دکن،

زیر نظر کتاب محمد حسن الاعظمی صاحب کی تالیف ہے، اعظمی صاحب اپنی سیاسی و علمی جد و جہد کے باعث گمنام نہیں ہیں۔ موصوف نے غالباً ہندوستان میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مصر کا سفر کیا جامعہ ازہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید چند سال مصر میں مقیم رہے ہیں اسی مدت میں انھوں نے عربی زبان کی طرف خاص توجہ کی اور اردو کی تعلیم کے فرائض بھی انجام "المکالمۃ الاعظمیہ" جیسا کہ موصوف نے اپنے دیباچہ میں اعتراف کیا ہے کہ مصر کے ابتدائی درجوں کی چند ریڈروں کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب عربی ریڈر کا اردو ایڈیشن ہے عربی جملوں کے اردو ترجمہ اور اردو جملوں کے عربی ترجمہ کو چند درس اور مشقوں میں تقسیم کر دیا ہے اس کوشش میں وہ بالکل ناکام نہیں ہیں، اعظمی صاحب کی یہ کوشش مستحق حوصلہ افزائی ہے البتہ اپنے مقدمہ میں انہوں نے ہندوستان کی عام عربی دانی کا جو شکوہ کیا ہے اس میں انہوں نے اپنے کارنامہ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی خاطر اہل علم حضرات کی بڑی حق تلفی کی ہے، موصوف نے اپنے دیباچہ میں ہندوستان میں مشہور لطیفہ "تعلت الوضو، اور قرأت الصلوۃ" کو ایک مسلّم حقیقت سمجھ کر برصغیر ہند و پاکستان کے تمام اہل علم کو عربی ادب سے ناآشنا ظاہر کیا ہے، شاید اعظمی صاحب کا تعلت الوضو، اور قرأت الصلوۃ بولنے والے علماء سے تعلق رہا ہے یا ایسے ادب ناآشنا مدرسین سے علم حاصل کیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پچاس برس کے عرصہ میں ہندوستان و پاکستان کے کسی عالم دیگر عالم کی قابلِ اعتماد (یہ لفظ موصوف کا ہے) عربی تصنیف نہیں دیکھ سکے، حالانکہ اس مدت میں ایک سے زیادہ علماء نے خالص فصیح عربی زبان میں قابل قدر کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا خود مصر، عراق، اور شام کے علماء نے اعتراف کیا ہے، ــ نواب صدیق حسن خاں مرحوم، مولانا شبلی مصنف "الانتقاد علی التمدن الاسلامی" مولانا انور شاہ رح، مولانا عبدالحی رح مصنف "نزہۃ الخواطر" (۸ جلدیں) مولانا حمید الدین فراہی مصنف نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ وغیرہ کی عربی تصانیف کا اگر اعظمی صاحب کو علم ہوتا تو پچاس برس کی مدت عربی مصنفات سے خالی نظر نہ آتی، نہ اس برصغیر کے علماء کی عربیت سے عدم واقفیت کا شکوہ کرتے، حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال کے عرصہ میں بھی ملک میں متعدد صحیح عربی لکھنے اور بولنے والے حضرات تھے اور اب بھی اعظمی صاحب سے بہتر لکھنے اور بولنے والے اس برصغیر کی نمائندگی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں،

مقام تعجب ہے کہ جہاں علامہ جلیل عبدالعزیز میمن صدر شعبہ ادب عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، موجود ہوں جن کی خالص ادبی تصانیف اور فن عربی لغت و ادب پر وسعت نظر اور تحقیق کو سارا بلادِ عرب تسلیم کرتا ہو ــــ جس ملک میں علامہ سید سلیمان ندوی جیسا فرید عصر موجود ہو جس نے سنہ ۱۹۲۶ء کی موتمر اسلامی منعقدہ مکہ معظمہ میں ہندوستان کے صدر کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور جس نے اپنی بلیغ عربی تقریر کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کا خلافت کے بارے میں نقطۂ نظر واضح کیا جسے سن کر خود عربوں نے اظہار حیرت کیا، جس مردم خیز ملک میں عبداللہ یوسف سورتی جیسا فاضل جلیل اور محقق گزرا ہو جس نے کتاب "الجمہرۃ ابن درید" جیسی لغت کی تصحیح و اصلاح کا کام انجام دیا ہو، جس ملک میں حکیم اجمل خاں مرحوم گزرے ہوں، جو فن طبابت کے امام ہونے کے

علاوہ عربی زبان کے ایک اچھے ادیب تھے اور جن کو اُن کے علم و فضل کے پیش نظر دمشق کے المجمع اللغوی العربی نے اپنا ممبر منتخب کیا تھا۔

جس ملک میں ابوالحسن علی ندوی، مسعود عالم ندوی، مولانا یوسف بنوری صدر شعبۂ تفسیر مدرسہ الہ یار (سندھ) مولانا بدر عالم میرٹھی، عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا طلحہ صاحب ندوی، ابواللیث ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی ازہری (صاحب التخصیص فی الازہر) اور محمد ناظم ندوی، عبدالرزاق ملیح آبادی وغیرہ جیسے عربی لکھنے اور بولنے والے حضرات موجود ہوں جن کی تبلیغی، ادبی، اور درسی کتابوں تقریروں اور ترجموں کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ "فاران" کے صفحات ان کے اجمالی ذکر کے لئے بھی کافی نہیں ہیں، جس ملک میں اتنی تعداد میں عربی لکھنے والے اور فصیح زبان بولنے والے موجود ہوں اس کے متعلق اعظمی صاحب کا شکوہ کس قدر غلط اور لاعلمی پر مبنی ہے، اور اس کے معلمین کی عربی دانی کا کیا علم ہو سکتا ہے وہ تو "فعلت الوضوء اور قرأت الصلوٰۃ" بولنے والے حضرات کی صحبت میں رہے چنانچہ اس ناقص تعلیم اور غیر ادبی ماحول کا اثر ان کی زبان و لہجہ پر مصر سے واپسی کے بعد بھی باقی ہے،　　خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

موصوف کو مصری اخبارات و رسائل کے علاوہ ہندوستان کی علمی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ اپنے ملک کے اہل علم کے کارناموں کے متعلق غلط بیانی سے محفوظ رہیں، ہندی علماء جو مصر سے اعلیٰ سندیں حاصل کر کے آئے ہیں ان کا بیان ہے کہ اعظمی صاحب جو ہمیشہ اپنے آپ کو من علماء الازہر لکھا کرتے ہیں ان کے پاس ازہر کی سب سے گھٹیا سند جو ہندوستان کے پرائمری یا مڈل اسکول کے سرٹیفکٹ کے برابر ہے یعنی شہادۃ الاغراب یا شہادۃ الغرباء" ہے .... یہ سند اس غیر مصری طالب علم کو دی جاتی ہے جو مصر میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ازہر میں اپنے آپ کو اس حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ وہ قرآن کریم اور عربی الفاظ پڑھ سکتا ہے، ازہر یونیورسٹی ازراہِ غرباء (دیسی لوگ) نوازی اسے اپنے در سے محروم نہیں کرتی اور شہادۃ غرباء عنایت کرتی ہے جس کی رو سے وہ نماز روزہ اور معمولی مسائل فقہ کا جاننے والا سمجھا جاتا ہے۔

یہ تو "المکالمۃ الاعظمیہ" کے دیباچہ کے متعلق عرض کیا گیا، اب نفس کتاب کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے یہ عربی ریڈر کا اردو ایڈیشن ہے البتہ ہندوستان کی مناسبت سے ملک کے چند مقامات کے نام اور شہر کا اضافہ کر دیا گیا ہے مگر اس میں کوئی ترتیب خاص نہیں ہے نحو کے ماتحت جو صرف و نحو کے قواعد بیان کئے گئے ہیں ان میں اور مشقوں میں ہم آہنگی نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دو کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اگر کوئی ایک کتاب سامنے ہوتی تو اس کے قواعد اور مشقیں انمل اور بے جوڑ نہ ہوتیں اور کتاب اس نقص سے پاک ہوتی۔

اردو مشقوں کے جو عربی ترجمہ کلید میں مندرج ہیں وہ بھی ادبی غلطیوں اور لغزشوں سے خالی نہیں صلات اور زبان کی دوسری غلطیاں بکثرت نظر آتی ہیں صفحہ ۸۳ (جزء ثانی) شکا صاحب الاطیان من المزارعین لانہم لم یدفعوا لہ الایجار "من" کا استعمال صحیح نہیں ہے "شکا" کا مفعول بغیر "من" کے استعمال ہوتا ہے، شکوت زیداً میں نے زید کی شکایت کی البتہ جس سے شکایت کی جاتی ہے اس پر "الیٰ" داخل ہوتا ہے جیسے "شکوت زیداً الی الحاکم" میں نے زید کی حاکم سے شکایت کی، "شکوت الی وکیع سوء حفظی" میں نے وکیع سے اپنے سوء حافظہ کی شکایت کی،

جزء اول صفحہ ۶۳　　میں نے راستہ میں ایک گنی پائی کا ترجمہ لکھا ہے "لقیت جنیہا فی الطریق" یہاں "لقیت" کے بجائے "وجدت" یا "التقطت" ہونا چاہیئے یا عثرت علی جنیہ" بھی کہا جا سکتا ہے، مگر "لقیت" کا یہ محل استعمال۔

کلید سبق ۲۵ مشق (صفحہ ۱۰۹) کیا تم نے کل آگ دیکھی؟ یہاں پر آگ کے بجائے آتش زدگی یا آگ لگنے ہونے کا

لفظ ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا ترجمہ حریق کیا ہے، اور حریق مطلق آگ کو نہیں کہتے بلکہ آتش زدگی کو کہتے ہیں، وہ فٹ بال کھیل رہا ہے اس کا ترجمہ کلید صفحہ ۱۴۲ میں ہے "ہو یلعب کرۃ القدم" ہے "بکرۃ القدم" ہونا چاہیئے — جزء ثانی صفحہ ۴۰، معین وقت کا ترجمہ "الوقت الملائم" لکھا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے، میعاد یا "الوقت المعین" ہونا چاہیئے "الوقت الملائم" مناسب وقت کو کہتے ہیں، "بلح" مصر میں مطلق کھجور کو کہتے ہیں خواہ تازہ ہو یا خشک مگر عربی زبان میں "بلح" گدر (پکنے سے کچھ قبل) کھجور کو کہتے ہیں، تازہ کھجور کے لئے "بلح" صحیح نہیں اس کے لئے صحیح لفظ "رُطب" ہے

جزء ثانی صفحہ ۸۷ "الخیرون ودن غیرہم حقیقیون ان یکونوا سعداء" کا ترجمہ کلید صفحہ ۱۴۶ میں یہ کیا ہے صرف نیک لوگ نیک بختی کے حقدار ہیں — ایک تو یہ ترجمہ ناقص ہے، دوسرے "خیّرون" کا ترجمہ نیک لوگ بھی ناقص ہے بلکہ اس کا صحیح ترجمہ "مخیّر" کارِ خیر کرنے والے یا "کریم وجواد" ہے، اس کے علاوہ "حقیقیون" کے بجائے "احقاء" ہونا چاہیئے کیونکہ "حقیق" کی جمع ہے اور یہی اس کا محل استعمال ہے اس کے معنی لائق کے ہیں، "حقیقۃ" کی طرف نسبت کرنے کی صورت میں "حقیقی" صحیح ہو سکتا ہے مگر اس کا یہاں کوئی محل نہیں، کیونکہ حقیقی کے معنی حقیقت پسند (R E A L I S T) ہیں اور آج کل اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے "تفصیل الثوب" کے معنی کپڑا تیار کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ کپڑا تیار کرنا "سینا" کے معنی میں عربی زبان میں "خیاطۃ" اور تیار کرنے کو "تجہیز" کہتے ہیں، کپڑا تراشنا اور بدن کے مطابق قطع برید کو "تفصیل" کہتے ہیں، "الخیاط یفصل الثوب" کے معنی ہیں، درزی کپڑے کو جسم کے مطابق تراشتا ہے اور سینے کے لئے "خیاطۃ" اور تیار کرنے کے "تجہیز" ہے مثلاً اگر کسی درزی سے عربی میں ہم یہ کہیں کہ "لم تفصیل ہذا الثوب" تو اس کے معنی یہ نہیں کہ تم نے کپڑا تیار نہیں کیا، بلکہ اس کے معنی ہیں تم نے اس کو فٹ نہیں کیا، یعنی اس کی تراش صحیح نہیں ہے — جزء اول صفحہ ۴۰ — چپو کا ترجمہ "مجزف" (ز سے) لکھا ہے مگر یہ لفظ دال اور ذال سے "مجداف" اور "مجذاف" (یا مجدف و مجذف) مگر "مجزف" تو کسی طرح صحیح نہیں ہے شاید یہ خیال ہو کہ کاتب کی غلطی ہے مگر یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کی جمع بھی "مجازیف" (ز سے) لکھی ہے اور متعدد مقامات اور کلید میں بھی اسی طرح ز سے ہے اس لئے مصنف کی غلطی کو بیچارہ کاتب کے سر تھوپنا کسی طرح روا نہیں ہے،

"ضخمۃ" کا ترجمہ گھنا کیا گیا ہے، "اشجار غابات امریکا ضخمۃ وعالیۃ" کا ترجمہ ہے امریکہ کے جنگلات کے درخت گھنے اور اونچے ہیں (کلید ۱۲۷) گھنا کا لفظ اردو زبان میں چند چیزوں کے قریب قریب ہونے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے گھنی آبادی گھنا جنگل گھنی ڈاڑھی، عربی زبان میں "ضخم یا ضخمۃ" کے معنی موٹا اور ضخیم "شجرۃ ضخمۃ" کے معنی بڑا اور تناور درخت کے ہیں،

جزء ثانی صفحہ ۱۲۳ "عندنا نقود اقل من عباس" کے بجائے "النقود عندنا اقل منہا عند عباس" یا "نحن اقل مالا (نقداً) من عباس" ہونا چاہیئے، اعظمی صاحب کا ترجمہ خالص ہندی ہے — "قد بحثنا علی کرۃ القدم فی کل مکان" کلید صفحہ ۱۴۴ "علی" کا استعمال غلط ہے "عن" ہونا چاہیئے، — بعض انتہائی فحش غلطیاں ہیں جیسے شاگرد اپنے استاد سے سوال پوچھ رہا ہے (سبق ۱۴، مشق ۱) کا ترجمہ کلید صفحہ ۱۴۰ میں ہے "یسأل التلمیذ عن استاذ" یہ بھی خالص ہندی نژاد اور ادب عربی سے عدم واقفیت کی بنا پر ہے اور "فعلت الوضوء" کم درجہ کی غلطی نہیں ہے "سأل" کا مفعول اوّل بلا حرف جار کے استعمال ہوتا ہے البتہ جس چیز کے متعلق سوال کیا جاتا ہے، یعنی مفعول ثانی پر عموماً "عن" اور کبھی کبھی "ب" حرف جار استعمال ہوتا ہے، قرآن کریم میں ہے "یسألونک عن الساعۃ" تم سے لوگ قیامت کے متعلق دریافت کرتے ہیں، "سأل سائل بعذاب واقع" میں "ب" استعمال ہوئی ہے، اگر اردو یہ ہوتی کہ شاگرد استاذ کے متعلق دریافت کر رہا ہے تو یہ ترجمہ صحیح ہوتا۔

اصل میں غلطی کا سرچشمہ یہ ہے کہ مصری ریڈر میں عربی فقرہ لکھا ہوا تھا۔ اعظمی صاحب نے زبان سے عدم واقفیت کی بنا پر اس کو غلط سمجھا، اور اس کا غلط ترجمہ لکھا اور کلید میں اس کے عربی ترجمہ کو بعینہٖ نقل کر دیا۔ موصوف جب کبھی اپنی طرف سے عربی لکھنے کی یا اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس قسم کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں ——— اس کتاب میں ایک عام غلطی یہ ہے کہ اس میں معرفہ و نکرہ کے استعمال میں یعنی معرف باللام کے استعمال میں کوئی امتیاز نہیں ہے کہ کہاں لام تعریف لانا چاہیئے اور کہاں نہیں، گویا معرفہ و نکرہ کا باب محذوف ہے اور اس میں ہمارے ملک کے اکثر عربی لکھنے والے بکثرت غلطیاں کرتے ہیں، الکتاب کی جگہ پر کتاب اور "الطعام" کی جگہ پر "طعاماً" اور "طعاماً" کی جگہ پر "الطعام" گویا لام تعریف کا داخل کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہیں،

سبق ۹ مشق ۱ — میں اردو کے جن جملوں کا کلید میں ترجمہ ہے وہ ترجمہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اسماء موصولہ کا جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ان میں سے کسی ایک اردو جملہ میں اسم موصول کے استعمال کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اصطبل میں گھوڑے ہمارے ہیں، اس کا ترجمہ کلید میں ہے "الخیول التی فی الاصطبل لنا" حالانکہ اس کا سادہ ترجمہ یہ ہے "فی الاصطبل خیلنا" اگر یہ عبارت ہوتی کہ جو گھوڑے اصطبل میں ہیں وہ ہمارے ہیں تو یہ ترجمہ صحیح ہو سکتا تھا ——— سبق ۱۲ مشق ۱ — "جواہرات زمین میں چھپائے ہوئے تھے" کا ترجمہ کلید میں "سترت الجواہر فی الارض" ہیں "سترت" کا اس جگہ استعمال فصیح نہیں ہے، بلکہ "دُسّت یا خُبئت" نیز "چھپائے ہوئے تھے" کا ترجمہ صرف "سُترت" صحیح نہیں ہے ——— اگر اس قسم کی ادبی غلطیاں اور زبان کے نازک اسلوب ادا اور فرق کو بیان کیا جائے تو ایک دوسری کتاب "الرد علی المکالمۃ الاعظمیہ" بن جائے گی۔

"آج بہت گرمی ہے" کا ترجمہ کلید صفحہ ۱۱۶ میں "الیوم حرارۃ شدیدۃ" لکھا ہے حالانکہ اس کا ترجمہ "الیوم حرٌّ شدیدٌ" ہونا چاہیئے!

"کیا گائے اچھا دودھ دیتی ہے" اس کا ترجمہ کلید جزء ۱ صفحہ ۱۶۲ میں "ھل تحلُبُ" (بصیغۂ معروف) "ھذہ البقرۃ حلیباً نفیساً" کیا ہے مگر یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے کیونکہ "حلب" متعدی ہے، اس کے معنی "دوھنا" ہیں نہ کہ "دودھ دینا" اس لئے "بقرہ" کو فاعل بنانا صحیح نہیں ہے، فصحاء عرب اس کو اس طرح نہیں کہتے بلکہ اس کے لئے "درّ" سے لفظ مشتق کرنا چاہیئے "درّت البقرۃ بلبنہا ای ادرّت" (قاموس للفیروز آبادی) اس کے علاوہ حلیب کی صفت "نفیس" کے بجائے طیب شہی لذیذ "یا حلو" وغیرہ ہونا چاہیئے، ماکولات یا مشروبات کے لئے لفظ "نفیس" ذوق عربیت کے خلاف ہے ——— "طیر" عربی زبان میں مصدر اور "طائر" کی جمع اور کبھی واحد پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن مطلق پرندہ کی نفی کرنے کی صورت میں مفرد یعنی "طائر" پر حرف نفی لانا چاہیئے، لہٰذا اگر یہ کہنا ہو کہ اس درخت پر کوئی پرندہ نہیں، تو عربی میں اس کو اس طرح ادا کریں گے۔ "لا طائر علی ہذہ الشجرۃ" مگر حسن اعظمی صاحب نے "لا طیر علی ہذا الشجر" ترجمہ کیا ہے جو اصول بلاغت کے بالکل خلاف ہے ———

درس ۱۴ ۲ "ای راحل الآن بمبائی" میں "الی بمبائی" ہونا چاہیئے ——— میرے بچے کبھی بھی گلی میں نہیں کھیلتے۔ صفحہ ۱۰۴ — کا ترجمہ کلید صفحہ ۱۶۰ پر "لا یلعب ابنائی قط فی الازقۃ" "قط" کے استعمال میں آج کل عرب کے ادیبوں کو مستثنیٰ کر کے عموماً اخبار نویس معمولی پڑھے لکھے بلکہ متوسط درجہ کے ذی علم غلطی کرتے ہیں، چنانچہ اعظمی صاحب نے بھی وہی غلطی کی ہے "قطّ" زمانۂ گزشتہ کسی فعل کی نفی کے لئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ حال و مستقبل میں نفی کے لئے ———

ہمہ نیز بگو! کتاب نفع سے خالی نہیں جو لوگ عربی زبان سے سرسری طور پر واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے کتاب مفید ہے، البتہ صحیح عربی زبان جاننے کے لئے یہ کتاب کافی نہیں ہے!
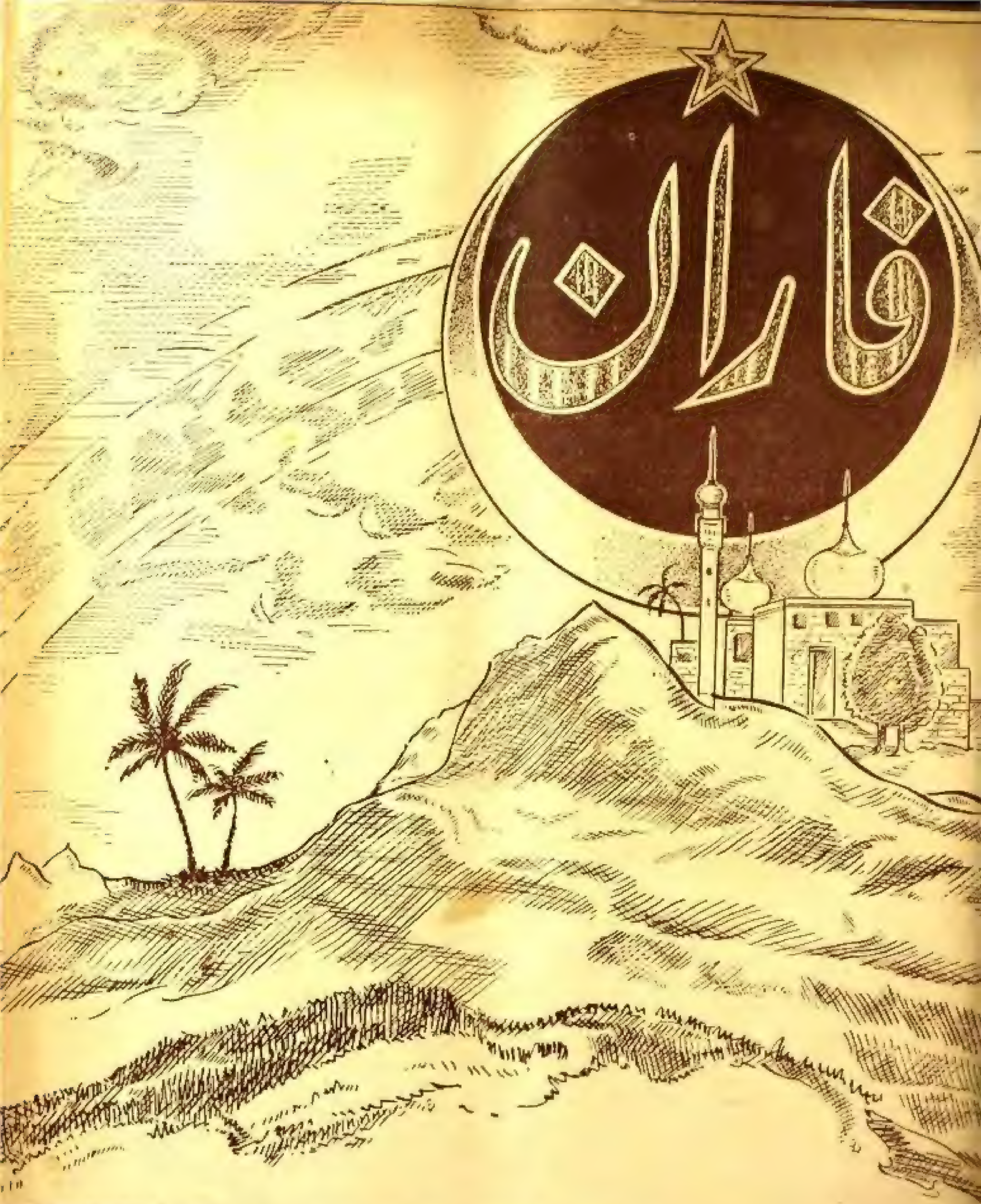
(ا — ع)

فاران

ماہرالقادری

جلد ۳ ———— شمارہ ۷

ماہنامہ

فاران

اکتوبر ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے

۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مُقامِ اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل!

اللہ تعالےٰ کی ذاتِ بے ہمتا کے بعد جتنی عقیدتیں، محبتیں، نیازمندیاں اور وابستگیاں ہیں اُن کے کچھ حدود ہیں، اسلام اُن میں "غلو" کو ناپسند کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ دُنیا کے سب سے بڑے انسان، اللہ کے آخری نبیؐ اور کائنات کے محسنِ اعظم (صلے اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ "مجھے یُونسؑ بن متی پر فضیلت نہ دو۔" کسی سے عقیدت ہو یا نفرت، محبت ہو یا مخالفت اس کے لئے بھی کتاب وسُنت نے حدود مقرر کر دئے ہیں!

جماعتِ اسلامی کو ہم حق پر سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس حماقت میں مُبتلا نہیں ہیں کہ جو کوئی مسلمان جماعتِ اسلامی میں شامل نہیں ہے یا اُس سے تعاون نہیں کرتا وہ دین کے دائرے سے خارج ہے (معاذ اللہ) اور نہ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات اور اُن کے تصورات ومعتقدات اور افکار پر جو کوئی تنقید کرتا ہے اُس کے نیک اعمال حبط ہو جاتے ہیں اور وہ "صالح" کہے جانے کا مُستحق نہیں ہے! اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس مُبالغہ آمیز محبت اور مفرط عقیدت سے بچایا ہے ——— جماعتِ اسلامی فرشتوں کی نہیں انسانوں کی جماعت ہے اور اُس سے فکر وعمل کی غلطی ہو سکتی ہے اور مولٰنا مودودی بھی معصوم نہیں ہیں اُن سے نسیان، خطا اور لغزش کا ارتکاب ممکن ہے۔

یہاں اس کا اظہار کر دینا بھی ضروری ہے کہ "ہم جماعتِ اسلامی کے رکن نہیں ہیں" اور یہ بات ہم کسی خوف کے سبب نہیں کہہ رہے ہیں اور نہ ہمیں اپنے موقف اور پوزیشن کی صفائی پیش کرنی مقصود ہے، اللہ اُس دن کے لئے ہمیں زندہ

نہ رکھے جس دن اس قسم کی کمزوریاں ہمارے نفس میں پیدا ہو جائیں، ہم اپنا معبود، رازق اور نفع و ضرر کا مالک اللہ تعالےٰ کو سمجھتے ہیں، جب تک اللہ تعالےٰ نہ چاہے کوئی قوت ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، اگر بندوں کو خوش رکھنا اور اپنی دنیا بنانا ہی ہمارا مطمحِ نظر ہوتا تو اس کے لئے بہت سی دوسری راہیں موجود تھیں، "فاران" کا ایک ایک صفحہ گواہ ہے کہ ہم نے اظہارِ حق میں کمزوری نہیں دکھائی اور کسی بڑی سے بڑی طاقت اور شخصیت کے عتاب کی پروا نہیں کی!

ہم نے **جماعتِ اسلامی** کے بعض ارکان کی زندگیوں کا قریب سے مطالعہ کیا ہے، اُن کے نماز روزے کو بھی دیکھا ہے، بندوں کے ساتھ اُن کے تعلقات اور حقوق و فرائض کا بھی جائزہ لیا ہے ان کی معیشت کے حلال وسائل اور کسبِ معاش کے پاکیزہ ذرائع کو بھی پرکھا ہے، ہم نے اُن کے جلسے اور اجتماعات ہی نہیں اُن کی خلوتیں بھی دیکھی ہیں ——— پس ہم "جماعتِ اسلامی" کا رُکن بننا چاہیں بھی تو ایسے پاکیزہ لوگ ہم جیسے "**اہلِ قال**" کو اپنی جماعت میں شامل کس طرح کر سکتے ہیں اور نہ انہیں ایسا کرنا چاہیئے کہ جماعتِ اسلامی میں وہی لوگ بار پا سکتے ہیں جنھوں نے اللہ تعالےٰ کی رضا کے لئے نفس کے چٹخاروں کو چھوڑ دیا ہو اور ہم اس چکر سے ابھی تک پوری طرح نکل ہی نہیں پائے ——— جو "جماعت" تمام دُنیا میں اللہ کا دین اور اسلام کا دستور قائم کرنے کے لئے اُٹھی ہو اُس کے ارکان کو فہم و بصیرت کے علاوہ کردار و عمل کے اعتبار سے بھی بلند تر ہونا چاہیئے، پس جماعتِ اسلامی نے اپنی رُکنیت کے لئے جو محتاط اور سخت شرائط مقرر کی ہیں اُس کیلئے وہ مستحقِ تبریک و تحسین ہے۔

جماعتِ اسلامی کوئی سیاسی جماعت اور پولیٹیکل پارٹی نہیں ہے اور نہ وہ کوئی اس قسم کی "مذہبی جماعت" ہے جو مسلمانوں سے نماز پڑھوانے تک ہی اپنی کوششوں کو محدود رکھے، وہ تو مسلمانوں کو اللہ کا یہ پیغام سُناتی ہے کہ اللہ کے دین (اسلام) میں پُورے کے پورے داخل ہو جاؤ، یہ نہ ہو کہ کچھ زندگی منافقانہ اور باغیانہ ہو اور کچھ مومنوں جیسی! اللہ تعالےٰ کو یہ نفاق یہ دو عملی اور یہ دوغلا پن پسند نہیں ——— صرف "اللہ کا دین" مدرسوں، کارخانوں، بازاروں اور دفتروں سے لیکر حکومت کے ایوانوں اور فوج کی بارکوں تک! فرماں روائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کو زیبا ہے اُسی کا حکم، دستور اور قانون نفاذ پانے کا مستحق ہے، دنیا والوں نے اپنی عقل کے زور سے جو قانون اور دستور بنا رکھے ہیں وہ سب کے سب غلط اور غیر فطری ہیں، جماعتِ اسلامی اسی بنیاد پر "اسلامی انقلاب" چاہتی ہے اور اُس کا "انقلاب" کمیونسٹوں جیسا "انقلاب" نہیں ہے اُس کے پیشِ نظر بلکہ یوں کہنا چاہیئے اُس کا مُنتہائے فکر و عمل وہ "انقلاب" ہے جس کو انبیاء کرام نے ہر دور میں برپا کیا ہے اور حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جس انقلاب پر اپنے قول اور عمل سے آخری مُہر ثبت فرما دی، جماعتِ اسلامی تمام عالمِ انسانیت کو اُس راہ پر چلنے کی دعوت دیتی ہے جس راہ میں محمد رسول اللہ کے نقشِ پا نظر آتے ہیں ——— جماعتِ اسلامی کا پُورا لٹریچر اسی اجمال کی تفصیل ہے!

مخالفتیں

جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہمارے اربابِ اقتدار کا جو سلوک اب تک رہا ہے اُس پر ہم نے جان کر تنقید نہیں کی، اس لئے کہ اُن کا یہ سلوک اور برتاؤ ہماری توقعات کے خلاف نہ تھا، جو جماعت یہ کہتی ہو کہ زندگیوں کو کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھالو اور اللہ کے قانون کو پُورے کا پُورا نافذ کرو، اُسے "ملوکانہ اقتدار" کا معتوب ہونا ہی چاہیئے ——— کمیونسٹوں نے "جماعتِ اسلامی" کے خلاف شعر و ادب اور تنقید و صحافت کا جو مورچہ لگا رکھا ہے وہ بھی ہمارے لئے باعثِ حیرت نہیں ہے اور وہ اس لئے کہ جماعتِ اسلامی تمام دُنیا میں اسلامی نظام

کو نافذ کرنا چاہتی ہے اور اشتراکیت کا فکر و عمل کے میدان میں سب سے بڑا حریف "اسلام" کے سوا اور کوئی نہیں ہے،
یہ کمیونسٹ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے امریکی جمہوریت کے کسی ادارے کو برداشت کر لیں مگر "جماعتِ اسلامی"
کو گوارا نہیں کر سکتے کہ اس کی براہِ راست زد اُن کے بُنیادی تصورات پر جا کر پڑتی ہے اور وہ اچھی طرح جانتے
ہیں کہ "کیمونزم" کو "اسلام" کے سوا اور کوئی نظامِ حیات شکست دے نہیں سکتا۔

وہ لوگ جو مغرب زدگی کا شکار ہیں، جن کی زندگیوں میں شراب، قمار بازی، سود خوری، کلب گھروں کی
تعیش سامانیاں، رقص و نغمہ اور مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط داخل ہے وہ بھی "جماعتِ اسلامی" سے ناخوش
ہیں وہ اسے "ملاؤں" کی جماعت کہتے ہیں اور ان کی خفگی بجا ہے کہ جماعتِ اسلامی کی کوششیں کامیاب ہوگئیں
اور نظامِ اسلامی برپا ہوگیا تو ان کی ناؤ نوش کی محفلیں اُجڑ جائیں گی اور کاک ٹیل پارٹیوں، رقص خانوں اور
کلب گھروں میں جن کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اُن کی پیٹھوں پر تازیانے برسیں گے اور اُن پر اسلامی حد جاری کیجائیگی
———— قادیانی جماعت بھی "جماعتِ اسلامی" کی دُشمنی پر آمادہ ہے اور اُس کی دشمنی بجا ہے کہ اسلامی حکومت
میں قادیانی گروہ کی حیثیت "ذمیوں" کی برابر رہ جائے گی، قادیانیت ہندومت، عیسائیت، یہودیت اور بُدھ
ازم کے ساتھ یا اُس کے زیرِ سایہ رہ سکتی ہے مگر "اسلام" کے ساتھ نہیں رہ سکتی ———— ہم نے جماعتِ
اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت میں اُس جماعت کے کتابچے بھی دیکھے ہیں جو قبروں کے طواف، عُرسوں
کی دھوم دھام، اور مزاروں اور درگاہوں پر چڑھاوے چڑھانے کو دین کی بہت بڑی خدمت سمجھتی ہے اور جس
کا مشن ہی ان بدعتوں کی تبلیغ ہے، جماعتِ اسلامی کی بنیاد خدا کی توحید اور رسول اللہ کی رسالت پر رکھی گئی
ہے جہاں خدائے قادر و برتر کے سوا نہ کوئی کارساز ہے، نہ کوئی مشکل کشا ہے، نہ کوئی فریاد رس ہے، نہ کوئی غریب نواز اور
بندہ نواز ہے ———— "**جماعتِ اسلامی**" کو اُن اخباروں نے بھی بہت کچھ بدنام کیا ہے اور اُس پر طرح
طرح کی تہمتیں جوڑی ہیں جن کو "آخرت" سے زیادہ "دُنیا" عزیز ہے اور جو "سرکار دربار" کے تیوروں کے
اشاروں پر نگاہ رکھتے ہیں۔

اتنی مخالفتیں اور بیچاری جماعتِ اسلامی جس کے ارکان کی تعداد سات سَو سے بھی کم ہے، آخر وہ کس کس
کے وار کو روکے گی، آگے پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر نیچے ہر طرف سے اُس پر تیروں کی بوچھار ہو رہی ہے، اِس موت کی
وادی اور خطروں کے طوفان میں وہ کب تک کھڑی رہے گی، جماعتِ اسلامی کے یہ ارکان اپنی جانوں سے بیزار
معلوم ہوتے ہیں ———— نہیں وہ اپنی جانوں سے بیزار نہیں ہیں ہاں! یہ ضرور ہے کہ اُنھوں نے اپنی
جانیں اللہ تعالےٰ کے ہاتھ بیچ دی ہیں اس لئے اُن کی جانیں اور زندگیاں اللہ کے دین کی خدمت کے لئے وقف
ہیں اِس راہ میں جو مصیبت بھی آئے گی وہ اُسے کُشادہ خاطری کے ساتھ برداشت کریں گے اور کر رہے ہیں
لوگ حق کی مظلومیت سے دھوکا کھا کر اُسے کمزور نہ سمجھیں، حق کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ شروع میں بے سہارا اور مظلوم
نظر آتا ہے ہر طرف اُس کی مخالفت ہوتی ہے! ہمارے آقا فخرِ بنی آدم رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جب کوہِ صفا
کی چوٹی سے اعلانِ حق فرمایا تھا تو اُس اعلان کے بلند ہوتے ہی مخالفتوں کے پہاڑ آپ پر ٹوٹنے لگے تھے، کعبہ کے متولی
صنادیدِ قریش، بتوں کے مجاور، طائف کے سرمایہ دار، زانیوں بدکاروں شراب نوشوں اور لٹیروں کی ٹولیاں اور پھر

آگے چل کر مدینہ کے منافقین اور یہودی ان سب کی مخالفت سے حضورؐ کو دو چار ہونا پڑا، مگر تاریخ میں آدھی سطر بھی ایسی نہیں ملتی کہ فرائضِ نبوت کا قافلہ کسی مخالفت سے گھبرا کر ایک سیکنڈ کے لئے بھی کہیں ٹھیرا ہو، سفر مسلسل سفر، کوشش اور پیہم کوشش یہاں تک کہ ابوسفیانؓ جیسے دشمن کو سپر انداختہ ہونا پڑا اور اللہ کا دین غالب ہو کر رہا ——— پس جو کوئی فرد یا جماعت اللہ کا دین برپا کرنے کے لئے کھڑی ہوگی اُسے بھی مخالفتوں کا لازمی سامنا کرنا ہوگا، مخالفتیں تو ارادوں میں اور جان ڈالتی ہیں، پیغامِ حق کے جواب میں ہمیشہ گالیاں ملی ہیں، سیدھی راہ بتانے والوں کے راستے میں سدا کانٹے بچھائے گئے ہیں اور یہی نہیں حق پرستوں کو آرے سے چیرا گیا ہے اور اُن کے جسم لوہے کی کنگھیوں سے کھرچے گئے ہیں! جماعتِ اسلامی جب حق کا پیام لیکر نکلی ہے تو مخالفتوں سے وہ کس طرح بچ سکتی تھی؟ اگر وہ نہ آزمائی جاتی اور اُس کی مخالفت نہ کی جاتی تو تعجب کی بات تھی!

ہم ایسے افراد سے بھی واقف ہیں جو "جماعتِ اسلامی" کو حق پر سمجھتے ہیں مگر اپنی کمزوریوں کو چھپانے کیلئے جماعت پر دبی زبان سے تنقید کیا کرتے ہیں، ایسے افراد اگر "سکوت" اختیار کرتے تو یہ اُن کے لئے بہتر ہوتا، جب ذکر چھڑا ہے تو اس سلسلہ میں ہم ایک واقعہ بیان کرتے ہیں، اب سے کوئی تقریباً چودہ سال پہلے کی بات ہے ورنگل (دکن) میں ——— "اتحاد المسلمین" کا جلسہ ہو رہا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب سید قاسم رضوی کی شخصیت غیر معروف تھی، اسلامیانِ دکن کی زمامِ قیادت نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے دستِ حق پرست میں تھی، شام کا وقت تھا جلسہ کے پنڈال کے شہ نشین[1] پر چند لوگ بیٹھے تھے، نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے ایک صاحب نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں دریافت کیا، نواب صاحب نے فرمایا مولانا ابوالاعلیٰ کی تحریریں میں نے پڑھی ہیں اُن کا کہنا ٹھیک ہے مگر میں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہوں کہ جتنے تیز وہ چل رہے ہیں اس قدر تیز چلنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے ——— تھوڑی دیر تک مجمع پر سکوت طاری رہا، ایک صاحب نے پھر پوچھا، الفاظ مجھے یاد نہیں رہے، روایت بالمعنیٰ کرتا ہوں ——— یہ کہ مولانا مودودی اِس اِس طرح تنقید فرماتے ہیں، اس انداز پر اسلامی انقلاب چاہتے ہیں مگر مصلحتوں کا یہ تقاضا ہے، آخر تدبیر بھی تو کوئی مقام رکھتی ہے ——— نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا کہ "یہ وہ مقام ہے جہاں عمر فاروقؓ کے مشورے[2] کو رد کر دیا جاتا ہے" قوم میں اسی قسم کے اکابر اور اہل الرائے کی ضرورت ہے! ہمارا وجدان کہتا ہے کہ بہادر یار جنگ آج زندہ ہوتے تو جماعتِ اسلامی کی معونت میں سب سے پیش پیش رہتے۔

جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں رسالہ "طلوعِ اسلام" بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ اس "کارِ خیر" (؟) میں سب سے ایک دو قدم آگے ہی ہے اُس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی "کتاب و سنت" کی بنیاد پر اسلامی دستور کی تسوید، تشکیل اور اُس کا نفاذ چاہتی ہے اور "طلوعِ اسلام" کو اس دُنیا میں سب سے

---

[1] اُس وقت اجلاس نہیں ہو رہا تھا۔

[2] مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں حضرتِ عمر فاروقؓ نرمی چاہتے تھے مگر حضرت صدیق اکبرؓ نے تمام مصلحتوں کو ٹھکرا دیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو شخص رسّی کے ایک ٹکڑے کی بھی زکوٰۃ دیتا تھا وہ بھی اُس سے لی جائے گی اور وہ نہ دے گا تو مرتدین کی طرح اُس سے جہاد کیا جائے گا۔ (م)

زیادہ دشمنی سُنّتِ رسول اللہ سے ہے اس کے ماسوا "طلوعِ اسلام" قرآن فہمی اور دینی بصیرت کا اپنے کو اجارہ دار سمجھتا ہے اُس کے کرتا دھرتا جب دیکھتے ہیں کہ جماعتِ اسلامی کو قیادت، مرکزیت اور مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے تو وہ طرح طرح سے پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اُن کے اعصاب پر مخالفت اور رشک و منافست کا کابوس سوار ہو جاتا ہے اور اس عالم میں وہ وہی کہتے ہیں جس کی ایک کابوس زدہ سے اُمید کی جا سکتی ہے:

جن مخالفتوں کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے یہ غیر متوقع اور خلافِ اُمید نہیں ہیں مگر سہ روزہ مدینہ بجنور کی ۱۳ اگست ۵۱ء کی اشاعت کو پڑھ کر جو صدمہ ہوا ہے اُس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں، اُس میں لکھا ہے:-

آہ! یہ فتویٰ! تحریک مودودی اور اسلامی جماعت کے سلسلہ میں کچھ دنوں سے فتاویٰ کا سلسلہ جاری ہے، متعدد اداروں کی طرف سے بیانات بھی جاری ہو چکے ہیں، اس کے متعلق غور و بحث کے لئے علماء کرام کا آج ایک اجتماع ۲۷ شوال ۱۳۷۰ھ یکم اگست ۱۹۵۱ء کو دفتر جمعیۃ علمائے ہند دہلی میں ہوا، اس اجتماع میں شرکت فرمانے والے حضرات نے ایک متفقہ بیان بغرض اشاعت دیا ہے جس پر ان سب حضرات کے دستخط ہیں، بیان کے الفاظ یہ ہیں:-

"مودودی صاحب کی جماعت اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے عام لوگوں پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اُن سے ائمہ ہدایت کی اتباع سے آزادی اور بے تعلقی پیدا ہو جاتی ہے جو عوام کیلئے مُہلک اور گمراہی کا باعث ہے اور دین سے صحیح وابستگی قائم رکھنے کیلئے صحابہ کرام اور اسلافِ عظام سے جو تعلق رہنا چاہئے اُس میں کمی آجاتی ہے نیز مودودی صاحب کی بہت سی تحقیقات سے جو غلط ہیں لوگ متاثر ہو کر گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پھر ان اُمور سے ایک جدید فقہ بلکہ دین ہی کی ایک مُحدث اور نئے رنگ کی بنیاد پڑتی ہے جو یقیناً مسلمانوں کے دین کیلئے مُضر ہے اس لئے ہم ان اُمور پر اور اُن پر مشتمل تحریک کو غلط اور مسلمانوں کیلئے مُضر سمجھتے ہیں اور اُس سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔

مولٰنا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے اس قتل نامہ پر اکابرِ دیوبند کے دستخط ثبت ہیں اس میں دہلی، سہارنپور، لدھیانہ اور امروہہ کے وہ علماء بھی ہیں جو دیوبند سے قریبی نسبت رکھتے ہیں، ہم نے اس تحریر کو پڑھا اور ایک سناٹا سا طاری ہو گیا، جن سے جماعتِ اسلامی کے دینی مقصد کی تائید اور مُساعدت کی توقع تھی اُن کی طرف سے مخالفت کا یہ انداز دیکھ کر اُمید دل کا خُون ہو گیا، حیرت اور کمال درجہ کی حیرت اور افسوس اور شدید ترین افسوس!

؎ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اگر اسلام میں ماتم کی اجازت ہوتی تو ضرورت تھی کہ صفِ ماتم بچھتی اور عُلماء کرام کی اس غلط اندیشی اور

"صد عن سبیل اللہ" پر ماتم کیا جاتا ــــــ حقیقت یہ ہے کہ اکابر دیوبند نے دیوبند کی زرین تاریخ میں ایک سیاہ ورق جوڑ دیا، اُن کے اس کارنامہ پر اُن کے اسلاف کی مقدس رُوحیں شرماتی ہوں گی!

آج مصلحتوں اور عقیدتوں کے دباؤ سے زبانیں بند رہ سکتی ہیں مگر ایک وقت آئے گا جب انصاف وصداقت کی کسوٹی پر گزشتہ واقعات کو پرکھا جائے گا اُس وقت اسلامی مورخ لکھے گا کہ یکم اگست ۱۹۵۱ء کا دن اسلامی تاریخ کا بڑا منحوس دن تھا اور ان علماء کو جن الفاظ سے یاد کیا جائے گا اُس کے تصوّر سے ہماری روح ندامت محسوس کر رہی ہے۔

خلافت کے زمانہ میں مسلمان لیڈروں کو "مولانا" کہا جاتا تھا اور مسلمان وکلاء بھی آج تک "مولوی" کہلاتے ہیں ــــــ ان القاب (مولٰنا اور مولوی) کی ایک تو یہ حیثیت ہے دوسری حیثیت یہ ہے کہ دینی علماء کو "مولوی" اور "مولٰنا" کہا جاتا ہے ــــــ مولٰنا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو "مودودی صاحب" کیا "مودودی" بھی کہا اور لکھا جا سکتا ہے علمی فضیلت، القاب وآداب کی محتاج نہیں مگر اس فتویٰ میں علمأ کرام نے "مودودی صاحب" لکھ کر اپنے علمی معیار اور اُس کے مالہ وماعلیہ کا بہت کچھ اتا پتا دیدیا، اُن کی نگاہ میں عالم، مولوی اور مولٰنا وہی ہو سکتا ہے جس کے سر پر مدرسہ امینیہ دہلی، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور میں دستارِ فضیلت بندھی ہو اور جس نے صرف درسِ نظامی کے ذریعہ علم حاصل کیا ہو ــــــ یہ ہے ان علماء کی نگاہ میں علمی فضیلت کا معیار، ان کے یہاں اسی شخص کو مولٰنا، مولوی اور عالم سمجھا جاتا ہے جس کو درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد باقاعدہ "سند" مل ہو چاہے اُس سے عربی کی ایک سطر بھی ٹھیک طرح پڑھنی نہ آتی ہو، جس نے درسی کتابیں طوطے کی طرح رَٹ لی ہوں جسے نہ اُصولِ فقہ کی خبر ہو اور نہ وہ حدیث وقرآن سے واقف ہو، ہم نے اس قسم کے بعض درسِ نظامی پڑھے ہوؤں کو دیکھا ہے اور اُن کی بے علمی پر افسوس کیا ہے بلکہ بعض کو تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بی-اے اور ایم-اے کی طرح دین وشریعت میں کورا پایا۔

مگر وہ شخص اِن علماء کی نظر میں نہ عالم ہے اور نہ "مولوی" اور "مولٰنا" کہے جانے کا مستحق ہے جس کا سر مدرسوں کی عطا کی ہوئی دستارِ فضیلت سے محروم ہو، چاہے اُس نے دین کو کتنے ہی دلنشین اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہو اور اُس کی کتابیں اُس کی مجتہدانہ بصیرت کی گواہی دے رہی ہوں، حیرت ہے کہ "الجہاد فی الاسلام" "حقوق الزوجین" "مسئلہ جبر وقدر" اور "پردہ اور اسلام" کا مصنف ان علماء کی نگاہ میں عالم نہیں ہے "دار الحرب" پر مولٰنا مودودی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُن کے تفقہ کا پتا دیتا ہے اور "تفہیم القرآن" اُن کی قرآنی بصیرت کی شہادت دیتی ہے! مگر یہ علمی شہادتیں اُن کے یہاں کیوں قبول ہونے لگیں جو "اسناد" کے کاغذ اور دستارِ فضیلت کے پیچوں سے اشخاص کی قابلیت اور علمیت کو ناپتے ہوں۔

دارالعلوم دیوبند علمِ دین کی تحصیل اور تبلیغ کے لئے قائم کیا گیا تھا اُس کا مقصد تحزب اور گروہ بندی نہ تھا مگر افسوس ہے کہ اس وسعتِ نظر میں تنگی پیدا ہو گئی، مولٰنا شبلی نعمانی کو چونکہ دیوبند سے وابستگی نہ تھی اور درسِ نظامی کی کوتاہیوں پر اُنھوں نے مسلسل مضامین لکھے تھے اس لئے علماء دیوبند اُن سے کچھ خوش نہیں رہے اور مولٰنا سید سلیمان ندوی اگر اپنے کو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے وابستہ نہ کر دیتے تو

وہ بھی شاید موردِ عتاب ہی رہتے!

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

جس جمعیۃ علماء کے دفتر میں علماء کا یہ اجتماع منعقد ہوا ہے اُسی کے آرگن روزنامہ "الجمعیۃ"[1] میں مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کی دینی خدمات اور علمی بصیرت کی تعریفیں چھپا کرتی تھیں مگر جس دن مولٰنا مودودی نے "قومیت" کے مسئلہ پر مولٰنا سید حسین احمد مدنی سے اختلاف کیا اُسی دن مودودی صاحب کو جلی سُرخیوں کے ساتھ ـــــ "خطبہ فروش مودودی" اور دوسرے بُرے القاب کے ساتھ یاد کیا گیا، گویا مولٰنا مدنی کی رائے سے اختلاف کے بعد مولٰنا مودودی کی تمام علمی خدمات پر پانی پھر گیا بلکہ اُن کی نیکیاں بُرائی سے بدل گئیں۔

یہ کھچڑی بہت دن سے پک رہی تھی مگر پچھلے چند مہینوں میں اس میں خوب خوب اُبال آئے یہاں تک کہ دلوں کی بات قلم تک آگئی، ہم نے رسالہ "زندگی" (رام پور) میں مولٰنا سید حسین احمد مدنی کا طویل مکتوب بھی پڑھا ہے اور کچھ فتوے اور بعض آراء کے اقتباسات بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں، ہم نے مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں کے وہ ٹکڑے بھی دیکھے ہیں کہ جن کو یا تو مسخ کر دیا گیا ہے یا سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے نکال لیا گیا ہے اور ان پر پھر فتوے صادر فرمائے گئے ہیں۔

دیوبند کے حریفوں نے ٹھیک یہی حربہ اکابر دیوبند کے خلاف استعمال کیا تھا اور اسی قسم کے اقتباسات اور عبارت کے ٹکڑے پیش کرکے مصر وحجاز کے علماء سے فتوے حاصل کئے اور "حسام الحرمین" ترتیب دے کر دُنیا کے سامنے پیش کر دی، اس حربہ سے آج بھی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے، "حلتِ غراب" پر حضرت مولٰنا رشید احمدؒ گنگوہی سے بعض مغالطہ آمیز باتیں منسوب کی جا سکتی ہیں، "علمِ غیب" کے سلسلہ میں حضرت مولٰنا اشرف علیؒ تھانوی کی کتابوں سے قابلِ اعتراض عبارتوں کے کچھ ٹکڑے نکالے جا سکتے ہیں اور "امکانِ کذب" اور "امتناعِ نظیر" کے مسئلوں پر علماء دیوبند کی تحریروں کے بعض اقتباسات پیش کرکے عوام مسلمانوں کو بہت کچھ مشتعل کیا جا سکتا ہے اور مجمل طور پر یہ فریب آمیز رائے دی جا سکتی ہے کہ "بھائی مسلمانو! علماء دیوبند کی کتابوں سے بچے رہنا، اُن میں توہینِ رسولؐ (معاذ اللہ) کی جھلک پائی جاتی ہے اور اُن کا مجموعی اثر قلب پر یہ مرتب ہوتا ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت مجروح ہو جاتی ہے ـــــ" مگر ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو جذبۂ انتقام کے ہاتھوں انصاف واخلاق کی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور ہمارا ضمیر بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہے، ہم اِن اکابر کو اُن کی تحریروں کے غلط سلط اقتباسات کی بنیاد پر بدنام کرکے اپنی آخرت برباد کرنا نہیں چاہتے، جن بزرگوں سے اظہارِ خیال میں لفظوں کی پیچ اوپچ ہو گئی ہے اُن پر ہم "توہینِ رسولؐ" کا الزام کس طرح لگا دیں جبکہ اُن کی زندگی کتاب وسنت کی آئینہ دار تھی اور جن کے قلم سے نکلے ہوئے سیکڑوں اور ہزاروں صفحے خوفِ خدا، اطاعتِ رسُولؐ اور خدمتِ دین کا ثبوت دے رہے ہیں۔

---

[1] یہ تقریباً تیرہ سال پہلے کا ذکر ہے۔

فردِ جرم

مولٰنا مودودی صاحب پر جو فردِ جرم لگائی گئی ہے اُس کا ابتدائی حصّہ یہ ہے :-

" مودودی صاحب کی جماعت اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے عام لوگوں" پر جو اثرات مُرتب ہوتے ہیں اُن سے ائمہ ہدایت کی اتباع سے "آزادی" اور بے تعلقی پیدا ہوجاتی ہے جو عوام کیلئے مہلک اور گمراہی کا باعث ہے اور دین سے صحیح وابستگی قائم رکھنے کیلئے صحابہ کرام اور اسلافِ عظام سے جو تعلق رہنا چاہئے اس میں کمی آجاتی ہے ۔ ۔ ۔ "

اتباع اور پیروی کی ایک تو وہ حیثیت ہے جو ان لفظوں سے عُرفِ عام میں مُراد لی جاتی ہے مگر قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد منصوص اطاعت " رسول اللہ " کی ہے اور " اولی الامر " کی اطاعت بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کی تابع اور اُس کی فرع ہے! پس " اطاعت " کا جو حق اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو عطا فرمایا ہے اس میں کسی صحابی کو بھی شریک نہیں کیا جاسکتا اور رسول اللہ کی طرح کسی کی اطاعت بھی منصوص نہیں ہے اور ہم کسی مسئلہ میں صحابی، تابعی، تبع تابعی یا محدّث و فقیہ کے عمل اور قول کو قبول کرتے ہیں تو اس کی بنیاد یہی عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ عمل اور قول کتاب وسُنّت کا تابع ہے ـــــــــ اسی لئے فرمایا گیا ہے -

" فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ "

اللہ تعالیٰ نے " ائمہ " اور " محدثین و فقہا " کے اقوال و ملفوظات کو نہیں بلکہ کتاب وسنت کو دینی مسائل کی نزاع میں " آخری اور قطعی سند " بتایا ہے -

تقلید کی ضرورت بلکہ اُس کی افادیت کے ہم مُنکر نہیں ہیں، شریعت ہی پر کیا منحصر ہے ہر فن میں پُوری قوم کی قوم مجتہد اور امام نہیں ہوا کرتی، اجتہاد و امامت کا شرف معدودے چند افراد کو میسر آتا ہے اور آدمی " غیر مقلد " بن کر ایک لمحہ کے لئے بھی زندگی نہیں گزار سکتا ـــــــــ شریعت کے معاملات میں ہم ائمہ کرام کے بتائے ہوئے مسائل کی تقلید اس اعتماد کی بنا پر کرتے ہیں کہ اُنھوں نے اُن مسائل کو اپنی فہم اور ممکنہ سعی و تفحص سے اچھی طرح پرکھ لیا ہے اور اُن کی تحقیقات، فیصلے اور اجتہادات کتاب وسنت سے زیادہ سے زیادہ قریب ہیں !

مگر مسائلِ شریعت میں " ائمہ " کی یہ " تقلید " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی " اطاعت " کی طرح منصوص قطعی اور آخری نہیں ہے، پس کتاب وسُنّت پر ایک حرف اور ایک شوشہ کا اضافہ اور ترمیم ممکن نہیں کہ یہ سب سے بڑی گمراہی ہے لیکن کتاب الخراج، کنز و ہدایہ، کتاب الام، مبسوط، شامی، اور عالمگیری پر اضافہ اور ترمیم دونوں ممکن ہیں - ائمہ تو پھر ائمہ ہیں خلفائے راشدین کو جب رسول اللہؐ کی کوئی حدیث مل گئی ہے تو انھوں نے اپنی رائے اور اجتہاد سے رجوع کر لیا اور خود امام ابو حنیفہ رہ کا ارشاد ہے کہ میرے قول کے مقابلہ میں اگر حدیث مل جائے تو میرے قول کو پتھر پر دے مارو ـــــــــ اور پھر علم فقہ ہی کا یہ مسلّمہ اصول ہے کہ مجتہد اور امام کے اجتہاد میں خطا اور صواب کے دونوں پہلوؤں کا امکان ہے !

نبوت کی طرح اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کر دیا گیا، تفقہ اور تدبر و بصیرت پر مُہریں نہیں لگادی گئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور حضور کے ارشادات کے سوا ہر شخص کی ذات، قول اور اُس کے عمل کے بارے میں گفتگو کی جا سکتی ہے بلکہ جرح و تنقید بھی ممکن ہے، پس کوئی اہلِ فکر و بصیرت ائمہ فقہا کے کسی قول اور اجتہاد پر جرح و تنقید یا اُس سے اختلاف کرتا ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہر گز نہیں کہ وہ دین میں گمراہی پھیلا رہا ہے۔ "تقلید" کے اس غلو کو شریعتِ اسلام گوارا نہیں کر سکتی، اس قسم کا مُبالغہ اور اس طرح کی مُفرط عقیدت اسلام کے مزاج کے منافی ہے، اگر اماموں، فقیہوں، اُستادوں اور بزرگوں کی رائے سے اختلاف دینی گمراہی کا سبب ہوتا تو امام ابو یوسفؒ اپنے اُستاد امام ابو حنیفہؒ سے اختلافِ رائے کی جرأت نہ کرتے، جامد اور کورانہ تقلید کے بُت کو امام ابو یوسفؒ کے تیشۂ جرأت نے اُس وقت پاش پاش کر دیا جب کہ فقہ حنفی کی بنیاد رکھی گئی تھی ——— فقہ حنفی میں جگہ جگہ یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں حضرتِ امام ابو حنیفہ کی یہ رائے ہے اور "صاحبین" کی یہ رائے ہے!

ائمہ فقہا نے معاذ اللہ کسی نئی شریعت کی بنیاد نہیں ڈالی تھی اور نہ وہ قانون ساز (LAW GIVER) تھے، وہ تو کتاب و سنت کے شارح، مُفسر اور قانونِ شریعت کی تعبیر کرنے والے تھے، نفسِ قانون اور شرحِ قانون و تعبیرِ قانون کے فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے، تعبیرِ قانون میں دو یا دو سے زائد رائیں ہو سکتی ہیں اور وہاں تنقید و اختلاف کے لئے بھی گنجائشیں ہیں مگر "قانون" سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ پس ائمہ فقہا کے اجتہاد، فیصلہ، رائے یا تعبیرِ قانون سے کوئی اختلاف کرتا ہے تو اس کو "اُصولِ دین" اور "نفسِ اسلام" کے اختلاف یا دین سے بے تعلقی پر محمول کرنا بہت بڑی بے دانشی ہے۔

فقہائے اسلام کے "مذاہب" میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اختلافات خدانخواستہ ایمان، اسلام اور شریعت کے اساسی احکام اور بنیادی اصولوں میں نہیں ہیں، اختلاف صرف فروع میں ہے، مثلاً پنجگانہ نماز کی فرضیت سب کے یہاں مُسلّم ہے اور ہر ایک کے یہاں نماز میں جسم و لباس کی پاکی، قیام، قعود، رکوع، سجود اور قرآن کا کچھ حصہ تلاوت کرنا ضروری ہے، اب کوئی رفعِ یدین کرے یا نہ کرے، "آمین" زور سے کہے یا آہستہ سے، نماز بہر حال ہو جائے گی، ان فروعی اختلافات کو حق و باطل کا سبب قرار دینا اپنی جگہ خود گمراہی ہے۔

کسی مسئلہ میں ائمہ فقہا کے اجتہادات اور فیصلوں کو ایک دوسرے پر ترجیح دینے کے یہ معنیٰ ہر گز نہیں ہیں کہ جس امام کے فیصلہ پر دوسرے امام کے فیصلہ کو ترجیح دی گئی تو اس سے اُس امام کی اہانت ہو گئی، اگر یہ اہانت ہے تو اس جُرم کے مرتکب تمام فقہا ہوئے ہیں کہ انھوں نے تابعین اور صحابہ کرامؓ کے اقوال و اعمال اور آثار و باقیات میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، مثلاً بعض مسائل میں حضرتِ عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ دونوں صحابیوں کے آثار ملتے ہیں اور امام ابو حنیفہؒ ان میں کسی ایک کے قول و عمل کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ اُن کی نگاہ میں کتاب و سنت سے اوفق اور اقرب ہے! اس کوشش اور تفحص پر تو مجتہدین کو اللہ کے یہاں اجر ملے گا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اگر بعض فقہی مسائل میں ایک امام کے اجتہاد پر دوسرے امام کے فیصلہ کو

ترجیح دی ہے یا کسی اجتہاد سے اختلاف کیا ہے، یا کسی فقیہ کی رائے کو کمزور بتایا ہے تو اس سے "دین سے صحیح وابستگی" کو آخر کیا نقصان پہنچ سکتا ہے ——— حضرتِ امام بخاریؒ نے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات پر کیسی کیسی طنزیں کی ہیں مگر ہم نے نہیں سُنا کہ علماء کے کسی اجتماع نے اس جُرم کی پاداش میں امام بخاری علیہ الرحمۃ کی تمام دینی اور علمی خدمات کو پس پشت ڈال کر اُن کے لٹریچر یا مشورت ورائے یا مسلک کو عوام کی مُہلک گمراہی کا سبب قرار دیا ہو۔

عُلماء کرام اور مفتیانِ عظام (اللہ تعالیٰ ان کی زبان وقلم کو ان آلودگیوں سے محفوظ رکھے) نے جناب مودودی کے خلاف جو فردِ جُرم مرتب فرمائی ہے اُس میں ائمہ ہدایت اور اسلافِ عظام کے ساتھ "صحابہ کرام" کا بھی ذکر کیا ہے ... یعنی ابوالاعلیٰ مودودی کا لٹریچر پڑھ کر ... "دین سے صحیح وابستگی قائم رکھنے کے لئے صحابہ کرام اور اسلافِ عظام سے جو تعلق رہنا چاہیئے اُس میں کمی آجاتی ہے"۔

مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کا پُورا لٹریچر موجود ہے، اُنھوں نے جگہ جگہ صحابہ کرام کے آثار کو سند بنایا ہے، اُن (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کی دینی خدمات کو نہایت دلنشین اور موثر پیرایوں میں سراہا ہے، مسلمانوں کو غیرت دلائی ہے کہ صحابہ کرام جیسی سیرت اور کردار پیدا کرو، اور فقہی مضامین میں ائمہ فقہا کے اقوال کے جابجا حوالے دئے ہیں، کیا ان ناموں، تذکروں اور حوالوں کو پڑھ کر ان بزرگوں کے ساتھ تعلق اور مضبوط ہوگا کہ بے تعلقی پیدا ہوجائے گی ——— جس لٹریچر کو پڑھ کر صحابہ کرام سے بے تعلقی پیدا ہوتی ہو وہ مسلمانوں کا نہیں مجوسیوں کا ادب ہے اور ہم ان علماء کو چیلنج دیتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو زبان میں مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی نے جو ادب پیش کیا ہے وہ بہترین ادب ہے اور اُسے پڑھ کر خدا، رسولؐ، صحابہ کرام اور اسلافِ عظام سے علی قدرِ مراتب تعلق مضبوط تر ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کردیں کہ تاریخی واقعات کے سلسلہ میں صحابہ کرام سے انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود ایک مُسلمان مؤرخ یہ لکھ سکتا ہے ... حضرتِ صدیقِ اکبر اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کا دورِ خلافت گزرنے کے بعد حضرتِ عثمان (رضی اللہ عنہ) کے دور میں نظم ونسق کی وہ کیفیت نہیں رہی اس میں کمزوری آگئی ——— یا یہ کہ حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے سب سے پہلے ملوکیت کی بنا رکھی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنایا ——— یا یہ کہ حضرتِ ابو موسیٰ اشعری مسئلہ تحکیم میں حضرتِ عمرو بن العاص کی سیاست کا شکار ہوگئے ——— یا یہ کہ صفین اور جمل کی خونریز جنگیں اسلامی تاریخ کے المناک اوراق ہیں ——— اس قسم کے تاریخی حقایق کا اظہار مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی نے کیا ہے تو اُسے "صحابہ سے بے تعلقی" کہنا سراسر "وہم" ہے، ان تاریخی واقعات میں آنے والے مسلمانوں کے لئے بڑی بصیرتیں اور عبرتیں ہیں۔

مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے متاثر ہونے والوں میں

اثرات!

ہم جیسے "بے عمل" بھی ہیں کہ جو ابھی تک صرف خیالی طور پر مُتاثر ہیں مگر ہم ایسے بہت سے نوجوانوں کو جانتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کے حالات دوسروں کی زبانی ہم تک پہونچے ہیں کہ مولٰنا مودودی اور جماعتِ اسلامی کا لٹریچر پڑھ کر فاسقانہ زندگیاں "تقوے"

سے بدل گئیں، جو نمازیوں کا مذاق اُڑاتے تھے وہ تہجد گزار بن گئے، ہزاروں روپیہ کی ناجائز کمائی کو یک لخت ترک کر دیا گیا، مغرب زدگی اور بے دینی اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی ——— ہم نے کالجوں کے نوجوان طالب علموں کو دیکھا ہے کہ جماعتِ اسلامی سے متاثر ہونے کے بعد اُن کے چہروں پر ڈاڑھیاں آگئیں، بازاروں سے وہ گزرتے ہیں تو نگاہیں نیچی کئے ہوئے، خدمتِ دین کی کیا تڑپ ہے، اسلام کی سر بلندی کا کیا جذبہ ہے، کیسی صاف ستھری اور پاک زندگیاں ہیں، جس جماعت کے لٹریچر نے زندگیوں میں یہ "انقلاب" پیدا کیا ہو اُس کو عوام مسلمانوں کی گمراہی کا سبب بتانا واقعہ کی کتنی غلط اور معکوس تعبیر ہے۔

یہ علماء اگر چاہیں تو ہم اُن کو بعض لوگوں کے نام اور پتے لکھ کر بھجوا سکتے ہیں تاکہ وہ معلوم کر لیں کہ جماعتِ اسلامی سے متاثر ہونے سے قبل اُن کے کیا حالات تھے اور متاثر ہونے کے بعد کیا حالات ہیں؟ شاید تحقیقِ حال کے بعد علماء کو افسوس و ندامت ہو کہ ہم نے یہ کیا کیا؟

ابوالاعلیٰ مودودی کو "ملّا" کہا گیا کہ اُس نے "بنک کے سود" کو حرام بتایا، اُس پر "قدامت پرستی" کی طعن کی گئی کہ اُس نے "تصویر" کو ناجائز کہا، اُس پر جاگیرداروں کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا کہ اُس نے یہ فتویٰ کیوں دیا کہ زمین افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے اور اُسے کرایہ پر اُٹھایا جا سکتا ہے ——— ان خیالات، افکار اور معتقدات میں "ائمہ ہدایت سے بے تعلقی پائی جاتی ہے یا یہ عزیمت اور بصیرت اُن سے تعلق کا پتا دیتی ہے؟

الحاد و مغرب زدگی، اشتراکیت اور آزاد خیالی کے جن مورچوں پر یہ مفتیانِ کرام جاتے ہوئے جھجکتے ہیں اُن مورچوں پر "جماعتِ اسلامی" استقامت کے ساتھ جنگ کر رہی ہے، اُس کے لٹریچر نے بہت سوں کو بے دینی کے طوفان، آزاد خیالی (؟) کی دلدل اور اشتراکیت و مغرب زدگی کے دامِ ہم رنگ زمیں سے نکالا ہے، مگر مقامِ شیون و فریاد ہے کہ جن کی کوشش سراہے جانے کی مستحق تھیں اُن کو بدنام کیا جا رہا ہے، جن سے مساعدت اور تائید کی توقع تھی وہی دشمنی پر آمادہ ہیں،

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اکابر سے کسی مسئلہ میں اختلاف بھی کیا ہے تو اُس میں احترام کو ملحوظ رکھا ہے، مثلاً مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ نے ریڈیو (RADIO) کو آلۂ مزامیر بتایا تھا، مولانا مودودی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ "ریڈیو" کے بارے میں مولانا تھانوی کی اطلاعات صحیح نہیں ہیں ریڈیو آلۂ مزامیر ہرگز ہرگز نہیں ہے یہ دوسری بات ہے کہ اُس سے گانے بجانے کا کام لیا جا رہا ہے ——— ! اس قسم کے فقہی اختلافات کو کیا گمراہی کہہ سکتے ہیں اور اگر کہہ سکتے ہیں تو اس کی زد نہ جانے کس کس پر جا کر پڑتی ہے ——— اور یہ جو فرمایا گیا ہے۔ "اور پھر ان اُمور سے ایک جدید فقہ بلکہ دین ہی کی ایک محدث اور نئے رنگ کی بنیاد پڑ جاتی ہے" یہ بھی ایک تہمت ہے آخر مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی نے کونسا نئے رنگ کا دین پیش کیا ہے اُس کی ایک آدھ مثال ہی بیان کر دی جاتی تو غور و فکر کے لئے کوئی بنیاد تو ہاتھ آجاتی ——— اقتصادیات، معیشت، صنعت و تجارت

اور سیاست و ادب کے جدید اور تازہ ترین مسائل کے سلسلہ میں جماعتِ اسلامی کے لٹریچر میں جو اصطلاحیں اسلوبِ نگارش اور طرزِ بیان ملتا ہے اُس کو یہ "بزرگانِ دین" شاید "نئے دین" سے تعبیر کر رہے ہیں۔

مولٰنا ابوالاعلیٰ مودودی کی غالباً اس قسم کی تحقیق ان علماء کی نگاہ میں غلط ہے بلکہ ان کی طبعِ نازک پر گراں ہے--- کہ حضرتِ یُوسف علیہ السلام کو جب مصر میں حکومت کا اقتدار حاصل ہوا تو یہ نہیں ہوسکتا کہ خدا کے پیغمبر نے کافرانہ نظام کو جُوں کا تُوں رہنے دیا ہو، آپ نے یقیناً اللہ کے قانون اور نیکی کے دستور کو نافذ کیا ہوگا ------ یا جماعتِ اسلامی کے اس قسم کے اندازِ بیان میں شاید اُن کو "نیا دین" نظر آتا ہے ------ کہ "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی شہادت زبان کے ساتھ عمل سے بھی دینی ضروری ہے ------ مُسلمان کی پُوری زندگی ہی نماز ہے، جس طرح نماز میں وہ پاکیزگی کو ضروری سمجھتا ہے اور ارکان کی تعدیل کا خیال رکھتا ہے اسی طرح زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسُول اللہ کے اُسوۂ حسنہ کی اتباع کو ضروری سمجھنا چاہئیے ------ اور نماز روزہ اور حج و زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے کے بعد مُسلمان مطمئن نہ ہوجائے کہ اُس نے اسلام کا حق ادا کردیا، نظامِ حق کے قیام کے لئے جد و جہد کرنا بھی مُسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔

بات بہت طولانی ہوگئی مگر اب بھی بعض گوشے ہمیں تشنۂ شرح و بیان نظر آتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ایک ایک بات کو خوب کھول کھول کر بیان کیا جائے لیکن ایسا ہم کریں تو "فاران" کی یہ پُوری اشاعت "نقشِ اوّل" ہی کی نذر ہوجائے گی، بہرحال جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اُس میں ایسا اجمال نہیں ہے کہ مفہوم مُبہم اور گنجلک ہو کر رہ گیا ہو ------ یہ علماء کرام جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں جس حد پر پہونچ چکے ہیں وہاں سے اُن کی واپسی دُشوار نظر آتی ہے ہم اُن کو اُن کے حال پر چھوڑتے ہیں مگر اس سلسلہ میں اتنا اور عرض کردیں کہ انھوں نے اس طرح مدافعتِ دین کے نام پر خود "دین" کو نقصان پہونچایا ہے اور قیامت کے دن جب اُن سے بازپُرس کی جائے گی تو اُن کا یہ عُذر مقبول نہ ہوگا کہ ہم نے اپنے فتووں کے آخر میں "وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ" لکھ تو دیا تھا اللہ تعالیٰ دلوں کے حال کو اچھی طرح جانتا ہے۔

عوام مسلمانوں کی خدمت میں ہماری گزارش ہے کہ وہ اس قسم کے فتووں کو پڑھنے کے بعد جماعتِ اسلامی کے لٹریچر کو خوب غور سے پڑھیں اور ساتھ ہی جماعتِ اسلامی کے ارکان کی زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ قریب رہ کر دیکھنے کی کوشش کریں کہ ان لوگوں کے خالق اور مخلوق کے ساتھ کس قسم کے معاملات ہیں اس کے بعد ان فتووں کی حقیقت اُن پر آپ ہی آپ واضح ہوجائے گی۔

لوگ فتوے چھاپتے اور اجتماع منعقد کرتے رہیں مگر دین کا قافلہ نہیں رُک سکتا، دُنیا میں نظامِ حق کو برپا کرنے کی لگن جن دلوں میں پیدا ہوچکی ہے وہ کم نہیں ہوسکتی اُسے بڑھنا اور پھیلنا ہے یہاں تک کہ سارا جہان اللہ کے دین سے معمور ہوجائے ---!

ماہر القادری
۲۲ ستمبر ۱۹۵۱ء

سیّد عبدالقدوس ہاشمی

عربی صحافت کی مختصر تاریخ

یوں تو بعض تاریخوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہانِ اندلس کے دربار سے ہفتہ وار اور بعض مرتبہ روزانہ بھی احکام اور واقعات کا قلمی جریدہ شائع ہوتا تھا جس کی متعدد نقلیں امرائے دربار اور حکام کے پاس بھیجی جاتی تھیں، اس مقصد کے لئے بعض بادشاہوں نے مستقل محکمے قائم کر رکھے تھے، ان کو "دار السجلات" کہا جاتا تھا، ایسے دار السجلات، اور دیوان الاحکام کا پتہ، فاطمیوں کے مصر اور عباسیوں کے بغداد میں بھی ملتا ہے۔ لیکن ان جریدوں کو آج کی اِصطلاح کے بموجب اخبار یا جریدہ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ بلکہ ان جرائد کو "گشتی مراسلات" کہنا چاہئے

التنبیہ

تاریخ میں سب سے پہلا عربی جریدہ جسے حالیہ اصطلاح میں جریدہ کہا جاسکے، سنہ ۱۷۹۹ء میں شائع ہوا، یہ وہ سال ہے جس میں نپولین نے مصر پر قبضہ کیا ہے، اس جریدہ کا نام "التنبیہ" تھا، اس میں واقعات وحوادث کم اور فاتح مصر نپولین کے احکام زیادہ تر ہوتے تھے، اس کے ایڈیٹر اپنے زمانہ کے مشہور ادیب سید اسمٰعیل بن سعد الخشاب تھے، یہ روزانہ قاہرہ سے شائع ہوتا تھا، سرکاری مطبع میں چھپتا تھا اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا عربی مطبع موجود ہی نہ تھا،

یہ ایک سرکاری جریدہ تھا، اور اس کی حیثیت سرکاری گزٹ کی تھی، لیکن مرحوم اسمٰعیل خشاب چوں کہ ایک بہت بڑے ادیب تھے اس لئے سرکاری ہونے کے باوجود اس میں ادبی لطائف اور عام ذوق کی بھی بعض چیزیں ہوتی تھیں۔ بعض مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے، اور بعض قدیم کاغذات میں اس کے انتخابات بھی ملتے ہیں۔

میں نے کوشش کی کہ اپنے قیام قاہرہ میں اس جریدہ کا کوئی نسخہ کہیں دیکھ سکوں، لیکن کوئی نمبر مل سکا، حتیٰ کہ "دار الکتب المصریہ" مصر کی قومی لائبریری کے مہتمم نے مجھے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس کا کوئی نمبر کہیں نہیں مل سکے گا۔

الحوادث الیومیہ

مصر کے مشہور مورخ المرحوم عبدالرحمٰن الجبرتی نے اپنی کتاب میں ایک دوسرے روزنامہ کا پتہ بھی دیا ہے جو تقریباً اسی سنہ میں یا شاید اسکے بعد نکلا، یہ بھی ایک سرکاری اخبار ہے، اس کا نام "الحوادث الیومیہ" ہے پروفیسر محمود مصطفیٰ مصری نے جبرتی کے اس بیان کو قیاسی قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس اخبار کا کوئی نمبر مجھے نہیں ملا، اس لئے یہ محض قیاس ہے کہ نپولین کے جریدہ کا نام "الحوادث الیومیہ" تھا، میرا خیال یہ ہے کہ یہ دوسرا جریدہ ہے جو مرحوم اسمٰعیل خشاب نے اربابِ اقتدار کی امداد سے جاری کیا تھا، اور کوئی وجہ نہیں کہ الجبرتی کا بیان کیوں نہ تسلیم کیا جائے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، نپولین کا قیام مصر میں بہت دنوں تک نہیں رہا، وہ اپنے یورپی مصالح کے لئے ۱۸۰۱ء میں مصر کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا، اور مصر پر موجودہ شاہ مصر کے مورثِ اعلیٰ محمد علی پاشا نے دولتِ عثمانیہ کی طرف سے قبضہ کر لیا۔ یہ شخص بڑی غیر معمولی صلاحیت کا آدمی تھا، اس نے زندگی کے ہر شعبہ میں اصلاح و تجدید کا عمل کیا۔ فرانسیسی فاتحین نے مصر سے جاتے ہوئے اپنا مطبع ایک مستشرق یوسف حنا مسال کے سپرد کر دیا تھا، محمد علی پاشا نے وہ مطبع خرید لیا، اور قاہرہ کے محلہ بولاق میں اس مطبع کے علاوہ ایک دوسرا بہت بڑا مطبع قائم کیا جو مطبع امیری کے نام سے مشہور ہے، اس مطبع نے عربی ادب اور عربی زبان کی ایسی خدمت انجام دی ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی، اکثر و بیشتر قدیم کتابیں، حدیث، تفسیر، فقہ، تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کی جدید کتابیں، اسی مطبع کی مطبوعات ہیں۔

اب عربی بولنے والوں کے پاس ایک چھوڑ، دو مطبعے موجود تھے، جن میں یوسف حنا کا مطبع چھوٹا، اور مطبع امیری بہت بڑا مطبع تھا، اس لئے عربی لکھنے والوں کے لئے اشاعت کی آسانی مہیا ہوگئی، اور رسائل و کتب مختلف قدیم و جدید فنون پر چھپنے لگیں،

غالباً "الحوادث الیومیہ" اور "التنبیہ" دونوں جریدے فرانسیسیوں کے مصر سے رخصت ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوگئے، اس کے بعد آئندہ پچیس سال میں کون کون سے اخبار نکلے، نکلے بھی یا نہیں، معلوم نہیں، مصر کے علاوہ دوسرے عرب ممالک اور آستانۂ عالیہ قسطنطنیہ میں بھی کسی عربی اخبار کا پتہ نہیں چلتا،

الوقائع المصریہ مذکورہ بالا دونوں جرائد کے بعد جس عربی جریدہ کا پتہ ملتا ہے وہ دسمبر ۱۸۲۸ء میں سرکاری طور پر شائع ہونا شروع ہوا، اس کا نام "الوقائع المصریہ" ہے، یہ جریدہ اب بھی شائع ہوتا ہے، اور سرکاری گزٹ کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں شاہی فرامین، وزارت کی تجاویز، قوانین، انتظامی احکام اور عدالتی فیصلے شائع ہوتے ہیں، طباعت اور ترتیب دونوں اعتبارات سے یہ ایک ایسا ہی گزٹ ہے جیسے اور دوسرے ممالک میں ہوتے ہیں، کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں۔

اس کا قدیم ترین پرچہ جو مجھے مل سکا، وہ دار الکتب المصریہ میں محفوظ ۱۸۴۸ء کا پرچہ ہے، یعنی اشاعت جریدہ سے تقریباً بیس سال کے بعد کا نمبر، دار الکتب المصریہ میں ۱۸۴۸ء کے بعد سے بھی مسلسل اور غیر منقطع مثل اس جریدہ کی موجود نہیں ہے۔

الرائد التونسی یہ جریدہ غالباً ۱۸۵۰ء میں نکلنا شروع ہوا یہ بھی ایک سرکاری جریدہ تھا جو فرماں روایانِ تونس کی خاص توجہ سے نکلنا شروع ہوا تھا، اس کی حیثیت بھی سرکاری گزٹ کی سی ہے

حدیقۃ الاخبار مشہور لبنانی ادیب و انشا پرداز خلیل فوزی لبنانی کی ادارت میں بیروت سے ۱۸۵۴ء میں یہ اخبار نکلنا شروع ہوا، یہ اگرچہ بالکلیہ غیر سرکاری اخبار تو نہ تھا، بلکہ اسے دولت عثمانیہ سے کثیر مالی امداد ملتی تھی اور یہ زیادہ تر سرکاری اعلانات وغیرہ شائع کیا کرتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ، اشعار، ذکایات، اور ادیبانہ مضامین بھی شائع ہوتے تھے، بعض مورخین نے اس کی ابتداء کا سنہ، ۱۸۵۸ لکھا ہے، لیکن میرے ایک لبنانی دوست یوحنا معلوف کا بیان یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۴ء عیسوی کا مطبوعہ نمبر دیکھا ہے،

مرآۃ الاحوال ادیب مرحوم رزق حسون الحلبی کی ادارت میں ۱۸۵۵ء میں آستانۂ عالیہ قسطنطنیہ سے نکلنا شروع ہوا، یہ جریدہ غالباً سب سے پہلا عربی جریدہ ہے جو سرکاری امداد سے بے نیاز اور سرکاری اثرات سے غیر متاثر نکلنا شروع ہوا، اس کے متعدد پرچے میں نے دیکھے ہیں۔ یہ آج کل کے اخباروں کی طرح ایک اخبار تھا، صورت میں کمتر لیکن سیرت میں بہتر پابندیاں بہت تھیں، اس لئے اتنی آزادی کے ساتھ تنقیدیں تو ممکن نہ تھیں، جتنی کہ آج کے جرائد کر سکتے ہیں، لیکن پھر بھی اس جریدہ میں صداقت نگاری اور ژرف نگاہی کے نمونے ملتے ہیں۔

الجوائب ۱۸۶۰ء میں مشہور و معروف انشاپرداز احمد فارس الشدیاق، نے ہفتہ وار اخبار الجوائب قسطنطنیہ سے شائع کرنا شروع کیا، جو بڑی مدت تک جاری رہا۔ یہ بڑا اثر انداز، اور شاندار اخبار تھا، بادشاہوں، وزیروں اور امیروں کے لئے اس زمانہ میں الجوائب کا مطالعہ ایک ضروری کام تھا، اس کی تحریر میں قوت، اور تنقید میں اثر پایا جاتا ہے۔ سلطان معظم عبد العزیز، اور صادق پاشا بے تونس نے مختلف اوقات میں اس کی بڑی گرانقدر امداد کی، ہندوستان کے ارباب ذوق، اور صاحبان علم میں سے مرحوم نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) نے بھی اس اخبار کی مادی اور معنوی امداد کی،

مولانا ابو الکلام آزاد نے جب کلکتہ سے اپنا مشہور و معروف ہفتہ وار "الہلال" شروع کیا تو ان کے سامنے یہی الجوائب نمونہ تھا، الہلال کی بہت سی سرخیاں، مضامین، اور ترتیب الجوائب، قسطنطنیہ اور جریدۂ "المؤید" قاہرہ سے لی گئی تھیں۔

زبان اس زمانہ تک بلکہ الجوائب کے ابتدائی عہد میں بھی عربی اخبارات ورسائل کی زبان قافیہ بندی اور سجع بندی کی قیدوں میں مقید تھی، اور یوں سمجھئے کہ امانت، اور سرشار کی اردو بنی ہوئی تھی، سجع بندی اور قافیہ پیمائی اظہار خیال کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی، بڑے بڑے القاب، اور تشبیہ واستعارات میں اصل مضمون کچھ خبط و بے ربط سا ہو جاتا تھا۔

۱۸۶۰ء سے ۱۸۸۰ء تک یعنی بیس سال کا یہ زمانہ جو خدیو اسمٰعیل کی مسند نشینی سے تقریباً دو سال پہلے، اور خدیو توفیق کی اورنگ نشینی کے تقریباً ایک سال بعد تک رہا، عربی صحافت کی ابتدائی نشو ونما کا دور ہے، اور وہ بے راہ روی اس میں دکھائی دیتی ہے جو کسی پودے کی ابتدائی زندگی میں شدت نمو سے پیدا ہو جاتی ہے، صحافت کے لئے کوئی قانون تو تھا نہیں اس لئے جو تعریف کرتا، اعتدال سے باہر نظر آتا، اور جو تنقید کرتا، بالکل ذاتی عداوت کا نمونہ پیش کر دیتا، اس دور میں عربی انشاء اور صحافت پر بڑا خوشگوار اثر سید جمال الدین افغانی مرحوم کی تحریروں اور تقریروں کا پڑا، صاف اور سلجھی ہوئی تحریریں جن میں سجع بندی اور قافیہ پیمائی کی الجھنیں نہیں ہیں،

اس دور کی عربی صحافت میں شامی ادباء، عیسائی اور مسلمان دونوں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ اور ممالک یورپ سے آنے والے عیسائی مبلغین کا اثر بھی اس دور میں موجود ہے، لیکن حق یہ ہے کہ یہ ترقی، اور وسعت جو اس بیس سال کے اندر عربی انشاپردازی میں اور خصوصاً صحافت میں

نظر آتی ہے وہ عیسائی مبلغین کے اثرات سے زیادہ مرہون منت ہے، مرحوم جمال الدین افغانی، اور شیخ محمد عبدہ کے قلم اور زبان کی، اور رفاعہ بک رافع ناظم دارالترجمہ قاہرہ کی مساعی اور ریاض پاشا کی مالی امداد کی،

اس دور میں بہت سے ارباب قلم شام سے بھاگ کر مصر آئے، کیونکہ شام میں ان کو قلم و زبان کی ویسی آزادیاں میسر نہ تھیں جیسی کہ مصر میں حاصل تھیں۔

اس دور کے مشہور عربی اخبارات و رسائل یہ تھے:۔

الوقایع المصریہ، اور الجوائب کے علاوہ جن کا ذکر اوپر آچکا،

مصر میں:۔	وادی النیل	عبداللہ ابوالسعود
	الکوکب الشرقی	الحموی
	مصر	ادیب اسحاق
	الیعسوب	محمد علی الحکیم
	روضۃ المدارس	رفاعہ بک رافع
	الاہرام	سلیم و بشارۃ تقلا
	الوطن	میخائیل عبدالسید
بیروت میں:۔	الجنان / الجنۃ	سلیم بستانی
	المقتطف	صروف نمبر — یہ بعد کو مصر سے شائع ہونے لگا۔
	الطبیب	ڈاکٹر بوسط
	ثمرات الفنون	عبدالقادر لبنانی
	لسان الحال	خلیل سرکیس
	التقدم	یوسف شلفون
	البشیر	عیسائی مشنریوں کا رسالہ
تونس میں:۔	الرغائب	عبدالعزیز
عراق میں:۔	صوت العراق	محمود شکری
	المنہاج	مصطفٰے الصیدادی

اس دور کا سب سے بہتر رسالہ "روضۃ المدارس" تھا، یہ ابتداءً پندرہ روزہ شائع ہوتا تھا، یہ ایک ایسا شاندار علمی رسالہ تھا کہ اس سے بلند رسالہ شاید ہی یورپ کی کسی زبان میں اُس وقت شائع ہوتا ہو۔ اس میں متعدد ابواب ہوتے تھے، اور ہر باب میں بہترین ماہرانہ مضامین، ہر باب کے لئے الگ الگ اسی فن کے ماہر اڈیٹر مقرر تھے، مثلاً ادب کے لئے عبداللہ فکری بک فلکیات کے لئے استاد اسمٰعیل فلکی، نباتیات کے لئے احمد ندا جغرافیہ کے لئے محمد قدری طب کے لئے محمد بدر وغیرہم،

اس دور کے اخبارات و رسائل میں سے الاہرام، المقتطف، اور الکوکب الشرقی اب تک زندہ ہیں۔ باقی ختم ہو چکے،

سنہ ۱۸۸۱ء - سنہ ۱۹۰۰ء: اس دور میں عربی جرائد کی زبان اور زیادہ صاف و رواں ہو گئی، تشبیہ و استعارے سے بوجھل اور صنائع بدائع سے مقید عبارتیں ختم ہو گئیں، علمی اصطلاحات کم استعمال ہونے لگیں، اسلوب نگارش میں فرانسادی اسالیب بیان کی آمیزش نمایاں طور پر دکھائی دینے لگی،

اخبارات میں خبریں مرتب کی جانے لگیں، افتتاحیہ لکھنے کا رواج پیدا ہوا، فکاہات کے کالم بڑھائے گئے، اب عربی اخبارات و رسائل، صرف آستانہ، بیروت، قاہرہ اور بغداد تک محدود نہیں رہے، بلکہ اس بیس سال کے اندر عربی کے ہفتہ وار، روزنامے، اور ماہوار رسالے اور اخبارات، عربی دنیا کے دوسرے شہر، مثلاً حلب، حماۃ، حمص، بصرہ، موصل، مراقش، مصر میں، اسکندریہ، طنطا، اسیوط، الفیوم، الزقازیق، بلکہ عربی دنیا سے باہر جنوبی امریکہ کے متعدد مقامات اور یورپ میں پیرس، روما، درسلیز سے بھی نکلنے لگے۔

قانون اس دور کی ابتداء یعنی ۱۸۸۱ء میں مصر میں پہلی مرتبہ قانون صحافت بنایا گیا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۸۷۹ء میں خدیو توفیق پاشا سریر آرائے حکومت ہوئے، اور انھوں نے مرحوم اسمٰعیل پاشا کی سطوت و جلال کی وجہ سے جو قلم اور زبانیں بند تھیں، انھیں غیر معمولی آزادی دے دی، جیسا کہ عام طور سے ہوتا ہے، اس وقت کچھ ایسے اخبارات پیدا ہو گئے جنھوں نے اعتدال کے حدود توڑ دئے، ان میں التنکیت، الطایف، اور المفید اپنی درشت کلامی کے لئے مشہور ہیں،

۱۸۸۲ء میں اعرابی پاشا مرحوم کا مشہور ہنگامہ ہوا، اور انگریزی نفوذ و تسلط بہت بڑھ گیا، بلکہ تمام سیاہ و سفید کے مالک انگریز بن گئے، ان کے خلاف ایک شدید جذبۂ نفرت مصر میں پیدا ہوا، اور مشہور و معروف عربی اخبار "المؤید" اسی جذبۂ نفرت اور احساس دفاع کی پیداوار ہے۔ یہ اخبار اپنے جذبہ اسلامیت، بلکہ اسلامی بین الاقوامیت اور دینی غیرت کے لئے مشہور ہے، مرحوم مفتی محمد عبدہ، قاسم امین، سعد زغلول اور اس اخبار کے ایڈیٹر علی یوسف "المؤید" کے خصوصی ارباب نگارش ہیں۔

اس اخبار نے انگریزوں کے مظالم ہندوستان میں، فرانسادیوں کے مظالم، مراقش اور تونس میں اس تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ شائع کئے ہیں کہ میری رائے میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کہیں اور شاید ہی مل سکیں گے۔

مصری روزنامہ المقطم، ماہوار الہلال، الازہر، الحقوق سب اسی دور کی پیداوار ہیں، اسی طرح شام و عراق کے بہترین اخبارات و رسائل اسی زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

اس دور کی ایک یہ خصوصیت بھی قابل ذکر ہے کہ معجون مرکب قسم کے صحیفوں اور رسائل کی بجائے اب الگ الگ فنی رسالوں کی طرف لوگوں کی توجہ ہونے لگی، اگرچہ اس اعتبار سے آج تک عربی رسائل کچھ زیادہ قابل تعریف نہیں ہوتے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں، المجلۃ الزراعیہ، المحاکم، اور الشفا کی طرح کے مخصوص فنی پرچے پیدا ہو گئے تھے۔

عربی زبان میں اسی دور میں یہ سرکاری اصطلاح مقرر ہوئی، کہ

الجریدۃ — روز نامے
الصحیفۃ — روز نامے اور ماہ نامے کے علاوہ سارے موقت الشیوع پرچے،
المجلۃ — صرف وہ موقت الشیوع جو کتابی شکل میں شائع ہو،

بیسویں صدی

بیسویں صدی کی ابتداء کے ساتھ ساتھ یوروپی اقوام کے مظالم، حرص، اور کمینہ پن میں بھی نمایاں اضافے ہوئے ابتدائی نو سال تک تو سلطان عبدالحمید خاں کا عہد تھا، ان کا جلال شام میں صحافت کو دبائے رہا، اور شامی ادباء وانشاء پرداز بھاگ کر مصر آتے رہے، لیکن اس کے بعد صورتِ حال بدل گئی، ۱۹۱۲ء میں اطالویوں اور فرانسیسیوں کے مظالم نے شمالی افریقہ کے ادباء کو بھاگ کر مصر آنے پر مجبور کیا، المراکشی، الجزائری اور التونسی اربابِ فکر مصر میں جمع ہو گئے، اور اس کثرت سے عربی رسالے، اخبارات اور کتابیں چھپنے لگیں کہ ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ ۱۹۱۸ء یعنی پچھلی جنگ عظیم کا اختتام وہ منحوس سال ہے جو عربی بولنے والوں کی خواری وزبوں حالی کو انتہائی مقام تک پہنچا گیا، ساری عربی دنیا، انگریزوں، فرانسیسیوں، اور اطالویوں کے پنجۂ ظلم واستبداد میں گرفتار ہو گئی، اور ایسی گرفتار ہوئی کہ اب تک نجات نہیں مل سکی ہے۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ صحافت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، لوگوں میں دفاعی قومیت کا جذبہ زور پکڑنے لگا، اور ظاہر ہے کہ ان جذبات کے اظہار کا ذریعہ صحافت اور خطابت ہی ہو سکتا تھا، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۹۱۸ء کے بعد سے عربی خطابت اور صحافت دونوں میں بڑی ترقی ہوئی،

اخبار نویسوں نے ظالم مستعمرین کے مقابلہ میں بڑی پامردی دکھائی، سیاسی زعماء نے جہاں اپنی شعلہ نوائیوں سے مردہ قلوب میں روح پھونکی، اور اس سلسلہ میں ظالموں کے ہاتھوں، مالی اور جانی سزائیں برداشت کیں وہاں اربابِ قلم اور اخبار نویسوں نے بھی، قید وبند، جرمانہ، اور بعض مواقع پر شہادت کے گھونٹ بھی ان ظالموں کے ہاتھوں سے پی لئے، اور اپنا فرض ادا کیا۔

اس دور میں عربی اخبارات پر فرانسیسی اور انگریزی صحافت کا رنگ اور زیادہ گہرا ہو گیا، اسلوبِ نگارش میں، ترتیب وتنظیم میں، حتیٰ کہ اخباروں کی ظاہری شکل وصورت میں بھی یہ رنگ صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ نقل وتقلید مفید ہے یا مضر یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں، لیکن اس تقلید کے باوجود عربی کے بڑے بڑے اخبارات جن کی اشاعت ایک لاکھ اور اس سے متجاوز ہے وہ بھی معیارِ صحافت اور ترتیب کے اعتبار سے ابھی اس درجہ تک نہیں پہونچ سکے ہیں جہاں وہ دوسری مشرقی زبانوں کے لئے قابلِ تقلید سمجھے جائیں۔ اور عربی کے رسالے تو ابھی اچھے قسم کے رسالوں میں شمار کے قابل بھی نہیں ہیں۔ شاید دو تین رسائل ایسے مل سکیں گے جنھیں آپ اوّل درجہ دے سکیں۔

اس دور میں عربی اخبارات ورسائل کی کثرت البتہ ایک خوش آیند چیز ہے جس سے اُمید ہے کہ جذبۂ مسابقت ان کو بہتر سے بہتر بنا دے گا۔ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ پچھلی صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں سیاسی صورتِ حال ایسی پیدا ہو گئی کہ مصر عربی ادب وانشاء کا قبلہ بن گیا۔ اس لئے اس دور میں سب سے زیادہ کامیاب عربی صحافت مصری صحافت ہے، شام، عراق، اور دوسرے عربی ممالک اس میدان میں مصر

سے بہت پیچھے ہیں ،

۱۹۴۰ء کی مئی میں مصری جرائد، صحائف اور مجلات کی تعداد (۳۸۲) تھی، ان میں سے ۵۲ روزنامے، اور باقی ہفتہ وار، پندرہ روزہ اور ماہوار تھے۔ مصر ایک چھوٹا سا ملک ہے جس کی آبادی پوری دو کروڑ بھی نہیں ہے۔ یہ تعداد اس کی آبادی کو دیکھتے ہوئے یقیناً قابل تعریف اور لائق ستائش ہے۔

۱۹۱۸ء کے بعد عربی صحافت کو مصر میں جو ترقی ہوئی، اس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب وہاں کی سیاسی زندگی ہے، انقلاب فرانس کے بعد جو جمہوریت اس دنیا میں پیدا ہوئی ہے، اس کی ایک نمایاں خصوصیت سیاسی پارٹی بازی اور جتھہ بندی ہے، یہ عمل فرد اور اجتماع کے لئے کیا اثر رکھتا ہے، اس کا فیصلہ تو ارباب فلسفہ یا اہلِ سیاست کریں گے، لیکن ایک عام آدمی کو بھی یہ صاف نظر آتا ہے کہ جمہوریت اپنے ساتھ جتھہ بندی ضرور لاتی ہے۔ اور یورپ میں فرانس اپنی پارٹی بازی کیلئے ضرب المثل ہو گیا ہے۔

شاید اس لئے کہ فرانس کا سب سے پہلا اور سب سے زیادہ گہرا اثر مشرقی ممالک میں سے مصر ہی پر پڑا ہے، اس لئے یہاں بھی فرانس کی طرح پارٹی بازی، اور جتھہ بندی بہت ہے، ہر پارٹی اپنا ایک ترجمان چاہتی ہے، اس لئے ایک روزنامہ ضرور نکالتی ہے، قاہرہ کے بازار میں آپ بہت سے روزنامے فروخت ہوتے دیکھیں گے اور ان میں سے اکثر کو کسی نہ کسی پارٹی کا ترجمان پائیں گے۔ پارٹی کی قوتِ تنظیم کا اندازہ، اخبار کی ظاہری صورت سے بھی آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اگر اخبار شاندار، عمدہ طباعت، اور نفیس ترتیب کے ساتھ شائع ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ پارٹی کافی منظم ہے، ورنہ پھر جتنی کمی اخبار کی ظاہری صورت میں نظر آئے، اتنی پارٹی کے نظم و تنظیم میں بھی سمجھ لیجئے۔

آخر میں عربی کے چند مشہور اخبارات کے نام درج کرتا ہوں :-

(۱) مصر میں: الاهرام، المقطم، الاساس، المصری، الکتلة، صوت الامة، البلاغ، الزمان، منبر الشرق، اخبار الیوم، الحوادث، الاثنین، المصور، الفتح، الاسلام، الازهر، الهلال، المقتطف، بوز الیوسف، الزهراء، الزراعة، الطبیب، المعلم، المعاهد۔

(۲) بغداد میں: الزمان، النهضة، السجل، الشوری، الاتحاد، الیقظة، صوت الاحرار، الاستقلال، البلاد، مجلة الفنون، السعادة، التمدن، الادب العربی،

(۳) حجاز میں: أم القری، صوت الحجاز،

(۴) تونس میں: الداعی، الرائد، الاسلام، الحریة، العلم،

(۵) مراکش میں: الحکم، الاختیار، المصباح، فجر الیوم،

ان کے علاوہ پیرس سے العرب، ارجنٹائن سے، الصوت، رواء البشائر، وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔

ہندوستان سے بھی پچھلے پچاس سال میں متعدد عربی ہفتہ وار و ماہوار رسالے نکلے، لیکن اب تو سب بند ہو چکے ہیں، جن میں سے چند یہ تھے:-

مرحوم علامہ عبداللہ العمادی کا رسالہ البیان لکھنؤ
عبدالرزاق ملیح آبادی کا رسالہ الجامعہ کلکتہ
مولانا مسعود عالم ندوی کا رسالہ الضیاء لکھنؤ
مولانا ناصر الملة کا رسالہ ــــــــ لکھنؤ

میں نے بھی ایک زمانہ میں ماہوار عربی رسالہ **القائد** کے نام سے نکالا تھا، گر صرف دو نمبر نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔

اس وقت کراچی سے دو عربی رسالے **العرب** اور **البشیر** شائع ہوتے ہیں۔

شہید حسن البنا مرحوم
مترجم:-
قاضی خلیل الرحمٰن نعمانی!

ہماری دعوت

فکر و عمل کیلئے ایک مرتب منشور

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

---

(۱) بیش بہا ترکہ

برادران عزیز! اللہ تعالےٰ کی مشیت یہ ہے کہ ہم اس موروثی بیش بہا ترکہ کے وارث قرار پائیں۔ نیز تمہاری دعوت کی روشنی اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں مشعلِ ہدایت بن کر چمکے، اور تمہارے لئے ایسے اسباب و وسائل مہیا کر دے جس کے ذریعے، تم اس کا کلمہ بلند، اور اس کی شریعت کو ظاہر، اور نئے سرے سے "اسلامی مملکت" قائم کرو!

" ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز"

اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جو اللہ کی مدد کرتا ہے، بیشک اللہ قوت والا، غالب ہے!

(ب) ہمارا عام بُنیادی مقصد

بھائیو! ہمارا کیا ارادہ ہے؟ کیا ہم مال جمع کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ وہ ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے، یا ہم جاہ حاصل کرنے کے درپے ہیں؟ حالانکہ، وہ ایک بے بنیاد سی چیز ہے!

یا ہماری خواہش زمین پر قبضہ و استیلاء حاصل کرنا ہے؟ حالانکہ زمین اللہ کی ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کا وارث بنائے، نیز ہم یہ قولِ خداوندی بھی پڑھتے ہیں

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا والعاقبۃ للمتقین

" یہ عالمِ آخرت ہم اُن ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں۔ جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔ اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے"

ہم اللہ کو گواہ بنا کر کہتے ہیں، ان چیزوں میں سے ہم کسی چیز کے خواہاں نہیں، اور نہ ان چیزوں کے لئے ہماری جدوجہد ہے، نہ ہم لوگوں کو ان چیزوں کی طرف دعوت دیتے ہیں، تم ہمیشہ یاد رکھو کہ تمہارے دو بنیادی مقصد ہیں

(۱) ہر اجنبی طاقت سے اپنے اسلامی وطن کو آزاد کرانا۔ اور یہ ہر انسان کا طبعی اور بنیادی حق ہے اس سے جابر و ظالم، اور مستبدِ قاہر ہی انکار کرسکتا ہے،

(۲) اس آزاد وطن میں ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کرنا، جس میں احکام اسلام کی تعمیل کی جائے، اور اسلام کا نظام اجتماعی نافذ ہو، بنیادی امور کا ٹھیک طور پر اعلان ہو، اور اس نظام کی پُر از حکمت دعوت کی عام لوگوں کو تبلیغ کی جائے۔

اور جب تک ایسی مملکت قائم نہیں ہو جاتی۔ سارے کے سارے مسلمان اللہ کے گنہ گار، اور اس کے سامنے ایسی مملکت کے قیام میں اپنی تقصیر، اور کوتاہیوں کے جوابدہ ہیں، اور ایسی مملکت کے برپا کرنے کے بجائے ہاتھ پر ہاتھ رکھکر بیٹھے رہنے کی بھی ان سے باز پُرس ہوگی،

اور یہ انسانیت کے ساتھ ظلم ہے کہ ایسے پُر آشوب، اور پریشان دور میں ایسی مملکت قایم کی جائے، جو ظلم دعدان کی بنیادوں پر استوار ہو، اور جو ستم رانیوں اور ظلم کوشیوں کی دعوت دیتی ہو،

موجودہ لوگوں میں کوئی ایسا نہیں جو حق وانصاف، امن وعدالت کی حکومت قائم کرنے کی جد وجہد کرتا ہو! ہم چاہتے ہیں کہ یہ دونوں بنیادی مقصد وادی نیل (مصر) بلاد عربیہ، اور ہر اس زمین میں حاصل کریں، جس اللہ نے عقیدہ اسلام سے مشرف فرمایا ہے، ایسا عقیدہ جو تمام مسلمانوں میں، دین، جنسیت اور عقیدہ کے اعتبار سے رشتۂ وحدت کا حکم رکھتا ہے،

(ج) ہمارا خاص بُنیادی مقصد

ہمارے واسطے ان دو مقاصد کے بعد ایک خاص مقصد اور ہے، جب تک وہ حاصل نہ ہو، کامل طور پر اسلامی اجتماع ممکن نہیں،

ایھا الاخوان! تم پر واضح ہونا چاہیئے کہ ساٹھ فیصدی مصری حیوانوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اور وہ اپنی روزی اپنی جانوں کو مشقت کے عذاب میں ڈالے بغیر نہیں حاصل کرپاتے، کیونکہ مصر ایسی ہلاکت خیز بھوک کا گہوارہ، اور بہت سی ایسی اقتصادی مشکلات کا میدان بنا ہوا ہے کہ اس کے نتیجہ سے اللہ کے سوا کوئی آگاہ نہیں۔ کہ کیا ہونے والا ہے!

مصر میں تین سو بیس سے زیادہ غیر ملکی تجارتی کمپنیاں ہیں۔ جو ملک کے گوشہ گوشہ سے ساری نفع بخش اور ضروری اشیا کو کھینچ کھینچ کر، ذخیرہ کرتی ہیں،

تجارتی، صنعتی، اور اقتصادی پیداوار کا پورا چکر انہیں اجنبی ہاتھوں میں چل رہا ہے، اور ثروت ودولت، بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اہل وطن کے ہاتھوں سے ان اجنبیوں کے ہاتھوں منتقل ہو رہی ہے،

مصر دنیا کے دوسرے متمدن شہروں کی نسبت، زیادہ بیمار، زیادہ مصیبت زدہ اور زیادہ آفت رسیدہ ہے، مصر کے نوے فیصد سے زیادہ گروہ جسمانی عوائق اور فقدانِ شعور کا گہوارہ بنے ہوئے ہیں، مختلف امراض متعدد تکالیف نے ان کو گھیر رکھا ہے،

مصر کی جہالت ابھی تک ختم نہیں ہوسکی، تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد پانچ فیصد بھی نہیں! اور ان پانچ فیصد میں بھی ایک لاکھ سے زیادہ ایسے لوگ ہیں جن کی تعلیم لازمی مدارس کے نصاب سے آگے نہیں

بڑھ سکی، (گویا وہ پرائمری سے آگے نہیں بڑھ سکے)
مصر میں جرائم بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور خطرناک حد تک ان کی کثرت ہوتی جا رہی ہے۔ حتٰی کہ قید خانوں سے نکلنے والوں کی تعداد مدارس سے نکلنے والوں سے زیادہ ہے،
اور مصر ابھی تک اس کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔ کہ اپنے لشکر کے ایک ڈویژن کو بھی پورے ساز و سامان سے مسلح کر سکے، اور یہی صورتِ حال آپ کو عالم اسلامی کے شہروں میں سے ہر شہر کی نظر آئے گی۔
پس تمہارے مقاصد میں سے یہ ہونا چاہیئے کہ تعلیمی اصلاح کے لئے جد و جہد کرو، فقر و فاقہ، جہالت، مرض اور جرائم کے مقابلہ میں محاذ جنگ قائم کرو،
اور ایسا مثالی اجتماع پیدا کرو جو شریعت اسلام کی طرف منسوب ہونے کا مستحق ہو؛

(د) ہمارے وسائل عامہ

ہم ان مقاصد تک کیسے پہونچ سکتے ہیں؟
خطبے، اور اقوال، کتابیں، اور درس، اور لیکچر، مرض کی تشخیص، دوا کی توصیف، تنہا یہ ساری باتیں کوئی نفع نہیں پہونچاتیں، نہ منزل ملتی ہے، اور نہ ان کے ذریعہ کوئی داعی اپنے مقاصد میں کسی مقصد تک پہونچ سکتا ہے،
اس دعوت کے لئے کچھ وسائل ہوتے ہیں جن کو حاصل کرنا، اور جن پر عمل کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور مختلف دعوتوں کے لئے جن عام وسائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُن میں نہ کبھی تغیر نمایاں ہوتا ہے نہ تبدل اور وہ ان تین امور سے تجاوز نہیں کرتے،
۱۔ پختہ اور گہرا ایمان ۲۔ مضبوط حرکت (جد و جہد) ۳۔ پیہم عمل
ایہا الاخوان! یہی تمہارے عام وسائل ہیں۔ اپنے نظریہ پر ایمان رکھو، اس کے گرداگرد جمع ہو جاؤ۔ اس کے لئے عملی جد و جہد کرو، اور اس پر مضبوطی و ثبات قدمی سے جمے رہو،

(ھ) اضافی وسائل

وسائل عامہ کے ساتھ ساتھ کچھ اضافی وسائل بھی ہوتے ہیں۔ ان کو اختیار کرنا۔ اور ان کے راستہ پر چلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اُن میں سے بعض سلبی ہوتے ہیں، بعض ایجابی، بعض عام لوگوں کے عُرف کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کے اس عرف سے خارج ہوتے ہیں، اور اس کے مخالف اور متناقض! بعض میں نرمی ہوتی ہے، بعض میں شدت، ہمارے لئے ضروری ہے، کہ ہم اپنے نفوس کو ان سب کا متحمل بنائیں۔ اور ان سب کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں، تاآنکہ کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوں! اس کامیابی سے جو ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم عادات اور مالوفات ذہنی کی مخالفت کریں۔ اور اُن راستوں اور تنظیموں سے نکل جائیں جن کو لوگ محبوب رکھتے ہیں اور جن کے وہ عادی ہیں۔ دعوت کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی محبوب و مالوف باتوں سے باہر نکلو۔ اپنے طور طریق اور عادات میں انقلاب پیدا کرو،
تو کیا اے اخوان تم اس سب کے لئے مستعد و آمادہ ہو؟

(د) حوصلوں کا پست کرنا

بہت سے لوگ کہیں گے، کہ ان وسائل سے کیا مراد ہے؟ نیز موجودہ خطرناک مشکلات کی موجودگی میں اجتماعی اُمور میں ترمیم، اور ان بے شمار مفاسد میں گھرے ہوئے حال کی اصلاح میں یہ وسائل کیا نفع دیں گے؟ اور تم اقتصادیات کے مرض کا سُود کے بغیر کیسے علاج کرو گے؟ اور عقیدے کے قضئے کو کیسے نبٹاؤ گے؟ اور بغیر قوت و طاقت کے اپنا حق کیسے لو گے؟

ایھا الاخوان! تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر مصلح کی تمناؤں اور آرزوؤں میں شیطان اسی قسم کے وساوس پیدا کرتا ہے۔ پس اللہ تعالےٰ القائے شیطانی کو ملیامیٹ کر دیتا ہے، پھر اپنی نشانیاں مستحکم کر دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ علم والا اور حکمت والا ہے!

ان تمام باتوں کے لئے یاد رکھو، کہ تاریخ کے دامن میں گزشتہ اور موجودہ اُمتوں کے بہت سے قصے اور حالات ہمارے لئے موجود ہیں۔ جو عبرت و موعظت کا کافی ذخیرہ رکھتے ہیں۔

- اور جو اُمت زندہ رہنے کا عزم صمیم کرے، اس کے لئے موت ناممکن ہے!

(ذ) ہمارے راستے کی رکاوٹیں

میں چاہتا ہوں کہ تمہارے سامنے صراحت سے بیان کر دوں۔ کہ تمہاری دعوت ابھی اکثر لوگوں سے پوشیدہ ہے اور جس دن بھی وہ تمہاری دعوت سے متعارف ہوئے، اور اس دعوت کے مقاصد و مطالب سے انہیں آگاہی ہوئی۔ تو اسی دن سے تم ان کی جانب سے شدید خصومت اور بے انتہا عداوت کے مظاہرے دیکھو گے، اور اپنے سامنے بہت سی مصیبتیں کھڑی پاؤ گے، اور بہت سی رکاوٹیں، اور موانع تم کو درپیش ہوں گے، درحقیقت تم اسی وقت اصحابِ دعوت کے راستے پر چلنے کی ابتدا کرو گے!

اور اب! تو ابھی گوشۂ خمول میں پڑے ہُوں کو دعوت کے لئے تیار کرتے رہو، اور جہاد و مشقت جس کے تم طلبگار ہو اس کے لئے مستعد اور تیار رہو،

عنقریب ہی وہ گروہ جو اسلام کی حقیقت سے بے خبر ہے تمہارے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جائے گا، اور تم دیکھو گے کہ دین دار طبقہ اور نام نہاد علمائے اسلام کے متعلق تمہارے فہم کو "عجیب و غریب" بتائے گا اور اسلام کے راستے میں تمہاری جدوجہد کو فضول و بیکار کہہ کر انکار کرے گا۔

اور رؤسا، زعماء صاحبِ اقتدار، اور بادشاہ، سب تم سے کینہ اور بغض و عداوت رکھنے لگیں گے! اور تمہارے مقصد کے خلاف ساری حکومتیں متحد ہوں گی۔ ہر حکومت یہ چاہے گی کہ تمہاری زندگی کے مقصد کو محدود کر دے اور تمہارے راستے میں دشواریاں اور سختیاں پیدا کر دے،

اور غاصب و ظالم لوگ ہر جہت و طریقہ سے تمہاری ترقی کو ملیامیٹ کرنے، اور تمہاری دعوت کی روشنی کو گل کرنے کی کوشش کریں گے،

اور یہ جاہل ان تمام کاموں میں کمزور و ضعیف طاقتوں، اور بیہودہ و ناکارہ اخلاق سے مدد لیں گے، مقصد یہ ہوگا

کہ تمھارے پتے، بُرائی، وسرکشی باندھ دیں، اور اپنے لئے کچھ آذوقۂ حیات حاصل کرلیں، اور یہ سب کے سب، تمھاری دعوت کے گرداگرد۔ شبہات کی گرد اُڑائیں گے، تہمتوں کے اندھیرے پھیلائیں گے، اور کوشش کریں گے کہ ہر بُرائی کو اس دعوت کے ساتھ چسپاں کردیں، اور لوگوں کے سامنے اس دعوت کو بھیانک شکل میں پیش کریں گے،

اللہ کا ارشاد ہے،

یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون — وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھادیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کرکے رہے گا اگرچہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ ہو،

لاریب اُس وقت تم آزمائش وتجربے کے دور میں داخل ہوجاؤگے۔ چنانچہ تم کو قید کیا جائے گا، پابند سلاسل بنایا جائے گا، اور جلاوطنی کی سزا بھی دی جائے گی، تم ہر طرف سے دھتکارے جاؤگے، تمھارے مصالح پامال کئے جائیں گے، تمھارے کاروبار معطل کردئے جائیں گے، تمھاری خانہ تلاشیاں ہوں گی، اور شاید تمھارے امتحان کی مدت طویل ہوجائے۔

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا وھم لا یفتنون — کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ آمنا کہنے ہی پر چھوڑ دئے جائیں گے۔ اور ان کی آزمائش نہ ہوگی۔

لیکن ان تمام آزمائشوں اور امتحانوں سے گزرنے کے بعد اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے، کہ مجاہدین کی سی نصرت اور عاملین محسنین کا سا اجر تم کو نصیب فرمائے گا،

یاایھا الذین آمنوا ھل ادلکم علیٰ تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم، فایدنا الذین آمنوا علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاھرین — اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی تجارت بتادوں، جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دلانے والی ہو، (آخر میں ارشاد ہے) سو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی۔ سو وہ غالب ہوگئے"۔ تو کیا تم اس پر مصر ہوگے کہ تم اللہ کے انصار ہوجاؤ؟

(ح) کامیابی کے اسباب

ایھا الاخوان! صحیح یہی ہے کہ ہمیں ان تمام رکاوٹوں کے مقابلہ میں یہی کہنا چاہئے کہ ہم اللہ کی دی ہوئی دعوت کی طرف بلاتے ہیں۔ اور یہی دعوت عظیم الشان اور پاکیزہ ہے، اور ہم اسلامی فکر کی طرف دعوت دیتے ہیں، اور یہی فکر پختہ اور صحیح ہے، اور لوگوں کے سامنے قرآنی شریعت پیش کرتے ہیں، اور یہی شریعت تمام شریعتوں میں سب سے زیادہ متوازن اور عادلانہ شریعت ہے،

صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ

لاریب، پورا عالم انسانیت اسی دعوت کا محتاج ہے، اور انہیں طریقوں اور انہیں تیاریوں کا ضرورتمند جو اس دعوت کے لئے ضروری ومفید ہیں،

خدا کا شکر ہے کہ ہم شخصی خواہشات سے بری ہیں، اور ذاتی منافع بازیوں سے دور ہیں! ہمارا مقصد لوگوں کی بھلائی۔ اور اللہ کی فرمانبرداری کے سوا کچھ اور نہیں۔ اور ہم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے

اللہ کی رضا مطلوب نہ ہو۔
اور ہم اللہ کی مدد اور تائید کے اُمیدوار ہیں۔ اور جس کا اللہ مددگار ہو اُس پر کوئی غلبہ نہیں پا سکتا۔
ذلک بان اللہ مولی الذین اٰمنوا و ان الکافرین لا مولی لھم
پس ہماری دعوت کی قوت۔ عالم کا اس دعوت کا محتاج ہونا۔ ہمارے مقصد کی پاکیزگی و بلندی۔ اور اللہ کی تائید و نصرت۔ بس یہی نجات و کامیابی کے اسباب ہیں۔ جن کے سامنے نہ کوئی رکاوٹ ٹھیر سکتی ہے اور نہ اس کے راستے میں کوئی دشواری آڑے آسکتی ہے،
واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون

وصیت!

ایھا الاخوان المسلمون!
سنو! میری خواہش ہے کہ میں ان کلمات کے ذریعہ تمہاری فکر کو تمہاری آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کردوں شاید وہ سخت گھڑیاں جو ہماری منتظر ہیں، میرے اور تمہارے درمیان ایک عرصہ تک کے لئے حائل ہوجائیں اور پھر میں تمہارے ساتھ بات چیت، یا مکاتبت کا موقعہ بھی نہ پاسکوں، اور اس کی طاقت نہ رہے، پس میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کو غور و تدبر کے ساتھ مطالعہ کرو، اور اگر ہوسکے تو ان کو حافظہ میں محفوظ کرلو، اور ان پر مجتمع ہوجاؤ۔ ہر ایک بات میں بہت سے رموز اور گہرے گہرے مطالب و معانی ہیں۔
ایھا الاخوان! تم نہ کوئی سیاسی گروہ ہو، اور نہ ایسی جماعت ہو جو محدود اغراض و مقاصد کے لئے قائم کی گئی ہو بلکہ تم ایک نئی روح ہو جو اس امت کے قلب میں سرایت کئے ہوئے ہو، پس اس روح کو قرآن کے ساتھ زندہ کرو، اور تم ایک نیا نور اور روشنی ہو جو درخشاں و تاباں ہے۔ پس مادیت کی اندھیریوں کو اللہ کی معرفت کے نور سے شکست دو! اور تم آوازۂ بلند ہو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کے پیغام کو سربلند اور اونچا کرو!
حق یہ ہے، اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں اگر یہ کہا جائے، تم ہی اس امانتِ خداوندی اور بوجھ کو اٹھانے والے، ہو، جبکہ اور لوگ اس بوجھ سے سبکدوش اور خالی ہوچکے ہیں،
جب تم سے پوچھا جائے کہ تم کس کی طرف دعوت دیتے ہو؟
تو جواب دو، کہ ہم اس اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے، اور حکومت و سلطنت جس کا ایک جز ہے۔ اور آزادی جس کے فرائض کے منجملہ ایک فرض ہے، اس کے بعد اگر تم سے کہا جائے کہ یہ تو سیاست ہے، تو ان سے کہو۔ اسلام یہی ہے، اور یہ تقسیمیں ہم نہیں جانتے، اگر تم سے کہا جائے کہ تم تو انقلاب و شورش کے داعی ہو، تو اُن سے کہو، ہم تو حق و سلامتی کے داعی ہیں۔ اسی کے معتقد ہیں اور اسی میں اپنا اعزاز سمجھتے ہیں۔
اگر تم ہم پر زیادتی کروگے۔ ہماری دعوت کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگے، تو پھر ہمیں اللہ

نے اس بات کی بھی اجازت دی ہے کہ ہم اپنی مدافعت بھی کر سکیں، اور ایسے وقت تمہارا درجہ ظالم و جابر کا ہوگا!
اور اگر تم سے کہا جائے۔ کہ تم لوگوں اور جماعتوں سے طلب کرتے ہو، (گویا ان کا آلۂ کار ہو) تو ان سے کہو۔
امنا باللہ وحدہ وکفرنا بما کنتم بہ مشرکین۔
پھر اگر وہ اپنی سرکشی، کٹ حجتی، پر اصرار کرے، تو اسے کہو
سلام علیکم لا نبتغی الجاھلین۔

ذمّہ داریاں اور فرائض

ایہا الاخوان! اللہ پر ایمان مضبوط رکھو، اسی کی معرفت اور پہچان کا اعزاز حاصل کرو، اسی پر اعتماد کرو، اسی کا سہارا اختیار کرو، اس کے علاوہ کسی سے خوف نہ کھاؤ، اس کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ اس کے فرائض ادا کرو، اس کی نافرمانی سے بچو،

اخلاق فاضلہ پیدا کرو، کمالات حاصل کرو، اخلاقی اعتبار سے قوی تر بنو، اور اللہ نے جو تمہارے لئے مومن ہونے کی حیثیت سے عزت، اور متقی و صالح لوگوں کے لئے جو بزرگی و کرامت رکھی ہے، اس کا اعزاز حاصل کرو،

قرآن کے درس و تدریس، اور سیرۃ مطہرہ کے ذکر و اذکار میں مشغول رہو، ایک عامل کی حیثیت میں رہو، جھگڑالو نہ بنو، کیونکہ اللہ جس قوم کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس پر عمل کی توفیق ارزاں فرماتا ہے۔ اور کوئی قوم ہدایت کے بعد ہدایت پر رہتے ہوئے اس وقت تک گمراہ نہیں ہوتی جب تک وہ جھگڑالو نہ بن جائے۔

آپس میں محبت اور دوستی رکھو، اور آپس کے ربط و ضبط کے رشتہ کو مضبوط تر بنانے کے لئے کوئی کوشش اُٹھا نہ رکھو، کیونکہ تمہاری قوت و طاقت کا یہی بھید ہے، اور تمہاری کامیابی کا یہی ستون ہے،

اور اس وقت تک ثباتِ قدمی سے ڈٹے رہو جب تک اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہاری قوم کے درمیان حق کو فتح و کامرانی نصیب فرمائے۔

اپنی قیادت کی ہر حالت میں اطاعت کرو، اس کا حکم سنو، چاہے تم کو تنگی ہو یا فراخی، تم کو وہ حکم ناگوار گزرے یا خوشگوار، کیونکہ تمہاری فکر کا یہ ایک بھید ہے، اور تمہارے آپس میں ملانے کا ایک حلقۂ اتصال!

اس سب کے بعد اللہ کی نصرت و تائید اور کامیابی کے آنے والے وقت کے جو یقیناً آکر رہے گا۔ اُمیدوار رہو،

ویومئذ یفرح المومنون بنصر اللہ ینصر من یشاء وھو العزیز الرحیم — اور اس دن مومن اللہ کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب، اور رحم والا ہے،

اللہ ہمیں اور تمہیں ان امور کی توفیق بخشے، جو اسے محبوب، اور اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں اور ہم سب کو خیار اُمت کے راستے پر جو ہدایت یاب تھے۔ چلائے،

اور ہم کو معزز و خوش نصیب لوگوں کی سی زندگی نصیب کرے، (اور جب موت آئے تو) ہماری موت مجاہد شہداء کی سی ہو،

انہ نعم المولیٰ و نعم النصیر!

ظفر احمد صدیقی
(ایم - اے)
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

فلسفۂ اقبال کے اجزائے ترکیبی

علامہ اقبال کے فلسفہ اور فکر کا نقطۂ آغاز انسانی فطرت ہے۔ وہ رازِ زندگی کی جستجو میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کی بجائے انسانی فطرت کو اپنی تحقیق کا مرکز بناتے ہیں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر گوہرِ مقصود کو پالیتے ہیں۔ اس جستجو میں پہلی ناقابلِ انکار حقیقت جو ان کے سامنے آتی ہے انسانی فطرت کا عملی پہلو ہے۔ انسان کے اندر ایک عملی رجحان۔ ایک جدوجہد کا جذبہ اور آگے بڑھنے کی خواہش کارفرما ہے، یہی خواہش یا جذبہ اسے موجودہ حالت پر غیر مطمئن اور ایک بہتر حالت کی جستجو میں سرگرداں رکھتا ہے۔ وہ کچھ اور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کسی اور مقام پر پہونچنا چاہتا ہے۔ کچھ اور بننا چاہتا ہے لیکن اس جذبۂ بیتاب کی منزل کبھی نہیں آتی۔ ہر خواہش کی تسکین نئی خواہشوں کی خلش اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ہر رفعت اگلی رفعتوں کا زینہ ثابت ہوتی ہے۔ راہ طلب میں ایک حد پر پہونچنے کے بعد نظر اپنی حد اور آگے بڑھا کر قائم کر لیتی ہے،

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد — دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے — تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

دراصل زندگی عبارت ہی حرکت و عمل سے ہے۔ یہ جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم ہی زندگی کا ثبوت ہے سکون و قرار فنا کا مترادف ہے۔ انسان کی اس عملی فطرت کا مطالعہ اب ایک دوسری حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ عمل کے ذریعہ ہی سے ہمیں اپنے وجود کا عرفان و یقین حاصل ہوتا ہے۔ کوئی قوت ہے جو عمل کے پس پردہ کارفرما ہے۔ کوئی جوہر ہے جو اپنے اظہار کی راہیں ڈھونڈھ رہا ہے۔ کوئی ذات ہے جو بدلتے ہوئے حالات میں قائم رہتی ہے اور عمل کی منتشر کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ اسی ذات کو ہم انسانی اعمال کا فاعل سمجھتے ہیں۔ اس کو تمام افعال کا ذمہ دار ٹھیراتے ہیں۔ ایک شخص اپنے بچپن کا لکھا ہوا خط دیکھتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے "یہ میں نے لکھا تھا" "میں" نہ اس کے جسم کا نام ہے نہ ذہنی کیفیات کا اس لئے کہ اس کا موجودہ جسم اور موجودہ ذہنی کیفیات وہ نہیں جو خط لکھنے کے وقت تھیں زندگی کی طویل مدت نے انہیں وسیع تغیرات رونما کر دئے ہیں۔ "میں" کا اشارہ اس ذات کی طرف ہے جو بچپن سے لیکر بڑھاپے تک موجود رہی ہے اور تمام ظاہری تبدیلیوں اور انقلابوں کے باوجود باقی اور پائندہ ہے۔ یہی باقی اور پائندہ حقیقت یا جوہر نفسِ انسانی یا خودی سے تعبیر ہے۔ اسی کی وجہ سے زید زید ہے اور احمد احمد! یہی تمام تغیرات کا منبع اور اعمال کا سرچشمہ ہے۔

اب انسانی فطرت کے ان دو حقائق تک ہماری نظروں کی رسائی ہو جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میری فطرت عملی ہے۔ میری خودی عمل کے ذریعہ سے اپنا اظہار چاہتی ہے۔ لیکن محض عمل خودی کی فطرت کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ عمل کے بے شمار راستوں میں سے ہر راستہ خودی کی منزل مقصود کو نہیں جاتا۔ خودی محض

راہِ عمل پر گامزن ہونا نہیں چاہتی بلکہ آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ اس کو محض جستجو نہیں خوب تر حالت کی جستجو ہے۔ اس لئے حدودِ عمل یا راہ ارتقا کے تعین کی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تسکین کا سامان بھی انسانی فطرت ہی میں موجود ہے۔ انسان کو اپنی فطرت ہی میں وہ معیار اور امتیازات مل جاتے ہیں جن سے وہ اپنی شاہراہ مقصود کو پہچان سکتا ہے۔ عمل و ارتقا کی تشنگی انسانی فطرت ہی کا تقاضا ہے اس لئے فطرت ہی اس راستہ کو پہچان سکتی ہے جو اس تشنگی کو بجھانے والا ہے، فطرت ہی ان مقاصد کو پہچان سکتی ہے جن کی کشش وہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ جس طرح ایک بیج میں اپنی نشو و نما کے قوانین موجود ہیں جس طرح ایک بے عقل حیوان کی جبلّت میں اس کی تشنگی کے مقصود کے متعلق اشارے پائے جاتے ہیں اس طرح انسانی فطرت بھی اپنی تکمیل کے راستہ کی پہچان سے محروم نہیں۔ کسی دستورِ عمل یا نظام زندگی کی صداقت یا عدم صداقت کا آخری معیار انسانی فطرت ہی ہے۔ دوسرے کی رہنمائی بھی اسی وقت انسان کو فائدہ پہنچا سکتی ہے جب اسے قبول کرنے کی صلاحیت پہلے سے موجود ہو۔ اگر آنکھ میں نور اور ظلمت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت نہیں تو خارجی روشنی اسکے کس کام کی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی فطرت میں یہ معیار اور امتیاز کہاں سے آئے۔ سازِ فطرت میں یہ کس کی نوائیں ہیں۔ اگر یہ میرے ہی من مانے اعتبارات ہیں تو ان کی صداقت اور قطعیت کا کیا بھروسا۔ کیا معلوم جس کو میں خوب سمجھ رہا ہوں وہ ناخوب ہو۔ جس کو میں ترقی کہہ رہا ہوں وہ تنزل ہو۔ بالفرض اگر اپنی فطرت کے مقاصد پر میں اعتبار بھی کر لوں تو اس کا کیا یقین کہ یہ قابلِ حصول بھی ہیں، کیا خبر یہ مادی عالم ان کو سرسبز بھی ہونے دیگا یا نہیں۔ اگر میری فطرت کے پردوں میں کسی اور کی آواز ہے تو اس کا منشاء کیا ہے۔ کہیں کوئی شوخ و شریر ہستی میرے جذبات اور ارادوں سے کھیل تو نہیں رہی ہے مجھے ناقابلِ حصول مقاصد کے پیچھے ڈال کر میری ناکامی و حسرت کا تماشا دیکھنا تو نہیں چاہتی۔ یہ سوال ہیں جو ہر سوچنے والے انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جو اپنی فطرت اور اس عالم کی حقیقت پر غور کرنے کی زحمت کرتا ہے۔ عقل انسانی ان سوالوں کا جواب دینے سے قاصر ہے۔ لیکن عقل ہی تو انسان کی تمام تر کائنات نہیں۔ عقل سے بالاتر انسانی فطرت کا ایک اور پہلو ہے جس کو عشق سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عشق ہمیں نظر بخشتا ہے عشق سے ہمیں خودی کی فطرت میں ایک دریچہ کھلا ہوا نظر آتا ہے جس سے ہم ہستی کامل کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اس کے حضور میں پاتے ہیں جس تک رسائی سے علم اور عقل محروم ہیں۔

عشق خودی کو اس کے مقصد کا یقین و ایمان بخشتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہی مقصدِ کائنات ہے۔ کائنات کی یہ مجال نہیں کہ اس کو اس مقصد کے حصول سے باز رکھ سکے۔ کائنات کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ اس کی رکاوٹوں پر غالب آکر خودی زندہ و پائندہ ہو،

یہ ہے مقصد گردشِ روزگار کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

عشق ہی سے راہ ارتقا کا صحیح مفہوم متعین ہوتا ہے۔ جذبۂ ارتقا ہستیٔ کامل کی کشش کا دوسرا نام ہے۔ ترقی وہی ہے جو خودی کو خدا سے نزدیک تر کرے اور تنزل وہی ہے جو اس کو خدا سے دور لے جائے۔ ارتقائے خودی یا بہ الفاظ دیگر تقرب الٰہی کا صحیح راستہ وہی ہے جو رضائے الٰہی سے ہم آہنگ ہو۔ عشق انسانی فطرت کے معیاروں اور امتیازوں کے قوانین احکام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ عشق ہی سے ہمیں ہستیٔ کامل کا ایمان و

یقین حاصل ہوتا ہے۔ عشق ہی خودی کو جادۂ ارتقاء (یا رضائے الٰہی) سے خبردار کرتا ہے۔ اور عشق ہی اس راستہ پر چلنے کی تڑپ عطا کرتا ہے، عشق ہی رہنما ہے عشق ہی راہ اور عشق ہی سالکِ راہ۔

عشق دلِ مصطفےٰ، عشق دمِ جبرئیل ۔۔۔ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق فقیہ حرم عشق امیر جنود ۔۔۔ عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام
عشق کی گرمی سے ہے پیکر گل تابناک ۔۔۔ عقل ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

غرض عشق ان تمام سوالوں کا شافی جواب دیتا ہے جو عقل کو حیرت و استعجاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ عشق کے مشاہدات کو علم و عقل کے نتائج سے کم درجہ سمجھنا غلطی ہے۔ عشق ایک کشش ایک وجدان ایک مشاہدۂ باطن ہے جس کے ذریعہ ہمیں براہ راست ہستی کامل کے وجود کا یقین اور ایمان حاصل ہوتا ہے۔ دراصل ایمان و یقین عشق ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل کا ماحصل ظن و گمان یا حیرت و استعجاب کے سوا کچھ نہیں عقل ہمیں خودی کی حقیقت اس کا مقصد اور کائنات کی علتِ غائی بتلانے سے قاصر ہے۔ وہ اس کارگاہِ حیات کا حیرت و استعجاب سے مطالعہ کرتی ہے اور نہیں سمجھتی کہ یہ سب کہاں سے اور کیوں آیا۔

تڑپ رہا ہے فلاطوں میانِ غیب و حضور ۔۔۔ ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف

بعض اوقات عقل زندگی کے ان ناگزیر سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کا جواب ایک گمان یا ظن سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کی اصل اور حقیقت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ ایک امکان مفروضہ سے آگے نہ بڑھے۔ وہ یقین و ایمان ہمیں نہیں عطا کرسکتی اور ایمان عمل کے لئے ناگزیر ہے۔

تماشائے علم تا افتد بہ دامت ۔۔۔ یقیں کم کن گرفتار شکے باش
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کن ۔۔۔ یکے جوئے دیکے بین و یکے باش

عشق ہی وحدت بیں نگاہ ہمیں بخشتا ہے۔ اور وہ ایمان و یقین ہمیں عطا کرتا ہے جس کی خودی کو تلاش تھی۔ عقل جب تک مادیات میں الجھی رہتی ہے اس وقت تک وہ عشق کا مذاق اُڑاتی ہے اور اس کے مقصود سے انکار کرتی ہے۔ لیکن درحقیقت عقل اور عشق میں کوئی تضاد نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عشق جن انوار کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے عقل ان کو نہیں دیکھتی اس لئے بعض اوقات اپنی تنگ نظری اور تعصب میں ان سے انکار کر بیٹھتی ہے لیکن عقل سلیم جو اپنی حدود کو سمجھتی ہے اور اپنی حقیقت کو پہچانتی ہے وہ اس عالم کے عجائبات سے انکار کی جرأت نہیں کرتی جس میں اس کو رسائی حاصل نہیں بلکہ منزل مقصود تک پہونچنے کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔ وہ رازِ حیات کو سمجھنے اور معمائے کائنات کو سلجھانے کی ایک بیتاب خلش پیدا کرکے ہمیں حقیقت کی جستجو پر مائل کرتی ہے اور اس راستہ پر ڈال دیتی ہے جس کی آخری حد عشق ہے۔ عقل جہاں سے ہمارا ساتھ چھوڑ دیتی ہے عشق وہاں سے ہمارا رہنما ہوتا ہے اور آخر بارگاہِ حقیقت میں ہمیں باریاب کرتا ہے۔

ابھی واضح کیا جاچکا ہے کہ خودی کی ارتقاء احکام الٰہی کا اتباع کرنے میں مضمر ہے اور احکام الٰہی وہی

ہیں جو انسانی فطرت کے قوانین ہیں بادی النظر میں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر شخص اپنی فطرت میں ان احکام کی جزئیات اور تفصیلات معلوم کرکے راہِ ارتقا پر گامزن ہو سکتا ہے اور منشائے الٰہی کو پورا کر سکتا ہے لیکن عام انسانی فطرت کے متعلق یہ ضرورت سے زیادہ حُسنِ ظن ہوگا۔ درحقیقت ہر شخص کی فطرت اتنی سلیم اور ترقی یافتہ نہیں ہوتی کہ وہ رضائے الٰہی کی تمام و کمال عکاسی کر سکے۔ اور خودی کے راستہ کی جزئیات و تفصیلات دریافت کر سکے۔ کبھی فطرت مادّی عناصر سے مغلوب یا باہم کجروی سے اس قدر مسخ ہو جاتی ہے کہ ان سرمدی نواؤں کو کھو بیٹھتی ہے۔ اس لئے خالقِ کائنات اپنی رضا کے اظہار کے لئے ایک ایسی برگزیدہ ہستی کو منتخب کرتا ہے جو انسانیت کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہو۔ جس کی خودی ہستیٔ کامل سے قریب تر ہو۔ جس کی فطرت سلیم مادّی عناصر سے مغلوب نہ ہو سکے۔ جس کا دل احکامِ الٰہی کے اسرار کا متحمل ہو۔ جو ان احکام کی صحیح تعبیر کرکے دوسروں تک پہونچا سکے۔ جو خود رضائے الٰہی کے راستہ پر گامزن ہو کر دوسروں کو اس راستہ کی دعوت دے سکے۔ جس کی خودی اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر دوسروں کو اس مقصد کے قابلِ حصول ہونے کا یقین دلا سکے۔ یہ ہے وحی اور نبوت کا فلسفیانہ مفہوم۔

ایسے انسانِ کامل کی اطاعت احکامِ الٰہی کی اطاعت ہے۔ ایسی برگزیدہ ہستی کا عشق عشقِ الٰہی کا مترادف ہے۔ لیکن ایسے انسانِ کامل کی پہچان کے لئے ہمیں پھر فطرتِ انسانی ہی سے رجوع کرنا پڑیگا۔ مانا کہ تمام انسانی فطرت راہِ ارتقا کی تفصیلات معلوم کرنے سے قاصر ہے لیکن کمالِ انسانی کا کوئی برگزیدہ نمونہ اس کے سامنے آئے تو مصیبت کوش انسان بھی پکار اٹھتا ہے کہ یہی ہے میری بھولی ہوئی منزلِ مقصود۔ یہ ہے اقبال کے فلسفہ میں عشقِ رسولؐ کی اہمیت ——!

ماہر القادری

نوائے خونیں

"یادِ رفتگاں" کا ایک اور غمناک ورق

زندگی چاہے یقینی نہ ہو مگر موت یقینی چیز ہے، اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ضرور ہے، جب اللہ کے نبی اور رسول نہ رہے تو اور کون رہ سکتا ہے زندگی کا قافلہ منزلِ فنا کی طرف چل رہا ہے بس آگے پیچھے کی بات ہے، کوئی منزل پر پہونچ چکا اور کوئی ابھی راہ میں ہے، میرا ہی شعر ہے --

جز ذاتِ خداوند کہ ہے دائم و باقی
دنیا میں سدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا

یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کے مرنے کا یقین نہیں آتا دفتر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے شاید وہ ملنے کے لئے آجائیں، میں نئے رسالے اور اخبار اُن کے سامنے پیش کروں پھر سیاست و ادب پر گفتگو چھڑ جائے، "زبان" کے کسی مسئلہ یا "لفظ" کی کسی تحقیق کے سلسلہ میں میری طرف سے جب یہ کہا جائے "ہمارے یہاں تو اس طرح بولتے ہیں" تو اس پر نواب صاحب طنز آمیز انداز میں فرمائیں "تم نے اپنے کو رشیہ وطن ---- "کسیر" کو کیا کوئی اقلیم سمجھ رکھا ہے" پھر ہم مل کر چائے پئیں ---- ستمبر کا شمارہ شائع ہوا تو حسب معمول خیال آیا کہ نواب صاحب کے پاس نیا پرچہ لیکر جاؤں گا اور چند دن کے بعد جب ..... پھر ملاقات ہوگی تو وہ ایک ایک مضمون پر تنقید کریں گے ----

"تمہارے نقشِ اول کا وہ حصّہ کمزور ہے، فلاں بات تم نے خوب لکھی ہے ---- افسانہ کا اُٹھان اچھا ہے مگر آخر میں تم دھم سے زمین پر گر پڑے، اُن صاحب کا مقالہ بہت جاندار ہے میں نے اُسے بار بار پڑھا ---- نظمیں اور غزلیں اوسط درجہ کی ہیں اور ماہر حیدر آباد سے چلے آنے کے بعد تمہاری شاعری میں وہ شوخی نہیں رہی ---

کیا خبر بابِ حریمِ ناز وا ہو یا نہ ہو
بس یہی اک وہم تھا سنگِ گرانِ کوئے دوست

تمہارے یہ شعر کتنے دل نشین ہیں" ---- اس خیال سے چونکتا ہوں تو عقل دل کی اس انجمن آرائی پر مسکراتی ہے کہ نواب صاحب اب کہاں؟ وہ تو اللہ کو پیارے ہوچلے، اور اے سخت جان ماہر! تو نے تو اُن کے جنازے کو کاندھا دیا تھا اُن کے جنازے کی نماز پڑھی تھی اُن کی قبر پر مٹی ڈالی تھی، وہ چلے گئے ہمیشہ کے لئے چلے گئے اور ساری دنیا کی

نوحہ گری بھی انھیں واپس نہیں لا سکتی۔

نواب نثار یار جنگ کا نام "نثار احمد" تھا، سادات سبزوار کے معزز اور مستند خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے آباؤ اجداد شاہانِ مغلیہ کے دور میں ہندستان آئے، دربار شاہی میں قدر و منزلت ہوئی، کئی گاؤں جاگیر کے طور پر عطا ہوئے مگر انقلاباتِ زمانہ کے ہاتھوں امارت اور فراغ و آسودہ حالی کی یہ بساط ہی اُلٹ گئی۔

زانقلابِ زمانہ عجب مدار کہ چرخ
ازیں فسانہ ہزاراں ہزار دارد یاد
کہ آگہست کہ کاؤس و کے کجا رفتند
کہ واقفست کہ چوں رفت تختِ جم برباد

نواب صاحب مرحوم علی گڑھ (یو۔پی) میں پیدا ہوئے، جامع مسجد کے نواحی محلہ اوپر کوٹ میں اُن کا آبائی مکان تھا، بہت ہی کم سنی میں وہ یتیم ہوگئے، بیوہ ماں نے بڑے حوصلے کے ساتھ اُن کو پرورش کیا، نواب صاحب کہا کرتے تھے کہ میری ماں نے مجھے خودداری کا سبق دیا اور مجھے گھٹی میں غیرت پلائی" غیرت مند ماں کے دودھ اور تربیت کا اثر اُن کی جبلت اور فطرت بن گیا، طبیعت کی اسی خودداری اور غیرت کی بدولت انھیں بہت سے مالی نقصانات اٹھانا پڑے، دوستوں، ہم چشموں اور ہم جیسے خاک نشینوں کے وہ بے تکلف یار تھے، جاہ و منزلت کا فرق ہی محسوس نہ ہونے دیتے مگر متکبروں کو دیکھ کر "التکبر مع المتکبر صدقۃ" کی تصویر بن جاتے اور اُن کا سرِ افتخار بلند تر ہو جاتا۔

آغازِ جوانی ہی میں نواب نثار یار جنگ مرحوم کو تلاشِ معاش کے لئے دیس چھوڑ کر پردیس جانا پڑا، بمبئی جب وہ پہونچے ہیں تو اُن کی مسیں بھیگ رہی تھیں، بمبئی میں انھوں نے ڈیڑھ دو سال رہ کر ایک اسکول میں ٹیچری کے فرائض انجام دئے، وہاں سے پھر حیدرآباد چلے آئے ——— دکن میں انھوں نے ٹھیکہ داری بھی کی ہے، دفتروں میں اہلکار (کلرک) بھی رہے ہیں، منتظمی (آفس سپرنٹنڈنٹ) کی ذمہ داریوں کو بھی نباہا ہے باب حکومت سرکار عالی (ایگزکٹو کونسل حیدرآباد دکن) کے پہلے صدر اعظم سر علی امام مرحوم کی پیشی میں معتمد علیہ کی حیثیت سے کام بھی کیا ہے۔

نواب صاحب مرحوم سر علی امام کے بڑے مدّاح تھے، اُن کی قابلیت، بیدار مغزی، مردم شناسی اور شرافت کی بہت تعریف کرتے تھے مگر افسوس ہے کہ سر علی امام حیدرآباد کی سازشوں کا شکار ہوگئے، "چاہ کن را چاہ در پیش" یہی سازشیں خود حیدرآباد دکن کے زوال کا باعث ہوئیں، نواب صاحب کہتے تھے کہ سر علی امام نے صدارتِ عظمیٰ سے استعفا جس وقت بارگاہِ خسروی[1] میں گزرانا تو اُس وقت سے کھانا پینا چھوڑ دیا، سر علی امام فرماتے تھے ریاست حیدرآباد دکن کی سرحد سے نکل کر کھاؤں گا پیوں گا! چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انھوں نے حیدرآباد چھوڑ دیا۔

---

[1] مگر اس انقلاب نے اس بساط ہی کو اُلٹ دیا، کہاں کی بارگاہ! اور کیسی خسروی! تاریخوں میں عروج و زوال کے جو افسانے پڑھے تھے، اُن کو ہم نے خود واقعات کی دنیا میں دیکھ لیا!

سر علی امام کے جانے کے بعد نواب صاحب مرحوم محکمہ سیاسیات میں انڈر سکریٹری ہوگئے، پھر دوم تعلقدار ہوئے اور پھر ضلع کے با اختیار حاکم (کلکٹر) بنا دئیے گئے، دکن کی تعلقداری (کلکٹری) اچھوٹی موٹی بادشاہت تھی، یوں سمجھئے کہ وہ چاندی سونے کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ دستِ غیب کے قدم قدم پر موقعے حاصل تھے، مگر نواب صاحب مرحوم کی بلند فطرت، اسلامی حمیت اور مذہبی غیرت ان آلودگیوں کی پرچھائیں کو بھی گوارا نہ کر سکی، وہ دگوں کے تحفے اور ڈالیاں تک قبول نہ کرتے تھے ——— اسی زمانہ میں بارگاہِ نظام سے اُن کو "نثار یار جنگ" خطاب عنایت ہوا۔

ایسے خوددار، غیرت مند، بلند حوصلہ انسان بلکہ یوں کہئیے مردِ مومن کو انگریز حکام کس طرح برداشت کر سکتے تھے، چنانچہ ان فرنگیوں کی بدولت جن کے چہرے گورے اور دل سیاہ ہوتے ہیں، نواب صاحب کو قبل از وقت وظیفہ (پنشن) پر ہٹ جانا پڑا، کوئی ڈیڑھ دو سال خانہ نشین رہے کہ پھر اس وقت کے "راج پرمکھ" اور اُس زمانہ کے "اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ" نے اُنھیں اطرافِ بلدہ کا تعلقدار (کلکٹر) بنا دیا اور کئی سال تک وہ اس عہدے پر فائز رہے، پھر وہ اس خدمت سے بھی سبکدوش ہوگئے! یہاں تک کہ زوالِ حیدرآباد کے بعد اپنی شریکِ زندگی اور اپنے داماد قمر مقصود صاحب کے اہل و عیال اپنے برادر نسبتی اشرف میاں کے بال بچوں اور دوسرے عزیزوں کے ساتھ کراچی آگئے اور اسی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے!

تعارف کے بعد

نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم سے غائبانہ تعارف اُن کے اس شعر کے ذریعہ ہوا:

اتنا تو مجھے یاد ہے کچھ اُس نے کہا تھا
کیا اُس نے کہا تھا یہ مجھے یاد نہیں ہے

پھر ایک دن مہاراجہ سرکشن بہادر یمین السلطنتہ کے دربار میں اُن سے ملاقات بھی ہوگئی!

مرزا یاس یگانہ لکھنوی کی رباعیوں کے مجموعہ (ترانہ) پر میں نے ایک طویل تنقید لکھی تھی، فانی بدایونی کو یہ تنقید بہت پسند آئی، وہ کہتے تھے اس مقالہ کو کتابی صورت میں چھپنا چاہیئے، مگر چھپتا کہاں سے! فانی اور میں دونوں مل کر بھی سَتر اَسّی روپیوں کا انتظام نہ کر سکے ——— پھر یہ تنقید رسالہ "ساقی" میں شائع ہوئی اور اُس کے جواب میں مرزا یگانہ نے مجھے خوب خوب ملاحیاں سُنائیں۔

تاریخ اور دن تو کیا مہینہ بھی یاد نہیں ہے، ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ یہ ۱۹۳۳ء کا واقعہ ہے میں ایک دن شام کے وقت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے یہاں گیا، وہاں فانی بدایونی اور نواب نثار یار جنگ بہادر بھی تھے، فانی مرحوم کے ایماء سے میں نے اُس تنقید کا ایک حصہ مہاراجہ بہادر کو پڑھ کر سنایا، مہاراجہ بہادر کی ڈیوڑھی سے میں لوٹا تو خوب رات ہوگئی تھی، میں شیروانی اُتار کر بیٹھا ہی تھا کہ اتنے میں دروازے پر موٹر رُکنے کی آواز آئی پھر کسی نے دستک دی، میں باہر گیا تو حضرت فانی اپنے ساتھ نواب نثار یار جنگ بہادر کو لئے کھڑے تھے، فانی مسکراتے ہوئے بولے:-

"بھئی! ماہر یہ نواب صاحب تمھاری تنقید سننے کے لئے آئے ہیں۔"

بس اُس ملاقات کے بعد تعلقات بڑھتے ہی چلے گئے، ہر طلوع ہونے والی صبح نے اس تعلقِ خاطر کو اور قریب تر کر دیا، نغمہ و رباب کی محفلوں سے لیکر خانقاہوں کے در و بام اور مسجدوں کے منبر و محراب تک ہمارے اخلاص کے شاہد

ہیں، اس دُنیا میں دوستوں کی کمی نہیں ہے مگر بے غرض دوستی بہت کم یاب ہے، لوگ ذاتی منفعت کے پیمانہ سے تعلقات کو ناپتے ہیں، میرے اور نواب صاحب کے روابط میں کوئی غرض، طمع یا منفعت شریک نہ تھی، دوستی صرف دوستی کے لئے! ایک دوسرے کی طبیعتیں بہت کچھ مل گئی تھیں!

میں حیدرآباد دکن میں جب تک تھا قریب قریب روزانہ ملاقات ہوتی رہتی اور یہ ملاقات گھنٹہ آدھ گھنٹہ کی نہیں بعض اوقات سارے سارے دن اور پوری پوری رات تک کی ہوتی تھی، کھانا پینا، شعر شاعری، اور سیاست، مذہب، تصوف اور ادب کے مسائل پر بحث مباحثہ، گفتگو، جرح و تنقید! نواب صاحب مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا، ذہن رسا اور فکر نکتہ سنج پائی تھی، طبیعت میں جودت اور شوخی بھی تھی، اس لئے ہماری علمی اور ادبی صحبتوں میں دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے تو اُکتانے نہ پاتے ——— گفتگو کے یہ موضوعات رنگا رنگ کے ہوتے تھے، کسی دن خوشخطی کا ذکر چھڑ گیا تو ابن مُقلہ، میر عماد اور دہلی کے میر پنجہ کش سے لیکر دکن کے زمرد رقم اور دوسرے خطاطوں تک کے حالات اور اُن کے "آرٹ" پر گفتگو ہو جاتی ——— تصوف کا ذکر نکلتا تو شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی عوارف المعارف اور مولانا رومؒ کی فیہ ما فیہ سے لیکر غوث علی شاہؒ پانی پتی کے تذکرہ غوثیہ تک پر گرما گرم بحث مباحثہ ہوتا، نواب صاحب وحدت الوجود کے قائل تھے اور اس مسئلہ پر ہم دونوں میں خوب نوک جھونک رہتی، اس اٹھارہ سال کی دوستی میں بس ایک بار بہت تلخ گفتگو ہو گئی، کئی مہینے تک ایک دوسرے سے کھنچے رہے، لیکن پھر جو ملے تو اس طرح ٹوٹ کر ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا کھچاوٹ کے بعد میل ملاپ میں بڑا لُطف آتا ہے!

ان صحبتوں میں علم و ادب اور شعر شاعری ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا، ان میں ہر کوئی اپنی زندگی کے پچھلے واقعات بھی بیان کرتا تھا، جہاں بے تکلفی اور یگانگت ہوتی ہے وہاں کیا کیا نہیں کہا جاتا، یعنی وہ باتیں بھی زبان پر آجاتی ہیں جو سب کے سامنے نہیں کہی جاتیں، زندگی کی کتنی سیاہیاں اور رنگینیاں بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں جھلکنے لگتی ہیں ——— نواب دستگیر نواز جنگ خاطر مرحوم بھی اس محفل کی رُوح رواں تھے، خاطر فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، تصوف اُن کی فطرت میں رچ گیا تھا، خوش سلیقہ اور نفاست پسند تھے اور دوستوں کی دل دہی، خاطرداری بلکہ نازبرداری میں اپنی آپ نظیر! دو سال کے اندر اندر خاطر اور مزاج دونوں چل بسے، ماہر سخت جان رہ گیا ہے ——— مگر ——— کب تک!

۵ آیا آیا یارانِ رفتہ آیا

نواب نثار یار جنگ طبیعت کے سادہ تھے خاک نشینوں کے ساتھ جھک کر اور بڑے آدمیوں سے تن کر ملنے والے! خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش طبع اور خوبصورت بھی! نازک ناک نقشہ تھا، گوری رنگت، جو کپڑا بھی پہن لیتے، جسم پر خوب پھبتا! جامہ زیبی کے ساتھ طبیعت میں نفاست بھی تھی، کھانے کے بہت شوقین تھے، مہمان نواز، سیر چشم، بامروت! اُن کا گھر مہمان خانہ ہی بنا رہتا، آئے دن دعوتیں اور جلسے[1]! ہاتھ کے سخی اور دل کے غنی، اپنی ضرورت روک کر دوسروں کی مالی امداد کرتے، اُن کی زندگی گوناگوں تجربوں اور طرح طرح کے انقلابوں سے گزری تھی مگر اس معاملہ میں بڑے بھولے

---

[1] یہ لفظ "پارٹی" کے مفہوم میں اہلِ دکن بولتے ہیں اور صحیح بولتے ہیں۔

تھے، ہر کوئی اپنی پریشانی کا ذکر کرکے اُن کو متاثر کرسکتا تھا ـــــــــ اس طبیعت کے آدمی کے پاس روپیہ پیسہ جمع کہاں ہو سکتا ہے! اِدھر تنخواہ ملی اور اُدھر خرچ ہوگئی یہاں تک کہ مہینہ کے آخری دنوں میں بالکل قلاش ہوجاتے۔

نواب صاحب مرحوم کے یہاں دوہی جذبے تھے محبت یا نفرت! جس سے محبت تھی اُس کے بندۂ بے دام اور جس سے نفرت وبیزاری اُس سے بات چیت کرنا بھی پسند نہ کرتے! اس معاملہ میں اُنھوں نے بڑی بڑی شخصیتوں کی بھی پروا نہیں کی، جب وہ صرفِ خاص کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے تو ایسا بھی ہوا کہ فوجداری کے مقدمہ میں ملزم پر اپنے اجلاس سے جُرمانہ کیا اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ملزم جُرمانہ ادا نہیں کرسکتا تو اُنھوں نے چپراسی یا اپنے پیشکار کی معرفت خود اپنے پاس سے جُرمانہ کی رقم عدالت کے خزانہ میں جمع کرادی اور ملزم چھوٹ گیا۔

مہاراجہ سرکشن بہادر کے یہاں مشاعرے ہوا کرتے تھے، میں طرحی غزل کہہ کر اُن کو سُناتا تو کہتے تم مجھے غزل لکھ کر دو، پھر اُس غزل پر بڑی دیر تک گفتگو رہتی "اس لفظ کو بدلو ـــــــ یہ مصرعہ چُست نہیں ہے ـــــــ یہاں یہ خامی رہ گئی" پھر وہ شعروں کو ترتیب وار لکھتے، یعنی مشاعرے میں جس ترتیب کے ساتھ پڑھنے چاہئیں، وہ کہتے تھے کہ غزل کے شعروں کو ترتیب کے ساتھ لکھنا بھی ایک فن ہے، حضرتِ داغ جب طرحی مشاعرہ کے لئے غزل کہتے تھے تو اُن کی غزل کی ترتیب دی جاتی تھی۔

میری غزل کا ایک شعر تھا:۔

اللہ اللہ! ترے جلووں کی بہار
ہر جگہ انجمن آرائی ہے

نواب صاحب نے فرمایا "جگہ" کو بدلو یہاں "طرف" اچھا معلوم ہوتا ہے، میں اس قسم کے مشوروں کو فوراً قبول کرلیتا، مگر بعض باتوں پر بڑی ردّوکد رہتی اور خوب خوب بحثیں ہوتیں!

مشاہیر کے ساتھ

نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج مرحوم نے نامور اہلِ علم اور مشاہیر روزگار کی آنکھیں دیکھی تھیں، کہتے تھے سر سید احمد خاں مرحوم نے بچپن میں بہ نظرِ شفقت آہستہ سے کان پکڑ کر ہلکی سی ایک چپت میرے لگائی تھی، فصیح الملک داغ دہلوی سے تلمذ حاصل تھا اور اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، مولانا حالی سے بھی وہ ملے ہیں، علامہ شبلی نعمانی کی زبان سے ترنم کے ساتھ قومی نظمیں سُنی ہیں، نواب محسن الملک اور جسٹس محمود کو اُنھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سرسید کے نامور پوتے سر راس مسعود مرحوم (نواب مسعود جنگ بہادر) اُن کے گہرے دوست تھے، سر راس مسعود اُن کو "پیارے نثار" لکھا کرتے تھے!

میں حیدر آباد دکن سے کانپور کے مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے جارہا تھا، بولے "ماہر! تم راستہ میں ایک دو دن کے لئے بھوپال اُتر جاؤ، سر راس مسعود سے ملو، شعروادب کے وہ بہت بڑے قدر داں ہیں ـــــ" پھر کہا "اچھا میری طرف سے اُن کو ایک تعارفی خط کا مسودہ لکھو" میں نے مسودہ لکھا، مسودہ پڑھا، اور مسکرا کر چاک کر دیا، فرمایا "بھئی! تم نے تو اس انداز میں اپنا تعارف کرایا ہے جیسے تم ماہر القادری نہیں شبلی نعمانی ہو"۔ پھر خود تعارف نامہ لکھ کر مجھے دیا مگر میں بھوپال میں نہیں اُترا!

سر سید احمد خاں سے نواب صاحب مرحوم کافی متاثر تھے اُن کی دردمندی اور اخلاص کے قایل تھے

مگر ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف تھا کہ سرسید مرحوم سے قرآن کی تفسیر اور اسلام کی ترجمانی میں غلطیاں ہوگئی ہیں!

قائد ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم سے حضرت ماہر کے بڑے خوشگوار تعلقات تھے، قائد ملت مرحوم کی ڈیوڑھی (بیت الامت) میں ایک بار مجلسِ اتحاد المسلمین کے ایک شورتی اجلاس کی صدارت بھی کی تھی ـــــــ میں ۱۹۴۶ء میں آخری بار حیدرآباد دکن گیا تو میری خاطر اپنے یہاں ایک دعوت کا انتظام کیا، مجاہد دکن سید قاسم رضوی کو بھی بلایا اور قاسم رضوی نے اس مجلس میں اپنا کلام بھی سنایا ـــــــ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعتِ اسلامیہ سے دلی تعلق اور گہرا ربط تھا اور اُن کے بڑے مدّاح تھے!

دمِ آخر

نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کی صحت پہلے ہی سے خراب تھی، کراچی میں آکر خراب تر ہوگئی، حیدرآباد دکن کے جس مکان کو اُنھوں نے چھوڑا ہے وہ اچھی خاصی وسیع اور آرام دہ کوٹھی تھی، یہاں کراچی میں آکر تنگ اور تکلیف دہ مکانوں میں رہنا پڑا، چند مہینے تو ایک خیمہ میں گزارے، اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ مصیبت تنہا نہیں آتی، اس خیمہ میں آگ لگ گئی، کئی سو روپیہ خیمہ والے کو دینے پڑے، حیدرآباد کی پنشن بھی بند ہوگئی تھی ـــــــ سچ سچ "عالم غربت"! وہ کبھی تنہانشین نہیں رہے، حیدرآباد میں دوستوں اور ملنے والوں کا جمگھٹا رہتا تھا، مگر یہاں یہ تنہائی اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھی، ہم اُن کے دوست اور جاننے والے گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے اُن کے پاس ہو آتے، ایک دن مجھ سے بولے ـ ـ ـ "ماہر! دماغ جواب دیتا جارہا ہے، اب کتاب بھی مجھ سے نہیں پڑھی جاتی، میں تمھاری وجہ سے خدا کی قسم تمھاری وجہ سے کراچی آیا تھا، سو تمھیں اپنے کام سے فرصت نہیں ہے، میں شکایت نہیں کرتا تم بھی مجبور ہو ـ ـ ـ"

نواب صاحب کی زندگی میں اس بات کا احساس نہ ہوتا تھا مگر اب اپنی کوتاہیوں پر غور کرتا ہوں تو دل کٹ کٹ جاتا ہے، مجھ سے پُوری طرح اُن کی دل دہی نہ ہوسکی، میرا دل کہتا ہے کہ نواب صاحب نے میری اس کوتاہی کو معاف کردیا ہوگا، اور نہ معاف کیا ہو تو اے خدا کے فرشتو! اُن تک میرا یہ پیام پہونچا دو کہ "ماہر کم بخت اور نالائق ماہر، تمھاری روح سے معافی چاہتا ہے، ایک دوست کو معاف کردو جبکہ تم اپنے دُشمن کو بھی معاف کردیا کرتے تھے ـ ـ ـ"!

دل کا پہلا دورہ پڑا تو احسن صاحب کی موٹر کار مجھے بلانے کے لئے بھیجی مگر میں مکان اور دفتر میں نہ تھا، دوسرے دن صُبح سویرے پیر الٰہی بخش کالونی پہونچا، اب طبیعت سنبھل چکی تھی، بولے "ماہر! میں نے تمھیں ایک ضروری کام کیلئے بلایا تھا، کل حالت بہت زیادہ خراب ہوگئی تھی، میں وصیت کرتا ہوں، دیکھو! میرے مرنے کے بعد رسم ورواج کی خرافات نہ ہونے پائیں ـ ـ ـ"!

دل کے دورے پڑتے تھے اور حالت سنبھل سنبھل کر بگڑتی تھی، کمزوری بلا کی ہوگئی تھی، ایک دن مجھ سے کہا اپنی کوئی پُرانی غزل سُناؤ، اپنی کتابوں میں سے میرا مجموعۂ کلام "نغماتِ ماہر" نکلوایا اور اس شعر کو بار بار سُنا:-

جانے کب ہو جائیں سازِ دل کے پردے نغمہ ریز
ہر نفس کو گوش بر آواز رہنا چاہیئے

بیماری کے زمانے میں دل و دماغ "رفیقِ اعلیٰ" کی طرف متوجہ تھے، ایک دن رونے لگے پھر خود ہی بولے "میں موت سے نہیں ڈرتا، اسی وقت ـ ـ ـ اسی وقت چاہے دم نکل جائے، مگر میرے گناہ میرے سامنے آتے ہیں تو خوف آتا ہے، لیکن اللہ کی رحمت کے آگے میری سیاہ کاریوں کی کیا حقیقت ہے"!

ایک دن مغرب کے بعد زائرِ حرم حمید لکھنوی کے مجموعہ کلام سے چند غزلیں اپنی نواسی سے پڑھوا کر سنیں، مدینہ اور صاحبِ مدینہ کا نام آتا تو آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے، میں نے کہا ـــ نواب صاحب! بدنصیبی تو ہماری ہے آپ کو تو زیارتِ حرمین میسر آ چکی ہے، بولے ـــ "شکر، شکر! اُس کا شکر! میں اس قابل کہاں تھا ـــ"

بڑے جوش اور عقیدت کے ساتھ ایک دن یہ شعر پڑھا

یارب تو کریمی و رسولے تو کریم
صد شکر کہ ہستند میانِ دو کریم

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگے ـــ لیکن میں نے خدا اور بندے میں ہمیشہ فرق کیا، خدا خدا ہے، رسول رسولؐ ہیں، میں دیکھ رہا تھا کہ اُن کا چہرہ جوشِ توحید سے تمتمایا جا رہا ہے ـــ ایک دن فرمایا "کیا کروں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی یادِ بیوں کی خلش دل سے نہیں جاتی، نہیں جاتی مگر میں اُن کو بُرا نہیں کہتا وہ کاتبِ وحی تھے اور رسول اللہؐ کے برادرِ نسبتی تھے"!

آخری حالات بہت اچھے تھے، آنسو، دعائیں، توبہ، استغفار، خدا اور رسولؐ کا ذکر! سوز و گداز پہلے ہی سے طبیعت میں تھا، آخری دنوں میں یہ اور بڑھ گیا۔

میں دو دن مسلسل اُن کے مکان پر رہا کہنے لگے ـــ "ماہر! تمہیں بہت تکلیف ہوئی، مگر آخری تکلیف ـــ بس آخری تکلیف ـــ"! ایک دن اُن کی حالت سنبھل گئی، میں نے کہا اللہ کے فضل سے آپ اچھے ہو گئے، اس پر بولے ـــ "وہ کیا ہوتا ہے ـــ جب بیمار اچھا ہونے لگتا ہے ـــ" میں قصداً خاموش ہو گیا پھر خود ہی فرمایا ـــ "افاقۃ الموت ـــ" اور اُن کا کہنا ٹھیک ثابت ہوا ـــ ہائے! ان پتھر آنکھوں سے آنسو بھی تو نہیں نکلتے!

رہے نام اللہ کا!

منتخب اشعار

نواب نثار یار جنگ بہادر مرحوم کا خط نہایت پاکیزہ تھا، اُن کی تحریر سلیس سادہ اور اثر انگیز ہوتی تھی اگر انشا پردازی کی طرف توجہ ہوتی تو اس فن میں نام پیدا کرتے، ۱۹۴۶ء میں انجمن مسلمانانِ پنجاب بمبئی کی طرف سے بڑے شاندار پیمانہ پر "اقبال ڈے" منایا گیا تھا اُس کے مشاعرے کی صدارت نواب صاحب مرحوم نے کی تھی، کسی تیاری کے بغیر مختصر سی تقریر بھی کی جو پسند کی گئی!

اپنے کلام کا مجموعہ "کیفیات" یادگار چھوڑا، حضرتِ جگر مراد آبادی نے اس پر یہ رائے دی ہے:-

"حضرت مزاج فطرتاً شاعر ہیں، اور بحیثیت انسان نہایت درجہ پاکیزہ نفس اور بیش از بیش اعلیٰ اخلاق و صفات کے حامل ـــ اس مجموعہ کلام میں اُس دور کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں ـــ مجھے کامل توقع ہے کہ موصوف کا کلام زندہ رہے گا اور مستقبل قریب میں اُن کے ادبی مرتبہ کا اعتراف کیا جائے گا"

جناب جگر مراد آبادی نے نواب نثار یار جنگ بہادر مزاج کے کلام کا انتخاب بھی پیش کیا ہے، یہ اشعار اُسی انتخاب سے ماخوذ ہیں!

کبھی دیکھا تھا اک جلوہ کسی کے روئے روشن کا ابھی تک حسرتِ دل لے رہی ہے انتقام اُس کا
ابھی تک نقشہ سے کی طرح ہے میری آنکھوں میں وہ طرزِ دلبری اُس کا وہ اندازِ خرام اُس کا

اُس کی شانِ مغفرت اُس کی کریمی دیکھ کر
میرے منہ میں خاک میرا ذوقِ عصیاں بڑھ گیا

رہروِ راہِ محبت کے لئے منزل کہاں
ہر قدم پر یوں تو منزل کا گماں ہوتا رہا

کر گئی کام تری سحر بیانی واعظ
خیر ہو دین کی، دُنیا سے مرا دل اُٹھا

اُن کے آتے ہی منور ہو گئے دیوار و در
آج خود بھی ہو گئے ہیں زینتِ کاشانہ ہم

سُراغ مل ہی گیا اُن کے نقشِ پا کا ہمیں
یہیں نشانِ سرِ سجدہ پائے جاتے ہیں

جی نہ بہلے جب تو اُس دُنیا کو لے کر کیا کریں
آ خیالِ یار! اور آباد اک دُنیا کریں

شبِ فراق کی ایذا کو ہم نشیں مت پُوچھ
خدا کسی کو اس آفت میں مبتلا نہ کرے

لذتِ دردِ محبت جو نمایاں ہو جائے
ہر فرشتہ کو یہ حسرت ہو کہ انساں ہو جائے

دلِ شوریدہ کو پاسِ نگہِ ناز بھی تھا
ورنہ سینہ میں تو سامانِ جنوں ساز تھا

فصلِ گل کے ساتھ ہی پہونچا یہ فرمانِ خزاں
پتیاں پھولوں کے کھلتے ہی بکھر جایا کریں

آپ کی خاطر سے میں خاموش ہوں
ورنہ سب کچھ ہے لبِ فریاد میں

ایماں نواز گردشِ پیمانہ ہو گئی
اب راہِ مغفرت رہِ میخانہ ہو گئی

اشکِ غم کی قدر بے دردوں کو کیوں ہونے لگی
یہ گہر ہیں ہم نشیں اپنے ہی داماں کے لئے

منتِ خلق سے لیا تو نے مزاج کو بچا
اے غمِ بیکسیٔ عشق عمر تری دراز کو

نعیم صدیقی

صُورِ حشر

موجوں سے لڑکے ہم تو یہاں ڈوبتے رہے
ساحل پہ بیٹھے آپ مگر دیکھتے رہے

جب کفر مجھ کو لے کے چلا دار کی طرف
تم دیں کے سرپرست کنارے کھڑے رہے

پانی مرا جب آنکھ کا دل سے حیا گئی
بندِ نقابِ رسم و دیا ٹوٹ کے رہے

یہ گُل ہی جانتا ہے کہ یہ کیا مقام ہے
سینہ ہے چاک! ہونٹ برابر سلے رہے

یاں معرکے بپا بھی ہوئے بیت بھی گئے
تم کس پناہ گاہ میں آخر چھپے رہے؟

ہم تو پکارِ فرض کی سُنکر نکل پڑے
کتنے مفاد پیچھے کھڑے کھینچتے رہے

توحید کے نقیبوں کی اولاد ہیں یہ لوگ
بن کر صنم کدوں پہ جو دربان کھڑے رہے

جنت جزا میں۔ لینے کو آئے ترے خواص!
دنیا میں آیتوں سے تری کھیلتے رہے

یہ بھی رہِ فرار تھی! وہ بھی رہِ گریز
میخانے، خانقاہ کے ڈانڈے ملے رہے

گو بجا ہے صورِ حشر بڑے زور سے مگر
قبروں میں کیسے چین سے مردے پڑے رہے

"پیام"

عبدالکریم ثمر

اک سجدہ زیر سایۂ شمشیر ہو ادا
مومن کی زندگی کا یہ ہے آخری مقام

ہے مجکو اب بھی آرزو ایسی نماز کی
صف بستہ اک قطار میں ہوں "خواجۂ غلام"

افسوس تو ہے موت کی لذت سے بے خبر
اس کی حلاوتوں سے مجاہد ہیں شاد کام

خونِ شہید سے جو ہو تحریر خاک پر
قرطاسِ دو جہاں پہ وہی نقش ہے دوام

سجدہ ترا طویل ہے اور دل بغیر سوز
لازم ترے سجود کو ہے مختصر قیام

میدانِ کارزار میں ساماں نہ کر تلاش
مومن کی اک نگاہ بھی ہو تیغِ بے نیام

ممکن نہیں خدا کی حضوری نصیب ہو
پوشیدہ ہو نظر سے جب اسلام کا مقام

میں ڈھونڈتا رہا حدِ کون و مکاں ثمر
اپنے ہی دل میں اس کا نہ ڈھونڈا کبھی مقام

نازش پرتاب گڑھی

ساقی!

درست اپنی جگہ ہر اقتضائے زندگی ساقی!
شعورِ بیش و کم ہو تو ہے جائز نیند بھی ساقی!

وصالِ گام و منزل ہو نہیں سکتا کبھی ساقی!
طلب کے ساتھ اگر شامل نہیں دیوانگی ساقی!

وہیں دیتی ہے پھر بڑھ کر بقا آواز بھی ساقی!
جہاں ہوتی ہے پیدا دل میں قدرِ زندگی ساقی!

ہیں یوں تو ہر جگہ، ہر سمت ڈھیروں آدمی ساقی!
مگر اب تک ہے اِس دنیا میں انساں کی کمی ساقی!

ذرا بیدار تو ہو جائے دنیا اور بھی ساقی!
تو مانگے گی تجھی سے جامِ عیشِ زندگی ساقی!

زہے وہ دل کہ جس نے آہ کی توفیق پائی ہو
کہ آ جاتی ہے اک دن آہ میں تاثیر بھی ساقی!

نہیں جب طاقچوں میں دل کے کوئی شمع بھی روشن
تو پھر آخر کہاں سے آئے منہ پر روشنی ساقی!

قیامت ہے کہ اب مجھ کو وہی جینا سکھاتے ہیں
بتائے تھے جنہیں میں نے رموزِ زندگی ساقی!

کہستاں راہ سے ہٹ جائے، دریا راستہ دیدے
ارادوں میں نہ آ جائے اگر ناپختگی ساقی!

عبدالعزیز خالدؔ

ہم نفس سے!

اُٹھ کہ ظلمت کدۂ دل میں چراغاں کرلیں
نورِ عرفاں سے دماغوں کو فروزاں کرلیں

شہپرِ شوق کو پھیلا کہ ہوں سرگرم ستیز
اور آفاق کی تسخیر کا ساماں کرلیں

دین و دنیا کی سعادت انہی اوراق میں ہے
مصحفِ پاک کو پھر حرزِ دل و جاں کرلیں

ارضِ بطحا سے ملے گی مرضِ دل کو شفا
کیوں نہ اے چارہ گرو درد کا درماں کرلیں

فوق کریمی

"..... دو گام کی زحمت اور سہی"

یہ کس کی نظر نے بدلا ہے اندازِ نظامِ میخانہ
مینا کے لبوں پر لرزش ہے اور کانپ رہا ہے پیمانہ

اِن آخری شب کے لمحوں کو کچھ اور فروزاں رہنے دے
ممکن ہے مکمل ہو جائے دنیا کیلئے اک افسانہ

تو حوصلۂ دل پست نہ کر منزل تو یقیناً آئے گی
دو گام کی زحمت اور سہی اے جرأتِ عزمِ مردانہ

جو آج میرے افسانہ کو سنتے ہیں بڑی بے کیفی سے
وہ وقت بھی اب کچھ دور نہیں بن جائیں گے خود بھی افسانہ

اطہر نفیس

"کہکشاں"

آج چہرے گلوں کے زرد ملے
شاید ان سے بھی اہلِ درد ملے
کتنی آبادیاں ہوئیں ویران
کتنے عالم بشکلِ گرد ملے

اشکِ غم اور ترے پھول سے رخساروں پر — اس قدر ظلم نہ کر اپنے پرستاروں پر
ایسا عالم تو نہ دیکھا تھا کبھی آنکھوں نے — اب سے پہلے بھی خزاں آئی تھی گلزاروں پر
کون سمجھے کہ شکارِ غمِ دوراں ہیں وہی — مسکراتے ہوئے دیکھا جنھیں ناداروں پر
آج احساس و تخیل کی ہیں راہیں مسدود — آج پابندیٔ افکار ہے فن کاروں پر
ہر قدم زیست نے کھائے ہیں کچھ ایسے ہی فریب
مجھکو دشمن کا گماں ہوتا ہے غمخواروں پر

...سرور بھوپالی

نہ ترے ستم کا گلہ مجھے، نہ تری روش کا ملال ہے — مگر اب کہ غم ہے شباب پر تری آرزو کا سوال ہے
مری آگہی مجھے کیا ہوا، وہ متاعِ عشق کہاں گئی — نہ سرورِ بادۂ شوق ہے، نہ فروغِ شمعِ خیال ہے
یہ نگاہِ گرم یہ شورشیں، یہ قدم قدم پہ قیامتیں — ترے نازِ حسن کی خیر ہو، یہ جہاں حریمِ جمال ہے
بدل سکی ہے کہیں روحِ عشق بھی ناصح — فروغِ شمع سلامت ہزار پروانے
گزر گئے ترے غم سے بھی بے نیازانہ — دلوں میں اپنے چھپائے ہزار ویرانے

...سرور سرحدی

وہ کم نظر ہے جسے فکرِ آشیانہ ہے — کہ آج سارا چمن برق کا نشانہ ہے
مسرتوں کا زمانہ عجب زمانہ ہے — رکے تو خواب گزر جائے تو فسانہ ہے
وہ آ رہے ہیں مرے گھر یقیں نہیں آتا — رکی رکی سی مگر گردشِ زمانہ ہے
ابھی تو میرے جنوں کی ہے ابتدا ہو سرور
ابھی سے تنگ مجھے وسعتِ زمانہ ہے

ادریس احمد خالد مینائی
(ایم - اے)

مسلم سے خطاب

(حج کے موقعہ پر)

تجھکو کیا بے حسی و شورشِ ایام سے کام
تیری تعمیر میں رکھا نہ گیا جوہرِ خام

عرش و سدرہ کے حوالی میں پڑا ہے کہرام
قدسیوں کے تری غفلت پہ ہیں دل بے آرام

دل کا حج! سوزِ براہیمؑ و دمِ اسماعیلؑ
تو نے بے عمرہ و حج کھول دیا کیوں احرام

آہ اے طائرِ سدرہ نشیں تیرے بغیر
باغِ جنت کے مکینوں پہ کٹھن ہیں ایام

رہ تری راہِ وفا اور تری منزلِ دوست
آہ اے مردِ جری تیرا سفر تیرا مقام

تو نے کی دلقِ گدائی میں بھی شاہی ایسی
ایک دستور کے پابند ہوئے میر و غلام

شام اور ہند کے گھر کس کے لئے ماتم دار؟
کس کو اندلس کے کھنڈر روئے حلب کے در و بام؟

عقل نے لوٹ لیا روح کا سرمایۂ سوز
اس کے لٹنے پہ لٹا قلب و نظر کا آرام

گرگ و روباہ نے تھامی ہے زمامِ صحرا
شیر مردوں نے کیا گوشۂ عزلت میں قیام

کھینچ شمشیرِ جگر دار کہ مردانِ جلیل
جامِ شمشیر سے پیتے ہیں شرابِ گلفام

ہو نہ ملت کو جو آزادیِ کردار و خیال
خواب اور خور ہے غلامانِ محمدؐ پہ حرام

ہیچ ہے دعوئ یکتائی و غمخواری و ذوق
گر نہیں جذبِ عمل سوزِ یقیں کا پیغام

"میں نے اے میرِ سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے
قل ھو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام"

ہے اسی سوز میں وہ جوہرِ عرفان و سرور
جس سے روشن ہیں مقاماتِ شبستانِ دوام

گر نہیں فکر و عمل عقدہ کشائے غمِ زیست
ذوقِ ایجاد ہے پھر ظلم و فنا کا پیغام

نوٹ: ستمبر کے فاران میں جناب خالد مینائی کی جو نظم (فقر و جہانگیری) شائع ہوئی تھی اُس کے دو شعر اصل میں اس طرح ہیں:

فقر نے صدیقؓ کو بخشا سرور و صدق و شوق
فقر نے فاروقؓ پہ کھولے رموزِ سروری

کیا کہوں رکھتی ہے کیا سرمایہ راز و نیاز
ہر حدیثِ شوق، خالدؓ! ہر ادائے دلبری

ماہر القادری

ڈائری

"شہر سے بال بچوں کو لیکر کسی قصبہ یا گاؤں میں چلا جاؤں ——" سلیم دل ہی دل میں سوچنے لگا، شدید غور وفکر اور انتہائی اضطراب کے آثار اُس کے تیوروں سے نمایاں تھے، چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا، جان ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے، موت سے سب ڈرتے ہیں، کوئی آدمی اپنی خوشی سے ذرا سی ایک پھانس کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرسکتا اور یہاں تو ہر آن جان جانے کا خطرہ تھا، دشمن کے طیارے بمباری کر چکے تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تو پہلی آزمائش اور ابتدائی تجربہ تھا، حملے تو اب ہوں گے، آگ تو اب برسے گی، غنیم کے پاس بہتر سے بہتر آتش بار ہوائی جہاز موجود ہیں کروڑوں اربوں روپیہ کا سامان اسی دن کے لئے جمع کیا ہے —— سلیم کا اضطراب بڑھتا ہی جارہا تھا، اُس کے ماتھے کی سلوٹیں جلد جلد بے ترتیب ہوئی جارہی تھیں، وہ سوچ رہا تھا —— قوم اور وطن کے فرض سے میں غافل نہیں ہوں مگر جان بچانا بھی تو فرض ہے، میں کسی گولہ کا نشان بن گیا یا کسی دیوار کے نیچے دب کر مرگیا تو میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خبر گیری کون کریگا! آپا دھاپی کا زمانہ ہے، پڑوس میں کوئی دم توڑتا رہے مگر اُس کے ہمسایوں کو تسلی اور غمخواری کے دو لفظ کہنے کی توفیق نہیں ہوتی"

گلی سے برف کی قلفیاں بیچنے والے کی آواز آئی اور سلیم کا منجھلا لڑکا باپ کے پاس بھاگتا ہوا آیا —— "ابا جان! کلفی —— کلفی کھاؤں گا —— کلفی" —— سلیم نے ایک چونی قمیص کی جیب سے نکال کر بیٹے کو دی اور بچہ چونی مٹھی میں باکر گلی کی طرف بھاگا، بچوں کی خوشی بہت ہی سادہ اور معصوم ہوتی ہے، ایک کھلونے، ایک غبارے اور مٹھائی کے ایک ٹکڑے سے اُن کی خوشی کو خریدا جاسکتا ہے، بچہ رو رہا ہو اور آپ ذرا تالی بجا دیجئے، وہ ہنس دیگا، اس طرح کہ آنکھوں میں آنسو ہوں گے اور لبوں پر مسکراہٹ! کاش! زندگی بچپن ہی کا نام ہوتی!

—— یہ آج صبح سے تم کیا سوچ رہی ہو، دن کے دس بجنے کو آئے اور ابھی تک سودا سلف بھی نہیں آیا، تم نے ناشتہ بھی ٹھیک طرح نہیں کیا —— سلیم کی بیوی نے کہا

—— تمھیں لوگوں کی فکر ہے یہی سوچ رہا ہوں کہ کل پھر بمباری ہوگی، اور کل آگ برس کر رک تھوڑی ہی جائے گی یہ سلسلہ تو جاری رہے گا، سوچتا ہوں کہ تم سب کو لیکر کسی گاؤں میں چلا جاؤں —— سلیم نے جواب دیا

—— تمھارے منھ سے ایسی کم ہمتی کی باتیں سن کر مجھے تو بڑا اچنبھا ہو رہا ہے، میں تو یہ خیال کرتی تھی کہ ہم عورتوں میں گھبراہٹ پھیلے گی تو تم ہمت بندھاؤ گے —— اور —— بیوی کی بات پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سلیم بیچ میں بول پڑا —— میں کم ہمت نہیں ہوں، موت سے نہیں ڈرتا، اپنی جان کی مجھے ذرا بھی پروا نہیں، تم لوگوں کی فکر ہے —— (بیوی جواب دیتی ہے) آپ ہماری فکر چھوڑ دیجئے، اللہ ہم سب کا نگہبان اور محافظ ہے، قسمت میں مرنا لکھا ہے تو لوہے کے بنے ہوئے قلعے بھی،

موت سے نہیں بچا سکتے، موت کا فرشتہ ہر جگہ پہونچ جاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کو زندہ رکھنا منظور ہو تو آگ کے شعلوں میں بھی بال بیکا نہیں ہو سکتا۔

بیوی کی باتیں سلیم کی غیرتِ مردانہ کو ابھار رہی تھیں وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے اسے ایکا ایکی پستی سے اچھال کر بلندی پر پہونچا دیا، گرے ہوئے جذبات ابھرنے لگے، چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کی جو سپیدی اور زردی پائی جاتی تھی وہ حوصلہ کی سرخی سے بدل گئی —— اسی عالم میں نفس نے پھر اس کے کان میں پھونکا کہ اس طرح عورت کے مقابلہ میں ہار مان لینا مردانگی کی توہین ہے —— وہ بولا:۔

"میں تم لوگوں کو باہر پہونچا کر واپس آجاؤں گا تاکہ تم محفوظ ہو جاؤ، جو کچھ بیتے گی مجھ پر بیتے گی اور اللہ نے چاہا تو میں ثابت قدم رہونگا اور۔ (بیوی نے شوہر کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا) اگر شہر کے سب لوگ یہی کرنے لگیں تو ایک بھگدڑ مچ جائے گی، ایک خاندان کو دیکھ کر دوسرا خاندان بھاگے گا اور یہ سلسلہ چل پڑا تو پھر میرے منہ میں خاک یہ سمجھو کہ ہم نے آپ ہی ہار مان لی —— جی —— ہیں ——"

اتنے میں قومی والنیٹروں کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا گلی سے گزرا، ان کے ساتھ جیپ کاروں میں اعلانچی تھے جو لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ بڑے جوش خروش کے ساتھ اعلان کرتے جاتے تھے ——

"بھائیو! اپنی اسلامی حمیت، قومی وقار اور دینی غیرت کا ثبوت دو، ہم اس دوراہہ پر کھڑے ہیں جہاں سے موت اور زندگی، مردمی اور نامردی اور شکست اور فتح کے راستے پھٹتے ہیں، فیصلہ کرو کہ تمیں ان میں سے کیا پسند ہے (والنیٹر یک زبان ہو کر نعرے لگاتے ہیں —— زندگی، بہادری، فتح —— اور شورِ تکبیر سے فضا گونجنے لگتی ہے) —— جو جہاں پر ہے وہیں جما رہے، کہیں جانے اور منتقل ہونے کی کوشش نہ کرو، جواب دو کیا کروگے (رضاکاروں کا دستہ پھر جواب دیتا ہے —— سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار کی طرح یہیں جمے رہیں گے —— مسلمان موت سے نہیں ڈرتا —— خدا پر بھروسا اور پھر فتح و نصرت —— اللہ اکبر، اللہ اکبر، پاکستان زندہ باد ——)

رضاکاروں کی پلٹن چلی گئی، مگر فضا میں ایک گونج چھوڑ گئی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بہادری اور حوصلے ہوا میں تیر رہے ہیں —— اتنے میں زنانہ والنیٹروں کی ایک پارٹی آئی، جوان اور بے باک لڑکیاں چست وردی پہنے ہوئے! جسم کے وہ حصے جن کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے اور جن کے دیکھنے سے جنسی کشش ہیجان میں آئے بغیر رہ نہیں سکتی، ان کو خوب نمایاں کئے ہوئے اور ابھارے ہوئے! پہلے بینڈ بجا، محلے کے مرد اپنے اپنے فلیٹوں سے اس حسین نظارے کو دیکھ رہے تھے اور دیکھ ہی نہیں رہے تھے جھکے پڑتے تھے، ان میں سے ایک نوجوان لڑکی نے جوشیلی تقریر کی، مگر نوجوانوں کے کانوں میں جوش کم اور رس زیادہ پڑ رہا تھا، جنگ کا محاذ دور تھا، موت دور تر تھی اور جوانی اور خوبصورتی آنکھوں کے سامنے تھی —— یہ جنت نظارہ، یہ فردوسِ نگاہ، یہ منظر حسین و دل کش! سینوں میں دل کیا کیا مچل رہے تھے!

تنقید ہو رہی تھی لڑکیوں کی اداؤں اور چہروں کی بناوٹ پر! انگلیوں اور آنکھوں کے اشاروں سے اور زبانوں سے بھی:۔

—— اس چھریرے بدن کی لڑکی کا رنگ کتنا گورا ہے، گردن بھی صراحی دار ہو بس آنکھیں ذرا چھوٹی

ہیں مگر کمر کی لچک کو تو دیکھئے، گلاب کی ڈالی جیسی ——— ارے عظیم! مجھے تو بھئی! یہ سانولے رنگ کی لڑکی پسند ہے میں رنگت کو نہیں ناک نقشہ کو دیکھتا ہوں اور خوبصورتی نام ہی قد کی موزونیت اور تناسب اعضا کا ہے ——— اوہو! یہ حُسن، یہ جوانی یہ صحت اور پھر ان سب پر قیامت ادائے رکانہ (اسلم! آہستہ بولو، تمھارے ماموں کھڑکی کے قریب ہی کھڑے ہیں ——— ایک آواز)' اجی! کھڑا رہنے دیجئے ماموں جان کو! اُن کے پیٹ میں بھی تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے!

یہ قیامت بھی گزر گئی، رومان (ROMANCE) کے کچھ حسین نقش چھوڑ کر!

عزم، حوصلہ بے باکی اور جُرات کی جو فضا پیدا ہوئی تھی اُس میں کچھ رنگینیاں بھی گھُل مل گئیں، رزم آرائی اور محاذ جنگ کے تصور میں انجمن آرائیاں اور عیش سامانیاں بھی شریک ہوگئیں، ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا، ہوس کو جہاں بھی ذرا سا سہارا ملے گا وہ بے قابو ہو کر رہے گی! پتھروں کی رگڑ سے پانی کی موجیں نہیں آگ ہی پیدا ہونی چاہیئے، یہ قدرت کا قانون ہے، فطرت ہے ——— اور جذبات کی رگڑ، نگاہوں کا تصادم، عیش و ہوس اور حُسن و جوانی کی قربت اور نظارہ سامانی؟ یہ سمجھانے اور بتلانے کی بات نہیں ہے، ہر کوئی جانتا ہے! اُن کی غیرت کا ماتم جو سب کچھ جان کر انجان بنتے ہیں!

اس کے بعد ایک اور جماعت آئی جس کے ساتھ باجہ گاجہ نہ تھا، شرمیلے اور غیرت مند نوجوان مگر جسور اور بہادر! اُن کے دل کی پاکیزگی اُن کے چہروں سے نمایاں تھی، فلیٹوں سے عورتیں جھانک رہی تھیں اس لئے وہ اُوپر کی طرف نظر اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے، اُن میں سے ایک نے کھُلی ہوئی ٹرک میں کھڑے ہو کر تقریر کی:-

——— **بھائیو!** صلح ہو یا جنگ، امن وعافیت کا دور ہو یا خوف و اندیشہ کا زمانہ، ہر حال میں مسلمان کو اللہ کی رضا کا تابع رہنا چاہیئے، ہم مسلمان جنگ کی حالت میں بھی اخلاقی حدود کو نہیں توڑتے! خدا کا خوف دل میں ہو تو پھر کسی اور چیز کا خوف پاس نہیں پھٹک سکتا، امتحان اور آزمائش کی سخت اور نازک گھڑیاں آرہی ہیں، شدید استقامت اور انتہائی ضبط و نظم اور ڈسپلن کی ضرورت ہے، برستی ہوئی آگ گرتے ہوئے مکانوں اور جلتی ہوئی زمین کی حالت میں بھی ہمیں ایک دوسرے کی ہمدردی، قومی وقار، ثباتِ قدم اور توکل علی اللہ کا ثبوت دینا ہے، پہاڑوں کی طرح جمے رہو اور دریا کی موجوں کی طرح زخمیوں، پریشان حالوں اور بے گھروں کی مدد کے لئے دوڑو ——— میں جو عرض کر رہا ہوں کیا آپ توجہ سے سُن رہے ہیں (جی ہاں! پوری توجہ اور شوق کے ساتھ ——— بہت سی آوازیں آئیں) بھائیو اور بہنو! یہ زمانہ خدا کی طرف رجوع ہونے کا ہے، زیادہ سے زیادہ رجوع الی اللہ! نمازیں، دُعائیں، خضوع و خشوع، پاکیزہ زندگی، گناہوں سے توبہ! اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ "اللہ اکبر" کے وہ نعرے بے اثر ہیں جن کے پیچھے اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے تقاضے نہ ہوں، بدر و حنین میں اللہ تعالیٰ نے جن مقدس انسانوں کی مدد فرمائی تھی وہ اللہ کے انتہائی اطاعت گزار تھے، تم چاہتے ہو کہ تاریخ پھر اپنے کو دُہرائے تو اللہ کی رسّی کو مل جُل کر مضبوطی کے ساتھ پکڑ لو، پھر چاہے زندگی ساتھ دے یا موت آجائے دونوں حالتوں میں تم کامیاب ہو! ———"

اس تقریر میں خلوص کے ساتھ پاکیزگی بھی تھی، دل سے نکلی ہوئی آواز، جس پر ضمیر بھی "لبیک" کہہ رہا

تھا، جس نے سُنا متاثر ہوا، کسی کسی کی آنکھوں میں آنسو آگئے، عورتیں جو گلی کی طرف جھانک رہی تھیں پیچھے کو ہٹ گئیں کُھلے ہوئے سروں پر دوپٹے اور ساریوں کے پلّو آگئے،

—— یا اللہ! اِن نیک لوگوں کے کام میں برکت دے، سب کے دلوں میں تیرے دین کی ایسی ہی لگن پیدا ہو جائے —— سلیم نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا

—— "آمین" تم نے میرے مُنہ کی بات چھین لی، یہ لوگ تو انسانوں کے بھیس میں سچ مُچ فرشتے ہیں!

—— بیوی نے جواب دیا -

دن گزرا، شام ہوئی، رات آئی، رضاکار، قومی کارکن، حکومت کا محکمہ نشر و اشاعت، اخبار، ریڈیو سب اسی کام میں لگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ صبح ہونے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے کہ خطرے کا سائرن بجا، محکمۂ دفاع کی ہدایت کے مطابق ہر کوئی اپنے کام میں لگ گیا، ڈاکٹر، نرسیں، آگ بُجھانے والے انجن، پولس، فوج، فرسٹ ایڈ کے دستے، امدادی پلٹنیں سب کی سب تیار ——!

"دشمن کے ہوائی جہاز آن پہنچے" ایک شور اُٹھا، "جہاز مار توپیں" حرکت میں آگئیں! ورلڑنے والے طیارے بھی فضا میں اُڑنے لگے، آگ برسنے لگی اور خوفناک آوازیں بھی جیسے موت کا فرشتہ چیخ رہا ہو، بچے ڈر کے مارے اپنی ماؤں کے کلیجوں سے چمٹ گئے، کسی مکان کی دیواریں گر رہی تھیں اور کہیں شعلے بلند ہو رہے تھے، شہر میں ہر طرح کے آدمی تھے ہمت والے بھی اور کم ہمت بھی، حوصلہ مندوں نے گھبرا جانے والوں اور بُزدلوں کو تھامے رکھا اور اُن کی ہمت بندھائی کہ کہیں ان کی بدحواسی دوسروں کے پاؤں نہ اکھاڑ دے!

خون و آتش کا یہ ہنگامہ ڈیڑھ گھنٹے کے قریب رہا، دشمن کے کچھ ہوائی جہاز توپوں نے مار گرائے، دو تین کو شکاری طیاروں نے تباہ کر دیا اور باقی بھاگ گئے، رُک کر کیا کرتے، بم برسانے کے لئے آئے تھے اپنا کام پورا کر کے لوٹ گئے۔

سلیم کے دروازے پر کسی نے دستک دی، دستک کیا کوئی دھڑا دھڑ کواڑوں کو پیٹ رہا تھا، سلیم نے دروازہ کھولا، اُس کا پڑوسی گھبرایا ہوا تھا، چہرہ پر پیلاہٹ، ماتھا پسینہ میں ڈوبا ہوا، اُس کی سانس تک نہ جُڑتی تھی،

—— خیر تو ہو آپ اس قدر پریشان اور گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ سلیم نے دریافت کیا

—— ارے صاحب! موت سر پر منڈلا رہی ہے، اجل کا فرشتہ دروازے پر کھڑا ہے اور آپ پوچھ رہے ہیں کہ آپ گھبرائے ہوئے کیوں ہیں! اس سے بڑھ کر گھبراہٹ کا اور کونسا موقعہ ہو سکتا ہے (اندر تو آئیے —— سلیم پڑوسی کی بات کاٹتے ہوئے کہتا ہے، اور وہ اندر آجاتا ہے دونوں فرش پر بیٹھ جاتے ہیں ——) ہاں! تو میاں سلیم اب شہر میں رہنا ٹھیک نہیں، اور یہ تو ابھی دشمن نے شروعات کی ہے، شدید حملے تو اب ہوں گے، چلو ہم تم اپنے بال بچوں کو لیکر کسی گاؤں میں چلے چلیں —— پڑوسی نے کہا

—— قاضی صاحب! آپ کی طرح مجھے بھی اپنے بال بچے پیارے ہیں اور اپنی جان سے میں بھی کوئی بیزار نہیں ہوں مگر یہاں دین، قوم اور وطن کی حفاظت اور وقار کا سوال ہے جس پر ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے بلکہ کر دینی چاہئیے! کیا آپ نے حکومت، رضاکاروں اور قومی کارکنوں کے اعلانات نہیں سُنے، کہا گیا ہے کہ بھگدڑ، بدحواسی اور بزدلی خدانخواستہ ہماری شکست کا سبب بن سکتی ہے —— یہ خیال دل سے نکال دیجئے قاضی جی! ہمیں یہیں

رہنا ہے، چاہے جو کچھ بھی ہو، اللہ کے فضل پر بھروسہ کیجئے، زندگی میں کبھی کبھی آزمائش کے موقعے آتے ہیں اُن میں پُورا اترنا ہی مسلمان کا فرض ہے ——— سلیم کے کہنے اور غیرت دلانے پر قاضی جی کی کچھ ڈھارس بندھی، خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولے:۔

سلیم! تم میرے چھوٹے بھائی نصیر کی برابر ہو، تم سے بات کیا چھپاؤں، کیا کروں میری بیوی نہیں مانتی، صاحب! کھانا پینا دشوار کر دیا ہے بس یہی رٹ ہے کہ آج بلکہ اسی وقت شہر کو چھوڑ دو (تو آپ بھابی جان کو سمجھایئے، سمجھانے سے نہ مانیں تو سختی کے ساتھ کہہ دیجئے کہ میں شہر کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا ——— سلیم نے قاضی جی کی بات کاٹ کر کہا) تمھاری باتوں نے میری ہمت بندھا دی سلیم میاں! تمھارا شکریہ!

اتنے میں رضا کاروں کا ایک دستہ آیا، اعلان کیا گیا کہ کھانے اور کپڑوں کی فوری ضرورت ہے:۔

امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا

سلیم نے بیوی کی طرف دیکھا، بیوی باورچی خانہ میں گئی، سلیم بھی وہاں پہونچ گیا، بیوی رات کے بچے ہوئے کھانے کا آدھا حصہ کٹوردان میں سنوار رکھ رہی تھی ——— آدھا نہیں پورا کھانا، اللہ تعالیٰ نے اپنے پریشان حال بندوں کی امداد اور غم خواری کیلئے ایک موقع دیا ہے، نہ جانے کتنے مرد عورتیں اور بچے بھوکے ہوں گے ——— سلیم نے کہا ———

——— بچوں کیلئے تو تھوڑی سی روٹیاں، ذرا سا سالن اور ایک رکابی چاول رکھ لوں ——— بیوی نے جواب دیا۔

——— اُن کیلئے بسکٹ کافی ہیں، بسکٹوں سے نہ بہلیں گے تو کھانا پک بھی سکتا ہے ——— سلیم کھانا لیکر نیچے پہونچا، کپڑوں کا ایک پشتارہ بھی اُس کے ساتھ تھا، "جزاک اللہ، بارک اللہ" ایک رضا کار نے کھانا اور کپڑا لیتے ہوئے کہا

دس بارہ دن تک یہی حالت رہی، دشمن کے ہوائی جہاز آتے اور بم گرا کر لوٹ جاتے، شہریوں نے بڑی پامردی کا ثبوت دیا، ہزار گھروں میں سے دو چار گھرانے شہر سے البتہ باہر چلے گئے انسانوں میں سبھی تو ایک جیسے نہیں ہوتے اور نہ ہوسکتے ہیں لاکھوں کی آبادی میں سے دو چار ہزار کا باہر جانا محسوس بھی نہیں ہوا۔

محاذِ جنگ سے پُر اُمید خبریں آرہی تھیں، مجاہد یلغار کرتے ہوئے چلے جارہے تھے کہیں کہیں پسپا بھی ہونا پڑا مگر پھر حالت سنبھل گئی، اخباروں میں اعلانات چھپ رہے تھے، جلی سُرخیوں اور نمایاں عنوانات کے ساتھ۔ کہ سول آبادی کی استقامت کے بغیر فوجیں کامیاب اور فتحمند نہیں ہوسکتیں، عوام نے ابتک جس استقامت کا ثبوت دیا ہے اگر وہ اسی طرح جمے رہے تو پھر دشمن کو ہارا ہوا سمجھو، عوام کا حوصلہ (MORALE) ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔

بمبار طیاروں کے خوفناک حملے ہوتے رہے ان حملوں میں جانیں بھی ضائع ہوئیں، لوگ زخمی بھی ہوئے، مکانوں کی تباہی بھی ہوئی، ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا، جنگی ہوائی جہاز سیر کرنے اور تماشا دیکھنے کیلئے نہیں آتے اُن کی اُڑان تباہی، بربادی، آتش زدگی اور جان و مال کے نقصان ہی کیلئے ہوتی ہے، سائنس نے موت کو بہت آسان اور ارزاں کر دیا ہے، مہینوں میں جتنی تباہی ہوا کرتی تھی اب منٹوں میں ہو جاتی ہے ——— ہائے انسان کی ذہانت! کاش! وہ چوپایوں کی طرح بے شعور اور بے عقل ہوتا!

شہری عوام نے بڑے حوصلہ، بلند ہمتی اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا مگر سب لوگ ایک جیسے نہ تھے، چوروں، اُچکّوں، اُٹھائی گیروں اور بدمعاشوں نے بھی خُوب ہاتھ کئے، گھر کے گھر ظالموں نے صاف کر دئے! آہ! انسان کی بلندی

اور پستی! بلند ہوتا ہے تو فرشتوں کو بھی منزلوں پیچھے چھوڑ دیتا ہے اور نیچا ہوتا ہے تو شیطان بھی اُس کے آگے کان ٹیکنے لگتا ہے! اس جنگ میں یہ حقیقتیں اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آگئیں، جس مسجد میں کچھ خدا کے بندے نمازیں پڑھ رہے تھے اور رو رو کر اللہ کے حضور دُعائیں مانگ رہے تھے اسی مسجد سے جوتیاں، بجلی کے بلب اور مُصلّے چرائے جا رہے تھے۔

آج مطلع ابر آلود تھا، بوندا باندی بھی ہوئی، شام ہی سے رات کے آثار نمایاں تھے دن چھپے بعد خطرے کا سائرن بجا اور آن کی آن میں دُشمن کے آتش بار طیارے آ پہونچے، بمباری ہونے لگی، سلیم جس بلڈنگ میں رہتا تھا اُس کے قریب ہی کئی بم آ کر گرے جس کے اثر سے مکانوں کی دیواریں ہل گئیں، آگ کے شعلے بھڑکنے لگے، سلیم کے فلیٹ کی چھت کا ایک حصہ گرا اور سلیم زخمی ہو گیا، بیوی نے زخمی شوہر کے لہو کو پانی سے دھویا، زخموں پر روئی رکھی مگر خون کہاں تھمتا تھا، سلیم نے آنکھیں کھولیں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان ہل کر رہ گئی دو ایک لفظ اُلجھے ہوئے نکلے اور اُس پر غشی طاری ہو گئی ——

—— بچے چیخ رہے تھے، ماں رو رہی تھی اور گھر والا بیہوش پڑا تھا، یہ کنبہ اُس مکان میں تھا جس کی آدھی چھت گر چکی تھی، دو دیواریں شق ہو چکی تھیں، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مکان اب گرا اب گرا، ایسے مخدوش مکان سے بھاگ جانا چاہیئے تھا مگر ایسی کون بے درد اور پتھر دل بیوی ہو گی جو اپنی اور بچوں کی جان بچانے کیلئے زخمی شوہر کو تن تنہا چھوڑ کر چلتی بنے!

دو گھنٹے کے بعد گلی میں ایک ایمبولینس کار آ کر رُکی، لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہوا "زخمیوں کی امداد کے لئے —— زخمیوں کی امداد کیلئے ——" سلیم کی بیوی نے کھڑکی پر آواز دی کہ آخری منزل پر ایک زخمی موجود ہے، تین آدمی اس آواز کے سُنتے ہی تیزی کے ساتھ اوپر آئے، سلیم کو دیکھا، پھر اُنھوں نے سیٹی بجائی، سیٹی کی آواز سُن کر چار آدمی بیماروں کا پلنگ لیکر اوپر پہونچے اور سلیم کو پلنگ پر ڈال کر نیچے لے گئے، ایمبولینس کار میں سلیم کو چڑھایا ہی جا رہا تھا کہ ایک جیپ کار آئی اور سلیم کے بیوی بچوں کو وہاں سے لے گئی۔

ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے تھے روزانہ اس تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا، شہر کی دفاعی کمیٹی کے دفتر کے چند کمروں کو مریضوں اور زخمیوں کیلئے کام میں لایا گیا، سلیم کو بھی اسی میں رکھا گیا، اُس پر رات بھر غشی طاری رہی، صبح سویرے ہوش آیا تو اپنے کو ایک دفتر میں پاکر کچھ بدحواس سا ہو گیا، اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ایک ایک چیز کو حیرت کے ساتھ دیکھا، ارے! یہ نقشے، یہ وردیاں، یہ جھنڈے، یہ بانسوں کی ٹٹی، وہ میری الماریاں کیا ہوئیں، ریڈیو سٹ کون اُٹھا کر لے گیا، اور وہ گھڑی، وہ صوفے —— ایں! میں خواب تو نہیں دیکھ رہا، آخر میں کہاں ہوں! میری بیوی کہاں ہے، بچے نظر نہیں آتے، یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے، اور میرے سر پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے، اُس نے اٹھنا چاہا مگر نقاہت نے پھر اُسے غافل کر دیا۔

زخمیوں کا یہ عارضی ہسپتال قومی کارکنوں کا دفتر بھی تھا، ہر جماعت اور ہر پارٹی کے لوگ یہاں آتے تھے، آپس کے جماعتی، طبقاتی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود ملک کے دفاع کیلئے سب یک زبان یک جان اور متحد اور متفق ہو گئے تھے، سیلاب کے زمانہ میں ہم نے سانپوں اور آدمیوں کو ایک تختہ پر بیٹھا ہوا دیکھا ہے یہ تو پھر انسان تھے!

سلیم کی حالت سنبھلتی اور بہتر ہوتی چلی جا رہی تھی، قومی کارکنوں کی نقل و حرکت دیکھنے اور اُن کی بات چیت سُننے کا اُسے یہاں ہر وقت موقع ملتا اُس کا پلنگ دفتر کے کمرے سے بالکل ملا ہوا تھا، کھڑکی درمیان میں تھی وہ کھلی رہتی۔ محاذِ جنگ سے اچھی خبریں آ رہی تھیں، غنیم پسپا ہوتا چلا جا رہا تھا، یہاں تک کہ مجاہدوں کی یلغار نے دشمن

کے آخری مورچہ کو بھی توڑ دیا، حریفوں کے پاؤں اُکھڑے تو اکھڑتے ہی چلے گئے، سو سو مجاہدوں نے دو دو ہزار سورماؤں کو خاک و خون میں تڑپا دیا، باطل کو کیا کیا غرور تھا اپنی فوجوں کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی پر! مگر حق کے آگے باطل کو سرنگوں ہونا پڑا بڑے بول کا سر نیچا ہی ہو کر رہتا ہے!

سلیم کو اچھا ہو جانا چاہیئے تھا، زخم بھر چلے تھے مگر قدرت کا ...... قانون ہماری تمناؤں اور اُمیدوں کا پابند نہیں ہے! اُٹھنے بیٹھنے اور ہلنے جُلنے میں بے احتیاطی کے سبب اُس کے ایک کچے زخم کے ٹانکے ٹوٹ گئے، اور چند گھنٹوں کے اندر اندر زہریلا مادہ پیدا ہو گیا، ڈاکٹروں نے بہت کچھ تدبیریں کیں مگر زخم بگڑتا ہی چلا گیا ـــــ تکلیف، سوزش، نقاہت، گھبراہٹ ...... بیوی سرہانے بیٹھی ہوئی رو رہی تھی، چپکے چپکے، سلیم نے آنکھیں کھولیں، پتلیاں پھرنے لگیں، چہرہ سپید ہوتا جارہا تھا، زبان سے بس "خدا حافظ" نکلا اور پھر خاموشی، ابدی خاموشی!

"بہن! صبر سے کام لے، اللہ کو یاد کر، دل کو تھام ـــــ ایک قومی کارکن سلیم کی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا، سلیم کی بیوی کی آنکھوں میں دُنیا بھیانک اور تاریک تر ہو گئی تھی، اُس کا غم اگر پہاڑوں پر ڈالا جاتا تو وہ بھی چیخنے لگتے!

سلیم کی پلنگ کی چادر، گدے اور تکیوں کو جب ڈریسر نے اُٹھایا تو ایک سیاہ رنگ کی کاپی فرش پر گر پڑی، یہ مرحوم کی لکھی ہوئی ڈائری تھی، اُس میں لکھا تھا:-

"جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اُس سے پہلے یہ بھی کہہ دوں کہ ملک کے بچاؤ کیلئے سبھی نے اپنی بساط بھر کوششیں کی ہیں ـــــ مگر کوشش کوشش میں فرق ہے ـــــ زخمی ہو کر جو میں یہاں آیا تو میں نے ایک ڈرامہ دیکھا، کیسے کیسے کردار سامنے آئے ـــــ اور ...... (دو سطریں نہیں پڑھی گئیں، شاید پانی پینے میں کچھ بوندیں گر گئی ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ لکھنے والے کے آنسوؤں نے حرفوں کی سیاہی کو دھو دیا ہو ـــ) میں نے اُن قومی لیڈروں کو بھی دیکھا ہے جو حیات و موت کی اس کشمکش میں چاہتے تھے بلکہ اس بات کی کوششیں کرتے تھے کہ اُن کی تصویریں اخباروں میں چھپیں، اُن کے کارناموں کو سراہا جائے، پبلک میں اُن کو قبولیت حاصل ہو اور اس ذریعہ سے سرکاری حاکموں میں بھی اُن کا رسوخ بڑھ جائے (یہاں ایک جملہ لکھا ہے" وہ بہت کڑوی ہے ـــ) ان گنہگار آنکھوں نے عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ اختلاط کے شرمناک مناظر بھی دیکھے ہیں، یہ عشق بازیاں، یہ چھیڑ چھاڑ ...... اور ...... کاش! میں اتنا بے شرم ہوتا کہ جو کچھ دیکھا ہے سب کچھ بیان کر دیتا ـــــ وہ لوگ دین اور اخلاق کے مجرم ہیں جنھوں نے عورتوں کی اس آزادی، بے حجابی اور بے باکی کو "قومی خدمت" کا نام دیدیا (پھر ایک جملہ ـــ ہائے! میرے زخموں میں کتنی ٹیس ہو رہی ہے" اللہ ـــ اللہ ـــ یا اللہ ـــ) ـــ میں نے اُن مخلص، نیک سیرت اور پاک ضمیر قومی کارکنوں کو بھی دیکھا ہے جو کیمرہ مینوں سے اس بات پر جھگڑتے تھے کہ اُن کی تصویریں ہرگز نہ لی جائیں، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے کارناموں کا اخباروں میں ذکر آئے، اُنھوں نے شہرت، نام و نمود اور جلبِ منفعت کیلئے ایک قدم بھی نہیں اُٹھایا، جو کچھ کیا اللہ کی خوشنودی کیلئے کیا، بے غرض خدمت، بے لوث کارنامے، خلوص، صداقت، اللہ کا خوف ـــــ اور ہائے اُن کی وہ نمازیں، وہ سجدے، وہ دُعائیں اور آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے! مجاہدوں کی تلواروں کے جوہر اور ان حق پرستوں کے اشکوں کی تابانی نے مل جل کر فتح و نصرت کے علم بلند کئے ہیں! ـــ بارالہا! ان کی مدد فرما ـــ (ربنا تقبل منا ...... الفاظ نہیں پڑھے جاتے، جیسے لکھتے میں کسی کا ہاتھ کانپ گیا ہو ......)

روحِ انتخاب

توحیدِ الٰہی کیا ہے؟

پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان ہونا چاہیئے۔ رسول کی عزت و توقیر اور نصرت و حمایت ہونی چاہیئے۔ صبح و شام صرف اللہ ہی کی تسبیح ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہ عبادت ہے۔ صرف اُس ذات برتر ہی کے لئے سزاوار ہے۔ نماز صرف اسی کی۔ روزہ صرف اسی کی خوشنودی کیلئے اور حج صرف اسی کے گھر کا ہونا چاہیئے۔ شدِّ رحال صرف تین مسجدوں ہی کی طرف ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کے نبیوں نے اُن کو اللہ کے حکم سے بنایا ہے۔ نذر صرف اللہ ہی کیلئے مخصوص ہے، قسم صرف اللہ ہی کی کھانا چاہیئے۔ دُعا صرف اللہ ہی سے کرنا چاہیئے۔ اور دُہائی صرف اللہ ہی کی دینا چاہیئے۔ ان باتوں میں اللہ تعالیٰ کو کسی کی شرکت گوارا نہیں۔ کیونکہ یہ صرف اسی کیلئے سزاوار ہے۔

رسولؐ کا واسطہ

حیوان و نباتات سورج چاند، مینہ اور بادل غرضکہ اپنی جملہ مخلوقات کے پیدا کرنے میں اس نے کسی مخلوق کو بھی واسطہ قرار نہیں دیا بلکہ اُس نے خود ہی اُنہیں اور اُن کے اسباب کو پیدا کیا ہے۔ کوئی مخلوق بھی غیر موجود کو موجود نہیں کر سکتی کیونکہ وجود کیلئے اسباب کی موجودگی اور موانع کی دُوری ضروری ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی قدرت بجز خدا کے اور کسی میں بھی نہیں۔ وہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ لیکن تبلیغ و رسالت کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس نے اس کی انجام دہی کیلئے **واسطہ** بنایا ہے۔ اور وہ واسطہ خود اس کا رسول ہوتا ہے۔ جو اس کے حکم سے اس کے پیغام بندوں تک پہنچاتا ہے۔

ہدایت اور استحقاقِ شفاعت

رہا بندوں کے دلوں میں ہدایت پیدا کرنا تو اس کی قدرت رسولؐ کو بھی نہیں۔ ہدایت صرف خدا ہی کے فضل سے آتی ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت یاب کر دیتا ہے۔ فرمایا

انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء (۲۸: ۵۶)

تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے لیکن وہ خدا ہی جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔

ان تحرص علیٰ ھداھم فان اللہ لایھدی من یضل (۱۶: ۳۷)

تو اُن کو ہدایت یاب کرنے کی کتنی ہی خواہش کرے مگر اللہ اسے ہدایت نہیں کرنے کا جو گمراہ ہو گیا۔

بلاشبہ انبیاء کی دُعا شفاعت۔ استغفار۔ ایک ایسی چیز ہے جو نفع پہنچاتی ہے مگر اس شرط سے کہ مستحق کیلئے ہو۔ ورنہ اگر پیغمبر کفّار و منافقین کیلئے دُعا کرنے لگے تو اس کی دُعا ذرا بھی سُود مند نہ ہو گی۔ جیسا کہ فرمایا

سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم

چاہے تو ان کیلئے مغفرت کی دُعا کرے یا نہ کرے مگر اللہ ان کو ہرگز معاف نہیں کریگا۔

توحید و رسالت کا فرق و وسیلۂ نجات

پس یہ معلوم ہو گیا کہ انبیاء ہم تک ہمارے رب کا امر و نہی اور وعدہ و وعید پہنچانے والے ہیں تو ہم پر

فرض ہو گیا کہ ان کی لائی ہوئی تمام خبروں کی تصدیق اور ان کے دئے ہوئے تمام حکموں کی تعمیل کریں۔ نیز ہم پر فرض ہوا کہ تمام رسولوں کی تصدیق کریں۔ اور کسی کو بھی اُس سے مستثنیٰ نہ کریں۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک کو بھی مطعون کرنے والا کافر و مرتد ہے۔ اور اُس کا خون مباح ہے۔ لیکن باوجود اس تمام تصدیق و طاعت و تعظیم کے جب توحید کا مسئلہ سامنے آئے گا تو ہمیں صاف کہنا پڑیگا۔ کہ جو حق خدا کے ہیں اُن میں انبیا بھی اس کے ساجھی نہیں۔ انہیں خدا کا شریک نہ بنایا جائے گا۔ اُن پر توکل و تکیہ نہ کیا جائے گا۔ اُن سے پناہ نہ مانگی جائے گی۔ ان کی قسم خدا کو نہ دلائی جائے گی۔ انکی ذات وسیلہ نہ قرار دی جائے گی۔ بلکہ اُن کے ایمان۔ اُن کی محبت و طاعت و موالات ان کی تعظیم و توقیر اُن کے دشمنوں کی دشمنی ان کی دلائی ہوئی صداقت کی تصدیق اُن کی حرام و حلال کی ہوئی چیزوں کی تحریم کو نجات کا وسیلہ بنایا جائے گا۔

غلو کا پہلا درجہ

علماء اسلام نے شرعی دُعائیں بیان کر دی ہیں اور بدعی دعاؤں سے اعراض کیا ہو لہذا ہمیں بھی چاہیئے کہ کہ ان کے نقشِ قدم پر چلیں۔ اس باب میں تین درجہ ہیں۔ ایک یہ کہ غیر اللہ کو پکارا جائے جو مر چکا ہو، یا غیر حاضر ہے۔ عام اس سے کہ کوئی نبی ہو یا ولی مثلاً کہے "اے فلاں" مجھے پناہ دے۔ یا تیری دُہائی ہے۔ یا دشمن کو زیر کر دے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ ہو کہ اُس سے مغفرت و توبہ چاہے۔ جیسا کہ بہت سے جاہل مشرک کرتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھکر یہ ہو کہ اس کی قبر کو سجدہ کرے۔ یا اس کی قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھے اور سمجھے کہ یہ نماز قبلہ رو نماز سے افضل ہے۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں۔ یہ قبر خواص کا قبلہ ہے اور کعبہ عوام کا قبلہ ہے۔ اور یہ کہ اس کی زیارت کیلئے چند مرتبہ کا سفر سفرِ حج کا ثواب رکھتا ہے بلکہ بہت سے غالی تو ایک دفعہ کی زیارت کو متعدد نفل حجوں سے بھی افضل بتاتے ہیں۔ یہ چیز شرک ہے اگرچہ بہت سے لوگ اس کے مرتکب کیوں نہ ہوں۔

غلو کا دوسرا درجہ

دوسرا درجہ یہ ہو کہ انبیا یا صالحین میں سے جو وفات پا چکے ہیں یا غیر حاضر ہیں اُن سے کہا جائے کہ میرے لئے دُعا کرو۔ یا اپنے رب سے ہمارے حق میں التجا کرو۔ جیسا کہ عیسائی حضرتِ مریمؑ وغیرہ سے درخواستیں کرتے ہیں۔ اس چیز میں کسی عالم کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا کہ وہ ناجائز ہے، اور ایک ایسی بدعت ہے جسے سلفِ اُمت میں سے کسی نے بھی نہیں کیا۔

زیارتِ قبور کی دُعائے مسنون

ہاں اہلِ قبور پر سلام بھیجنا اور انھیں۔ مخاطب کرنا جائز ہے چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو تعلیم دیتے تھے کہ جب قبروں پر جائیں تو کہیں

السلام علیکم اھل الدیار من المومنین والمسلمین، وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون یغفر اللہ لنا ولکم نسال اللہ لنا ولکم العافیۃ اللھم لا تحرمنا اجرھم ولا تفتنا بعدھم واغفر لنا ولھم ۔	تم پر سلام اے اس جگہ کے بسنے والو ہم انشاء اللہ تم سے مل جانے والے ہیں خدا ہمیں اور تمہیں بخشے، ہم اللہ سے اپنے اور تمہارے لئے عافیت چاہتے ہیں اے خدا ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ کرنا اور ان کے بعد فتنہ میں نہ ڈالنا۔

مشروع اور غیر مشروع

ابو عمر بن عبد البرؒ نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ فرمایا:۔

ما من رجل یمر بقبر الرجل کان یعرفہ	جب آدمی کسی شخص کی قبر پر سے گزرتا ہے جسے دُنیا

فی الدنیا فیسلم علیہ الارد اللہ علیہ روحہ حتی یرد علیہ السلام

میں جانتا تھا اور سلام کرتا تھا تو خدا اس کی روح اسے لوٹا دیتا ہے تاکہ اس کے سلام کا جواب دے دے۔

سننِ ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا۔

ما من مسلم یسلم علی الارد اللہ علی روحی حتی ارد علیہ السلام

جو مسلمان بھی مجھ پر درود بھیجے گا تو خدا میری روح لوٹا دیگا تاکہ اس کے سلام کا جواب دے سکوں۔

یہ مشروع ہے لیکن موتیٰ سے دعا چاہنا اور کوئی خواہش کرنا مشروع نہیں!

حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور روضۂ اطہر

مُوطا امام مالک میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب روضۂ مبارک پر جاتے تو یہ کہہ کر فوراً ہٹ جاتے:۔

السلام علیک یا رسولؐ اللہ السلام علیک یا ابا بکرؓ السلام علیک یا ابہ

اے رسولؐ اللہ آپ پر سلام اے ابوبکرؓ آپ پر سلام اے باپؓ آپ پر سلام۔

عبداللہؓ بن دینار سے مروی ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا کہ حجرہ میں کھڑے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کیلئے دعا کر رہے ہیں۔ اسی طرح حضرت انسؓ وغیرہ کی بابت منقول ہے۔ کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجتے اور جب دُعا کرنا چاہتے تو قبلہ رو ہو جاتے تھے۔

بعد والوں کی لغزش

کسی ایک صحابی کے متعلق بھی مروی نہیں کہ اُس نے حجرہ کی طرف رُخ کرکے دُعا مانگی ہو بلاشبہ بعد کے بہت سے فقہاء و صوفیا اور عوام نے اس معاملہ میں لغزش کی مگر کوئی ایک ایسا امام بھی اس طرف نہیں گیا۔ جس کی رائے مانی جاتی ہو اور جسے امت میں عام مقبولیت حاصل ہو۔

ائمہ اربعہ کا مذہب

ائمہ اربعہ مالکؒ و ابوحنیفہؒ و شافعیؒ و احمدؒ اور دوسرے ائمہ اسلام کا مذہب یہ ہے کہ زائر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر چکے اور اپنے لئے دُعا کرنا چاہے۔ تو قبلہ رو ہو جائے۔ پھر سلام کے بارے میں اختلاف ہے کہ کس طرح کیا جائے۔ مالکؒ و شافعیؒ و احمدؒ کا مذہب ہے کہ حجرہ کی طرف منہ کرکے سلام کرنا چاہیئے اور ابوحنیفہؒ کا قول یہ ہے کہ سلام کے وقت حجرہ کی طرف منہ بھی نہ کرے۔ پھر اس بارے میں اُن کے مذہب میں دو قول ہیں کہ آیا حجرہ کو پشت دیکر سلام کرے یا بائیں جانب رکھے۔ یہ سلام کے متعلق ائمہ کا اختلاف ہے مگر دعا میں سب ایک زبان اور متفق ہیں۔ کہ قبلہ رُخ ہونی چاہیئے۔

امام مالکؒ والی حکایت

رہی وہ حکایت جو امام مالکؒ کی نسبت بیان کی جاتی ہے، کہ ان سے جب خلیفہ منصور نے حجرے کی طرف رُخ کرکے دُعا مانگنے کی بابت پوچھا تو اُنھوں نے اس کی اجازت دی اور کہا۔ ھو وسیلتک و وسیلۃ ابیک آدم (وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) تیرا اور تیرے باپ آدمؑ کا وسیلہ ہیں) تو یہ امام مالکؒ پر ایک بہتان ہے اس کا سلسلۂ روایت مجہول ہے اور ان کی مذہب کی کتابوں اور ان سے مستند روایتوں کے سراسر خلاف ہے جیسا کہ اسمٰعیل بن اسحاق وغیرہ نے بیان کیا ہے چنانچہ امام مالکؒ سے مروی ہے کہ جب ان سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا گیا جو حجرہ کے سامنے دیر تک کھڑے ہوتے اور اپنے لئے دُعا کرتے ہیں۔ تو انھوں نے اس فعل کی سخت مذمت کی اور کہا یہ ایک ایسی بدعت ہے جسے سلفِ اُمت صحابہ و تابعین میں سے کسی نے بھی نہیں کیا اور

فرمایا۔ لایصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا ما اصلح اولھا۔ (اس امت کا آخر بھی اسی سے درست ہوگا جس سے اس کا اوّل درست ہوا ہے)

استدلال ابن تیمیہؒ امام مالکؒ نے جو کچھ کہا ہے وہی درست ہے کیونکہ صحابہ و تابعین کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ چیز ان میں نہ تھی حالانکہ اگر دُعا کے وقت حجرہ کی طرف متوجہ ہونا جائز ہوتا۔ تو وہ ضرور اس سے واقف ہوتے۔ اور اس پر سب سے پہلے عمل کرتے دُعا صرف خدا ہی سے کی جاتی ہے۔ اس لئے دُعا کے وقت حجرہ کی طرف رُخ کرنا اسی طرح ممنوع قرار دیا گیا جس طرح نماز کے وقت حجرہ یا قبر کی طرف رُخ کرنا ممنوع ہے جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ میں ثابت ہے۔ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لا تجلسوا علی قبور ولا تصلوا الیھا — نہ قبروں پر بیٹھو نہ ان کی طرف منہ کرکے نماز پڑھو۔

لہٰذا اس حدیث صحیح کے بموجب قبروں کی طرف رُخ کرکے نہ نماز پڑھنا جائز ہے اور نہ دُعا کرنا۔ قبروں میں کوئی تخصیص یا امتیاز نہیں انبیاؑ اور غیر انبیاء سب کی قبریں اس حکم میں یکساں طور پر داخل ہیں۔

سخت بدعت و معصیت

اس بارے میں تمام مسلمان متفق ہیں کہ نماز کے لئے قبر پر جانا اور قبر کی طرف رُخ کرکے ادا کرنا جائز نہیں، بلکہ سخت بدعت اور معصیت ہے اس طرح دُعا کیلئے قبر پر جانا عام اس سے کہ انبیاء کی قبریں ہوں یا صالحین کی جائز نہیں پس جب قبر کی طرف نماز اور قبر کے پاس دُعا ناروا ہے تو خود میت سے یا صاحب قبر سے دُعا مانگنا یا چاہنا بدرجہ اولیٰ ناروا ہوگا۔

("کتاب الوسیلہ" از شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ الحرانی رحمۃ اللہ علیہ
مترجمہ:۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی)

ہمارِی نظر میں

ماہنامہ "الصدیق"

ماہنامہ "الصدیق"— حصۂ اُردو کے ترتیب دینے والے:- حمّاد رشید اور حصۂ عربی کے مُرتب:- محمد عبداللہ، مُدیر مسئول:- عبدالکریم، قیمت سالانہ حصۂ اُردو پانچ روپیہ، قیمت سالانہ حصۂ عربی دو روپیہ، دونوں حصّوں کی قیمت چھ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- دفتر "الصدیق" بیرون بوہڑ دروازہ، ملتان شہر—

"الصدیق" کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس رسالہ میں کیا ہوگا اور اس کے کیا مقاصد ہیں؟ اس ماہنامہ کی اشاعت کا مقصد "ادب برائے ادب" نہیں بلکہ "ادب برائے دین" ہے! کتنا مُبارک مقصد اور کس قدر مستحسن کوششیں ہیں حُسنِ باطن کے ساتھ حسنِ ظاہر بھی موجود ہے، کاغذ سے لیکر کتابت و طباعت تک ہر چیز خوب ہوتی ہے۔

مضامین اور نظموں کے انتخاب میں سختی برتنے کی ضرورت ہے تاکہ معیار بلند سے بلند تر ہو جائے! ہم اس ماہنامہ کی زندگی کیلئے دُعاء کرتے ہیں کہ "الصدیق" دلوں میں "سوزِ صدّیق" پیدا کرتا رہے!

"العلم"

"العلم" (سہ ماہی) ایڈیٹر:- سید الطاف علی بریلوی ضخامت ۱۲۲ صفحے، کاغذ، کتابت اور طباعت نظر افروز، سالانہ چندہ چھ روپیہ، فی پرچہ ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ:— دفتر آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سندھ مدرسہ، کراچی!

ہندوستان کی "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کا نام کون نہیں جانتا مگر اس انقلاب کے بعد وہ سب باتیں خواب ہو کر رہ گئیں، بھارت کی اکثریت کو ہر اُس چیز سے بیر ہے جو اسلام یا مسلمانوں سے معنوی ہی نہیں نام کی نسبت بھی رکھتی ہے! "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے بہت سے کارکن پاکستان چلے آئے اور چلے کیا آئے انھیں آنا پڑا اپنے دیس کو خوشی سے کون چھوڑتا ہے! انھی حوصلہ مند اور علم دوست کارکنوں نے پاکستان میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کی بنا ڈال دی اسی کانفرنس کا سہ ماہی رسالہ "العلم" ہمارے سامنے ہے! جناب سید الطاف علی بریلوی کے نام اور کام کو علمی دُنیا جانتی اور پہچانتی ہے، نام و نمود کے ہنگاموں سے دور رہ کر اُنھوں نے علم کی خدمت کی ہے، خدمتِ علم کے ساتھ خدمتِ دین کا جذبہ بھی موجود ہے، "العلم" کی زمامِ ادارت سید الطاف علی بریلوی کو "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" نے سونپ کر اپنے حُسنِ انتخاب اور جوہر شناسی کا ثبوت دیا ہے!

"العلم" کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا ہے جو اپنے علمی مضامین کی سنجیدگی اور افادیت کے اعتبار سے قابلِ قدر اور لائق مطالعہ ہے، مضامین کے انتخاب اور ترتیب میں فاضل مُدیر کا علمی ذوق جھلکتا ہے! دینی مضامین کی کمی البتہ محسوس ہوتی ہے، یقین ہے کہ آئندہ اس طرف خاص توجہ کی جائے گی۔

صفحہ ۱۱ پر سید عبدالودود دردؔ بریلوی کی نظم کا ایک شعر ہے

ایک دفعہ سال میں جمہور، جمع ہوتے ہیں		ٹرکی وردس میں ہوتی ہے مسادات کی عید

"جمع" کو "دفا" اور "صدا" کے وزن پر دیکھ کر حیرت اس لئے اور زیادہ ہوئی کہ صاحبِ نظم کے نام کے ساتھ

"علامہ" اور "ابوالکلام" لکھا ہوا ہے!

تعزیت نمبر ماہنامہ "پرچم"

تعزیت نمبر ماہنامہ "پرچم" مُرتبہ:- مظہر صدیقی، نعمان تاثیر، حجم ۲۳۲ صفحے، متعدد تصویروں کے ساتھ، قیمت ڈیڑھ روپیہ، ملنے کا پتہ:-
مکتبہ "پرچم" حسن آفندی روڈ، کراچی۔

حکومتِ پاکستان کے وزیروں، ادیبوں، شاعروں اور اہلِ صحافت نے حضرت سیماب اکبرآبادی مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثرات پیش کئے ہیں، یہ "تعزیت نمبر" اُن کا مجموعہ ہے، اس میں تعزیتی جلسوں کی کارروائیاں بھی ہیں اور تقریروں اور اداریوں کے خلاصے بھی ہیں! بعض خطوط جن میں مرحوم کے پسماندگان کو پُرسا دیا گیا ہے نہ صرف یہ کہ اثرانگیز ہیں بلکہ ادبی اعتبار سے بھی بلند ہیں۔

مولانا سیماب مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دو تحریروں کے عکس بھی ہیں ایک تحریر مرنے سے چند دن پہلے کی ہے جو پڑھی نہیں جاتی! کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جن ہاتھوں نے لاکھوں صفحے لکھے، وہ چند سطریں لکھنے پر قادر نہ رہے! زندگی حباب اور خواب و افسانہ ہی تو ہے!

"تعزیت نمبر" اس کی دلیل ہے کہ سیماب مرحوم کے لئے کتنے بہت سے دلوں میں جگہ تھی اور ہے اور اُن کی موت کو کس قدر محسوس کیا گیا ——— ہائے! غافل انسان اس نہ رہنے والی زندگی کیلئے کیا کچھ کرتا ہے، پرچم کا تعزیت نمبر اگر ایک دل میں بھی خدا اور آخرت کا خوف پیدا کردے تو سمجھو وہ کامیاب ہے، مشاہیر کی موت دنیا والوں کے لئے اور زیادہ عبرت انگیز ہونی چاہیئے!

"بھائی جان"

ماہنامہ "بھائی جان" کا آزادی نمبر ——— ضخامت ۱۲۸ صفحے، اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ سالانہ چندہ چار روپے، ملنے کا پتہ:-
ماہنامہ "بھائی جان" برنس روڈ، کراچی ۱

"بھائی جان" بچوں کا پسندیدہ رسالہ ہے، جسے میر جمیل الرحمٰن اور شفیع عقیل صاحبان ترتیب دیتے ہیں، بی۔ اے بنجی اس کے آرٹ ایڈیٹر ہیں، اسی ماہنامہ کا "آزادی نمبر" پوری آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے، ہلکی پھلکی نظمیں اور دلچسپ مضامین ہیں، ہنسنے ہنسانے کے ساتھ کام کی باتیں بھی ہیں، ہمارا دل کہتا ہے کہ بچوں نے اس شمارہ کو مزے لیکر پڑھا ہوگا! لکھنے والوں نے بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر، مضامین لکھے ہیں!

"بھائی جان" کے ترتیب دینے والوں سے اُن کی اس کوشش پر مبارکباد دیتے ہوئے ہمیں اتنا کہنا ہے کہ بچوں میں دینی رُوح بیدار ہو اور اسلامی ذوق پیدا ہو اس کے لئے بھی انھیں اپنے پروگرام میں خاص طور پر گنجائش رکھنی چاہیئے، آجکل جو عام بے اخلاقی، مغرب زدگی اور بے دینی پھیلی ہوئی ہے اس کا توڑ ایک آدھ مضمون سے نہ ہوگا، اسلام شعر و ادب کے محاذ پر بھی اپنے شیدائیوں اور نام لیواؤں کو پُکار رہا ہے! ❊

فاران

ماہر القادری

جلد ۳ شمارہ ۸

ماہنامہ

فاران

نومبر ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر
ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقامِ اشاعت
دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ
کراچی ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل!

آج اکتوبر کی اٹھارہ تاریخ ہے، پاکستان کا دارالخلافہ سوگ میں ڈوبا ہوا ہے، چہرے افسردہ اور مضمحل ہی نہیں فکرمند بھی ہیں، آنکھیں بظاہر خشک ہیں مگر دل اندر اندر رو رہے ہیں، قصر و ایوان سے لیکر جھونپڑوں تک اداسی چھائی ہوئی ہے، موٹر نشینوں اور راہگیروں کو "غم" نے ایک ہی سطح پر لاکر کھڑا کردیا ہے۔

۱۶ر اکتوبر کی شام کتنی منحوس تھی اور وہ شخص کس قدر سفاک اور بے ضمیر تھا جس نے پاکستان کے محترم وزیر اعظم کے سینہ کو پستول کی گولیوں سے چھید ڈالا جناب لیاقت علی خاں مرحوم تیورا کر جلسہ گاہ کے شہ نشین پر گرے ——— "کلمۂ شہادت" اور "خدا پاکستان کی حفاظت کرے گا" بس یہ دو آوازیں آئیں اور پھر کوئی آواز نہ آئی، خاموشی اور ابدی خاموشی، نیند اور ہمیشہ کیلئے نیند! بس اب حشر کے دن ہی آنکھ کھلے گی!

جب تک تاریخ زندہ ہے قاتل کے اس شرمناک اور سفاکانہ فعل کی مذمت کی جائے گی اُس ظالم نے ایک دل کو چھید کر، لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے دل دو پارہ کردیئے، ہزار دو ہزار آدمی نہیں پوری قوم کی قوم سوگوار ہے، کون کسے پُرسا دے۔ سب کا ایک ہی جیسا حال سانحہ انتہائی المناک اور حادثہ شدید ترین غم انگیز ہے مگر صبر کرنا ہی پڑے گا، اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا ہے، مسلمان کا کام ماتم اور سینہ کوبی نہیں صبر و استقامت ہے، اپنی مرضی کو رضائے الٰہی کے تابع کردینا ہی مردِ مومن کی شان اور پہچان ہے۔

اس دُنیا میں مکر و فریب اور حیلہ سازیوں سے حقیقت کو چھپایا جاسکتا ہے، کتنے مجرم ہیں جو قانون کے احتساب سے بچے رہتے ہیں اور کتنی چوریاں ہیں جو آخر وقت تک نہیں کھلتیں، موجودہ بے دین سیاست "ڈپلومیسی" ہی کے سہارے چل رہی ہے مگر ایک دن آئے گا جب انصاف کی ترازو کھڑی کی جائے گی اور خالقِ کائنات کے دربار میں مخلوق کی پیشی ہوگی، اُس دن قاتل اور اس کے حمایتی، خان لیاقت علی خاں کے "خونِ ناحق" کی صفائی پیش نہ کرسکیں گے ——— اور کیا عجب ہے کہ قاتل کے حمایتی اور مددگار آخرت کی رُسوائی سے پہلے اسی دُنیا میں اپنی آنکھوں سے اپنی رسوائی دیکھ لیں ———

دیدی کہ خونِ ناحقِ پروانہ، شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

اس المناک حادثہ کے تیور بتا رہے ہیں کہ قاتل کے پستول کی جنبش کے پیچھے کوئی سازش کام کررہی تھی، ابھی واقعات پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آئے اس لئے ہم "قیاس" پر "سکوت" کو ترجیح دیتے ہیں مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے وزیر اعظم کا "خونِ ناحق" رائیگاں نہیں جاسکتا، پاکستان کے دشمن پاکستان کی رواداری کو اُس کی کمزوری سے تعبیر نہ کریں اہلِ پاکستان کے بازوئے شمشیر زن کو اگر مجبوراً حرکت میں آنا پڑا تو دنیا دیکھ لے گی کہ رواداری کے شبستاں میں عزم و شجاعت کے کتنے تند و بے باک شعلے چھپے ہوئے تھے، ہم نہ تو سازشوں کو جانتے ہیں اور نہ کسی حکومت کا بُرا چاہتے ہیں، ہمارا پیام امن و آشتی اور ہمارا مسلک حق و صداقت ہے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ سازش اور فریب کو عارضی نمود حاصل ہوجائے تو ہوجائے مگر آخرکار حق و صداقت ہی کو فتح نصیب ہوگی، ہماری تاریخ میں "صلح حدیبیہ" کے ساتھ بدر و خیبر کی رزم آرائیاں، فتح مکہ اور یرموک و قادسیہ کے تاریخ ساز معرکے بھی ہیں، ہم بڑے بول بولنے اور اپنی ماضی پر فخر کرنے کے عادی نہیں ہیں، مگر یہ باتیں اُس عالم میں ہماری زبان سے نکل رہی ہیں جبکہ سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہمارے کلیجے کے "قتل و خون" تک پہونچ چکی ہیں۔

یہ خونیں حادثہ اگر سیاسی اختلافات کا سبب ہے تو بھی ہر آئینہ لائقِ مذمت اور مستحقِ ملامت و بیزاری ہے، اس قسم کی ذہنیت افراد کی نہیں خود پاکستان کی قاتل ہے، وہ شخص جو پاکستان میں اصلاح و انقلاب قتل و خونریزی کے ذریعہ چاہتا ہے، پاکستان کا سب سے بڑا دشمن ہے، جہاں جہاں اس قسم کی ذہنیت پائی جاتی ہے، کھوج لگا کر اُسے کچل دینا چاہیے، یہ ایک غیر اسلامی تصور اور انتہائی ظالمانہ فعل ہے، جو کوئی اس قسم کی ذہنیت کی پشت پناہی کرتا ہے یا ان واقعات پر خوش ہوتا ہے اُس کے ایمان میں کھوٹ پیدا ہو چکی ہے!

اربابِ اقتدار کی پالیسی سے اختلاف اور اُن کی روش پر تنقید ہو سکتی ہے پوری نیک نیتی اور خلوص و صداقت کے ساتھ اصلاح اور تبدیلی کی سعی بھی کی جا سکتی ہے، مگر یہ سب کچھ آئینی حدود کے اندر رہ کر ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے، ہم نے خود "فاران" کے صفحات پر تنقید و احتساب کے اِس فرض کو انجام دیا ہے، ہماری تنقید بگاڑ کے لئے نہیں بناؤ کے لئے ہوتی ہے، سیاسی اختلافات کی بنا پر "قتلِ نفس" اور وہ بھی کسی کلمہ گو کا گناہِ عظیم ہے ہم اس قسم کے تصور کی پرچھائیں سے بھی اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

جھلکیاں

نوابزادہ لیاقت علی خاں مرحوم ایک امیر اور معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، امارت و خوشحالی کی فضا میں پرورش پانے کے باوجود انھوں نے مروجہ تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں، وہ اس منزل تک جا پہونچے جہاں تعلیم و تدریس کی حد ختم ہو جاتی ہے، مرحوم کی قومی اور سیاسی زندگی کا آغاز صوبہ متحدہ (U. P.) کی لیجسلیٹو کونسل کی رُکنیت سے ہوا، مسلم لیگ میں شامل ہو کر اُن کی صلاحیتوں اور توانائیوں کو بروئے کار آنے کے مواقع میسر آئے، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش میں وہ قائدِ اعظم کے دوش بدوش نظر آتے تھے، قائدِ اعظم سے اُن کی عقیدت اور وابستگی اختلاف و تنقید سے یکسر نا آشنا تھی، قیادت کے بارے میں اُن کا مسلک "سمعنا و اطعنا" تھا اور قائدِ اعظم کے وہ غالباً سب سے زیادہ معتمد علیہ رفیق کار تھے مسلم لیگ کا پیام لیکر وہ ہندوستان کے ایک ایک گوشہ میں پھرے، پاکستان کی جدو جہد کے لئے انھوں نے دن رات ایک کر دیئے، اور اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ ہندوستان بٹ گیا، پاکستان وجود میں آگیا، جس کی وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان اُنھی کو سونپا گیا، قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد اور زیادہ بھاری اور نازک تر ذمہ داریاں اُن کے کاندھوں پر آن پڑیں اور اُن کی شخصیت پاکستان کی داخلی اور خارجی سیاست کا محور بن گئی!

نوزائیدہ حکومت، نازک حالات، دشمنوں کی ریشہ دوانیاں ——— اُلجھنوں نزاکتوں اور ذمہ داریوں کے طوفان اُٹھ کھڑے ہوئے، لیاقت علی خاں مرحوم کو دہلی، لندن اور واشنگٹن کے بھی سفر کرنے پڑے، بڑے بڑے سیاستدانوں چوٹی کے لیڈروں اور صفِ اوّل کے اربابِ حل و عقد سے گفت و شنید اور تبادلۂ خیالات کی معرکہ آرائیاں رہیں ——— کشمیر کے مسئلہ نے حالات کو اس حد تک پہونچا دیا کہ بھارت اور پاکستان کی فوجیں سرحدوں پر پہونچ گئیں صورتِ حال کی یہی نزاکت اُنھیں راولپنڈی لے گئی یہاں تک کہ ۱۶ اکتوبر کی شام کو جبکہ دھوپ چھاؤں ایک دوسرے سے گلے مل رہی تھیں، وہ جامِ شہادت پی کر ہمیشہ کے لئے آسودۂ خواب ہو گئے، ہم انسانوں کے لئے یہ حادثہ یقیناً غیر متوقع ہے مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس "نفس" کے لئے جو وقت مقرر کر دیا گیا ہے، وہ ایک لحظہ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ خدا کے فیصلے ہماری تمناؤں اور آرزوؤں سے بلند ہیں، ادبی زبان میں ہم جن انسانوں کو "تاریخ ساز" کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حقیقت میں وہ خود تقدیرِ الٰہی کے تابع ہیں۔

پاکستان کے شہید وزیر اعظم پارلیمانی انداز کے مُفکر تھے، اُن کی انگریزی تقریر میں یہ خصوصیت جھلکتی تھی، متضاد عناصر اور مختلف مزاج کے آدمیوں کو ملانا اور اُن سے کام لینا وہ جانتے تھے، اُن کی شخصیت اندرونی اختلافات کو اُبھرنے نہ دیتی، محنت اور کثرتِ کار سے وہ اُکتاتے نہ تھے، راتوں کو جاگ کر اور بے خواب رہ کر دفتری فرائض انجام دیتے، اُن کا ایک وصف سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھا، بڑے سے بڑے حادثہ کے وقت بھی اُن کی فہم و فراست، اور ہوش و حواس مجتمع رہتے، گھبرانا اور پریشان ہونا وہ جانتے ہی نہ تھے، اگر اُن کو یہ اطلاع ملتی کہ پانی کا طوفان اُن کی کوٹھی کی دیواروں کے قریب آگیا تو وہ ایسے عالم میں بھی گھبرانے اور بدحواس ہونے کی بجائے طوفان کے روکنے کی تدبیر کرتے ——— پھر بھی وہ انسان تھے فرشتہ نہ تھے اور انسان میں کمزوریاں بھی ہوا کرتی ہیں مگر اب موقعہ تنقید کا نہیں تحسین کا ہے! مرنے والوں کا بھلائی کے ساتھ ہی ذکر کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

ہونا کیا چاہیئے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام کا نعرہ تھا جس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں میں مقبول اور ہر دلعزیز بنا دیا، لیاقت علی خاں مرحوم نے اپنی تقریروں میں "اسلام" کے نعرے کو بار بار دہرایا، پھر کانگریس اور مسلم لیگ کی ملی جُلی حکومت (INTERIM GOVERNMENT) جب قائم ہوئی اور مرحوم نے وزیر مالیات کی حیثیت سے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں بجٹ پیش کیا تو اللہ کے نام سے اُس کا آغاز کیا، اور جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے قرآنی تعلیمات کا بھی حوالہ دیا تھا، پاکستان بننے کے بعد وہ قریب قریب ہر تقریر میں "اسلام" کا بار بار نام لیتے تھے، اور "قراردادِ مقاصد" کی منظوری تو اُن کی وزارتِ عظمٰی کا سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہے، افسوس ہے کہ اندرونی اور داخلی مسائل کی گوناگوں اُلجھنوں اور کچھ ساتھیوں کی سست روی کے سبب "قراردادِ مقاصد" کو عملی طور پر تشکیل دینے کا اُن کو موقعہ نہ مل سکا۔

اللہ اور رسُولؐ، کتاب و سنت اور اسلام کے ساتھ اُن کی تقریروں میں تواتر اور تسلسل اور ربط ملتا ہے، پس اُن کے جانشینوں، رفیقوں اور عقیدت مندوں کا فرض ہے کہ جس کام کو مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں اُسے جلد سے جلد تکمیل اور اتمام کو پہونچا دیں جس دن پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہوگا اُس دن آسمان کے فرشتے شہید مرحوم لیاقت علی خاں کی رُوح کو بشارت اور مبارک باد دیں گے، اس کام میں جتنی ڈھیل اور جتنی تاخیر ہوگی اُسی قدر اُن کی رُوح انتظار کی شدت محسوس کرے گی۔

حکومتِ پاکستان کی مشین اور کل پُرزوں کو اسلام کی رہنمائی میں پُوری قوت کے ساتھ حرکت میں آنے کی ضرورت ہے، پاکستان صرف اسی غرض کے لئے بنا تھا اور وجود میں آیا تھا، پروانشلزم کا فتنہ جو دفتری نظم و نسق اور منصب داری کی دنیا میں اُبھر رہا ہے اور جس کے بارے میں بڑی تشویش ناک باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں اس کا توڑ صرف "اسلامی اخوت" کے عقیدہ سے ہوسکتا ہے، "قراردادِ مقاصد" میں اسلامی ماحول کے لئے حالات کو سازگار بنانے کا وعدہ کیا گیا تھا ضرورت ہے کہ عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ اختلاط کو سختی کے ساتھ چیک کیا جائے، کھیل تماشوں، ڈراموں، تھیٹروں، رقص و سرود کی محفلوں اور مقابلوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی بجائے اُن پر احتساب قائم کیا جائے، شراب خانے، گھوڑ دوڑ کی قمار بازی اور کلب گھروں کی فاسقانہ تفریحیں اسلامی مملکت کو ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتیں، پاکستان کی اصل طاقت "اسلام" ہے اسی بنیاد پر یہ مملکت وجود میں آئی ہے، پاکستان کے سچے وفادار، مخلص خدمت گزار اور قابلِ اعتماد کارکن وہی افراد ہیں جن کی کوششیں اور سرگرمیاں نیکی، اخلاق اور اسلامی تصورات کے ساتھ ربط اور مطابقت رکھتی ہیں، وقت نازک تر

آرہا ہے، اس المناک سانحہ کے بعد ذمہ داریاں اور زیادہ شدید ہوگئی ہیں بس ضرورت ہے کہ سب لوگ مل جل کر اللہ کے دین کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ ——— عزت مآب خواجہ ناظم الدین کے بارے میں صوم و صلوٰۃ کی پابندی اور تہجد گزاری کی اچھی خبریں ہم تک پہونچی ہیں، اُن سے ہم نیک توقعات رکھتے ہیں، گورنر جنرلی کے دور میں اُنکی پوزیشن رسمی طور پر سب سے بالا اور بلند تھی مگر نظم ونسق کی دُنیا میں اُتنی زیادہ اثر انداز اور با اختیار نہ تھی جو اس وقت ہے، اب وہ پاکستان کے وزیر اعظم ہیں، حکومت کی پالیسی اور اختیار واقتدار کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں ہے، ہم اُن کی تسبیح و تہلیل، نماز روزے اور تہجد گزاری کے اثرات اُنکی نئی ذمہ داری میں دیکھنا چاہتے ہیں؛

ہمیں یقین ہے کہ محترم خواجہ ناظم الدین صاحب اُس قسم کے "مذہبی" لوگوں سے بلند ہیں جو سمجھتے ہیں کہ نماز، روزہ، اور زکوٰۃ و حج کے بعد دین کی ذمہ داریاں پوری ہوجاتی ہیں، یہ وہ شکست خوردہ عافیت پسند اور تنگ محدود ذہنیت ہے جو اسلام کو دُنیا میں مغلوب ہی رکھے گی، "غالب" نہ ہونے دیگی، خدا کے آخری نبیؐ، انسانیت کے سب سے بڑے محسن سیدنا محمد رسول اللہ صلعم سے زیادہ متقی پرہیزگار اور اللہ کا عبادت گزار کون ہوسکتا ہے، حضورؐ نے نمازیوں، روزہ داروں، حاجیوں، زکوٰۃ دینے والوں اور جہاد کرنیوالوں کی کثرت کو دیکھ کر یہ نہیں سمجھ لیا کہ دین کا فریضہ پورا ہوگیا، حضورؐ نے عرب میں اسلامی اسٹیٹ قایم کی جہاں صرف اللہ کا قانون چلتا تھا، قبائلی رسم ورواج اور عربوں کا فرانہ قانون اور جاہلانہ دستور کے علی الرغم اللہ کے قانون کو نافذ فرمایا گیا، تمام سیادتیں، قیادتیں، فرمانروائیاں اور شخصیت پرستیاں ختم کردی گئیں صرف اللہ کے قانون کی حکومت! ——— ہمیں پاکستان میں اسی "اسوۂ حسنہ" کو دلیل راہ بنانا ہے۔!

اپنے نئے وزیر اعظم کی مشکلات کو ہم جانتے ہیں "نظام حق" کے قیام میں اُنکو طرح طرح کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑیگا، اُنکو ایسے مشورے بھی دئیے جائینگے کہ دُنیا بہت ترقی کرچکی ہے اس متمدن دنیا میں اسلامی قوانین نہیں چل سکتے۔ اُن کو لوگ ڈرائیں گے کہ پاکستان کے اقتصادی نقصانات سے کہ شراب اور دوسرے مسکرات کی بندش کے بعد کروڑوں کی آمدنی کا خسارہ کسطرح پورا کیا جائے گا —— اُن سے ہمدردانہ لہجہ میں کہا جائے گا کہ حضور والا! پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے تو یہ معنی ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور ان ملّاؤں اور مولویوں کے ہاتھ میں آجائے اسطرح آپ اپنی پوزیشن اور اقتدار کے بارے میں بھی اچھی طرح سوچ لیجئے۔ ——— اور جناب والا! اسلام دوسروں کے یہاں کی اچھی چیزیں لینے سے روکتا کب ہے، "حکمت" تو مسلمان کی کھوئی ہوئی پونجی ہے، جہاں بھی ملے اُسے حاصل کرلینا چاہئیے، اس مشورہ کا مقصد یہ ہوگا کہ پاکستان میں کفر اور اسلام، جاہلیت اور دین حق کا ایک مُرکّب تیار کیا جائے ——— اور کیا عجب ہے کہ کچھ ایسے مولوی اور علما بھی مل جائیں جو یہ مشورہ دیں کہ مسجدوں کی تنظیم فرمادی جائے، اماموں کی تنخواہ مقرر کردی جائے، ریاست حیدرآباد دکن کی طرح امور مذہبی کا ایک محکمہ بنادیا جائے، اوقاف، مساجد خانقاہوں، درگاہوں اور متبرک مقاموں کی نگرانی ہوتی رہے، طلاق و نکاح کے مقدمات کے انفصال کیلئے ایک عدالت کا قیام عمل میں آجائے، یہ ہوگیا تو سمجھو کہ پاکستان اسلامی ریاست بن گئی، ہمارے یہاں بادشاہ اور حکمران بھی تو ہوئے ہیں وہ مسلمان تھے کافر نہ تھے اُن کے دلوں کو ہم اسلامی درد سے خالی کس طرح سمجھ لیں جبکہ وہ نماز بھی پڑھتے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے، اُن کے یہاں سے خانقاہوں و عربی مدرسوں کی مالی اور سرپرستی بھی ہوتی تھی اُنکی حکومتوں میں "خلافت راشدہ" کا نظام آخر کب رائج تھا، اور تمام علما اور صلحا انھی حکومتوں کے زیر سایہ تقویٰ کی زندگی بسر کرتے تھے ——— ہمارے نئے وزیر اعظم کو اس قسم کے مشوروں، رکاوٹوں اور مزاحمتوں سے قدم قدم پر سابقہ پڑے گا، اس اندھیرے میں اُن کے لئے محمد رسول اللہ کا اُسوہ حسنہ ہی چراغ ہدایت بن سکتا ہے، یہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پایا تو ہر مشکل پر قابو پایا جاسکتا ہے اور ہر رکاوٹ دور ہوسکتی ہے

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الٰہ الا اللہ

لیاقت علی خاں مرحوم کی زندگی کو جس سانحہ سے دوچار ہونا پڑا، اُس میں عبرتیں ہیں اہل ایمان اور ارباب ہوش و خرد کیلئے!

(باقی مضمون صفحہ ۹ پر)

ادارہ

مدیرِ "فاران" کے نام!

ماہ اکتوبر (فاران) کے اداریہ (نقشِ اوّل) کے سلسلہ میں مدیر "فاران" کے نام گجرات سے ایک خط موصول ہوا ہے، جو بلفظہ درجِ ذیل کیا جاتا ہے:—

گجرات —— ۱۲-اکتوبر ۱۹۵۱ء

مکرمی! السلام علیکم —— ۹/اکتوبر ۱۹۵۱ء کے سہ روزہ "کوثر" لاہور میں رسالہ "فاران" سے لیا ہوا ایک مضمون چھپا ہے جس میں جماعتِ اسلامی سے اختلاف کرنے والی جماعتوں کے ذکر میں رسالہ طلوعِ اسلام کراچی کے موقف کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:— "جماعتِ اسلامی کی مخالفت میں رسالہ طلوعِ اسلام بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے بلکہ اس "کارِ خیر" (؟) میں سب سے دو قدم آگے ہی ہے اس کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی "کتاب و سنت" کی بنیاد پر اسلامی دستور کی تسوید و تشکیل اور اس کا نفاذ چاہتی ہے اور طلوعِ اسلام کو اس دنیا میں سب سے زیادہ دشمنی سنتِ رسول اللہ سے ہے" راقم الحروف کی رائے میں طلوعِ اسلام کو سنتِ رسول اللہ کا دشمن سمجھنا غلط ہے، البتہ "طلوعِ اسلام" اس بات کے خلاف ہے کہ ہر حدیث کو جو کسی مجموعہ احادیث میں پائی جاتی ہو، صحیح مانا جائے خواہ وہ لفظاً یا معناً قرآن مجید کی تعلیم کے خلاف ہی ہو، اگر طلوعِ اسلام سنتِ رسول کا دشمن ہوتا تو ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے "معراجِ انسانیت" نامی کتاب شائع نہ ہوتی جو رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر لکھی گئی ہے —— طلوعِ اسلام کی رائے میں سنتِ رسول اللہ قرآن مجید میں محفوظ ہے اور اس سنت سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے قرآنِ مجید سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ والسلام! محمد حسین

یہ ایک سنجیدہ مکتوب ہے، اس خط کی اسپرٹ زبانِ حال سے بول رہی ہے کہ مکتوب نگار میں قبولِ حق کی صلاحیت موجود ہے، "سنن و احادیث" کے بارے میں صاحبِ مکتوب ایک خاص نظریہ سے متاثر تو ضرور ہو چکے ہیں مگر طبیعت میں کد، ضد اور شدت ابھی تک پیدا نہیں ہوئی، اگر حق پوری طرح اُن پر واضح ہو گیا تو اُمید ہے کہ وہ اپنی رائے بدل دیں گے —— دلوں کا حال اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے، یہ تو صرف ہمارا قیاس ہے خدا کرے کہ ہمارا قیاس صحیح ثابت ہو!

فاضل مکتوب نگار کی طرح بعض دوسرے حضرات بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مولانا اسلم جیراج پوری جناب پرویز اور ادارۂ طلوعِ اسلام کے اربابِ حل و عقد "سنتِ رسول اللہ" کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ اُن احادیث کے مخالف ہیں جو لفظاً و معناً قرآنِ مجید کی تعلیم کے خلاف ہوں یا وضعی، مشتبہ اور بہت کمزور ہوں —— اگر ان حضرات کی صرف یہی رائے ہوتی تو اس رائے پر وہ قابلِ مبارکباد تھے کہ اُنھوں نے وہی بات کہی

ہے جو محدثین، فقہا اور تمام راسخون فی العلم کہتے آئے ہیں!

حدیث کے جانچنے اور پرکھنے کی پہلی اور بنیادی شرط یہی ہے کہ وہ قرآنی تعلیم کی مخالف نہ ہو، حدیث قرآن کی مفسر اور شارح ہے اور شرح وتفسیر کو "متن" کا اصولی طور پر معارض، مخالف اور حریف نہ ہونا چاہیئے! احادیث کے جتنے مجموعے آج دنیا میں پائے جاتے ہیں اُن کے ایک ایک لفظ کو قرآن کی طرح مستند، معتبر اور قابلِ حجت کوئی مسلمان بھی نہیں سمجھتا، اور اگر کوئی سمجھتا ہے تو وہ نادان نہ کتاب اللہ سے واقف ہے اور نہ سنتِ رسول کی اُسے خبر ہے!

وہ محدثین جن کو یہ "مخالفینِ حدیث" طرح طرح سے مطعون اور بدنام کرتے ہیں اور جن کا مشن ہی یہ ہے کہ کسی نہ کسی عنوان سے محدثین کی ثقاہت مجروح ہو جائے، اُن (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی دیانت، احتیاط اور تفقہ فی الدین کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے یہ نہیں کیا کہ جس کسی کی زبان سے "قال قال رسول اللہ" سنا اور سرِ اطاعت خم کر دیا، ان بزرگوں نے راویوں کی شخصیتوں کو پرکھا ہے، جانچا ہے، اُن کے پاس روایت کا معیار ہی نہیں درایت کی کسوٹی بھی رہی ہے، کسی راوی میں کوئی عیب نظر آیا ہے تو اُسے بغیر کسی جھجک کے صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ جعلی اور وضعی احادیث چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دی گئی ہیں اور اس موضوع پر محدثینِ کرام کی کتابیں موجود ہیں۔

اسناد اور رواۃ کے اعتبار سے احادیث کی درجاتی تقسیم کہ یہ صحیح ہے، یہ حسن ہے، یہ غریب ہے، یہ ضعیف ہے، یہ مشہور ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خود اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ محدثین نے آیاتِ قرآنی اور احادیث کو ایک جیسا نہیں سمجھا اور احادیث کی صحت اور ثقاہت کے سلسلہ میں یہ تمام کوششیں اسی لئے کی گئی ہیں کہ احادیث قرآنی منشاء اور مزاجِ نبوت کے ساتھ مربوط رہیں۔

حدیث کی کتابوں اور مجموعوں میں بھی درجے ہیں، ایک کو دوسرے پر ترجیح ہے، صحاح ستہ، سنن اور مسانید ایک درجہ میں نہیں رکھے جا سکتے، کنز العمال اور موطا امام مالک میں جو درجاتی امتیاز ہے وہ اہلِ علم پر پوشیدہ نہیں ہے ـــــ فنِ حدیث اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ دنیا میں کسی انسان کے اقوال کو پرکھنے، جانچنے اور پھر اُسے محفوظ رکھنے کی اس سے زیادہ کوشش تاریخ کے کسی دور میں نہیں کی گئی اور یہ تمام کوششیں قرآنی تعلیم کے محور کے اردگرد ہی گھومتی ہیں!

"طلوعِ اسلام" والے صرف یہ نہیں کہتے کہ قرآنی تعلیم کی مخالف حدیثوں کو ہم نہیں مانتے اور کمزور حدیثیں ہمارے نزدیک قابلِ تسلیم نہیں ہیں بلکہ اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ "سنتِ رسول" دینی حجت بن ہی نہیں سکتی، احادیث کے مجموعوں کو وہ زیادہ سے زیادہ "دینی تاریخ" کا درجہ دیتے ہیں اور یہ بھی انتہائی وسعتِ قلب اور اُن کا بڑا کرم ہے ورنہ وہ کچھ اور کہہ دیتے تو اُنکی زبان کو کون پکڑ سکتا تھا۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ خود محدثین نے احادیث اور راویوں پر جرح وتنقید کی ہے، حدیثوں کی "علتوں" اور کمزوریوں کو کھول کھول کر بتایا ہے مگر جنھوں نے حدیثوں کو اس قدر عرق ریزی اور ژرف نگاہی کے ساتھ پرکھا ہے اُنھوں نے صحیح احادیث کی بھی نشان دہی کی ہے، اور کوئی انسان جس کو قدرت نے رمق برابر عقل بھی عطا کی ہے کیا اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ تمام کی تمام احادیث قرآنی تعلیم کی مخالف ہیں؟ کیا خاک بدہن گستاخ محدثین کا گروہ "مخالفینِ قرآن" کا گروہ تھا! اگر کوئی یہی سمجھتا ہے تو ایسے بے عقل کو ہم سزاوارِ خطاب ہی نہیں سمجھتے اور ہم افہام و تفہیم میں اپنے عجز کا اقرار کرتے ہیں۔

ہم دریافت کرتے ہیں کہ جو احادیث درایت وروایت کے اعتبار سے صحیح ہیں اور جو قرآنی تعلیم کی مخالف نہیں ہیں

—— آخر اُن کا دین میں کیا درجہ ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوالِ صحیح کو کیا ہم صرف حضور کی ذاتی رائے اور شخصی مشورت کہہ کر اور سمجھ کر گزر جائیں! کیا یہ " دینی تاریخ " اسی قابل ہے کہ سکندر، پورس، کیکاؤس، نوشیرواں، بخوا منیت، قسطنطنین، آگسٹس، محمود غزنوی اور بابر و ہمایوں کی " تاریخوں " کی طرح صرف پڑھ لی جائے، اُس میں ہمارے لئے نہ کوئی ہدایت ہے اور نہ بصیرت ہے ؟ کیا رسول اللہ تاریخ کے دوسرے " ہیروز " (HEROES) کی طرح صرف ایک " ہیرو " تھے ؟

اور یہ جو " دینی تاریخوں " میں جگہ جگہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ فلاں مسئلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے رسول اللہ کی فلاں حدیث کو حجت بنایا، اُس قضیہ میں حضرت عمر فاروقؓ کو جب حدیثِ رسول مل گئی تو اپنی رائے کو بدل دیا، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دینی مسائل میں قرآن کے بعد رسول اللہ کی احادیث کو حجت سمجھتے تھے —— کیا یہ تمام باتیں لوگوں نے اپنے جی سے گھڑلی ہیں، کیا تاریخ کی یہ بر حقیقت زری تہمت و افترا ہے ؟ اور اگر اس میں صحت ہے تو خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہؓ " مخالفینِ حدیث " کے نظریہ کے مطابق اُن باتوں پر عمل کرتے رہے جو قرآن کے مخالف تھیں اور یہ راز سب سے پہلے " طلوعِ اسلام " والوں کے دلوں پر منکشف ہوا کہ " سنتِ رسول " قرآن سے باہر اور کہیں ہے ہی نہیں! اور جسے " سنتِ رسولؐ " بتایا جاتا ہے وہ " مخالفِ قرآن " ہے، اگر اس نظریہ کو صحیح مان لیا جائے تو صحابہ تو صحابہ خود رسول اللہ کی ذاتِ گرامی کو قرآنی تعلیم کا حریف اور مخالف ماننا پڑے گا (معاذ اللہ . . . ہزار بار . . . خدا کی پناہ . .) اس لئے کہ " دینی تاریخ " سے تواتر کے ساتھ ثابت ہے کہ حضور ہر مسئلہ اور ہر قضیہ کے جواب میں قرآنِ پاک کی آیتہ ہی تلاوت نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ کرنے اور نہ کرنے کا خود بھی حکم دیتے تھے!

صاحبِ مکتوب نے لکھا ہے کہ " طلوعِ اسلام کی رائے میں سنتِ رسول اللہ قرآنِ مجید میں محفوظ ہے اور سُنت سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ہمیں قرآنِ مجید سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے . . . . . " ہم جیسے موٹی عقل والے نیاز مند عرض کرتے ہیں کہ " طلوعِ اسلام " کی یہ رائے کیا " وحی " کا درجہ رکھتی ہے کہ اُسے کسی چون و چرا کے بغیر مان لیا جائے، کیا مکتوب نگار کے خیال میں " طلوعِ اسلام " کے صفحات پر جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ پتھر کی لکیر اور نوشتۂ تقدیر ہوتا ہے کہ جو ارقام فرمایا گیا بس وہی " آخری حجت " ہے اُس پر جرح و تنقید ہی نہیں ہو سکتی!

اگر " سنتِ رسولؐ " پوری کی پوری قرآن میں محفوظ ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ قرآن پاک میں جو " قیامِ صلوٰۃ " کا بار بار حکم آیا ہے، اس حکم کی کس نہج اور کس ترتیب سے تعمیل کی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کس طرح شروع اور ختم فرماتے تھے، قیام، قعدہ اور رکوع و سجدہ میں حضور کیا پڑھتے تھے ؟ ہم قرآن سے اس کا جواب چاہتے ہیں، اگر قرآن میں یہ تفصیل ہے تو ہمیں اس سے مطلع کیا جائے اور نہیں ہے تو نماز کی ترتیب کیلئے رہنمائی حاصل کرنے کے لئے آخر ہم کہاں جائیں ؟ ہم یہ بھی پوچھنا چاہتے ہیں کہ احادیث کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز ادا کرنے کی جو تفصیل ملتی ہے کیا وہ مخالفِ قرآن ہے ؟ اسی طرح دوسرے قرآنی احکام کی عملی تشریح جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل میں پائی جاتی ہے کیا " طلوعِ اسلام " کے فتوی کی بنا پر اُسے مخالفِ قرآن سمجھ لیں ؟

نہ جانے مکتوب نگار " صلوٰۃ " کو کیا سمجھتے ہیں مگر جن کے خیالات سے وہ متاثر ہیں اُن (پرویز صاحب)

کی تو یہ رائے ہے کہ مسلمانوں نے "صلوٰۃ" کے نظامِ جامع کو "نماز" سے بدل دیا، ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ کی احادیث، حضورؐ کا اسوہ اور آپؐ کا طرزِ عمل ہی معتبر اور لائقِ حجت نہ رہا تو پھر قرآن کے ہر حکم اور ہر آیت کی من مانی تاویل اور تفسیر کی جاسکتی ہے اور کی جارہی ہے!

قرآن کی حمایت اور اشاعت کے نام پر احادیثِ رسولؐ کی مخالفت کا جو فتنہ اُٹھایا گیا ہے اُس کی غرض ہی یہ ہے کہ قرآنی احکام اور دینی مسائل کی ماڈرن انداز میں تفسیر پیش کی جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اُسے "قرآن سے باہر" کہہ کر یکسر رد کر دیا جائے، جب رسول اللہ کی "سنت" کا واسطہ ہی درمیان میں نہ رہا اور یہ معیار ہی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو پھر قرآن کی تفسیر، تعبیر، تاویل اور تشریح کا جو حشر ہوگا اور جو ہو رہا ہے اُسے "طلوعِ اسلام" اور "معارفِ قرآن" کے صفحات پر ہم دیکھ رہے ہیں —— ابھی تو خیر سے [illegible] کی "زبانی" کے خلاف جہاد (؟) شروع ہوا ہے مگر جیسے جیسے یہ جنون بڑھتا جائے گا، احکامِ دین کے دامنوں کی دھجیوں میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔

اور یہ جو فرمایا گیا ہے کہ "اگر طلوعِ اسلام" سنت رسولؐ اللہ کا دشمن ہوتا تو ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے "معراجِ انسانیت" نامی کتاب شائع نہ ہوتی جو رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ پر لکھی گئی ہے" —— اس کے جواب میں عرض ہے کہ کوئی شخص قرآن کو تو نہ مانے بلکہ اُس کی طرح طرح سے تضحیک کرے، اُس کا مشن ہی یہ ہو کہ قرآنِ پاک لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا میں ایک کتاب تصنیف کر دے، کیا ایسے منافق داستاں سرا کی یہ کتاب اُس کے نفاق کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے، اللہ کی تعریف اور اُس کی کتاب کی تنقیص یہ نفاق نہیں تو اور کیا ہے —— پس وہ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دین میں حجت نہیں مانتے اور حضورؐ کی احادیث کی تنقیص کرتے ہیں مگر حضورؐ کی نعت و منقبت میں کتابیں لکھ دیتے ہیں، ایسے لوگ "منافقین" کے زمرے میں آتے ہیں! جو بد نصیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو دین میں حجت نہیں سمجھتا وہ درحقیقت منصبِ نبوت کا منکر ہے اور ایسے شخص کی نعت خوانیاں اور منقبت سرائیاں اللہ اور رسول کے نزدیک پانی کے بلبلوں اور ریت کے ذروں کی برابر بھی وقعت نہیں رکھتیں!

(بقیہ نقشِ اوّل) پستول کی گولی تلوار کی دھار، نیزے کی انی، پانی کی موج، آگ کی لپٹ، وبائے عام، یا کوئی حادثہ اور دوسرا مرض یا سبب ہو بہر حال موت یقینی چیز ہے کوئی "جان" اس صدمہ سے بچ نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ کے یہاں دنیا کی شہرتیں اور ناموریاں جاتی ہیں نہ زر، نہ مال، نہ جاہ و حشم، نہ منصب اور اقتدار وہاں کام دیتے ہیں صرف اعمال کی وہاں پوچھ ہے، اللہ کے انصاف کی ترازو میں عہدے، شہرتیں، دنیوی عزتیں اور مال و دولت نہیں اعمال "تلتے" ہیں جو دل آخرت کے محاسبہ سے غافل ہیں افسوس ہے اُن کی بد توفیقی اور حرماں نصیبی پر!

لیاقت علیخاں مرحوم و مغفور کے جنازہ اور دفن کفن میں شریک ہونے والے اور اُنکی روح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے والے اپنے نفس کا محاسبہ کریں کہ اس المناک سانحہ سے اُنھوں نے کسقدر عبرت حاصل کی، کس برائی کو چھوڑا، اور کس بھلائی کو اختیار کیا، خدا کے خوف، موت کی یاد اور آخرت کے ڈر سے اُنکی زندگی میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی، اگر ہوئی تو وہ قابلِ مبارکباد اور اگر اُنکی غفلتوں کا وہی عالم ہے تو پھر اُنھوں نے شہیدِ ملت کا "جنازہ نہیں ایک فلم" دیکھا تھا، اور لیاقت علیخاں کی قربانی کیلئے مقامِ عبرت نہیں بلکہ ایک تماشا گاہ ہے! ماہر القادری

از ضیاء احمد بدایونی

کیا اقبالؔ تصوّف کے مُخالِف تھے؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اقبالؔ تصوّف کے مخالف تھے۔ عوام ہی نہیں۔ بعض خواص کی زبان سے بھی یہ جملہ سنا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ تصوف کے اُن غلط نظریات اور اشغال کے خلاف تھے جو صدیوں سے اُمت اسلامیہ میں رائج ہو گئے ہیں۔ جب ۱۹۱۵ء میں[۱] اُن کی مشہور مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی تو اُس میں حافظ شیرازی کے بارے میں یہ اشعار پڑھ کر اکثر حلقوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار	جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیز او	مے علاج ہول رستاخیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او	از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں خراب از بادۂ گلگوں شود	مایہ دار حشمت قاروں شود
مفتیٔ اقلیم او مینا بدوش	محتسب ممنونِ پیرِ مے فروش

آں فقیہِ ملّت مے خوارگاں	آں امام اُمت بے چارگاں
گوسفندست و نوا آموختست	عشوہ و ناز و ادا آموختست

اِس کے بعد بتایا ہے کہ وہ (حافظ) "بُزِ یوناں زمیں" (افلاطون) سے زیادہ زیرک ہیں کہ انھوں نے ضعف کو توانائی کا لباس پہنا کر پیش کیا ہے۔ اُن کا نغمۂ چنگ دلیل انحطاط ہے اور اُن کا ہاتف جبرئیلِ انحطاط۔ اُن کا جام مریدانِ حسن بن صبّاح کی طرح حشیش سے

---

[۱] یہ وہی ایڈیشن ہے جو حقایقِ حیات فردیہ، کے عنوان سے سر سید علی امام مرحوم کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ انتساب اس طرح کیا ہے:-

اے امام اے سید والا نسب ❖ دودمانت فخر اشراف عرب	سلطنت را دیدہ افروز آمدی ❖ عقل کل را حکمت آموز آمدی
آشنائے معنی بے گانۂ ❖ جلوۂ شمع مرا پروانۂ	مرغ فکر گلستاں ہا دیدہ است ❖ از ریاض زندگی گل چیدہ است
ایں گل از تار رگ جاں بستہ ام ❖ تازہ تر در دست تو گلدستہ ام	ملت از جسم است شاہ چشم اوست ❖ جسم را از چشم بینا آبرو دست
چشم از نور محبت روشنم ❖ اشکبار از درد اعضائے تنم	نذر اشک بیقرار از من پذیر ❖ گریۂ بے اختیار از من پذیر

[۲] اسی بنا پر عالمگیر نے دیوان حافظ کے پڑھنے پڑھانے کی ممانعت کر دی تھی۔ شیر خاں لودی مصنف مرآۃ الخیال لکھتا ہے:—

"حضرت عالمگیر شاہ در اوائل ایام سلطنت حکم کردہ بود کہ دیوان خواجہ حافظ شیرازی را مردم از کتاب خانہ ہائے خود برآرند و معلمان ممالک محروسہ بہ صبیان تعلیم نہ نمایند"

لبریز ہو - وہ ایک خیالی جنت کی تصویر دکھا کر دنیا کو عدم کا شیدا بنا دیتے ہیں - وہ ایسے نادک انداز ہیں جو موت کو دل کش بنا کر پیش کرتے ہیں - یا مارِ گلزار کہ شکار کو سُلا کر ہلاک کر دیتی ہیں - آخر میں حافظ اور عرفی کا موازنہ کر کے عرفی کو ترجیح دی ہو -

حافظ جادو بیاں شیرازی است　　　عرفی آتش زباں شیرازی است

ایں سوئے ملکِ خودی مرکب جہاند　　　آں کنار آب رکنا باد ماند

ایں قتیل ہمت مردانۂ　　　آں ز رمز زندگی بیگانۂ

بادہ زن با عرفیؔ ہنگامہ خیز　　　زندۂ ؟ از صحبت حافظ گریز

محفل او در خور ابرار نیست　　　ساغر او قابل احرار نیست

بے نیاز از محفل حافظ گذر　　　الحذر از گوسفنداں الحذر

جب اسرار خودی شائع ہوئی تو اقبال کے خلاف مخالفت کا ایک طوفان[1] اٹھ کھڑا ہوا جس پر اُن کے دوستوں نے رائے دی کہ حافظ کا باب "مطاعن" نکال دینا چاہیئے ـ صرف موجودہ تصوّف کی بے عنوانیوں پر تنقید کافی ہو - ذاتی حملے سے کیا نتیجہ - اُنھوں نے بتایا کہ اِن مطاعن سے اُن کے تبلیغی مقاصد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو - چنانچہ وہ حصّہ حذف کر دیا گیا -

تاہم "اسرار خودی" اور دوسری تصانیف میں نام نہاد تصوّف پر سختی سے اعتراضات ملتے ہیں - اُنہوں نے بتایا ہو کہ نفی خودی یا فنا کا مسئلہ اقوام مغلوبہ کی ایجاد ہو - اور مثال کے طور پر شیروں کی حکایت لکھی ہو جو پہلے گوسفندوں کو پھاڑ کھاتے تھے - بعد کو ایک گوسفند کی تلقین سے دین گوسفندی اختیار کر کے اپنے تمام شیرانہ خصائص و خصائل سے ہاتھ دھو بیٹھے -

شیر بیدار از فسونِ میش خفت　　　انحطاطِ خویش را تہذیب گفت

خود افلاطون[2] بھی جو اس مسلک کا امام سمجھا جاتا ہو اُن کے قلم کی زد سے نہ بچ سکا -

راہب دیرینہ افلاطون حکیم　　　از گروہ گوسفنداں قدیم

گفت سترِ زندگی در مردن است　　　شمع را صد جلوہ از افسردن است

گوسفندے در لباس آدم است　　　حکم او بر جان صوفی محکم است

---

[1] اُس زمانہ میں اقبال کے رَد میں متعدد مضامین اور رسالے نکلے - پنجاب کے ایک بزرگ پیرزادہ مظفر احمد فضلی نے ایک مثنوی موسوم بہ رازِ بے خودی لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا :-

از دم کرشغالاں الحذر　　　الحذر از بدسگالاں الحذر

[2] افلاطون (۴۲۹ تا ۳۴۷ ق م) غالباً پہلا مفکّر ہے جس نے وحدت و کثرت کی بحث چھیڑی ہے اور بتایا ہے کہ روح اپنے سابق تجربات، میں کلیّات (حق - و حسن و خیر مطلق) سے دوچار ہوتی ہے اور ناسوتی زندگی میں اُنہیں تجربات کی یاد اُس کی رفیق ہوتی ہو - اُس کے عرصے کے بعد فلاطینوس (فلاطون آلہی یا الشیخ الیونانی) نے جس کا زمانہ ۲۰۴ تا ۲۷۰ میلادی ہو اِن افکار کو عام کیا - اِسی بنا پر اِس عقیدے کو افلاطونیت جدید کہتے ہیں ٭

منکر ہنگامہ موجود گشت　　　　خالق اعیان[1] نامشہود گشت

تو ہا از سکر او مسموم گشت　　　　خفتہ واز ذوق عمل محروم گشت

اقبال نے دیکھا کہ صدیوں سے ہمارے شعر۔ ادب۔ افکار۔ گفتار۔ کردار سب پر غلط تصوف کے اثرات کارفرما ہیں جن کی وجہ سے قوم کی قوم زبوں ہمتی۔ پست خیالی۔ بے حسی اور بے عملی کا شکار ہو۔ امراء و سلاطین۔ علماء و مشائخ۔ خواص و عوام عرب و عجم کوئی طبقہ نہیں جو اس شراب سے سرشار نہ ہو عروج کا تصور تو درکنار زوال کا احساس بھی رخصت ہو چکا ہو۔ اِن حالات کے پیشِ نظر انھوں نے ضروری سمجھا کہ اِن خرابیوں کی جڑ پر ضرب کاری لگائی جائے۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

وائے قومے کز اجل گیرد برات　　　　شاعرش وابوسد از ذوق حیات
خوش نماید زشت را آئینہ اش　　　　در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

از خم و مینا و جامش الحذر　　　　از مے آئینہ فامش الحذر

آخر میں اسلامی شاعروں اور ادیبوں کو ہدایت کرتے ہیں۔

فکر صالح در ادب می بایدت　　　　رجعتے سوئے عرب می بایدت
دل بہ سلمائے[2] عرب باید سپرد　　　　تا دمد صبح حجاز[3] از شام کرد

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

پیرہا پیراز بیاض مو شدند　　　　سخرہ بہر کودکانِ کو شدند
دل ز نقش لا الٰہ بیگانہ　　　　از صنم ہائے ہوس بت خانہ
می شود ہر مو درازے خرقہ پوش　　　　آہ زیں سوداگران دیں فروش

اُن کو شکایت ہو کہ ہمارے صوفیوں کو عراقی کی غزلوں پر تو حال آتا ہو۔ قرآن پر کبھی نہیں آتا

صوفیٔ پشمینہ پوش حال مست　　　　از شراب نغمۂ قوال مست
آتش از شعر عراقی در دلش　　　　در نمی سازد بہ قرآں محفلش

حضرات صوفیہ دنیا کو ذلیل جانتے ہیں۔ اقبال اِس پر یوں طعنہ زن ہیں۔

اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ　　　　عالم اسباب را دوں گفتۂ

---

[1] صور علمیۂ الٰہی یا معلومات حق جن کو ماہیات اشیاء قرار دیا گیا ہو۔

[2] یعنی خالص اسلام کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ یہی خیال اور جگہ بھی ملتا ہے۔ دل و دیں در گردِ زہرہ وشانِ عجمی آتش شوق نیز رفت جاں بُت کدۂ چیں سے ہٹائیں اپنا دل کو محو رُخ سُعدیٰ و سلیمیٰ کرلیں ـــــــ یہ عرب کی دلرباؤں کے نام ہیں۔

[3] اس میں اشارہ ہو اس قول کی طرف کہ اسیت کردیاً و اصبحت حجازیاً میں شام تک کُردی تھا۔ اور صبح کو حجازی ہو گیا:

خیز و وا کن دیدۂ مخمور را — دل مخواں ایں عالم مجبور را

اور چند شعر سنئے :-

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی و ملا کے غلام اے ساقی

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — خونِ دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی — اُن کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا — تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی — فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی
خراب کوشکِ سلطان و خانقاہ فقیر — فغاں کہ تخت مصلے کمالِ زراقی

عارت کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں — پیدا کلہ فقر سے ہو طرۂ دستار

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں فرد — محبت میں یکتا، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

غرض عام صوفیہ کی روش پر نکتہ چینی کی مثالیں اُن کے یہاں بکثرت ہیں — بایں ہمہ یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اقبال کو یا اُن کی شاعری کو تصوف سے کوئی لگاؤ نہیں۔ سچ پوچھئے تو اُن کے کلام میں تصوف کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ جیسا کہ آئندہ بحث سے ظاہر ہوگا۔ دراصل وہ فلسفے کے مردِ میدان تھے اور حکمائے مشرق و مغرب کے افکار کی وادیوں میں بہت گھومے تھے — مگر

گہ آری خلیلے زبت خانۂ — کنی آشنائی بہ بیگانۂ

توفیقِ الٰہی نے امام غزالی رح[1] کی طرح اُن کو فلسفے کی راہ سے تصوف کی منزل تک پہونچا دیا۔ اور یہ تمام راہ انھوں نے قرآن

[1] امام موصوف نے منقذ من الضلال اور دوسری تصانیف میں خود اس کا اعتراف فرمایا ہے ؂

کی روشنی میں طے کی یہ صحیح ہو کہ کہیں کہیں اُن کے نظام فکر کے اجزائے ترکیبی اور اُن کی تعبیر و تاویل منطوق قرآنی سے بیگانہ[۱] معلوم ہوتی ہو۔ تاہم ان کے شعور میں ہمیشہ یہی نصب العین رہا۔ چنانچہ فرماتے ہیں

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

تصوّف سے اُن کے شغف کا بدیہی ثبوت وہ عقیدت[۲] ہو جو اُن کو پیر رومی سے ہو ایسا نہیں ہو کہ وہ "منکرے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن" کے مصداق ہوں۔ بلکہ اُن کے کلام سے ظاہر ہے کہ اُن کو مولائے روم کی ذات اور خیالات سے قلبی لگاؤ ہو۔ "اسرار خودی کے آغاز ہی" انہوں نے کہا ہو کہ میں ایک رات غم دوراں کے اثر سے روتے روتے سو گیا۔ خواب میں حضرتِ رومی آئے اور یوں مخاطب ہوئے

تا بہ کے چوں غنچہ می باشی خموش　　نکہت خود را چو گل ارزاں فروش
آتش استی بزم عالم برفروز　　دیگراں را ہم زسوز خود بسوز
فاش گو اسرار پیر مے فروش　　موج مے شو کسوت مینا بپوش

چنانچہ اقبالؔ نے اُن کے حکم کی تعمیل کی

زیں سخن آتش بہ پیراہن شدم　　مثل نَے ہنگامہ آبستن شدم
چوں نوا از تار خود برخاستم　　جنتے از بہر گوش آراستم

رومی سے عقیدت از اوّل تا آخر اُن کے کلام کی خصوصیت رہی ہو۔ مثلاً

مرشد رومی حکیم پاک زاد　　سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد
بوعلی اندر غبار ناقہ گم　　دست رومی پردۂ محمل گرفت
ایں فروتر رفت و تا گوہر رسید　　آں بہ گردابے چو خس منزل گرفت

بیا کہ من ز خم پیر روم آوردم　　مَے سخن کہ جواں تر ز بادۂ عنبی ست

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاک من　　مرشد رومی کہ گفت "منزل ما کبریاست"
مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

حیراں ہو بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں　　رومی یہ سوچتا ہو کہ جاؤں کدھر کو میں

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے　　وہی آب و گل ایراں، وہی تبریز ہو ساقی

---

[۱] یہ مسئلہ ایک جداگانہ بحث کا محتاج ہو۔ [۲] اقبالؔ کے حالات سے معلوم ہوتا ہو کہ ان کے گھر کا ماحول بھی تصوّف سے متاثر تھا۔ نیز انہوں نے اپنی تصانیف میں متعدد اکابر صوفیہ کے حضور میں خراجِ ارادت پیش کیا ہو۔

یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ

نے مہرہ باقی نے مہرہ بازی جیتا ہے رومی، ہارا ہے رازی

بال جبریل میں پیر و مرید کے عنوان سے انہوں نے اپنی بعض مشکلات رومی کی خدمت میں پیش کی ہیں۔ اور حضرت رومی کی زبان سے اُن کے جواب دیئے ہیں۔ جاوید نامہ میں جو روحانی سفر اقبال کو پیش آتا ہے۔ اُس میں رومی ہی کی روح اُن کی رہنما ہوتی ہے اور قدم قدم پر اُن کی امداد کرتی ہے۔

مسلمان صوفیہ خصوصاً صوفی شعرا میں مولانائے روم کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے وہ فارسی صوفیانہ شاعری کے ارکان ثلاثہ[۱] میں شامل اور کئی لحاظ سے اُن سب میں برتر ہیں۔ اُن کی مثنوی کی شہرت کا یہ حال ہے کہ گو فارسی میں ہزاروں مثنویاں لکھی گئی ہیں لیکن اگر صرف مثنوی کہہ دیا جائے تو مثنوی رومی ہی مراد ہوتی ہے۔ فارسی زبان کے ہزار سالہ لٹریچر میں وہ ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے۔ اہل علم نے ہر زمانے میں اُس کی متعدد شرحیں لکھی ہیں اور وہ مشرق و مغرب میں برابر احترام کی نظر سے دیکھی گئی ہے یہاں تک کہ اُس کو "قرآں در زبانِ پہلوی" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اِس کتاب میں تصوف کے مشہور مسائل مثلاً وحدت الوجود۔ عالم خلق و عالم امر۔ تجدد امثال۔ فرق و جمع۔ فنا و بقا۔ اور نیز صوفیہ کے خاص اشغال۔ توبہ۔ مجاہدہ۔ وجد۔ تسلیم۔ زہد۔ تقویٰ۔ صبر۔ شکر وغیرہ سے نہایت موثر اور دلنشیں انداز میں بحث کی ہے۔ موقع موقع سے آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے استدلال کرتے جاتے ہیں۔ اگرچہ مثنوی میں ترتیبِ مضامین کے لحاظ سے زیادہ ربط۔ اور افکار کے اعتبار سے چنداں ندرت نہ سہی۔ تاہم اُس کا تنوع۔ تخیل۔ حُسن و لطافت۔ خیالات کی گہرائی۔ اور جذبات کی صداقت مسلم ہیں۔ مولانا نے اپنے دل کش تمثیلی اسلوب میں نہ صرف ایک صوفی۔ بلکہ (جیساکہ مولانا شبلی[۲] نے دکھایا ہے) ایک متکلم کی حیثیت سے بھی عقاید اسلامی کے اسرار کی پردہ کشائی کی ہے انہیں خصوصیات کا اثر ہے کہ گو مثنوی ایسے ملک میں عالم وجود میں آئی جس کی زبان فارسی نہ تھی۔ اور اُس سے پہلے حدیقہ اور منطق الطیر جیسی بلند پایہ مثنویاں موجود تھیں تاہم وہ اُن سب سے فائق سمجھی جاتی ہے۔

مولانائے روم کی فکر کا محور وحدۃ الوجود کا عقیدہ ہے۔ لیکن یہ ایسا وصف نہیں کہ وہ اُس میں منفرد ہوں۔ اور دوسرے صوفیہ کے یہاں نہ پایا جاتا ہو۔ اُن کے نظام فکر کے وہ اجزا جو اقبال کو زیادہ اپیل کرتے ہیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) وہ نفی خودی کو ماننے کے باوجود نفی مطلق کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایسی حالت کے قایل ہیں جہاں پہونچ کر خودی اور بے خودی میں تضاد باقی نہیں رہتا۔ فرماتے ہیں

منتہاے سیر سالک شد فنا نیستی از خود بود عین بقا

ہست از روے بقا آں ذات او نیست گشتہ وصف او در وصف ہو

چوں زبانہ شمع پیش آفتاب نیست باشد ہست باشد در حساب

ہست باشد ذات او تا تو اگر بر نہی پنبہ بسوزد زاں شرر

---

[۱] یعنی سنائی۔ عطار۔ اور رومی [۲] سوانح مولانا روم

نیست باشد روشنی ندہد ترا　　　　کردہ باشد آفتاب اورا فنا

شمع[1] کا شعلہ آفتاب کے روبرو ایک لحاظ سے ہست ہو اور ایک لحاظ سے نیست۔ ہست تو یوں ہو کہ اگر تم اُس (شعلہ شمع) کو روئی دکھاؤگے تو جل جائے گی۔ نیست یوں ہو کہ آفتاب کے ہوتے ہوئے وہ تم کو روشنی دینے سے قاصر رہو گا۔

(۲) وہ عقل کے مقابلے میں وجدان کو ترجیح دیتے ہیں عقل جس کو وہ حکمتِ دنیا یا عقل جزوی کہتے ہیں قابل اعتماد نہیں۔

حکمت دنیا فزاید ظن وشک　　　　حکمت دینی برد فوق فلک
عقل جزوی را وزیرِ خود مگیر　　　　عقل کل را ساز اے سلطاں وزیر
عقل جزوی عقل را بدنام کرد　　　　کام دنیا مرد را ناکام کرد

(۳) وہ عشق کو مقصود حیات قرار دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

عشق آں شعلہ ست کو چوں بر فروخت　　　　ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت
شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　　　وے طبیب جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما　　　　وے تو افلاطون وجالینوس ما
علت عاشق ز علت ہا جدا است　　　　عشق اصطرلاب اسرار خدا است

(۴) اُنھوں نے تقدیر کی تعبیر قانون حیات سے کی ہو جو فطرت کے تمام کارخانے پر حاوی ہو۔

پس قلم بنوشت کہ ہر کار را　　　　لایق آں ہست تاثیر وجزا
کج روی جف القلم کج آیدت　　　　راستی آری سعادت زایدت
ظلم آری مدبری جف القلم　　　　عدل آری برخوری جف القلم
معنیٔ جف القلم کے ایں بود　　　　کہ جفا ہا و وفا یکساں شود
بیں جفا را ہم جفا جف القلم　　　　واں وفا را ہم وفا جف القلم

(۵) وہ وحدت کے علم بردار ہونے کے باوجود اختیار پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور[2] انسان کو اس کے افعال میں مجبور نہیں ٹھہراتے۔

کردِ حق وکردِ ما ہر دو ببیں　　　　کردِ ما را ہست داں پیدا ست ایں

مولانا نے اس کی ایک عمدہ مثال دی ہو۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے ہاتھ میں رعشہ ہو۔ دوسرا شخص خود ہاتھ ہلا رہا ہو۔ اگرچہ یہ دونوں جنبشیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں تاہم دونوں میں بڑا فرق ہو۔ اوّل الذکر سے اگر کوئی قیمتی چیز گر کر ٹوٹ جائے تو اُس کو ندامت نہ ہوگی۔ لیکن آخر الذکر سے یہ حرکت سرزد ہو تو اس کو بالآخر نادم ہونا پڑے گا۔

---

[1] اسی طرح انھوں نے لوہے کی مثال دی ہو کہ وہ آگ میں ڈالے جانے سے آگ کے اوصاف پیدا کر لیتا ہو۔ [2] نکلسن نے اس ظاہری تضاد کی توجیہ وتطبیق اس طرح کی ہو کہ مولانا نے اختیار کا مسلک مبتدی کے لئے مقرر کیا ہو۔ اور تفویض کا منتہی کے لئے۔

(۶) وہ سعی و عمل پر مدارِ کار رکھتے اور حیات کے لئے کشمکش حیات کو لازم جانتے ہیں۔

گفت پیغمبرؐ کہ چوں کوبی درے — عاقبت زاں در برول آید سرے
چوں نشینی بر سر کوئے کسے — عاقبت بینی تو ہم روئے کسے
اندریں رہ می تراش و می خراش — تادم آخر دمے فارغ مباش
دوست دارد دوست ایں آشفتگی — کوشش بیہودہ بہ از خفتگی

دنیا میں پیاسا ہی پانی کو نہیں ڈھونڈھتا۔ پانی بھی پیاسے کی تلاش میں ہے۔ پیاس کا ہونا شرط ہے۔

تشنگاں گر آب جویند از جہاں — آب ہم جوید بہ عالم تشنگاں

(۷) اُن کی غائر نظر بعض ایسے مسائل تک پہونچ گئی تھی جو سائنس کی دنیا پر صدیوں کے بعد منکشف ہوئے۔ مثلاً کشش و ارتقاء کے مسائل۔

(۸) مولانا روحِ انسانی کے ارتقا کے معتقد ہیں — اور اُس کی بے شمار صلاحیتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایک جگہ روحِ حیوانی اور روحِ انسانی کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

غیر فہم و جاں کہ در گاو خراست — آدمی را عقل و جانِ دیگر است
تفرقہ در روح حیوانی بود — نفس واحد روح انسانی بود
اقتضائے جاں چوائے دل آگہی ست — ہر کہ آگہ تر بود جانش قوی ست

پھر فرماتے ہیں۔

جاں ہمہ نور است و تن زنگ است و بو — رنگ و بو بگذار و دیگر زاں مگو
رنگ دیگر شد ولیکن جان پاک — فارغ از رنگ است و از ارکانِ خاک

ایں ہمہ بہر ترقی ہائے روح — تا رسد خوش خوش بہ میدان فتوح

ایک جگہ کہتے ہیں کہ جس طرح روحِ حیوانی سے روحِ انسانی اعلیٰ ہے۔ اسی طرح عام انسانوں سے اولیاؒ اور انبیاؑ کی روح اعلیٰ ہوتی ہے۔ یہ وہ روح ہے جو الہام و وحی سے مشرف کی جاتی ہے۔ اور محدود عقل کی محتاج نہیں ہوتی۔

مولانا کے یہاں اِسی قبیل کے مباحث ہیں جن کو اقبالؔ اپنے عصر کی روح سے قریب۔ اور اپنے نظام فکر سے متیجّ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مولانائے روم کو اپنا روحانی مرشد قرار دیتے اور کمال احترام سے یاد کرتے ہیں۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ اقبالؔ کے خیالات میں تصوّف کے عناصر کس حد تک پائے جاتے ہیں۔ لیکن اِس سے پہلے مناسب ہوگا کہ اُن کے عام خطِ فکر کا مختصراً جائزہ لے لیا جائے۔ جس سے مسئلہ زیرِ بحث کے سمجھنے میں مدد ملے۔

سب جانتے ہیں کہ اُن کی فکر کا مبدا اور معاد فلسفۂ خودی ہے۔ یہی اُن کی تعلیمات کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور یہی پایانِ کار۔ خودی سے اُن کی مراد تعیین ذات یا عرفانِ نفس ہے۔ یہ ہر چیز کی اندرونی ماہیت کا نام ہے۔ خودی غیر مرئی۔ ناقابلِ تقسیم۔ زمان و مکان سے ماورا۔ غیر محدود۔ بے مثال اور غیر فانی ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہم دیکھتے ہیں خودی ہی کے مظاہر ہیں۔ ہر آن اُس کی نئی شان ہے۔ اُس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ آگے بڑھے۔ راہِ عمل طے کرے۔ اور مسلکِ ترقی پر گام زن ہو۔ کائنات کے تمام

تغیرات و حرکات اِسی فطرت کے مظاہر سمجھنے چاہئیں - خودی دنیا کے ہر ذرّے میں کارفرما ہے - جس قدر کسی چیز کی خودی قوی ہے اسی قدر اُس کی زندگی پائے دار ہے - جس شے کو ہم مادہ کی قوتِ مقاومت کہتے ہیں یہ اس کی خودی کے علاوہ اور کچھ نہیں - اب انسانی زندگی پر نظر ڈالئے تو وہاں اُس کا وجود اور بھی واضح اور آشکار نظر آئے گا - ہمیں اپنی خودی کا براہ راست علم ہے - ہم کسی[1] چیز میں بھی شک کریں مگر اپنی خودی میں شک نہیں کر سکتے - یہ علم ہمیں وجدان کے طور پر ہوتا ہے - نہ کہ عقلی استدلال کی راہ سے - عقل اِس بارے میں ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر ہے -

اگرچہ خودی مادہ اور روح دونوں پر حاوی ہے - لیکن وہ اِس مادّی محسوس دنیا کی چیز نہیں - بلکہ اُس کا تعلق ایک بالاتر روحانی عالم سے ہے - جو اُس کی اصلی منزل ہے - اپنے اثبات کی آرزو یا ظہور کا شوق اُس کی مادّی دنیا میں لایا ہے - تاکہ یہاں وہ اپنے مخفی امکانات کو بروئے کار لائے اور جادۂ ارتقا کو طے کرے - اُس کی یہی صورت ہے کہ وہ برابر ہر مقاومت پر غالب آئے اور اس طرح زیادہ قوی حقیقی اور انفرادی حیثیت حاصل کرے - اور یہی اس کی معراج ہے -

یہ تو خودی کی عام بحث ہوئی - اب سوال یہ ہے کہ اُس کا جادۂ ارتقا کیا ہے ؟ اقبال اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ جس حد تک انسانی خودی (انائے صغیر[2]) حق تعالیٰ کی خودی (انائے کبیر) کے قریب آتی جائے گی اُسی قدر کامیاب اور فائز المرام کہلائے گی - انسان کے اندر خدا کے وجود کا وجدانی شعور - اُس کو پانے کے لئے حقیقی تڑپ - اور اُس کی طرف زبردست کشش[3] پائی جاتی ہے -

یہی کشش جس کا نام عشق ہے انسان کی ارتقا کا ذریعہ - اور اُس کی برتری کی ضامن ہے - اِس عشق کے دو پہلو ہیں - اور دونوں اپنی جگہ انسان کی خودی کی ترقی کے لئے لازم ہیں - فقر اور طاعت -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں ہمیں خدا کی مرضی کا کیونکر علم ہو - اور ظاہر ہے کہ علم کے بغیر طاعت غیر ممکن ہے - اقبال اِس کا حل یہ پیش کرتے ہیں کہ عقل تو اِس میدان کی مرد نہیں - لہٰذا انسان کو وحی الٰہی کے سہارے کے بغیر یہ راہ طے کرنا محال ہے وحی کا حامل وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا کی صفات جلال و جمال کا مظہر اتم ہو - اور یہ شان انبیائے کرام ہی کے نفوسِ قدسیہ کی ہو سکتی ہے - خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد اگرچہ سلسلۂ وحی منقطع ہو گیا اور نبوت کا دروازہ بند کر دیا گیا - لیکن ایسے مردانِ کامل ہر زمانے میں ہوتے رہیں گے جو شرف الہام سے مشرف ہوں - اور جن کی خودی صحیح طور پر انبیا کی ذاتِ مقدسہ کا نمونہ ہو اس لئے اُن کی اطاعت و محبت جامعۂ انسانی کا نصب العین[4] ہونا چاہیئے -

اقبال کے عام نقطۂ نظر کے اِس مختصر جائزے میں ہمیں تصوّف کے حسب ذیل عناصر ملتے ہیں :-

(الف) وحدت الوجود کا عقیدہ - اقبال اِس کے قائل ہیں کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ خودی کا کرشمہ ہے -

---

[1] کہا جاتا ہے کہ موجودہ علمی دنیا پر فرنچ فلسفی ڈیکارٹ کا احسان ہے کہ اس نے روح کے وجود کا اعلان کیا - اُس کا مشہور مقولہ ہے - " میں سوچتا ہوں - اس لئے میرا وجود ہے " [2] ... علامہ اقبال " تقرب حق " کے سلسلہ میں اس پیرایہ میں گفتگو نہ فرماتے تو زیادہ اچھا تھا (مدیر) [3] اقبال فنا اور وصل کے قائل نہیں - بلکہ درد و اضطراب اور سوز فراق کو روح انسانی کا نقطۂ عروج مانتے ہیں - [4] مگر ساری کائنات اور تمام انسانیت کے لئے آخری " معیار " حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے ! " وحی " کی طرح کسی غیر نبی کا " الہام " اور " القا " حجتِ قطعی نہیں ہو سکتا (مدیر)

اُس کے ذوقِ ظہور۔ یا اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے کی خواہش نے یہ عالم پیدا کیا۔ یوں تو وہ کائنات کے ہر ذرّے میں خودی کے وجود کے معتقد ہیں۔ اور انسان میں یہ چیز بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔ لیکن خودی کی اصل وحدت ہے جو کثرت میں ظہور کئے ہوئے ہے۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں۔

دمادم رواں ہے یمِ زندگی　　ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گِل　　خوش آئی اسے محنتِ آب و گِل
یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی　　عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر　　مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بُت خانۂ شش جہات　　اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

گُل اِس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے　　اِسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات　　اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

اسرارِ خودی میں کہتے ہیں۔

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی ست　　ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی ست
خویشتن را چوں خودی بیدار کرد　　آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہاں پوشیدہ اندر ذاتِ او　　غیرِ او پیدا است از اثباتِ او
در جہاں تخمِ خصومت کاشت ست　　خویشتن را غیرِ خود پنداشت ست
سازد از خود پیکرِ اغیار را　　تا فزاید لذتِ پیکار را

اور چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

تلاش او کنی جز خود نہ بینی　　تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی
میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں　　غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں　　میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
تو ہے محیطِ بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو　　یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر
وہی اصل مکان و لامکاں ہے　　مکاں کیا شے ہے اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے　　اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

زیادہ مثالوں سے مضمون کی طوالت اور قارئین کی ملالت کا خوف ہے۔ ویسے بھی استقصا مقصود نہیں۔ آغازِ کار میں اقبال صوفیہ کے ساتھ چلتے ہیں۔ مگر پایانِ کار راہیں بٹ جاتی ہیں۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک مقصدِ حیات فنا ہے (گو یہ فنا بدھ کی نروان کی طرح منفی نہیں۔ بلکہ بقا کے ذریعے سے ایجابی شان کی حامل ہو جاتی ہے) اقبال کے یہاں مقصدِ حیات سوز و مستی۔

لہ　یعنی فنا یا انا۔ اِن دونوں میں سے کوئی مقام عطا کر۔

جذب و شوق ہی رُوح کو آرزو و جستجو مشاہدے کی حریم تک لے جاتی ہے۔ مگر اُس سے راحت کے ساتھ اضطراب کی کیفیت بھی بڑھ جاتی ہے۔

(ب) رُوح کی عظمت اور انسان کی منزلت: تمام تصوّف کا مدار رُوح کے عقیدے پر ہے اگر رُوح کے وجود کا انکار کردیا جائے تو تصوّف کی عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر روحِ انسانی کے ارتقا کے منازل۔ اور اُس کی ترقی کے اَن گنت امکانات کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا اقبال یہ نہیں مانتے کہ "عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا" بلکہ دریا کا عرفان۔ اُس کا مشاہدہ اور اُس کی صفات سے رابطہ ہی قطرے کی سب سے بڑی معراج ہے۔

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں وہ جلوہ گاہ ترے خاک داں سے دور نہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں آب و گِل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
عشق کی اک جَست نے طے کر دیا قصہ تمام اِس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

میلادِ آدم میں انسان کی منزلت بڑے عجیب اور پُرزور انداز میں بیان کی ہے

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور خودگرے۔ خودشکنے۔ خودنگرے پیدا شد

اِس میں کہیں کہیں ایسا مبالغہ کر جاتے ہیں کہ دامانِ ادب ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ مثلاً

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

ایک جگہ کہتے ہیں کہ اگرچہ خاکی انسان کو فرشتوں کا پیکر نوری نہیں دیا گیا۔

دلے تاب و تبِ ما خاکیاں بیں بہ نوری ذوقِ مہجوری ندادند

انسان کی منزلت کے سلسلے میں اُنہوں نے نیابتِ الٰہی پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی نیابت و خلافت انسان کی آفرینش کی غایتِ اصلی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است
پختہ سازد فطرتِ ہر خام را از حرم بیروں کند اصنام را

دوسری جگہ کہتے ہیں:۔

---

[۱] تھیٹر یا سینما کی مثال اس کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہاں تعینات و امتیازات (بے اصل ہوتے اور جانتے ہوئے بھی) نباہنا پڑتے ہیں۔ ورنہ تماشے کا مقصد ہی فوت ہو جائے [۲] سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا [۳] تخلقوا باخلاق اللہ [۴] و [۵] ہم اسے "نازِ عبدیت" کہتے ہیں (مدیر)

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

پھر سیدنا علی مرتضیٰ کی مثال دیکر بتاتے ہیں کہ مومن کامل وہ ہے جو آپ کی طرح وجود خاکی کی خواہشوں کو زیر کر سکے۔

(ج) وجدان و عشق کا مقام — کانٹ کی طرح اقبال کے نظام فکر میں وجدان کی خاص اہمیت ہے عقل مظاہر[1] کے عرفان میں تو مدد دے سکتی ہے۔ لیکن حقایق کے پہچاننے سے قاصر ہے۔ یہاں وجدان ہمارا رہبر ہوتا ہے۔ ہمارے اندر جو ایک دردِ طلب ہے وہ مطلوب کے در تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے۔ یہی وجدان جب عشق کے اسلحہ سے مسلح ہو کر ہمارا رفیق ہوتا ہے تو ہم بے خطر طریق منزل دوست طے کرتے۔ اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیتے ہیں۔ عشق کا مفہوم جیسا کہ خود اقبال نے ایک جگہ بتایا ہے ہر اس چیز کو اپنے اندر جذب کرنا ہے جو اعلیٰ و اکمل ہو۔ یہ صرف جذباتی چیز نہیں بلکہ قوت فعال بھی ہے۔ اب اعلیٰ و اکمل کی طلب دوسرے الفاظ میں عشق الٰہی کی مترادف قرار پاتی ہے۔ انسان کامل (یا مردِ حُر) کی محبت بھی اسی اصل کی فرع ہے۔ اس موضوع پر اقبال نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفےٰ — عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا پیام
در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق — آبِ حیواں، تیغ جوہر دار عشق
از نگاہِ عشق خارا شق شود — عشقِ حق آخر سراپا حق شود
عاشقی آموز و محبوبے طلب — چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب

عشق پر ان کی نظم پیام مشرق میں مطالعے کے قابل ہے۔

ایضاً — عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد — از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی

(د) فقر و استغنا — ان دونوں اوصاف کی تشریح سے اقبال کا کلام بھرا ہوا ہے۔ خود اُن کی زندگی ان اوصاف کا روشن آئینہ تھی۔ فقر ماسوا سے بیزاری اور استغنا خودداری سے عبارت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی
گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ — پہونچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

اسرار میں اُنہوں نے دکھایا ہے کہ خودی کیونکر سوال سے ضعیف ہو جاتی ہے۔ اور یہ کہ سوال میں، خیال، عمل میں غیروں کی ریس بھی شامل ہے۔ یہیں سے عمل پیہم کی اہمیت، جفاکشی اور محنت کوشی کی فضیلت بھی ثابت ہے۔

آنکہ خاشاک بتاں از کعبہ رُفت — مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت
وائے بر منت پذیرِ خوانِ غیر — گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر

(ھ) ضرورت مرشد — صوفیہ۔ خصوصاً رومی نے مرشد کی ضرورت پر بہت زور دیا ہے، اقبال بھی اس مسئلے

---

[1] مظاہر = حقائق

میں اُن کے ہم خیال ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ رسمی پیری و مریدی کے قائل نہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں اپنی محبت و اطاعت کا مرکز ایک ایسے مرد مومن کو بنانا چاہیئے جو ہماری خودی کو صحیح راہ پر ڈال سکے۔ ہم دنیا کے علوم کی تحصیل میں کتابوں پر اکتفا نہیں کرتے۔ بلکہ کسی اُستاد کی رہنمائی کے بھی محتاج ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس راہ میں بھی ضرورت ہے کہ کسی دانائے راہ کا دامن تھام لیا جائے۔ اگرچہ اس کلیے میں مستثنیات پر حکم نہیں دیا جاتا۔ کہ النادر کالمعدوم۔

کیمیا پیدا کن از مشت گلے　　بوسہ زن بر آستان کاملے
شمع خود را ہم چو رومی بر فروز　　روم را در آتشِ تبریز سوز

دوسرے موقع پر اُسی مرد کامل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

اے سوارِ اشہب دوراں بیا　　اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامہ ایجاد شو　　در سواد دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن　　نغمۂ خود را بہشت گوش کن

ایضاً۔
غلام زندہ دلانم کہ عاشق سرہ اند　　نہ خانقاہ نشیناں کہ دل بہ کس ندہند
از کلیسے سبق آموز کہ دانائے فرنگ　　جگر بحر شگافید و بہ سینا نرسید

ایک جگہ انوکھے انداز میں ایسے مرد کامل کی ضرورت جتائی ہے۔

قدم در جستجوے آدمے زن　　خدا ہم در تلاش آدمے ہست

اُس "آدم" کی خصوصیات یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

بدہ او را جوانِ پاک بازے　　سرورش از شراب خانہ سازے
قوی بازوئے او مانند حیدرؓ　　دلِ او از دو گیتی بے نیازے

غرض حقائق بالا کی روشنی میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اقبالؔ تصوف کے مخالف تھے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اُن کو تصوف سے فطری ذوق تھا۔ جس پر اُن کے خاندانی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ بعد کو اپنے مقالۂ علمی (ایرانی مابعد الطبیعیات) کے سلسلے میں جب انہوں نے صوفیہ کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا تو اُس نے اور بھی اس ذوق کو جلا دے دی۔ حضرات صوفیہ کے فیض باطن کا کوئی قائل ہو یا نہ ہو۔ اتنا تو ماننا پڑے گا کہ رومی کے "فیضان نظر" نے اقبالؔ کو دردِ طلب دیا۔ اور ہندوستان (اور پاکستان[له]) کو اقبالؔ!

تصوف کے وہ اشغال واذکار جن کا مقصد تزکیہ نفس ہے اور جو کتاب و سنت کے عین مطابق ہیں، اُن کی افادیت کا کون انکار کرسکتا ہے اور علامہ اقبالؔ بھی اُن کے قایل ہیں ــــــــ مگر "عجمی تصوف" کا اقبالؔ خوب کھُل کر رد کرتے ہیں کہ اس قسم کا "تصوف" (؟) اسلامی مزاج کے لئے اجنبی ہے! ــــــ رہا "وحدت الوجود" سو یہ بڑا اُلجھا ہوا مسئلہ ہے، اس کی تشریح کی جاتی ہے تو یہ اور زیادہ اُلجھ

له　فاضل مضمون نگار نے صرف "ہندوستان" لکھا تھا! (مدیر)

جاتا ہے، قرآن کی تعلیم (قل الروح من امر ربی) ہمیں بتاتی ہے کہ "معانی و بسائط" کی بحثوں میں پڑنا خطرات کو دعوت دینا ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کرام کے آثار میں "وحدت و کثرت" کی یہ نازک بحثیں نہیں ملتیں —— (م — ق)

انیس علوی

خوفناک تفریح

توپ کے دہانہ سے انسان نکلتا ہے!

آج دنیا زندگی کے ہر شعبہ میں حیرت انگیز[1] ترقی کرچکی ہے، ترقیوں کا یہ سلسلہ پوری تیزی کے ساتھ جاری ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ کل کی ترقی یافتہ دنیا کیا ہوگی؟ علم کیمیا اور طبیعیات کی ترقی اور زیادہ حیرت انگیز ہے، ترکیب عناصر کی چھان بین ہوچکی ہے اور ذرہ کا ہیبت ناک تجزیہ توانائیوں کی نیرنگیوں کو سامنے لارہا ہے، علم الافلاک نے سورج، چاند اور ستاروں کے چہروں سے نقابیں اٹھادی ہیں، جو چیزیں کل "پُر اسرار" تھیں آج وہ معمولی اور سادہ ہوکر رہ گئی ہیں، حیرت و ماندگی کی گرد آہستہ آہستہ چھٹتی جارہی ہے!

سائنس کی اس دوڑ میں امریکہ بہت آگے ہے، اڈیسن (E D I S O N) امریکہ ہی کا مایہ ناز فرزند ہے، یہ جگمگاتے قمقمے جن سے آپ کے مکانات بقعۂ نور بنے رہتے ہیں، یہ گراموفون جن کے نغمے آپ کے لئے فردوس گوش ہیں اسی ایڈیسن کی فکرِ ندرت طراز کی ایجاد ہیں۔

امریکہ میں " زچینی " نام کا ایک خاندان رہتا ہے، یہ خاندان اگرچہ اٹلی نژاد ہے لیکن عرصہ دراز سے امریکہ میں اقامت گزیں ہونے کے باعث ،وہ امریکن کہلاتا ہے۔

اس خاندان کا آبائی پیشہ سرکس کا کھیل تماشا دکھانا ہے۔ زچینی سرکس امریکہ کا اعلیٰ ترین سرکس شمار کیا جاتا ہے۔ سرکس کے چلانے والے نت نئے کھیل۔ تماشے اور ورزشیں ایجاد کرکے اپنی کمالات کی داد حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر حال ہی میں اس سرکس کے مالک مسٹر ایڈمنڈ نے ایک عجیب و غریب کھیل ایجاد کرکے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ وہ توپ میں بجائے فولادی گولے کے انسان کو بھرتا ہے اور توپ چلاتا ہے۔ اس عمل کا تصور بھی انسانی دماغ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، معلوم نہیں یہ خیال سرکس کے مالک کے دماغ میں کب اور کیسے آیا۔ بہرحال ایڈمنڈ کے ذہن میں خیال آیا اور اس نے اس کو عملی قالب میں ڈھالنے کیلئے جدوجہد شروع کردی۔ انتہائی کوشش کے بعد اور لاکھوں روپیہ صرف کرکے اس نے ایک دن انسانی گولے والی توپ کے چلانے کا اعلان کردیا، اس اعلان کو سن کر لوگ سناٹے میں رہ گئے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک اسی کا چرچا تھا۔ کسی کو اس بات کا یقین نہ آتا تھا۔ اور سچ تو یہ ہے یقین بھی کیسے آتا۔ کسی نے ایسی بے جگری اور دلیری کا کارنامہ نہ کبھی دیکھا اور نہ کبھی سنا تھا۔ بھلا ایسا کون جیوٹ ہوگا جو دوسروں کی تفریح کے لئے ہنسی خوشی مرنا قبول کرے۔ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہو ہی رہی تھیں کہ وہ دن بھی آگیا

[1] مگر اخلاق " میں پست تر ہوچکی ہے اور ہوتی جارہی ہے۔ (مدیر)

جس دن سرکس میں اس ہوش رُبا منظر کا مشاہدہ ہونے والا تھا، سرکس کے پنڈال کو تماشائیوں کے لئے اور وسیع کر دیا گیا۔ ٹکٹ بکنے شروع ہو گئے۔ ملک کے گوشہ گوشہ سے عورتیں۔ مرد اور بچے سیلاب کی طرح امنڈے چلے آتے تھے۔ سرکس کے اِرد گرد بے پناہ ہجوم تھا۔ ہزار ہا تماشبین جگہ کی قلت کی وجہ سے ٹکٹ حاصل نہ کر سکے۔ بہر حال حسب معمول بعد مغرب سرکس میں تماشے شروع ہو گئے۔ سامعہ نواز بینڈ بجنے لگے۔ ماہرین سرکس اپنی اپنی کمالات دکھانے لگے۔ شیر چیتے۔ ہاتھی اپنے اپنے ماسٹروں کے اشاروں پر کام کرنے لگے۔ لیکن آج ان کھیلوں میں کوئی شخص بھی دل چسپی نہیں لے رہا تھا۔ توپ اور گولے کا خیال لوگوں کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ بڑے انتظار کے بعد ایک خاص انداز سے گھنٹی بجی اور ساتھ ہی توپ کی آمد کا اعلان ہوا۔ سب کھیل بند کر دئے گئے۔ پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔ پردہ اُٹھا اور چند نوجوان ایک زبردست توپ کو ڈھکیلتے ہوئے اسٹیج پر لائے۔ یہ توپ بھی اعجوبۂ روزگار تھی۔ تیس فٹ لمبی نال۔ ڈیڑھ فٹ چوڑا دہانہ۔ اَسّی من وزن! خدا کی پناہ اس کو دیکھ کر ہی آدمی کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ مجمع بہوت تھا۔ پنڈال میں ایک سناٹا طاری تھا۔ مگر سرکس والے اپنے کام میں مشغول تھے۔ توپ اسٹیج پر نصب ہو گئی۔ اب "گولے" کی آمد کا اعلان ہوا اور ساتھ ہی ایک سجیلا کڑیل نوجوان نہایت شان و شوکت کے ساتھ اسٹیج پر آیا۔ اس توپ کا موجد "زچی" خاندان کا نامور فرزند اور سرکس کا مالک خود ایڈ منڈ تھا۔ اس وقت نوجوان کا بانکپن قابل دید تھا۔ نعرہ ہائے تحسین سے پنڈال گونج اُٹھا۔ ایڈمنڈ نے ایک ادائے خاص کے ساتھ مجمع کے پر جوش استقبال کا سر کی ہلکی سی جنبش سے جواب دیا اور نہایت وقار کے ساتھ توپ کے دہانے کے قریب آیا۔ چند مددگار آگے بڑھے اور اُس کو اپنے ہاتھوں پر لٹا کر پیروں کی طرف سے توپ کے دہانے میں داخل کر دیا۔ اس وقت پنڈال میں ہزار ہا دل دوز چیخیں فضائے آسمانی میں گونجتی ہوئی سنائی دیں۔ متعدد نوخیز لڑکیوں کو غش آ گیا۔ بہت سے معمر بزرگوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ مگر کارکنانِ سرکس اپنے کام میں مشغول رہے۔ توپ کی کٹھالی میں بارود بھر دی گئی۔ توپچی آگے آیا۔ فلیتہ نکالا اس کو سُلگایا۔ اور اس کو چٹکی میں دبا کر آہستہ آہستہ بارود کی طرف بڑھا۔ یہ لمحہ بھی کس قدر صبر آزما اور کرب انگیز تھا۔ آنکھیں خود بخود بند ہوئی جاتی تھیں۔ دم گھٹے جاتے تھے۔ جُوں جُوں فلیتہ بارود کے قریب ہو رہا تھا لوگوں کے دل بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ چہروں سے خوف و ہراس عیاں تھا۔ عورتیں لرزہ بر اندام تھیں۔ بچوں کے رنگ فق تھے۔ یکایک بگل کی ایک تیز مگر مختصر آواز سُنائی دی۔ توپچی کے ہاتھ کو ایک خفیف سی حرکت ہوئی۔ بارود نے آگ پکڑی اور توپ کے بھیانک دھماکے کے ساتھ ہی لاتعداد انسانی چیخیں فضائے آسمانی میں گونج گئیں۔ اور توپ کے دہانے سے انسانی گولا سو فٹ کی بلندی پر پرواز کرتا ہوا دو سو فٹ کی دوری پر جا گرا۔ اس وقت پنڈال میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کو ایڈ منڈ کے زندہ رہ جانے کا یقین ہو اس لئے وہ سب نہایت بے صبری سے اپنے خیال کی تصدیق کے منتظر تھے۔ چند ماہر ڈاکٹر ایڈ منڈ کے قریب پہونچ چکے تھے۔ وہ اس وقت بیہوش تھا۔ اس کو بہ عجلت اس جال سے نکالا گیا جس پر وہ توپ کے دہانے سے نکل کر جا گرا تھا۔ ڈاکٹروں نے معاینہ کیا اور جلد ہی اعلان کر دیا گیا کہ ایڈ منڈ زندہ ہے۔ یہ اعلان مجمع کے لئے ایک حیات آفریں مژدہ سے کم نہ تھا۔ حاضرین میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی اور مجمع دیر تک خوشی کی تالیاں بجاتا رہا۔ اور لوگ ایڈ منڈ کی عجیب و غریب جدت کی داد دیتے ہوئے رخصت ہوئے۔

بد قسمتی سے توپ کے کسی نقص کی وجہ سے ایڈ منڈ کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس وجہ سے اس کو کئی مہینہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ مگر صحت یاب ہونے کے بعد اُس نے توپ کا وہ نقص دُور کر دیا اور اب اگرچہ وہ خود تو اس قابل نہیں کہ توپ کا گولا بن سکے۔ اس کے دوسرے بھائی اور ایک بہن توپ کے گولے بنتے ہیں اور لوگوں کو روزانہ یہ کھیل دکھا کر محوِ حیرت کرتے ہیں۔ آجکل اس کے سرکس میں اس قسم کی بارہ توپیں ہیں اور خاندان کا ہر ہونہار بچہ اس کام کو سیکھتا ہے ٭

مظفر حسین شمیم!

ہماری شاعری

چوں کہ شاعری کا شمار فنونِ لطیفہ میں کیا جاتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ فنونِ لطیفہ کا انسانی زندگی کے کس شعبہ سے تعلق ہے۔ جس طرح بالعموم آدمی کی زندگی کے ہر روز کا ایک حصہ عملی زندگی کی گتھیوں کے سلجھانے میں صرف ہو جاتا ہے اُسی طرح اُس کے لئے ضروری ہے کہ ذہنی توازن اور صحت کو برقرار رکھنے کے لئے تھوڑا سا وقت ایسی تفریح میں صرف کرے جس سے اُسے کوئی معاشی فائدہ نہیں ہوتا البتہ ایک ذہنی اور جسمانی سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ یہ انسان کی روحانی دلفریبی زندگی ہے اور یہ بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی معاشی جدو جہد سے تعلق رکھنے والی زندگی اور اصل شاعری کا تعلق اسی زندگی سے ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ شاعر اپنے ماحول سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور وہ عموماً اپنے گرد و پیش کے حالات و واقعات کو اپنے حُسن کارانہ نقطۂ نظر سے منظوم پیرائے میں دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ شاعر اور لوگوں کی طرح زندہ اور متحرک انسان ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ ایک زندہ انسان ہی کی کہی ہوئی چیز ہے اور انسانوں ہی کے لئے کہی جاتی ہے اس لئے شاعر کا انسانی زندگی کے مختلف مسائل سے اثر پذیر ہونا ضروری ہے تاہم اس جگہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کیا ہے؟

کیا زندگی صرف انسان ہی میں ہے؟ اور کیا انسانی زندگی صرف معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی ہی کا نام ہے؟ کیا پوری کائنات بے جان ہے؟ کیا انسان کا اپنی ذات کے علاوہ کائنات کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں؟ کیا انسان کائنات کی دوسری اشیاء سے متاثر نہیں ہوتا؟ کیا چرندوں، پرندوں اور دوسری مخلوق میں جان نہیں؟ کیا نباتات و جمادات بالکل بے جان ہیں؟ مختلف اربابِ سائنس مدتوں سے اِس چھان بین میں لگے ہوئے ہیں کہ نباتات و جمادات میں بھی زندگی کے آثار ہیں۔ اگر اِن باتوں کو نظر انداز کر بھی دیا جائے تو کیا یہ صحیح نہیں کہ آرٹسٹ کا انسانی زندگی کے علاوہ کائنات کی پوری زندگی سے تعلق ہے اور کیا کائنات کی رنگا رنگ جلوہ آرائیوں سے آرٹسٹ متاثر نہیں ہوتا؟ کیا چاند، ستاروں، چاندنی، شفق، پھولوں اور حُسن، و عشق سے انسان کا کوئی تعلق نہیں؟

اگر یہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں تو ایسی صورت میں انسان کی صرف معاشرتی، معاشی و سیاسی زندگی ہی کو "زندگی" کے نام سے تعبیر کرنا اور فقط اِن ہی مسائل کے بیان یا حل کو شاعری قرار دے دینا کہاں کی دانش مندی ہے؟ انسان کے بنائے ہوئے ادارے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، لیکن قدرت کے بنائے ہوئے بنیادی اُصول کبھی نہیں بدلتے۔ انسان ابتدا میں بھی وہی تھا جو آج ہے۔ اُس کے بنیادی جذبات و احساسات آج بھی وہی ہیں جو عہدِ قدیم میں تھے۔ اگر فرق ہوا ہے تو صرف اِن جذبات و احساسات کی نکاسی کے خارجی راستوں میں!! انسانی تاریخ کا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ انسان کی فطرت نہ پہلے بدلی تھی، نہ اب بدلی ہے، اور موجودہ اور پچھلے تجربے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسانی فطرت آئندہ بھی کبھی نہیں

بدل سکتی، اگر کوئی چیز بدل جاتی ہو تو وہ صرف انسانی نقطۂ نظر ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انسانی زندگی کا مقصد قدرت کے اسرار کا کھوج لگانا ہو۔ انسانیت کی تاریخ ترقی میرے اس بیان کی شاہد ہے۔ چونکہ شاعر انسانی سماج کا ایک فرد ہو اس لئے بہ حیثیت انسان، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو آگے بڑھانے میں اُسے بھی حصّہ لینا چاہیے۔ چونکہ اُس کے پاس اِن مسائل کو بیان کرنے یا سلجھانے کی خاطر شاعری کے حربہ کے سوا اور کچھ نہیں لہٰذا اگر وہ اِن مسائل کو اپنی شاعری میں بیان کرے تو وہ صرف اِس قدر اور اِس حد تک ہو جیسے وہ کسی نیک مقصد کی راہ میں کوئی قربانی کر رہا ہو اگر اُس نے صرف اِن مسائل کے بیان یا حل کو اپنے آرٹ کا مقصد قرار دے دیا تو ان مسائل کے سلجھ جانے کے بعد دُنیا اُس کی شاعری کو طاقِ نسیاں میں رکھ دے گی اور اُس کے زمانے بھی وہ لوگ جنہیں اِن مقاصد سے ہمدردی نہ ہوگی اُس کی شاعری کو دو کوڑی میں بھی نہ پوچھیں گے؟ میری رائے میں شاعری کا مقصد کائنات کے حُسن کو دیکھ کر اپنے مشاہدے کے بُرش اور تخیل کے رنگ سے ایک ایسی جذباتی تصویر کھینچنا ہو جس پر زمان و مکان کے اُلٹ پھیر اثر انداز نہ ہوسکیں، اور جسے دیکھ کر انسانیت تاقیامِ قیامت لُطف اُٹھا سکے۔ کیا خواجہ حافظ اور کالیداس کی شاعری میں کسی معاشرتی، سیاسی یا معاشی گتھی کو سلجھایا گیا ہے؟ کیا صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی ہم اُن کی شاعری کو پڑھ کر لطف حاصل نہیں کرتے؟ حقیقی شاعری کا مقصد تلاشِ حُسن کے سوا نہ پہلے کچھ تھا اور نہ اب کچھ ہوسکتا ہو۔ دُنیا میں انقلابات آتے اور چلے جاتے ہیں مگر زندگی میں کچھ ایسی بھی چیزیں ہیں جن کی حیثیت ازلی و ابدی ہو، اِن پر دنیاوی انقلابات کا کوئی اثر نہیں پڑتا، انسان کو ازل سے لے کر اب تک جس چیز نے سب سے زیادہ سکون پہونچایا ہے وہ حُسن ہو۔ مزدور سے لے کر سرمایہ دار اور جاہل سے لے کر عالم تک سب ہی حُسن سے لطف اُٹھاتے ہیں، فرق صرف اتنا ہو کہ کوئی حُسن سے کم لطف اُٹھاتا ہے اور کوئی زیادہ، اِس جگہ سوال یہ پیدا ہوتا ہو کہ حُسن کہاں ہو؟ حُسن قدرت کے نگار خانے، انسان اور دوسری مخلوقات میں پنہاں ہو۔ اب یہ دیکھنے والے کی نظر کا کام ہو کہ وہ اپنے مذاق کے مطابق حُسن کو کہیں بھی تلاش کرلے ؎

پسند اپنی اپنی، نظر اپنی اپنی!!

ہومر نے اہلِ یونان کی بہادری میں، فردوسی نے قدیم ایرانی جنگ جوؤں کے شاندار کارناموں میں اور کالیداس نے قدرتی مناظر، موسموں کے تغیر اور کُسم اور کمودنی میں اِس جاودانی حُسن کو ڈھونڈھ نکالا، اور صوفی شعراء نے روحانیت کے سمندر میں ڈوب کر "جمالِ مطلق" کی تلاش شروع کی۔ اگرچہ حُسن کی تلاش میں اِن سب کا نقطۂ نظر جداگانہ ہو مگر سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو شاعری میں پیغام کی تلاش کرتے ہیں، شاعر کوئی پیغام بر[1] نہیں وہ ایک آرٹسٹ ہو، جس طرح مصوّر رنگ

---

[1] اگر کوئی فطری شاعر اپنے "آرٹ" کے ذریعہ کوئی پیغام بھی دیتا ہو اور اُس کے کلام میں وہ حُسن بھی پایا جاتا ہو جسے ہم "شعریت" کہتے ہیں تو یہ اور اچھی بات ہو، یہی وہ مقام ہو جہاں شاعر مصوّر اور مغنی سے بلند ہو جاتا ہو! (م - ق)

اور برش کی مدد سے کینوس پر تصویر اتارتا ہے اُسی طرح شاعر مشاہدے کے رنگ اور تخیل کے بُرش سے لفظی تصویر بناتا ہے۔ اگر کوئی شاعر اپنی شاعری کے ذریعہ کوئی خاص پیغام دیتا ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ یا تو اس کی منزلِ مقصود شاعری نہیں ہے بلکہ وہ شاعری کے رُوپ میں کسی خاص خیال کی اشاعت کر رہا ہے یا یہ ہے کہ اُسے شاعرانہ تحریک ہمیشہ اسی ایک خیال کے تحت ہوتی ہے۔ آجکل بعض حضرات نے شاعری کو قدیم اور جدید کے نام سے دو حصّوں میں تقسیم کرنے کا فیشن اختیار کر لیا ہے۔ میری نظر سے اب تک کوئی ایسی تحریر نہیں گزری جس سے صاف و صریح طور پر یہ سمجھ میں آ سکے کہ جدید شاعری سے اِن حضرات کی کیا مراد ہے اور قدیم شاعری کس کو کہتے ہیں؟ حقیقی شاعری نہ کبھی قدیم تھی نہ جدید، وہ ہمیشہ صرف شاعری تھی اور ہمیشہ محض شاعری ہی رہے گی!! "شکنتلا" "ڈیوائن کامیڈی" "شاہ نامہ" اور "ایلیڈ" چمنستان شاعری کے وہ سدا بہار پھول ہیں، جن سے انسانیت صدیوں سے لُطف اندوز ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ شاعری کے یہ وہ شاہکار ہیں جن پر موجودہ زمانے کی سب کی سب "جدید" نظمیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ جس طرح انسان کے ظاہری خدو خال اور اندازِ فکر میں تبدیلی ہو سکتی ہے مگر انسانی جذبات و احساسات کی بنیاد تبدیل نہیں ہوتی اُسی طرح حقیقی شاعری کا لباس بدل سکتا ہے رُوح نہیں بدلتی!!

اِس زمانے میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں انقلاب برپا ہے، اُردو شاعری کا لباس بھی اِس سے متاثر ہے۔ ہماری شاعری کے اسلوب اور ٹیکنیک دونوں میں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں، میں زندگی کے تمام شعبوں میں نئے تجربوں کا سختی سے حامی ہوں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر نئے تجربے کسی اُصول کے تحت ہوں تو وہ رحمت ثابت ہوتے ہیں ورنہ زحمت بن جاتے ہیں۔ ہمارے نوخیز شعراء کو جدّت طرازی سے پہلے دوسری منجھی ہوئی زبانوں کے عروض و قوافی کے قواعد اور اصنافِ سخن کا بغور مطالعہ کرنا اور سوچنا چاہیئے کہ اِنہیں کن اصولوں پر وضع کیا گیا ہے، اور اُردو شاعری اِن سے کہاں تک فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ ہر زبان کی اپنی ایک فطرت اور اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ دوسری زبانوں کے تمام اصنافِ سخن اور عروض و قوافی کے قاعدے اُردو میں رائج ہو سکیں اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ کسی اور زبان کی کوئی صنفِ سخن یا عروض و قافیہ کا کوئی قاعدہ اُردو میں نہیں لیا جا سکتا، مگر اِس قسم کا کوئی نیا تجربہ کرنے سے پہلے اپنی زبان کی فطرت، مزاج اور سانچے کو سمجھنا نہایت ضروری ہے، اگر اُردو شاعری کے اصنافِ سخن اور عروض و قوافی کے قاعدوں میں سوچ سمجھ کر نئے تجربے کئے گئے تو اِس سے ہماری شاعری کے دامن میں بہت بڑی وسعت اور اظہارِ بیان کے نئے نئے پیرائے پیدا ہوں گے ورنہ یہ جدّت بدعت بن جائے گی اور بجائے فائدے کے شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچ جائے گا، اور اِس کی مثال اُس مشہور نقلی انسان فرنکنسٹین کی ہو جائے گی جس نے اپنے مُوجد کو کچھ فائدہ پہونچانے کے بجائے اُسے ملکِ عدم کی سیر کرا دی تھی!!

ترجمہ:- حسن مثنیٰ ندوی!

عورتیں مرد نہیں ہیں!

مخلص مکرم ...... ماہر　　السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اس سے قبل جو مضمون "انسان تاریخ ساز ہے" کے عنوان سے آپ نے اپنے رسالہ میں شائع کیا تھا وہ یورپ کے ایک بہت ہی بڑے مفکر و مورخ پروفیسر ٹوئن بی، کا تھا اور اس کا ماحصل یہ تھا کہ اس مادی دنیا کو تباہی سے بچانے کیلئے روحانیت کا احیا بیحد ضروری ہے ـــــ عورتوں کا تذکرہ اس میں ضمناً آیا تھا۔ لیکن آپ نے سرخی میں اسے بھی ابھار کر پیش کیا اور خاص طور پر لوگوں کی توجہ ادھر مبذول کرادی۔ اسی وقت سے خیال تھا کہ اب کے کوئی مضمون ایسا منتخب کروں جو شروع سے اخیر تک عورتوں ہی کے ذکر خیر سے معمور ہو چنانچہ لیجئے یہ ترجمہ حاضر ہے، حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ مضمون ایک عورت ہی کا ہے، مضمون نگار کا نام ہے AGNESS E MEYER یہ پانچ بچوں کی ماں ہے اور آٹھ پوتے نواسیاں اس کے ہیں خود گریجویٹ ہے Barnard college کی اور اب اس کی ٹرسٹی ہے نیز وہ رکن ہے نیشنل سیٹی زنس کمیشن فار پبلک اسکولس National citizens commission for public schools کی اور پریسیڈنٹس کمیشن آن ہائر ایجوکیشن President's commission on Higher Education کی اور مڈ سینچری وہائٹ ہاؤس چائلڈ کانفرنس The mid century white house child conference کی ـــــ اس لئے یہ ایک بہت ہی بلند مرتبہ و مقام کی عورت ہے، اور یہ مضمون ملخص ہے اس خطبہ کا جو اس نے ایک بلند مرتبہ عورت ہونے کی حیثیت سے Harvard university میں دیا تھا ـــــ مضمون بالکل صاف اور خطاب براہ راست ہے اس لئے کسی قسم کے مزید تبصرہ کا محتاج نہیں ہے۔ اگر آپ قابل سمجھیں کہ اس سے کچھ فائدہ قارئین کرام کو پہونچ سکتا ہے تو بسم اللہ درج اشاعت کیجئے، بعض اور مضامین بھی اسی قسم کے نشان زدہ رکھے ہوئے ہیں، آئندہ وہ بھی حاضر خدمت کر دونگا، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ والسلام

مخلص حسن مثنیٰ ندوی
۲۰ / اکتوبر ۱۹۵۱ء

یوں تو عورتوں کے لئے بھی بود و باش کی صورتیں بہت سی ہیں کیونکہ وہ بھی مختلف مشاغل، کام کاج اور پیشے اختیار کر سکتی ہیں لیکن اصل میں ان کا فریضۂ طبعی اور منصب حقیقی ایک ہی ہے یعنی امومت، یا ماممتا —— ایک عورت اگر اپنے فطری جذبۂ امومت اور ”جبلت مادرانہ“ کو اپنی زندگی میں پوری اہمیت کے ساتھ پیش نظر رکھے تو وہ ایک فیاض اور سرسبز و شاداب زندگی حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتی ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ عورت اگر اپنے تقاضائے طبعی و جبلی کے تابع رہ کر بسر کرے، تو اس کی زندگی، لازماً مفہوم زندگی کی تمام تر دسعتوں اور برکتوں کی حامل ہو سکتی ہے، یہ فریضہ عورت ہی کا ہے کہ وہ بہ حیثیت ماں —— خواہ وہ اس وقت واقعی ماں ہو نہ ہو —— اس غیر محفوظ دنیا میں، جذبات کا تحفظ و تیقن از سرِ نو حاصل کرے اور ان کے بقا کی ضامن ہو،

یہ عورت ہی تھی جس نے زمانۂ ماقبل تاریخ سے، گھرانے کو، معاشرے کو اور خود زندگی کو ایک ساتھ سنبھالے رکھا ہے، یہ اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اور یہ کارنامہ اس نے اپنی اسی مخصوص تحریک طبعی کی بنا پر انجام دیا ہے کہ خود اسے اپنے دورانِ حمل میں تحفظ و سکون کی ضمانت حاصل رہے اور جب اس کے بچے ہوں تو بچوں کو بھی ان کی دیکھ بھال کی عمر تک حفاظت و صیانت کا ماحول میسر رہے۔ یہ عورت ہی تھی جس نے استحکامِ خانوادہ کی اس بنیادی طلبِ احتیاج کے سہارے، انسانی روابط و تعلقات کے فن کو ترقی دی تھی اور انسانی وضع و سلوک کی حیات افروز اہمیت اور اس کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا تھا۔ اور آج پھر ضرورت ہے کہ عورت اس حقیقت کو از سر نو محسوس کرے اور پوری طاقت کے ساتھ محسوس کرے کہ صرف وہی ہے جو نئے اخلاقی معیار و شعار کو —— ایسے اخلاقی معیار و شعار کو جو عہدِ جدید کے حالات سے مطابقت رکھتے ہوں —— حاصل کر کے، ہمارے تمدن کو تخریب و تباہی کی نذر ہونے سے بچا سکتی ہے۔

ایک بیوی کا اور ایک ماں کا منصب جس قدر واضح اور اٹل ہے اتنا ہی دشوار بھی ہے، —— اس لئے ”فقط گھر والی“ ہونے پر شرمندہ و خجل اور معذرت خواہ ہونے کے بدلے —— جیسا کہ بہت سی عورتوں کا حال ہے —— ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے اور سماج کو یہ محسوس کرا دیا جائے کہ ماہرین مالیات، ماہرین پرورش و پرداخت ماہرین علم معاشرت ماہرین علاج ذہنی، اور ماہرین تعلیم و تربیت، سب کی مشترکہ ذمہ داری و اہم اور مجموعی فرائض تنہا گھر والی ہی کے سر عائد ہوتے ہیں، یعنی وہ اکیلی ہی سب کچھ ہے، جب یہ باور کرا دیا جائے گا جبھی سوسائٹی بھی گھر والی کو وہ اعزاز و توقیر اور منصب و مقام عطا کرنے پر آمادہ ہوگی جس کی وہ مستحق ہے۔ لیکن آج حالت کیا ہے؟ معمار خانہ (House maker) کی ذمہ داریاں اتنی حقیر و بے توقیر ہو کر رہ گئی ہیں کہ بہت ساری عورتوں نے اس سے متاثر ہو ہو کر اپنے گھروں سے باہر نکل کر کام کرنے شروع کر دیئے ہیں حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ان کا گھروں سے باہر نکل نکل کے کام کرنا اقتصادی اور مالی طور پر بالکل ضروری نہ تھا، —— مگر وہ تو یہ سب کچھ فقط اس لئے کر رہی ہیں کہ سمجھتی ہیں، قوم کی نظروں میں انھیں کچھ عزت کی جگہ مل سکتی ہے تو اسی طرح مل سکتی ہے یا ان کی کچھ قدر و قیمت قائم رہ سکتی ہے تو بس اسی صورت سے رہ سکتی ہے،

عورتوں کو پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ ”کوئی کام، کوئی خدمت، کوئی فریضہ اتنا واضح، اتنا درست اور مکمل یا اتنا ضروری اور اہم نہیں ہے جتنا وہ فریضہ جو ایک گھر والی کا اور ماں کا ہے“ —— اور صرف یہی ایک صورت ہے کہ عورتیں اپنے گھروں کو مضبوط اور مستحکم کر کے ایک مرتبہ پھر سوسائٹی کی ”اخلاقی طاقت“ بن سکتی ہیں، لیکن یہ جب ہی ہوگا کہ وہ پہلے خود بھی اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ”عورت ہونے کی حیثیت سے ان کے فرائض و اعمال، مردوں کے فرائض و اعمال

سے قطعی مختلف اور جداگانہ ہیں: ماڈرن عورت کو یہ عقل ایک مرتبہ پھر حاصل کرنی پڑے گی کہ عورت کا عورت ہونا ہی دراصل اس کی حقیقی اور مرکزی مہم ہے اور عورت کا عورت ہونا ہی اس کا سب سے بڑا شرف اور بڑا اعزاز ہے۔

شکر ہے کہ اب اپنے اردگرد جب ہم نظر دوڑاتے ہیں تو اُمید افزا علامتیں نمایاں نظر آتی ہیں، عورتوں کو اور بالخصوص ان عورتوں کو جو نوجوان ہیں اور جن کی نئی نئی شادیاں ہوئی ہیں، ان بنیادی صداقتوں کا احساس ہونے لگا ہے، روزافزوں شرح پیدائش یقیناً ایک اُمید افزا علامت ہے، اس کے علاوہ بہت ساری نوجوان عورتیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو اپنے شوہر کے، بچوں کے اور خانہ داری کے عملی فرائض بڑی دل چسپی اور بڑی ذہانت وقابلیت کے ساتھ، خوشی خوشی انجام دے رہی ہیں، غالباً کسی تمدن میں بھی ایسی مثالی قسم کی ازدواجی رفاقت زندگی اتنی زیادہ کبھی نہ رہی ہوگی جس میں بیوی میاں دونوں ایک دوسرے کے دائرۂ عمل کا اس طرح اور اس قدر احترام کرتے ہوں اور اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داریوں میں بھی برابر کے حصہ دار ہوں،

دوسری طرف، شاید اتنی زیادہ عورتیں بھی کبھی ایسی نہ رہی ہوں گی جو اپنی ازدواجی زندگی اور مشاغل Career کے درمیان خواہ مخواہ اتنی زیادہ منقسم ہوں، یا اتنی ساری مائیں جو اپنی بچوں کی طرف سے اس بُری طرح غفلت برت رہی ہوں، جتنی آج ہیں، وہ بھی صرف اس لئے کہ چند فضول قسم کے کام کاج اور مشاغل سے ان کو زیادہ دلچسپی ہے یاد رکھئے کہ انتہائی دردناک طور پر غفلت کا شکار عموماً وہی بچے ہوتے ہیں جو اچھے گھرانوں کے ہیں، غریب ماؤں کو تو بہرصورت کوئی نہ کوئی کام کرنا ہی ہے اس لئے ان کے بچوں کو ایک قسم کی باطنی تسکین وضمانت (Inner Security) حاصل رہتی ہے کیونکہ وہ بچے دل ہی دل میں یہ محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کی مائیں خود ان ہی کی بھلائی کیلئے اپنے آپ کو قربان کر رہی ہیں، لیکن اچھے گھرانوں کے جو بچے غفلت کا شکار ہوتے ہیں، ان کا معاملہ برعکس ہے، ان کو طبعی طور پر احساس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی مائیں دراصل اپنے مشاغل اور اپنی دلچسپیوں کو اُن پر ترجیح دیتی ہیں، اور اس احساس کی بنا پر ان کی طبیعتیں جھنجھلاتی ہیں، ان کے دلوں میں اپنی ماؤں کی طرف سے ایک قسم کی نفرت روز بہ روز جڑ پکڑتی چلی جاتی ہے، پھر یہی بچے ایک دن اپنے اسی دبے ہوئے اندرونی غم وغصہ کی بدولت بلاتکلف بدترین خرابیوں میں پڑ جاتے ہیں،

آخر یہ کیا روگ ہے کہ عورتیں اپنے بچوں کو اس طرح نظرانداز کر دیتی ہیں؟ —— صرف سطحی موثرات، مقابلہ ومسابقت (Competition) کے محرکات، اس مادی (اور غیر روحانی) دنیا کے داعیات —— جو بالآخر ان کے جذبات کو کُھلا ڈالتے ہیں اور احساسات کو پژمردہ کر دیتے ہیں، اور ان کے باطنی ردّعمل اور تاثر کو تباہ کر دیتے ہیں برباد کر دیتے ہیں، ایسی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ خود بین وخود پرست ہیں، ایسی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ جارحانہ انداز ومزاج کی حامل اور بے حس "مشین" ہیں جو مردانہ پن کو جانے بوجھے بغیر ہی مرد بن بیٹھی ہیں، اور فطری بالیدگیٔ جذبات اور قدرتی نمو پذیریٔ احساسات کی اس عام پستی و پژمردگی کا شکار ہیں جو آج ہمارے تمدن میں عام سی ہو رہی ہے جی ہاں، ہمارا یہ سائنٹفک عہد، احساس (لطف وکرم) سے ڈرتا ہے خوف کھاتا ہے، ورنہ کیا بات ہے، اس کا سبب کیا ہے کہ ان کتابوں کا ایک سیلاب ہے کہ اُمڈا پڑ رہا ہے جن میں جرائم نوجوانی، معاصی، شباب، اور فرض شکنی کی داستانیں بھری پڑی ہیں، اور جن میں آپ دیکھیں گے کہ یکساں طور پر، ایک ہی

آہنگ و انداز سے بہ اصرار تکرار یہ بات درج ہوتی ہے کہ "بچوں کو اگر واقعی مستحکم و پائدار شخصیتوں کے قالب میں ڈھالنے کی تمنا ہو تو اس کے لئے لازمی شرط یہی ہے کہ ان کے قلوب میں سب سے پہلے اس احساس و یقین کو راسخ کیا جائے کہ وہ مطلوب ہیں، محبوب ہیں، اور ان کے والدین ان سے واقعی محبت رکھتے ہیں ان کو چاہتے ہیں" ؟ ———

میں اس کوشش میں نہیں ہوں کہ تمام عورتوں کو واپس پھر گھر میں بھیج دیا جائے، جی نہیں، بلکہ میری رائے ہیں، وہ شادی شدہ عورتیں جو گھریلو زندگی سے باغی ہوں، ان کا تو گھروں کے اندر رہنا بھی بچوں کے لئے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مضرت رساں ہے جتنا ان بچوں کا کسی مہربان و شفیق رشتہ دار کے سپرد کرکے چھوڑ دیا جانا یا کسی بورڈنگ اسکول کے حوالے کرکے بے نیاز ہو جانا ان کے لئے مضرت رساں ہو سکتا ہے، یہ عورتیں تو خود اپنے دائرۂ عمل میں بھی اثرات کے لحاظ سے ویسی ہی تباہ کن ہیں، خدا ہم سب کو ایسی عورتوں سے محفوظ ہی رکھے جو بڑی مستعد، بڑی قابل اور کامیاب قسم کی تاجر واقع ہوتی ہیں، اور جن کی نسوانیت پامال اور بنجر اور بانجھ ہو کر رہ گئی ہے۔ عورتیں جہاں کہیں بھی ہوں، خواہ گھروں میں ہوں یا ملازمتوں پر، ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ عورت ہونے کی حیثیت سے ان کا صرف ایک ہی کام اور ایک ہی مقصود ہے اور وہ ہے فیاضانہ ارتباط انسانی اور گرم جوشانہ تعلقات و قرابت کی صلاحیت و اہلیت۔

میری رائے میں حلم و انکسار اور فروتنی، سب سے بڑا امکانی سرمایہ ہے جو کسی فرد انسانی اور بالخصوص کسی عورت کو، ودلیعت ہوا ہو، یہ ایک ایسی صلاحیت و اہلیت ہے جس کے ذریعے ہم ان حقائق کو "پہچانتے" ہیں جن سے ہمارا سامنا ہوتا رہتا ہے، خارجی حالات سے مطابقت و ہم آہنگی پیدا کر لینے کی یہ صلاحیت ——— مثلاً ازدواجی زندگی میں داخل ہوتے ہی اپنے شوہر سے ہم آہنگ ہو جانا، یا معاملات کی زندگی میں قدم رکھتے ہی اپنے آقا یا دوسرے رفقائے کار سے مطابقت و موافقت پیدا کر لینا ——— کمزوری کی علامت نہیں بلکہ طاقت و توانائی کی علامت ہے، وہ عورت جو صورتِ حال کو قابو میں کرنے کے لئے طاقت استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہے، یا ہر انسانی رابطہ و تعلق میں جارحانہ انداز سے ہاتھ ڈالتی ہے، وہ کمزور عورت ہے اور اس طرح درحقیقت وہ اپنی کمزوریوں کی تلافی کرنا چاہتی ہے۔

یہی وہ پریشان و بے قرار، نامکمل و ناقص عورتیں ہیں جو آج بڑے تلخ انداز میں شکوہ کناں ہیں کہ حکومت میں اور تجارت میں اقتدار و اختیار کے مناصب پر کافی عورتیں نہیں ہیں، مگر سُن لیجئے کہ یہ عورتیں وہ ہیں جن کے ماتحت نہ تو کوئی عورت ہی کام کرنا پسند کر سکتی ہے نہ کوئی مرد ——— متوازن و معتدل اور مکمل عورت اپنے باطنی خزائن اور ذاتی صلاحیتوں سے باخبر ہوتی ہے، وہ مردوں کی بے انصافی کا شکوہ کبھی نہیں کرتی۔ بلکہ خاموشی کے ساتھ اپنے اثر و اخلاق کا دامن وسیع کرتی ہے، اسی لئے جہاں کہیں کوئی ایسی عورت برسر عمل ہوتی ہے اس کی قدر ہوتی ہے، اس لئے نہیں کہ وہ اپنے کام کا کچھ اعتراف چاہتی ہے بلکہ اس لئے کہ اس کی خدمات و اوصاف واقعی غیر معمولی اور بیش قیمت ہوتے ہیں، اس قسم کی مستثنیٰ عورتوں کی صفتِ عالیہ کی توضیح اگر مجھ سے پوچھی جائے تو میں عرض کردوں گی وہ صرف یہ ہے کہ ان کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ ان سے اگر زندگی کے کچھ کارنامے انجام پاتے ہیں تو وہ کبھی مغرور نہیں ہوتیں، اور اگر وہ زندگی کی مشقتوں اور مصائب میں مبتلا ہو جاتی ہیں تو کبھی یاس و قنوط کو اپنے پاس تک پھٹکنے نہیں دیتیں ———

نوجوان طبقہ اس فکر میں آج بڑی غلطاں ہے کہ مقابلہ و مسابقت (completion) کی اس سوسائٹی میں اگر اپنے لئے کوئی جگہ پیدا کرنی ہے تو اس کے لئے جارحانہ انداز و اقدام ضروری ہے، لیکن یہ بات عورت کے لئے قطعی نادرست ہے، چاہے وہ بوڑھی ہو یا جوان ـــــ دنیا آج جس چیز کی محتاج ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اور زیادہ مقابلے اور مسابقتیں ہوں، بلکہ دنیا کو تو عورت کی خلقی و جبلی ذہانت و فطانت اور ادراک کی ضرورت ہے۔ ہمدردانہ تعاون و امداد کی خاطر ـــــ پرائیویٹ مساعی کے درمیان بھی، کارخانہ داروں اور مزدوروں کے درمیان بھی، متحارب و متصادم مذہبی جماعتوں کے درمیان بھی، گھرانوں اور فرقوں کے درمیان بھی، بلکہ خود افراد و افراد کے درمیان بھی، ہمدردانہ تعاون و امداد کی ہر جگہ ضرورت ہے، لہٰذا عورت کے لئے آج واقعی سب سے بڑا موقع میسر ہے، وہ ماڈرن زندگی کی خطرناک اور مہلک و مزمن کشیدگیوں اور کشاکشوں کو کم کرسکتی ہے، ان کی شدت و حرارت کو سکون پذیر بنا سکتی ہے،

یقیناً میں عورتوں سے یہ مطالبہ نہیں کر رہی ہوں کہ وہ اپنی کم تحتی اور ذلتِ نفس کی حد تک ایثار و قربانی گوارا کرلیں، لیکن ان کو عزتِ نفس اور ایثارِ نفس، سوشیل فرائض اور بایولیجیکل (Bio-logical) فرائض دونوں کو توازن و اعتدال کے ساتھ برتنے کا سلیقہ ضرور سیکھنا چاہیئے۔ اور جو عورتیں یہ سلیقہ رکھتی ہیں، وہ اس "ماڈرن" چیخ پکار سے جو مساواتِ حقوق اور برابری کے نام سے بلند ہو رہی ہے، کوئی واسطہ نہیں رکھتیں، کیونکہ ان کو خود اپنے اوپر اعتماد ہے، اور اس حقیقت پر اعتماد ہے کہ وہ دنیا کو کچھ عطا کرنے والی ہیں، وہ مردوں کی برابری ([illegible]) نہیں بلکہ مردوں کی رفاقت (Partnership) چاہتی ہیں۔

مساواتِ حقوق کی یہ چیخ پکار، بے شمار پہلوؤں سے، ایک مہلک تصور و عقیدہ (Pernicious doctrine) کی حامل ہے، اور اس کے اثرات بالخصوص دو شعبوں میں تو سب سے زیادہ مضرت رساں ہیں، یعنی جنسیات (sex) اور شادی (marriage) کے معاملات میں۔ یہ واقعہ ہے کہ جنسی کردار کسی زمانے میں بھی اتنا پست نہیں رہا ہے جتنا آج ہے، برابری کی طلب میں عورتوں نے تو اپنے معیارِ بلند کو قعرِ تنزل تک پہونچا دیا ہے، یہ جنسی آزادی جو آج بہت سی عورتوں کی جولان گاہِ عمل بنی ہوئی ہے، سراسر فریب ہے، دھوکا ہے، عورت کی جنسیات کو ـــــ اگر وہ خود عورت کے لئے اور سوسائٹی کے لئے موجبِ تخریب و تباہی نہیں ہے ـــــ تو لازماً مردوں کی جنسیات کی بہ نسبت زیادہ روحانی (اور پاکیزہ) ہونا چاہیئے۔

عورت اگر اپنے جسمانی نشو و نما اور لوازم و آراستگی کے بالمقابل زمانہ ماقبل بلوغ ہی سے اپنے کردار، اپنے ذہن و دماغ اور اپنے افلاطونی (ملکوتی و غیر نفسانی) تصورات کی پرورش و تہذیب اور تربیت و ترقی کا سامان نہیں کرتی اور یہ عمل اس کے اندر جاری نہیں رہتا تو سمجھ لو کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو توڑتے مڑوڑتے رہنے اور ساری عمر بھٹکتے پھرنے کا خطرہ مول لے رہی ہے، خود اس کے اندر جیسے جیسے تبدیلیاں رونما ہوتی جائیں ویسے ویسے اگر وہ اپنی جنسیاتی زندگی میں اقدار کی تبدیلیوں کی بھی طالب ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اس ارتباطِ انسانی کی اس صلاحیت کو بھی زہر آلود کر رہی ہے جو اس کے اندر موجود ہے (یا ہونی چاہیئے) جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پائدار ازدواجی زندگی سے اس کی ساری دلچسپی ختم ہو جائے گی وہ عورت جو اپنی جنسی زندگی کی پاسبانی و حفاظت اس نقطۂ نظر سے کرتی ہے کہ اس سے جس قدر خود اس کی اپنی تہذیبِ نفس و ترقی وابستہ ہو اتنی ہی بہ حیثیت مجموعی ساری انسانیت کی تہذیب و ترقی بھی وابستہ ہے، تو وہ جنسیاتی زندگی کی بلندترین

منزل کے حصول میں بھی کامیاب ہوسکتی ہے۔ ایسی عورت اپنی طرف لوگوں کو بے اختیار کھینچے گی، بے انتہا کشش اس کے اندر ہوگی، اور وہ اپنے صحیح قسم کے شوہر کی والہانہ کیفیات و جذبات اور پرستش تک کی نعمتوں سے مالا مال ہوگی۔

یہ حقیقت ہے کہ آج جو نوجوانوں کو ان کی عام زندگی گزارنے میں بالعموم، اور جنسی زندگی بسر کرنے میں بالخصوص کوئی رہبری و رہنمائی میسر نہیں ہے تو اس کی ساری ذمہ داری بالغوں کی دنیا پر عائد ہوتی ہے، آجکل نوخیزوں تک میں جنسی تجربات کی جو کثرت اس بُری طرح عام ہورہی ہے، اس کی طرف بھی بہت ہی کم بلکہ سرے سے کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی۔ سبب واضح ہے یعنی "بالغ دنیا" اس مسئلہ میں خود اپنی ہی روش کے بارے میں غیر متیقن اور مذبذب ہے،

ادب میں، اشتہارات میں اور فلموں میں جنسیات کو جس شدّت کے ساتھ اور غیر صحت مندانہ طریقے پر، اُبھار اُبھار کر پیش کیا جارہا ہے، اس نے تو اب "نمودِ جنسی" کو بھی دوسری چیزوں کی طرح مقابلہ و مسابقت (competition) کا معاملہ بنا دیا ہے، اور نوجوان عورتوں کو یہ ڈر سا ہوگیا ہے کہ آج اگر وہ اس پست قسم کے جنسی معیار کو تسلیم کرنے سے انکار کردیں تو پھر شاید انھیں کوئی مقبولیت و ہر دلعزیزی حاصل ہی نہ ہوسکے گی۔

بہر کیف ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ سلبی یعنی مقدسانہ و زاہدانہ رہبانیت (یا ترکِ دنیا) کی نہیں بلکہ ایجابی یعنی عمل صالح کی سرجوشی و گرم کوشی کی ہے، جنسی انحرافات کا بہترین علاج یہی ہے کہ بچوں کی شروع ہی سے تربیت کی جائے ہمارے اس مرکب و پیچیدہ تمدن میں اگر بچّوں کے ذہن و جذبات اور کردار کی تعلیم و تربیت، ان کی احتیاجات کی مطابقت و موافقت کے ساتھ کی جائے تو پھر قریب البلوغ لڑکوں اور لڑکیوں اور جوان مردوں اور عورتوں کے اندر ایسی حیات افزا قسم کی دلچسپیوں کا پیدا ہوجانا لازمی ہے جن کی بدولت شخصیت کے نشو و نما اور ارتقاء کے حصول میں، ان کی جنسیات اپنی نکاس کے لئے اعلیٰ صورتیں اور راہیں پیدا کرلیں گی کیونکہ نوجوانوں کا، قبل از وقت اور بہت ہی زیادہ جنسیات سے دلچسپی لینے لگنا بڑی حد تک دراصل نتیجہ ہے دوسرے دائروں اور شعبوں میں ان کے افلاس و بے مائگی کا، یعنی یا تو ان میں شوقِ علم مفقود ہوگا، جان جوکھم میں ڈالنے اور کوئی مہم سر کرنے کا ذوق ناپید ہوگا، یا تخلیقی و فکری صلاحیتوں کی ترقی و نمود کا جذبہ اور ولولہ غائب ہوگا۔ بہر کیف یہ حقیقت سب سے پہلے عورتوں کو محسوس کرنی چاہیئے کہ اگر انھوں نے اپنے گھروں کو اور منظم سوسائٹی کے استحکام کو خطرے میں ڈال دیا، جس پر خود ان کی اپنی حفاظت و صیانت کا انحصار ہے، اور اپنی اس حیثیت کو فراموش کردیا جو اخلاقی اقدار کی سرپرست و نگراں و پاسبان ہونے کے اعتبار سے ان کا حقیقی منصب و مقام ہے تو اس سے کسی اور کو اتنا زیادہ نقصان ہرگز نہیں پہونچے گا جتنا خود عورتوں کو پہونچے گا،

اس واسطے کہ عورت اگر صرف تحفظ ذاتی کے لئے وحدت نکاح (MONOGAMY) کے اصول کو ضروری اور لازمی تصوّر کرتی ہے اور اپنے گھر کو خود اپنے لئے محفوظ و مخصوص رکھنا چاہتی ہے اور تنہا اپنی راج دھانی بنانا چاہتی ہے، تو پھر ازدواجی زندگی کی کامیابی کا بھی ذمہ دار خود اسی کو بننا پڑے گا اور بننا چاہیئے، بدقسمتی سے مساواتِ حقوق کی جد و جہد کی بدولت انانیت پرستانہ خواہشات عورتوں کی رگ و پٹھے میں اس قدر سرایت کر گئے ہیں اور ازدواجی زندگی کا نظم و ضبط (Discipline) اور انکسار و ایثارِ نفس (Subordination) جو اس نظم و ضبط کے لئے لازمی ہے، اور اپنی شخصیت کی وہ موافقت و تطبیق (adjustment) جس پر اس نظم و ضبط کا انحصار ہے یہ سب کچھ ان کے لئے روزافزوں طور پر دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا

جارہا ہے، وہ اسے مشکل تصور کرتی ہیں اور کٹھن سمجھتی ہیں، حالانکہ یقین کیجئے کہ ہم اس وقت تک کثرت طلاق کے تناسب کو ہرگز کم کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے جب تک کہ خود "ماڈرن عورت" مذکورہ بالا ذمہ داریوں کو قبول نہیں کرتی۔ فقط طلاق کو کچھ اور دشوار بنا دینے سے مطلق کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے برخلاف طلاق کو تو اور ان مواقع پر جہاں بدسلوکیاں اور بے انصافیاں بہت زیادہ اور ناقابل تدارک ہو گئی ہوں ممکن الحصول اور آسان ہونا چاہئیے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ نوجوان عورتیں اپنے آپ کو متوازن و معتدل نسوانیت کے سانچے میں ڈھال لیں، اور رفیق زندگی کا انتخاب بھی کسی طفلانہ گرفت کا، یا فقط جنسی جذب و کشش کا نتیجہ نہ ہو بلکہ اس نقطۂ نگاہ سے ہو کہ واقعی ایک مستقل اور دائمی رفاقت مطلوب ہے تو پھر کثرت بشیتر طلاق کی ضرورت ہی باقی نہ رہے گی، یہ سن لیجئے کہ شادیاں اگر خالص جنسی بنیاد پر کی جائیں گی تو پھر اسی بنیاد پر ان کا ٹوٹ جانا اور ختم ہو جانا بھی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک ایسا کھیل ہے جس میں عورت تو کبھی جیت ہی نہیں سکتی۔

اپنی سوسائٹی میں اخلاق کی تازہ رُوح پھونکنے اور کردار کو از سرِ نو زندہ کرنے کی یہ دعوت، کیا نسوانیت اور فرائضِ نسوانیت کے لئے کوئی بے جا، یا مبالغہ آمیز مطالبہ ہے؟ جی نہیں، جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے، بہت سی علامتیں اور آثار ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے طرز فکر میں تبدیلی و تجدید شروع ہو گئی ہے۔ شہادت کے طور پر جہاں اور دوسری بہت سی چیزیں موجود ہیں وہاں ان بیشمار کامیاب شادیوں کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے جو اس انداز کے "اعلیٰ نمونے" ہیں فرض کیجئے اگر آج ہماری ماڈرن سوسائٹی میں "اعلیٰ فریضہ نسوانی" کا ادا کیا جانا دشوار ہو تب بھی اس نازک عہد میں عورت کا "عورت ہونا" بھی بجائے خود بڑے مرتبے اور اعزاز کی بات ہے —— لیکن نہیں اب ایسا نہیں ہے، کیونکہ اب جبکہ تخریب دنیا ہی کا خطرہ ہمیں اندرونی بھی لاحق ہے اور بیرونی بھی، سوسائٹی میں عورت کے فرائض و مناصب کو بنیادی اور حیات افروز شے کی حیثیت سے پھر اسی طرح تسلیم کیا جا رہا ہے جیسے ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ بہ حیثیت ماں، عورت دراصل نمایندہ ہے اُس لازوال فتح مندی و کامرانی کی جو زندگی کو موت پر حاصل ہے ٭ ٭ ٭ ٭

کیفی جام پوری

مسلمان آگئے

اک ہاتھ میں صحیفہ قرآں لئے ہوئے
اور دوسرے میں خنجر عریاں لئے ہوئے
آنکھوں میں برقِ جلوہ ایقاں لئے ہوئے
سینوں میں رقصِ شعلۂ ایماں لئے ہوئے
سر خم حضورِ ایزدِ بے چوں کئے ہوئے
دل میں ولائے صاحبِ قرآں لئے ہوئے
ہر قول میں سناتے ہوئے امن کا پیام
ہر فعل میں نجات کا ساماں لئے ہوئے
ذرّے ہیں اور تابشِ خورشید در کنار
قطرے ہیں اور شورشِ طوفاں لئے ہوئے
پیغام مرگ روحِ شقاوت کے واسطے
انسانیت کے درد کا درماں لئے ہوئے
مژدہ ہو اہلِ دہر! مسلمان آگئے
جن کا تھا انتظار وہ انسان آگئے

سالِ نو

طالب حجازی

جذب و دردو شوق کا ہنگام لایا سالِ نو
اے مسلماں! عشق کا پیغام لایا سالِ نو
اک نیا دستور صبح و شام لایا سالِ نو
کج کلاہو! گردشِ ایام لایا سالِ نو
کٹ گئی گردن جھکی لیکن نہ پیشِ اقتدار
اُسوۂ شبیرؓ کا پیغام لایا سالِ نو
کشتِ دیں کی تازگی اور خونِ اولادِ علیؓ
صبحِ خنداں اور گریاں شام لایا سالِ نو

عزائم

ابو البیان حماد

کاشانۂ دل میں اُلفت کے فانوس جلا کر چھوڑیں گے
بچھڑے ہوئے سب انسانوں کو آپس میں ملا کر چھوڑیں گے
آثار و قرائن کہتے ہیں یہ دور بدلنے والا ہے
مظلوم کے نالے خوابیدہ محشر کو جگا کر چھوڑیں گے
طاغوت سے رشتہ توڑ چکے اللہ سے رشتہ جوڑ چکے
ہم جسم میں جب تک جان رہی یہ عہد نبھا کر چھوڑیں گے
ایمان و عمل کے ساتھ اگر اللہ کی نصرت شامل ہے
باطل کی حکومت دنیا سے اک روز مٹا کر چھوڑیں گے

سعادت نظیر

آبگینے

جاچکے صبر و سکوں، تاب و تواں اب کیا کروں؟
آئے ہیں سننے وہ میری داستاں اب کیا کروں؟
شمعِ کشتہ درخورِ آرائشِ محفل نہیں
تفتہ جاں، افسردہ دل رہ کر یہاں اب کیا کروں؟
یاد آتی ہیں مجھے فرہاد کی مایوسیاں
زندگی ہے سنگ کی صورت گراں اب کیا کروں؟
جلوہ فردا دکھا آئینۂ امروز میں
عہدِ ماضی کی ہیں سن کے داستاں اب کیا کروں؟

سیدھے رستے سے وہی لوگ بھٹک جاتے ہیں
اہلِ دل جن کی نگاہوں میں کھٹک جاتے ہیں
دور میں آئیں تو پیمانے چھلک جاتے ہیں
ضبط کرنے پہ بھی کچھ اشک ٹپک جاتے ہیں
میرے میخانے میں ایسوں کو نہ آنے دینا
ایک دو گھونٹ ہی پی کر جو بہک جاتے ہیں

جلی احمد دھوی

فراق و وصل تو جذبِ طلب پہ ہی موقوف
قفس کی قید میں کب آشیاں نہیں ملتا
ہمیں کو حیف نہیں شوقِ دید و ذوقِ نظر
وہ کس جگہ نہیں ملتا کہاں نہیں ملتا

نہال سیوہاروی

ہو گئی عمر بہاروں کے تصور میں تمام
سیر کرتے رہے نادیدہ گلستانوں کی

تابش دہلوی

کبھی ساقی نے سنبھالا، کبھی میخواروں نے
زہے تقدیر! چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

ماہر القادری

قدر کیا دہر میں جانے کوئی ویرانوں کی
جنتیں ہیں یہ ترے سوختہ سامانوں کی

قمر جلالوی:- ؎ شمع روشن ہوئی موت آگئی پروانوں کی

روش صدیقی:- ؎ مری آنکھیں ترا خوابِ فراموش

جبریل صدیقی

نوائے جبریل

چھلک جانے سے کیا گردش میں آ جانے سے کیا ہوگا
جو کام اُن کی نظر کا ہے وہ پیمانے سے کیا ہوگا

اُلجھ کے رہ گئی آخر کو زلفِ برہم سے
وہ اِک نگاہ جو بچتی رہی دو عالم سے

اے دوست انقلابِ محبت کی خیر مانگ
جو میری داستاں ہے تیری داستاں نہ ہو

صبحدم دوش پہ زلفیں تو پریشاں کیجئے
آپ چاہیں تو ابھی شام ہوئی جاتی ہے

مشاہداتِ جہاں میرے کام آئے ہیں
فریب جان کے میں نے فریب کھائے ہیں
گلوں کو حُسنِ تبسّم بھلا نصیب کہاں
چمن کی آڑ میں شاید وہ مسکرائے ہیں
چمن میں لالہ و گل چرخ پر مہ و انجم
ترے جمال کے ترتیب دار سائے ہیں

اے راہ رو بڑھے جا ہمّت ابھی جواں ہے
منزل سے پہلے رُکنا توہینِ کارواں ہے
گلشن میں ہے چراغاں لیکن مجھے خوشی کیا
جو شاخ جل رہی ہے وہ شاخِ آشیاں ہے

جو ھے ٹو نکی
عشق ہے نام دہکتی ہوئی چنگاری کا
عشق اک سوزِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
اشکِ خونیں کی حقیقت سرِ داماں اے دوست
غم کے افسانۂ مجمل کے سوا کچھ بھی نہیں

کوئی محرومِ نوازش نہ رہا حسبِ مذاق
کچھ نہ کچھ لے کے اُٹھا جو تری محفل سے اُٹھا
موج ٹکرا کے کناروں ہی سے گرداب بنی
جو بھی طوفان اٹھا، دامنِ ساحل سے اُٹھا

ماہر القادری

"روٹی"

شہر کے کونہ کونہ سے مزدور چلے آرہے تھے، کسی کے کان میں ادھ جلی بیڑی لگی ہوئی تھی کسی کے ہاتھ میں زنبیل تھا جس پر ٹوٹی ہوئی چلم رکھی تھی، کوئی سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا جا رہا تھا، کسی کی ٹوپی ثابت تھی تو دھوتی پھٹی ہوئی تھی، کسی کا پاجامہ اُجلا تھا تو کرتہ کو تیل کی چکناہٹ نے کالا کر دیا تھا، کسی کے نیکر میں بے جوڑ پیوند لگے تھے اور کسی کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ بتا رہا تھا کہ میں کسی مرے ہوئے گورے کی یادگار ہوں اور مجھے آج ہی فٹ پاتھ سے خریدا گیا ہے۔

شام کے پانچ بجے تک مزدور جلسہ گاہ میں جمع ہوگئے، آج مزدوروں کا جلسہ تھا، اس اجتماع کے لئے دس بارہ دن سے طوفانی پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا، گلی گلی میں اشتہار چسپاں تھے اور لاؤڈ اسپیکروں نے چیخ چیخ کر شہر کی فضا میں ایک گونج پیدا کر دی تھی، مزدوروں، فاقہ کشوں اور مظلوموں سے ہر کسی کو ہمدردی ہوتی ہے، اخباروں نے بھی جلسہ کی اطلاع کو نمایاں انداز میں شائع کیا، مزدوروں کے ساتھ دوسرے لوگ بھی جلسہ گاہ میں پہونچ گئے، ان میں کچھ تماشائی تھے اور کچھ اہلِ درد! دُنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کا گھر جل رہا ہے اور کچھ خود غرض اور بے درد تاپ رہے ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں آدمؑ کی اولاد میں شیطان بھی پائے جاتے ہیں اور فرشتے بھی!

جلسہ کھلے میدان میں تھا، آٹھ دس ایکڑ زمین کے رقبہ میں دو تین درخت تھے، نیم کے پیڑ کے نیچے اسٹیج تھا، درخت کی ایک ڈالی پر سُرخ جھنڈا لہرا رہا تھا اس جھنڈے پر ہتھوڑے اور درانتی کے نشان بنے ہوئے تھے، مُونجھ کی رسّی میں کچھ جھنڈیاں اور کتبے بھی لٹک رہے تھے، صدر صاحب ایک اونچی سی کرسی پر بیٹھے تھے، گلے میں گیندے اور کینر کے پھولوں کا ہار تھا ——— مزدور بے چارے سنہری ہار- اور مُقیش کی کترن کے فیتے اور پھول کہاں سے لاتے؟

تقریریں ہوئیں، دھواں دھار تقریریں، زندہ باد کے نعرے، تالیاں، پُرجوش آوازیں، مزدوروں کی آنکھیں اُمید سے چمک رہی تھیں، بوڑھے بوڑھے قلیوں اور بوجھ اُٹھانے والوں کی رگوں میں گرم خون دوڑنے لگا، تقریروں میں کہا گیا۔ ......

"محنت اور سرمایہ کی جنگ کا بگل بج چکا، مزدور اب اِس لڑائی کو جیت کر ہی دم لیں گے، سرمایہ داری کا فریب اب نہیں چل سکتا، اس طلسم کو بہت جلد ٹوٹ جانا چاہیے، کارخانے اور فیکٹریاں کس کے بل بوتے پر چلتی ہیں (ہمارے بل بوتے پر ——— مجمع سے پُرشور آواز آئی) سرمایہ داروں کو روٹی کون دیتا ہے (ہم دیتے ہیں ... ہم ——— دوسری جوشیلی آواز) تو پھر کتنا ظلم اور کس قدر حماقت ہے جو ہماری محنت کے ٹکڑوں پر پلتے ہیں وہ تو سُکھی اور خوش حال رہیں اور ہم دانہ دانہ کو ترسیں، یہ زبردستیاں اب نہیں چل سکتیں، ہم نہیں چلنے دیں گے....!

تقریر کرنے والوں نے مزدوروں کے لہو کو گرما گرما دیا، سوکھے اور مرجھائے ہوئے چہروں پر اُمید اور خوشی نے شادابی پیدا کردی، کمزور اور بوڑھے بازوؤں میں توانائی آگئی، مزدوروں کی آنکھیں مقررین کے قدموں کے تلے بچھی جارہی تھیں دل کہہ رہے تھے کہ ہماری ہمدردی اور غم خواری کے لئے آسمان سے فرشتے اُتر آئے ہیں!

شہر میں اتنے پُرجوش، منظم اور کامیاب جلسے کم دیکھنے میں آئے تھے، پانچ گھنٹہ کا جلسہ اور ایک آدمی بھی اُٹھ کر نہیں گیا، جو جہاں تھا وہیں جما ہوا بیٹھا رہا، کسی کسی نے تو پہلو بھی نہیں بدلا، جلسہ ختم ہونے کے بعد، مزدور منتشر ہوگئے، بہت سے اپنے گھروں، جھونپڑیوں اور ٹھکانوں کو چلے گئے، اور کچھ لوگ چنے مُرمُرے، مونگ پھلی اور گُڑ کے سیو خونچہ والوں سے مول لیکر کھانے لگے، مزدور جسے کم سے کم روٹی ملتی ہو، اُسے زیادہ سے زیادہ بھوک بھی تو لگتی ہے!

یہ اُجلے پوشوں، خوش حالوں کھاتے پیتوں اور لکھوں پڑھوں کا نہیں غریبوں اور مزدوروں کا جلسہ تھا، جو تجویزیں یہاں منظور ہوئیں اُن پر پُورا پُورا عمل کیا گیا، ۱۶؍مئی کو تمام کارخانوں کے مزدوروں نے ہڑتال کردی، اس کے نتیجہ میں تنخواہوں میں دس فی صدی اضافہ کارخانہ داروں کو منظور کرنا پڑا نہ کرتے تو کارخانے بند ہوجاتے —— پہلا وار ہی کامیاب اور بھرپور پڑا، "سُرخ انجمن" کے کارکنوں کی ہر دلعزیزی مزدوروں اور محنت کشوں میں اور زیادہ بڑھ گئی۔

پیاسوں کی اوس سے پیاس کہاں بجھتی ہے، مزدوروں کے مطالبے بڑھتے گئے، ایک معرکہ سر ہوتے ہی دوسرے معرکہ کی داغ بیل پڑجاتی، مزدوروں کے پاس سب سے زیادہ کارگر اور مؤثر حربہ "اسٹرائیک" ہی کا تھا، اِدھر ہڑتال ہوئی اور اُدھر کارخانہ داروں نے صُلح صفائی کے لئے دوڑ دھوپ شروع کردی، ایک دن کی ہڑتال سے سرمایہ داروں کو لاکھوں کا نقصان ہوتا تھا "سُرخ انجمن" والوں کی لیڈری خوب چمک رہی تھی، ان تمام کامیابیوں کا سہرا اُنھی کے سر تھا، اُن کے دفتر میں مزدوروں کا دن بھر تانتا بندھا رہتا، ایک گیا، دوسرا آیا، شکایتیں، مطالبے، مشورے، تجویزیں، اسکیمیں، اس انجمن نے سارے مزدوروں کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، جو مزدور سرمایہ داروں کے پِٹھّو اور بہی خواہ تھے اُن پر طرح طرح کا اخلاقی دباؤ ڈالا جاتا، قوم اور جماعت کا افراد مقابلہ نہیں کرسکتے، سوسائٹی کی مار بہت بُری ہوتی ہے، اچھے اچھے جی چھوڑ جاتے ہیں۔

مزدوروں کے تمام مطالبات پُورے ہوتے گئے مگر یہ آگ ہر لمحہ "ہل من مزید" پُکار رہی تھی، قناعت سے نہ سرمایہ دار آشنا ہے اور نہ مزدور؟ ہر کوئی اپنے لئے آرام اور سہولتیں چاہتا ہے، مزدوروں اور سرمایہ داروں میں سمجھوتا بھی ہو سکتا تھا، محنت اور سرمایہ کے مسائل ایسے نہیں ہیں جو حل نہ ہوسکیں مگر اُن کے لیڈر صلح صفائی کب چاہتے تھے! اُن کا مقصد مزدوروں کو مطمئن کرنے سے زیادہ یہ تھا کہ انفرادی ملکیت کا نظام درہم برہم ہوجائے، اپنے اسی نظریہ کے لئے وہ سب کچھ کر رہے تھے، مزدوروں کی ہمدردی اور غم خواری کے پیچھے ایک خاص نظریہ اور نصب العین کام کر رہا تھا۔

بٹن فیکٹری کا مالک بڑا ہی ہوشیار اور جہاں دیدہ تھا، اُس نے اپنی فیکٹری میں مزدوروں کی علیحدہ ایک انجمن بنائی اور اپنے یہاں کے کام کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ رعایتیں دے دیں، اس فیکٹری کے مزدور واقعی خوش حال اور مطمئن تھے، اُن کے بچّوں کے لئے اسکول تھا جہاں مُفت پڑھائی ہوتی تھی، فیکٹری کے ہسپتال میں ملازموں کے لئے مُفت علاج کا بندوبست تھا تنخواہیں بھی معقول تھیں —— مگر "سُرخ انجمن" والوں کو مزدوروں کے سُکھ چین سے زیادہ عزیز تھا اپنا نصب العین! اُنھوں نے اپنے آدمی وہاں بھیجنے شروع کئے، چند آدمیوں کو اُس فیکٹری میں

نوکر رکھا دیا تاکہ وہاں کے مزدوروں میں مل کر کام کریں "ٹن فیکٹری" کے مزدوروں میں بے چینی اور بے اطمینانی شروع ہو گئی جھونپڑے والے کو بنگلہ کا اور بنگلہ میں رہنے والے کو قصر وایوان کا لالچ دیا جائے گا اور اُمید دلائی جائے گی تو وہ بڑی آسانی سے اس لالچ، اُمید اور سُود و منفعت کا شکار ہو سکتا ہے! ہر کوئی آرام، راحت، ترقی اور آسودگی چاہتا ہے۔

ٹن فیکٹری کے مالک پر سب سے بڑا الزام یہ لگایا گیا کہ بعض مزدوروں کی عورتوں سے وہ ربط ضبط رکھتا ہے، مزدوروں کو بھڑکانے کے لئے یہ بڑا ہی کارگر حربہ تھا، اُس کے خلاف ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا، اُس نے بہتیری صفائی پیش کی مگر اُس شور دار و گیر میں اُس کی سُنتا کون تھا، ایک دن تو یہاں تک نوبت پہونچ گئی کہ بروقت پولس نہ آجاتی تو مزدور اُس کی فیکٹری کو آگ لگا کر خاک کر دیتے!

"سُرخ انجمن" والوں کے پروگرام کا پہلا جُز کامیاب ہو چکا تھا، اب وہ امن و آشتی پر توڑ پھوڑ اور مار دھاڑ کو ترجیح دیتے تھے اور یہ ہنگامہ آرائی تو اُن کے پروگرام کا سب سے زیادہ ضروری جُز تھی، جب تک خون خرابہ نہ ہو، توڑ پھوڑ نہ ہو، مار پیٹ اور ہاتھا پائی کی نوبت نہ آئے اُن کا پروگرام ادھورا رہتا ہے —— ایسے واقعات ہونے لگے، کسی کارخانہ کے منیجر کو کسی مزدور نے ہتھوڑے سے زخمی کر دیا —— مشین توڑ دی گئی —— کارخانہ کا پھاٹک جلا دیا گیا —— فیکٹری کے مالک سے مزدور لپٹ پڑے —— ہیڈ کلرک روپیہ داخل کرنے کے لئے بنک جا رہا تھا مزدوروں نے اُس سے روپیہ چھین لیا —— کارخانوں کی دیواروں پر کوئلہ سے لکھا جاتا ... سرمایہ دار ہشیار رہیں اُن کی موت کی گھنٹی بج چکی —— کارخانے ہم مزدوروں کے ہیں —— سرمایہ داری کے تابوت میں آخری کیل بہت جلد ٹھوکی جائے گی —— ہماری محنت اور عرق ریزی کا پورا پورا صلہ ہمیں ملنا چاہیئے! —— سُرخ انقلاب زندہ باد!

مزدوروں میں چند لوگ نشہ پانی بھی کرتے تھے مگر ساتھیوں کی نظروں سے چھپ کر، اور وہ بھی کبھی کبھار! کسی دن اوور ٹایم (OVER TIME) کی رقم معمول سے زیادہ مل گئی تو کلال خانہ میں گئے اور ٹھرّے کا ادھا پی کر تکان دُور کر لی، "سُرخ انجمن" کے کارکنوں سے جو ملنا جلنا ہوا تو اِن کی بدولت شراب عام ہو گئی، وہ مزدور جو شراب کے پیالے کو پاپ اور گناہ سمجھ کر ہاتھ نہ لگاتے تھے، اب جام پر جام لُنڈھانے لگے، اُن کے دل میں یہ بات اُتار دی گئی کہ بھائیو! گناہ و ثواب اور نیکی و بدی کی قدریں ادلتی بدلتی رہتی ہیں، جس زمانہ میں رِشیوں، پیغمبروں اور مذہبی پیشواؤں نے شراب کو ناجائز بتایا تھا وہ اور زمانہ تھا، اب پہلے سے حالات نہیں رہے، ریلوں، موٹروں اور ہوائی جہازوں کے دور میں بھلا چھکڑوں اور بیل گاڑیوں کے زمانہ کی باتیں کہیں چل سکتی ہیں! آج ساری دُنیا کے بڑے آدمی شراب پیتے ہیں، جس زندگی میں آزادیاں اور راحت سامانیاں نہ ہوں اُس سے موت اچھی!

غریبوں کو فطری طور پر خدا اور مذہب سے لگاؤ اور عقیدت ہوتی ہے، "سُرخ انجمن" کے کارکن بڑے مزاج شناس تھے، اُنھوں نے اس قلعہ پر سامنے سے حملہ نہیں کیا، اس کے لئے اُنھیں چور دروازے تلاش کرنے پڑے اور سُرنگیں لگانی پڑیں، اِس فن میں تو وہ ید طولیٰ رکھتے تھے، اگر چھوٹتے ہی خدا اور مذہب کی بُرائی شروع کر دیتے تو اُن کی بات کون سُنتا لوگ بدک جاتے، مذہبی عقیدہ میں بڑی جان ہوتی ہے مزدوروں کے مزاج اور تیور کو دیکھ کر "سُرخ کارکنوں" نے قدم بڑھایا، مزدور اُن کو اپنے سے بہت زیادہ عقلمند، جہاں دیدہ اور تجربہ کار سمجھتے تھے، پھر وہ اُن کے محسن تھے، اُن کی باتیں آخر کب تک

اثر نہ کرتیں، کسی کسی مزدور کے تو ایمان و عقیدہ کی بنیاد ہی ہل گئی، شک اور تذبذب میں تو بہت سے مبتلا ہو گئے، ایک مزدور نے تو اپنے ساتھی سے یہاں تک کہہ دیا کہ خدا ہے تو آخر وہ سامنے کیوں نہیں آتا، کیا دنیا والوں کے سامنے آتے ہوئے اللہ میاں حجاب محسوس کرتے ہیں ـــــــ مذہب اور خدا پر طنز کرنے کی بیماری پھیلتی جا رہی تھی۔

کامریڈ فیروز "سرخ انجمن" کا سکریٹری تھا، تیس بتیس سال کے لگ بھگ عمر تھی اُس کی سانولی رنگت، چھریرا بدن، چیچک رو، لانبے لانبے بال، پان اور سگریٹ کا شوقین، ہر وقت کلے میں پان کی بیڑا اور ہونٹوں میں سگریٹ دبی رہتی، مزدوروں میں سب سے زیادہ یہی شخص گھل مل کے رہتا تھا، اُس نے ربط ضبط اتنا بڑھا لیا تھا کہ مزدوروں کے گھروں میں بے تکلف چلا جاتا، ہر جگہ اُسکی آؤ بھگت ہوتی تھی، اپنے ہمدرد غم خوار کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔

چھٹن مزدوروں کا نمائندہ تھا، خشخشی چھدری ڈاڑھی، لانبا قد، کنپٹی پر ایک نشان، معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے کبھی زخم آیا تھا جو اچھا تو ہو گیا مگر اپنا نشان چھوڑ گیا، چھٹن نے ریلوے گودام کے ایک حمال کی بیوی سے کامریڈ فیروز کو خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا، یہ اُس کا پہلا مشاہدہ تھا، بدگمانی پیدا ہوئی مگر اُس نے بدگمانی کو دل میں جمنے نہیں دیا، اُس کے دل نے اس واقعہ کی تاویلیں کیں ـــــــ یہ کہ جو شخص ہمارے لئے کسی معاوضہ اور غرض کے بغیر اپنے چین آرام کو چھوڑ کر کام کر رہا ہو وہ ہماری عزت اور ناموس کا دشمن نہیں ہو سکتا، بہن بیٹی اور ماں سے بھی ہنس کر بات چیت ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے، ہر مسکراہٹ اور ہر ہنسی میں تو ہوس اور بدنیتی شامل نہیں ہو سکتی!

بات آئی گئی ہو گئی ـــــــ اس واقعہ کے کوئی تین مہینہ کے بعد چھٹن جمعدار کارخانہ سے آ رہا تھا، شام کا وقت تھا، دن بھر کام کرنے کی تکان اُس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی، قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے، آج فورمین سے باتوں باتوں میں تکرار بھی ہو گئی تھی، وہ اسی فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ کل کیا ہو گا؟ فورمین نے اوپر کے افسروں سے شکایت کر دی تو نوکری سے اُسے علیحدہ کر دیا جائے گا وہ پریشان پریشان سا ہو جاتا، اندیشوں کے جال تنتے چلے جا رہے تھے، مگر اُس نے ذرا سوچا اور اُس کی آنکھیں اُمید سے چمک اُٹھیں ـــــــ "سرخ انجمن" کا خیال آیا کہ اُس انجمن کے لوگ اُس کی پشت پناہی کے لئے موجود ہیں، فورمین اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، کتنے مزدوروں کی فورمینوں، انجنیروں اور منیجروں سے ہاتھا پائی اور لڑائی ہوئی ہے اور "سرخ انجمن" نے بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرا دی! بلکہ مزدوروں کی ہی جیت اور اُنھی کا پلہ بھاری رہا!

شام ہو رہی تھی، دھندلکا پھیل رہا تھا، بجلی کے چراغ سڑکوں پر جل چکے تھے، چھٹن جمعدار ریل کے پل سے گزر رہا تھا کہ اُس کے قریب سے ایک وکٹوریہ گزری، وہ ٹھٹھک سا گیا، پھر اُس کی طرف تیز تیز بڑھا آواز بھی دی مگر وکٹوریہ ذرا سی دیر میں بہت آگے بڑھ گئی ـــــــ وہ گہرے سوچ میں پڑ گیا، کامریڈ فیروز کے ساتھ گلزاری فٹر کی جوان لڑکی گھوڑا گاڑی میں بیٹھی ہوئی ... ... آخر یہ جا کہاں رہے ہیں ـــــ کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے ... ... اس سوچ میں وہ اپنے غم اور فکر کو بھول گیا ... ... وہ اسی غور و فکر میں ڈوبا ہوا راہ میں چلا جا رہا تھا، ایک دو راہگیروں سے ٹکر بھی ہو گئی اور ایک خونچہ والا اپنے خونچہ کو نہ سنبھالتا تو چھٹن کے کاندھے نے اُس غریب کا بیڑا ہی کر دیا تھا، سارا خونچہ زمین پر گر جاتا۔

راستہ میں بجلی گھر پڑتا تھا اُس کے کواٹروں میں چھٹن کے جاننے والے مزدور رہتے تھے، اُس نے سوچا کہ لاؤ ان کے پاس ہوتا چلوں، حقہ پانی پیوں گا، ادھر اُدھر کی بات چیت ہو گی، اس طرح میرا غم ہلکا ہو جائے گا، کواٹروں کے سامنے

کھرنی کا درخت تھا اُس کے نیچے مزدوروں نے چھپر ڈال لیا تھا یہ اُن کی بیٹھک تھی، زمین پر بچھا ہوا ترپال بچھا تھا اور کونوں
میں دو چار ٹوٹے ہوئے مونڈھے بھی پڑے تھے۔

...... آؤ آؤ! جمعدار صاحب آؤ، بڑی عمر ہے تمہاری! ہم تمہیں یاد ہی کر رہے تھے، ان بابو لوگوں (سُرخ انجمن کے
دو کارکنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سے ہماری بحث ہو رہی تھی ——— ایک مزدور نے کہا
——— جمعدار صاحب کارخانہ سے چل کر آ رہے ہیں، ان کو سستا تو لینے دو...... جمعدار! یہ لو بیڑی پیو، محبوب کمپنی
کی چھاپ لگی ہے اس بنڈل پر! میں ان ٹٹ پونجیا کارخانوں کی بنی ہوئی بیڑی نہیں پیتا ——— دوسرا مزدور بولا۔

چھٹن جمعدار نے پینے کے لئے پانی مانگا، آن کی آن میں ایک مزدور کا لڑکا تانبے کے کٹورے میں پانی لے کر آ گیا،
پانی پی کر اُس نے بیڑی سلگائی اور اُن لوگوں کی ٹوٹی ہوئی گفتگو کا سلسلہ پھر چھڑ گیا، کامریڈوں کی گفتگو...... ——— !
——— جی ہاں! ہم یہ کہہ رہے تھے کہ عورت کے اُس فعل کو بدچلنی کہتے ہیں جو پیٹ کی خاطر اور مال و دولت کے دباؤ سے
کیا جائے، یہ بات نہ ہو تو ہر عورت کو تفریح کا حق حاصل ہے، جس سے دل مل گیا اس سے بے تکلفی ہو سکتی ہے، اور یہ اخلاق
تو اگلے زمانہ کی باتیں ہیں (تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک آدمی کی بیوی کی کسی غیر مرد سے طبیعت مل جائے، تو وہ دونوں
سب کچھ کر سکتے ہیں ——— ایک مزدور نے کہنے والے کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا) ہاں! ہاں! سب کچھ کر سکتے
ہیں، ترقی یافتہ ملکوں میں آج یہی ہو رہا ہے، اخلاق اور عصمت کا دم تو غلام اور جاہل ملکوں کے باشندوں کی نشانی اور پہچان ہے،

چھٹن جمعدار بہت دیر سے ضبط کئے ہوئے خاموش بیٹھا تھا، اُس سے نہ رہا گیا، غصہ کے مارے اُس کی مٹھیاں
آپ ہی آپ بند ہو گئیں، وہ غصہ کے لہجہ میں بولا...... تو پھر آپ لوگ ہماری بہو بیٹیوں کی آبرو لوٹنے کے لئے یہ سوانگ
کھیل رہے ہیں، ہمارے مذہب پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے، یہ ہمدردی نہیں ظلم ہے...... میں ابھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر
آیا ہوں کہ گلزاری کی لڑکی کامریڈ فیروز کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں جا رہی تھی (گلزاری کی لڑکی اور فیروز کے ساتھ
——— کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں ——— اور جمعدار تم نے اُن دونوں کو جیتا چھوڑ دیا۔) میں نے

...... چھٹن کہہ ہی رہا تھا کہ اتنے میں بجلی گھر کا برقنداز بھاگا ہوا آیا کہ کل ہمارے جلسہ میں جس نوجوان نے نجم (نظم)
پڑھ کر لیکچر دیا تھا وہ ابھی ابھی میری لڑکی کو اشارے سے بلا رہا تھا، میں نے اُس کو ٹوکا تو وہ سٹ پٹا کر چلتا بنا......
آخر یہ کیا ہو رہا ہے!

مزدوروں کا مجمع مشتعل ہو گیا، یہ ان کی عزت اور آبرو کا سوال تھا، کامریڈ یہ رنگ دیکھ کر وہاں سے کھسک گئے، نہ جاتے
تو آج ان کی خیر نہ تھی، رات بھر مزدوروں کی مشورت ہوتی رہی، ایک دوسرے سے ملے اور بہت سے لوگ جمع ہوئے
تو اور دوسری باتیں جن پر اب تک پردہ پڑا ہوا تھا کھل کر سامنے آ گئیں، یہ پنچایت صبح کے وقت کہیں جا کر ختم ہوئی ———
——— اور اب سیکڑوں مزدور غضبناک انداز میں "سُرخ انجمن" کے دفتر کی طرف جا رہے تھے، دیکھنے والے سمجھے کہ آج پھر کسی کارخانہ کی شامت
آ گئی...... مگر ماجرا کچھ اور تھا، عقاید اور عزائم کا قافلہ دوسری طرف مڑ چکا تھا، "سُرخ انجمن" کے دفتر پر دھاوا بول دیا، اور ذرا سی
دیر میں دفتر کی عمارت کو ویران بنا دیا گیا، جو بنانا جانتے ہیں وہ بگاڑ بھی سکتے ہیں، تخریب، تعمیر سے آسان ہے، کامریڈ چھپے
چھپے پھرتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کی یہ سازش ہے، دولت ایسے ہی کھیل کھیلتی رہتی ہے
——— مگر اُن کا فریب اب چل نہ سکتا تھا، مزدوروں کے جس جھنڈے پر کل تک "روٹی" لکھا تھا، اُس پر اب......
"اخلاق اور روٹی" ——— لکھا ہوا تھا ——— !

رُوحِ انتخاب

اگر آج آپ کے اجتماعی کردار میں پورے اسلام کا ٹھیک ٹھیک مظاہرہ ہونے لگے تو آپ دُنیا میں سربلند اور آخرت میں سُرخ رُو ہو کر رہیں گے خوف اور حُزن، ذلت اور مسکنت مغلوبی اور محکومی کے یہ سیاہ بادل جو چھائے ہوئے ہیں چند سال کے اندر چھٹ جائیں گے، آپ کی دعوتِ حق اور سیرتِ صالحہ دلوں اور دماغوں کو مسخر کرتی چلی جائے گی، آپ کی ساکھ اور دھاک دنیا پر بیٹھتی چلی جاتے گی، انصاف کی اُمیدیں آپ سے وابستہ کی جائیں گی، بھروسہ آپ کی امانت اور دیانت پر کیا جائے گا سند آپ کے قول کی لائی جائے گی، بھلائی کی توقعات آپ سے باندھی جائیں گی، ائمہ کفر کی کوئی ساکھ آپ کے مقابلہ میں باقی نہ رہ جائے گی، ان کے تمام فلسفے اور سیاسی و معاشی نظریے آپ کی سچائی اور راست روی کے مقابلہ میں جھوٹے مُلمع ثابت ہوں گے اور وہ طاقتیں جو آج اُن کے کیمپ میں نظر آرہی ہیں ٹوٹ ٹوٹ کر اسلام کے کیمپ میں آتی چلی جائیں گی، حتی کہ ایک وقت وہ آئے گا جب کمیونزم خود ماسکو میں بچاؤ کے لئے پریشان ہوگا، سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی خود واشنگٹن اور نیویارک میں اپنے تحفظ کیلئے لرزہ براندام ہوگی مادہ پرستانہ ماحول خود لندن اور پیرس کی یونیورسٹیوں میں جگہ پانے سے عاجز ہوگا، نسل پرستی اور قوم پرستی خود برہمنوں اور جرمنوں میں اپنے معتقد نہ پاسکے گی اور یہ دور صرف تاریخ میں ایک داستانِ عبرت کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا کہ اسلام جیسی عالمگیر و جہاں کشا طاقت کے نام لیوا کبھی اتنے بیوقوف ہو گئے تھے کہ عصائے موسیٰ بغل میں تھا اور لاٹھیوں اور رسّیوں کو دیکھ کر کانپ رہے تھے۔!

(ابوالاعلیٰ مودودی)

ہماری نظر میں

مُرتد کی سزا

"مرتد کی سزا اسلامی قانون میں" از: سید ابو الاعلیٰ مودودی ضخامت ۸۸ صفحے، سفید چکنا کاغذ کتابت و طباعت دیدہ زیب، سرورق رنگین، قیمت بارہ آنے، ملنے کا پتہ:— مرکزی جماعت اسلامی پاکستان، اچھرہ، لاہور۔!

اس بیسویں صدی میں ایسے مسلمان بھی پائے جاتے ہیں جو اسلامی احکام کو موجودہ تمدن و تہذیب سیاست اور سوسائٹی کے رجحانات کے معیار پر جانچنا چاہتے ہیں، اس ذہنیت نے بعض اسلامی احکام کو خود تراشیدہ تفسیر و تعبیر کا رنگ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا ہے، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے چشم بصیرت دی ہے اور ساتھ ہی اظہارِ حق کی توفیق عطا فرمائی ہے، دین کے مسائل کو وہ اس انداز پر نہیں سوچتے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، حالات کا تقاضا کیا ہے، تمدن و تہذیب کے کیا مطالبے ہیں؟ اُن کی طرزِ فکر یہ ہے کہ کتاب و سُنت کا اس مسئلہ میں کیا فیصلہ ہے، صحابہ کرام کے آثار اور راسخون فی العلم کے ملفوظات اس بارے میں کس طرف رہنمائی کرتے ہیں؟ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی دینی احکام کی شرح و تفصیل اور تعبیر میں یہ خیال پیش نظر نہیں رکھتے کہ دُنیا کیا کہے گی؟ وہ اپنے نزدیک جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اُس کے اظہار میں کمزوری نہیں دکھاتے چاہے ساری دُنیا اُن کی مخالف ہو جائے، انھیں اپنی ہر دلعزیزی، ساکھ اور شخصیت سے زیادہ اسلام اور حق و صداقت عزیز ہے!

اس کتابچہ میں بھی مولانا مودودی نے خوب کھُل کر اظہارِ حق کیا ہے، کتاب و سُنت، آثار صحابہ اور ائمہ مجتہدین کے اقوال کی روشنی اور رہنمائی میں اس بات کو ثابت کر دکھایا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے اور پھر آگے چل کر عقلی دلیلیں پیش کی ہیں، سیاسی اور بین الاقوامی مسائل کی نزاکتوں اور ضرورتوں سے بحث کی ہے، اس کتاب میں فاضل کتاب نگار نے نقل و عقل دونوں کو جمع کر دیا ہے۔

سیاسی خُطبات

"سیاسی خطبات" مصنف:— سید ودود الحق ندوی ناشر:— دائرۃ العلم والعرفان بمبئی ضخامت ۱۱۲ صفحے، قیمت درج نہیں، ملنے کا پتہ:— ادارۂ تبلیغ الاسلام ۱۰۲ ٹن ٹن پورہ اسٹریٹ بمبئی ۹

یہ کتاب جمعہ کے خطبات کا مجموعہ ہے، کتاب کا نام پڑھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ یہ خُطبے صرف سیاسی انداز کے ہوں گے مگر ان میں دین و سیاست کو اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ دونوں کا جُدا کرنا مشکل ہے، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام میں دین سیاست سے جُدا نہیں ہے، اسلام میں قیصر و کلیسا اور ملوکیت اور پاپائیت کی تقسیم نہیں پائی جاتی۔

مولانا قاری سید ودود الحق ندوی کی پہلی تصنیف ہماری نظر سے گزری اور کتاب کو پڑھ کر جی خوش ہو گیا، مصنف کے لئے مُبارک باد کے ساتھ دل سے دُعائیں بھی نکلیں، کتنی سُلجھی ہوئی فکر اور کس قدر دل نشین انداز ہے، پھر اللہ کا سب سے بڑا فضل یہ ہے کہ پرویز اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی طرح فاضل خطیب اور لائق مصنف نے دینی

مسائل کو افسانہ و داستان اور بازیچہ فکر و نظر نہیں بنایا، قلم و زبان کے ساتھ اللہ کا خوف، رسول کی محبت، دین کی عظمت اور ملّت کا درد ساتھ ساتھ رہا ہے!

زبان و ادب کے اعتبار سے بھی یہ خطبے قابلِ قدر ہیں، صفحہ (۷۱) پر "نقوشِ قدم" کو "نقوش ہائے قدم" لکھا ہے اور صفحہ (۱۰۱) پر علامہ اقبال کے اس مشہور شعر کو:-

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

مولانا محمد علی جوہر سے منسوب کیا ہے۔

ان خطبات کی سب سے بڑی خصوصیت اظہارِ حق کی جرأت اور بے باکی ہے ہندوستان کے مظلوم اور پریشان مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے اسی حوصلہ اور اسلامی فکر کے اصحاب کی ضرورت ہے ———— اقبال نے کہا تھا

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

ٹونسڈن اور گول واکر کے مقابلہ میں مولانا دریابادی جیسے مردانِ حق کوش کی زبان و قلم اسی وظیفہ کو انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُن کی محافظت اور مدد فرمائے (آمین)

قانون بین الممالک

"قانون بین الممالک" :- از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ضخامت ۲۶۲ صفحے، قیمت تین روپے (مجلّد) ملنے کا پتہ:- دبستانِ اردو ۶۸ ، کٹلمنڈی، حیدر آباد دکن (بھارت)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اور کام سے علمی دنیا اچھی طرح متعارف ہے۔ انٹرنیشنل کانسٹی ٹیوشن (INTERNATIONAL CONSTITUTION) اُن کا خاص موضوع ہے، اس تصنیف کے لئے ڈاکٹر صاحب موصوف نے مختلف زبانوں کی پچیس کتابوں سے استفادہ کیا ہے، یوں سمجھئے کہ اس چھوٹے سے ذخیرہ کے لئے انھوں نے بہت سے خرمنوں کی خوشہ چینی کی ہے، علمی اور قانونی کتابیں اسی سعی و تفحص اور عرق ریزی کے ساتھ ہی لکھی جانی چاہئیں یہ افسانہ نویسی نہیں ہے کہ قلم اٹھایا اور لکھتے چلے گئے!

فاضل مصنف اور لائق مؤلف نے آدم و حوّا کے چھوٹے سے کنبہ سے کتاب کا آغاز کیا ہے، پھر بتایا ہے کہ آبادیاں کس طرح پھیلیں، کنبوں، گھرانوں، قبیلوں اور شہروں میں باہمی تعلقات کس طرح پیدا ہوئے، قبایلی سیادتیں کس طرح قایم ہوئیں، بادشاہتیں کیوں کر ظہور میں آئیں قدیم حکومتیں ایک دوسرے کے ساتھ کیا برتاؤ کرتی تھیں سفارتیں اور حلیفیاں کس طرح وجود میں آئیں ———— بین الممالک روابط اور دستور کی تدریجی ترقی کتاب میں دکھائی گئی ہے، اور موجودہ "قانون بین الممالک" تو اس کتاب کا اصل موضوع ہی ہے اُسے خوب پھیلا کر بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں "مجلسِ اقوام" کا بھی ذکر ہے، اُس مجلسِ اقوام کا جسے علامہ اقبال نے "کفن چوروں" کی ایک ٹولی بتایا تھا، خود لائق مؤلف نے یہ رائے دی ہے:-

"غرض اہلِ یورپ ابھی اخلاقی نقطۂ نظر سے اس قابل نہیں ہوئے تھے کہ مجلسِ اقوام چلا سکیں،

ادارۂ اقوام متحدہ کا آغاز بھی کچھ اُمید افزا نہیں ہے ... ..."

یہ کتاب اُس وقت لکھی گئی تھی جب "ادارۂ اقوام متحدہ" نیا نیا بنا تھا، اس لئے فاضل مؤلف نے محتاط انداز میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا اب تو یہ "ادارہ" اپنے تمام عزائم اور مساعی کے ساتھ بے نقاب ہو گیا ہے، مجلس اقوام کی طرح "ادارۂ اقوام متحدہ" بھی قطعاً ناکام ہے، نہ یہ کمزوروں کی مدد کرتا ہے نہ مظلوموں کی فریاد سُنتا ہے اور نہ کسی ظالم سے مظلوم کا چھنا ہوا حق دلواتا ہے جس ادارے، جماعت اور قانون و دستور کی بنیاد اخلاق اور نیکی پر نہ ہو اُس سے بھلائی اور انصاف کی توقع رکھنا ہی حماقت ہے!

ہم اپنی آنکھوں سے یورپ والوں کی بہیمانہ جنگ و جدل کا منظر دیکھ چکے ہیں، اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان تاریخی حقایق کو بھی پڑھیئے ——

"دس سالہ مدنی زندگی میں آپ (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا اقتدار شہر مدینہ سے پھیل کر جزیرہ نمائے عرب اور جنوبی فلسطین کے دس لاکھ مربع میل رقبہ پر محیط ہو گیا، اس عرصہ میں آپ کو بہت سی لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں لیکن اس پوری فتح کے لئے دشمن کے بہ مشکل ڈھائی سو آدمیوں کا خون بہایا گیا اور (اگر بیر معونہ میں دھوکے سے اور اُحد میں فوجی نافرمانی کے نتیجے بھاگڑ کے وقت قتل شدہ (۱۳۰) آدمی مستثنیٰ کر دیئے جائیں تو) مسلمانوں کے بہ مشکل ایک سو آدمی مارے گئے تھے، غرض عہد نبوی میں دس سال تک اوسطاً دو سو پچھتر میل کا رقبہ فتح ہوا اور مسلمان فوج سے دس سال تک اوسطاً ماہانہ صرف ایک آدمی مارا جاتا رہا ... ..." (صفحہ ۳۴)

صفحہ (۳۹) پر یہ عبارت کس قدر عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہے:-

"موسیو پیرے کے الفاظ میں مسلمانوں کی حکومت ایک ہلال کی شکل میں دُنیا میں پھیل گئی جس کا ایک سرا پرینز کی چوٹیوں پر تھا تو دوسرا سرا چین کے پہاڑوں پر، اور اس سب علاقہ پر صرف ایک خلیفۃ المسلمین حکمرانی کرتا تھا جو مذہبی امام بھی تھا اور سیاسی امیر بھی تھا، اہل یورپ اس کو دیکھتے تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے ——"

"صفحہ ۵۱" پر لکھا ہے - - "بنی اسرائیل جب فرعون کے ظلم سے بیزار ہو کر مصر سے بھاگ نکلے اور صحرائے قبہ میں چالیس سال بھٹکتے رہے - - -" یہ قبہ نہیں "تیہ" ہے اور یہ یقیناً کتابت ہی کی غلطی ہے!

"قانون بین الممالک" میں مواد اور معلومات کی بہتات ہے یہ ایک ٹھوس اور معلومات آفریں کتاب ہے، جو کوئی بھی اسے پڑھے گا اُس کے علم و اطلاع میں اضافہ ہو گا-

"چراغِ راہ" کا شعر نمبر

"چراغِ راہ کا شعر نمبر" مُرتب:- نعیم صدیقی، ضخامت ۱۹۲ صفحات، اس شمارہ کی قیمت دو روپے، سالانہ چندہ پانچ روپیہ (پاکستانی) ساڑھے سات روپے (ہندوستانی) ملنے کا پتہ:- دفتر چراغ راہ ۹ —— لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ — کراچی!

ماہنامہ "چراغِ راہ" اسلامی ادب کا نقیب اور حق و صداقت کا بے باک ترجمان ہے، جناب نعیم صدیقی اس مجلہ کو ترتیب دیتے ہیں، نعیم صاحب کا نام ہی "چراغِ راہ" کی افادیت، بلندی اور ثقاہت کا ضامن ہے —— اس ماہنامہ کا "شعر نمبر" پورے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے -

احساسِ کمتری کا وہ دور گزر گیا جب اسلام کا نام لیتے ہوئے زبانیں اور قلم شرماتے تھے کہ کہیں ہم پر

قدامت پرستی"، "تنگ نظری" اور "فرقہ واریت" کا الزام نہ آجائے، آج کا مسلمان ادیب اور شاعر منظرِ عام پر آکر "اسلام" کا نعرہ بلند کرتا اور خدا کا نام لیتا ہے۔

جہاں کی کشمکشِ مستقل کا حل ہے یہی — کہ ہو زمیں پہ خدا کا نظام سب کا سب
تم اپنے فن سے زمانہ کو روشنی دکھلاؤ — تمہارا فرض یہی ہے پیمبرانِ ادب

(عاصی کرنالی)

اسلام پسند شاعروں نے ادب، سوسائٹی اور انسانیت کی یہ خدمت انجام دی ہے:-

قلب و نظر کو دالہِ ایماں بنا دیا — فکر و نظر کو تابعِ قرآں بنا دیا
گلیوں میں خُم بہا دیئے حرمت کے حکم پر — مے خانہ کو غبارِ پریشاں بنا دیا
پھر عشق کی نظر کو حجابِ حیا دیا — عصمت میں حُسن کو مہِ کنعاں بنا دیا
فرہاد و قیس کو نئی تہذیبِ عشق دی — کتنے جنونیوں کو پھر انساں بنا دیا
حیوانیت کے تند تقاضوں کو دی لگام — انسانیت کو اُن کا نگہباں بنا دیا

اے شعر! تجھ پر اپنا یہ احسان کم ہے کیا؟
کافر سے ہم نے تجھ کو مسلماں بنا دیا

(نعیم صدیقی)

بلند نظری، احساسِ غیرت اور عزم و صداقت کا یہ عالم ہے:-

دیکھا ہے میں نے تیرا چلن باغباں! مجھے — کانٹے قبول ہیں گل و ریحاں نہیں قبول
دل کو طوافِ درگہِ سلطاں نہیں پسند — گردن کو بارِ منتِ درباں نہیں قبول

اور

مدتوں نظارۂ بربادیِ انساں کیا — آج فکرِ رونقِ کاشانۂ انساں کریں
آج ہے جن کی زبانوں پر مقدر کا گلہ — آؤ اُن کو رازدانِ گردشِ دوراں کریں
مدتوں جو آستانِ غیر پر جھکتی رہیں — اُن جبینوں کو شناسائے درِ یزداں کریں

اب تلک شاہد ہے جس پہ کوہِ فاراں کا سکوت
ساتھیو! آؤ دلوں میں یاد وہ پیماں کریں

(ضیا محمد ضیا)

مردِ مومن کی کرشمہ سازیوں اور رفعتوں کا یہ عالم ہے:-

برق کیا ہے تری نظر کا جلال
کہکشاں کیا ہے تیرے پاؤں کی دھول

(احمد نسیم)

"سیفٹی راج کے کارپردازوں" کو شاعر للکارتا ہے:-

شیشۂ بادہ و جام خطرے میں ہے — جنتِ بادہ آشام خطرے میں ہے
میرے قرآن و سنت کے اسلام سے — حکمرانوں کا اسلام خطرے میں ہے

(نعیم صدیقی)

دعوتِ عمل کا پیغام شعر کی زبان سے اس طرح دیا جاتا ہے

وہی نمایشِ عصیاں ہو، قم باذن اللہ　　وہی نفاق ہو، طغیاں ہو، قم باذن اللہ
کمال جس کو سمجھتی ہے دانشِ حاضر　　زوالِ حضرتِ انساں ہو، قم باذن اللہ
یہ اشتراکی و جمہوریانِ دہر تمام　　بس ایک ضرب کا ساماں ہو، قم باذن اللہ

(یعقوب طاہر)

"جماعتِ اسلامی" کے ارکان خود کیا ہیں؟ اُن کا مقصد اور منتہائے فکر و عمل کیا ہو؟

یہ سارے خداؤں سے بیزار بندے　　فقط ایک تیرے پرستار بندے
خداؤں کے باغی! زمانہ سے سرکش　　یہ تیرے سوا سب سے بیزار بندے
یہ پابندِ حق اور باطل کے منکر　　یہ مجبور بندے! یہ مختار بندے

ترے دینِ حق کی شہادت کے مجرم　　اور اس جرم کو برملا کرنے والے
محمد کی رحمت کے یہ خوشہ چیں ہیں　　عدو کے بھی حق میں دعا کرنے والے

(ملک عزیز)

قرآن کو سب مسلمان مانتے ہیں اور آنکھوں سے لگاتے ہیں مگر عملی دنیا میں آکر اس "اعتقاد" کی قلعی کھلتی ہو:-

قرآن کو اک غازیٔ کردار سے پوچھو
ملّا تو سمجھتا ہے فقط "ہدیۂ تبریک"

(عاصی کرنالی)

"قرارداد مقاصد" جب منظور ہوتی ہو تو اسلام پسند شاعر سے خوشی ضبط نہیں ہوسکتی:-

اب پھر کسی کے حُسن کا چرچا ہوا تو ہو　　اس دور میں بھی عشق کا دعویٰ ہوا تو ہو
تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں　　میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہو
تصویر صاف ہو گی نمودار عنقریب　　دھندلا سا ایک نقش ہویدا ہوا تو ہو
آثار سر بلندیٔ اسلام ہیں عیاں　　دنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہوا تو ہو
انجام کے لیے بھی خدا کارساز ہے　　آغاز کار حسبِ تمنا ہوا تو ہو

افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہو رُخ
قبلہ بنائے قوم کا سیدھا ہوا تو ہو

(آسد ملتانی)

"قوموں" کی تقدیر "چنگ و رباب" سے نہیں "شمشیر و سناں" ہی سے وابستہ ہو:-

نہیں نہیں آپ اپنی مجبوریوں کو خود دے رہی ہیں دعوت
میں اُس کا انجام جانتا ہوں جو ہاتھ تلوار پر نہیں ہو

(عاصی کرنالی)

جشن قرارداد مقاصد" کی منظوری پر آسد ملتانی نے مسرت و شادمانی کی "لے" میں نغمہ سنجی کی تھی جب اُس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا تو نعیم صدیقی و فورِ غم سے چیخنے لگتا ہو:-

قرار داد مقاصد کے تم مصنف تھے　　یہ صُور پھونک کے اب کھو گئے کہاں آخر؟

زمانے بھر کی امامت کے مُدعی بن کر — رہِ حیات میں گم ہو گئے کہاں آخر؟
نمازِ عشق اقامت کی منتظر ہے ابھی — اذاں پکار کے تم سو گئے کہاں آخر؟

اور

لباسِ دیں میں ہو رقصاں سیاستِ افرنگ — کمالِ فن یہ دکھایا فسوں طرازوں نے

"اسلام پسند شاعر" لالہ و گل کی شگفتہ سامانیوں کا بھی ذوق رکھتا ہے؟ :-

مہک رہی تھیں گُلوں کی لطافتیں اس میں — دمک رہی تھیں شگوفوں کی عصمتیں اس میں
عطا ہوا تھا تبسّم انھیں فرشتوں کا — تھے چند پھول خلاصہ کئی بہشتوں کا
شگوفے نازک دمربوط پھول وابستہ — تمام ہار تھا فطرت کا شعرِ برجستہ
(عاصی کرنالی)

اس انقلاب آزادی کے بعد بھی شاعر محسوس کرتا ہے کہ آزادی کی صبح ابھی پُوری طرح طلوع نہیں ہوئی :-

سروں پہ نحوست کے گھیرے ہیں اب تک
دلوں میں رعونت کے ڈیرے ہیں اب تک
بہت دھندلے دُھندلے سویرے ہیں اب تک
(سجاد شاہد)

ہمارے اسلامی شاعر اور صالح انقلاب کے نقیب کی جادہ پیمائی کے تیور تو دیکھئے :-

میں ایسی راہوں پہ بڑھ رہا ہوں — کہ ہم رکاب انجم و قمر ہیں
میں ایسی راہوں میں چل رہا ہوں — خدا کی آیات راہبر ہیں
میں دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے — مجاہدوں کا ہجوم اُٹھا
یہ قابلِ یادگار منظر — فلک نے دیکھا تو جھوم اُٹھا
(نعیم صدیقی)

جن مُجاہدوں کا یہ عزم ہو، اللہ تعالیٰ پر اس قدر بھروسا ہو، یہ جوش اور ولولہ ہو وہ "انتم الاعلون" کی منزل پر پہونچ کر ہی دم لیں گے، کامیابی اُن کے لئے مقدر ہو چکی ہے! (انشاء اللہ العزیز)

مگر مُجاہدوں کو آگے بڑھتا دیکھ کر یہ "مفتیانِ کرام" حسد و رشک کے مارے آگ بگولا ہو رہے ہیں کہ اس طرح ہماری دکانداری ختم ہوئی جا رہی ہے، فتووں کی منجنیقیں دھڑا دھڑ آگ برسا رہی ہیں :-

یہ روحانی نظامِ ساہوکاری — تقدس کے ادارے کاروباری
ہے برہم مجھ پہ طاغوتوں سے بڑھ کر — کتاب و فقہ کی جاگیرداری

جو پھنکارے بھی لفظی ناگ تو کیا — اگر فتووں نے اُگلی آگ تو کیا
خدا جس سے بھی چاہے کام لے لے — حسد کے مُنہ میں آئے جھاگ تو کیا

ان شعروں میں کس قدر ولولہ انگیز پیام ہے :-

خبر بھی ہے تمھیں عہدِ نبوی کے بت شکنو! جہاں میں پیدا[1] نئے سومنات ہوتے ہیں
(عبدالکریم ثمر)

جہانِ سُرخ کہاں اور کہاں یہ اسلام اُلجھ رہے ہیں اندھیرے سحر ہوتا ہے!
(عرشی بھوپالی)

اسلام پسند شاعر طرزِ ادا میں "قاآنی" کے قصیدوں کی تشبیب کی یاد تازہ کر دیتا ہے:-

آہی کائنات آج کیوں اداس اداس ہے
گھٹی گھٹی سی ہے فضا تھکی تھکی سی ہے ہوا
فسردگی چمن چمن نہ تازگی دمن دمن
نہ زیر و بم کی نغمگی صدائے آبشار میں
نہ پیچ و خم کی دلکشی ردائے جوئبار میں (عاصی ضیائی رامپوری)

دُوسرا رُخ: ——— ہم نام نہاد "ترقی پسندوں" کی طرح تنگ نظر، نامنصف اور جانب دار نہیں ہیں کہ اپنوں کی کمزوریوں پر پردہ ڈال دیں اور اُن کی اچھائیوں اور خوبیوں ہی کو اُچھالتے پھریں ——— اسلام پسند شاعر آخر انسان ہیں، اُن سے خیال و اظہار میں غلطیاں بھی ہوئی ہیں، فاحش بھی اور معمولی اور سرسری بھی! نقاد اور نکتہ چیں نہ ہوں تو پھر لوگوں کو اپنی کمزوریاں اور غلطیاں کس طرح معلوم ہوں، تنقید و احتساب "شعر و ادب" کی بہت ضروری اور مفید صنف ہے! ——— (صفحہ ۲۸)

ابھی تو نئی پھانسیاں ہیں
شہیدوں کا خوں چاٹتی ہیں

یہاں "پھانسی" کی جگہ "سولی" زیادہ موزوں تھا اس طرح "خوں چاٹنے" کا مفہوم لفظاً اور معناً پورا ہو جاتا۔

صفحہ (۳۰) میری خلوت میں وہ چپکے سے چلی آتی ہے
اجنبی اجنبی خوشبوؤں کا دھارا بن کر

یہاں "دھارا" "موج" کے معنیٰ میں غلط استعمال ہوا ہے

صفحہ (۳۰) کر کے قرآں کو نثارِ مصحفِ روئے بتاں
چاک بدبختی سے تو نے پردۂ نسواں کیا

پورا شعر ہی کمزور اور بے مزہ ہے، دوسرا مصرعہ خاص طور سے سُست ہے!

صفحہ (۴۲) ابھی باطل کو دنیا سے مٹانا ہے شرر ہائے جنوں سے کھیلنا ہوگا

"شرر ہائے جنوں" آخر کیا بات ہوئی! طویل بحروں میں تو کبھی کبھار شاعر کے اس عجز کو گوارا کیا جا سکتا ہے کہ مصرعہ پورا کرنے کے لئے کوئی زائد لفظ رکھ دیا مگر اس مختصر سی بحر میں تو ہر لفظ کو نگینہ کی طرح جڑا ہونا چاہیئے تھا۔

---

[1] کاش! "الف" یہاں نہ دبتا!

(صفحہ ۴۹) — حدودِ کفر سے ایماں بچاکے لائے ہیں		بغیر اس کے جو کچھ تھا وہ سب لٹا آئے

یہاں "بغیر" شاعر نے "ماسوا" کے معنی میں استعمال کیا ہے، شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ ایمان کے سوا جو کچھ بھی پاس تھا وہ سب لٹا آئے، "بغیر" نے مفہوم کو گنجلک بنا دیا۔

(صفحہ ۱۲۰) یہ رُشد و ہدایت کی ریا پوش تلاوت		جلتے ہوئے ماحول کا درماں تو نہیں ہے

"تلاوت" کو "ریا پوش" کہنا بہت عجیب سی بات ہے، آخر ترکیبوں اور لفظوں کے استعمال کا کوئی محل بھی تو ہوتا ہے

صفحہ (۱۴۳) اس طرح احساس قوتِ ضعف کو دلواؤں گا		آبگینوں کو کہستانوں سے جا ٹکراؤں گا

پہلا مصرعہ یکسر "غیر شاعرانہ" ہے "دلواؤں گا" پر زبان کو الگ ٹھوکر لگتی ہے اور "وجدان" الگ تلملانے لگتا ہے۔

"نیا سامراج" (صفحہ ۱۵۰) میں ایک ہی نظم کے دو بند دو مختلف بحروں میں ہیں، (صفحہ ۱۷۴) پر ایک شعر ہے:—

تیرگی چاند کی مشعل کو نہیں پی سکتی
پیشِ خورشید دئیے بھی کبھی آسکتے ہیں

یہ آج ہی سننے میں آیا کہ "مشعل" پی بھی جا سکتی ہے، نئی تخئیل اور نئی ترکیبوں کے ہم مخالف نہیں ہیں مگر "جدت" کوئی نہ کوئی قرینہ چاہتی ہے!

فاضل مُرتب کو نظموں کے انتخاب میں سختی برتنی چاہیے تھی اگر ایسا ہو جاتا تو اس گلدستہ میں پھول ہی پھول رہ جاتے خار وخس دکھائی نہ دیتے، اسلام پسند شاعروں اور ادیبوں میں ایسے اصحاب بھی ہیں جن کا دل تو اللہ کے فضل سے مُسلمان ہے مگر اشتراکیت زدہ ادیبوں اور شاعروں کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا سے وہ بہت کچھ متاثر اور مرعوب ہیں، اُردو میں "بلینک ورس" بُری طرح ناکام ہو چکی ہے، نہ عوام میں وہ مقبول ہوئی اور نہ خواص نے اُسے پسند کیا حیرت ہے ہمارے بعض اسلامی شاعروں کی "فراست" اس حقیقت کو نہیں پہچان سکی!

بے ردیف و قافیہ (بے سروپا) شاعری میں کوئی لُطف، کوئی جاذبیت اور کوئی مزہ نہیں، اس میں کسی "فکر" کی ضرورت نہیں پڑتی بس ذرا طبیعت پر زور دیا اور لفظ جُڑتے چلے گئے، شاعری "آمد" کی حالت میں بھی غور و فکر چاہتی ہے؟ اسلامی شاعروں کو دوسروں کے مقابلہ میں لفظوں کا استعمال اور زیادہ صحت کے ساتھ کرنا چاہیئے کہ اُن کے افکار کی بنیاد ہی عدل و صحت اور تناسب و اعتدال پر ہے ——— ہم بہت دنوں سے یہ مشورے دے رہے ہیں، شاید یہ کہہ کر کہ:—

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو

ہماری بات ٹال دی جاتی ہے، مگر یہ طنز ہمیں سچی بات کہنے سے روک نہیں سکتی۔

خوب و ناخوب ——— تصویر کے دونوں رُخ ہم اوپر دکھا چکے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مجموعی طور پر "چراغِ راہ" کا "شعر نمبر" بہت کامیاب ہے اور مُرتب اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں، آٹھ دس سال پہلے اس قافلہ میں گنتی کے چند آدمی تھے مگر اب دیکھتے ہی دیکھتے خاصہ اضافہ ہو گیا اور ہو رہا ہے!

مختلف شعراء کے کلام کا یہ پہلا پاکیزہ مجموعہ اُردو زبان میں منظرِ عام پر آیا ہے جس کے شاید ایک شعر میں بھی رندی و ہوسناکی کو سہارا نہیں ملتا، جس میں نہ بادہ و مینا کے تذکرے ہیں، نہ آنچل اور دوپٹہ کا ذکر ہے، نہ دیر

کو حرم پر اور زنار کو تسبیح پر ترجیح دی گئی ہو، نہ زہد و پاکبازی کا مذاق اُڑایا گیا، نہ یہ کہا گیا ہو کہ

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

نہ تقدیر کا شکوہ ہو، نہ رقیبوں اور پاسبانوں کی کشمکش ہو، نہ جھرکوں اور چلمنوں کی تاک جھانک ہو، نہ حسینوں کے وعدے ہیں، نہ حور و غلماں اور کوثر و جنت پر پھبتیاں ہیں، لطف یہ ہو کہ ان تمام چٹخاروں کے نہ ہوتے ہوئے جاذبیت ہے، دلچسپی ہو کشش اور شگفتہ سامانی ہو، یہ وہ اشعار ہیں جو کردار کو بگاڑتے نہیں بناتے ہیں، جو اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو میخانوں، کلب گھروں اور قمار خانوں کی بجائے منبر و محراب اور رزمگاہ کی طرف لے جاتے ہیں!

چراغِ راہ کا "شعر نمبر" ایک انقلابی محضر ہے، جس پر دردمند فن کاروں نے اپنے خونِ جگر سے مُہریں ثبت کی ہیں، اقبال نے کہا تھا:

یا مردہ ہو یا نزع کے عالم میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

اقبال کی روح کو مژدہ کہ اُس کے ہم خیال شاعروں نے خونِ جگر ہی سے اسلامی فلسفہ کو لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا ——— جناب نعیم صدیقی کی خدمت میں اُن کے ایک گنہگار بھائی کی طرف سے آنسوؤں کا نذرانہ..... !

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

حجاز نامہ

"حجاز نامہ" از :- شفیق صدیقی جون پوری، ضخامت ۲۰۸ صفحے، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ :- ظفر الحسن منیجر ظفر بک ڈپو، جون پور (یو-پی)

اردو زبان کے مشہور سنجیدہ اور صاحبِ فکر شاعر جناب شفیق صدیقی جون پوری کو اللہ تعالیٰ نے زیارتِ حرمین کی سعادت عطا فرمائی، یہ کتاب (حجاز نامہ) اُس مبارک و مسعود سفر کی قلمی یادگار ہے۔

"حجاز نامہ" محبت و عقیدت کے جذبات سے معمور ہے، اندازِ بیان شگفتہ دلکش اور سلیس ہے، بعض مقامات پر جذبات کی اتنی صحیح ترجمانی کی ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا، اب یہ اپنا اپنا ظرف اور حال ہے کہ کوئی بس "آہ" بھر کے رہ جائے اور کسی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگیں

سرابے کہ رخشد بویرانہ خوشتر
ز چشمیکہ پیرایہ نم نہ دارد

سفرِ حجاز پر جتنی کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں اُن میں حجاز کے معلمین کی بے پروائی اور حکومتِ حجاز کے عمال کی بدسلوکی اور لالچ کی شکایتیں سب میں مشترک ہیں، "حجاز نامہ" میں بھی اس قسم کی شکایتیں پڑھ کر بہت تکلیف ہوئی ——— کاش! سلطان ابنِ سعود، "حج" کو اپنی آمدنی کا ذریعہ نہ بناتے، نجد کے جو علماء مولد النبی اور جنت البقیع کی پامالی پر خوش ہوتے تھے اُن کا جذبہ "بدعت شکن" سلطان سے کچھ نہیں کہتا، متبرک اور مقدس آثار کو ڈھا دینا ہی "بدعت شکنی" ہے اور انسانوں کے بھیس میں جو یہ بدعتیں اور برائیاں چلتی پھرتی ہیں اُن کو ٹوکنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

جناب شفیق جون پوری نے سفرِ حجاز کے سلسلہ میں بعض دوستوں اور شناساؤں کی بے مروتی اور

دوست فراموشی کی جو شکایتیں کی ہیں، اگر وہ نہ ہوتیں تو اچھا تھا ——— "اضطباع" کو کتاب میں ہر جگہ "اصطباغ" لکھا ہے، تجنیس خطی جہاں ہو وہاں نقطے خاص طور پر احتیاط کے ساتھ نصب کرنے چاہئیں ——— رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالمِ ماکان وما یکون" کہہ کر مصنف نے مبالغہ کیا ہے جو کچھ (تھا) ہو چکا اور جو کچھ کائنات میں ہونے والا ہے اُس کا پورا پورا علم اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔ تفریط ہی نہیں افراط سے بھی بچنے کی ضرورت ہے۔

صاحبِ "حجاز نامہ" جب ہندوستان سے حجاز کا سفر کر رہے تھے تو سمندر کے ایک نظارے کو اُنھوں نے اس طرح پیش کیا ہے ——— "یکایک معلوم ہوا جیسے کوئی اٹھر دوشیزہ نہاتی ہوئی پانی سے سونے کی تھالی اُچھال دے" (صفحہ ۲) یہ تو رومانی افسانوں کی زبان ہے، "حجاز نامہ" کے صفحات پر یہ تشبیہہ بھلی نہیں لگتی۔

"حجاز نامہ" کے آخر میں ولولہ انگیز نظمیں ہیں، حجاز کے بعض تاریخی واقعات نے اس کتاب کی افادیت کو اور بڑھا دیا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو یہ سعادت عطا فرمائے (آمین)

نذرِ حجاز

"نذرِ حجاز" از :- انیق جون پوری، ۹۶ صفحات، ملنے کا پتہ :- نسیم بک ڈپو، لکھنؤ،

"نذرِ حجاز"، مولانا انیق جون پوری مرحوم کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے، شعروں میں سلاست اور روانی ہے، بہت سی نعتیہ غزلیں مولود خوانوں کے کام کی ہیں، حُبِ رسولؐ کی فراوانی ہے مگر اس میں بہت کچھ "غلو" پایا جاتا ہے، مولانا انیق کس عقیدے کے شاعر تھے اُس کا اظہار اُن کے اِس مطلع سے ہوتا ہے

شفیع المذنبیں کو رات دن ہم یاد کرتے ہیں　　جو ہم سے بیکسوں کی ہر گھڑی امداد کرتے ہیں

شعروں میں جا بجا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے "استغاثہ" کیا ہے، امداد چاہی ہے، دُہائی دی ہے، دستگیری کے لئے پکارا ہے ——— یہ "غلو" بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہونچ گیا ہے۔

احد ڈال کر بُرقعِ میم مُنہ پر　　قدم سے ہو سوئے حدوث آنے والا　　(صفحہ ۱۵)

ایسی باتیں ایک توحید پرست کو ہرگز ہرگز زیب نہیں دیتیں، اس قسم کی منقبت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوش نہیں ہو سکتے ——— ہم جانتے ہیں کہ اس تنقید پر "وہابیت" اور "نجدیت" یا کم سے کم "دیو بندیت" کا فتویٰ ہم پر ضرور لگایا جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ مگر

؎ مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

جنوبی ہند میں دو ہفتے

"جنوبی ہند میں دو ہفتے" از :- جگن ناتھ آزاد، ضخامت ۸۰ صفحے، سادہ دو رنگین سر ورق، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ ——— دہلی کتاب گھر، دہلی

اردو زبان کے مشہور نغز گو شاعر جناب جگن ناتھ آزاد مشاعرے کے سلسلہ میں مدراس تشریف لے گئے تھے اور راستہ میں حیدرآباد بھی اُتر پڑے، یہ کتاب اُسی سفر کی داستان ہے، آزاد نثر نگاری پر بھی کافی قدرت رکھتے ہیں، لطف یہ ہے کہ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مفہوم خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر جاتے ہیں۔

دورانِ سفر میں صاحبِ سفر نامہ کی ایک ایسے شخص سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے جو نیپال کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے ———

"یہاں (نیپال) کے عوام کا افلاس ناقابلِ بیان ہے، اَسّی (۸۰) فی صدی لوگوں کو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی، تعلیم کا معیار بھی بہت پست اور ناقص ہے سارے نیپال میں کوئی اخبار نہیں اور نہ کوئی پبلک لائبریری ہی پائی جاتی ہو۔" (صفحہ ۱۹)۔!

مُصنّف نے حیدرآباد دکن، اور مدراس کے ادبی اجتماعوں اور مشاعروں کی تفصیل بڑے دلچسپ پیرایہ میں بیان کی ہے، اس کو پڑھ کر دکن، مدراس، بنگلور اور میسور کے مشاعروں اور علمی وادبی جلسوں کی یاد تازہ ہوگئی اور وہ نقش ایک ایک کرکے اُبھر آئے

ع گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

صفحہ (۳۰) پر عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلہ میں لکھا ہو "یہ ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی ہے جس نے اپنی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا اور ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر محی الدین اور ڈاکٹر عزیز الدین ایسی شخصیتوں کو پیدا کیا۔۔۔" ڈاکٹر عزیز الدین سے مصنّف کی مُراد "ڈاکٹر رضی الدین صدیقی" کی ذات معلوم ہوتی ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے سب سے زیادہ قابلِ فخر فرزند ہیں!

یونیورسٹی گرلز کالج میں جب آزاد صاحب گئے ہیں اور وہاں اُنھوں نے اپنا کلام سُنایا ہے تو وہ لکھتے ہیں کہ "کوئی سو کے قریب لڑکیوں نے مجھے گھیر لیا، یہ ہجوم آٹو گراف لینے کے لئے جمع ہوا تھا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے اس انقلاب کے بعد بلدہ حیدرآباد میں بے حجابی بہت عام ہوگئی، زوالِ دولت کے بعد شاید زوالِ تہذیب و اخلاق بھی ضروری ہے ——— کس کس نقصان کا ماتم کیا جائے!

آزاد صاحب دہلی سے مدراس تک کا سفر کرتے ہیں، دو ہزار میل کا سفر! مختلف صوبوں سے گزرتے ہیں اور ہر جگہ اُردو زبان کا چرچا پاتے ہیں مگر بھارت کی سیکیولر حکومت ہے کہ بھارت کی عوامی زبان اور ہندوستان گیر بولی کو مٹانے پر تُلی ہوئی ہے، اُردو انشاء اللہ مٹے گی تو نہیں مگر اُس کے مٹانے کی کوشش کرنے والے علم و ادب کی تاریخ میں اپنے بُرے نام چھوڑ جائیں گے۔

اُردو "اُردو" از: جگن ناتھ آزاد، ضخامت ۲۴ صفحے، خوبصورت سرورق، قیمت چھ آنے، ملنے کا پتہ:- کتاب گھر دہلی

یہ نظم جناب جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۴۴ء میں کہی تھی، یہ نظم کہیں چھپ نہ سکی موصوف کے کاغذات میں دھری رہ گئی، تقسیم ہند کے بعد اُن کے کاغذات سے مسودہ برآمد ہوا اور اب یہ چھپ کر منظرِ عام پر آئی ہے!

اس نظم کے اکثر اشعار رواں اور برجستہ ہیں، اُردو زبان سے شاعر کی غیر معمولی دلچسپی بلکہ یوں کہئے والہانہ شیفتگی ایک ایک مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہو، نظم میں اس بات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔

---

۵۱ اور تبت" تک کمیونزم آچکا ہو، بھارت راج کے کرتا دھرتا کس غفلت کی نیند سو رہے ہیں (م - ق)

اسے اہلِ وطن دیکھیں نہ ہرگز بد گمانی سے
کہ دُھل کر آئی ہے یہ زمزم و گنگا کے پانی سے

کاش! بھارت ورش کے منتریوں اور پردھان منتریوں کے دلوں پر جگن ناتھ آزاد کے دل کی پرچھائیں ہی پڑ جائے!

اسلام کا معاشیاتی نظام

"اسلام کا معاشیاتی نظام" از: حیدر زماں صدیقی، ضخامت ۱۸۴ صفحات، کتابت، طباعت، جلد، سرورق ہر چیز اچھی! قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ:- کتاب منزل لاہور!

جناب حیدر زماں صدیقی اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسلامی فکر رکھتے ہیں اُن کی چند کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں —— یہ کتاب اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ "معاشیات" دورِ حاضر کا مقبول ترین موضوع ہے۔

فاضل مصنف نے اشتراکی اور سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں اسلامی نظام معیشت و اقتصاد کو عوام کے لئے بہتر، مفید اور فطرت سے قریب ترین ثابت کیا ہے، اور ایک خطرناک قسم کی غلط فہمی جو خود مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہے اُس کے بارے میں دو ٹوک بات کہی ہے:-

"جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سوشلزم اسلام سے مناسبت رکھتا ہے وہ ایک خطرناک گمراہی میں مبتلا ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ جاہلی نظامات میں اگر کوئی سب سے زیادہ مکروہ اور خطرناک نظام ہے تو وہ اشتراکیت ہے۔" (صفحہ ۳۰)

کارل مارکس کا دعویٰ ہے کہ دنیا کے تمام تغیرات اور واقعات کی تہ میں معاشی ضرورت کا ہاتھ ہوتا ہے مگر حیدر زماں صدیقی اس دعوے کی تردید فرماتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں صحیح کہتے ہیں ——

"کارل مارکس کا یہ خیال کہ دنیا کے واقعات کی تہ میں صرف معاشی ضرورت ہی کارفرما ہی ہے ایک ایسا سفید جھوٹ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی جھوٹ نہیں ہو سکتا، افسوس ہے کہ اُس شخص نے انبیاء و رُسل کے طریقِ دعوت اور تاریخ اسلامی کا بغور مطالعہ نہیں کیا ورنہ اُسے یہ رائے قائم کرنے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی ..." (صفحہ ۹۲)

اس قسم کے بہت سے حقایق اس کتاب میں ملتے ہیں:-

"درحقیقت اجزاءِ حیات کے توازن کو برقرار رکھنا انسانی زندگی کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے مگر اس کا فہم عقلِ انسانی سے بالاتر ہے اور اس کے لئے انبیاء و رُسل کی الہامی تعلیم کی ضرورت ہے، قرآنِ حکیم نے انبیاء و رُسل کی بعثت کا یہ مقصد ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے

ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

ہم نے اپنے رسولوں کو آیات بینات کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ہمراہ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ لوگ نقطہ عدل پر قائم ہو جائیں۔

یعنی حیاتِ انسانی کو افراط و تفریط کی راہوں سے ہٹا کر اُس کے اجزا میں ربط و نظم اور ہم آہنگی پیدا کرنا انبیاء و رسل کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہے۔" (صفحہ ۹۴ و ۹۵)

لائق مصنف نے کتنی سچی بات کہی ہے:-

" نظامِ اشتراکیت اور نظامِ سرمایہ داری انجام کے اعتبار سے ایک ہی ہیں بلکہ نظامِ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس میں ملک کی دولت بہت سے سرمایہ دار بنیوں کے قبضہ سے نکل کر بنیوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے اور اس طرح ملک کا سرمایہ افرادِ انسانی میں پھیلنے کے بجائے اور زیادہ سمٹ جاتا ہے ۔۔۔۔۔ (صفحہ ۹۸)

کتاب اپنے موضوع پر بہت خوب ہے، طرزِ نگارش بھی دلنشین ہے، دو چار جگہ زبان کی خامی پائی جاتی ہے:۔۔۔ " قانونِ قدرت (LAW OF NATURE) اپنا کام بہرحال جاری رکھتا ہے ۔۔۔ " (صفحہ ۱۹) کاش! مصنف نے " کے اس غلط استعمال کو چھوڑ سکتے !

لائق مصنف شرعی نقطۂ نگاہ سے زمین کی ملکیت کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کے قایل نہیں ہیں کہ زمین کا مالک عقدِ مزارعت کے ذریعہ دوسروں سے زمین کاشت کرائے ۔۔۔۔۔ اُن کی یہ رائے درست نہیں ہے ۔۔۔۔۔ سچ تو یہ ہے کہ زمانے کے رجحانات سے کسی نہ کسی حد تک اچھے اچھے متاثر ہو ہی جاتے ہیں! مگر وہ جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے !

ساتواں شاستر

" ساتواں شاستر " از:۔ فکر تونسوی، حجم ۲۰۲ صفحے، مجلد گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے بارہ آنے، ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ شاہراہ دہلی !

یہ کتاب چند " افسانچوں " کا مجموعہ ہے، فکر تونسوی اس کے لکھنے والے ہیں، مضامین کی نگارش اور کتاب کی اشاعت کی غرض " اشتراکی " خیالات اور تصورات کی تبلیغ ہے جس مقصد کیلئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس مقصد میں بہرحال کامیاب ہے، سرمایہ داری اور مغربی جمہوریت کی طنز کی لپیٹ میں خدا، مذہب اور اخلاق بھی آگئے ہیں۔

کتاب کا آغاز زیادہ شگفتہ نہیں ہے، مگر آگے چل کر تحریر میں روانی اور برجستگی پیدا ہوتی چلی گئی ہے، افسانہ نگار کو " اشتراکیت " سے غیر معمولی شغف بلکہ عقیدت ہے اس لئے جہاں وہ اشتراکیت کی حمایت اور دوسرے نظریوں کی تردید کرتے ہیں وہاں ان کا قلم اور زیادہ رواں اور پُرجوش ہو جاتا ہے، خدا اور مذہب کا جہاں نام آتا ہے، وہاں اپنی جھنجلاہٹ کو وہ چھپا ہی نہیں سکتے ۔

" ساتواں شاستر " کا پیشِ لفظ جناب احتشام حسین نے لکھا ہے جس میں اُن کی دوسری تحریروں کی طرح " گھٹن " سی پائی جاتی ہے، پیشِ لفظ کے بعد خود مصنف نے " عرضِ مدعا " کیا ہے اور پھر افسانے شروع ہو جاتے ہیں۔

" اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض صلاحیتیں کوئی جسمانی یا جذباتی چوٹ پاکر جاگ اٹھتی ہیں " (احتشام حسین) " چوٹ کھاکر " لکھنا چاہیئے تھا ۔۔۔۔۔ صفحہ (۱۰) " ایک خاص روپ[۱] کچھ زیادہ ہی تیز ہوتا جارہا ہے ۔۔ " " روپ کا تیز ہونا " مہمل سی بات ہے ۔۔۔۔۔ صفحہ (۱۲) " اگر ہم فرض کرلیں کہ ہم نے پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہے تو اس وقت آنتوں کی تلملاہٹ میں سے جو ایک خاص تال سا اُبھرتا ہے، وہی اُبھار آزادی کے فرض کرلینے کے بعد ہمارے لوگوں میں بھی آیا، اس اُبھار میں ایک کڑواہٹ تھی، یا شعوری تبسم تھا، ہونٹوں کے کونے کچھ اس طرح دبتے اور اُبھرتے تھے، پھڑکتے اور دھڑکتے تھے جیسے کہہ رہے ہوں " بجا فرمایا حضور ۔۔۔ " ۔۔۔۔۔ (صفحہ ۱۴) اس بکواس پر تنقید کرنا لفظوں کی توہین ہے، یہی وہ " ترقی پسندانہ " اندازِ بیان ہے جو اردو زبان و ادب کو رسوا اور ذلیل کر رہا ہے۔ اور زبان و قلم کو جس کی پرچھائیں سے بھی دور رہنا چاہیئے ۔

---

[۱] اگر یہ " Style " کا ترجمہ ہے تو غلط اور نامانوس ترجمہ ہے !

(صفحہ ۱۸) — "یہ چوراہہ، ہر چوراہہ کی طرح چاروں سمتوں کو پھوٹتا ہے" راستہ کے لئے "پھوٹنا" نہیں "پھٹنا" بولتے ہیں —— صفحہ (۳۵) "ہزاروں دوشیزاؤں کی عصمتیں چاک کردی گئیں" — "ردائے عصمت یا دامنِ عصمت" چاک کردیئے گئے یا عصمتیں لوٹ لی گئیں یا خراب کردی گئیں" درست تھا —— صفحہ (۴۰) "لیکن میری سوچیں ہمیشہ واہیات بن جاتی ہیں" وہ لوگ بڑے بدذوق ہیں جو "یاد" کی جمع "یادیں" اور "سوچ" کی جمع "سوچیں" بناتے ہیں —— صفحہ (۴۵) "کڑوے کڑوے آنسو بہتے" —— "گرم آنسو" تو سُنے تھے مگر آج معلوم ہوا کہ آنسو میٹھے اور کڑوے بھی ہوتے ہیں —— صفحہ (۵۳) "تمہاری سمجھ پھولوں پھلوں اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے رچی ہوئی ہو —— اوّل تو "سمجھ کا رچنا" ہی کچھ کم عجیب نہ تھا اور "ہوا کے جھونکوں سے رچنا" تو "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" والی بات ہوئی —— صفحہ (۱۲۱) "ڈاکٹر بازخاں کی گونجیلی آواز سُنائی دیتی ہے —— "گرجدار" یا "گونجنے والی" آواز لکھنا تھا —— "صفحہ (۱۶۰) شاستروں کے الفاظ بوکھلا اُٹھے" —— "الفاظ کا بوکھلا جانا" خود مضمون نگار کے فکر و خیال کی "بوکھلاہٹ" کی دلیل ہے —— "صفحہ ۱۹۲) — "اس نئی آفت کو بھی کیمپوں اور بحالیت کے محکمے کے حوالے کردیا —— "بحالیت" کی جگہ "بحالی" لکھنا تھا —— "صفحہ ۱۹۵" — "جب اس شرنارتھی کو ہوش آئی" —— اس "ہوش آئی" نے وجدان کو نہ جانے کتنی دیر تک کے لئے بدمزہ کردیا ——

مضمونوں، نظموں اور افسانوں میں ہم "اسلام" کو پیش کرتے ہیں تو کہا جاتا ہے اس طرح "ادب" کو بانٹا جارہا ہے، لٹریچر کی "آفاقیت" مجروح ہورہی ہے، ادب سے پروپیگنڈے کا کام لیا جارہا ہے —— اور یہ کمیونسٹ ادیب جو "کمیونزم" کا پرچار "ادب" کے ذریعہ کرتے ہیں ان کو کوئی کچھ نہیں کہتا، اس ذہنیت کے معترضین اور طنّاز حقیقت میں اسلام سے کد اور اشتراکیت اور بے دینی سے ربط رکھتے ہیں —!

فاران

ماہر القادری

جلد ۲ شمارہ (۹)

ماہنامہ

فاران

دسمبر ۱۹۵۱ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران" — کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم

Z

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا تھا اور جس کی دستور ساز اسمبلی نے "قرارداد مقاصد" کے ذریعہ پاکستان کے طول و عرض میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کا عہد کیا تھا، اُس پاکستان میں مسلمان عورتوں کی بے حجابی، آزادی اور بے باکی اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے کہ اگر اس سیلابِ معصیت کو نہ روکا گیا اور اس طوفانِ بدتمیزی کو چیک نہ کیا گیا تو ہمارا سارا معاشرتی نظام درہم برہم ہو جائیگا، اور ہو کیا جائے گا اُس کے آثار پیدا ہو رہے ہیں!

عوام اور خواص سبھی اس خرابی اور بے اعتدالی کے ذمہ دار ہیں، زبان پر "اسلام" "اسلام" کے نعرے مگر اعمال روحِ اسلام سے خالی! ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اُس کے لئے شواہد رکھتے ہیں کہ اسلامی مملکت پاکستان میں اسلامی ماحول پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مغربی تمدن اور غیر اسلامی ماحول کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے ــــــ تعلیم گاہوں اور علمی اداروں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی ملی جلی تعلیم کی کس نے اجازت دی ہے؟ عورتوں کے فوجی دستے کس نے قایم کئے ہیں؟ نوجوان لڑکیوں کو یورپ تعلیم حاصل کرنے کے لئے کون بھیجتا ہے؟ دعوتوں، پارٹیوں اور تفریحی جلسوں میں عورتوں اور مردوں کی یکجائی اور اختلاط کا کون ذمہ دار ہے؟ مسلمان لڑکیاں کس کی سرپرستی میں ڈرامے کھیلتی اور ایکٹنگ کرتی ہیں؟ اُن کی اداکاری اور رقص و نغمہ پر کون انعام دیتا ہے؟ گھوڑ دوڑ کی قماربازی کس کی اجازت سے ہوتی ہے جہاں عورتوں کو اپنے حُسن و جمال کی نمود کے علاوہ غیر مردوں کے ساتھ بے باکانہ اختلاط اور لطف انگیز ہم نشینی اور بے تکلفی کے مواقع میسر آتے ہیں؟ یہ وہ حقائق ہیں جن کو جھٹلایا

نہیں جاسکتا، یہ وہ کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کو ایک راہ گیر (street walker) بھی جانتا ہے اور موٹر نشین بھی واقف ہے۔

انگریز اپنی تمام دسیسہ کاریوں کے باوجود ہمارے تمدن اور معاشرت کا تھوڑا بہت لحاظ کرتا تھا مگر پاکستان میں وہ باتیں ہو رہی ہیں کہ جو انگریز کے زمانہ میں بھی نہ ہوتی تھیں ـــــــ "شاگرد اپنے اُستادوں سے بھی آگے بڑھ گئے" !

سب جانتے ہیں کہ اس "پاکستان" کے لئے ہمیں کیا قیمت دینی پڑی ہے ؟ ہزاروں مسجدوں کی ویرانی، سیکڑوں علمی اداروں کی تباہی، ہزاروں مسلم خواتین کی بے عصمتی اور بے آبروئی، لاکھوں فرزندانِ توحید کا قتل اور غارت گری، اور بھارت کے ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں کی غلامی! یہ سب کچھ آخر کس توقع پر گوارا کیا گیا؟ صرف اس توقع پر کہ پاکستان میں ایک اسلامی حکومت قائم ہوگی، اسلامی ماحول پیدا کیا جائے گا، اللہ کا قانون چلے گا اور رسولؐ اللہ کی تعلیمات پر عمل ہوگا! مگر ہو کیا رہا ہے! وہ سب کچھ جو اسلام کے مزاج کے منافی ہے، نہ "منکرات" کو بند کیا گیا اور نہ "معروف" کو قائم کیا گیا، جن مسلمان لڑکیوں کی زندگیوں میں مریمؑ و زہراؓ کی سیرت جھلکنی چاہیئے تھی اور جن کو "رابعہ بصری" بننا تھا وہ "گرٹیا گاربو" اور "دیوکا رانی" بن رہی ہیں اور بن کیا رہی ہیں، ایسا ماحول پیدا کیا گیا ہے کہ وہ یہی بن کر رہیں گی، کانِ نمک میں نمک ہی مل سکتا ہے اُس سے مٹھاس اور حلاوت کی اُمید رکھنا ہی حماقت ہے! ناچ گھروں اور موسیقی کے اسکولوں میں مُطرب و مغنّی اور رقّاص ہی پیدا ہوں گے، بلالؓ و ابوذرؓ اور خالدؓ تو پیدا ہونے سے رہے!

خدا جانتا ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم، ترقی اور اُن کی بہتری کے مخالف نہیں ہیں اور ایک مسلمان جو کتاب و سنت پر ایمان رکھتا ہے اس کے ذہن میں ایسا ناپاک خیال پیدا ہو ہی نہیں سکتا، اسلام نے مردوں کو حکم دیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ بہتر سے بہتر حُسنِ سلوک کریں، یہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے عورت کو ذلت کی پستی سے نکال کر عزت کی بلندی پر بٹھا دیا، اسلام سے بہتر عورت کے حقوق اور منصب کو اور کون پہچان سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو مرد و عورت کی فطرت کا خالق ہے وہی بہتر جان سکتا ہے اور جانتا ہے کہ ان دونوں کے ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں؟ زندگی میں ان کے حدودِ عمل کیا ہیں؟ اور ان دونوں صنفوں کی معاشرت کا انداز کیا ہونا چاہیئے ؟

پس ہم چاہتے ہیں کہ عورت کو وہ تمام حقوق ملنے چاہئیں جو اسلام نے اُس کے لئے مقرر کئے ہیں اور اُس کی تمام ترقیوں، حوصلہ مندیوں، توانائیوں اور تگ و تاز کا ظہور اسلامی حدود کے اندر ہونا ضروری ہے! مغرب نے عورت کی آزادی اور ترقی کا جو معیار مقرر کیا ہے، وہ غیر فطری معیار ہے، ہم اُسے تسلیم نہیں کرتے، مغرب نے عورت کے ساتھ وہ ظلم کیا ہے جو جاہلیت کے دور میں بھی شاید نہ ہوا تھا، عورت کا سب سے بڑا جوہر "عصمت" ہے اور مغرب صنفِ نازک کی بے عصمتی اور بے آبروئی پر تُلا ہوا ہے، اُس نے عورت کو تسکین ہوس کا ایک کھلونا سمجھ رکھا ہے، وہ اُسے جس اسٹیج پر چاہتا ہے لے آتا ہے! فلم اسٹوڈیو، تھیٹر ہال، رقص گاہیں، آرٹ سرکل اور ننگوں کے کلب ان سب کی رنگینیاں عورت کی عصمت کے خون ہی سے تو قائم ہیں! مغرب نے عورت سے اُس کا "عورت پن" چھین لیا اور مقام افسوس و ماتم ہے کہ عورت اپنا سب کچھ گنوا کر خوش اور مطمئن ہے! اُسے زہر پلایا جا رہا ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ آبِ حیات کے گھونٹ پی رہی ہے اُس کی "شخصیت" کو ذبح کیا جا رہا ہے اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ اُسے زندگی عطا ہو رہی ہے، ہر جگہ اُس کی بے آبروئی ہو رہی ہے اور وہ اس "حسنِ ظن" میں مبتلا ہے کہ اس کو عزتیں اور بلندیاں دی جا رہی ہیں!

عورت کا سب سے بڑا وصف جس پر اُس کی شخصیت کا مدار ہے، عصمتِ کردار، پاکیزگی سیرت اور عفت و حیا ہے، یہ نہیں تو کچھ نہیں، چاہے ہوا بازی، قدر اندازی، تیراکی، شہسواری، اور تقریر و تحریر میں وہ یگانۂ روزگار ہی کیوں نہ ہو! عورت کے لئے پہلے "عصمت" اور بعد میں سب کچھ! اُس کی تمام خوبیوں کا مرکز "عصمت" ہے اور اس محور کے ارد گرد اُس کی تمام زندگی گھومتی ہے اور گھومنی چاہیئے، اسلام نے

جو دینِ فطرت ہی ہر اُس پوشیدہ سے پوشیدہ خطرے اور نازک سے نازک داعیہ کی نشان دہی کر دی ہو جہاں عورت کی عصمت و پاکیزگی کو نقصان پہنچتا ہو، اسلام عورت کو علم سیکھنے کی تاکید کرتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ... ... "طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مُسلم و مُسلمۃٍ" لیکن اسلام کی نگاہ میں بے عصمت اور آبرو باختہ عالم و فاضل عورت ایک باعصمت اور باحیا جاہل عورت کے پاؤں کے دھوون کی برابر بھی نہیں ہے۔

جوانی کا زمانہ بڑا ہی ہنگامہ آرا اور طوفان خیز زمانہ ہوتا ہے، جذبات تُند و سرکش، بے باک اور شعلہ ساماں! اس زمانہ میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو تعلیم و تدریس کے لئے یک جا کر دینا نہایت ہی خطرناک قسم کا تجربہ ہے، ناممکن ہے کہ لغزشیں ظہور میں نہ آئیں اور بے اعتدالیاں پیدا نہ ہوں اور اس ماحول میں جب کہ ریڈیو، فلم، عریاں تصویروں اور فحش لٹریچر نے دل و دماغ کو مسحور کر دیا ہو، درس گاہوں کے نصاب میں بھی رنگین اور جذباتی تجدد کی نظمیں اور ڈرامے شامل ہوں، مرد عورتوں کی نظارہ بازی اور اُن کے تعاقب کے عادی ہوں، طلباء اور طالبات کی یہ مخلوط تعلیم خطرے سے خالی نہیں، اس میں نفع کم اور نقصان زیادہ ہے! "اخلاق" کے کم سے کم نقصان کے بعد زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنے میں بھی خسارہ ہے! اور تعلیم کا یہ موجودہ مغربی انداز لڑکی کو "چراغِ خانہ" بنانے کے بجائے "شمعِ انجمن" بناتا ہے، یہ قیاس آرائیاں نہیں حقائق ہیں، یہ مشاہدات ہیں یہ وہ محسوس واقعات ہیں جو رات دن نظر آتے ہیں!

عورت کو ہم یقیناً "گڑیا" بنا کر رکھنا نہیں چاہتے لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ وہ "ایکٹریس" بن جائے یہ دونوں انتہائیں غلط ہیں! حجاب و اخلاق کے حدود میں رہ کر وہ فنِ حرب بھی سیکھ سکتی ہے تاکہ ضرورت کے وقت اپنی، اپنے گھر والوں کی اور اپنے ملک کی حفاظت کر سکے، مگر عورتوں کی یہ کھُلے بندوں پریڈ، یہ سینے تان تان کر "سیلوٹ" (S A L U T E) اور مارچنگ، یہ جسمانی اعضاء کی نمایش! اسلام اور اخلاق کی نگاہ میں انتہائی مذموم ہے، عورتوں کو عصمت و عفت کی حفاظت کے لئے سپاہی بنایا جاتا ہے مگر جس انداز پر وہ سپاہی بنائی جاتی ہیں، وہ طریقہ ہی خود اپنی جگہ عصمت و پاکیزگی کے لئے خطرناک ہے! جو مسلمان عورت غیر محرم مردوں کو سینہ تان کر سلامی دیتی ہو اُس کو اسلامی شرم و حیا سے کیا واسطہ؟ جو لوگ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ، اُم سلیطؓ اور خولہؓ کی مثالیں پیش کرتے ہیں وہ اپنے خود تراشیدہ نظریوں کی جواز کی خاطر اسلام کو رُسوا کرتے ہیں۔

پاکستان میں زنانہ "نیشنل گارڈ" بھی دوسری باتوں کی طرح خداوندانِ مغرب اور اُستادانِ فرنگ کی نقالی کا ایک شاہکار ہے! کیا یہ طے کر لیا گیا ہے کہ مغرب کی ایک ایک ادا کو پاکستان میں مجسّم کر کے دکھایا جائے گا، لندن اور واشنگٹن میں جو کچھ ہوتا ہے لاہور اور کراچی میں ٹھیک اُسی کی نقل کی جائے گی! پاکستان اسمبلی نے جس "قرار دادِ مقاصد" کو منظور کیا تھا اُس میں تو "اسلامی ماحول پیدا کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا، مگر ہو کچھ اور رہا ہے" ... ... اور

؎ ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی!

جو افراد قانون و اختیار کے نفاذ و عمل کے ذمہ دار ہیں اُن سے قیامت کے دن پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنے فضل سے تمہیں اقتدار بخشا تھا اور حکومت عطا فرمائی تھی بتاؤ! کہ تم نے اسلام کے لئے کیا کیا؟ کس "منکر" کو مٹایا اور کس "معروف" کو قائم کیا؟

مغرب کا معیارِ اخلاق یہ ہے کہ ہٹلر کی فوجیں جب دار السلطنت سے محاذِ جنگ کے لئے روانہ ہو رہی تھیں تو ایک نوجوان لڑکی

راستہ میں کھڑی ہو گئی تھی اور سپاہی اُس کے لب و رخسار کو چوم کر آگے بڑھتے جاتے تھے، جرمنی کے رہنے والوں نے اُس عورت کے اس ایثار کو بہت کچھ سراہا مگر اسلام کا معیارِ اخلاق یہ ہے کہ ساری زمین اور ہفت اقلیم بھی ایک عورت کی عصمت کی قیمت نہیں ہو سکتیں، کسی بڑے سے بڑے ملکی اور قومی مفاد کے لئے عصمت و اخلاق کا نقصان گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

جس مذہب میں فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے بھی عورت کو تنہا یا غیر محرم مرد کے ساتھ جانے کی اجازت نہ ہو، وہ مذہب یہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ عورتوں کو تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لئے یورپ بھیج دیا جائے ——— اُس یورپ میں جہاں عصمت و اخلاق کو سبزے کی طرح روند دیا جاتا ہے، جہاں لڑکی جوان بھی نہیں ہونے پاتی کہ معاشقہ شروع ہو جاتا ہے، جس جگہ بے حیائی، بد اخلاقی اور بد چلنی زندگی کا "ROUTINE" بن چکی ہیں! نہ جانے وہ کس دل گردے کے ماں باپ، بھائی اور سرپرست ہیں جو اپنی بہنوں اور بہو بیٹیوں کو معصیت و فحاشی کے اُس طوفان میں ہنسی خوشی بھیج دیتے ہیں اور یہ کس قسم کی "اسلامی حکومت"!

گزارشیں

مسلمانوں نے مسلم لیگ کی قیادت کو صرف اس لئے قبول کیا کہ لیگ نے "اسلام" کا نعرہ بلند کیا تھا، پاکستان اسلام کی بنیاد ہی پر وجود میں آیا ہے اور اسلام وہی ہے جو کتاب و سنت میں پایا جاتا ہے! اللہ کے مقدس کلام اور رسول اللہ کے ارشاداتِ گرامی کا ایک ایک حرف شاہد ہے کہ عورتوں کے "تبرج" کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے، جاہلیت میں مردوں اور عورتوں کے بے باکانہ اختلاط کی جو رسم جاری تھی اسلام نے اُسے مٹا دیا ——— پس پاکستان میں جاہلیت کی اس مذموم رسم اور بُرے چلن کو جو کوئی رواج دیتا ہے وہ پاکستان کی اخلاقی بنیادوں کو کمزور کرتا ہے۔

ارباب حکومت کے ہم ہاتھ جوڑتے ہیں اور خدا اور رسولؐ کا واسطہ دے کر اُن سے عرض کرتے ہیں وہ اپنے فرض اور ذمہ داری کو پہچانیں اُن کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیئے، جس سے یہ سمجھا جائے کہ "فتنۂ آزادی و بے حجابی" کی اس طرح حوصلہ افزائی ہو رہی ہے! پاکستان کے اعزاز و منصب کی کرسی اپنے ساتھ "اسلام" کی ذمہ داریاں رکھتی ہے ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور نباہنا ہر پاکستانی عہدیدار کا فرض ہے؟ جہاں غفلت اور کوتاہی نظر آئے گی، قلم و زبان وہاں تنقید و احتساب اور اظہارِ حق کا فریضہ انجام دیں گے ——— تنقید اور وہ بھی "اپنوں" پر ایک ناخوش گوار فرض ہے، مگر اصلاح و تعمیر اور درستی کے لئے اس ناخوش گواری کو بھی انگیز کرنا پڑتا ہے!

پاکستان کے نئے وزیر اعظم جناب خواجہ ناظم الدین صاحب اللہ کے فضل سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں اُن سے ہم اصلاحِ حال اور تلافیٔ مافات کی توقع رکھتے ہیں، اُن کی مذہبیت، تسبیح و تہلیل اور تہجد و اشراق کو ہم سرکاری حلقوں پر اثر انداز اور سایہ فگن دیکھنا چاہتے ہیں، خواجہ صاحب موصوف کی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں اگر پاکستان میں اسلامی ماحول پیدا ہو جائے تو اُن کی وزارتِ عظمیٰ کا یہ سب سے زیادہ شاندار کارنامہ ہوگا، کاش! ہماری یہ توقعات پوری ہو سکیں! ہم اللہ تعالیٰ سے پاکستان میں "پاکی" اور "نیکی" "پھیلنے"

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہم علماءِ کرام اور ہمدردانِ ملت کی خدمت میں گزارش کرتے ہیں کہ وہ اس "فتنۂ بے حجابی" کے روکنے کیلئے میدانِ عمل میں آ جائیں، خاموشیوں کے قفل ٹوٹ جانے چاہئیں، علماءِ اسلام کا کوئی طبقہ اور اُن کی کوئی جماعت بھی مغرب زدگی، فرنگی تہذیب، دین و اخلاق سے بے تعلقی اور عورتوں کی بے حجابی کو

پسند نہیں کرتا، یہ وہ مشترکہ اور متحدہ محاذ ہے جہاں سب جمع ہوسکتے ہیں، ایک آدھ تقریر یا اشاریت اور اجمال سے کام نہیں چلے گا خوب کھل کر دوٹوک بات کہنے کی ضرورت ہے۔

اس کام کیلئے خاص طور پر جلسے بھی منعقد کئے جاسکتے ہیں مگر ان اجتماعات اور جلسوں میں نمود و نمائش اور داد و ستائش کا جذبہ شریک نہ ہونا چاہیئے کہ جہاں اخلاص نہ ہو وہاں نہ کام میں برکت ہوتی ہے اور نہ قلوب خاطر خواہ اثر قبول کرتے ہیں، اور ہم یہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ کراچی کے بعض جلسوں کا رنگ ہم نے دیکھا ہے جہاں "صدر" بننے کیلئے جلسے کرائے جاتے ہیں اس لئے کہ اخبارات میں فوٹو چھپیں، بار بار نام آئے، قومی رضا کاروں کی سلامی کا فخر اور لذت نفس نصیب ہو، لیڈری کیلئے زمین ہموار ہوجائے بلکہ ہوتی رہے ——— "فتنۂ بے حجابی" کی روک تھام کے لئے جو اجتماعات منعقد ہوں اُن کی غرض صرف اصلاح حال، نہی عن المنکر، امر بالمعروف اور خدا اور رسول ؐ کی خوشنودی ہونی چاہیئے، اللہ تعالیٰ نفس کی چوریوں اور دلوں کے حال سے واقف ہے وہاں "نیت" پر اجر و ثواب ملتا ہے!

سیرۃ النبی کے مُبارک اجتماعات کے علاوہ دوسرے قومی اور مذہبی جلسے بھی ہوتے رہتے ہیں اُن میں اس موضوع پر خاص طور پر بولنے کی ضرورت ہے، قصر و ایوان سے کوئی مایوس ہو تو ہو مگر جھونپڑیوں، مکانوں اور فلیٹوں سے ہم مایوس نہیں ہیں عوام مسلمانوں میں اس گئے گزرے زمانہ میں بھی غیرت اور حمیت موجود ہے اُن کی غیرت سے اپیل کی جائے گی تو اس کا اثر ہوگا اور ضرور ہوگا، سب نہیں تو زیادہ سے زیادہ اور زیادہ نہیں تو تھوڑے آدمی تو متاثر ہوں گے، ہم کہتے ہیں کہ سو دو سو گھرانے بھی اس بُرائی سے بچ گئے تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے!

عوام مُسلمانوں میں اللہ کے فضل سے غیرت کی گرمی موجود ہے اُن کے دل سوزِ حمیت سے خالی نہیں ہیں اور ہمیں اس کا ذاتی طور پر تجربہ ہے ——— بھساول[1] میں سیرۃ النبی کے جلسہ میں مُقرر نے مُسلمان مردوں اور پردہ نشین عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ مُسلم خواتین جن کی غیرت و حیا دُنیا کے لئے ایک مثال، نمونہ اور ضرب المثل ہونی چاہیئے اُن کا سینما دیکھنا کس درجہ معیوب بات ہے، وہ کیسے مرد ہیں جو اپنی ماؤں، بہنوں، اور بیٹیوں کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ فلم کے پردے پر بوس و کنار، چھیڑ چھاڑ اور عشق بازی کے مناظر جاکر دیکھیں ——— صرف ایک گھنٹہ کی تقریر مگر اس کا یہ اثر ہوا کہ جلسہ کوئی دس بارہ دن بعد بھساول سے ایک صاحب نے ہمیں خط لکھا کہ یہاں کے سینماؤں میں اس تقریر کے بعد مُسلمان عورتیں نظر نہیں آتیں!

مساجد کے اماموں کا فرض ہے کہ وہ اپنی ہر تقریر میں مسلمانوں کو غیرت دلائیں کہ جو لوگ نماز پڑھنے کیلئے آتے ہیں کم سے کم اُن کے گھراؤں میں تو اس فتنہ کو داخلہ کی اجازت نہ ملنی چاہیئے، مردوں سے یہ بھی کہا جائے کہ عورتوں کو حجاب کا اور تمھیں "غض بصر" کا حکم دیا گیا ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ "آنکھ کا زنا اُس کا دیکھنا ہے" پہلی اچانک اور اتفاقیہ نظر معاف ہے مگر دوسری نگاہ معصیت ہے کہ نظارہ ہی اس کاروانِ ہوس و معصیت کا نقیب ہوتا ہے اور زہر کا پہلا قطرہ آنکھیں ہی ٹپکاتی ہیں!

عوام کی خدمت میں عرض ہے ——— "النّاس علیٰ دینِ ملوکھم" کی اثر آفرینی اور گیرائی کے ہم منکر نہیں ہیں، ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ قصر و ایوان کے تمدن کا اثر عوام کے جھونپڑوں اور مکانوں پر بھی پڑتا ہے اور ایک "بیگم صاحبہ" کے کھلے ہوئے

---

[1] سی۔ پی۔ بمبئی میں جی، آئی، پی ریلوے کا بہت بڑا جنگشن اور ورکشاپ!

گریبان کو دیکھ کر سیکڑوں "شمائیں" بے نقاب ہو جاتی ہیں، یہ سب کچھ درست ہو مگر عوام مسلمان یہ عذر پیش کر کے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے، وہ خود بھی اس خرابی کے ذمہ دار ہیں، سینماؤں میں عورتوں کو جانے کی اجازت خود انھوں نے دی ہے، بازاروں، باغوں اور تفریح گاہوں میں وہ خود عورتوں کو بے پردہ لیکر گھومتے ہیں، اور اس بے اعتدالی کو انھوں نے گوارا کیا ہو کر عورت موٹر بس یا ٹرام میں بیٹھی اور بیٹھتے ہی نقاب جھٹ سے اُلٹ دی، وہ روکتے، ٹوکتے اور شدت برتتے تو عورتیں اتنی آزاد ہرگز نہ ہو جاتیں، پردہ پہلے مردوں کی عقل پر پڑا ہے جب کہیں جاکر عورتیں بے نقاب ہوئی ہیں، مرد کو قدرت نے "قوّام" بنایا تھا مگر اس ہوسناک اور غیر فطری تہذیب نے اُسے عورت کا آئینہ بردار" یا نئی اصطلاح میں اُس کا "پرسنل اسسٹنٹ" اور "پرائیویٹ سکرٹری" بنا دیا۔

سب سے آخر میں ہماری گزارش ارباب صحافت سے ہے! وہ اہلِ قلم جو اپنے اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ بے حجابی کی تبلیغ اور حوصلہ افزائی کرتے اور "مینا بازاروں" کو سراہتے ہیں، وہ ہمارے مخاطب نہیں ہیں، ہمارا خطاب اُن اخبار نویسوں اور اہلِ خامہ و قرطاس سے ہے جن کے دل میں اسلامی درد ہے جن کو اسلام کی سربلندی اور غلبہ مقصود ہے، اور جو اخلاق و عصمت کی قدر و قیمت کا احساس رکھتے ہیں۔

اربابِ صحافت ہم سے زیادہ جانتے ہیں کہ یورپ عورتوں کو ضرورت سے زیادہ آزادی دے کر خود پریشان ہو اور جرمنی میں BACK TO HOME "(عورتیں گھروں کی طرف واپس ہوں) کی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا کہ اتنے میں ہٹلر کی ضد اور غرور نے جرمنی کا بیڑا ہی غرق کر دیا، اب بھی بعض مصلحین اور قوم کے بہی خواہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں مگر اب پانی سر سے گزر چکا ہے، مغرب کی عورت کلبوں، ناچ گھروں اور تفریح گاہوں کی لذت اور بے قید زندگی کو چھوڑ کر گھر گرہستی کے جھمیلوں میں اُلجھنے کے لئے تیار نہیں ہے، جرائم بڑھ رہے ہیں، فواحش پھیل رہے ہیں اور غیرت بیچاری تو وہاں سے کب کا اپنا بستر بوریا باندھ کر رخصت ہو چکی۔

ذوقِ بے حجابی اور شوقِ تبرّج صرف چہرے کی بے نقابی پر ہی قناعت نہیں کرتا، پہلے نقاب اُٹھتی ہے پھر جھکی ہوئی نگاہیں آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہیں، پھر لباس میں تخفیف ہونا شروع ہوتی ہے، پھر آرائش اور بناؤ سنوار میں یہ جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ لوگ دیکھیں اور شوق و قدردانی کی نگاہ سے دیکھیں، ہوسناکیوں، بے اعتدالیوں اور بُرائیوں کا یہ سلسلہ شاخ در شاخ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ جو عورت پہلی بار چہرہ کو بے نقاب کرتے ہوئے فرطِ شرم و غیرت سے پسینہ پسینہ ہو گئی تھی، وہ آگے چل کر کلب گھروں میں غیر مردوں سے بغل گیر ہو کر ناچتی اور تھرکتی ہے۔

مصر، اور ایران اور عراق میں یہی ہوا کہ پہلے عورتیں تنہا برقعے پہن کر تفریح کے لئے جانے لگیں، مردوں کی ہمراہی کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، پھر چہرے بے نقاب ہوئے، پھر برقعوں کو اُتارا گیا، لباس میں کاٹ چھانٹ کی گئی، زینت کے مقامات کی نمائش ہوئی ۔۔۔ اور اب یہ عالم ہو کہ قاہرہ اور طہران کی عورتیں بے حجابی بے باکی اور آزادی میں لندن اور پیرس کی عورتوں سے چار قدم آگے ہیں، ہم نے معتبر لوگوں کی زبانی وہاں کے واقعات سُنے ہیں، ایسے شرمناک واقعات کہ جن کے ذکر سے "فاران" کے صفحات کو ہم آلودہ کرنا نہیں چاہتے۔

ان بُرائیوں کی مثالیں ہندو پاکستان میں بھی ملتی ہیں، حیدر آباد دکن میں یو۔پی کے سادات کا ایک معزز گھرانا آباد ہے، وہاں پہلے "شعر و ادب" کے شوق میں بے پردگی کا آغاز ہوا، پھر یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی، یہاں تک کہ اُس خاندان کی ایک لڑکی نے ایک ہندو ادیب کے ساتھ بیاہ رچالیا۔ ۔۔ ۔۔ "اس آغاز" کے اسی قسم کے خوفناک بلکہ شرمناک "انجام" ہوا کرتے ہیں ۔۔ !

پردہ نشین عورتوں کے مقابلہ میں بے حجاب عورتوں کے ذاتی مصارف ہر حال میں زیادہ ہوتے ہیں! اسباب آرایش، سامانِ زینت، دعوتیں، پارٹیاں، آمد و رفت! یہ سب اُن کے اخراجات کی ناگزیر مدیں (ITEMS) ہیں! امیروں اور خوش حالوں کی تعداد تو عام طور پر کم ہی ہوتی ہے، اوسط درجہ کے لوگ یا پھر غریب زیادہ تر پائے جاتے ہیں! بے پردہ عورتوں کے بڑھتے ہوئے مصارف کے تکمیل کی تین صورتیں ہیں —— مرد اپنی توانائی، اور صلاحیت کے اصلی (NORMAL — AVERAGE) اوسط سے زیادہ کمائیں[1] —— عورتیں کارخانوں، دفتروں، بنکوں اور تجارت گاہوں میں جاکر کام کریں (مگر اس میں مردوں کے ساتھ اختلاط کے سبب عصمت و اخلاق کے لئے بہت سے خطرے ہیں اور ساتھ ہی گھر بار اور بال بچوں کی دیکھ بھال میں کمی اور نقص واقع ہونے کے امکانات ہیں) —— تیسری صورت یہ ہے کہ عورتیں اپنے فیشن، تفریح، آرایش اور دوسرے مصارف کے لئے نامحرم مردوں کے تحفے، ہدیے اور "PRESENTS" قبول کریں اور یہ صورت "عصمت فروشی" کی ایک مہذب شکل ہے۔

صنفِ نازک کی صلاحیتوں کے ہم منکر نہیں ہیں، اور نہ ہم اس "مرد و زن کی برتری اور کمتری" کی بحث میں بھی اُلجھنا نہیں چاہتے مگر یہ امر واقعہ ہے کہ عورت کی جسمانی ساخت اس کی شاہد ہے کہ کارگاہِ حیات میں عورت اور مرد کا وظیفۂ عمل (FUNCTION) بالکل ایک جیسا نہیں ہے، فرض و عمل کی دُنیا میں اُن دونوں کو ایک سطح پر لانا گویا فطرت سے جنگ کرنا ہے، معاشرت میں عورت کی اہمیت مرد سے یقیناً کسی طرح کم نہیں ہے مگر دونوں کے فرائض اور اعمال و اشغال میں ضرور فرق ہے، یہ امتیاز اور فرق باقی رہنا چاہیئے ورنہ سوسائٹی سرکس والوں کا کھیل تماشا بن کر رہ جائے گی —— یورپ میں یہی ہو رہا ہے عورتیں "مرد" بننے کے شوق میں مبتلا ہیں، وہاں کی اہلی زندگی انتہائی بے کیف اور پریشان و آشفتہ ہو گئی ہے اور ہوتی جارہی ہے۔

عورت تدبیر منزل کی ملکہ اور مرد معیشت کا بادشاہ ہے، اس فطری توازن کا باقی رہنا ضروری ہے، نسل کی پرورش اور دیکھ بھال عورت کے ذمہ ہے اور یہ کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے، یہ چھوٹے بچے ہی بڑے ہو کر قوموں، ملکوں اور حکومتوں کی تقدیر کے مالک ہوتے ہیں عورت ہر نئی نسل کی مُربّی ہے، معلّم ہے، نگراں ہے، اُس کی تربیت کا قوم اور مُلک پر بہت بڑا احسان ہے! مگر یہ "ترقی زدہ تہذیب" عورت کو اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے خلاف اُبھارتی اور اُکساتی ہے وہ اُس کے کان میں یہ افسوں پھونکتی رہتی ہے کہ بچوں کو گود میں کھلانا اُن کی دیکھ بھال کرنا اور اُن کیلئے راتوں کو جاگنا اور دن کو بے آرام رہنا، اے آزاد عورت! تیری آزادی کی توہین ہے، تیری محکومی اور پابندی کے دن بیت چکے، اب تو آزاد ہے، شوق سے گھوڑوں پہ سواری کرتا لابوں اور دریاؤں میں تیر، جمناسٹک کے کمالات دکھا: کلب گھروں میں ناچ اور تتلی کی طرح روش روش اور چمن چمن گھومتی پھر!

پاکستان میں اس فتنہ کو روکنا ابھی ناممکن نہیں ہے، پانی اونچا تو ہو گیا ہے، مگر ابھی تک سر سے اونچا نہیں ہوا، اس نوبت پر اس طوفان کی روک تھام ہو سکتی ہے، لیکن چند دن اور اسی عالم میں گزر گئے تو پھر یہ "سرچشمہ" جو آج "میل" سے بند ہو سکتا ہے کل "فیل" کو بھی بہانے جائے گا!

اربابِ صحافت اس سلسلہ میں بہت کچھ کر سکتے ہیں، اُن کے پاس قلم ہے، پریس ہے، آواز ہے، اُن کی بات سُنی اور مانی جاتی ہے، وہ کسی چیز کے خلاف قوم میں محبت و نفرت، اور قبول و بیزاری کے جذبات پیدا کر سکتے ہیں پس اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے "اخبارات" اس فتنہ کے خلاف متحدہ طور پر جد و جہد شروع کریں، لکھیں اور مسلسل لکھیں اور لکھتے ہی

---

[1] اور اس کے لئے بھی ہر مرد کو مواقع میسر نہیں آسکتے!

رہیں، اگر اس جدوجہد کا آغاز ہو گیا ——— اور ہمیں اُمید ہے کہ انشاء اللہ ہو جائے گا ——— تو چند دن میں فضا بدل سکتی ہے! کاش! اس ذمّہ داری کو محسوس کیا جائے!

پاکستان کے دفاع کی اہمیت سے ہم غافل نہیں ہیں اور ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ تمنا رکھتے ہیں کہ اسلام اور پاکستان کی حفاظت اور مدافعت میں جان کا پہلا نذرانہ ہماری طرف سے پیش کیا جائے، یہ جسم آخر کس کام آئے گا اس کا بہترین مصرف یہی ہے کہ اللہ کے راستہ میں ٹھکانے لگ جائے ——— مگر "دفاع"، تبلیغ اخلاق اور امتناعِ مُنکر سے تو نہیں روکتا، اس سے تو "دفاع" اور مضبوط ہوگا، ٹینکوں، توپوں اور بمبار طیاروں کی اہمیت اپنی جگہ ثابت اور مُسلّم لیکن اخلاق و تقویٰ مُسلمان کا سب سے بڑا "دفاع" ہے! ٹینک، توپیں اور طیارے برباد کئے جا سکتے ہیں مگر اخلاق و پرہیز گاری کا یہ قلعہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہ وہ خطِ دفاعی (DEFENCE LINE) ہے جس پر دُشمن فتح پا ہی نہیں سکتا۔

جس دل میں بھی غیرت کی حس اور حمیت کا جذبہ ہے اُس سے ہم اپنی اس مخلصانہ گزارش پر لبیک کی ——— زبانی نہیں ——— عملی لبیک ——— کی اُمید رکھتے ہیں[1]!

---

[1] گزشتہ مہینہ (نومبر) کے لئے یہ "افتتاحیہ" لکھا گیا تھا، کتابت بھی ہو چکی تھی مگر وسطِ اکتوبر میں پاکستان کے عظیم الرتبت وزیرِ اعظم خان لیاقت علی خاں (مرحوم و مغفور) کے قتل کا دردناک سانحہ وقوع میں آ گیا اور اس کی اشاعت کو ہم نے روک کر دوسرا "نقشِ اوّل" وقت کے وقت لکھ کر رسالہ میں شامل کر دیا ——— قوموں کی زندگی میں حُزن و ملال کے موقعے بھی آتے رہتے ہیں، لیکن یہ حُزنیے اصلاح و ترقی اور تعمیر کے کاموں میں رُکاوٹ نہیں بن سکتے اور نہ بننے چاہئیں، افراد اُٹھ جاتے ہیں مگر ملّت باقی رہتی ہے۔

ع ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست!

مُسلم قوم نے حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات علیہ الصلوٰت والتحیات کی رحلت کے الم انگیز سانحہ کو برداشت کیا ہے اور اُمت کے کام میں ذرہ برابر خلل واقع نہیں ہوا، نظم و نسق، معاشرہ اور افراد میں جو کمزوریاں پائی جاتی ہیں اُن کی نشان دہی اور اصلاح کا کام ہوتے رہنا ضروری ہے! یہ بھی یاد رہے کہ سچے مسلمان کا "اصلاح" سے مقصد "ہنگامہ آرائی" ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتا، خلوص و صداقت اور امن و وقار کے ساتھ اصلاح کی کوشش! یہاں تک کہ نیکی بُرائی پر غالب آ جائے! (م-ق)

ڈاکٹر عبدالحمید قاضی
(ایم۔اے، پی، ایچ، ڈی)

علم و عمل کے سرچشمے

ولا یحیطون بشئ من علمہ الا بما شاء وسع کرسیہ السموات
والارض ولا یؤدہ حفظہما وھو العلی العظیم ط (پارہ ۳)

(ترجمہ) لوگ اُس کی معلومات میں سے کوئی چیز نہیں رکھتے مگر جتنی وہ چاہے اُس کی کرسیِ سلطنت آسمان وزمین سب پر پھیلی ہوئی ہے اور آسمان وزمین کی حفاظت اُس پر مطلق گراں نہیں اور وہ بڑا عالی شان اور عظمت والا ہے ۵

نفس انسانی اور فطرت کے عمیق مطالعہ نے ہمیں اِس نتیجہ پر پہونچا دیا ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہمہ گیر روحانی عنصر کام کر رہا ہے۔اس کائنات کی حقیقتِ اصلی مادی نہیں ہے بلکہ روحانی ہے—— ہم ابھی تک صرف اِس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اصلی حقیقت روحانی ہے۔ لیکن اس کی ماہیت اصلی اور خواص کا بھی اب تک پتہ نہیں ہے۔حقیقت کی ماہیت اصلی اور اُس کے خواص کا پتہ چلانا ایک نہایت ہی دشوار کام ہے۔ اس دشوار گزار وادی میں لاکھوں ہی مسافر تباہ وبرباد ہو چکے ہیں۔ اِس لئے ضروری ہے کہ ہم اس سفر کو طے کرنے کے لئے پہلے اُن سواریوں کا پتہ چلالیں جن کی تنہا وساطت سے ہم اِس منزل تک پہونچ سکیں گے۔ بغیر اُن آلات سے مسلح ہوئے جن کے بغیر اس گھاٹی کو عبور نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں قدم رکھنا تباہی اور ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اس باب میں اسی لیے ہم نفس انسانی کی قوتوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کس حد تک ہم کو حقیقت کا علم دے سکتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نفسِ انسانی کی مخصوص صلاحیتیں سات ہیں۔ یعنی جبلتیں اور جذبات، ادراک، عقل، حافظہ، ارادہ، حسِ جمال اور وجدان۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ یہ قوتیں ایک دوسرے سے کلیتاً مخالف نہیں ہیں بلکہ در اصل ایک متحدہ نفس انسانی کی مختلف کیفیات ہیں۔ نظری اور عملی قوتوں میں ہم کسی قسم کی بنیادی تفرلق نہیں کرتے بلکہ وہ در اصل ایک ہی نفسی کیفیت کے مختلف مظاہر ہیں، ہر نظری فعل میں عملی عنصر موجود ہے اور عملی فعل کا وجود بغیر نظری عنصر کے نہیں ہو سکتا نہ صرف یہ کہ نظری اور عملی اعمال باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں بلکہ ہر فعل میں نظری، عملی، جمالی اور وجدانی عناصر پائے جاتے ہیں۔ قدیم علم النفس کی یہ بہت بڑی خامی تھی کہ وہ نفسی قویٰ کو ایک دوسرے سے کلیتاً علیحدہ تصور کرتا تھا حالانکہ وہ ایک متحدہ کل ہے۔ انسان کو در اصل اشیاء کا علم وجدانی طرز پر اولاً بہ حیثیت کلی ہوتا ہے اور بعد میں انسان اُس میں نظری تفرلق پیدا کر لیتا ہے نفسِ انسانی کے عمل کی اِس بنیادی خصوصیت کو سمجھنے کے بعد ہم اِس طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ حقیقت اصلی تک پہونچانے میں کس حد تک یہ نفسی صلاحیتیں ہماری راہ بری کر سکتی ہیں۔

جبلتوں کے متعلق ہم معلوم کرچکے ہیں کہ یا تو وہ فرد کی حیوانی زندگی کو باقی رکھتی ہیں مثلاً بھوک اور پیاس کی جبلتیں یا وہ اُس کی نسل کی بقا کے لئے مد ثابت ہوتی ہیں، مثلاً شہوت، یا بچوں کی محبت کی جبلت وغیرہ یا وہ انسان میں سماجی جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ یہ جبلتیں ہمیں صرف اِس حد تک مدد پہونچاتی ہیں کہ ہمارا انفرادی یا اجتماعی طور پر حیوانی وجود باقی رہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑا اہم فریضہ ہے کیونکہ جس وقت تک ہمارا مادی وجود باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت تک ہم کسی قسم کی ذہنی یا روحانی زندگی کا تذکرہ نہیں کرسکتے۔ یہ ہمیں وہ سواری مہیا کرتی ہیں جس پر سوار ہو کر ہم اخلاقی اور روحانی زندگی کے منازل طے کرسکتے ہیں۔ بھوک اور پیاس کی جبلتیں ہمیں غذا مہیا کرتی ہیں، شہوت کی جبلت افزائش نسل کا باعث ہوتی ہو بچوں کی محبت کی جبلت آئندہ نسلوں کی بقا اور تربیت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ جبلتیں لیکن اس سے زیادہ اور کوئی کام انجام نہیں دیتیں وہ بلا واسطہ حقیقت اصلی تک راہ نمائی کرنے میں ناکام ہیں۔ دراصل یہ ان کا فریضہ ہی نہیں ہے کہ وہ اِس کام کو انجام دیں البتہ وہ حقیقت کے اُس پہلو سے بھی ضرور واقف کراتی ہیں جن کا تعلق بقائے وجود، اور افزائش نسل سے ہے اِس معنی میں وہ بھی ایک حد تک سرچشمۂ علم ہیں کہ وہ حیوانوں اور انسانوں کو اُن کے رزق کے سرچشموں سے واقف کراتی ہیں وہ اُنھیں جنسی تعلقات کی طرف مائل کرتی ہیں اور وہ اُنھیں ایک جماعتی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہیں۔

قرآن میں وحی کی اصطلاح کو نہایت وسیع مضمون میں استعمال کیا گیا ہے۔ اِس میں وہ تمام صلاحیتیں شامل ہیں جن کے ذریعے جمادات، نباتات، حیوانات اپنے مادی اور روحانی وجود کو باقی رکھتے ہیں اور اُس کی مادی اور روحانی نشو و نما کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ چنانچہ جبلتوں کو بھی وہاں ایک قسم کی وحی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے ذریعے جمادات مثلاً پہاڑ اپنا وجود باقی رکھتے ہیں اور حیوانات مثلاً شہد کی مکھیاں اپنے لئے غذا کا سامان مہیا کرتی ہیں۔

واوحیٰ ربک الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاً ومن الشجر ومما یعرشون (۱۶:۷)

(ترجمہ) اور دیکھو تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں، اور درختوں اور اُن ٹہنیوں میں جو اِس غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لئے چھتے بنائے۔

جبلتوں کے ذریعے غرضکہ حقیقت کی اُن صفات کا پتہ چلتا ہے جنھیں ہم ربوبیت اور رزاقیت کی صفات کہتے ہیں۔

علم انسانی کے سرچشموں کی حیثیت سے جذبات جبلتوں سے زائد ہمارے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ جذبات دراصل جبلتوں ہی کی ایک مخلوط اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ خوف، غم، محبت، خوشی، تشکر، اُمید، نا اُمیدی وغیرہ یہ جبلتوں ہی کی ایک مخلوط شکل ہے۔ یہ جذبات نفسِ انسانی میں ایک ایسی کیفیت پیدا کردیتے ہیں جس کے باعث انسان حقیقت کے اُن پہلوؤں سے واقف ہو جاتا ہے جن سے وہ بغیر ان کے ہمیشہ ناواقف رہتا۔ محبت کے عمیق، گہرے اور شدید جذبات اُس کو اِس حقیقت سے واقف کراتے ہیں کہ کائنات میں محبت کا اصول کارفرما ہے۔ تمام کائنات عشق کی تجلّی گاہ ہے۔ عشق کے بغیر دُنیا میں کسی چیز کا وجود نہ ہوتا۔ دُنیا کا تمام نظام اِسی کے باعث قائم ہے۔ خوف کا جذبہ انسان میں ایک مافوق الانسان قدرت اور طاقت والی ہستی کا یقین پیدا کرتا ہے۔ غم اُس کی حقیقت کے اِس پہلو سے واقف کراتا ہے۔ کہ دُنیا میں کسی چیز کو ثبات اور استقلال نہیں ہے۔ یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے اور دُنیا میں سوائے فنا کے اور کسی چیز کو استحکام نہیں ہے۔

حقیقت کے بعض پہلوؤں سے واقفیت کے علاوہ جذبات جو سب سے بڑا اہم فریضہ انجام دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف جبلتوں کی طرح انسان کی حیوانی زندگی کو باقی رکھتے ہیں بلکہ وہ اُس نفس زندگی کے بعض نہایت قیمتی عناصر

کی بقا اور نشو و نما کرتے ہیں۔ یہ جذبات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک سفلی اور ایک اعلیٰ۔ سفلی جذبات انسان کی حیوانی مادی زندگی کے محافظ ہیں مثلاً غیظ و غضب اور غصہ انسان کو اپنے دشمن سے مدافعت پر اُبھارتا ہے یہ غصہ اگر صرف تحفظ ذات تک محدود ہو اور اس کا مقصد دوسرے افراد کی تباہی نہ ہو تو یہ ایک مستحسن جذبہ ہے لیکن اگر اس کا مقصد دوسرے انسانوں کی تباہی ہو یعنی بہ حیثیت مجموعی انسانیت کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنا ہو تو یہی غصہ ایک سفلی جذبہ ہو جاتا ہے۔ پہلی کیفیت انسان کے شہوانی جذبہ کی ہے۔ اگر اُس کا مقصد بقائے نسل ہو تو وہ ایک مستحسن جذبہ ہے لیکن اگر اس کا مقصد صرف انسان کے حیوانی جذبات کی تکمیل ہو تو وہ ایک سفلی جذبہ ہے۔ غرضکہ ہر جذبہ ادنیٰ اور اعلیٰ شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اگر وہ انسان کی بہ حیثیت مجموعی مادی اور روحانی ترقی میں مُمد ہوتا ہے تو وہ ایک اعلیٰ جذبہ ہے لیکن اگر وہ اُس کی نشو و نما کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو وہ ایک ادنیٰ جذبہ ہے۔ انسانیت کی زندگی کے بڑھتے ہوئے دھارے کو ہر وہ چیز جو مدد پہونچاتی ہے نیکی ہے اور ہر وہ چیز جو اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے بدی ہے۔ اِس جگہ ہم اس مسئلہ سے تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے۔ اس پر ہم مفصّل نظر "اخلاق انسانی" کے باب میں ڈالیں گے۔ یہاں صرف اِس قدر عرض کر دینا کافی ہے کہ جذبات انسان کو حقیقت کے ایک ایسے پہلو سے واقف کراتے ہیں جو نہایت قیمتی ہے۔ اِسی بنا پر وہ انسانی علم کے ایک سرچشمہ کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

عقل بہ حیثیت سرچشمۂ علمِ انسانی

انسانی علم کے سرچشموں کی حیثیت سے جذبات کی اہمیت عہد جدید کی نفسیات میں تسلیم کی جانے لگی ہے لیکن عقل کی اس حیثیت کو تو عہدِ قدیم ہی سے ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عقل کو انسانی علم کا ہمیشہ تنہا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ قبل اِس کے کہ ہم اس مسئلہ پر بحث کریں کہ عقل کس حد تک علم حاصل کر سکتی ہے ضروری ہے کہ ہم عقل کے دو مختلف پہلوؤں سے واقف ہو جائیں، وہ ہیں اولاً ادراک اور دوم عقلِ مجرد۔

خارجی دُنیا سے حواسِ خمسہ کے ذریعہ ذہن انسانی پر تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسان ناک، کان، آنکھ، زبان اور اپنے تمام جسم کے ذریعہ ہزار ہا قسم کے تاثرات ذہنِ انسانی تک پہونچاتا ہے۔ اِن تمام منتشر اور پراگندہ تاثرات میں ذہن انسانی ایک وحدت پیدا کر دیتا ہے اور اشیاء کے متعلق ہم کو ایک مربوط علم حاصل ہوتا ہے۔ ذہن اور دماغ کے باہمی فرق کو ہمیں اس جگہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ دماغ انسانی جسم کا ایک جزو ہے وہ ایک مادی چیز ہے اور ذہن جو کہ ایک غیر مادی چیز ہے اُس سے اُسی طرح کام لیتا ہے جس طرح کہ وہ دیگر حواسِ خمسہ سے کام لیتا ہے۔ دماغ ہمیشہ صرف مُنفعلانہ طریقہ پر کام کرتا ہے فاعلانہ طور عمل کرنا صرف ذہن انسانی کا کام ہے۔ خارج سے تاثرات ذہن انسانی پر مُرتب ہوتے ہیں۔ ذہن انسانی میں داخلی طور پر بدا ہتاً زمان و مکان، کیفیت کمیت وغیرہ کے اعیان موجود ہوتے ہیں۔ ان منتشر خارجی تاثرات کو ذہن اپنے داخلی بدیہی اعیان کے ذریعہ ایک شکل دے دیتا ہے وہ اُن میں ایک وحدت پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح انسانی علم اور تجربہ کی بُنیاد پڑتی ہے۔ جہاں تک خارجی دنیا کے علم کا تعلق ہے وہ صرف ادراک ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اِس کے ذریعہ فطرت کے قوانین کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ چاند اور زمین کی گردش کششِ زمین اور کششِ ثقل کے قوانین، آگ، پانی، ہوا، برقی قوت ایتھر وغیرہ کی قوتوں کا علم ہم کو اس کے ذریعہ ہوا ہے۔ ریڈیو، ٹیلیفون، ٹیلیگرام، ٹیلی ویژن وغیرہ جیسے محیرالعقول انکشافات ہم کو اس عقلی تجربہ کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔ اِس قوتِ ادراک کے لئے فطرت کے خارجی تاثرات اُسی طرح ضروری ہیں جس طرح

کہ ذہن انسانی کے داخلی بدیہی اعیان۔ دونوں کے بغیر کسی علم کا وجود نہیں ہو سکتا۔

ادراک سے بھی زیادہ عقل کی ترقی یافتہ شکل عقل مجرد ہے، جس طرح ادراک خارجی تاثرات کو باہم ملا کر اشیاء کے علم کی بنیاد رکھتا ہے اُسی طرح عقل مجرد اُس علم کو باہم مربوط کر کے ایک نئے علم کی بُنیاد رکھتی ہے جو اُسے ادراک فراہم کرتا ہے۔ سائنس کے اولین اُصولوں کا پتہ بھی عقل مجرد چلاتی ہے۔ ریاضی کے بُنیادی اصولوں کا پتہ عقل مجرد ہی نے چلایا ہے۔ وہ بُنیادی اصول جس کی بنا پر اعلیٰ سائنس اور ریاضی کا وجود ہے، مادی تجربہ یا خارجی تاثرات کے ذریعہ حاصل نہیں کئے گئے ہیں بلکہ یہ نتیجہ ہیں اعیان کے ذریعہ عقل مجرد کی کارفرمائی کا۔ عہد جدید میں آئنسٹائن نے فطرت کا عمیق مطالعہ کیا لیکن نظریہ اضافیت جس کا وہ بانی ہے اُس نے کہیں عملاً تجربہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ اُس وسیع علم کی بُنیاد پر قایم کیا گیا ہے جو ادراک نے اعیان کے ذریعہ اُسے مہیا کیا ہے۔

عقل اور مابعد الطبیعاتی مسائل

یہ بات بالکل واضح ہے کہ خارجی فطرت کا علم صرف ادراک کے ذریعہ ہوتا ہے اور ریاضی اور سائنس کے تمام بنیادی اُصولوں کا پتہ عقل مجرد نے چلایا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عقل مجرد تمام مابعد الطبیعات مسائل مثلاً "بقائے روح" حشر و نشر، سزا و جزا، اور ذات خداوندی کا بھی حل کر سکتی ہے؟ عقل نے ہمیشہ اِس کا دعویٰ کیا ہے اور اِن تمام مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِسی جگہ فلسفہ جو صرف عقلی غور و فکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور مذہب کے جو وحیِ الٰہی کا نتیجہ ہوتا ہے، ڈانڈے مل جاتے ہیں اہلِ یونان اور اُن کے سب سے بڑے فلاسفر افلاطون اور ارسطو ان مسائل کے حل کے لئے بھی عقل کو واحد ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ عقل کی ہمہ گیری کا یہ تصور یونان ہی سے مغربی اور اسلامی دُنیا میں پھیل گیا۔ کانٹ نے سب سے پہلے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاں تک عالمِ مظاہرات (Phenomenon) کا تعلق ہے بے شک عقل کی یہاں مکمل دسترس ہے اور صرف عقلی معیار ہی پر خارجی علم کو جانچا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک (Noumenon) عالم داخلی کا تعلق ہے وہاں یہ بے بس ہے۔ عقل کے ذریعہ سے اگر بقائے رُوح اور ذاتِ خداوندی کی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہو تو عقل انسانی ایک عجیب خلفشار میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ دونوں قسم کے متضاد تصورات عقل کے ذریعہ ثابت کئے جا سکتے ہیں یعنی عقل کے ذریعہ یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ انسانی روح باقی رہنے والی ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ فانی ہے۔ خدا کے وجود کو بھی عقل کے ذریعہ ثابت کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ خدا موجود نہیں ہے بلکہ دُنیا صرف مادی ذرات کے تعامل باہمی کا نتیجہ ہے۔ عقل کے ذریعہ اِن متضاد تصورات کی بہ یک وقت نفی اور اثبات کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ نے غرضکہ کہا کہ عقل کی دسترس صرف مظاہرات خارجی تک ہے اگر اس سے مابعد الطبیعاتی مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی تو انسان ایک عقلی تضاد میں گرفتار ہو جاتا ہے، بقائے رُوح حشر و نشر اور ذاتِ ایزدی کے لئے کانٹ عقلی دلیلیں بہت پیش کرتا ہے بلکہ انھیں اخلاقی دلائل سے ثابت کرتا ہے۔ کانٹ کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ خود اس کے فلسفہ میں اِس قسم کے عناصر تھے جن پر ایک عقلی مابعد الطبیعاتی نظام قائم کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ فشٹے نے یہ کام

---

[1] فلسفہ کی بعض باتیں بلاشبہ حکمت آمیز ہوتی ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ فلسفہ حقائق یا حقیقتِ اشیاء کا اتا پتا دیتا ہے مگر انبیاء کرام کی "وحی" فلسفیوں کے تعقل و تفکر اور حکمت سے اس قدر بلند ہوتی ہے کہ ہم دونوں کو ایک سطح پر نہیں لا سکتے، "وحی" کی طرح فلسفہ کا موضوع "ہدایت" بھی نہیں ہے! یہ فرق گفتگو اور بیان میں بہرحال باقی رہنا چاہئیے ورنہ شدید قسم کے مغالطوں کا امکان ہے (م - ق)

انجام دیا۔ اُس نے کانٹ کے مابعدالطبیعاتی ادراک کو جو فعال ہے خودی کی اصطلاح دے کر خالق کائنات قرار دیا۔ ہیگل نے تو عقل کی اہمیت کو اُسی قدر زیادہ تسلیم کیا جس قدر کہ مابعدالطبیعاتی مسائل پر کانٹ اُسے کم کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے عقلِ کل کو خالق کائنات قرار دیا اور تمام مظاہر کو اِسی عقل کل کا ظہور تو بتایا!

مابعدالطبیعاتی مسائل کو حل کرنے کی عقل کس حد تک صلاحیت رکھتی ہے اس کے متعلق ہمیشہ انسانوں نے مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ بعض مرتبہ عقل کی ہمہ گیری کو تسلیم کیا گیا اور پھر اُس کے خلاف ردِ عمل ہوا اور اُس کی بجائے جذبہ یا وجدان کو جگہ دے دی گئی۔ اشراقیت کا فلسفہ یونانی عقلی غور و فکر کا نتیجہ تھا اس عقلیت کے خلاف مسیحیت کی تحریک نے زور پکڑ لیا جو ایک وجدانی تحریک تھی۔ عہدِ عباسیہ میں عقلیت کی تحریک زوروں پر تھی جس کے نمایندے معتزلہ تھے، اس کے خلاف ردِ عمل ہوا اور امام غزالی کی تعلیمات عالمِ اسلام میں مقبول ہوئیں جو ایمان اور یقین کے وجدانی تصورات پر قائم تھیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اِس مسئلہ کو صاف کرلیں کہ کس حد تک عقل ان مابعدالطبیعاتی مسائل کو حل کر سکتی ہے اور کہاں وہ بے بس اور لاچار ہے!

تیسرے باب میں فطرت کے مطالعہ نے، جو ریاضی اور سائنس کے عقلی اُصولوں کے ذریعہ کیا گیا تھا ہم کو اِس نتیجہ تک پہونچا دیا ہے کہ کائنات کی اصل روحانی ہے۔ عہدِ جدید کے بڑے سائنس داں سرایڈنگٹن، سر جیمس جینس اور آئنسٹائن کا یہی خیال ہے۔ سائنس اور ریاضی کے عقلی قوانین کے ذریعہ حقیقت کا علم ہم کو واضح، نہیں حاصل ہوتا بلکہ صرف دھندلا سا ہوتا ہے جس کو یہ سائنس داں خود قبول کرتے ہیں یہ علم انتہائی ترقی یافتہ دماغوں کے لئے تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے لیکن عام طور پر انسان جس کی ذہنی سطح بہت پست ہے اس سے استفادہ نہیں کر سکتی۔

پھر عقل کے ذریعہ نہ صرف یہ پتہ چل سکتا ہے کہ انسان کی اصل مادی نہیں روحانی ہے، رُوح اپنا ایک وجود مستقل رکھتی ہے۔ کائنات کی اصل حقیقت روح کلی ہے بلکہ اُن صفات کا بھی ہمیں علم ہو سکتا ہے جو اس حقیقت کلی کی ذات میں موجود ہیں، مثلاً یہ کہ کائنات کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں ایک ہمہ گیر قانون کارفرما ہے اور پتہ چلتا ہے کہ وہ تمام کائنات کے مختلف عناصر کی مادی اور روحانی بقا اور نشو و نما میں مصروف ہے، وہ رحیم و کریم ہے۔ غرضکہ عقلی غور و فکر کے ذریعہ خدا اور اُس کی صفات کا بہت کچھ علم ہمیں حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن عقل بمشکل ہمیں اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ ہم خدا اور اُس کی صفات کو پہچاننے لگیں۔ وہ اِس سے زیادہ ہماری راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ وہ ہم میں یہ طاقت نہیں پیدا کرتی کہ ہم حقیقتِ اصلی کا بلاواسطہ مشاہدہ اور تجربہ کریں وہ دور سے ہمیں منزل کی راہ بتا دیتی ہے لیکن اُس منزل کے قریب تر پہونچنے کے لئے ہمیں ایک دوسرے ہی وسیلہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور یہ وسیلہ وجدان ہے جو ہمیں بلاواسطہ حقیقت اصلی سے واقف کرا دیتا ہے، ولایت و نبوت اور وحی الٰہی اسی وجدانی کیفیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

جمالی حِس بہ حیثیت سرچشمۂ عِلم

عقل اور وجدان کے درمیان ایک اور نفسی صلاحیت ہے جسے ہم حِسِّ جمال کہہ سکتے ہیں۔ احساسِ جمال خارجی فطرت میں حُسن ہم آہنگی اور تناسب دیکھتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیشہ زیرِ بحث رہا ہے کہ حُسن ایک معروضی وجود رکھتا ہے یا موضوعی۔ یعنی کیا وہ مُدرک سے کلیتاً آزاد خارجی مستقل بالذات اپنا وجود رکھتا ہے، یا وہ صرف مُدرک کی داخلی نفسی کیفیت کا نام ہے، پہلے تصوّر نے آرٹ میں وہ اسکول پیدا کیا جو آرٹ کا مقصد صرف خارجی تاثرات کی ترجمانی قرار دیتا ہے اور دوسرے تصوّر نے اُس مکتبہ خیال کو وجود بخشا جو آرٹ

کو صرف نفس کی داخلی صلاحیتوں کا ترجمان سمجھتا ہو۔ آرٹ میں عہد قدیم سے یہ دونوں اسکول یعنی (
خارجیت اور د) باطنیت چلے آرہے ہیں اصل یہ ہے کہ ایک صحیح اور بلند آرٹ نہ صرف خارجی
تاثرات کی نقل کرتا ہے اور نہ وہ صرف خارجی فطرت سے کلیتاً آزاد ہو کر داخلی نفسی کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلکہ وہ دونوں میں ایک
مزاج پیدا کر دیتا ہے۔ ایک صحیح مصوّر اپنی تصویر کے خارج سے بہت کچھ تاثرات قبول کرتا ہے لیکن وہ اُن تصورات کو اپنی داخلی نفسی
دُنیا سے اِسقدر متاثر کرتا ہے کہ اُس کی تخلیق صرف خارجی چیزوں کی ایک نقل نہیں ہوتی بلکہ اُس میں اُس کے نفس کے تخلیقی عناصر بھی
شامل ہوتے ہیں، یہی کیفیت بُت سازی، ادب، شاعری، فن تعمیر اور موسیقی میں بھی پیش آتی ہے۔ اہل فن اپنی تخلیق کے لئے خارج
سے تاثرات تو قبول کرتے ہیں لیکن اُن پر وہ اپنی داخلی شخصیت کا نقش ثبت کر دیتے ہیں۔ فنی تخلیقات مادی قید و بند سے آزاد
ہوتے چلے جاتے ہیں۔

فنون لطیفہ میں سب سے زیادہ مادی دُنیا سے جو فن وابستہ ہے وہ فنِ تعمیر ہے لیکن سنگین پتھروں کو بھی کس قدر انسان اپنی
روحانی دنیا سے متاثر کر سکتا ہے اگر یہ دیکھنا ہو تو تاج محل کو صرف ایک مرتبہ دیکھ لینا کافی ہے۔ تاج محل کو صنّاع کے ہاتھوں نے پاکباز
عشق کا ایک روحانی مرقع بنا دیا ہے!

بت سازی میں بھی اہلِ فن کو سنگین پتھروں ہی سے کام لینا پڑتا ہے۔ فنِ تعمیر اور بت سازی کے مقابلہ میں مصوّری کا تعلق مادہ
سے کم ہے لیکن اس میں بھی مصوّر بہرحال رنگ و روغن اور کاغذ سے آزاد نہیں ہے۔

ادب اور شاعری میں اہلِ فن مادی فن سے بہت زیادہ آزاد ہیں لیکن اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی دُنیا سے کلیتاً آزاد
ہوگئے ہیں، وہی ادیب اور شاعر سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو انسان کی موجودہ زندگی کو تو پیش نظر رکھتے ہیں لیکن اپنی
نفسی زندگی کے سحر سے اُس کو اِس قدر متاثر کر دیتے ہیں کہ وہ ایک نئی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ زندگی کے واقعات اور جذبات کو
صرف اُسی طرح پیش کر دینا جس طرح کہ وہ موجود ہیں بیشک ایک کامیاب نقالی تو ہے لیکن اعلیٰ ادب اور شاعری نہیں ہے۔ وہ
ادب اور شاعری جس میں ادیب اور شاعر کے داخلی نفسی تخلیقی عناصر کام نہ کر رہے ہوں دراصل ادب اور شاعری ہی نہیں ہے۔
ادب میں حقیقت نگاری جو آج کل اِس قدر مقبول ہو رہی ہے سوا اس کے کیا ہے کہ وہ انسانیت کی مُہیب زندگی کے برہنہ
واقعات پیش کرے جس میں نہ تو اس کے لئے کوئی تسکین کا سامان ہے اور نہ اُس کے ارتقائے حیات کے لئے کوئی محرکات
موجود ہیں۔ یہ دراصل ایک ایسے عہد کا ادب ہے جو خود زوال پذیر ہے۔ وہ ادب جو صرف انسان کی حیوانی اور شہوانی زندگی
کا حامل ہو دراصل اس کا مستحق ہی نہیں ہے کہ اُسے ادب کہا جائے۔ اپنے سفلی پہلوؤں سے ادب انسان کو حیوانی
زندگی سے وابستہ کر دیتا ہے لیکن اپنے اعلیٰ پہلوؤں کے ذریعہ وہ اُسے ملکوتی دُنیا کے قریب تر پہونچا دیتا ہے وہ انسان
میں حُسن ہم آہنگی اور تناسب کا مادہ پیدا کرتا ہے جو کائنات کی اصل ہے۔ اِس طرح بھی وہ حقیقت کے ایک ایسے
پہلو سے واقف کراتا ہے جو حقیقت اصلی کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ عقل ہمیں اس نتیجہ تک پہونچاتی ہے کہ دُنیا میں ایک
نظام اور ربط ہے لیکن حِسِ جمال ہماری اِس حد تک راہ نمائی کرتا ہے کہ اِس نظام و ربط میں حُسن، ہم آہنگی اور تناسب
بھی ہے۔ انفرادی مظاہر میں حُسن و ہم آہنگی دیکھنے کی جب انسانی نگاہ کو عادت ہو جاتی ہے تو وہ پھر کائنات کے حُسن و
ہم آہنگی کو بھی دیکھنے لگتا ہے۔ اور پھر اُس حسین اور ہم آہنگ ہستی کو جو اِس کائنات کی روحِ رواں ہے، اس وقت ہم لیکن
حس جمال پر صرف علم کے ایک سرچشمہ کی حیثیت سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں اس لئے اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ حقیقت

کی طرف راہ نمائی کرنے میں یہ ہماری بہت حد تک مدد کرسکتا ہے اور یقیناً عقل سے زیادہ اس کی دسترس ہے فلسفی عقلی غور و فکر کے ذریعہ کائنات کا اصل پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن فنونِ لطیفہ کے حامل اپنی وجدانی کیفیت سے جو مشاہدہ حقیقت کا کر لیتے ہیں وہ اہلِ عقل کے لئے ممکن نہیں ہوتا، ایک شاعرانہ کیفیت موسیقی[^1] کی ایک وجد انگیز دُھن انسان کو سرِ حقیقت کے وہ جلوے دکھاتی ہے جو عقل کی بہترین کاوشوں سے بھی بسا اوقات ممکن نہیں ہوتا۔

۵- علم کا مفہوم

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عقل کے علاوہ جذبات اور جمالی احساس کے ذریعہ بھی علم حاصل کیا جاسکتا ہے تو ہمارا مفہوم علم سے وہ نہیں ہے جو عموماً سمجھا جاتا ہے۔ علم عموماً صرف عقلی جد و جہد کا نتیجہ تصور کیا جاسکتا ہے بیشک عقل کے ذریعہ بہت کچھ علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کائنات کے قوانین اور اُس کے نظام کا پتہ بے شک عقل ہی چلاتی ہے لیکن یہ حقیقت کا صرف ایک پہلو ہے حقیقت کے اور بھی دوسرے نہایت اہم پہلو ہیں اور وہ اُس کی جذباتی کیفیات اور اُس کا حُسن و ہم آہنگی ہے۔ حقیقت کے اِس پہلو سے لیکن عقلی غور و فکر کے ذریعہ واقف نہیں ہوسکتے۔ حقیقت کی جذباتی کیفیت کا پتہ صرف جذبات ہی کے ذریعہ معلوم کیا جاسکتا ہے اور اُس کے حُسن و جمال اور تناسب و ہم آہنگی کا ادراک صرف احساسِ حُسن و جمال ہی کے ذریعہ ہوسکتا ہے۔

علم کا مفہوم غرضکہ صرف حقیقت کے عقلی پہلوؤں ہی سے واقفیت نہیں ہے بلکہ اُس کے جذباتی ارادی اور جمالی کیفیتوں سے بھی واقفیت کا نام ہے۔ حُسن و جمال کی طرح پاک ارادہ بھی حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے ایک اہم سرچشمہ علم ہے۔ جبکہ دُنیا تاریک دکھائی دیتی ہے، حوادث انسان کو جادۂ حق سے ہٹ جانے پر مجبور کرتے ہیں اُس وقت ضمیر انسانی سے ایک مقدس روشنی پیدا ہوتی ہے، ایک پاک ارادہ اُس کی راہ نمائی کرتا ہے۔ ایسے اوقات میں انسان حقیقت کے ایک اور خاموش لیکن منور پہلو سے واقف ہو جاتا ہے۔

علم غرضکہ بحیثیت مجموعی حقیقت کے تمام جبلّی جذباتی، ارادی، عقلی، جمالی، اور اخلاقی صفات سے واقف ہونے کا نام ہے۔ اور علم نفسِ انسانی کو اُسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ وہ بھی اپنی جبلتوں، اپنے جذبات، اپنی قوتِ ارادی، اپنی عقل، اپنے احساسِ جمال، اپنے اخلاقی شعور اور اپنے روحانی کیف میں پاکی و صفائی پیدا کرے۔ وہ پاکی اُس حد تک ہونی چاہیئے کہ حقیقت کی تجلّی بالآخر اُس میں منعکس ہونے لگے۔ علم کا آخری سرچشمہ وہ منبع جمال حُسن، وہ مقدس قوت ارادی وہ مخزن علم و عقل ہے جہاں سے تمام علم اور ارادہ اور حُسن و جمال کائنات کو عطا ہوتا ہے۔

الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم ——— کل فی کتاب مبین ——— (۱۱ : ۱۲)

(ترجمہ) جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور انسان کو وہ سکھایا جس کا اُس کو علم نہ تھا۔ سب کچھ کتاب روشن یعنی لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔

---

[^1]: اسلامی نقطۂ نگاہ سے سیرت و کردار کی تشکیل اور اسرار و حقائق کے انکشافات و یقین میں "موسیقی" کا کوئی مقام نہیں ہے، غنا اور موسیقی کی "وجد انگیزی" میں منافع کم اور خطرات زیادہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے آلات غنا و موسیقی (مزامیر) کا توڑنے والا بنا کر بھیجا تھا (م - ق)

یوتی الحکمۃ من یشاء ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیرا (٢ : ٣)
اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی بیشک اُس نے بڑی دولت پائی!

٦ — وجدان اور وحی

احساسِ جمال سے بھی ایک اعلیٰ قوت نفسِ انسانی میں پائی جاتی ہے اور وہ قوت وجدان ہے جبلّت اور وجدان میں اکثر خلطِ مبحث کیا جاتا ہے۔ جبلّت وہ قوت ہے جو انسان کی حیوانی زندگی کی بقا کا سامان مہیا کرتی ہے لیکن وجدان وہ قوت ہے جو اس کو انسانیت کی حد سے اُٹھا کر ملکوتیت کی سرحد پر لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ عقل کے ذریعہ علم حاصل کرنے کے لئے انسان کو ذہنی کاوش کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب اور منطقی استدلال کے ذریعہ علم تک پہونچتا ہے، اس کی یہ تمام جد وجہد شعوری اور بالارادہ ہوتی ہے۔ حسِ جمال میں بھی کسی قدر غیر شعوری عناصر کے ذریعہ انسان اشیاء کا احصا کر لیتا ہے۔ شاعرانہ صلاحیت اسی قسم کی ایک غیر شعوری صلاحیت ہے۔ وجدان، لیکن اس قسم کی غیر شعوری صلاحیت کی انتہائی شکل ہے۔ یہ بلکہ اُس وقت پیدا ہوتا جب انسان اپنی دیگر نفسی قویٰ کی انتہائی تکمیل کر لے جس وقت انسان کی عقلی قوت انتہائی ترقی کر لیتی ہے تو پھر ہر وقت اُسے مسائل کو سمجھنے کے لئے ذہنی کاوش کرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہ فطری اور غیر ارادی طور پر خود بخود اشیاء کی حقیقت تک پہونچنے لگتا ہے جب نفسِ انسانی کی ہر قوت انتہائی ترقی کر لیتی ہے، تو پھر حقیقت کے سمجھنے کیلئے اُسے عقل کی پُر پیچ گھاٹیوں سے گزرنے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہ خود بخود اُس کی تہ تک پہونچ جاتا ہے۔ یہ وجدان غرضکہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کے جذبات، اُس کی عقل، اُس کی قوتِ ارادی اور اُس کے احساسِ جمال کی انتہائی ترقی کا۔ وجدان کبھی بھی عقلی قوانین یا جمالی احساسات کے خلاف نہیں ہوتا بلکہ وہ اِن سے ماوریٰ ہوتا ہے۔ اگر کوئی وجدانی کیفیت واضح عقلی اور جمالی قوانین کے خلاف دکھائی دے تو وہ کبھی بھی ایک صحیح وجدان کا نتیجہ نہ ہو گی۔

وجدان کی ہی ایک ترقی یافتہ شکل قوتِ ولایت ہے۔ اِس طاقت کے ذریعہ انسان کا تعلق روحانی دُنیا سے بلاواسطہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی روحانی ترقی کے لئے اِس دُنیا سے فیض حاصل کرتا ہے۔ ولی کی فطری صلاحیت تو بیشک کافی بلند ہوتی ہے جس کے باعث وہ اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے لیکن اُس میں عملی صلاحیت اس قدر نہیں پائی جاتی کہ وہ دوسرے انسانوں کی بھی مکمل راہ نمائی کرے جس انسان میں روحانی دُنیا سے وابستگی کے ساتھ مکمل نظری، عملی اور جمالی صلاحیت بھی پائی جائے وہ پیغمبر کہلاتا ہے۔ پیغمبر نہ صرف اپنی تکمیلِ ذات کے لئے روحانی دُنیا سے تعلق رکھتا ہے بلکہ وہاں سے اِس قدر فیض حاصل کرتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کو بھی اِس سے سیراب کرے۔

ہم نفسِ انسانی کی تحقیقات میں یہ دیکھ آئے ہیں کہ انسانیت نے تدریجاً عالم جمادات سے نباتات کی طرف اور نباتات سے حیوانات کی طرف نشو ونما کی ہے اور اِن حیوانات میں سب سے ترقی یافتہ حیوان انسان ہے۔ سب سے پہلے دُنیا میں اجسام مُفردہ کا وجود ہوا۔ پھر اِن کی ترکیب سے جمادات کا ظہور ہوا۔ جمادات میں کسی قسم کی داخلی قوت نہیں ہوتی بلکہ اُن کا وجود صرف

---

١ نبی اور پیغمبر کی یہ تعریف فلسفیانہ انداز میں کی گئی ہے، دین کا تصور اور زیادہ جامع، وسیع، سادہ، پاکیزہ اور ہمہ گیر ہے (م۔ق)

خارجی اثرات مثلاً چاند اور سورج کی گردش، گردشِ زمین وغیرہ کے فطری قوانین کے سبب باقی رہتا ہے۔ جمادات سے پھر نباتات کا وجود ہوتا ہے۔ پانی اور زمین کے امتزاج سے گھاس پھونس پیدا ہونا شروع ہوتی ہے۔ یہ نباتات ترقی کرتے کرتے حیوانات کی سرحد پر پہونچ جاتے ہیں، اس وقت نباتات کی ایسی قسمیں پائی جاتی ہیں جو نباتات اور حیوانات کی درمیانی کڑی ہیں مثلاً خرمے کا درخت اصل میں نباتات کی ایک قسم ہے مگر اس کی پیدائش کے لئے نر و مادہ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس کو حیوانات میں بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی ترقی صرف عقل ہی تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ اس میں ایسی طاقتیں پائی جاتی ہیں جو اس کو ملکوتیت کے درجہ پر پہونچا دیتی ہیں یہی ملکوتی مادہ نفوسِ قدسیہ میں پایا جاتا ہے وہ ولی یا پیغمبر ہوتے ہیں۔ ولی صرف اپنی ذات کی تکمیلِ روحانی کر سکتے ہیں لیکن پیغمبر بہ حیثیت مجموعی تمام انسانیت کی روحانی تکمیل کرتے ہیں۔ غرضکہ پیغمبر انسان ہیں جو انسانیت اور ملکوتیت کے درمیان ہوتے ہیں۔ حقیقت سے بالواسطہ تعلق کے باعث ان انسانوں میں غیر معمولی نظری، عملی، جمالی اخلاقی اور روحانی احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ جن اشیار کا علم عام انسانوں کو انتہائی کد و کاوش کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے وہ ان کو وجدانی طریقہ پر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بو علی سینا کہتا ہے کہ

"ہم لوگ اشیار کو حواس کے ذریعہ سے دیکھتے ہیں اور پیغمبر باطنی قویٰ کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ اور ہم لوگ ایک چیز دیکھتے ہیں، پھر جانتے ہیں اور پیغمبر جانتا ہے اور پھر دیکھتا ہے۔"

مسئلہ نبوت کے متعلق امام رازی کہتے ہیں:-

"پیغمبر انسانیت کی آخر سرحد پر ہوتا ہے اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر نوع کی انتہا دوسرے نوع کی ابتدا سے متصل ہے، اس لئے بشریت کی انتہا ملکوتیت کی ابتدا ہے اس بنا پر پیغمبر میں ملکوتی صفات پائے جاتے ہیں۔ وہ جسمانیات سے بے پروا ہوتا ہے روحانیت اس پر غالب ہوتی ہے اس کی قوتِ نظر کے آئینہ میں معارفِ الٰہی مرتسم ہوتے ہیں۔ اس کی قوتِ عملیہ عالمِ اجسام میں طرح طرح کے تصرفات کر سکتی ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے۔"

امام رازی کہتے ہیں انبیار کا کمال مندرجہ ذیل چار چیزوں میں ہے:-

۱- قوتِ نظری
۲- قوتِ عملی
۳- دوسروں کی قوت نظری کی تکمیل
۴- دوسروں کی قوت عملی کی تکمیل

معارج القدس میں امام غزالیؒ نے نبوت کے مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی تالیف الکلام میں لکھا ہے:-

"اشیائے مجہولہ کا علم دو طریقے سے ہوتا ہے فکر اور حدس (جس کو جدید اصطلاح میں ہم وجدان کہیں گے) فکر میں ذہن مقدماتِ معلومہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، حدِ اوسط کو تلاش کرتا ہے، سب کو ملا کر ترتیب دیتا ہے ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے۔ حدس میں دفعتاً تمام مقدمات ذہن میں آجاتے ہیں اور ان سے فوراً نتیجہ کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس حالت میں بھی حرکت فکری وقوع میں آتی ہو لیکن یہ حرکت اس قدر جلد اور غیر نمایاں ہوتی ہے کہ ذہن اس کو مطلق محسوس نہیں کرتا، حدس میں کیف و کم دونوں اعتبار سے اختلاف مراتب ہوتا ہے۔ بعض آدمیوں کو اکثر حدس

ہوتا ہے، بعض آدمیوں کو نہایت جلد ہوتا ہے یعنی ذرا سا غور کرنے سے فوراً مقدمات ذہن میں آجاتے ہیں اور ساتھ ہی نتیجہ بھی ذہن آجاتا ہے۔ حدس کے مراتب نہایت مختلف ہیں۔ بعض ایسے کودن ہوتے ہیں کہ سیکڑوں دفعہ غور کرنے سے بھی اُن کا ذہن نتیجہ کی طرف منتقل نہیں ہوتا، بعض کا ذہن جلدی سے منتقل ہوتا ہے، بعض کا اِس سے بھی زیادہ۔ حدس (یعنی وجدان) کا جو سب سے انتہائی درجہ ہے وہ "نبوت" کا خاصہ ہے، نبی کو اشیاء کا علم۔ مقدمات کی ترتیب و استنباط سے نہیں ہوتا بلکہ دفعتاً خود بخود اُس کے دل میں القا ہوجاتا ہے"۔

آگے چل کر امام غزالیؒ لکھتے ہیں۔ کہ "نوع بشری میں سب سے افضل وہ ہے جس کی قوت حدسیہ (قوت وجدان) اس قدر قوی ہو کہ اُس کو تعلیم و تعلم کی بالکل حاجت نہیں اور قوت متخیلہ اس قدر صحیح اور مضبوط ہو کہ محسوسات اُس کو اپنی طرف توجہ نہ کرنے پائیں بلکہ نفس سے جو ادراکات پیدا ہوتے ہیں وہ مجسم ہو کر سامنے آئیں اور قوت نفسانی اِس قدر قوی ہو کہ عالم اجسام پر اثر ڈال سکے یہاں تک کہ اجرام علوی بھی اُس کی دسترس میں آجائیں۔

اِس درجے سے اُتر کر وہ شخص ہے جس میں صرف دو پہلی باتیں ہوں۔ اِس سے کم وہ جس کی صرف قوت نظری قوی ہو اُس سے کم وہ جس کی صرف قوت عملی قوی ہو، جس شخص میں تینوں باتیں پائی جاتی ہیں وہ گویا شہنشاہ ہے، عالم علوی سے اُس کو یہ نسبت ہے کہ جب چاہے اِس عالم میں شامل ہوجائے۔ عالم نفسی کا گویا وہ رہنے والا ہے، اور عالم اجسام پر جس قسم کا چاہے تصرف کرسکتا ہے۔

اِس سے کم درجہ پر جو شخص ہے وہ دوسرے درجہ کا بادشاہ ہے۔ اِس سے کم درجہ کے لوگ شرفاء اُمت ہیں جن میں کسی قسم کی قوت نہ ہو، لیکن اخلاق حسنہ سے متصف ہونے کی قابلیت ہو وہ اولیاء اُمت ہیں جو عام آدمیوں سے ممتاز ہیں"

نبوت کے متعلق عموماً یہ بحث کی جاتی ہے کہ وہ کسبی ہے یا وہبی یعنی فطرت کی طرف سے اپنے خاص بندوں کو عطا کی جاتی ہے۔ نبوت ایک فطری ملکہ ہے جو قدرت کی طرف سے بعض انسانوں کو انسانیت کی مادی اور روحانی نشوونما کے لئے عطا کیا جاتا ہے۔ وہ انسان کے دلوں کی روحانی کھیتیوں کو اُسی طرح سرسبز و شاداب کر دیتی ہے جس طرح بارانِ رحمت خشک کھیتیوں اور بیابانوں کو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جو انسان وحی الٰہی کا حامل ہو اُس میں چند شرائط پائی جائیں۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک پاک اور با اخلاق زندگی کا حامل ہو، مجاہدہ اور تزکیہ کے ذریعہ وہ اپنے نفس کو منزہ کرے لیکن ان شرائط کو خود اِس انسان کی زندگی میں قدرت ہی پورا کر دیتی ہے۔ ولایت اور نبوت تو خیر واضح طور پر ایک عطیہ الٰہی ہے لیکن کوئی سی وہ صلاحیت ہے جو عطیہ الٰہی نہیں ہے! چاہے یہ صلاحیت عقلی ہو یا اخلاقی یا جمالی! انسان سمجھتا ہے کہ وہ اشیاء اور صفات اور اخلاق کا اکتساب کرتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ چیز عطیہ الٰہی ہے۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

انسانی علوم کے سرچشموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلا کہ انسانی وجود کی بقا اور اُس کی مادی اور روحانی نشوونما کے لئے قدرت کی طرف سے انسان کو خاص طور پر دو اہم ذریعے دئے گئے ہیں۔ ایک عقل اور دوم وجدانِ وحی۔ اہل عقل حکما اور فلسفی کہلاتے ہیں اور الہام اور وحی کے حامل پیغمبر۔ حکیم مُفرد واقعات کا مطالعہ کرتا ہے اور اُن کی بنا پر کلیات مرتب کرتا ہے جو اُسے حقیقت کی سرحد تک پہونچا دیتے ہیں۔ پیغمبر کو وجدانی طور پر حقیقت کا علم ہوجاتا ہے اور کلی علم کی بنا پر جزئیات سے واقف ہوجاتا ہے۔ حکیم محسوسات سے معقولات کی طرف ترقی کرتا ہے اور پیغمبر معقولات سے عام انسانوں کے افہام و تفہیم کی خاطر محسوسات

کی طرف آتا ہے۔ علامہ ابن مسکویہ نے وحی کی یہی حقیقت بیان کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"جس طرح مادی اور محسوس معلومات جب ترقی کرتے ہیں تو مادہ سے مجرد ہو کر صرف مفہوم عقلی رہ جاتا ہے، اسی طرح مفہوم عقلی جب تنزل کی طرف مائل ہوتا ہے تو جسمانی صورت اختیار کر لیتا ہے، انبیا کو جو ملکوتی صورتیں مشاہدہ اور محسوس ہوتی ہیں یا جو آوازیں اُن کے کانوں میں آتی ہیں اُس کی حقیقت یہی ہے۔"

عبدالرزاق لاہی کا بھی یہی خیال ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

"جس طرح ہم لوگوں کا دماغ محسوسات کو مجرد کر کے صورِ عقلیہ بنا دیتا ہے اسی طرح انبیا علیہم السلام کی قوتِ قدسیہ معقولات کو محسوسات کا لباس پہنا دیتی ہے۔۔۔۔"

امام غزالیؒ نے اسی خیال کو اس طرح ادا کیا ہے کہ

"زبانِ حال تمثیل کے طور پر مشاہد و محسوس ہوتی ہے اور یہ انبیا اور رسولوں کا خاصہ ہے، جس طرح زبانِ حال نیند کی حالت میں عام لوگوں کو محسوس صورت میں نظر آتی ہے اور وہ آوازیں اور گفتگوئیں سنتے ہیں۔ تو پیغمبر (علیہ السلام) ان چیزوں کو بیداری کی حالت میں دیکھتے ہیں اور یہ چیزیں بیداری کی حالت میں اُن سے باتیں کرتی ہیں۔۔۔"

عقل اور وجدان کے فرق کو امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ایک دلنشین اور موزوں مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ وہ علم جو عقل کے ذریعہ حاصل ہو اُس کی مثال اُس پانی کی ہے جو حوض میں باہر سے آ کر جمع ہو رہا ہو، لیکن وہ علم جو وجدان یا الہام یا وحی الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اُس کی مثال یہ ہے کہ اُن زمین اِس حد تک کھودے کہ اُس کے اندر سے مُصفا پانی کا چشمہ اُبل پڑے عقل کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خارجی تاثیرات کا ذریعہ ہوتا ہے جس میں نفسِ انسانی ایک ترتیب و ترکیب پیدا کر لیتا ہے لیکن وجدان اور وحی کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے وہ انسان کے باطنی چشموں سے پھوٹ پڑتا ہے۔ خارج سے کوڑے کرکٹ کے داخل ہو جانے کا ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ یہ چیزیں نفسِ انسانی میں داخل ہو کر اُس کو مکدر کر دیتی ہیں۔ لیکن جو علم صرف باطن کے سرچشمہ سے پیدا ہوتا ہے، وہ موتی کی طرح پاک و شفاف ہوتا ہے۔

علم کی مختلف قوتوں کو اگر ہم ایک مثال کے ذریعہ ظاہر کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مختلف دوربینیں ہیں جن کے ذریعہ حقیقت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جذبات کی دوربین کے ذریعہ حقیقت صاف و واضح نہیں دکھائی دیتی۔ صرف اُس کا دُھندلا سا خاکہ دکھائی دیتا ہے، عقل کی دوربین اِس سے زیادہ بہتر اور صاف ہے لیکن اُس کے ذریعہ صرف حقیقت کے چند پہلو دکھائی دیتے ہیں گو کہ وہ حقیقت کی اصلیت کی سرحد تک انسان کی راہ نمائی ضرور کر دیتی ہے جس جمال کی دوربین کے ذریعہ حقیقت کا حُسن تناسب اور ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن وہ تیز و شفاف دوربین جس کے ذریعہ حقیقت کی ماہیت اصلی کا ادراک ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ بہت کچھ اصل حقیقت کا پتہ چلتا ہے وہ وجدان، الہام اور وحی الٰہی کی دوربین ہے۔ اِس دوربین کی بھی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔ بعض زیادہ دور تک دیکھتی ہیں بعض صرف قریب کا مشاہدہ کرتی ہیں جس شخص کے پاس جس قسم کی دوربین ہے وہ اُسی حد تک حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ الہامی شعرا فلسفیوں سے زائد حقیقت کے قریب پہونچ جاتے ہیں اُن سے زیادہ اولیا حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ پیغمبر حقیقت کو بے حجاب دیکھتے ہیں۔ پیغمبروں کے بھی پھر روحانی صلاحیت کے اعتبار سے درجے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی روحانی صلاحیت کے اعتبار سے سب سے زیادہ برتر و بالا تھی۔

حقیقت کی دشوار گزار گھاٹی میں سے گزرنے کیلئے غرضکہ ہم کو مندرجہ بالا آلات سے مسلح ہونا چاہیئے جبلتیں ہم کو اِس قابل بناتی ہیں کہ ہم

اپنے حیوانی جسمانی وجود کو باقی رکھ سکیں تاکہ جسم کی پشت پر سوار ہو کر نفس انسانی اپنا سفر طے کر سکے۔ جذبات ہر قسم کے خارجی حملوں سے ہماری حفاظت کرتے ہیں لیکن ان جبلتوں اور جذبات کو نفس انسانی کے تابعِ فرمان ہونا چاہیئے، ورنہ یہ خطرہ ہر وقت لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ اپنی درشتگی کے باعث نفس انسانی ہی کو ہلاک نہ کر دیں عقل ہماری اس منزل میں بہت حد تک رہنمائی کرتی ہے جب وہ تھک جاتی ہے تو ذوقِ جمال بھی کشاں کشاں آگے بڑھاتا ہے جب وہ بھی تھک جاتا ہے تو پھر وجدان الہام اور وحی الٰہی کے سوا اور کوئی دوسری قوت راہ نمائی نہیں کر سکتی۔ ہر مسافر صرف اسی حد تک منزل طے کرتا ہے جس حد تک کہ اس کی سواری اُسے لے جاتی ہے۔ دُنیا کے اکثر انسانوں میں لیکن جبلتوں اور جذبات کے علاوہ کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس لئے وہ تقریباً حیوانی زندگی ہی پر اکتفا کرتے ہیں جن میں قویٰ عقلی بھی ہوتے ہیں۔ وہ حکیم اور فلسفی بنتے ہیں جن میں وجدانی صلاحیت ہوتی ہے وہ شاعرانہ اور ملہمانہ زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں جن میں روحانی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے وہ انسانیت کی آخری سرحد اور ملکوتیت کی ابتدائی منازل تک پہونچ جاتے ہیں۔ اُن نامرادانسانوں کے لئے جن میں نہ عقلی غور و فکر کا مادہ ہوتا ہے اور نہ روحانی صلاحیت ہوتی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ وہ حکما اور عقلا اور ولیوں اور پیغمبروں کے احکام کی اطاعت کریں لیکن اگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتے تو اُن کے لئے سوائے ہلاکت کے اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

علم اور عمل

حقیقت کی منزل تک پہونچنے کے لئے غرضکہ یا تو ہم کو خود اپنے نفس۲۱ میں وہ روحانی صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے جس کے ذریعہ حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے یا پھر پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت کی اطاعت کرنی چاہیئے۔ پہلا راستہ نہایت دشوار گزار ہے جو صرف تزکیہ نفس اور مجاہدہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے انعامات بھی بہت بیش قیمت ہیں۔ دوسرا راستہ نسبتاً آسان ہے لیکن یہاں وہ لذت و کیف کہاں جو پہلے راستہ کے اختیار کرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ بہر حال نفسی تباہی اور ہلاکت سے انسان اس کے ذریعہ بھی بچ جاتا ہے۔

الہامی شاعروں۲۲ حکیموں اور فلسفیوں اور ولیوں اور پیغمبروں نے حقیقت کے جو رموز ظاہر کئے ہیں اور انسانی ہدایت کے لئے جو تعلیمات

ف ۲۱ جن "نامرادوں" میں عقلی غور و فکر کا مادہ پایا جاتا ہے اور روحانی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اُن کیلئے بھی انبیاء کرام کے احکام کی اطاعت ضروری ہے صرف نفس کی روحانی صلاحیت کافی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ جو تعلیمات بھیجی ہیں اُن کا اتباع بڑے سے بڑے فلسفی اور بلند سے بلند روحانی انسان کیلئے ناگزیر ہے، صداقت، حقیقت، راستی اور ہدایت کا صرف ایک ہی کامل اور صحیح ذریعہ ہے اور وہ ہے "وحی الٰہی"! یہ نظریہ یکسر غلط ہے کہ "انسان کو مشاہدۂ حقیقت کیلئے اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے یا پھر پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت کا اتباع کرنا چاہیئے" آدمی خود کس طرح فیصلہ کرے گا کہ مجھ میں اتنی روحانی صلاحیت پیدا ہو گئی کہ میں حقیقت کا صحیح طور پر مشاہدہ کر سکتا ہوں اور فکر و عمل میں خود میری روحانی صلاحیت میری رہنمائی کر سکتی ہے ـــــ یہ وہ دوراہا ہے جہاں سے ہدایت اور ضلالت کے راستے پھٹتے ہیں جنھوں نے خود اپنے نفس اور وجدان کی صحت پر اعتماد کیا وہ ضلالت کے راستہ پر چل پڑے اور جنھوں نے انبیاء کرام کی تعلیمات کو دلیلِ راہ بنایا اور اپنی عقل، روحانی صلاحیت اور وجدان کو "وحی الٰہی" کے تابع کر دیا، اُن کو ہدایت نصیب ہوئی ـــ

ف ۲۲ "پیغمبروں" کی تعلیمات کے ساتھ شاعروں اور فلسفیوں کے "رموز" و "اقوال" کا آخر جوڑ کیا ہے اِن لوگوں کو انبیائے کرام کی صف میں لکھنا ہی فکر و نظر کی بہت بڑی غلطی ہے، نبوت اور شعر و فلسفہ میں زمین آسمان کا فرق ہے، قرآن نے انبیاء کرام کے متبعین کو ہدایت یافتہ اور شاعروں کی اتباع کرنے والوں کو "غاوون" کہا ہے، اُن شعروں کو چھوڑتے ہوئے جن میں حکمت و موعظت کی باتیں ہوتی ہیں، عام طور پر شاعری نے لوگوں کو اخلاقی نقصان پہونچایا ہے غالب کتنا بڑا شاعر ہے مگر اُس کی شاعری کیا ہدایت و فلاح کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ نبوت کا موضوع ہی "ہدایت" ہے اور شاعری کا موضوع "ہدایت" نہیں ہے! انبیاء کے پیام میں یکسانی اور یک رنگی ہے تضاد نہیں ہے، شاعروں کے یہاں تضاد ہے انبیاء کرام سب کے سب معصوم اور پاکیزہ کردار ہوئے ہیں (بقیہ صفحہ ۲۲ پر)

دی ہیں وہ انسان کی خوش قسمتی سے کتابوں اور صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ ہر انسان میں خود اس قدر عقل و حکمت نہیں ہوتی کہ وہ ان رموز کا پتہ چلا سکے اور روحانی صلاحیت تو شاذ و نادر ہی لاکھوں انسانوں میں سے بعض میں پائی جاتی ہے جس کے ذریعہ انسان حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ البتہ انسان ان نوشتوں کے مطالعے سے بھی کم از کم ان مسائل کے متعلق وہ نظری علم حاصل کرتا ہے جو اس کی عملی زندگی کے لئے کافی ہے۔ شاعروں میں ویاس، ڈانٹے، گوئٹے، رومی، سعدی، ٹیگور اور اقبال وغیرہ کا کلام حقیقت کے روحانی پہلو سے واقفیت کراتا ہے۔ فلسفیوں میں ارسطو، افلاطون، شنکر اچاریہ، ہیگل اور ابن رشد وغیرہ حقیقت کی اصلیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ پیغمبروں میں تو سب ہی حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور یہ نہ صرف اس کے جمالی اور نظری مشاہدہ پر اکتفا کرتے ہیں ...اور حقیقت کی روشنی میں انسان کی ہدایت کے لئے ایک نظام عمل بھی مرتب کرتے ہیں اور عملاً اس پر عمل کر کے انسانیت کے لئے ایک اسوہ حسنہ بھی پیش کر دیتے ہیں ہم جس طرح پہلے کہہ آئے ہیں کہ پیغمبر نہ صرف انسان کی نظری تکمیل کرتا ہے بلکہ وہ اس کی عملی زندگی کی بھی تکمیل کرتا ہے۔ اسی بنا پر پیغمبروں کی تعلیمات سب سے زیادہ موثر ثابت ہوتی ہیں وہ صرف منطقی استدلالات کے ذریعہ مسائل حل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وجدانی طریقہ پر نفس انسانی پر اثر انداز ہو کر اس کی اخلاقی اور روحانی نشوونما کرتے ہیں اسی بنا پر ان کا کلام ایسا ہوتا ہے جسے معمولی فہم کا انسان اور ایک فلسفی دونوں ٹھیک طور پر سمجھ لیتے ہیں۔ وہ نفس انسانی کے ایک پہلو یعنی صرف عقل سے اپیل نہیں کرتے بلکہ بہ حیثیت مجموعی تمام نفس انسانی سے خطاب کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کے کلام میں جہاں عقلی دلائل ہوتے ہیں وہاں جمالی احساسات اور وجدانی کیفیات بھی ہوتی ہیں ان کا طرز استدلال عموماً خطیبانہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ ایک نفس دوسرے نفس سے بلاواسطہ تعلق پیدا کر لیتا ہے۔

ارسطو اور افلاطون کی تعلیمات کو سوائے چند نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ انسانوں کے کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ انسانیت کا کوئی بڑا حصہ ان سے متاثر ہوا ہے لیکن کرشن[1]، بدھ[2]، عیسیٰ و موسیٰ، ابراہیم اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے ماننے والے اور ان پر عمل کرنے والے آج تقریباً تمام دنیا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان کی تعلیمات حقیقت سے اس بلاواسطہ تعلق کا نتیجہ ہیں جو الہام اور وحی کے ذریعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اثر اندازی کا ایک دوسرا سبب یہ بھی ہے کہ ان تعلیمات کا مقصد صرف بعض انسانوں کی بعض قوتوں کی ترقی نہیں بلکہ بہ حیثیت مجموعی انسانیت کی اخلاقی اور روحانی نشوونما مد نظر ہے۔ باوجود ہزاروں سال گزر جانے کے بھی بید[3]، توریت، زبور، انجیل اور قرآن میں جو تاثیر پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے انسانی نوشتہ میں نہیں ہے۔ وہ ازلی نوشتے ہیں وہ نوشتے جو خود حقیقت اعلیٰ نے انسانیت کی ترقی کے لئے مقدس انسانوں کے دلوں پر کندہ کر دئے تھے۔ اسی بنا پر احیائے انسانی کے لئے ہم

اور شاعروں میں کردار کی پاکیزگی بہت کم یاب ہے" گنتی کے چند شعراء کے علاوہ باقی تمام شعراء خراب بادہ و شاہد ہی ملیں گے! شعر کی اثر انگیزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر "اثر انگیزی" اور "ہدایت" لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ (م۔ق)

[1] و [2] اس مضمون کے لکھنے والے مسلمان نہ ہوتے تو ہم اس عبارت پر احتساب نہ کرتے! اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں انبیا اور مصلحین کو مبعوث فرمایا ہے اور ان نبیوں پر کتابیں اور صحیفے بھی نازل ہوئے ہیں مگر جن نبیوں، رسولوں، مقدس کتابوں اور صحیفوں کے نام قرآن پاک میں آئے ہیں، ان کے سوا دوسرے مصلحین اور مذہبی کتابوں کو ہم قطعیت کے ساتھ نبی، رسول اور آسمانی کتاب نہیں کہہ سکتے، اور نہ ہم ان کا اس سطح پر آکر ذکر کریں گے جس سطح پر ہم حضرت ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور توریت و زبور کا ذکر کرتے ہیں، اس فرق کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے، تعریف و تحسین کا ایسا پیرایہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے کہ یہ امتیازات باقی رہیں ——— فاضل مضمون نگار نے بدھ کا جو نام لیا ہے تو اس سلسلہ میں ہمیں بعض قابل اعتماد اور صاحب بصیرت افراد نے بتایا ہے کہ مذہب کی خشت اول خدا کا تصور ہے اور گوتم بدھ کی تعلیمات میں خدا کا ذکر نہیں ملتا، وہ شروع سے آخر تک "آتما" ہی پر غور کرتے رہے، اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر بدھ جی قومی مصلح تو تھے مگر مذہبی پیشوا نہ تھے! (م۔ق)

جو بھی نظامِ عمل بنائیں گے وہ لازماً ان احکامات اور تعلیمات پر مبنی ہوگا جو ایزدی ہیں جو وحی الٰہی کا نتیجہ ہیں یعنی جو حیثیت کلی حقیقت کا ادراک کرنے کے بعد انسانیت کے لئے ایک راہِ عمل پیش کرتے ہیں۔

یہ الہامی نوشتے سب ہی مقدس ہیں اور اس قابل ہیں کہ انسان کی راہ نمائی کریں لیکن ان میں اکثر صحیفوں میں انسانوں نے تحریف کر دی ہے۔ اُن میں بہت کچھ ردو بدل کر دیا ہے اس لئے یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی اصلیت میں باقی ہیں۔ لیکن ایک صحیفہ یعنی قرآن کے متعلق یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ تیرہ سو برس سے اُس کے ایک شوشے میں بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے' اسی لئے وہ انسانیت کی راہ بری کے لئے سب سے زیادہ مفید اور معیاری کتاب ہے۔ پھر وہ اُن تمام الہامی کتابوں کا خلاصہ بھی ہے جو اس کے پہلے اس دنیا میں نازل ہو چکی ہیں اس لئے اس اعتبار سے اس کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔

نظری تعلیم معلّم کی عملی زندگی سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی۔ نظری تعلیمات بلکہ انسان کی عملی زندگی کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لئے معلّم کی ذات بھی انسانیت کے علم و عمل کے لئے ایک بہت بڑا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ حکما اور فلاسفہ میں علم و عمل کی ہم آہنگی کا پایا جانا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ فلاسفہ ایک خاص قسم کی نظری تعلیم پیش کرتے ہیں لیکن اُن کی عملی زندگی اُس کے بالکل خلاف ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اُن کے نظری قویٰ کے ساتھ اُن کے عملی قویٰ اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہوتے، نظری تعلیمات اور اعمالِ زندگی کی مکمل ہم آہنگی دیکھنا ہو تو ہم کو پیغمبروں کی زندگی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب خدا کی ذاتِ یکتا کو پا لیا تو اُس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا حتیٰ کہ خدا کی فرماں برداری میں اپنے چہیتے بیٹے کو بھی ذبح کرنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک پاک باز زندگی کے لئے قید و بند کی سالہا سال تک مصیبتیں سہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو آزاد کرانے اور اُس کو راہِ ہدایت دکھلانے کیلئے فرعونِ مصر سے اپنی جان کی بازی لگا کر مقابلہ کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صداقت اور بنی نوعِ انسان کی محبت کے لئے کانٹوں کا تاج پہنا۔ ان تمام مقدس ہستیوں نے اپنی نظری تعلیمات اور اسوۂ حسنہ سے بنی نوعِ انسان کی نظری اور عملی ہدایت کی۔ لیکن وہ یگانہ ہستی جس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق صرف نظری تعلیمات پیش کیں بلکہ اُن پر عمل کر کے بھی دکھایا وہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات ہے۔ بچپن سے لیکر وفات تک آپ کی زندگی کا ہر واقعہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اور اس قطعیت اور صحت کے موجود ہے کہ کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپؐ کا بچپن بچوں کے لئے ایک نمونہ ہے، تو آپؐ کی جوانی جوانوں کیلئے ایک مثال ہے، اسی طرح آپؐ کا ادھیڑ پن اور بڑھاپا ادھیڑ اور بوڑھے لوگوں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ آپؐ نے بحیثیت ایک گھریلو انسان کے اپنے بیوی بچوں اور خاندان کے فرائض انجام دئے۔ بحیثیت ایک شہری کے اپنے شہر کے دشمنوں کے مقابلہ میں حفاظت کی اور اُن کے آپس کے فسادات کو دور کیا۔ اپنے رفیقوں کے ساتھ حق و صداقت کے لئے فقر و فاقہ اور سماجی بائیکاٹ کی تکالیف اُٹھائیں۔ مکی زندگی کو خیرباد کہہ کر جب آپؐ مدینہ پہونچے تو وہاں کے مختلف مذاہب کے پیرووں کے آپس کے فسادات کو دور کر کے ایک ریاست کی بنیاد ڈالی جس میں سب کو مساوی حقوق دیئے گئے اور سب کی آزادیٔ ضمیر و مذہب کو تسلیم کیا گیا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں آپؐ اس ریاست کی حفاظت کے لئے خود لڑے۔ بحیثیت مزدور آپؐ نے سر پر پتھر اُٹھائے۔ بحیثیت امیر آپؐ نے امورِ سلطنت کو انجام دیا تمام قبائل کے اختلاف کو دور کر کے ایک متحدہ عرب کی بنیاد ڈالی۔ جب اس کام سے فارغ ہوئے تو دُنیا کی دیگر اقوام کو حق و صداقت اور امن و امان کا پیام دیا۔ غلاموں کے ساتھ بہتر سلوک کی تاکید کی اور اس قسم کی تعلیمات دیں کہ غلامی خود بخود مسدود

ہو جائے۔ عورتوں کو اس قدر سماجی اور قانونی حقوق دئے کہ وہ میدانِ زندگی میں مردوں کے برابر دوش بدوش آ کر کھڑی ہو گئیں۔ عرب وعجم کے فرق کو مٹا دیا اور ہر قسم کے نسلی اور قومی غرور کا سدِ باب کیا، غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے خود آپؐ نے اپنا "اسوہ حسنہ" چھوڑا ہو جس کی تقلید کر کے انسانیت انتہائی مادی اور روحانی ترقی کر سکتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل یا بعد اس وقت تک کوئی اتنی جامع شخصیت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے اس میں کیا شک ہے کہ آپؐ خاتم النبیین تھے اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے خدائے تعالےٰ نے اپنا آخری پیغام آپؐ کے ذریعہ انسانیت تک پہونچا دیا، جو تعلیمات آپؐ نے دیں آج بھی اگر اُن کا منصفانہ طریقہ پر مطالعہ کیا جائے تو وہ انسانیت کی مادی اور روحانی فلاح وبہبود کے لئے سب سے بہتر ہیں اُن کا اگر دُنیا کے دوسرے نظام ہائے حیات وسلطنت سے مقابلہ کیا جائے تو اُن کا پلہ ہر حیثیت سے بھاری رہے گا، اِن تعلیمات میں دین دنیا، معیشت وسیاست، اخلاق ومذہب اور رُوح ومادہ کے اعتدال کے ساتھ وہ امتزاج کیا گیا ہے جو کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہ نہ ترکِ دُنیا کی تعلیم دیتی ہیں نہ حُبِ دُنیا کی اِس میں نہ رہبانیت ہے، نہ عیش پرستی۔ انسانیت اگر اپنا احیاء اور سربلندی چاہتی ہے تو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ اور قرآن پاک اُس کے علم وعمل کیلئے بہترین سرچشمے ہیں ــــ!!

سیّد حسن ریاض

جرائم — اور افراد حکومت اور معاشرہ

اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے!

بنی نوع انسان اس دور میں اپنی بداعمالیوں سے عاجز ہے۔ جو جرائم شایستہ اور مہذب انسانوں کی آبادیوں میں ہوتے ہیں، درندوں اور وحشیوں کے بنوں میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسروں کے حقوق پر دست درازی، چوری، لوٹ، ڈکیتی، دھوکا، فریب اور جعل، رشوت، تغلب، غصب اور قتل روز کا معمول ہیں۔ دنیا کے کسی ایسے شہر کا نام لیجئے جو کسی عظیم سلطنت کا پایۂ تخت ہے اور لوگ تہذیب و شایستگی میں اسے نمونہ سمجھتے ہیں وہ ان کا اور ان سے بدتر جرایم کا مرکز ہوگا۔ دولت بڑھانے کے لئے اور سیاسی اختیار اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے جو جرائم کئے جاتے ہیں وہ بھی سب یہی ہیں لیکن اس مقصد کے لئے جو ان کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اونچے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی بداعمالیوں کے اثرات شہروں سے گزر کر ملکوں اور ولایتوں تک پہونچتے ہیں اور ایسی ہولناک جنگوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جیسی ایک ابھی حال میں ختم ہوئی ہے جو مختلف قسم کے انفرادی اور اجتماعی جرایم اس زمانے میں ہو رہے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

حیرت انگیز یہ ہے کہ یہ جرایم اس عہد میں ہیں جب فن حکمرانی نے ایسی ترقی کی ہے کہ برطانیہ امریکا اور فرانس جیسی جمہوریتیں پیدا ہوئیں، جن میں سے ہر ایک بہترین ہونے کی دعویدار ہے، اور دنیا کی تاریخ میں اس ترقی کی نمود سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ حکومتیں انسانی شایستگی اور ترقی کی نمود ہیں، تو اس حقیقت سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نیویارک، لندن، اور پیرس کے جرایم ہمیشہ بے نظیر ہیں۔ جرایم کی تاریخ میں ان جیسے کبھی کبھی نہیں ہوئے۔

خود ان حکومتوں کو قایم کرنے کے لئے، قایم رکھنے کے لئے، اور ان ضوابط کی تکمیل کے لئے، جن سے ان کی وہ ہیئت پیدا ہوتی ہے جس پر جمہوریتیں نازاں ہیں، اس سے کہیں بدتر جرایم کئے جاتے ہیں جو روپیہ حاصل کرنے اور نفسانی خواہشات پوری کرنے کے لئے وہ جاہل کرتے ہیں جن کے پیچھے ہر وقت پولیس دوڑتی رہتی ہے جو گرفتار ہوتے رہتے ہیں اور سزائیں پاتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جرایم اور بداعمالیوں کی نفرت باقی نہیں ہے۔ ایک شخص رشوت لیتا ہے، جوا کھیلتا ہے یا اس نے مال غصب کیا ہے اور لوگ اس سے واقف ہیں مگر اس سے احترام کے ساتھ ملتے ہیں۔ ایک بڑھیا سی کار، اچھا سا مکان، اور لوگوں کی مدارات کا معقول انتظام ہو کسی کو قاتل سے بھی ملنے میں عار نہیں ہے۔

جرائم کی کثرت اور جرائم سے بے پروائی کا ایک عام نتیجہ یہ ہے کہ وہ نئی نسل جو عنقریب دنیا کی وارث بننے والی ہے اپنی آئندہ زندگی کا تمام پروگرام بداخلاقیوں پر بنا رہی ہے۔ کسی نوجوان سے گفتگو کیجئے وہ صرف ایسی تدبیریں بیان کرے گا جو دغل، فریب، اور بددیانتی پر مبنی ہوں گی۔ آپ ان پر اعتراض کیجئے۔ وہ آپ پر ہنسے گا اور بے باکی سے کہے گا "جی نہیں۔ اس زمانے میں کامیابی اور ترقی اسی طرح ہوتی ہے۔ اُن باتوں کا زمانہ گیا جو آپ بیان کر رہے ہیں" وہ کنایتاً آپ کو بیوقوف اور احمق کہے گا۔

اس میں نوجوان نسل کا کوئی قصور نہیں۔ انہوں نے نہایت بداعمال لوگوں کو برائیوں کے ذریعے ہر شعبہ زندگی میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ کسی ماہر سیاست کے باطن سے پردہ اُٹھائیے وہ سخت سیاہ کار نکلے گا، اور اپنی تمام سیاہ کاریوں ہی کے ساتھ وزارت کے عہدے تک پہونچا ہوگا۔ دنیا کے کسی دولت مند کے حالات کی تحقیقات کیجئے معلوم ہوگا کہ کوئی شدید بے ایمانی اور بے ایمانیوں کا تسلسل اس کی دولت مندی کا سبب ہے۔ بے ایمانی اور بداعمالی سے اختیار اور اقتدار بھی حاصل ہو جاتا ہے اور دولت بھی مل جاتی ہے (آسانی سے ملتی ہے، جلد ملتی ہے اور بہت ملتی ہے) لیکن انصاف مٹ جاتا ہے اور اجتماعی خوش حالی اور عافیت تباہ ہو جاتی ہے۔

جب بددیانتی اور ناانصافی کا دور ہوتا ہے تو کسی معاملے میں توازن اور عدل باقی نہیں رہتا چند لوگوں کو حق کے خلاف بے اندازہ مل جاتا ہے اور بہت سے بالکل محروم رہتے ہیں۔ دولت اختیار اور وسائل ترقی ہر چیز کی تقسیم کا ایک ہی طور ہوتا ہے۔ افراد میں اور جماعتوں میں اس سے کوفت، شورش، خلش اور مایوسی، پھیلتی ہے۔ پھر جب بداعمالیاں بین الاقوامی پیمانے تک پہونچ جاتی ہیں جیسی اس وقت ہیں، تو عالمگیر جنگیں اور بین الاقوامی مصائب رونما ہوتے ہیں۔ ہوس اور ناانصافی کا انجام صرف خونریزی اور تباہی ہے۔ ان سے جو کامیابیاں ہوتی ہیں وہ عارضی اور بُرے انجام کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ مگر لوگ فوری اور بڑی کامیابیوں سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ ناسمجھ لوگوں کے لئے ان میں بڑی رغبت ہے اور ناانصافی سے اکثر افراد کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں اور جو کامیابیاں ہوتی ہیں وہ اور کسی طرح میسر آ ہی نہیں سکتیں۔ لیکن افراد کی ناانصافیوں اور معصیتوں کا اثر جماعت پر بڑا مہلک ہوتا ہے۔ مثلاً ایک غدار پورے ملک اور اس کی آبادی کو دشمن کے ہاتھ فروخت کر کے بڑا مالدار ہو سکتا ہے۔ مگر وہ ملک اور اس کی آبادی صدیوں کے لئے غلامی، افلاس ہر قسم کی ذلت اور خواری میں مبتلا ہو جائے گی۔ چند سُود خوار ہزاروں اوسط درجے کے ضرورت مندوں کے وسائل آمدنی میں حصے دار ہو کر بہت جلد بڑے دولت مند بن سکتے ہیں لیکن جس ملک میں انفرادی سود خواری کا رواج ہوگا اس کے عوام مفلس ہوں گے۔ اسی طرح جب افراد میں جنسی بداعمالیوں کا رواج ہو جاتا ہے تو بالآخر سوسائٹی کی حالت وہ ہو جاتی ہے جو اہل فرانس کی ہوئی۔ جنگِ عظیم میں فرانس کی شکست کے اسباب اور اُن میں سے ایک سبب یہ بھی بتایا گیا کہ بچوں کی پیدائش بہت کم ہو گئی۔ واقعی فرانس کی آبادی میں اسی سبب سے برابر تنزل ہو رہا ہے۔ اسی طرح ہر ناانصافی اور برائی جو افراد سے شروع ہوتی ہے انجام کار پوری جماعت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک تباہ ہوتی ہی نہیں جب تک کہ افراد کی اکثریت خراب نہ ہو جائے۔ قوموں اور اُمتوں کی تباہی افراد کی مجموعی بداعمالیوں کی ظاہری ہیئت ہوتی ہے۔

بُرے اعمال سے افراد بھی تباہ ہوتے ہیں مگر وہ سمجھتے نہیں۔ اسے دوسرے اسباب پر محمول کر لیتے ہیں لیکن معاشرے کی زندگی منحصر اسی پر ہوتی ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی (یعنی افراد) ذمائم سے پاک ہوں۔ ذمائم میں بدترین ظلم ہے، یا یہ ایک لفظ میں تمام برائیوں کا خلاصہ ہے۔ ظلم حکومتیں ہی نہیں کرتیں افراد بھی کرتے ہیں اور اصل میں افراد ہی کرتے ہیں۔ زانی بھی ظالم ہے، شرابی بھی ظالم ہے، جواری بھی ظالم ہے، سود خوار بھی ظالم ہے، راشی بھی ظالم ہے، مرتشی بھی ظالم ہے، جھوٹا بھی ظالم ہے۔ ان میں سے ہر گناہ

کے اثرات اور نتائج پر غور کیجئے نظر آجائے گا کہ ہر ایک جہان سوز ہے، مگر یہ سب جرائم ہیں انفرادی۔

یہ ان مظالم سے معاشرے کو محفوظ رکھنے ہی کے لئے ہوا کہ انسان نے اپنے لئے یہ ایک عظیم مصیبت ایجاد کی جس کا نام حکومت ہے۔ وہ اب اس کی وسعت، اس کی گراں خرچی اور ہر معاملہ میں اس کی دراندازیوں سے عاجز ہے۔ ہر ملک کا وزیر مالی ہر سال نئے نئے ٹیکس اختراع کرتا ہے۔ اب سوائے ہوا کے مشکل ہی سے کوئی چیز باقی ہے جس پر ٹیکس نہیں۔

مگر اس کے باوجود ہر ملک میں جتنی بداعمالیاں اس وقت ہیں وہ عاد اور ثمود کی بستیوں میں بھی نہ ہوں گی۔ افسوس یہ ہے کہ خود حکومتوں کے اداروں میں یہ سب سے زیادہ ہیں۔ زیادہ اس وجہ سے ہیں کہ یہاں اختیار ہے اور دار و گیر سے بڑی حد تک تحفظ ہے۔

اگر انسانوں میں ظلم اور ہوس کا مادہ نہ ہوتا تو حکومت کی ہرگز ضرورت نہ ہوتی۔ لوگ بلا جبر اور بلا خوف بادشاہ امن اور آزادی کے ساتھ رہتے۔ مگر یہ نہیں ہوسکتا۔ انسان میں یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے، اور اپنے لئے ہر قسم کی آسائشیں اور سہولتیں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ چاہتا ہے۔ یہ حکومتیں نہیں کرتیں کہ دولت، وسائل ترقی اور اختیار کے توازن کو خراب کریں بلکہ افراد کرتے ہیں۔ حکومتوں کے قیام کی تو غایت ہی یہ ہے کہ وہ اس توازن کو نہ بگڑنے دیں۔ مگر اس وقت حکومتوں ہی سے یہ شکایت ہے کہ وہ توازن خراب کر رہی ہیں۔ یہ نظر کا فریب ہے۔

یقیناً جہاں تک داخلی امور کا تعلق ہے حکومت طبعاً اس کی حامی نہیں ہوسکتی کہ ظلم پر رہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں عدم توازن کا دوسرا نام ظلم ہی ہے۔ مگر بادشاہ، ڈکٹیٹر یا کوئی مطلق العنان حاکم اپنے ذاتی مقاصد کے لئے وہ طرز عمل اختیار کرسکتا ہے جو عملاً ظلم ہو۔ یہ حکومت کا میلان نہیں اس ایک شخص کا انفرادی میلان ہوگا۔ پھر اس کے وزراء، اس کے عمال، اور اس کے اہلکار اپنے اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اپنے انفرادی مقاصد کے لئے ظلم اور زبردستی کرسکتے ہیں یہ ان کے ذاتی افعال ہوں گے۔ کسی نظام حکومت میں جہاں ظلم اور جبر نظر آئے اس کی تحقیقات کرنی چاہیئے۔ انجام کار ثابت ہوگا کہ وہ کسی ایک یا بہت سے افراد کی ذاتی حرص و ہوس کا نتیجہ ہے۔

رشوت ستانی انفرادی میلان ہے۔ تغلب انفرادی میلان ہے، اعزا پروری اور دوست نوازی انفرادی میلان ہے۔ عوام کے مقابلے میں برتری کی خواہش اور اس کے لئے تمرد کا استعمال انفرادی میلان ہے۔ نذریں قبول کرنا، جلوس نکلوانا، دربار منعقد کرنا، اور سلامیاں لینا انفرادی میلان ہے۔ جنسی اختلاط کے لئے سہولتیں مہیا کرنا انفرادی میلان ہے۔ کام میں سستی، خلاف انصاف احکام دینا اور ان کی تعمیل پر اصرار کرنا انفرادی میلان ہے۔ جائز نکتہ چینی اور اعتراض سے تنفر انفرادی میلان ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی حکومت کے لاکھوں عمال اور اہلکار ان تمام جرائم میں مبتلا ہوں۔ بالآخر ان جرائم کا فائدہ افراد ہی کو پہنچتا ہے کسی حکومت یا نظامِ حکومت کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔

جب کسی حکومت کی یہ حالت ہوجائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ اختیار اور نظام حکومت پر آبادی کے اس عنصر نے قبضہ کر لیا جس کے برُے انفرادی میلانات کے انسداد کے لئے وہ وجود میں آئی تھی۔ اور اجتماعی مقاصد پر انفرادی اغراض غالب آگئیں یقیناً اس سے یہ بھی ثابت ہوگا کہ جس معاشرے کی وہ حکومت ہے اس کی بہت بڑی اکثریت عیب دار ہے، یہ عیب دار اکثریت حکومت پر چھا گئی ہے،

جب یہ صورت حال ہو تو اصلاح بڑی دشوار ہو جاتی ہے۔ مگر اصلاح کے کام کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بڑھتی ہوئی خرابیاں بالآخر پوری قوم، جماعت یا معاشرے کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ کو بداعمالیوں پر غصہ آتا ہے اور وہ بداعمال اقوام کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت خود بداعمالیوں کے اندر ہی وہ اثرات موجود ہیں جو انجام کار عام تباہی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں

جھوٹ جو لوگوں میں بہت عام ہے اور اس درجہ عام کہ اب اسے کوئی جرم ہی نہیں سمجھتا اپنے نتائج کے اعتبار سے اس قدر ہولناک ہے کہ اگر لوگ اس کا اندازہ کریں تو اس سے اس طرح بچیں جس طرح کوڑھ اور پلیگ سے بچتے ہیں، ادنیٰ سی بات یہ ہے کہ خود جھوٹ بولنے والا ساری دنیا کو جھوٹا سمجھنے لگتا ہے اور اس اعتماد سے محروم ہو جاتا ہے جو راست گوئی سے لوگوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ تجارت، گواہی اور شاہدی اور پورا انتظام دیوانی جھوٹ اور بدعہدی ہی سے پیدا ہوا ہے اور قوموں کے وسائل پر بار ہے۔ پھر جھوٹ بولنے والا بہت سے وہ جرائم چھپاتا رہتا ہے انہیں اپنی سیرت میں پختہ کرتا رہتا ہے اور دوسروں میں اس کی اشاعت کرتا رہتا ہے، جو ضرر کا باعث ہوتے ہیں۔ اس وقت جھوٹ نے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے کہ دنیا کا کوئی ماہر سیاست اور صاحب مرد انتظام اس بُرائی کے ارتکاب سے محفوظ نہیں ہے۔ وہ اپنی کوتاہیوں کو چھپانے اور عوام کا تعاون اور ان کی تائید حاصل کرنے کے لئے بے تکلف جھوٹ بولتا ہے اور جب اُس کا جھوٹ کھُلتا ہے تو ذرا بھی نہیں شرماتا۔ ان سربرآوردہ اور صاحب اختیار لوگوں کی دروغ بافیوں سے جھوٹ فیشن ایبل ہوگیا ہے، اور وہ طبقہ جو اقتدار و اختیار کی تمنا رکھتا ہے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے انتظام و اہتمام کرتا ہے۔ لیکن جب لوگوں کو باور آجاتا ہے کہ ان کے حاکم جھوٹ بولتے ہیں تو پھر وہ ان کے سچ پر بھی اعتبار نہیں کرتے اور کسی بہت ہی نازک موقع پر وہ ایسی لاچاری میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کے لئے سوائے حکومت سے دست برداری کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا، اس کے علاوہ لوگوں کی دروغ بیانی کے سبب سے کروڑہا انسان لاحاصل سعی میں مبتلا رہتے ہیں اور اجتماعی طور پر بہت مفید وقت ضائع ہوتا رہتا ہے، جو افراد و اقوام کے لئے سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔

جن لوگوں میں جنسی بداعمالی عام ہوتی ہے وہ اس فرحت سے محروم ہو جاتے ہیں کہ ان کی اولاد انہی کی ہے۔ گھروں میں بدامنی بچوں کے ساتھ بے مہری، ترکے میں ناانصافی یہ اس کے لازمی نتائج ہیں۔ بالآخر قومی اور اجتماعی معاملات میں جنسی خواہشات دراندازہو جاتی ہیں دنیا کی کتنی سلطنتیں ہیں جو جنسی بے اعتدالیوں اور لغوتیوں سے تباہ ہو گئیں۔ انسان کو حق، انصاف، اور فرض کی راہ سے ہٹانے میں جنسی ہوس اتنی بڑی شیطانی۔ طاقت ہے کہ وہ لوگ اس پر غالب آہی نہیں سکتے جو جنسی جرائم سے متنفر نہیں۔ کوئی حسین جاسوس عورت ان سے قومی اسرار معلوم کرسکتی ہے اور کوئی دلفریب قحبہ ان سے حق اور انصاف کے خلاف عمل کرا سکتی ہے ــــــ قتل تک!

راشی عمال اور اہلکار رشوت لیتے ہی ہیں اس بات کی کہ حق کے اور انصاف کے خلاف کریں۔ اگر کسی ملک کا محکمۂ انتظام اور پولس رشوت سے مجتنب ہو تو وہاں جرم اور جرم کرنے والوں کا وجود نہ رہے۔ لیکن چوروں، ڈاکوؤں، جواریوں، اور ہر قسم کے قانون شکنوں سے ماہوار، ہفتہ وار اور روزانہ ان کی رقمیں بندھی رہتی ہیں اور اس معاشرے کو راشی عمال و حکام ایذا پہنچاتے رہتے ہیں جس کے وہ محافظ اور تنخواہ دار خادم ہوتے ہیں۔

ملک کی داخلی بدامنی اور عافیت سے محرومی کا باعث ہمیشہ راشی[۵] محکمۂ انتظام ہوتا ہے جس میں پولیس اور مجسٹریٹ سب شامل ہیں۔ ایسے ملک میں نہ لوگوں کی جان محفوظ ہوتی ہے، نہ مال محفوظ ہوتا ہے اور نہ آبرو محفوظ ہوتی ہے۔ اکثر ہوا ہے کہ ایسے ملکوں کی آبادیوں نے غیروں کو دعوت دی ہے کہ وہ بداعمال حاکموں سے انہیں نجات دلائیں، قومی خطرے کے وقت بالعموم اُس ملک کے لوگوں کو جس کے حکام اور عمال میں رشوت ستانی اور جنسی جرائم کی عادت ہوتی ہے، اپنی حکومت پر یہ اعتماد نہیں ہوتا کہ وہ ملک

---

[۵] عربی میں رشوت لینے والے کو "مُرتشی" اور رشوت دینے والے کو "راشی" کہتے ہیں مگر اُردو میں یہ لفظ راشی "مُرتشی" (رشوت لینے والے) کے معنیٰ میں چل پڑا ہے، فاضل مضمون نگار نے بھی عوام کے روزمرہ کا تتبع کیا ہے (مدیر)

اور قوم کی حفاظت کر سکے گی، انہیں ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ کوئی رشوت لیکر ملک کی آزادی کو بیچ نہ ڈالے، لہٰذا دفاع و تحفظ میں حکومت کو عوام کا دلی تعاون بھی حاصل نہیں ہوتا، اس کے خطرناک نتائج ظاہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے اور عاقبت کے خوف سے خوش اعمالی اختیار کرنا یہ تو انہی کے لئے مخصوص ہے جن کی روحیں سعید ہیں اگر لوگوں میں خودغرضانہ بصیرت بھی کامل ہو تو اسی دنیوی زندگی کو تباہی اور مصائب سے بچانے کے لئے وہ بداعمالیوں سے بچیں۔

جن لوگوں نے سب سے پہلے یہ سوچا کہ جماعت، معاشرے یا قوم کے اندر عدل قایم کرنے اور غیروں کے حملوں سے حفاظت کے لئے وہ اجتماعی مرکز اختیار و قوت قایم کیا جائے جس کا نام حکومت ہوگیا ان کی انفرادی خودغرضانہ بصیرت بڑی کامل تھی، انہوں نے لوگوں کی انفرادی جان مال اور آبرو کی حفاظت ہی کے لئے جماعتی قوتوں کو یکجا کرنے کی یہ صحیح تدبیر سوچی۔ گر کس کے مقابلے میں ان افراد کے مقابلے میں جو جسمانی قوت یا اپنے گروہ کی طاقت کے زور سے دوسروں کے زر، زمین، زن پر دست درازی کرتے تھے۔ اسی کو اگر بالکل زمانہ حال کی زبان میں بیان کیا جائے تو ان چار آزادیوں کو برقرار رکھنے کے لئے یعنی تقریر کی آزادی عقیدے کی آزادی، خوف سے آزادی، احتیاج سے آزادی، منشور اقوام متحدہ میں یہ چار آزادیاں انسانی حقوق میں بنیادی اصول کی گئی ہیں، دور جاہلیت کے انسان نے عقیدے اور تقریر کی آزادی کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً اس وقت ان آزادیوں کے لئے یا کوئی خطرہ نہیں تھا، یا ان کی نظر میں ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ منورین عہدِ حاضر ناموس کی حفاظت کا ذکر نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

اس بیسویں صدی میں انجمن اقوام کی طرف سے یہ اعلان کہ وہ خوف سے اور احتیاج سے لوگوں کو آزاد کرے گی اور تقریر اور عقیدے کی آزادی دلائے گی اس کی دلیل ہے کہ اب تک عدل قایم نہیں ہو سکا ہے، اور قانون کی ڈھیروں کتابیں جن میں وہ تمام ضوابط درج ہیں جو زمانہ عروج روما الکبرے سے لیکر اس وقت تک وضع ہوئے ہیں انسانی کوشش کی ناکامی کی بڑی وزنی دلیل ہیں مگر تمام دنیا کے عاقل انسان ایسی نیک سعی میں کیوں ناکام ہوئے؟ یہ قابل غور ہے۔ کسی کو حیرت ہوگی، مجھے ذرا بھی نہیں جہاں ذات کا معاملہ ہو انسان اپنے ذاتی مفاد کے خلاف اور جہاں طبقے، گروہ یا قوم کا معاملہ ہو اپنے طبقے اور قوم کے مقابلے میں عادل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اسے کسی یقینی پاداش کا خوف نہ ہو۔ کہا جائے گا کہ قانون میں ناانصافی کی سزائیں ہیں۔ بیشک ہیں۔ لیکن روزانہ مشاہدہ ہوتا ہے کہ جس قانون سے لوگ سزا پاتے ہیں اسی سے بری بھی ہو جاتے ہیں۔ قانون کا مقصد بہر حال عدل ہونا چاہیئے تھا۔ اب یہ ہے کہ قانون کے الفاظ سے اس کا جو منشا ثابت ہو جائے وہ پورا کر دیا جائے وکیل اصل قاتل کو پھانسی کے پھندے سے بچا کر لاتا ہے۔ وکیل بھی نازاں ہوتا ہے اور شکرانے کا مطالبہ کرتا ہے اور قاتل بھی خوش ہوتا ہے کہ جان بچ گئی۔ عدالت کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا کیا۔ ایک ظالم کی جان بچتی ہے مگر انسانیت ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں یہ حالت ہے کہ قانون اور بداعمالوں کے درمیان مقابلہ ہے بداعمالیوں پر انہیں اصرار ہے مگر وہ قانون کی گرفت سے بچ کر نکل جائیں ان کی تمام ذہانتیں اسی پر صرف ہوتی ہیں۔ ہزاروں برس کی کوشش میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین نہ لوگوں کے دلوں میں بداعمالی سے تنفر پیدا کر سکے اور نہ ان سے جرایم کم ہوئے۔

اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ عام طور پر جو قوانین بنتے ہیں خود ان کے مرکبین اور واضعین کی نیتوں میں قصور و فتور ہوتا ہے۔ وہ کسی فرد یا گروہ کے نفع کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ دوسرے ان کے نفاذ میں بددیانتی کی جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ واضعانِ قانون،

ارکانِ حکومت، اور عمال کی زندگیاں خود پاک نہیں ہوتیں۔ جن برائیوں کو رفع کرنے کے لئے وہ قوانین بناتے ہیں اور جن کے خلاف وہ آئین نافذ کرتے ہیں انہی میں اکثر وہ خود بھی مبتلا ہوتے ہیں اسی وجہ سے قوانین میں رخنے ہوتے ہیں اور ان کا نفاذ بے محل ہوتا ہے۔ اس سزا کا خوف ہونا چاہیئے جس سے بچنے کی کوئی سبیل نہ ہو۔

مغرب حکومتوں کی ہیئت کی ایجاد میں بڑا ماہر ہے مگر ان کے مقاصد کی تکمیل اس سے کبھی نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ قانون اور اس کے الفاظ کا قایل رہا۔ یہ حقیقت اسے کبھی نظر نہیں آئی کہ جب تک واضعان قانون اور عمال حکومت پاک کردار نہ ہوں اس وقت تک نہ صحیح قانون بن سکتا ہے اور نہ ان کا نفاذ صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ جو جرائم پیشہ لوگ دن اور رات قانون کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں اس کا سبب صرف یہی ہے کہ ان کے ہم پیشہ ایوان ہائے پارلیمنٹ میں بھی ہوتے ہیں اور عدالتوں کی کرسیوں پر بھی، خود اس اقوام متحدہ کی یہی حالت ہے کہ جن بین الاقوامی جرائم کو روکنے کے لئے وہ بنی ہے اس کا ہر رکن چار آزادیوں کے اعلان کے ساتھ ساتھ اپنے لئے تمام جرائم کے ارتکاب کی آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اس تمام بحث سے یہ صاف ثابت ہو رہا ہے کہ بانیٔ فساد افراد ہوتے ہیں افراد کی بدی کو روکنے کے لئے لوگوں نے حکومت کی صورت میں اپنی اجتماعی قوتوں کو یکجا کیا جماعت میں عیب دار افراد کی کثرت سے نظام حکومت ہر جگہ ایسا گندہ ہو گیا کہ بجائے برائیوں کو روکنے کے وہ برائیوں کو بڑھانے میں معاون ہے۔ اچھے افراد مجتمع ہو کر اچھے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں، اور اگر بُرے ہوں تو ان کا اجتماع برائی کا اجتماع ہوتا ہے۔ اچھے معاشرے سے اچھی حکومت پیدا ہوتی ہے اور بُرے معاشرے سے بُری، اس وقت کی حالت یہ ہے کہ افراد کی اکثریت عیب دار ہے، معاشرے بُری اکثریت پر مشتمل ہیں، انہی بُرے معاشروں سے حکومتوں کے لئے وزراء، عمال اور اہلکار نکل کر آتے ہیں اور یہ سب بُرائی کو بڑھانے میں باہم تعاون کرتے ہیں، اصلاح کیوں کر ہو؟ سوال یہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ افراد کی اصلاح سے۔!

دُنیا کی تاریخ میں بارہا یہ صورتِ حال واقع ہوئی اور نتیجے میں بارہا بڑی بڑی تباہیاں واقع ہوئیں، چیخ، سخت و تند ہوا، سیلاب زلزلے اور سنگ باری کی صورت میں۔ اب ان کی صورتیں تبدیل ہو گئی ہیں۔ بڑی بڑی عالم گیر جنگیں ہوتی ہیں، زہریلی گیسیں چھوڑی جاتی ہیں، بم گرتے ہیں، ایٹم بم پھینکے جاتے ہیں اور سب سے بدتر یہ ہے کہ انسان کی فکر و ذہانت بنی نوع انسان کو تباہ کرنے میں مصروف کر دی گئی ہے یہ کام صاحبِ طاقت انسانوں کی نظروں میں مُزیّن کر دیا گیا ہے۔ عذاب آتے ہیں مگر بنی نوع انسان کی اصلاح کیلئے نبی اور پیغمبر کوئی نہیں آتا۔ کوئی نہیں آئے گا۔ وہ آخری آ چکا جس کے ذریعہ دین اور ہدایت کی تکمیل کر دی گئی۔

وہ کامل دین بھی موجود ہے، وہ ہدایت بھی موجود ہے، اور وہ قوم بھی موجود ہے جس کے ہاتھوں اور سینوں میں یہ ہدایت نامہ ہے۔ پھر بھی دنیا خراب ہے اور خود وہی خراب ہیں جن کی تحویل میں یہ دین اور یہ ہدایت ہے۔ مغرب نے اپنی مادی ترقی کے دور میں مسلمانوں کو مغلوب کیا اور ان کے افکار و تصورات کو تبدیل کر دیا۔ مسلمان ہونے کے دعویدار ہونے کے باوجود ہر ملک میں اب وہ مسلمان طبقہ جو صاحب اقتدار ہے معاملات کو مغرب کے دماغ سے سوچتا ہے اور مغربی تصورات کے مطابق اسے حل کرتا ہے۔ وہ دین اور اس کی ہدایت سے ناواقف ہی کب ہے جو اس سے کام لے، وہ تو اب اس کے درپے ہے کہ مغربی افکار و تصورات کے مطابق اسلام میں ترمیم کرائے۔

مسلمانوں کا یہ طبقہ نہ اسلام کے ساتھ مخلص ہے اور نہ مغرب کے۔ اسلام کی اسے یہ بات ناگوار ہے کہ وہ ہر معاملہ میں دخیل ہے ہر معاملہ کے متعلق ضابطہ پیش کرتا ہے، ہر حالت میں خدا کا خوف دلاتا ہے اور عاقبت سے ڈراتا ہے۔ نہ شراب کی اجازت دیتا ہے، نہ ناچنے کی، نہ نامحرم عورتوں کے ساتھ اختلاط کی، نہ عورتوں کو بے حیائی کی، نہ حق اللہ اور حقوق العباد سے بے پروائی کی، نہ برج کھیلنے کی، نہ ریس کھیلنے کی، نہ سیاست میں حیلہ فریب کی، نہ تکبر و تمرد کی، نہ ذاتی خدم و حشم پر اسراف کی، نہ نماز اور روزے کے ترک کی، اور مغربیت کی وہ

ان چیزوں سے بیزار ہے جن میں تکلیف ہوتی ہے اور جو انگریزوں کی خصوصیت ہیں جیسے وقت کی پابندی، فرائض پر مستعدی، قومی اور ملکی مقاصد کے ساتھ اخلاص، پریس اور پلیٹ فارم کی بے باکانہ تنقید کا احترام، سیاست میں اور الیکشنوں میں عمال اور اہلکاران حکومت کی غیر جانبداری، عمال حکومت کا یہ سمجھنا کہ وہ عوام کے خادم ہیں اور انکسار کے ساتھ ان کی خدمت کرنا۔ یہ طبقہ اپنے لئے اجازت نامہ عام (لیسنس) چاہتا ہے شرق اور مغرب کے عیب اختیار کرنے کے لئے۔ سیاست میں یہ شرقی سلاطین کا جانشین بننا چاہتا ہے اور معاشرتی زندگی میں اُسے یورپ کی رنگ رلیاں چاہئیں۔

اصلاح کا راستہ

اصلاح کا راستہ وہی ہے جو ہمیشہ سے رہا ہے یعنی پیغمبرانہ بے نفسی کے ساتھ رائے عامہ کی تربیت اور اہل اخلاص کی تنظیم۔ یہ راستہ لوگوں کو طویل معلوم ہوتا ہے اور سخت! بیشک طویل بھی ہے اور سخت بھی مگر ہے یہی ایک راستہ! میں ساری دنیا کے متعلق کچھ نہیں کہتا، مسلمانوں کی اصلاح کی تدبیر ہے اور بالخصوص ایسے ملک میں جیسا کہ پاکستان جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے اور آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے کہ لوگوں میں حشر و نشر اور سزا و جزا کے عقیدے کو ایسا راسخ کیا جائے اور اس کی طرف انھیں ایسا متوجہ کیا جائے کہ وہ ان کے فکر و خیال پر مستولی ہو جائے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بغیر اس عقیدے کے کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، اور یہ ایک حقیقت ہے، واہمہ نہیں۔ لیکن مغربی تعلیم کے اثر سے یا جہل سے انہیں اس کی طرف سے غفلت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ ان کی غفلت دور ہو یا یہ اعلان کریں کہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ اس غفلت ہی کی وجہ سے ہے کہ لوگ جرائم کرتے ہیں اور قانون کی گرفت سے بچ کر مطمئن ہو جاتے ہیں، اور تمام عمر جرائم کئے چلے جاتے ہیں۔

"مسٹر ٹرومین نے ۲۹ ستمبر ۱۹۵۱ء کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی قوم کے گورنروں سے یہ اپیل کی ہے کہ منظم جرائم کو روکنے کیلئے پہلے سے دُگنی جد و جہد کے ساتھ رہنمائی کریں ... ... اس کے بعد انہوں نے کہا کہ سینیٹ کی جرائم کمیٹی کے انکشافات سے قوم گھبرا گئی ہے۔"

کون کہہ سکتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی گورنمنٹ، اس کی سول سروس، اور پولیس جرائم کے انسداد کے جدید ترین طریقوں سے واقف نہیں ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ امریکہ کے واضعان قانون ایسے قوانین بنانے سے قاصر ہیں جو انسانی فکر وضع کر سکتی ہے، مگر امریکہ میں اتنے جرائم ہو رہے ہیں اور منظم طریقے پر کہ سینیٹ کو ان کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنی پڑی، اس کمیٹی کی رپورٹ سے امریکی قوم کو دحشت ہو گئی، اور صدر جمہوریہ امریکہ کو گورنروں سے اپیل کرنی پڑی کہ انسداد جرائم میں دُگنی سرگرمی کے ساتھ محکمہ انسداد جرائم کی رہنمائی کریں اور وفاقی حکومت کی تائید کا انھیں یقین دلایا۔ امریکہ میں بڑے ہیبت ناک پیمانے پر جرائم ہو رہے ہیں یہ اس کی بیّن دلیل ہے اور اس کا کامل ثبوت کہ انسان کے وضع کئے ہوئے قوانین بنی نوع انسان کو گناہوں سے پاک نہیں کر سکتے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیوی سزاؤں کے خوف سے آج تک کوئی قوم خوش اخلاق اور نیک اطوار نہیں بنی۔ یہ صرف اسی طرح ہوا ہے اور ہو گا کہ جرائم کے یہ اثرات لوگوں کے دل نشین ہوں کہ ان سے روح تاریک ہو جاتی ہے، اس دنیا کے معاملات بگڑ جاتے ہیں، اور عاقبت میں جہنم کی تخلیق ہوتی ہے۔ جو کثیف طینت لوگ عاقبت کے خوف سے تقویٰ اختیار نہ کریں ان کے لئے عبرت انگیز شرعی سزائیں ہیں۔ جب کبھی اور جہاں کہیں تعزیرات اسلامیہ کا نفاذ کیا گیا ان کے اچھے اثرات ظاہر ہوئے۔ اسلام کا قرنِ اوّل معاشرے کی تطہیر میں مثالی ہے۔ اس وقت نجد و حجاز میں شرعی تعزیرات جاری ہیں۔ ہر چند کہ یہ ملک دوسرے شعبوں میں بہت پیچھے ہے لیکن جرائم کے انسداد میں کامیاب ہے۔ بدوؤں کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارتگری کے واقعات قصہ ماضی ہو چکے ہیں۔ گزشتہ پچیس ۲۵ تیس سال کے اندر چند ہی آدمیوں کے ہاتھ کاٹے گئے ہوں گے، حجاز اور نجد میں چوری بالکل بند ہے۔

لوگوں کو جرائم سے اس وقت تک ہرگز نہیں روکا جا سکتا جب تک کہ یہ ان کے ذہن نشین نہ کر دیا جائے کہ پاک زندگی خود انہی کے لئے مفید ہے اور یہ ذہن نشین نہیں ہو سکتا جب تک کہ دینِ حق کی تعلیمات ان کے سامنے نہ رکھی جائیں۔ گناہ میں بڑی لذت ہے۔ مفت میں کسی کا مال چھین لیا، چرا لیا یا مجبور کر کے اس سے وصول کر لیا، لوگوں کی مرضی اور ان کے افعال و اعمال پر بجبر قدرت اور قابو حاصل کر لیا، دوسروں کے وسائل پر بزور قابض ہو گئے، جنسی خواہشات بلا روک ٹوک پوری کیں، اس سے زیادہ لطف اور کس بات میں ہوگا! اگر یہ دنیا کی زندگی اسی موت پر ختم ہونے والی ہو جس کا بلا استثنیٰ ہر شخص کو یقین ہے تو یقیناً اس سے زیادہ اور کون بیوقوف ہوگا کہ نفسانی خواہشات پوری کرنے اور اولاد کے لئے دولت جمع کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو اور نہ کرے۔ رہا یہ کہ جرائم سے معاشرے میں اختلال واقع ہوتا ہے اور اس کرۂ ارض کی زندگی تباہ ہو جائے گی، یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے، لیکن جب تک کوئی شخص اپنی ذات کے لئے عیش، ثروت اور جاہ حاصل کرنے پر قادر ہوا سے معاشرے کی فلاح کے لئے ہر چیز کے ترک پر کوئی آمادہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر اس سے بڑے انعام کا اسے کامل یقین دلا دیا جائے اور عدمِ ترک کی صورت میں سزا کا بھی تو یہ ہو سکتا ہے۔ جب اللہ کے خوف اور اللہ کی خوشنودی کے لئے برائیاں ترک کرنے کی لوگوں کو عادت ہو جاتی ہے تو دنیوی تعزیرات کی ضرورت بہت کم رہ جاتی ہے اور معاشرتی زندگی میں اور معاملاتِ عامہ میں حکومت کی مداخلت کا کوئی محل نہیں رہتا۔ حقیقت میں وہ نعمت جسے آزادی کہتے ہیں اسی حالت کا نام ہے جو اس دور میں کسی کو حاصل نہیں ہے، یعنی یہ کہ کسی کو خوف نہ رہے کہ اس کے جائز حقوق پر کوئی دست درازی کرے گا اور جو اس کا حق ہو وہ اسے نہ ملے گا۔ اگر معاشرے کا ہر فرد اپنے دل کے تقاضے سے اس آزادی کا محافظ بن جائے تو حکومتوں کا موجودہ وسیع نظام اس قدر مختصر ہو جائے اور اس کے اخراجات اتنے گھٹ جائیں کہ ان کا بار کسی کو محسوس نہ ہو۔ اسلام کا منشا یہی ہے۔

معاشرے کی تطہیر اور اس کے تزکیہ کی کوشش میں پہلا قدم حشر و نشر اور سزا و جزا کے عقیدے کی تبلیغ ہو۔ اس کے ساتھ ہی ان جرائم کی فہرست مرتب ہونی چاہیئے جو اس زمانے میں بہت عام ہیں۔ اہمیت اور نتائج کی برائی کے اعتبار سے ان جرائم کو مختلف مجموعوں میں تقسیم کیا جائے اور اسی ترتیب سے ان کے خلاف جہاد ہو، یعنی جب (الف) گروپ کے جرائم ترک ہو جائیں تو (ب) گروپ لیا جائے اور پھر (ج) گروپ۔ مصلحین خود تمام گناہوں سے تائب ہو کر یہ عہد کریں کہ تشدد ہرگز اختیار نہ کریں گے، نہ عمل میں، نہ قول میں، نہ خیال میں۔ وہ حکومت سے بھی مداخلت کی اپیل نہ کریں گے وہ سزائیں جو باغیانِ شریعت کو دی جائیں، صرف معاشرتی ہوں، یعنی معاشرتی مقاطعہ جس کی تفصیلات غور و خوض کے بعد طے کی جا سکتی ہیں۔ اربابِ حکومت کو بھی اس معاملے میں بالکل اسی نظر سے دیکھا جائے جس نظر سے کہ عام لوگوں کو۔ یعنی وہ افراد ہیں اور معاشرے کے اجزائے ترکیبی ہیں اور ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جائے جو عام لوگوں کے ساتھ ہو۔

اصلاح کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اصلاح کرے[۵۱]۔ یہ طریقہ بڑا موثر ہے اور اس کے نتائج بہت جلد ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ حکومت کے پاس اختیار ہوتا ہے، نظام ہوتا ہے اور وہ سزا و جزا کی مجاز ہوتی ہے۔ لیکن اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ عمائدِ حکومت صاحبِ تقویٰ ہوں[۵۲]۔ لازماً وہ عمال اور اہلکاروں کا انتخاب بھی اسی نظر سے کریں گے۔ مگر جب بلوۂ عام ہو، تقویٰ

---

[۵۱] اور پاکستان میں اللہ کے فضل سے اس کے مواقع موجود ہیں، "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی بنیاد پر اصلاحِ حال کی جائے تو انفرادی و اجتماعی طور پر بہت کچھ سدھار اور بناؤ بلکہ تلافیٔ مافات کا امکان ہے۔ (مدیر)

[۵۲] مگر جو کوئی یہ بات زبان سے نکالتا ہے اس کو لوگ طرح طرح سے مطعون کرتے ہیں کہ یہ "ملاؤں" کی حکومت چاہتا ہے، اور "تقویٰ" کو معیارِ صلاحیت ٹھہرا کر خود اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ (مدیر)

اور صلاحیت مفقود ہو، اور خود عوام ہی اپنے حاکموں کا انتخاب تقویٰ کی بنا پر نہ کرتے ہوں تو ایسی حکومت کیسے پیدا ہو جائیگی جو ان جرائم کے استیصال کو اتنی اہمیت دے جتنا کہ قرآن میں اس کا تقاضہ ہے۔ جو اہلیت عوام کی ہوگی وہی اہل حکومت کی ہوگی۔ اس کے ارکان بھی عام لوگوں کی طرح اصلاح کے محتاج ہوں گے۔ اس دور کی حکومتیں ایسی ہی ہیں۔ لہذا اس وقت یہ طریقہ کارآمد نہیں ہو سکتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معاشرے میں اہلِ تقویٰ کی جو ایک چھوٹی سی اقلیت رہ گئی ہو وہ اس مہم کو اپنے ذمے لے اور پیغمبروں کے طریقے پر اس کا انصرام کرے۔ اپنی مثال، تبلیغ، اور اجتماعی طاقت یہ تین اس جہاد میں بہت موثر اسلحہ ہیں۔ ان سے آراستہ ہو کر اور جاہ و اقتدار کے خیال کو بالکل ترک کر کے اللہ کے بھروسے پر کھڑی ہو جائے انشاء اللہ مسلمانوں کی انفرادی اصلاح سے ابتدا، اور اجتماعی اصلاح پر اس کارِ خیر کی تکمیل ہوگی۔ شاید سیاسی مزاج کے لوگ گھبرا کر کہیں "اور حکومت کا کیا ہوگا؟" میرا جواب یہ ہے کہ جیسے بدوں اصلاحِ عام میں اچھی حکومت ناممکن ہے، اصلاحِ عام میں بُری حکومت کا وجود ناممکن ہے۔

پھر لوگ شاید یہ کہیں کہ بین الاقوامی مظالم اور زیادتیوں کے استیصال کی کیا تدبیر ہے۔ بیشک یہ بھی سوچنے کی بات ہے۔ بین الاقوامی شرارتیں قومی اور انفرادی زندگیوں تک اثر انداز ہیں۔ بین الاقوامی معاملات اور مجالس میں ہر قوم کی حیثیت ایک فرد ہی کی سی ہے اور ان میں اس کے میلانات بالکل ایک آدمی کے سے ہوتے ہیں۔ لہذا یہاں بھی وہی تدبیر کارگر ہے جو ایک معاشرے اور ایک قوم کی اصلاح کے لئے ہو سکتی ہے، اگر مسلمان قوم کی اصلاح ہو جائے جو بہت سے ملکوں میں آباد ہے تو یہ معاً، دوسری اقوام کے ساتھ برائی میں مجبورانہ تعاون کی ضرورت سے آزاد ہو جائے، دنیا میں تیسری طاقت (فورس) کی حیثیت سے عمل کرنے کے لئے اس کے ہاتھ اور پیر آزاد ہو جائیں اور بالآخر وہ دوسری اقوام کو اپنی راہ پر لانے میں کامیاب ہو جائے۔

لے بہر حال جب اصلاح کے لئے کوئی جماعت کھڑی ہوگی تو عوام اور خواص غریب امیر اور خاک نشین اور صاحبانِ جاہ و اقتدار سبھی اس اصلاح کے مخاطب اور مورد ہوں گے۔ عوام کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے، خواص اور اکابر گنتی میں کم ہوتے ہیں ان کی اصلاح زیادہ آسان ہے اور ان کی اصلاح اور تبدیلی کے یہ معنی ہیں کہ اقتدار اور ہیئت حاکمہ صالح ہو گئی، اس صورت میں عوام کے سدھارنے اور سوسائٹی کی اخلاقی درستی کا کام بہت جلد ہو سکتا ہے، ایک ہزار واعظوں کی تقریروں سے عوام اتنے متاثر نہیں ہو سکتے جتنا کہ ریڈیو کے دو دن کے اخلاقی اور اصلاحی پروگرام سے پیدا ہو سکتا ہے۔ (مدیر)

محمد صدیق صاحب ٹونکی

سیفؔ ٹونکی مرحوم!

ٹونک دیکھنے میں تو چھوٹی سی بستی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی خاک کو مردم خیز بنایا ہے اور بقول ماہر القادری۔۔۔ "شاعری تو ٹونک کی زمین سے سبزے کی طرح اُگتی ہے ۔۔۔" تنہا حضرت مولانا برکات احمد علیہ الرحمۃ کی ذاتِ گرامی ٹونک کے فخر و ناز کے لئے بہت کافی ہے، اس ہمہ گیر جامعیت کا دوسرا عالم پھر دیکھنے میں نہیں آیا۔

مولانا سیفؔ مرحوم بھی اسی مردم خیز خطہ (ٹونک) سے اُٹھے اور آخرکار اسی خاک کا پیوند ہو گئے، کچھ نے اُنہیں جانا اور بہت سوں نے نہ جانا ــــــ اور لوگ اُن کو جانتے کیسے، پروپیگنڈے کا فن مرحوم کو آتا نہ تھا، ساری عمر خاموشی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے، اس زمانہ میں شہرت اُسے ملتی ہے جس کو شہور ہونے کے ذرائع میسر ہوں، جس کو یہ ذرائع میسر نہ ہوں اُس کو شہرت کی جگہ گمنامی ملتی ہے۔ ہائے اکتنے گہر پارے تابناک گردِ گمنامی میں دب کر رہ گئے!

سیفؔ ٹونکی ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، اُن کے والد حافظ محمد عالم گیر خاں کیفؔ مشہور نعت گو شاعر تھے، ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے نامور باپ سے پائی، پھر دار العلوم خلیلیہ ٹونک میں داخل ہوئے اور حضرت مولانا حکیم برکات احمد صاحب جیسے فاضل اُستاد کی رہنمائی میں درسِ نظامی کی تکمیل کی عربی کے ساتھ ساتھ فارسی کتابوں کا مطالعہ بھی جاری رہا، یہاں تک کر فراغِ تعلیم کے بعد دار العلوم خلیلیہ کے شعبہ فارسی میں سیفؔ مرحوم مدرس ہو گئے اور پھر ۱۹۲۹ء میں دربار ہائی اسکول ٹونک میں ہیڈ مولوی کی جگہ پر تقرر ہوا۔

سیفؔ شاعرانہ طبیعت لیکر پیدا ہوئے تھے، شاعر باپ کی تربیت اور فیضِ صحبت نے اس جوہر کو اور چمکا دیا، آغازِ شباب سے لیکر آخر وقت تک مشغلۂ شعر و سخن جاری رہا اور ہزاروں اشعار اپنی یادگار چھوڑے، اُن کے کلام کے چند مجموعے چھپ کر منظرِ عام پر آچکے ہیں، طبیعت ہمہ گیر پائی تھی، شاعری کی کسی صنف میں بند نہ تھے، غزل، نظم، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثلث، مخمس، مسدس غرضکہ ہر صنف اور ہر رنگ میں اُن کا کلام موجود ہے۔

سیفؔ کے کلام میں سادگی اور متانت کے ساتھ پختگی بھی پائی جاتی ہے بجے پور کا طرحی آل انڈیا مشاعرہ ایک یادگار مشاعرہ تھا، [۵] طرح تھی:-

کلی کی آنکھ کھل جائے چمن بیدار ہو جائے

اس طرح میں حضرت سیفؔ کی غزل کا یہ شعر:-

متاعِ دل کی قیمت کون دے سکتا ہے دُنیا میں
یہ وہ سودا نہیں ہے جو سر بازار ہو جائے

---

[۵] میں اس مشاعرے میں شریک تھا، اور حضرت سیفؔ مرحوم کے شعر سے دوسروں کی طرح میں بھی لُطف اندوز ہوا (م۔ق)

مشاعرے میں بہت مقبول ہوا، داد وتحسین کے شور سے مشاعرہ کا ہال گونج اُٹھا ——— حضرت جگر مرادآبادی نے اُن کا کلام سن کر فرمایا:- "آپ مولوی ہوکر، ایسے شعر کیوں کر کہہ لیتے ہیں"

حضرت سیفؔ کے کلام کی خوبیوں کا تھوڑا بہت اندازہ اُن کے حسب ذیل شعروں سے ہوسکتا ہے:-

مری نظر کو تو خورشید کی بھی تاب نہیں ۔۔۔ تجھے تو دیکھنے والا ہی دیکھ سکتا ہے

ہوش آئے گا تو درد تمنا لئے ہوئے ۔۔۔ جتنا ہو کم ہے بیخودئی شوق کا کرم

اُس دل کو کامیاب تمنا نہ کیجئے ۔۔۔ جس دل کی آرزو ہو کوئی آپ کے سوا

اپنے لیل و نہار پیدا کر ۔۔۔ دوسروں کے نہ دیکھ لیل و نہار

ناشادماں نہیں ہوں اگر شادماں نہیں ۔۔۔ وہ ظلم ہی سہی مگر اک سلسلہ تو ہے

قفس کی شکل میں دیکھیں گے رنگِ گلستاں کب تک ۔۔۔ خزاں آثار ہوگی یوں بہارِ گلستاں کب تک

ورنہ نغمہ بن کے رہ جاتی فغانِ عندلیب ۔۔۔ شاعرِ فطرت ہی کچھ سمجھا زبانِ عندلیب

عشق کی دنیا میں یہ ترتیب بھی کیا خوب ہے

دردِ انساں، سوزِ پروانہ، فغانِ عندلیب

پاکباز شاعر

سیفؔ مرحوم شاعر تھے مگر پاکباز، نیک کردار اور خوش اوقات! نیکی اور پاکبازی اُن کی صورت سے نمایاں تھی قناعت اُن کا شیوہ تھا اور خودداری اُن کا مسلک! اٹھارہ سال کی عمر سے تہجد اور اشراق کے پابند تھے اور آخر دم تک پابند رہے، تقریباً چالیس سال سے کوئی نماز جماعت کے بغیر نہیں پڑھی، محلہ کی مسجد میں جماعت ہوجاتی تو شہر کی دوسری مسجدوں میں جا کر جماعت سے نماز پڑھتے، نماز میں خضوع وخشوع کا یہ عالم ہوتا جیسے سچ مُچ بارگاہِ خداوندی میں کھڑے ہیں اور جلالِ الٰہی آنکھوں کے سامنے ہے ——— ۲۹ اکتوبر (۱۹۵۱ء) کو نماز عشا کے وقت بہت روئے کہ آج تین نمازیں قضا ہوگئیں، اور اس عالم میں کہ اللہ کے خوف سے دل دھڑک رہا تھا، دل کی رفتار رُک گئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے کہ شاعروں میں اس کردار کے آدمی افسوس ہے کہ نظر نہیں آتے (نور اللہ مرقدہٗ وبرد اللہ مضجعہٗ)

ترانۂ شیکسپیر!

(شیکسپیر کی ایک نظم اردو لباس میں)

Hark, hark, the lark at heavens' gates sings
And Phoebus gins' arise
to water his steeds on those chaliced flowers
that lies
And winking merry buds that his
to ope their golden eyes
And every thing that pretty is
my lady sweet arise, arise, arise
(Shakespeare)

سُنا رہی ہے بہشت کے در پہ ایک کوئل نیا ترانہ
وہ صبح کا دیوتا بھی اٹھا، وہ اُس کا رتھ بھی ہوا روانہ
وہ اُس کا انداز خسروانہ، وہ اُس کی شان قلندرانہ
بھری ہے سورج مکھی کی گنگا میں جگمگاتی مئے معنانہ
چھپا ہے گیندے کی انکھڑیوں میں حسین کرنوں کا کارخانہ
ہر ایک پتی بنی ہوئی ہے بجائے خود اک شرابِ خانہ
پلا رہا ہے وہ اپنے گھوڑوں کو بڑھ کے یہ آبِ جاودانہ
وہ صبح انگڑائی لے رہی ہے، وہ زندگی کا پیام آیا
اے میرے محبوب اُٹھ کہ اب آفتاب آتش بجام آیا

(مظفر حسین شمیم)

کہکشاں

ابر احسنی گنوری

نظر پہ ہے کہ تقاضائے دید پیہم ہے ۔۔۔ سمجھ رہا ہوں کہ طاقت نگاہ میں کم ہے
ترا کمال تو اے چارہ گر مسلّم ہے ۔۔۔ مگر وہ زخم کہ جو بے نیاز مرہم ہے؟
تباہ حالیٔ گلشن کا اب یہ عالم ہے ۔۔۔ جدھر نگاہ اٹھاتا ہوں شور ماتم ہے
گزر ہی جائے گی اب زندگی باطمینان ۔۔۔ جو دل میں غم ہے تمہارا تو دل کو کیا غم ہے
اب ان کے ذکر سے بھی بھاگتے ہیں دیوانے ۔۔۔ جنونِ عشق ارے الامان یہ عالم ہے
وہ ظرفِ عشق کا یوں امتحان لیتے ہوں ۔۔۔ یہ اضطراب بھی تسکین پرست کیا کم ہے
مرا ہی قصۂ پستی مرا ہی ذکرِ عروج ۔۔۔ نگاہ میں مری افسانۂ دو عالم ہے
پڑی تھی رسم یہ دنیا میں کب خدا جانے ۔۔۔ ہنوز جلوہ و حیرت میں ربط باہم ہے
حد علاج سے باہر نکل چکا بیمار ۔۔۔ اب آپ جائیں مزاجِ حیات برہم ہے

کریں گے شرح کبھی اس کی ان کے دیوانے
یہ کائنات ابھی داستانِ مبہم ہے

نہال الدین خیال

سحر ہوتے ہی آ بیٹھے جو دروازے پہ زنداں کے ۔۔۔ قفس والوں نے شاید خواب دیکھے ہیں گلستاں کے
محبت کا تعلق صرف دل سے ہے مگر پھر بھی ۔۔۔ شکستِ دل سے پہلے ہوش اڑ جاتے ہیں انساں کے
وہ آتے ہیں تو موتی بھر دئے ہیں اُن کے دامن میں ۔۔۔ بہت نازک حقیقت ہیں سلیقے چشمِ گریاں کے

رہیں دب کر چمن میں باغباں سے ۔۔۔ قفس اچھا ہے ایسے آشیاں سے

ہم جہاں ہوں گے بہاریں بھی وہاں آئیں گی ۔۔۔ نہ گلستاں ہے جہاں میں نہ بیاباں کوئی

ارمان جھانسوی

وارفتگیٔ شوق چھپاتا ہوں مگر دوست ۔۔۔ اظہار کئے دیتی ہے بے ربطیٔ گفتار

ساقی ترے ساغر کا طلبگار نہیں ہوں ۔۔۔ میخانے میں لے آتے ہیں یہ ملتفت انداز

تاباں بدایونی

گردشِ چشم ہے پیمانے میں ۔۔۔ تم گئے ہو کبھی میخانے میں

"تم"؟

نعیم صدیقی

تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا؟
تم؟ مسل سکو گی تم؟ زیرِ پا شرار کیا؟
تم؟ لُٹا سکو گی تم؟ ذہن کا قرار کیا؟
ڈٹ کے روند جاؤ گی غم کے خارزار کیا؟
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا؟

تم پہ اعتبار کیا! کب کہاں لڑھک پڑو!
کس گھڑی پگھل بہو، کس طرف ڈھلک پڑو!
خود بھی جانتی نہیں کب معاً بہک پڑو!
کفر کا اصول کیا! کفر میں وقار کیا!
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا!

تم کو اور ساتھ لوں؟ جی نہیں، اجی نہیں!
آپ اور مستِ عزم! جی نہیں، کبھی نہیں!
زندگی کی کشمکش کھیل اور ہنسی نہیں!
آزما نہیں چکیں خود کو بار بار کیا!
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا!

وقت کی ہوائے نو یوں تمہیں اُڑائے گی!
تم کہاں گئیں کدھر، کچھ خبر نہ آئے گی!
کل یہ ساری عاشقی بھول بھال جائے گی
آندھیوں کے سامنے جم سکے غبار کیا!
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا!

تم کو مست کر سکے اک ادا ظریف سی
تم کو جذب کر سکے اک نگہ لطیف سی
تم کو مول لے سکے اک خوشی خفیف سی
رُوح کی نفیر کیا! فرض کی پکار کیا!
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا!

آج سے یہ جان لو، میری راہ اور ہے،
میرے عیش اور ہیں! میری چاہ اور ہے
میرا قہقہہ الگ! میری "آہ" اور ہے
وہ مذاق مختلف ہونگے سازگار کیا؟
تم تو بے خدا ہوئیں! تم پہ اعتبار کیا؟

ماہر القادری

میں نے کیا دیکھا؟

افسانہ اور حقیقت کا فرق نازک اور باریک نہیں سادہ اور واضح ہے، افسانہ خواہ کتنے ہی دل نشین انداز میں کیوں نہ پیش کیا جائے، وہ قصہ و حکایت ہی ہے، اندازِ بیان کی تاثیر اور اظہار (Expression) کی دل نشینی اُسے "حقیقت" نہیں بنا سکتی، اور حقیقت چاہے خاموش ہی رہے، زبان سے نہ بولے، اُس کا ذکر بھی نہ کیا جائے مگر وہ پھر بھی "حقیقت" ہے، اُس کا وجود کسی کی تخییل کا رہینِ منت نہیں ہوتا ——— زندگی کا کاروبار افسانوں سے نہیں، "حقایق" سے چلتا ہے، یہ بھی جو کچھ کہا گیا ہے افسانہ نگاری اور داستان سرائی نہیں حقیقت نگاری ہے، یہ خواب و خیال کی باتیں نہیں واقعات کی دُنیا کی باتیں ہیں۔

آگے چل کر جو کچھ کہا جائے گا، وہ افسانہ نہیں حقیقت ہے، ایسی حقیقت جسے ہزاروں آنکھوں نے دیکھا ہے، چشمِ آفتاب ہی نہیں نگاہِ مہ و انجم بھی جس کا مشاہدہ کر چکی ہے، طلوع ہونے والی صبحیں اور غروب ہونے والی شامیں جس کی شاہد ہیں ——— اب سے چند دن پہلے کا واقعہ ہے کہ میں دفتر سے جا رہا تھا چوراہہ پر ایک اشتہار نظر سے گزرا جس میں لکھا تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان کا سالانہ اجتماع "لکری گراؤنڈ" میں ہوگا ——— "لکری گراؤنڈ" میں؟ یہ آخر کہاں واقع ہے، جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے اس گراؤنڈ کو ریسرچ کر کے نکالا ہے، کراچی میں ایک دو ہفتہ نہیں پُورے چار سال رہتے ہوئے ہو گئے مگر اس مقام کا نام آج تک کانوں نے نہیں سُنا، آخر اتنی غیر معروف جگہ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں نے جلسہ گاہ کیلئے منتخب کیوں کی؟ پبلک تو آرام باغ اور جہانگیر پارک کو جانتی اور پہچانتی ہے، ہماری قوم جو ہر بات میں سہولتیں اور آسانیاں ڈھونڈتی ہے، "لکری گراؤنڈ" کا پتہ لگا کر، وہاں جانے کی زحمت کا ہے کو گوارا کرنے لگی اور پھر قوم کی دلچسپی کا موضوع مشاعرے، قوالی، دنگل، کھیلوں کے ٹورنامنٹ، مینا بازار، فینسی شو، ڈرامے اور تھیٹر ہیں ——— یہ خلش کئی دن تک دامن گیر رہی، یہاں تک کہ ۱۰ر نومبر کی شام کو میں "لکری گراؤنڈ" میں پہنچا۔

خیال یہ تھا کہ جس طرح ہمارے دوسرے قومی سیاسی اور مذہبی اجتماعات ہوا کرتے ہیں، جماعتِ اسلامی کا سالانہ جلسہ بھی اُسی انداز کا ہوگا مگر "لکری گراؤنڈ" میں پہونچکر آنکھوں نے وہ دیکھا جو اس سے قبل کہیں دیکھا ہی نہ تھا، ایک ایک چیز کو دیکھ کر آنکھوں نے ٹھنڈک اور دل نے مسرّت ہی نہیں روشنی بھی محسوس کی ——— وہ بُک اسٹالوں، شامیانوں اور قناتوں کا قرینہ، اس قدر وسیع اور عریض و طویل پنڈال میں فرش کا انتظام، اطلاع و استفسار اور معلومات کیلئے دفتروں کا بندوبست، گفتگو کی سہولت کے لئے ٹیلیفون حاضر، بیماروں کی ضرورت اور امداد کے لئے شفاخانہ موجود، باہر سے آنے والی جماعتوں کی قیام گاہوں پر مقامات کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئیں، اِدھر مہمان آئے اور ذرا سی دیر میں کسی زحمت اور جستجو کے بغیر اُن کی قیام گاہوں پر پہونچا دیئے گئے، لاؤڈ اسپیکر پر تھوڑی تھوڑی دیر سے ضروری ہدایات کا اعلان ہو رہا تھا ——— ان سب سے بڑھ کر کارکنوں کی سرگرمی، خلوص، احساسِ ذمہ داری، مہمانوں کے ساتھ کس قدر تواضع اور فروتنی کے ساتھ پیش آ رہے تھے، کیا مستعدی اور فرض شناسی تھی، کس قدر نظم و ضبط تھا۔

ہم نے عُرسوں اور قومی اجتماعات میں لوگوں کو گانا گاتے اور تاش کھیلتے دیکھا ہے، ناشایستہ ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ، آخر وقت کاٹنے کے لئے کوئی نہ کوئی مشغلہ تو چاہیئے مگر جماعتِ اسلامی کے اجتماع میں ان لغویتوں کی نہ تو گنجایش تھی اور نہ اُس کے ارکان ان

تفریحات تک نہ فرصت نکال سکتے تھے، سب کے سب ایک ہی دُھن میں مبتلا، ایک ہی نشہ سے سرشار، ایک تسبیح کے دانوں کی طرح مربوط اور ایک دیوار کی اینٹوں کی مانند مضبوط اور منظم! اللہ کے دین کی سربلندی، اور نظامِ حق کے قیام کی تمنائیں دل میں لئے ہوئے، سب کے سر میں یہی سودا سمایا ہوا کہ چاہے ہم مٹ جائیں مگر اللہ کا دین پُورے کا پُورا قائم ہو جائے!

سورج افق کی اوٹ سے ذرا ذرا جھانک رہا تھا، شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا، اتنے میں لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا کہ مغرب کی نماز میں چند منٹ باقی رہ گئے ہیں جن کو وضو کرنا ہو وہ وضو کرلیں، خدا کے نیک بندوں نے نماز کے لئے تیاری شروع کردی، پنڈال میں نماز کا انتظام تھا، نمازی صفوں میں ترتیب کے ساتھ بیٹھ گئے، اتنے میں منادی نے اللہ کا نام بلند کیا، اس کی بڑائی کو پکارا...... اور "حی علی الصلوٰۃ" اور "حی علی الفلاح" کا جواب عمل سے دیا جانے لگا، ربِ واحد کے پرستار نماز گاہ میں جوق در جوق آنے لگے، امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نماز پڑھائی، قرأت بہت سادہ تھی مگر لہجہ میں سوز تھا جیسے وہ اللہ کا کلام اور اسی کی نماز اسی کے سامنے کھڑے ہوئے پڑھ رہے ہیں، سلام پھیرتے ہی میں نے کھڑے ہو کر دیکھا تو بہت دور تک نمازیوں کو پایا، صفوں کی تعداد آسانی سے گنی نہیں جا سکتی تھی، ان آنکھوں نے کانگریس[1]، مسلم لیگ اور دوسرے قومی اجتماعات کو بھی دیکھا ہے، تقریر کرنے والوں کی زبانوں پر اسلام کے قصیدے اور حاضرین کی طرف سے "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعروں کا جواب، مگر نماز کے وقت اسلام کے اِن شیدائیوں میں سے بہت بڑی تعداد غائب! جماعتِ اسلامی کے اجتماع میں قول و فعل کی یہ دورنگی نہیں پائی جاتی تھی، دین اور سیاست یہاں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں، وہ لوگ اس جماعت میں بار ہی نہیں پا سکتے جو اپنے عمل سے اسلامی احکام کی کھلی ہوئی نفی کرتے ہوں، چاہے یہ لوگ شہرت کے اعتبار سے "برنارڈ شا" اور فکر و نظر کے لحاظ سے "افلاطون" سے بھی چار قدم آگے کیوں نہ ہوں، جماعتِ اسلامی میں عزت کا مقام اہلِ "تقویٰ" کو دیا جاتا ہے۔

نمازِ مغرب کے بعد حاضرین کی تعداد تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی، پنڈال کے برقی ٹیوب ایک ایک کر کے روشن ہوتے چلے جا رہے تھے، اتنے میں جماعتِ اسلامی شاخ کراچی کے امیر نے اعلان کیا کہ جلسہ شروع ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں، حاضرین اپنی جگہ پر اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائیں!

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اسٹیج پر آچکے تھے، اسٹیج سادگی کا دلکش نمونہ تھا، غیر ضروری اور مسرفانہ آرائش سے پاک، یہاں لیڈروں کی قد آدم تصویروں کی جگہ قرآنِ پاک کی آیتیں لکھی ہوئی تھیں، جلی اور حسین خط میں، دل نشین ترجمہ کے ساتھ! گھڑی کی سوئی ٹھیک چھ پر پہونچی تھی کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کھڑے ہوگئے، سب کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں، سفید اور گھنی ڈاڑھی پر سیاہ ٹوپی کتنی بھلی لگتی تھی، چند سال پہلے مودودی صاحب کی ڈاڑھی میں اکا دکا بال سفید تھا مگر اب گنتی کے بال سیاہ ہوں گے، دردِ ملت شاید غمِ روزگار سے بھی زیادہ شدید ہوتا ہے، مولانا مودودی نے اپنی توانائیوں کی ایک ایک رمق خدمتِ دین میں لگا دی ہے، ہائے! ان کے وہ سفاک ناقد جو ان کی دینی خدمات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

امیر جماعتِ اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اللہ کے نام سے تقریر کا آغاز کیا، سب سے پہلے خان لیاقت علی خاں مرحوم کے دردناک حادثۂ قتل کی پرزور مذمت کی اور ان کی خدمات کو سراہا، پھر ایران اور مصر سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا، اس کے بعد

---

[1] جب مسلمان بھی اس میں شریک تھے اور نہرو رپورٹ ابھی تک شائع نہیں ہوئی تھی۔

کشمیر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ کشمیر کے بارے میں پاکستان چونکہ حق پر ہے اس لئے ہم اُس کی تائید کرتے ہیں کہ "حق" تائید و نصرت ہی کا مستحق ہے ——— تقریر کے آخری حصہ میں حکومتِ پاکستان کے نظم و نسق اور اربابِ حکومت کی روش پر بے باکانہ تنقید کی گئی، اس تنقید کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمارے اربابِ اقتدار ہمیں جس طرف لے جارہے ہیں وہ اسلام کی منزل ہرگز نہیں ہے ——— جو لوگ قوم اور ملک کا درد رکھتے ہوں تو رکھتے ہوں مگر جن کے دل غمِ اسلام سے خالی ہیں اُن کو یہ تنقید شدید اور ناگوار معلوم ہوئی ہوگی اور ہونی چاہیئے، اُن بیچاروں کو کیا خبر کہ کچھ دل ایسے بھی ہیں جو "منکرات" کو دیکھ کر شدید تکلیف محسوس کرتے ہیں، جن کی راتیں اسی غم میں بسر ہوتی ہیں، ایسے حساس، باحمیت اور غیرت مند لوگوں سے جو کوئی قصیدہ خوانی اور منقبت سرائی کی اُمید رکھتا ہے وہ حقیقت میں جہل کے مرض میں مبتلا ہے!

اس تقریر کے بعد طفیل احمد صاحب قیم مرکزی جماعتِ اسلامی پاکستان نے رپورٹ پڑھ کر سُنائی جو خاصی طویل ہونے کے باوجود دلچسپ اور معلومات آفریں تھی، حاضرین محسوس کر رہے تھے کہ یہ رپورٹ کی رپورٹ اور کمنٹری کی کمنٹری ——— (commentary) ہے!

پھر جلسہ برخاست ہوگیا، ہر شخص پنڈال سے خاص اثر لیکر اُٹھا، لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگے، تقریر پر تبصرے اور رائے زنی ہونے لگی، پولیس کے ایک سب انسپکٹر صاحب بہت برہم تھے اور اُن کی برہمی غیر متوقع نہ تھی، ایک صاحب فرمانے لگے کہ تنقید میں حکومت کی مشکلات کو بھی توپیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اُن کو جواب دیا گیا کہ شراب، بے حجابی، بدکاری گھوڑ دوڑ اور کلب گھروں کی قماربازی کو اگر بند کردیا جاتا تو کیا اس سے حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہوجاتا، پاکستان میں انگریز کا بنایا ہوا قانون چل سکتا ہے اور خدا کا قانون نہیں چل سکتا، اسلامی ماحول پیدا کرنے کیلئے فضا کو سازگار اور موافق بنانے میں آخر وہ کونسی مشکلات ہیں جن سے دوچار ہونے کا خطرہ محسوس کیا جاتا ہے ——— بہت سے لوگ تقریر کی دردمندانہ اسپرٹ، اور مقرر کے خلوص کی تعریف بھی کر رہے تھے جس کی جیسی سمجھ اور جیسے جذبات تھے، اُسی طرح کی باتیں کر رہا تھا، مقرر کے وقار، سنجیدگی اور قوتِ استدلال کا ہر کسی کو اعتراف تھا، اس باب میں شاید سب کی ایک ہی رائے تھی!

میں جلسہ گاہ سے باہر سڑک پر پہنچا تو ایک صاحب سے علیک سلیک ہوئی، کہنے لگے آرام باغ اور جہانگیر پارک کے جلسوں میں اُن لوگوں کے ساتھ جو کسی مقصد کو لیکر اُن اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں، بہت سے تماشائی بھی شامل ہوجاتے ہیں مگر "گگری گراؤنڈ" ایک غیر معروف جگہ اور عام گزرگاہوں سے دور ہے اس لئے یہاں حاضرین میں تماشائیوں کی تعداد برائے نام تھی، جو بھی آیا تھا شوق اور دلچسپی کے ساتھ آیا تھا، ایسے حاضرین اور سامعین ہر اجتماع کو میسر نہیں آتے، فکر و نظر اور شوق و مقصد کی کیفیت کے اعتبار سے یہ چند ہزار کا مجمع لاکھوں کے ہجوم پر بھاری تھا!

جلسہ گاہ کے باہر سڑک پر خونچے والے موجود تھے، دہی بڑے، کچالو، پوڑیاں، مونگ پھلی، شامی کباب اور نہ جانے کیا کیا چیزیں اُن کے پاس تھیں، کہیں جلسہ اور اجتماع کی خبر سُن پاتے ہیں تو یہ بیچارے اپنی چیزوں کی روزانہ سے زیادہ بکری کی اُمید میں چلے آتے ہیں، ان خونچے والوں سے مجھے ایک طرح کا لگاؤ ہے، اُن کی غربت سے زیادہ اپنی زبان کے چٹخاروں کے سبب! کم پیسوں میں زبان زیادہ سے زیادہ مزے لوٹتی ہے مگر کبھی کبھار کوئی خونچہ والا اس قدر تیز مرچوں سے تواضع کرتا ہے کہ زمین و آسمان چکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور زبان "پبلک سیفٹی ایکٹ" کی دُہائی دینے لگتی ہے، تو بہ کرتا ہوں کہ اب خونچوں کا رُخ کبھی نہ کروں گا مگر توبہ پر قایم نہیں رہ سکتا ——— شاید غالب کا شعر ہے :-

پیرِ پیمانہ کش ما کہ روانش خوش باد
گفت پرہیز کن از صحبتِ پیماں شکناں

مگر یہ مے و مینا اور جام و بادہ کی دنیا کی باتیں ہیں، خونچوں کی دنیا میں توبہ اور پیماں شکنی کا کچھ اور معیار ہے! یہ شورابہ تلخ کے پینے والے چاٹ کے مزے کو کیا جانیں!

دس بج چکے تھے، میں کچھ کھانا چاہتا تھا، خیال تھا کہ راستہ میں کوئی ہوٹل مل جائے گا تو کچھ کھالوں گا مگر دو ہمراہیوں کی عنایت سے ایسی گلیوں سے گزرنا پڑا جہاں میں آج تک آیا ہی نہیں تھا، بولٹن مارکیٹ تک کوئی ہوٹل نہیں ملا، ٹرام کی پٹری کے قریب پھر ایک خونچہ والے کا سامنا ہوگیا اور اب یارائے ضبط باقی نہ رہا، اُبلے ہوئے چنوں اور کچالو کا ایک لبالب پیالہ سڑک پر کھڑے کھڑے کھاکر پانی پیا، اور چند آنوں میں کام نکل گیا ——— "خونچہ والوں کی جے"!

دوسرا دن

دوسرے دن صبح آٹھ بجے سے اجلاس تھا، پہلے مولانا مسعود عالم ندوی کا ایک فاضلانہ مقالہ پڑھا گیا، اس کے بعد جناب نعیم صدیقی نے تقریر کی، نعیم صاحب تحریر اور تقریر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں، بہت خوب بولتے ہیں، پورے نظم اور ترتیب کے ساتھ! انھوں نے اپنی پُر مغز تقریر میں سیکولرزم، نیشنلزم، فاشزم اور کمیونزم کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں، میں افسانہ کی زبان میں نہیں حقیقت اور واقعیت کی زبان میں گفتگو کر رہا ہوں، پھر انھوں نے نظامِ اسلامی کی اچھائیوں کو گنایا اور ثابت کر دیا کہ صرف نظامِ اسلامی ہی دنیا میں نفاذ پانے کا مستحق ہے کہ یہ نظامِ فطرت سے قریب ترین ہے اور زندگی کے تمام صالح تقاضوں کو پورا کرتا ہے ——— پروگرام کے اعتبار سے نعیم صدیقی کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی کو بولنا تھا مگر وقت کافی ہوگیا تھا، پروگرام میں تبدیلی کر دی گئی، شب کی نشست میں پڑھا جانے والا مقالہ اس وقت پڑھا گیا۔

مولانا مسعود عالم ندوی عربی ادب میں پاکستان اور ہندوستان کے "امیر شکیب ارسلان" ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کی صلاحیتوں کو دینِ حق کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہے، اپنے قلم کی دولت وہ بہت کچھ پیدا کر سکتے تھے، پاک و ہند ہی نہیں مصر و شام اور عراق و حجاز کی درس گاہوں، علمی اداروں اور صحافت میں اُن کو بلند مقام مل سکتا تھا مگر خدمتِ دین کی خاطر انھوں نے مادی فوائد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، جماعتِ اسلامی کا عربی شعبہ (دار العروبہ) اُن کے سپرد ہے اور اپنی مسلسل علالت کے باوجود اسی کام میں مصروف رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ صاحبِ موصوف نے علم کو طلبِ جاہ و دولت کا ذریعہ نہیں بنایا، اُن کی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں دین کے کام آرہی ہیں۔

مولانا مسعود عالم ندوی کے دونوں مقالے سننے کے قابل تھے، جنھوں نے اُن کو سُنا وہ شاید مدتِ دراز تک یاد رکھیں گے، مولانا موصوف کا اصل میدان عربی انشا پردازی ہے مگر ان دونوں مقالوں میں اُردو زبان و ادب کی خصوصیات بھی نمایاں تھیں، بلندیٔ فکر دقتِ نظر اور اصابتِ رائے کے ساتھ خلوص بھی شامل تھا، اس چیز نے بعض مقامات کو انتہائی اثر انگیز بنا دیا تھا، حسن البنا شہید مرحوم کی شہادت اور مظلومیت کا نقشہ اس قدر دردناک انداز میں کھینچا کہ مجھ جیسے سنگ دل کی آنکھیں بھی بھیگے بغیر نہ رہ سکیں۔

مغرب کے بعد تیسرا اجلاس شروع ہوا، آخری عام اجلاس تھا، سب سے پہلے مولانا امین احسن اصلاحی نے تقریر فرمائی عنوان تھا ——— "ہم ملک میں کیا تغیرات چاہتے ہیں؟" مولانا امین احسن صاحب اصلاحی جماعتِ اسلامی کے سب سے زیادہ شگفتہ بیان مقرر ہیں اور صرف مقرر ہی نہیں ہیں بہت بڑے عالم اور صاحبِ نظر عالم ہیں، قرآن میں وہ خاص طور پر بصیرت رکھتے ہیں، اُن کی نگاہیں مجتہدانہ انداز کی حامل ہیں، علم و فضل تو سایہ کی طرح اُن کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، اُن کی ذات علوم و افکار کی ایک جیتی جاگتی یونیورسٹی ہے!

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی تقریر کیا کرتے تھے فصاحت کے پھول برسا رہے تھے، خطابت اُن کے لبوں کو چوم رہی تھی اور

برجستگی اُن کے تکلم کی بلائیں لے رہی تھی سارا مجمع ہمہ تن گوش تھا، انتہائی دل نشین انداز میں حقائق کو بے نقاب کرتے چلے جاتے تھے، اِن کانوں نے مرحومین میں مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا محمد فاخر شاہ الہ آبادی، مولانا نثار احمد کانپوری، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، رئیس الاحرار مولانا محمد علی، مولانا شاہ سلیمان پھلواروی، نواب بہادر یار جنگ، مولوی مرتضیٰ حسین الہ آبادی، مولوی سید سبط حسن جائسی پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ ——— اور زندوں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد سبحانی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا قاری محمد طیب، مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولوی سید محمد دہلوی کی فاضلانہ اور شگفتہ تقریریں سُنی ہیں اور بعض تقریروں کا اب تک دل ودماغ پر اثر باقی ہے مگر مولانا امین احسن اصلاحی کا انداز بیان اور اسلوب تقریر بھی اپنی جگہ منفرد ہے، سب سے زیادہ نمایاں چیز یہ ہے کہ اُن کی تقریر کے ہر جملے سے اُن کے عزم ویقین کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔

مولانا اصلاحی صاحب کا رنگ جم چکا تھا، سامعین مسحور ہو چکے تھے، کوئی دوسرا مقرر شاید اس کے بعد لب کشائی کی جرأت نہ کرتا مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے خاصی طویل تقریر کی لیکن دلچسپی کا جو سلسلہ اصلاحی صاحب قائم کر چکے تھے، وہ ذرا سی دیر کے لئے بھی نہ ٹوٹا، یہ رنگ ہی اور تھا، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ایک کوہِ وقار بول رہا ہے، جچے تلے الفاظ، پُر زور استدلال، محکم دلیلیں، دوٹوک باتیں، سادگی کے ساتھ فکر ونظر کی گہرائی بھی! اگر زبان وادب میں میری یہ ترکیب قبول کر لی جائے تو عرض کروں گا کہ مولانا مودودی کی تقریر میں "ٹھنڈی بجلیاں" بھری ہوئی تھیں، وہ جذبات کو گرما نہیں رہے تھے بلکہ دلوں میں کوئی چیز اتار رہے تھے، انھوں نے جماعتِ اسلامی کا پروگرام پیش کیا اور ہر چیز کی خوب خوب وضاحت کی ——— آخر میں دُعا مانگی "اللہ کے حضور اپنا عجز ونیاز پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یا اللہ! جو باتیں ہم نے حق کہی ہیں اُس کے قبول کرنے کی لوگوں کو توفیق عطا فرما، اور جو کچھ ہم نے ناحق کہا ہے اُس کے لئے لوگوں کے سینے بند کر دے ۔۔۔"

سچّی باتیں

۱۳ نومبر کو مغرب کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ارکانِ جماعت اور متفقین کو خطاب کیا، اُنھوں نے کہا کہ ——— "تعلق باللہ" کو مضبوط کرو جب تک یہ تعلق مضبوط نہ ہوگا کوئی کام ٹھیک طور پر انجام کو نہیں پہونچ سکتا ——— "تعلق باللہ" ہر "تعلق" پر مقدم ہے، پہلے یہ، اُس کے بعد اور سب کچھ! خدا کا خوف اور آخرت کا ڈر زیادہ سے زیادہ پیدا ہونا چاہیئے ——— پھر فرمایا کہ علماء کرام نے جماعتِ اسلامی کے خلاف جو مخالفانہ روش اختیار کر رکھی ہے اُس میں زیادہ تر نشانہ میری ذات ہی کو بنایا جاتا ہے، میں ضرورت سمجھوں گا تو اپنی مدافعت خود کر لوں گا آپ میری طرف سے مدافعت کر کے اور اس بحث میں اُلجھ کر اپنے وقت کو ضائع نہ کیجئے، جماعت کے ارکان کو حتی المقدور بحث ومناظرہ سے دامن بچانے کی ضرورت ہے۔

——— اور ہاں! اس چیز کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ جو لوگ ہم پر تنقید کر رہے ہیں اُن کے خلاف دلوں میں نفرت و عناد کا جذبہ ہرگز ہرگز پیدا نہ ہونے دیجئے! ——— اور سنئے! جب ہم پر طرح طرح کی تہمتیں جوڑی جاتی ہیں اور ہمارے عیب گنائے جاتے ہیں تو اُس وقت مجبوراً ہمیں اپنی جماعت کے ارکان کی زندگیوں کے بارے میں کچھ بولنا پڑتا ہے تو ہماری اِن تحریروں کو دیکھ کر کہیں آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ سیرت واخلاق میں آپ درجۂ کمال تک پہونچ چکے، ایسا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہیئے، یہ بہت بڑا فریب ہے، کمال کی کوئی حد نہیں، اونچے سے اونچے مقام پر پہونچ کر بھی پستی ہی محسوس ہوتی ہے، اللہ سے ہر وقت نیکی اور اصلاح کی توفیق طلب کرتے رہیئے۔

آج ساری دُنیا کا اخلاق بگڑ چکا ہے، آپ جس پست اور گندے ماحول میں رہتے ہیں اُسے دیکھ کر بہت ممکن ہے

کہ آپ میں برتری کا جذبہ پیدا ہو جائے مگر کسی جماعت اور قوم نے "پستی" کو ترقی اور بلندی کا معیار آج تک نہیں بنایا، اگر کوئی آدمی سسکتے ہوئے بیمار کو دیکھ کر اپنی صحت کا اندازہ لگائے تو یہ اُس کی جہالت اور بے وقوفی ہے!

مولانا کی تقریر میں بعض ایسے اشارے بھی تھے جس سے یہ اندازہ ہوا کہ ارکانِ جماعت کے خصوصی اجلاس میں تمام رفقاء اکٹھے ہو کر ایک دوسرے پر تنقید کرتے ہیں اور خود مولانا مودودی امیرِ جماعت اپنے کو تنقید و احتساب کے لئے پیش فرماتے ہیں، یہ جذبہ، یہ ذہنیت، اور یہ فکر و نظر اُسی جماعت کو میسر آ سکتے ہیں جس کی بُنیاد للّٰہیت پر ہو اور اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی جس کا معیار، مطلوب اور مقصود ہو! ——— جس اجلاس کا میں ذکر کر رہا ہوں اُسی اجلاس میں جماعت کے ایک رُکن نے اعتراض لکھ کر بھیجا کہ ظہر کی نماز آپ نے جماعت سے کیوں نہیں پڑھی؟ مودودی صاحب نے برسرِ اجلاس جماعت میں شریک نہ ہونے کے لئے اپنی صفائی پیش کی! نیک، راست باز اور خدا ترس لوگوں کا یہی انداز اور طور طریق ہوا کرتا ہے اور ہونا چاہیئے،

جماعتِ اسلامی کے ارکان اور اُن کے اکابر کو دیکھ دیکھ کر بار بار یہ خیال آتا تھا کہ ہائے! یہی وہ نیک لوگ ہیں جن سے "خارجیت" منسوب کی جاتی ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس تحریک میں "قادیانیت" کی بو آتی ہے، جن کے خلاف عُلماء کے فتووں کی توپیں دھڑا دھڑ آگ کے گولے برسا رہی ہیں، عام مسلمانوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ دیکھو! اِن جماعتِ اسلامی والوں سے بچے رہنا ورنہ تمہارا دین برباد ہو جائے گا ——— آہ! جن کو دیکھ کر قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کی زندگیوں کی ایک ذرا سی جھلک اور پرچھائیں نگاہوں کے سامنے آ جائے، اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ "اسلاف" کی تضحیک کرتے ہیں، جو لوگ دینِ حق کے قیام کے لئے تن من دھن کی بازی لگا رہے ہیں، اُن پر "بے دینی" کی تہمت جوڑی جاتی ہے، ان تہمت طرازوں میں عوام ہی نہیں بڑے بڑے جُبّہ و دستار والے بھی شامل ہیں، کیا بیسویں صدی میں علم و تقویٰ کا یہی کام رہ گیا ہے!

ان ستم ظریفیوں کا سلسلہ بڑا طویل ہے، جماعتِ اسلامی کے ارکان اور اُن کے لیڈر جن کی زندگیاں آئینہ کی طرح روشن ہیں اُن کی ڈاک "سنسر" کی جاتی ہے، اُن کی نگرانی کے لئے "خفیہ پولیس" مقرر ہے، اُن کے ملازمین کو سرکاری دفاتر سے نکالا جاتا ہے، سرکاروں کے ذریعہ تنبیہ کی جاتی ہے کہ جماعتِ اسلامی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے یہاں تک کہ اس کا لٹریچر بھی نہ پڑھا جائے، جو سب سے زیادہ اعتماد کے قابل تھے اُن پر یہ بے اعتمادی! اسلام اور پاکستان کے سب سے زیادہ "وفادار" اور سچے "بہی خواہوں" کے ساتھ مُلزموں اور مُجرموں جیسا سلوک!

تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

اس پاکستان میں رشوت خواروں، شرابیوں، قمار بازوں، بے نمازوں اور بدکاروں کے لئے عزت کا مقام ہے مگر نیک، راست باز، خدا پرست اور پاکیزہ کردار رکھنے والوں کے لئے طرح طرح کی مزاحمتیں، مشکلیں اور دشواریاں اور پریشانیاں ہیں ——— کیا لوگ آخرت کی جواب دہی سے بالکل نہیں ڈرتے؟

حُسنِ انتظام

جماعتِ اسلامی کے ان جلسوں میں جماعت کے کسی لیڈر کے لئے "زندہ باد" کا ایک نعرہ بھی بلند نہیں ہوا، یہ نیک لوگ اپنے کام کی تحسین اور اجر اپنے خالق و معبود سے چاہتے ہیں ——— جلسہ میں کوئی کیمرہ مین ہی نظر نہیں آیا، کسی لیڈر یا مُقرر کی ایک تصویر بھی نہیں لی گئی، خدا پرستی اور شخصیت پرستی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

باہر سے بارہ سو کے لگ بھگ مہمان آئے تھے، یُوں سمجھو کہ "لگری گراؤنڈ" میں ایک چھوٹی سی بستی آباد تھی، اور شاید لوگوں کو یہ سُن کر تعجب ہو گا کہ چار دن کے لئے جس میں دونوں وقت کے کھانے کے علاوہ صبح کا ناشتہ بھی شامل تھا، ایک

آدمی سے صرف پانچ روپیہ چارج کیے گئے ـــــ اور یہ باتیں تو اجتماعات کی تاریخ میں لکھے جانے کے قابل ہیں کہ مہمانوں میں کسی بات پر چھوٹی سے چھوٹی تکرار بھی نہیں ہوئی، کسی مہمان کا ایک پیسہ اور خلال کا ایک تنکا بھی چوری نہیں ہوا، لوگ اپنے ٹرنکوں کو کھلا چھوڑ کر قیام گاہوں سے باہر چلے جاتے، جس کارکن سے جو ڈیوٹی (DUTY) متعلق تھی وہ اُسے پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دے رہا تھا،

عام اجلاسوں میں ہزاروں کا اجتماع مگر ضبط و نظم اور ڈسپلن کا یہ عالم جیسے حاضرین امتحان کے کمرے (ایگزامنیشن ہال) میں بیٹھے ہوئے پرچہ حل کر رہے ہیں، عوام کے ذوق کی رعایت اور تماشائیوں کو جمع کرنے کی غرض سے کسی ایک جلسہ میں ایک نظم بھی نہیں پڑھی گئی، خواتین کے لئے اس قدر معقول انتظام تھا کہ لوگوں کو محسوس تک نہ ہوتا تھا کہ عورتیں آخر کہاں اور کدھر بیٹھی ہوئی ہیں، نہ بچوں کا شور تھا اور نہ دوسرے جلسوں کی طرح عورتیں تاک جھانک کر رہی تھیں، اجتماع کا سارا ماحول ہی اسلامی تھا، نظم و ضبط، غیرت، پاکیزگی، نفاست، سادگی اور خوش انتظامی! مردِ مومن کی فراست کی یہی شان ہونی چاہیئے' دیکھنے والے اندازہ لگا رہے تھے کہ یہ سب کچھ کم سے کم پچھتر ہزار روپیہ میں ہوا ہوگا، مگر لوگوں کا اندازہ غلط تھا، یہ جماعتِ اسلامی کا اجلاس تھا جس کے کارکن انتہائی ایثار پسند دیانت دار اور محتاط ہیں، جو خود مزدوروں اور نوکروں کی طرح کام کرتے ہیں' جہاں دوسروں کا ایک روپیہ خرچ ہوتا ہے وہاں یہ لوگ چند آنوں میں کام نکال لیتے ہیں، قومی اور سیاسی جلسوں کے کارکنوں کی طرح جماعتِ اسلامی کے کارکن کمائی نہیں کرتے اور جلسوں سے مادی نفع نہیں اُٹھاتے، یہی سبب ہے کہ اس اجتماع میں جماعتِ اسلامی کا بہت سے بہت دس گیارہ ہزار روپیہ صرف ہوا ہوگا ـــــ

جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجتماع میں ایک نمائش بھی تھی جس میں چارٹوں (CHARTS) اور مختلف نقشوں کے ذریعہ جماعت کے کام کی رفتارِ ترقی کو دکھایا گیا تھا، دیکھنے والوں کے لئے یہ نمائش دلچسپی کا حیرت انگیز نمونہ تھی ـــــ بک اسٹالوں پر بھی پاکیزہ لٹریچر نظر آتا تھا، سب سے زیادہ مجمع مکتبہ انسانیت کی اسٹال پر تھا جہاں مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" ملتی تھی، سچ تو یہ ہے کہ "لکری گراؤنڈ" کے نصیب میں یہ سعادت لکھی تھی، نیک لوگ خاک کے جن ذرّوں پر سے گزرتے ہیں وہ اُن کو پامال نہیں سرفراز کرتے ہیں،

نومبر کی ۵ ر تاریخ ہے، رات کے ساڑھے بارہ بج چکے ہیں، چاروں طرف سکوت چھایا ہوا ہے شاید سینما کا آخری شو بھی ختم ہو گیا! کسی آنے جانے والے کی پہچل تک سُنائی نہیں دیتی، کبھی کبھی موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آجاتی ہے، سوچتا ہوں کہ "لکری گراؤنڈ" کے شامیانے اکھڑ گئے ہوں گے مگر پھر خیال آتا ہے کہ اس اجتماع نے دلوں میں نیکی اور عزم و عمل کے جو شامیانے نصب کر دئے ہیں وہ تو نہیں اکھڑ سکتے ـــــ اور ہاں! بجلی کے وہ ٹیوب گل ہو چکے ہوں گے اُن کو ہٹا دیا گیا ہوگا، لیکن دلوں میں جو روشنی پیدا ہو گئی ہے وہ تو نہیں بجھ سکتی ـــــ

جماعتِ اسلامی والوں کیلئے دُعائیں کہ ان آنکھوں کو وہ منظر دکھا دیا جو کبھی دیکھا نہ تھا، شاید تاریخ کوئی ورق اُلٹنے والی ہے!

ع ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

رُوحِ انتخاب

امریکہ کی ہرورڈ اور بوسٹن یونیورسٹیوں کا علمی قافلہ جو مدت سے مقبرۂ اہرام مصر سے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے، حال میں اُسے ایک ملکہ کے مقبرہ کے اندر ایک ظرف میں پانی کا ایک ذخیرہ دستیاب ہوا ہے، جو کم وبیش پانچ ہزار سال ہوئے وہاں رکھا گیا تھا، اور اب تک بدستور اپنی طبعی حالت پر قایم ہے نہ مزے میں فرق آیا ہے، نہ رنگ میں، نہ بو میں، اور یہ اطلاع تمام ولایتی اخباروں میں شائع ہوئی ہے (ڈیلی ہیرلڈ، ۲۵ر جولائی، ڈیلی میل ہفتہ وار، ۳۰ر جولائی وغیرہ)

پانچ ہزار سال تک پانی نہ بگڑنے، اور اپنی طبعی حالت پر بدستور قایم رہنے کا یہ واقعہ ہم اخبارات میں پڑھتے ہیں، اور ان اخبارات میں پڑھتے ہیں، جن کے جھوٹ کا روزانہ تجربہ ہوتا رہتا ہے، لیکن ہم میں سے کسی کی جبین "عقلیت" پر شکن نہیں پڑتی اور ہر شخص بلا بحث وحجت اسے یقین کر لیتا ہے، لیکن اسی کے بعد جب اُسے سچے کی، جس کی سچائی میں اُس کے جانی دشمن تک شبہ نہ کر سکے، لائی ہوئی کتاب میں ہم یہ پڑھتے ہیں کہ ایک شخص کو مُردہ کرکے سو برس تک اُسے اُسی حالت میں رکھا گیا، اور اس کے بعد اُسے بتایا گیا۔ کہ دیکھو سو برس گزر جانے پر بھی جو

بل لبثت مائة عام فانظر الی طعامک و شرابک لم یتسنه

کھانا اور پانی تیرے پاس رکھا تھا، وہ سڑنے اور بسنے نہیں پایا!

تو سعاً ہماری سوئی ہوئی "روشن خیالی" بیدار ہو جاتی ہے اور ہم اس "خلافِ عقل؟" و "خلافِ قیاس؟" دعوے کی طرح طرح پر تاویلیں کرنے لگ جاتے ہیں

("سچ" ۲۶ر اگست ۱۹۳۶ء)

نامور امریکی موجد اور ماہر سائنس، ایڈیسن (موجد گراموفون) کا نام اُس کی بیشمار ایجادوں کے باعث ایک عالم میں مشہور ہے۔ آپ نے حال میں ایک انگلستانی اخبار میل کے نمایندہ کو اپنے عقائد سے متعلق ایک بیان دیا ہے جس میں فرماتے ہیں:۔

"میری ساری عمر سائنسی حقائق کے تجربہ پر گزری ہے، اور مجھے جب تک قطعی شہادت نہیں مل جاتی، میں کسی شے کا یقین نہیں کرتا۔ لیکن اب میں اس منزل پر پہونچ گیا ہوں کہ اب قطعیت کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میری تحقیقات کے نتائج حیات بعد الموت کی زبردست تائید میں ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک ماننے کو تیار ہوں، کہ اس دُنیا اور مُردوں والی دُنیا کے درمیان نامہ و پیام ممکن ہے۔"

"برقی اور لاسلکی پیام رسانی کے سلسلہ میں سائنس کے اسرار پر مجھے جتنا زیادہ دسترس ہوتا جاتا ہے، اُسی نسبت سے میرا یقین مضبوط ہوتا جاتا ہے، کہ ہادیانِ قدیم، جو رُوح کے بقا اور زندوں اور مُردوں کے بیان نامۂ پیام کے قائل تھے، ہم لوگوں سے کہیں زیادہ علم وخبر رکھتے تھے۔"

ہمارے وہ جوان عزیز، جن کے پاس روحانیت سے انکار، رُوح سے انکار، دوزخ وجنت کے وجود سے انکار، عالم غیب کے وجود سے انکار کی کُل یہی ایک دلیل ہے، کہ جدید سائنس اس کے باوجود منکر ہے، سائنس کے سب سے بڑے ماہر کی زبان سے، آخر عمر میں، انکار کو نہیں، اقرار کو سُن رہے ہیں؟ فبای حدیث بعده یومنون!

("سچ" ۱۶ر دسمبر ۱۹۳۶ء)

(مولانا عبد الماجد دریابادی)

ہماری نظر میں

رحمتِ عالم

"رحمتِ عالم" از:- مولانا سید سلیمان ندوی، حجم ۱۵۸ صفحے، مجلد قیمت درج نہیں ہے! ملنے کا پتہ:- مکتبۃ الشرق نزد مسجد باب اسلام، آرام باغ، کراچی!

علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا نام ہی اپنا خود تعارف ہے، تقریباً نصف صدی سے اُن کا قلم دین اور علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے، علامہ ممدوح کی ذاتِ گرامی قوم، ملک اور ادب کے لئے سرمایۂ نازش و افتخار ہے، اس جامعیت کا آدمی اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو قدر افزائیاں اُس کی فرشِ راہ بن جاتیں!

اب سے بارہ سال پہلے (۱۳۵۹ھ ہجری میں) مولانا سید سلیمان ندوی نے یہ کتاب لکھی تھی، طبع اوّل کے دیباچہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

"اسلام کا گلدستہ جس دھاگے سے بندھا ہوا ہے وہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجودِ مبارک ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس وجودِ پاک کے سوانح کا ایک ایک حرف ہر مسلمان کے کان تک پہونچ جائے، تاکہ یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے اس کی مناسب صورت یہ ہے کہ ہر چھوٹے سے بڑے تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام اور پیغام کو پہنچایا جائے، ایک زمانہ سے دوستوں کا اصرار تھا کہ چھوٹے لڑکوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے سیرت کی ایک ایسی چھوٹی سی کتاب لکھوں جس کا پڑھنا اور سمجھنا سب کے لئے آسان ہو اور پھر اس میں کوئی اہم بات چھوٹنے بھی نہ پائے ——"

اس کتاب (رحمتِ عالم) کو اللہ کے فضل سے قبولِ عام حاصل ہوا، ہندستان کے بہت سے مدرسوں اور مکتبوں میں داخلِ نصاب ہوئی اور اب تقسیم کے بعد پاکستان کے مدرسوں میں اس کو پڑھایا جاتا ہے، اس کتاب کے بہت سے ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، زیرِ تبصرہ ایڈیشن تازہ ترین ہے جسے کراچی میں مکتبۃ الشرق نے شائع کیا ہے!

جس نامور مورخ اور فاضل سیرت نگار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کو ہزاروں صفحوں میں پھیلا کر پیش کیا ہے اُس کے قلم نے "رحمتِ عالم" میں "ایجاز" کا کمال دکھایا ہے، سلاست اور شگفتہ نگاری کا اندازہ ان جملوں سے ہو سکتا ہے:-

"صبح ہوئی تو دونوں فوجیں میدان میں آکھڑی ہوئیں، ایک طرف ہزار کا دل بادل تھا جو لوہے میں غرق تھا، دوسری طرف تین سو تیرہ مُسلمان تھے، جن کے پاس پورے ہتھیار بھی نہ تھے، لیکن حق کا زور اُن کے بازوؤں میں تھا اور دین کا جوش اُن کے سینوں میں منڈرا رہا تھا، اللہ کے رسول م لڑائی کے میدان سے ذرا ہٹ کر ایک چھپّر کے سایہ میں اللہ کے حضور سر جھکائے فتح کی دُعا مانگ رہے تھے اور عرض کر رہے تھے، خداوندا! اگر آج یہ تیرے مٹھی بھر پوجنے والے مٹ گئے تو پھر زمین پر تیری پرستش نہ ہوگی —— (صفحہ ۵۶)

"خدا کی عجیب قدرت ہے کہ تین سو تیرہ آدمیوں نے جو ہتھیاروں سے بھی پوری طرح سجے نہ تھے ایک ہزار کی فوج کو ہرا دیا، یہ سچ اور جھوٹ اور اندھیرے اور اُجالے کی لڑائی تھی، سچ کی جیت ہوئی اور جھوٹ کی ہار، اندھیرا چھٹ گیا اور اُجالا پھیل گیا —— (صفحہ ۵۸)

(صفحہ ۶) "ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے جب چاہا کر اپنے بندوں کو اپنے مطلب کی بات اور پیغام سے خبر دے۔۔۔" ــــــ "اپنے مطلب کی بات" "اپنے فائدے کی بات" کو کہتے ہیں، عام طور پر بولتے ہیں "فلاں صاحب اپنے مطلب کی بات خوب سُن لیتے ہیں،" اور یہاں اس کا کوئی محل نہ تھا ــــــ (صفحہ ۲۱) "جس اللہ نے اپنے بندوں کے لئے زمین آسمان بنایا، طرح طرح کے اناج، میوے، اور پھل پیدا کئے، پہننے کو رنگ برنگ کے کپڑے بنائے" ــــــ جن چیزوں سے کپڑے بنائے اور تیار کئے جاتے ہیں وہ تو یقیناً اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں مگر رنگ برنگ کے کپڑے تو خود انسان ہی بناتے ہیں ــــــ (صفحہ ۷۱) "ایک ہی سال بعد بدر کا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں نے فتح پائی، یہ یہودیوں کے لئے خطرہ کی گھنٹی تھی وہ چوکنے ہو گئے اور کیل پرزے سے درست ہونے لگے" ــــــ اُردو روزمرہ یوں ہے "کیل کانٹے سے درست ہونے لگے" ــــــ (صفحہ ۷۷) اور خندق (گڈھا) کھودی جائے تاکہ دشمن اُس سمت سے شہر میں گھسنے نہ پائیں ــــــ "خندق" بھی بہرحال "گڑھے" کی طرح کھودی جاتی ہے مگر "خندق" کا ترجمہ "گڈھا" محلِ نظر ہے، خندق کا صحیح ترجمہ "کھائی" ہے ــــــ "نبٹنا" کو کئی جگہ "نپٹنا" لکھا ہے یہ کتابت کی غلطی ہے کہ "ب" کو "پ" بنا دیا ــــــ (صفحہ ۷۹) "گھوڑا کودا کر اس پار آگیا" اس کا صحیح املا "کُدا کر" ہے، بالکل اسی طرح، جس طرح "چھڑا کر" لکھتے ہیں "چھوڑا کر" نہیں لکھتے!

فاضل مصنف جن کے قلم سے سیرۃ النبی، ارض القرآن، خطبات مدراس اور خیام جیسی بلند پایہ علمی ادبی و تاریخی کتابیں نکل چکی ہیں، اُن کو "رحمتِ عالم" اپنی انشا پردازی کی سطح سے نیچے آکر سادہ زبان میں لکھنی پڑی، پہلا تجربہ تھا اس لئے کہیں کہیں بیان و اظہار میں لفظوں کی یہ نیچ اونچ ہو گئی۔

"رحمتِ عالم" مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ بار پانے کی مستحق ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ پر آسان اور سلیس زبان میں اتنی مستند اور جامع کتاب ہماری نظر سے آج تک نہیں گزری، اللہ تعالےٰ مولانا سید سلیمان ندوی کی عمر اور صحت میں صحت اور برکت عطاء فرمائے کہ اُن کی ذات علم و ادب کی ایک انجمن ہے!

رنگ و آہنگ

"رنگ و آہنگ" از:- ادیب سہارن پوری، ضخامت ۲۰۸ صفحے، مجلد، خوبصورت رنگین گردپوش، قیمت تین روپیہ، ملنے کا پتہ:- تاج آفس، بالمقابل میونسپل کارپوریشن، بندر روڈ، کراچی!

جناب ادیب سہارن پوری اپنی مشق سخن کی مدت کے اعتبار سے بہت دیر میں منظرِ عام پر آئے مگر جب آئے تو اس شان سے آئے کہ اُن کی شہرت پھیلتی ہی چلی گئی اور اب اُردو دنیا کے وہ خاصے معروف شاعر ہیں ــــــ "رنگ و آہنگ" ادیب صاحب کی غزلوں اور نظموں کا منتخب مجموعہ ہے جو حال ہی میں چھپ کر مارکیٹ میں آیا ہے۔

"رنگ و آہنگ" میں حضرت جگر مرادآبادی، بابائے اُردو مولوی عبد الحق، پروفیسر رشید احمد صدیقی، نیاز فتح پوری اور ممتاز حسن احسن کی قیمتی آراء درج ہیں ــــــ پیش لفظ، تعارف، مقدموں اور دیباچوں کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ "دیباچہ نگار" یہ سوچ کر تو مقدمے اور دیباچے لکھتے ہیں کہ ہمیں "تحسین" ہی کرنی ہے، "تحسین و ستایش" نہ ہو تو شاعر اور ادیب اپنی کتابوں میں اُن تحریروں کو شامل کیوں کرنے لگے، معمولی اور سطحی کتابوں پر بھی تحسین آمیز دیباچے ہماری نظر سے گزرے ہیں، خود ہمیں اس کا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک مشہور شاعر نے ہم سے اپنے مجموعہ کلام پر "تعارف" لکھوایا، کتاب جب چھپ کر آئی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ "تنقیدی جملوں" کو سرے سے حذف ہی کر دیا بس "تعریف" رہنے دی۔

جناب ادیب سہارن پوری خود اعتمادی سے کام لیتے اور اُن کے مجموعہ کلام پر یہ "صداقت نامے" نہ بھی ہوتے، تو بھی ان کے

اس انداز کے شعر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین لیکر ہی چھوڑتے :-

سدا بہار ادائیں گل و سمن میں کہاں ——— ملیں گے کوچۂ جاناں میں ہم چمن میں کہاں

آرزوئے قرب بھی بخشی دلوں کو عشق نے ——— فاصلہ بھی میرے اُن کے درمیان رہنے دیا

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے ——— عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

وقت کی برہم مزاجی کا گلہ کیا کیجئے ——— یہ بھی کیا کم ہے کہ سر پر آسماں رہنے دیا

علاج درد سے کچھ اور درد بڑھ ہی گیا ——— اُنھیں کا ذکر کیا آنے جلنے والوں نے

کتنے غم روکے ہوئے تھی وہ نگاہِ التفات ——— یہ اُنھیں سے پوچھئے جو بے سہارے ہوگئے

تو نے دیکھا ہی نہیں ہے اُنھیں ناصح ورنہ ——— ہم کوئی جان سے بیزار نظر آتے ہیں

اور بڑھ جاتا ہے احساسِ شکستہ پائی ——— جب ذرا راستے ہموار نظر آتے ہیں

دل کا یہ تقاضا کہ وہ جلدی سے گزر جائیں ——— آنکھوں کی تمنا کہ وہ کچھ دیر ٹھہر جائیں

یہ جوشِ بہاراں یہ ہوائیں یہ گھٹائیں ——— دیوانے نہ ہو جائیں اگر لوگ تو مر جائیں

اور بھی انداز ممکن تھے ستانے کے مگر ——— یہ تری بیگانگی اور خاص کر میرے لئے

سمجھ کر راز جن اشکوں کو اکثر پی گئیں آنکھیں ——— وہی ٹوٹے ہوئے موتی تو چبھتے ہیں رگِ جاں میں

ادیب سہارن پوری کے کلام کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت "نغمگی" اور "ترنم" کی فراوانی ہے، اُن کی بعض غزلوں کو سُن کر اور پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سچ مچ ساز سے خوش آہنگ نغمے نکل رہے ہیں ——— اور یہی نہیں اُن کے اشعار غمازی کر رہے ہیں کہ اُن کے دل نے کہیں نہ کہیں چوٹ ضرور کھائی ہے، اس قسم کے شعر :-

کیا غم جو اجنبی ہے ذرا گفتگوئے شوق
تم بھی نئے نئے سے ہو ہم بھی نئے نئے

نرے "خیالی" نہیں ہو سکتے، چوٹ کھائے ہوئے دل کی اسی کسک نے "نغمگی" کو پُر سوز بھی بنا دیا ہے،

ادیب سہارن پوری کے جو اشعار ہم ابھی ابھی پیش کر چکے ہیں اور جو یہاں نیچے درج کر رہے ہیں، اپنی جگہ خود شاعر کے "آرٹ" کا سب سے بہتر "تعارف" ہیں

شبِ غم اور یہ اُس پر خیالِ خانہ ویرانی ——— بسا اوقات چیخیں روکنا ممکن نہیں ہوتا

سو بار ہم نے پیدا کی جُرأتِ شکایت ——— لیکن تری نگاہیں آتے بھی دیں زباں پر

کہتے ہیں لوگ سہل ہے اظہارِ دردِ دل ——— ہم سے تو آنکھ بھی نہ اُٹھی بزمِ یار میں

آج[1] وہ سب کچھ حقیقت ہے بہ فیضِ قربِ دوست ——— ذکرِ جنت کو فقط حسنِ بیاں سمجھا تھا میں

ذرا روکے ہوئے سرشار و بے[2] پروا نگاہوں کو ——— خبر بھی ہے تمھیں کیا رنگِ محفل ہوتا جاتا ہے

[1] ادیب کا یہ شعر غالب کے اس شعر سے :- جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ؏ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
مُستفاد ہے مگر ادیب کے اندازِ بیان میں بھی کچھ کم دلکشی نہیں ہے۔

[2] "بے پروا" فارسی نہیں خالص اُردو ہے، اس لئے سرشار کے ساتھ "عطف" کرنا درست نہیں!

یہ باتیں تو کچھ اہلِ عشق ہی کو زیب دیتی ہیں　　خدا ناکردہ وہ کیوں صورتِ شام بلا دیکھیں
جوابِ نامۂ اُلفت کی شوخی ہائے کیا کہیے !　　یہ قاصد سے کہا ہے اُن سے کہنا آئینہ دیکھیں

اور یہ مصرعہ بھی !

؎ ابھی ہم انھیں دیکھیں دیکھیں کہ اُن کا دیکھنا دیکھیں

محبت کی آغوش میں چین پایا　　خرد کی ستائی ہوئی زندگی نے
رُخِ دوست پر ڈال رکھے ہیں پردے　　خود اپنے توہم کی صورت گری نے

———

ہماری مسکراہٹ پر کسی کو کیوں تعجب ہو　　ذرا تصویرِ غم کا رُخ بدل کر ہم نے دیکھا ہے

———

اکثر یہی ہوا ہے دمِ پرسشِ ملال　　گھبرا کے رہ گئے ہیں کبھی مسکرا کے ہم

———

ادیب نے بھی کہاں آشیانہ بنایا ہے　　جہاں کہ برق و شرر کے سوا کچھ اور نہیں

———

چاہ رہی ہے لغزشیں آج ادائے حُسنِ دوست　　اور یہاں بقدرِ شوق تابِ نگاہ بھی نہیں

———

دیدنی تھے چشمِ ساقی کے اشارے ہائے ہائے　　بے پیے ہی اُٹھ گئے اکثر بھری محفل سے ہم
وہ تو کہیے عشق کی فطرت نہیں آسودگی　　ورنہ سو سو بار گزرے ہیں اسی منزل سے ہم

———

اُٹھ سکا ہوگا کب ان آنکھوں سے بارِ انتظار　　رہ گئے ہوں گے ستارے ٹوٹ کر میرے لئے

———

تری نگاہ کا پیدا کہاں جواب ہوا　　جس آئینہ کو تراشا وہ آفتاب ہوا
خرد کے شیوۂ کارِ آگہی کا حال نہ پوچھ　　جس آئینہ پہ جِلا کی وہی خراب ہوا

———

اس انجمن میں مُغنی کی نغمگی پہ نہ جا　　ذرا یہ دیکھ کہ کس کس کی آنکھ پُرنم ہے

———

زندگی کو امتحاں کا نام دے کر عشق نے　　ناگوارا تلخیوں کو بھی گوارا کر دیا

———

مُہلت ہی دے سکے نہ رہِ زندگی کے موڑ　　کیا دیکھتے کہ چھُوٹ گیا کارواں سے کون

———

مشورے ترکِ عشق کے ناصحِ نامزا نہ دے　　عشق کرے کسی سے کون درد اگر مزا نہ دے

———

کبھی تو اتنا ہمیں بتا دیں اُمیدِ راحت بندھانے والے　　کہ گریۂ پے بہ پے کا حاصل تبسم گاہ گاہ کب تک

———

مسرتوں نے رفو تو بہت کئے لیکن　　خراشِ غم سے کلیجے فگار ہیں اب تک

———

گزارے جا رہے ہیں اس توقع میں بے سحر راتیں　　سحر جن کی ہوا کرتی ہے وہ راتیں بھی آئیں گی

———

ہلاکِ دوریٔ منزل ہیں کیا کیا　　بچارے سُست رو کیا، بادپا کیا

———

نہ انجمن ہی گوارا ہمیں نہ تنہائی　　یہی ہے عشق تو پروردگار کیا ہوگا

———

ہمیں اب آہ کر کے کیا کریں گے اور کیا ہوگا　　نہ جانے کتنی آہیں دفن ہیں دیوارِ زنداں میں

ادیب سہارنپوری کے اِن قطعوں کو ہم یورپ کے شاعروں کے کلام کے مقابلہ میں بلا تکلف پیش کر سکتے ہیں :-

کون جانے مآل کیا ہوگا　　شاعروں کے جو ہیں یہ لیل و نہار
جیسے اندھے بنا رہے ہوں نقوش　　جیسے بہرے بجا رہے ہوں ستار

———

گہوارۂ شرق سے اُٹھاتا ہوا پردے　　کس شان سے خورشیدِ سحر جاگ رہا ہے

دامن کو سمیٹے ہوئے گھبرا کے اندھیرا ——— ہارے ہوئے لشکر کی طرح بھاگ رہا ہے

دیکھ کیا کیا مچل رہا ہے ادیب! ——— فرطِ جوشِ نمو میں فوارہ

جس طرح جوشِ رقص و مستی میں ——— بھول جاتی ہے خود کو رقاصہ

دوسرا رُخ :— لمحہ بھر کو ملی تھی اُن سے نگاہ ——— دل کو تسکین عمر بھر نہ ہوئی (صفحہ ۲۰)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ اُن سے ایک لمحہ کے لئے نگاہ ملنے کے بعد ساری عمر بیقراری اور بے تابی رہی، مگر مصرعِ ثانی نے اس مفہوم ہی کو خبط کر دیا ——

حُسنِ شرارتِ نگہ ناز دیکھنا ——— سمجھا گئی کہ جراتِ شکوہ نہ کیجئے (صفحہ ۲۵)

اس غزل کے قوافی "تمنا، مدادا، گوارا ۔ ۔ ۔ ۔" ہیں اس لئے "شکوہ، توبہ ۔ ۔ ۔ ۔" وغیرہ قافیے اس غزل میں اُردو (شکوا، توبا، پردا ۔ ۔ ۔ ۔) ہو جاتے ہیں، چاہے اُن کو ہم "شکوہ" "پردہ" اور "توبہ" ہی لکھیں، اس لئے "جراتِ شکوہ" اضافت کے ساتھ یہاں درست نہیں، پھر "حُسن" کا لفظ بھی زاید ہے "شرارتِ نگہِ ناز" ہی کافی تھا "حُسن" نے اس ترکیب (حُسنِ شرارتِ نگہِ ناز) میں بڑا تکلف پیدا کر دیا۔

وہ بھی کیا دن تھے جب اُن کو مہرباں سمجھا تھا میں ——— اضطرابِ شوق کو آرامِ جاں سمجھا تھا میں (صفحہ ۲۸)

مطلع یوں بھی کمزور ہے اور پھر محبت میں "اضطرابِ شوق" بہر حال باقی رہتا ہے چاہے محبوب مہرباں ہو یا نامہرباں! —— دوسرا مصرعہ ٹھیک طرح نہ لگ سکا!

غم اُبھر کر یوں محیطِ دیدہ و دل ہو گیا ——— گویا طوفاں بے نیازِ قیدِ ساحل ہو گیا (صفحہ ۲۵)

"گویا" کا "الف" بُری طرح دب رہا ہے "جیسے" کہنا تھا!

ہزار بادِ الم آندھیاں بھی لے کے اُٹھیں ——— مگر ادیب بہر حال جل رہا ہوں میں (صفحہ ۳۲)

"آندھیاں، بادِ الم لیکے اُٹھیں" یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ "سیاہ رات شبِ غم کو لیکر آئی" پھر دوسرے مصرعہ نے شعر کی معنویت اور ساخت دونوں کو کمزور کر دیا، جب آندھیاں "غم" (بادِ الم) ہی کو لیکر آئی تھیں تو آتشِ غم میں اور اضافہ ہی ہونا چاہیئے تھا یہ آگ بجھ کیسے جاتی! یا پھر دوسرے مصرعہ میں "شمع" اور "چراغ" کا ذکر کرنا تھا تاکہ شعر کی چولیں ٹھیک بیٹھ جاتیں —— رمز و اشاریت کا بھی ایک قرینہ ہوتا ہے۔

نغماتِ غم کو عام کئے جا رہا ہوں میں ——— چاکِ دلِ حیات سئے جا رہا ہوں میں (صفحہ ۳۵)

"نغماتِ غم" کے عام کرنے کے سبب "چاکِ دلِ حیات کا سلنا" ایک ایسی بعید از تصور اور نامانوس سی بات ہے، جسے سُن کر وجدان کو وحشت سی ہوتی ہے۔

دُنیا ہے خندہ زار مگر اے غمِ جہاں ——— پھر بھی تجھے تلاش کئے جا رہا ہوں میں (صفحہ ۳۵)

"غمِ جہاں" نے سارے شعر کو گنجلک بنا دیا، دُنیا کا "خندہ زار" اور پھر اس میں "غمِ جہاں" کی تلاش ایک عجیب سی بات ہے! اگر مطلق "غم" کہا جاتا تو یہ ابہام ایک حد تک دور ہو جاتا۔

خوشی منا نہ سکے تھے بہار آنے کی ——— کہ خاک ہو گئی ہر چیز آشیانے کی (صفحہ ۳۷)

یہاں "خوشی منانے نہ پائے تھے" کا محل تھا۔

لے "بادِ الم" آندھیاں لے کر اُٹھی تھیں اگر مراد ہو تو یہ بھی درست نہیں!

چارہ جسے پسند نہ آسودگی قبول　　دل کو ایک ایسا روگ لگا کر چلے گئے　(صفحہ ۴۸)

"چارہ" یہاں اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے، "درماں" کہنا چاہیئے تھا ــــــ اور شعر مضبوط اور مربوط اُس وقت ہوتا جب یوں کہا جاتا کہ دل کو نہ تو آسودگی ہی قبول ہے اور نہ اذیت اور بیقراری ہی گوارا ہے!

نئی راہوں، نئی دُنیا کے جن کو خواب آتے ہیں　　وہ دریا بھی کہیں آغوشِ ساحل میں سماتے ہیں　(صفحہ ۵۶)

اوّل تو "خواب نظر آتے ہیں" کہنا چاہیئے تھا "کیا مجھ کو غیب آتا ہے" یہ روزمرہ ضرور ہے! پھر دریاؤں کو نئی راہوں اور نئی دُنیا کے خواب نظر آنا خود اپنی جگہ ایک مُہمل سی بات ہے۔

وہاں کس بھروسہ پہ ہم مُسکرائیں　　گلوں کا جہاں خون پی لیں شعائیں　(صفحہ ۶۹)

شعاع کی جمع "شعاعیں" ہے مگر ادیب صاحب نے "شعائیں" باندھا ہے، غلط نامہ میں اس کی تصحیح سے کیا فائدہ جبکہ شاعر نے "آئیں" اور "بلائیں" کے ساتھ اسے نظم کیا ہے!

لاکھ حکیم مٹ گئے پر نہ یہ زخم بھر سکے　　لطفِ شکستگی اُٹھا، رنگِ شکستگی نہ دیکھ　(صفحہ ۷۰)

اُردو کی عام بول چال میں طبیب کو حکیم کہتے ہیں مگر علم و ادب اور شعر کی زبان میں حکیم اور طبیب میں فرق ملحوظ رکھا جاتا ہے جسے اس شعر میں نہیں رکھا گیا ــــــ "حکمائے یونان" سے "اطبائے یونان" لکھے پڑھے لوگ مُراد نہیں لے سکتے ــــــ فارسی کا مشہور شعر ہے

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب!
دردمندِ عشق را دارو بجز دیدار نیست،

یہاں "طبیب" صحیح استعمال ہوا ہے ــــــ علامہ اقبال کہتے ہیں ؎ لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف' یہ ہے "حکیم" کا محلِ استعمال! ــــــ اگر شاعر نے "حکیم" کو اس کے اصلی معنیٰ میں استعمال کیا ہے، تو پھر مصرعہ اولیٰ کی ساخت کچھ اور ہونی چاہیئے تھی۔

تیر و کماں جو عشق کو سونپے گئے اِدھر　　چہرے پہ زندگی کے اُدھر رنگ آگیا　(صفحہ ۷۳)

بالکل بے ربط شعر ہے "تیر و کماں" عشق کو آخر کب سونپے گئے تھے، یہ کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے! پھر ناوک فگنی حُسن کی خصوصیت ہو عشق کی نہیں ہے! نہ جانے شاعر کہنا کیا چاہتا ہے؟

جنوں اُبھر ہی گیا قیس و کوہکن بن کر　　دبا گیا مری دانائیوں کا بار مجھے　(صفحہ ۷۴)

پہلے مصرعہ میں اچھا خاصا اُٹھان تھا مگر دوسرے مصرعہ میں ایکا ایکی پستی پیدا ہوگئی، "دانائیوں کے بار کا دبا جانا" ترجمہ سا معلوم ہوتا ہے!

موجیں ہوں گی اثر انداز نہ طوفاں ہوں گے　　جن کو ہونا ہے پھر وہ کسی عنواں ہوں گے　(صفحہ ۸۲)

"کسی عنواں" کی جگہ "بہر عنواں" کہنا چاہیئے تھا۔

جو لوگ منصب یادیناں کو بھول گئے　　وہ لطفِ زندگیٔ جاوداں کو بھول گئے　(صفحہ ۹۱)

"منصب" یہاں بالکل "زائد" اور غیر متعلق ہے! "شیوہ" "لذت" یا اسی قبیل کا کوئی لفظ ہوتا تو شعر میں ایک ربط تو پیدا ہو جاتا۔

بجا کہ غمزۂ ساقی ہے نعمتِ ہستی　　مگر کسی کو گوارا یہ جام ہو تو سہی　(صفحہ ۱۰۹)

"گوارا" کی جگہ "میسر" ہوتا تو شعر صاف ہو جاتا ــــــ غمزۂ ہستی کو آخر لوگ (بادہ خوار) کیوں گوارا نہیں

کرتے، اُن کو یہ ناگوار کیوں ہے!

جی رہے ہیں گھر کے طوفانِ حوادث میں بھی ہم ۔۔۔ ہے ہماری زندگی کا لمحہ لمحہ محترم

قافیہ کی مجبوری اپنی جگہ مُسلّم مگر محل بیاں "قیمتی" اور "بیش بہا" اور گراں قدر" کا تھا

جناب ادیب سہارن پوری، غزل ہی نہیں "نظم" پر بھی قدرت رکھتے ہیں، اُن کی بعض نظمیں کافی جاندار ہیں، اُن میں جوش ہے، روانی ہے اور تفکر بھی ہے! اُن کی نظم "عقل و مذہب" کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ ہم —"بانگِ درا" کی کوئی نظم پڑھ رہے ہیں

؎ اہلِ صحت کے نگہبان "جذامی" تاکے!

کہ کر اُنھوں نے بہت کچھ کہہ دیا ہے، تنہا یہ مصرعہ اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے،

"ایک ملحد دوست سے" جس نظم کا عنوان ہے اُس کا خاتمہ کس قدر حقیقت آفریں شعر پر ہوا ہے:-

مریضِ کم نگہی کا علاج ہے اسلام
ترے لئے ہے اسی میں سلامتی کا پیام

صفحہ (۱۳۱) پر ایک نظم "اے قائداعظم" ہے جس کے ٹیپ کے بند بڑے پُرجوش ہیں

؎ ایک بگڑی ہوئی ملت کو سنوارا تو نے
ذرّے کو صورتِ خورشید اُبھارا تو نے

؎ جرأت آموز تما جوشِ عمل ہے تو ہے
اہلِ محنت کے پسینہ میں تری خوشبو ہے

اسی نظم کا ایک شعر ہے:-

شمعِ کعبہ ہے، چراغِ رہ طیبہ تو ہے
جو دل و جاں سے ہے پیاری وہ تمنا تو ہے

قائداعظم مرحوم کی شخصیت اپنی جگہ مُسلّم مگر "شمعِ کعبہ" کو پڑھ کر ہم یہ سمجھے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہو رہی ہے، فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے؟ کمال اتاترک نے ترکی کے مردِ بیمار کو "رستم و سہراب" بنا دیا وہ ایک تاریخ ساز قائد تھا لیکن ہم اُسے جنید و بایزید اور شیخ عبدالقادر جیلانی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی صف میں جگہ نہیں دے سکتے!

پے بہ پے چُومی نگاہوں نے جبینِ آبشار ۔۔۔ روح پر پڑنے لگی کیف و مسرت کی پھوار
جیسے امرت سامنے آسودگی میں گھل گیا ۔۔۔ روح پر فردوس کا گویا دریچہ کھل گیا (صفحہ ۱۳۶)

"امرت کا آسودگی میں گھلنا" کچھ سمجھ میں نہیں آیا، بعض وقت صرف ایک لفظ شعر کو بے جوڑ بنا دیتا ہے اور اس شعر میں لفظ "آسودگی" یہ کام انجام دے رہا ہے!

"حسین علیہ السلام" جس نظم کا عنوان ہے، اُس کے دو شعر ہیں:-

تیرا جنونِ کارساز، تیری شہادتِ عظیم ۔۔۔ چشم زدن میں کر گئی قصرِ یزیدیت تباہ
بازیٔ گرانِ عقل کو تو نے وہ مات دی کہ بس ۔۔۔ رہ گیا پیٹ پیٹ کے سر کو غرورِ عز و جاہ (صفحہ ۱۹۲)

"جنونِ کارساز" آخر کیا بات ہوئی؟ پھر حضرت حسینؓ کے جوشِ صداقت اور عزمِ شہادت کو "جنون" سے تعبیر کرنا بھی ٹھیک نہیں ——— دوسرے شعر میں "بازیٔ گرانِ عقل" کی "ی" کے دبنے پر صبر بھی کر لیا جائے مگر یہ دونوں مصرعے اس قدر پُھس پُھسے ہیں کہ اس نظم کے اچھے مصرعوں کا حُسن غارت ہوا جا رہا ہے!

عرفی شیرازی نے انسانوں کو اُن کے عیب اور کمزوریوں سے معلوم کرنے کا یہ گُر بتایا ہے کہ:—

گاہے منافقانہ نشیں در کمینِ خویش

مگر یہ ہے بڑا مشکل کام! اور خاص طور سے شاعر کے لئے جو اپنے ہر شعر کو "لختِ جگر" اور "پارۂ دل" سمجھتا ہے،

جناب ادیب سہارن پوری اشعار کے انتخاب میں زیادہ دقتِ نظر سے کام لیتے تو نگینے ہی نگینے رہ جاتے خزف ریزے باقی نہ رہتے ——— بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن میں کافی ابہام پایا جاتا ہے، تشریح کا موقع نہیں ہے کہ تنقید بہت زیادہ طویل ہو جائے گی، ہم صرف اشارے کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔

وہ رشک تھا کہ نگاہوں نے التفات نہ کی — ترس کے رہ گئیں رنگینیاں زمانے کی (صفحہ ۳۷)

کس کی نگاہوں نے التفات نہیں کیا؟ شاید محبوب کی نگاہ نے، تو پھر "رشک" کا یہاں کیا جوڑ ہے، کیا محبوب رشک کے مارے زمانہ کی رنگینیوں پر نگاہِ التفات نہ کر سکا ——— شاعر آخر کیا کہنا چاہتا ہے؟ اگر "نگاہِ عشق" مراد ہے تو بھی شعر صاف نہیں ہے!

تڑپنا اور منہ سے کچھ نہ کہنا دل لگی کیوں ہو؟ — یہ کہتے ہیں کہ اُن کو زحمتِ چارہ گری کیوں ہو (صفحہ ۵۰)

مفہوم ادا کرنے کیلئے خاطر خواہ الفاظ نہ مل سکے اور شعر گنجلک ہی نہیں بے مزہ بھی ہو گیا ——— "یہ" کا اشارہ کس کی جانب ہے، کچھ نہیں کھلتا!

حدودِ عام سے گزرا شعورِ نظارہ — غضب کہ پھول کے پہلو میں خار ہیں اب تک (صفحہ ۹۹)

حدودِ عام سے شعورِ نظارہ کے گزر جانے کا کیا یہ نتیجہ ہونا چاہیئے کہ پھول کے پہلو میں خار نہ باقی رہیں! شاعر شاید کہنا یہ چاہتا ہے کہ شعورِ نظارہ میں حسبِ نزاکت، کمال اور خصوصیت پیدا ہو جائے تو پھر نگاہ کو گل و خار میں امتیاز نہ کرنا چاہیئے ——— مگر شعر کے لفظوں سے یہ مفہوم کہاں ادا ہوتا ہے؟

مل بھی گئے تو آئیں گے وہ لوٹ کر کہاں — کیا جانے کھو گئی متعاقب نظر کہاں (صفحہ ۱۰۰)

افسوس ہے ہمارے پلے تو کچھ پڑا نہیں، شعر کا معمہ اور پہیلی بن جانا خوبی نہیں نقص ہے!

عشق بھی سلسلۂ زخمِ تمنا نہ نکلا — ہم تو سمجھے تھے مئے ہوش ربا ہوتا ہے (صفحہ ۱۰۸)

عشق کی یہ تعریف، کہ وہ "مئے ہوش ربا" ہوتا ہے، وجدان کے لئے اجنبی سی ہے،

بھول چوک کس سے نہیں ہوتی، بڑے بڑوں کے دامن بھی اس گرد سے پاک نہیں ہیں، مجموعی طور پر "رنگ و آہنگ" اُردو شعر و ادب کے سرمایہ میں اضافہ کرتا ہے، ہمیں یقین ہے کہ جناب ادیب سہارن پوری کے مجموعہ کلام کو قبول حاصل ہوگا اور اہلِ ذوق، شوق و دلچسپی کے ساتھ اسے پڑھیں گے!

حیاتِ اکبر

"حیاتِ اکبر" تسوید:— سید عشرت حسین مرحوم، ترتیب و تہذیب:— ملا واحدی دہلوی، ضخامت ۲۳۲ صفحے، لکھائی، چھپائی، کاغذ، جلد، ہر چیز اپنی جگہ خوب سے خوب تر! قیمت درج نہیں، شائع کردہ:— بزمِ اکبر کراچی!

بزم اکبر (کراچی) کی یہ تیسری ادبی پیش کش منظر عام پر آئی ہے، کتاب "GET UP" کے اعتبار سے الماری اور میز کی زینت بننے کی مستحق ہے، حضرت اکبر الہ آبادی کے فرزند سید عشرت حسین مرحوم کے لکھے ہوئے مسودہ کی ترتیب عبارت کو جناب علامہ محمود احمدی صاحب نے اس طرح بدلا ہے کہ اس "روایت بالمعنیٰ" میں مسودہ نگار کی کہی ہوئی کوئی بات واقعہ کے اعتبار سے تبدیل نہیں ہوئی، متن کے نیچے جابجا ضروری، مفید اور معلومات آفریں فٹ نوٹ بھی ہیں جو سید عشرت حسین کے علاوہ مولانا عبدالماجد دریابادی، خواجہ حسن نظامی اور علامہ احمدی صاحب کے لکھے ہوئے ہیں۔

یہ "باپ کی کہانی بیٹے کی زبانی" ہے، اس لئے مستند ہے، بعض گھریلو واقعات جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں کسی دوسرے اور باہر کے آدمی کو اُن کی ہوا بھی نہ لگتی، عشرت حسین مرحوم بہت صاف گو تھے اُنھوں نے خود اپنی زندگی کے ایک آدھ ایسے واقعہ کا بھی ذکر کر دیا ہے جسے کوئی اور ہوتا تو چھپا جاتا، اکبر الہ آبادی کے لطائف کا جہاں ذکر ہے وہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہے، یہ کتاب اکبر الہ آبادی کی زندگی کے کئی رُخ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے پیش کرتی ہے۔

حضرت اکبر الہ آبادی کے مکان کا نام "عشرت منزل" تھا، اس نام کی ترکیب میں اکبر کے ذہن ندرت آفریں نے جو نکتے پیدا کئے ہیں وہ بھی سُن لیجئے:-

"حضرت قبلہ (یعنی اکبر الہ آبادی) فرمایا کرتے تھے کہ عشرت منزل نام میں یہ گنجائش ہے کہ عشرت حسین اگر مفلوک الحال ہو جائیں تو صرف "شین" کے نقطے اُڑانے پڑیں گے اور عین کا زیر پیش سے بدل دیا جائے گا عشرت آسانی سے عُسرت بن جائے گا۔ اور عشرت حسین خدانخواستہ مرجائیں تو عشرت منزل کو عبرت منزل کہہ سکتے ہیں"

جب حضرت اکبر الہ آبادی پرتاب گڑھ تشریف لے گئے ہیں تو عقیدت مندوں کا اُن سے ملنے کے لئے تانتا بندھا رہتا، اس واقعہ کو ان لفظوں میں "خلقت کی رجوعات تھی" ادا کیا گیا ہے (صفحہ ۱۲۵)

"رجوعات" کان، زبان اور وجدان تینوں کو بھلا نہیں لگتا!

حضرت اکبر الہ آبادی کے انتقال پر تعزیت کے جو خطوط اور برقیے درج ہیں اُن میں حیرت ہے کہ دیوان سنگھ مفتوں ایڈیٹر اخبار "ریاست" کے دو سطری خط کو بھی جگہ دی گئی ہے، اگر عشرت حسین مرحوم کے اصل مسودہ میں یہ خط موجود تھا تو ترتیب اور نظر ثانی میں اس کو حذف کر دینا چاہیئے تھا۔

علامہ اقبال کا تعزیتی مکتوب عقیدت اور محبت میں ڈوبا ہوا ہے:-

"ابھی زمیندار (اخبار) سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مُرشد معنوی) کے انتقال پُرملال کی خبر معلوم ہوئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، اس بات کا ہمیشہ قلق رہے گا کہ اُن سے آخری ملاقات نہ ہو سکی، میں اور میرے ایک دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو اُن کی زیارت کے لئے الہ آباد کا سفر کریں، اُنھوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا تھا کہ "امسال ضرور ملنا، بعض باتیں ایسی ہیں کہ خطوط میں نہیں سما سکتیں" میری بدنصیبی ہے کہ میں اُن کے آخری دیدار سے محروم رہا —— ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی —— اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیا میں کسی قوم کے ادبیات کو اکبر نصیب نہیں ہوا، فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بڑی بخیل ہے، زمانہ سیکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب آکے ایک اکبر اس کے ہاتھ آتا ہے۔ . . . . (۱۲ ستمبر ۱۹۲۱ء)

چودھری نذیر احمد صاحب، "بزم اکبر" کے بانی اور صدر ہیں اور جو ابھی چند دن پہلے حکومت پاکستان کے "عزت مآب وزیر" تھے، اُن کے بھی چند تعزیتی خطوط اس کتاب میں درج ہیں، جن سے اکبر کے ساتھ موصوف کی غیر معمولی عقیدت، وابستگی بلکہ کمال درجہ کی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے مگر ان خطوں کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہے!

صفحہ (۵۶) پر "نقاہت" کو "نقاحت" صفحہ (۱۳۰) پر "منحنی" کو "منہنی" صفحہ (۱۴۲) پر "زعم" کو "ضعم" اور صفحہ (۱۶۷) پر "بہ نحوا" کو "بنفہوا" لکھا ہے، کتابت کی یہ غلطیاں افسوسناک ہی نہیں شرمناک بھی ہیں، "حیاتِ اکبر" کے جو نسخے اسٹاک میں ہوں اُن میں ان لفظوں کو پہلی فرصت میں درست کر دینا چاہیئے!

اس کتاب کے پڑھنے سے پہلی بار اس کا علم ہوا کہ جناب سردار عبدالرب نشتر وزیر پاکستان اپنے کلام پر حضرت اکبر الہ آبادی سے اصلاح لیتے تھے ——— "حیاتِ اکبر" پڑھنے کی چیز ہے اکبر کے کلام کے شیدائیوں اور اُن کے سوانح نگاروں کو اس کتاب سے بہت کچھ روشنی ملے گی،

اشتراکیت مذہب اور اخلاق

"اشتراکیت مذہب اور اخلاق" از:- نذر محمد خالد، صفحات ۱۴۹، طباعت وکتابت دیدہ زیب، سرورق رنگین، قیمت ایک روپیہ دو آنہ، ملنے کا پتہ:- مکتبہ چراغِ راہ، ۹ لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ، کراچی ۱

ڈیڑھ سو صفحے کی اس کتاب کے لئے فاضل مصنف نے دو چار نہیں پینتیس[۳۵] کتابوں سے استفادہ کیا ہے، یوں سمجھئے کہ ہزاروں صفحوں کا نچوڑ اس کتاب میں موجود ہے، استدلال کے ساتھ تاریخی اور تحریری حوالے بھی درج ہیں جن سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ "اشتراکیت" اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے مذہب اور اخلاق کی مخالف اور دشمن واقع ہوئی ہے، اس کتاب کو پڑھ کر اشتراکیت کے صحیح خدوخال نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، اس موضوع پر یہ کتاب بہت خوب ہے، مصنف کی یہ علمی اور اخلاقی خدمت تحسین وستائش اور تبریک کی مستحق ہے،

مسئلہ انتخابات اور مسلمانانِ ہند

"مسئلہ انتخابات اور مسلمانانِ ہند" (حصہ اول) از:- مولانا ابواللیث اصلاحی، ضخامت ۱۱۱ صفحے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ جماعتِ اسلامی ہند رام پور (یو-پی)

ہندستان کے مظلوم مسلمانوں کو آئے دن نئے نئے صبر آزما حالات کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، ہر طلوع ہونے والی صبح اُن کے درد وغم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر دیتی ہے، اب وہاں انتخابات کا ہنگامہ برپا ہونے والا ہے، جماعتِ اسلامی ہند کی یہ رائے ہے کہ انتخابات کے اس ہنگامہ میں مسلمانوں کو حصہ لینا نہ چاہئے، یہ کتاب اسی موضوع پر ہے اور جہاں تک فکر و نظر اور استدلال کا تعلق ہے بہت خوب کتاب ہے!

اس ضمن میں کچھ فقہی بحثیں بھی آگئی ہیں، "تعامل" کے سلسلہ میں فاضل مصنف نے کس قدر اچھی بات کہی ہے۔

——— "دین میں بلاشبہ "تعامل" کے اعتبار کا ایک درجہ ہے لیکن اس کے لئے اولین شرط دین کی مطابقت ہے اگر ایسا نہ ہو تو یہ کوئی چیز نہیں ہے خواہ اس میں مبتلا ہونے والے کیسے ہی لوگ کیوں نہ ہوں، مومن صرف اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند ہے دوسروں کی اطاعت اور پیروی اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس وقت جب وہ اس سے متصادم نہ ہو رہی ہو اور صرف اس شرط کے ساتھ شریعت نے دوسروں کی اطاعت و اتباع کی اجازت دی ہو (صفحہ ۶۸، ۶۹)

مولانا ابواللیث اصلاحی کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اظہارِ حق کے لئے کھول دیا ہے اور وہ ہندستان میں احمد بن حنبلؒ

اور ابنِ تیمیہؒ (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے مسلکِ حق گوئی کی تجدید کر رہے ہیں، اُن کی دینی خدمات ہمارے لئے قابلِ رشک ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مدد اور حفاظت فرمائے!

ادارۂ الحسنات کا اصلاحی لٹریچر

(۱) قاعدہ ۳۲ صفحے، قیمت تین آنہ (۲) پہلی کتاب، ۳۲ صفحے قیمت تین آنہ (۳) دوسری کتاب ۳۲ صفحے قیمت تین آنہ (۴) تیسری کتاب ۳۲ صفحے قیمت تین آنہ (۵) "سورج کا پیام" ۳۲ صفحے قیمت پانچ آنہ (۶) "عید کا تحفہ" (حمیدہ بیگم صاحبہ بی۔اے) ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۷) "پنیچر والے" ۳۲ صفحے، قیمت پانچ آنہ (۸) "گاؤں والے" ۳۲ صفحے قیمت چار آنہ (۹) "غار والے اور مچھلی والے نبیؑ" ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۱۰) "سچ ہے بھئی سچ ہے" ۳۲ صفحے قیمت چار آنہ (۱۱) "تبدیلی اور آپا کی آپ بیتی" ۳۲ صفحے قیمت چار آنہ (۱۲) "اصمعی کا چورن" (عاصی ضیائی رام پوری) ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۱۳) "بیٹے کو نصیحت" (حضرت لقمان کا وعظ) ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۱۴) "کون ہے راجا" ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۱۵) "ہدیہ" (حمیدہ بیگم صاحبہ بی۔اے) ۳۲ صفحے قیمت چار آنہ (۱۶) "مجاہد کی ڈائری" ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۱۷) "انسان کی کہانی" (ابوسلیم محمد عبدالحیٔ) قیمت فی جلد غیر مجلّد، (علاوہ محصول ڈاک) بارہ آنہ ——

—— ملنے کا پتہ :- مکتبہ "الحسنات" رام پور (یو۔پی) (بھارت)!

ادارۂ "الحسنات" (رام پور) اپنی خالص دینی اور علمی خدمات کے سبب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، اس ادارہ کے کارکنوں کی ہر جنبشِ قلم اللہ کے دین کی خدمت کے لئے وقف ہے، ان نیک لوگوں نے اللہ کے دین کو پھیلانا اور نظامِ حق کے قیام کیلئے کوشش کرنا ہی اپنی زندگی کا واحد مقصد بنالیا ہے۔

سترہ کتابوں کا یہ سٹ ادارۂ "الحسنات" نے مرتب کر کے اُردو جاننے والوں کے سامنے پیش کیا ہے، کتابیں بچّوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہیں، زبان آسان، سلیس اور بہت سہل ہے، اندازِ بیان اتنا دل نشین بلکہ اچھوتا ہے کہ بچے ایک ایک سطر میں دلچسپی اور کشش محسوس کریں گے، قصّوں کہانیوں میں دین کی، اخلاق کی اور اللہ رسول کی باتیں بیان کر دی ہیں، بعض کہانیاں قرآنِ کریم سے ماخوذ ہیں، کتابوں کے آخر میں مآخذ آیتیں بھی ترجمہ کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں۔

جناب ابوسلیم محمد عبدالحیٔ نے کس قدر دل میں اُتر جانے والے انداز میں ڈاروِن کے نظریہ کی کمزوری دکھائی ہے اور "تخلیقِ کائنات" کے مسئلہ کی قرآن کی روشنی میں تشریح کی ہے، یہ کتابیں ہر گھر میں بار پانے کی مستحق ہیں۔ ان کو پڑھ کر بچوں کی فکر و نظر اور کیریکٹر کی اسلامی طرز پر تشکیل ہوگی —— اِن کتابوں کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی خوب ہے، سرورق رنگین و دلکش اور "تصویر کی لعنت" سے پاک ہیں، بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں یہ دلیل ہے اِن کی مقبولیت اور پسندیدگی کی!

اُن علماء کو کیا کہئے جو اتنے اچھے لوگوں کے کام کو شبہ اور حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور خدمتِ دین کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں جن سے اُمید تھی کشتی دین کی پتواروں کو چلانے اور بادبان کو تھامنے کی، وہی اُس میں "مدافعتِ دین" کے نام پر چھید کرنے کی فکر میں ہیں —— مگر کوئی کتنا ہی بُرا مانے اللہ کے دین کا کام رُکے گا نہیں! ادارۂ "الحسنات" کے کارکنوں کیلئے دعائیں، تمنائیں اور تبریک و تہنیت!

؎ "بے پروا" کو جگہ جگہ "بے پرواہ" لکھا گیا ہے، اس کی آئندہ ایڈیشنوں میں تصحیح کر دینی چاہیئے نہ جانے یہ بات کیسے چل پڑی کہ بعض لوگ "پروا" کو "پرواہ" اور "گوارا" کو "گوارہ" لکھنے لگے ہیں!

فاران

ماہر القادری

جلد ۳ ——— شمارہ ۱۱

ماہنامہ

فاران

فروری ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ آنے
۸ روپے (ہندستانی) فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

حصۂ نظم:-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نقشِ اوّل

جو کوئی "اِسلام" کی عمر ساڑھے تیرہ سو سال کی بتاتا ہے وہ حقیقت میں شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے، اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے، یہ "دینِ فطرت" ہے، پس دُنیا میں جس دن سے بھی انسانی زندگی کا وجود ملتا ہے، ٹھیک اُسی دن سے "اسلام" بھی پایا جاتا ہے، دُنیا کا سب سے پہلا انسان "مُسلم" ہی تھا ـــــــ اسلام کے آخری پیغمبرؐ نے اسی لئے تو فرمایا ہے کہ جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے فطرت (اسلام) ہی پر پیدا ہوتا ہے، (یہ اُس کے) والدین (اور سرپرست) ہیں جو اُسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔

جس اللہ نے ارض و سمٰوات کو خلق کیا وہی اللہ اسلام کا "بانی" ہے، اسلام کی بنا مخلوق نے نہیں خود خالق نے رکھی ہے، جس طرح کائنات کی ہر شے کیلئے فرض و عمل کی ایک حد مقرر کی گئی ہے، ٹھیک اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے جمادات، نباتات اور حیوانات کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ دستورِ حیات اور نظامِ عمل مقرر فرمایا ـــــــ اور وہ "اسلام" ہے! پس دُنیا میں جہاں بھی اور جب بھی جو نبی، رسول، پیغمبر اور مُصلح آیا وہ "اسلام" ہی کا پیام لیکر آیا اور ہر مقدس صحیفہ اور ہر آسمانی کتاب حقیقت میں اسلام ہی کی کتاب تھی، اور ان صحیفوں اور کتابوں کے وہ اجزاء جو محرفین کی دست برد سے بچ گئے ہیں در اصل "اسلام" ہی کی ترجمانی کرتے ہیں، ہم اُن سب پر ایمان لاتے ہیں اور اُن کی تصدیق کرتے ہیں۔

وحی و ہدایت اور دینِ اسلام کا یہ مقدس سلسلہ جو انسانی پیدایش کے پہلے دن سے چلا آرہا تھا، اُس کو محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ذاتِ گرامی پر تمام فرما دیا گیا، نبوت کے قبالہ اور رسالت کے منشور پر آخری مُہر ثبت کر دی گئی، اب نہ آسمان سے کوئی صحیفہ نازل ہوگا، نہ کسی نبی کی بعثت ظہور میں آئے گی، توحید و اسلام کی ازلی و ابدی بُنیادی تعلیمات کے ساتھ محمد رسول اللہ جو شریعت اور

قانونِ زندگی لیکر آئے تھے اُسی کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے پسند فرمایا اور اللہ کی پسند سے بہتر پسند اور اللہ کے انتخاب سے بہتر انتخاب اور کس کا ہو سکتا ہے۔

قرآن ہر اُس تمدّن، تہذیب اور طریقِ فکر و عمل کو جو غیر اسلامی ہے "جاہلیت" کے نام سے پکارتا ہے اور وہ اس لئے کہ اسلام سراسر "علم" ہے اور اُس کے خلاف جو طریقہ بھی پایا جاتا ہے وہ یکسر "جہل" ہے، کلدانیوں مصریوں اور رومیوں کے یہاں بلند پایہ شاعر، سحر بیان خطیب، نکتہ شناس مقنن، معرکہ آراء سپہ سالار، خوش آواز مُغنی، باکمال رقاص اور مُطرب موجود تھے، وہ اچھے سے اچھا کھانا کھاتے اور بہتر سے بہتر لباس پہنتے تھے، اُن کے شہروں میں مُصفا سڑکیں، خوشنما باغیچے، دیدہ زیب عمارتیں اور پُر لُطف سیر گاہیں بھی تھیں، لیکن یہ سب کچھ ہونے اور رکھنے کے باوجود اُن کا تمدّن جاہلانہ تمدّن تھا کہ اُس کی بُنیاد اسلام پر نہ تھی۔

عرب کی بے برگ و گیاہ وادی میں رومتہ الکبریٰ اور بابل کے تمدّن کی بوقلمونیاں نہیں تھیں مگر یہ بھی نہیں ہے کہ عربوں پر تہذیب و تمدّن کا آفتاب سرے سے طلوع ہی نہیں ہوا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کے جس دور کو "عہدِ جاہلیت" کہا جاتا ہے، اُس دور میں عربوں کی شاعری اور خطابت کا دُنیا بھر میں کہیں جواب نہ تھا، اُن کو اپنی گویائی اور تکلّم و فصاحت پر اس قدر ناز تھا کہ ساری دُنیا کو وہ بے زبان اور گونگا سمجھتے تھے، وہ بہادر اور تلوار کے دھنی بھی تھے، اُن کے یہاں نمائشیں اور بازار بھی لگتے تھے، وہ ناچنا اور گانا بجانا بھی جانتے تھے، دُنیا کے ملکوں سے اُن کے تجارتی تعلقات بھی تھے، اپنے قبیلوں اور جرگوں کے قانون اور رسم ورواج کا وہ احترام بھی کرتے تھے، اُن کی تاریخ میں حاتم طائی جیسے سخی کا نام بھی ملتا ہے، مذہبی رسوم اور پُوجا پاٹ سے بھی وہ ناآشنا نہ تھے، کعبہ کا طواف بھی کرتے تھے اور مہمانوں کو کھانا بھی کھلاتے تھے، اُن کے امیروں کے گھر کی دیواروں پر یمن کی چادریں اور قباط کے پردے بھی لٹکے رہتے تھے، وہ شراب بنانا اور لُطف لے لیکر پینا بھی جانتے تھے ——— مگر تہذیب و تمدّن کے ان لوازم کے باوجود اُن کا تمدّن "جاہلیت" کا آئینہ دار تھا، اُن جاہلوں کو "عالم" تو اسلام نے بنایا، اُن کو رچشموں کو بصیرت تو قرآن نے عطا کی، اُن گم کردہ راہوں کو سیدھی راہ تو محمد رسول اللہ نے دکھلائی۔

اسلام کے بعد عرب میں ایک عجیب انقلاب ظہور میں آتا ہے، اب اہلِ عرب کے یہاں نہ شاعروں کے پہلے سے جمگھٹے نظر آتے ہیں، نہ گانے بجانے کی محفلیں جمتی ہیں، نہ مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط پایا جاتا ہے نہ شراب کے پیالے کھنکتے ہیں، نہ نسب ناموں پر فخر کیا جاتا ہے، نہ شرط بد کر گھوڑے دوڑائے جاتے ہیں، نہ کاہنوں کی "غیب دانی" پر کوئی یقین رکھتا ہے، اس لئے کہ "جہالت" کا دور ختم ہو چکا اب "علم" کا دور دورہ تھا اور علم اپنے جلو میں نیکی، بھلائی، شرافت اور غیرت ہی لیکر آتا ہے۔

علم و جہالت کا جو معیار حضرت موسیٰ، اور حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت عیسیٰ اور دوسرے انبیا (علیہم السلام) کے عہد میں تھا اور جس معیار کی زبان سے تصدیق اور عمل سے تائید سیدنا محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کیا وہ معیار اب بدل گیا؟ نہیں بدلا، ہرگز نہیں بدلا، اللہ کا مقرر کیا ہوا معیار بدلا نہیں کرتا، ہاں! یہ ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے کہ لوگ بدل جاتے ہیں، فطرتیں مسخ ہو جاتی ہیں اور ذہن اُلٹ

جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔!

ع لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی!

علم و جاہلیت کے جس فرق اور جس معیار کا ابھی ابھی ذکر کیا گیا ہے، اُس کے اعتبار سے آج کی دُنیا کتابوں کی کثرت، تعلیم کی فراوانی، سائنس کی ترقی اور تہذیب کی رنگارنگی کے باوجود "جاہلیت" کی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے، اُس کے پاس معلومات، ایجاد و اختراع اور تعلیم و اطلاع کے ذرائع موجود ہیں مگر "علم" نہیں ہے اور علم کہاں سے ہوتا جبکہ "اسلام" جو "جاہلیت" کی ضد اور سرتاسر علم ہے، اُس سے دوری، بیزاری اور بیگانگی پائی جاتی ہے۔

گزشتہ "عہدِ جاہلیت" میں لوگ درختوں کے پتّے نہیں کھاتے تھے اور نہ پیروں کے بدلے ہاتھوں سے چلا کرتے تھے، وہ زراعت بھی کرتے تھے، اُن کے یہاں تجارت بھی ہوتی تھی، صنعت و حرفت سے بھی واقف تھے، اُن کے پاس حکومت، اقتدار اور جاہ و دولت بھی تھی، وہ ذوقِ جمال بھی رکھتے تھے، یہ سب کچھ تھا مگر "علم" (اسلام) اُن کے پاس نہ تھا اس لئے وہ "جاہلیت" کی نمایندگی کر رہے تھے ——— اور آج بھی تجارت کی منڈیوں، سیاست کے ایوانوں، معیشت کے بازاروں اور شعر و ادب کے اداروں میں "جاہلیت" ہی کا پرچم لہرا رہا ہے، وہ "جاہلیتِ اولیٰ" تھی یہ "جاہلیتِ ثانیہ" ہے، کمیت کا فرق تو ضرور رہا ہے مگر کیفیت وہی ہے، "جاہلیت" چاہے کسی زمانہ میں اور کسی شکل میں پائی جائے اپنے مزاج کے اعتبار سے مختلف نہیں ہوتی۔

آج جاہلیت پورے زور کے ساتھ اُبھر رہی ہے اور اُس کے ساتھ بہت سے فرعون اور نمرود بھی اُبھر رہے ہیں، اقبالؔ یہی حال دیکھ کر تو چیخ اُٹھا تھا

ع یہ دور اپنے براہیمؑ کی تلاش میں ہے!

"جاہلیت" کا بحرِ احمر، نیل آج پھر "ضربِ کلیمی" کا مُنتظر ہے، چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی پھر ستیزہ کار ہے، سچّائی کی راہ میں آج بھی کانٹے بچھائے جا رہے ہیں، راست بازی آج بھی مکر و دغا کے "طائف" میں ظلم کے پتھروں سے "زخمی" کی جا رہی ہے، صداقت کو "شعبِ ابی طالب" میں آج بھی جاہلیت کے علمبرداروں نے محصور کر رکھا ہے۔

پس دُنیا کی زمامِ کار جب "جہلا" اور "سُفہا" کے ہاتھ میں ہو، اُن کے ہاتھ میں جو علم و صداقت سے کوسوں دُور ہیں، تو پھر دُنیا میں امن و عافیت کا قیام ہو کس طرح سکتا ہے، انسانیت کو اطمینان کی سانسیں میسر کیوں آنے لگیں، پراگندگی، انتشار، لاقانونیت، بے امنی، فتنہ و فساد، اور مار دھاڑ تو جاہلیت کے مظاہر اور لازمی نتائج ہیں، ببول کے درخت چاہے زعفران کے کھیتوں میں کیوں نہ اُگیں اُن سے لالہ و گُل تو پیدا ہونے سے رہے، کانٹے ہی پیدا ہوں گے۔ دُنیا نے جو کچھ بویا تھا اُسے وہ کاٹ بھی رہی ہے ——— پھر یہ چیخ پکار، یہ واویلا، یہ شور و شر اور یہ احتجاج کس لئے ہے، اس دَور کے انسانوں نے جاہلیت کے علمبرداروں کو قیادت اور پیشوائی کا مقام خود ہی تو عطا کیا ہے اور اُن کی اطاعت کے قلادے اپنی گردنوں میں اپنی خوشی سے ڈالے ہیں، اس کے نتائج بھی اُنھی کو بھگتنے ہوں گے اور وہ بھگت رہے ہیں۔

صُلح کانفرنسوں اور اسلحہ پر پابندی کی اسکیموں سے نہ جنگیں رُک سکتی ہیں اور نہ امن قایم ہو سکتا ہے،

یہ سب دکھاوے کی باتیں اور فریب کی چالیں ہیں، بڑے بڑوں کے دلوں میں کھوٹ اور نیتوں میں فساد موجود ہے، مجلسِ اقوام متحدہ کی شیشہ بازی اور شعبدہ گری ہم کئی سال سے دیکھ رہی ہیں، کشمیر اور فلسطین کے مسائل میں مجلسِ اقوام نے جو روش اب تک رہی ہے وہ ہر کس و ناکس پر ظاہر ہے، سب طاقت کا ساتھ دیتے ہیں، کمزور کی کوئی نہیں سنتا، مجلسِ اقوام ظالموں اور فتنہ پردازوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے ——— "جاہلیت" چالباز، ریاکار، نامنصف اور بے ضمیر بھی تو ہوتی ہے۔

"جاہلیت" کا ایک کمال شعبدہ گری یہ بھی ہے کہ وہ "بُرائی" کو انسانوں کی نگاہ میں حسین اور محبوب بنا دیتی ہے، آج رقص، مصوری، بت گری، قمار بازی، اداکاری اور اس طرح کی تمام "بازیاں" آرٹ سمجھی جاتی ہیں اور اُن کے کرنے والے "آرٹسٹ" کہے جاتے ہیں، اسی جاہلیت نے زر و مال کو عزت کا معیار بنا دیا ہے، ایک شخص بدکار ہو، رشوت خوار ہو، بے ایمان اور پرلے درجہ کا خائن ہو مگر اُس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہو، سب اُس کی عزت کریں گے، قومی جلسوں کی صدارتیں اُسے دی جائیں گی، اُس کے مجسمے چوراہوں اور پارکوں میں نصب ہوں گے، جاہ و اقتدار کی کرسیاں اُسے ملیں گی۔

آج دنیا میں، اُس لٹریچر کی مانگ ہے جو جاہلیت کی زیادہ سے زیادہ نمایندگی کرتا ہے، جس میں فحش مضامین اور سفلی جذبات کو بھڑکانے والی نظمیں ہوں، رسالے یا کتاب پر کسی خوبصورت اور جوان عورت کی رنگین تصویر چھاپ دیجئے، پھر دیکھئے کہ رسالے اور کتاب کی بکری اور مانگ کا کیا عالم رہتا ہے، آدمی خواہشوں کا بالکل غلام بن کر رہ گیا ہے، اپنا آگا پیچھا اُسے سوجھتا ہی نہیں، جسے اللہ کا خلیفہ اور نائب بننا چاہیئے تھا وہ شیطان کا ایجنٹ بن گیا ہے!

کیا کریں؟

جب دنیا اور اہلِ دنیا کی یہ حالت ہے تو آخر کیا کریں؟ کیا یوں ہی چپ چاپ بدی اور فتنہ وفساد کے ڈرامہ کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہیں یا "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر عمل پیرا ہو جائیں، یہ دونوں باتیں ممکن ہیں بلکہ بہت آسان ہیں، آپ تماشائی بھی بن سکتے ہیں اور جاہلیت سے ساز باز بھی ہو سکتی ہے، مگر پھر آپ کو جاہلیت کے خلاف احتجاج کرنے کا حق نہیں ہے ——— لیکن آپ ایمان داری کے ساتھ جاہلیت کے اس تمام کاروبار کو غلط، مضر اور گمراہ کُن سمجھتے ہیں تو پھر آپ کا مسلک "زمانہ بساز" کی جگہ "زمانہ ستیز" ہونا چاہیئے!

اربابِ عزیمت حالات کی ناسازگاری سے گھبرایا نہیں کرتے، حوصلہ مند انسانوں کی تگ و تاز اور ہمت میں مخالفتوں کو دیکھ کر اور جان پڑتی ہے، مریض چاہے نزع کے عالم ہی میں کیوں نہ ہو، طبیب کا فرض ہے کہ وہ اُس کے علاج میں کوتاہی نہ کرے، اُس کا کام مریض کو شفا دینا یا زندگی بخشنا نہیں بلکہ اُس کا علاج معالجہ کرنا ہے ——— حالات بدلیں یا نہ بدلیں آپ کو تو اپنی کوشش جاری رکھنی چاہیئے، آپ اپنے فرض سے غفلت نہ برتیے، مشیت کو جو بھی منظور ہو گا وہ ہو جائے گا اور ہوتا رہے گا آپ سے قیامت کے دن پرسش آپ کے فرض کے بارے میں ہو گی۔

بڑے کم ہمت اور بزدل ہیں وہ لوگ جو حالات کی نامساعدت اور ماحول کی ناسازگاری کو دیکھ کر

یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ " ہمارے کرنے سے بھئی ! کیا ہوگا" ؟ یہ نفس کا بہت بڑا فریب ہے " کیا ہوگا ؟ " کی ذمہ داری آپ سے متعلق نہیں ہے ، " کیا کرنا چاہیئے " کا فرض آپ کے ذمہ ہے اور یہ فرض اُس حالت میں بھی پُورا ہونا چاہیئے ، جب روئے زمین پر صرف آپ کی تنہا ذات کے سوا ، ایک متنفس بھی آپ کا ساتھی اور ہم نوا نہ ہو -

" جاہلیت " کا توڑ صرف " علم " ہے اور " علم " اسلام کے طریقِ فکر و حیات کا نام ہے ، پس " جاہلیت " کا تختہ اُلٹنے کی ذمہ داری دُنیا کے تمام مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے ، جو مُسلمان جہاں بھی اور جس حال میں بھی ہو اُسے اللہ کے دین کو غالب کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ، اور اس کوشش کا پہلا قدم اپنی ذات کو بنانے کی ضرورت ہے ، ہر شخص پہلے اپنے نفس کا جائزہ لے اور اپنی زندگی پر احتساب کرے کہ خود اُس کے اندر " جاہلیت " کے آثار تو نہیں ہیں ؟ اگر ہیں تو اُن کو مٹا دینا چاہیئے ، یہ ہوگیا تو پھر انشاء اللہ جاہلیت کے دوسرے مورچے رفتہ رفتہ سر ہوتے چلے جائیں گے ، سچائی بہت دن تک مظلوم اور مجبور نہیں رہ سکتی ، اُسے ایک نہ ایک دن اُبھرنا اور چھا جانا ہے ، ہم کہتے ہیں کہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی سعادت ہمیں کو کیوں نہ نصیب ہو ، جاہلیت کی شکست کا سہرا ہمارے سر ہی کیوں نہ رہے اور " شہداء علی الناس " کے خطاب کے مصداق اور سزاوار ہمیں کیوں نہ بن جائیں ——

پچھلی جاہلیتوں کو شکستیں ، فرشتوں نے نہیں انسانوں ہی نے دی تھیں ، وہ بھی بے سر و سامان تھے ، اور ایک زمانہ اُن کا مخالف تھا ، حالات کی ناسازگاری کا قدم قدم پر اُن کو سامنا کرنا پڑا مگر اُن کو اپنے اللہ پر اعتماد تھا ، اُن کا سہارا خدا کی ذات تھی ، تاریخ شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی مدد فرمائی اور وہ کامیاب ہوئے ، اور اس طرح کامیاب ہوئے کہ عزتوں نے اپنے پرچم اُن کے سروں پر کھول دیئے تھے اور اقبال مندیاں اُن کے پاؤں چومتی تھیں ———— اللہ کی نصرت آج بھی سر فروش مجاہدوں اور حق و صداقت کے علمبرداروں کی راہ دیکھ رہی ہے ، جاہلیت کو مٹانے اور نظامِ حق کے قایم کرنے کے لیے خدا کے جو نیک بندے اُٹھ چکے ہیں اُن کی مساعدت کی ضرورت ہے ، جس سے جو بھی ہو سکتا ہے وہ کر گزرے ، زندگی کا کوئی بھروسا نہیں نہ جانے کب موت کا قاصد آ پہونچے اور کس وقت دم نکل جائے ، زندگی کی وہی ساعتیں حقیقت میں معتبر ہیں جو اللہ کے راستے میں بسر ہوئی ہوں ، افسوس اُن پر جو ہنوز غفلت کی نیند سو رہے ہیں اور مژدہ اُن کو جن کے قدم اللہ کے راستے میں غُبار آلود ہو رہے ہیں ——!

ماہر القادری
۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء

ترجمہ:-

محب الدین الخطیب

فقہ ـــــ اسلام میں

"صاحبِ مضمون محب الدین الخطیب دمشق کے رہنے والے اور عربی زبان کے مشہور اہلِ قلم ہیں۔ ان کا خاندان دمشق کے مشہور علمی خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی نشوونما بیسویں صدی کے آغاز میں ہوئی جب کہ ترکی اقتدار کے خلاف عربوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ محب الدین الخطیب نے بھی عرب نوجوانوں کی قومی سرگرمیوں میں پُرجوش حصّہ لیا تاہم خاندانی تربیت اور ابتدائی ٹھوس دینی تعلیم کی وجہ سے وہ عربی قومیت کے سیلاب میں بہہ جانے سے بچ گئے اور اپنی طویل جدوجہد کی ہر منزل میں اسلامی نقطۂ نظر کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر جب عربوں کا خوابِ آزادی موہوم ثابت ہوا اور عرب لیڈروں کی صف میں ابتری پھیلنے لگی، تو محب الدین الخطیب مصر منتقل ہو گئے اور قاہرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہیں سے ان کی زندگی کا اصلی کام شروع ہوتا ہے۔ قومیت اور وطنیت کی تحریکوں میں اُلجھنے اور دُنیا کے سرد و گرم چکھنے کے بعد اب وہ اس نتیجے پر پہونچ چکے تھے کہ مسلمانوں کے تمام سیاسی اور اجتماعی امراض کا ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے پُورے کا پُورا اِسلام، اس مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے ایک مسلسل جدوجہد شروع کر دی اور آج سے پچیس[۲۵] سال پہلے مشہور ہفتہ وار اخبار "الفتح" جاری کیا۔ جس نے جلد ہی دُنیائے اسلام میں اپنا ایک مرکزی مقام پیدا کر لیا۔ الفتح کے لکھنے والے دنیائے اسلام کے ممتاز ترین افراد تھے، اور اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ بھی پُورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا تھا۔ مصر کی اکثر دینی اور تہذیبی تحریکیں اسی کی آغوش میں پروان چڑھیں۔ جمعیتہ الشبان المسلمین کا گویا یہ آرگن ہو گیا تھا۔ الاخوان کے ابتدائی دور میں بھی الفتح نے اس کی بڑی مدد کی۔ خلاصہ یہ کہ الفتح ایک مستقل "مکتبِ فکر" بن گیا تھا۔ اس کی بدولت دُنیائے اسلام کے مختلف حصّوں میں اچھے لکھنے والے اور سوچنے والے اُبھرے اور اپنی اپنی جگہوں پر اسلامی فکر کے علم بردار بنے۔ اب چند سال سے الفتح بند ہو اور محب الدین خطیب اپنے علم

اور تجربوں سے الاخوان المسلمون کی تائید اور ان کی دعوت کی علمی تشریح و توضیح میں مصروف ہیں۔ زیر نظر مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

شہید راہ حق مرحوم حسن البنا نے اپنی شہادت سے کچھ پہلے ایک علمی ماہانہ رسالہ الشہاب کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس کے صرف پانچ نمبر ہی شائع ہو سکے تھے کہ وہ بساط ہی اُلٹ گئی۔ یہ مضمون اسی مرحوم الشہاب کے پہلے نمبر میں شائع ہوا تھا۔ بات پر بات نکلتی ہے، ہمارے مخلص دوست سعید رمضان نے جو مرحوم الشہاب کے منیجر تھے المسلمون کے نام سے، قاہرہ سے نیا ماہنامہ جاری کیا ہے۔ جو ہو بہو الشہاب کا چربہ ہے ابھی ربیع الاول میں اس کا پہلا نمبر شائع ہوا ہے اور توقع ہے کہ اس سے الشہاب کی روایات زندہ رہیں گی"

(مولانا مسعود عالم ندوی)

"فِقہ" کا لفظ عربی قدیم میں "پھاڑنے" اور "کھولنے" کے معنوں میں ملتا ہے۔ پھر عربوں نے اس کو وسعت دی اور معنی کی اس "مادی" نوعیت کو "فکری اور معنوی" حیثیت میں بدل دیا، اور کسی خیر کے "معنی" کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کے لئے بولنے لگے۔ فکر و تحقیق اور غور و تأمّل سے کسی چیز کے دقیق مقاصد کا پتہ لگانے کے لیے، جس کا ظاہری اور سرسری نظر میں ہم ادراک نہیں کر سکتے "فقہ" کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔ یہی اصل ہے کہ لفظ "فقہ" "ذہانت و فطنت" اور "فہم و ادراک" کا ہم معنیٰ ہو گیا۔

"فقہ" کے یہی آخری معنیٰ تھے جو اسلام کے ابتدائی دَور میں لفظ "فقہ" سے سمجھے جاتے تھے۔ ہر وہ چیز جس سے نصوص کی روشنی میں مقاصدِ شریعت پر استدلال ہوتا ہو اور نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے مقاصد اور اوامر و نواہی کی تفصیلات معلوم کی جائیں "فقہ" کی تعریف میں داخل تھی۔ سُنن ترمذی اور مسند امام احمد بن حنبلؒ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو سُنن ابن ماجہ میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور صحیحین اور مسند امام احمد میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین	اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہو اُسے دین میں "تفقہ" عطا فرماتا ہے۔

اس "تفقہ" کے معنی، صحابہ اور تابعین کے نزدیک، ان اصطلاحی معنوں سے کہیں زیادہ وسیع تھے، جو ہمارے درمیان ایک ہزار برس سے رائج ہو گئے ہیں اور جس کی رو سے فقہ کو چند خاص ابواب کی حد تک محدود مان لیا گیا ہے۔ ان ہی وسیع تر معنوں میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا قول آتا ہے کہ جب آپ عراق میں ایک نبطی عورت کے پاس اُترے، اور اس سے نماز پڑھنے کے لیے کسی پاک جگہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا "اپنا دل پاک کر اور جہاں جی چاہے نماز پڑھ" آپ نے جواب میں فرمایا "فقہتِ" یعنی تو نے فقہ کی بات کہی ——

حالانکہ اس عورت نے ایک ایسی بات کہی تھی جو اسلام کے ایک بلند مقصد کو تو واضح کر رہی تھی لیکن جس کا تعلق ان احکام سے بالکل نہیں تھا، جن سے ہماری فقہ کی کتابیں بحث کرتی ہیں - نہ وہ ان احکام سے واقف تھی اور نہ اصطلاحی معنوں میں اس کی بات کو " فقہ " سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔

علماء متقدمین نے جب عقائد و توحید پر کتابیں لکھیں تو اپنی بعض تالیفات کو انھوں نے " فقہ اکبر " کا نام دیا۔ مثال کے طور پر عقاید کی وہ کتاب جو امام ابو حنیفہ رح کی طرف منسوب ہے۔ " فقہ " کا عنوان انھوں نے توحید اور ایمان کے موضوع کے لیے منتخب کیا - اس لیے کہ صحیح معنوں میں ہی وہ اکبر و اشرف فقہ ہے جس کے بلند اصول دین کی سلامتی کے ضامن ہیں۔

" فقہ " کے ان قدیم معنیٰ کی روشنی میں ہم اس کو آٹھ شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) **فقہ اکبر** ! وہ فقہ جس میں توحید و اخلاص اور ایمان سے بحث کی جائے - اسلام میں ایمان کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کی ستر سے زیادہ شاخیں بتائی گئی ہیں اور دنیا کے ہر حق اور ہر خیر میں ایمان داخل ہے - اپنی اس اہمیت کے پیش نظر ایمان اپنے سارے شعبوں اور عملی مقتضیات کے ساتھ فقہ اکبر میں داخل ہے۔

(۲) **بین الاقوامی فقہ** ! (الفقہ الدولی) یعنی وہ فقہ جس میں حکومت اسلامی کے دوسری حکومتوں کے ساتھ حالت امن و جنگ میں تعلقات کی تحدید ہو۔ جس کو موجودہ اصطلاح میں " بین الاقوامی قانون (القانون الدولی) کہتے ہیں۔

(۳) **فقہ مملکت** (فقہ الدولہ) جو اسلامی حکومت کے اپنے حدود مملکت میں اختیارات اور رعایائے مملکت پر حقوق کی حد بندی کرتی ہے - امام کے انتخاب کی کیفیت اہل حل و عقد، ارباب شوریٰ اور عمائد سلطنت کی صفات - عدلیہ اور عاملہ کے شرائط اور واجبات - حکومت کے ذرائع آمدنی اور ابواب خرچ کی نگہداشت اور ایسے ہی دوسرے امور اس ذیل میں داخل ہیں -

فقہ کی اس شق کی ہر دور میں ایک خاص اصطلاح رہی ہے - شیخ الحنابلہ قاضی ابو یعلی اور شیخ الشافعیہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اس کو " الاحکام السلطانیہ " سے موسوم کیا، اور یہ احکام ائمہ کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں - بعض ائمہ نے اس کی کسی ایک فرع پر کتاب تالیف کی، جیسے قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج - امام یحییٰ بن ادم قرشی کی کتاب الخراج ابو عبید کی کتاب الاموال اور شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی رسائل الحسبہ وغیرہ - حکومتیں اس فقہ کے احکام کی تعمیل میں کمی بیشی کرتی رہی ہیں، بعض زمانوں میں اس کو " سیاست شرعیہ " کے اصطلاحی معنوں میں محدود کر لیا گیا - اس پر امام ابن تیمیہ کا ایک رسالہ بھی ہے اور ان کے شاگرد امام ابن قیم نے اپنی کتاب الطرق الحکمیہ بھی اسی باب میں لکھی ہے ——— فقہ کی یہ شق کافی وسیع اور اس قابل ہے کہ اس کو باقاعدہ منظم و مدون کیا جائے۔

(۴) **فقہ اجتماعی** (الفقہ الاجتماعی) یہ ایک طرف حکومت کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ رعایائے مملکت کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلام پر قائم رکھے، تو دوسری طرف اسلامی مقاصد کو ایسی زندگی بخشتی ہے کہ اس سے مسلمانوں کی عملی تربیت ہو اور وہ اخلاقی، اقتصادی اور اجتماعی طور پر اسلام کے ہم رنگ ہو جائیں - اس طرح اللہ تعالیٰ کا امت محمدیؐ کو برپا کرنے کا مقصد پورا ہو اور وہ خیر امۃٍ اخرجت للناس کے مصداق بن جائیں - اس لئے فقہ کی یہ شق اس کی مستحق ہے کہ

ایمانیات کی سی توجہ اس پر صرف کی جائے۔ اس کی حفاظت و نگہداشت ان اہم اُمور میں سے ہو جس کی طرف صدر اوّل کی حکومتیں متوجہ تھیں۔ "فقہ اجتماعی" ہمارا دیا ہوا نام ہے اور یہ موجودہ زمانہ کی ضرورت کا تقاضا ہے۔ زمانہ اِس بات کا متقاضی ہے کہ اسلامی مقاصد کی اس قسم کو مستقل بالذات حیثیت دی جائے۔ مسلمان حکومتوں کے فرائض اس سلسلہ میں بہت زیادہ ہیں اس لیے کہ آج مسلمان اس کے بہت زیادہ محتاج ہیں۔ اتنے زیادہ محتاج کہ اتنے وہ کسی دوسرے دور میں نہیں تھے۔

(۵) فقہ معاشری (فقہ الاسرہ) یہ وہ فقہ ہے جس کو موجودہ قانونی اصطلاح میں "پرسنل لا"[عہ] کہا جاتا ہے جس کا تعلق نکاح و طلاق، متعلقین و اقرباء کا نان نفقہ اور تقسیم میراث سے ہے۔

(۶) فقہ معاملات (فقہ الالتزامات والعقود) جس کو ہم آج کل "قانون دیوانی" (القانون المدنی) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس کے موضوع و مدلول سے ہمارے ناظرین ناواقف نہ ہوں گے۔

(۷) فقہ تعزیرات (فقہ الحدود والقصاص والزواجر) یہ قانونی جرائم کے مرتکب، فرد یا جماعت کے باغی اور اس کے حقوق کے غاصب اور اللہ کے حدود کو توڑنے والوں کے تعزیری احکام پر مشتمل ہوتی ہے، جس پر اسلامی جماعت کی بہتری اور بھلائی کا دارومدار ہے۔

(۸) فقہ عبادات (فقہ العبادات) اس میں نماز، روزہ اور حج کے احکام شامل ہیں، صحابہ کرام اور ان کے معاصرین کے نزدیک اس علم کا تمام تر دارومدار ان عملی نمونوں پر تھا جو ان کے سامنے پائے جاتے تھے اور غالباً اُنھوں نے اس کو اتنی وسعت کبھی نہیں دی جتنی کہ بعد کے لوگوں نے دی، یہاں تک کہ مسلمانوں کی فقہ بس اسی شق میں محدود ہو کر رہ گئی۔ زکوٰۃ کا موضوع بھی، اگر وہ فقہ مملکت میں شامل نہ ہو تو اسی ذیل میں شمار ہونا چاہیئے الّا یہ کہ حکومت فقہ و شریعت اسلامی کی پابند ہو اور مکمل حیثیت سے اس کی اقامت کے فرض منصبی کو پہچانے۔

مسلمانوں کے ابتدائی تین ادوار کے مسلمانوں کی نظر میں "فقیہہ" وہی تھا جو فقہ کی ان آٹھوں قسموں کے تعلق سے اسلام کے احکام اور اس کے مقاصد سمجھتا ہو۔ اس کے فروع میں کتاب و سنّت کے نصوص دیکھتا ہو صحابہ کرام اور ائمہ اسلام کے اس تعامل پر بھی جس کی نظر ہو جو ان احکام پر منطبق ہوتے ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنی سیرت و کردار میں ڈھکے چھپے اور جلوت و خلوت میں اسی پر عمل پیرا ہو۔

ان ابتدائی ادوار میں حکومت کے تمام افراد ان ساری چیزوں کے جاننے والے تھے۔ خلیفہ اس وقت تک خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا تھا جب تک کہ وہ ان میں کا زیادہ جاننے والا نہ ہو۔ وہ اپنے مددگار وزراء، عمال اور قضاۃ بھی اسی گروہ سے مقرر کرتا تھا، امیرالمومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے معاصرین سے فرمایا کرتے تھے "تفقھوا قبل ان تسوّدوا" سردار ہونے سے قبل تفقہ پیدا کرو۔

خلفائے راشدین کے دور میں حکومت اسلامی فقہ کے ان آٹھوں ہی شعبوں پر قائم تھی اور ساری قوم ہی کا یہ حال تھا کہ وہ ان کے درمیان کسی فرق و امتیاز کی روادار نہ تھی اور نہ دوسرے شعبوں سے بے نیاز ہو کر کسی ایک شعبہ پر قانع ہونا اُسے گوارا تھا —— یہاں تک کہ عبداللہ ابن عباس کے شاگردوں اور اہل غفلت نے اس

[عہ] PERSONAL LAW

میں رخنہ پیدا کر دیا۔

خلفائے راشدین کے بعد مسلمانوں کے اصحاب امر نے دیکھا کہ حکومت خفیہ ریشہ دوانیوں اور دسیسہ کاریوں سے دوچار ہے۔ ان حالات نے انھیں مجبور کئے رکھا کہ وہ بھی فقہ کے جملہ انواع کو ساتھ لیکر چلیں اور یہ حال تابعین کے دور تک رہا۔ لیکن ان اصحاب امر نے اس اسلامی رافت و رحمت کو خیر باد کہہ دیا جو اُن کے پیش رو، حکومت اسلامی کی دشمن طاقتوں سے برسرپیکار افراد کے لئے روا رکھتے تھے۔ یہ حکم شریعت سے آزادی اور اخلاق اسلامی سے بُعد ان میں بتدریج آیا۔ زیاد نے سمجھا کہ وہ حزم و احتیاط کے معاملہ میں سیدنا عمرؓ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ پھر حجاج کا یہ نقطۂ نظر تھا کہ اس نے زیاد کے حزم و احتیاط پر صرف بقدر ضرورت ہی اضافہ کیا ہے، جو موجودہ دشمن طاقتوں کے تعلق سے ضروری تھا۔ بہرحال ہم جس کو تاریخ میں دورِ تابعین کے نام سے یاد کرتے ہیں —— اور اس دور کو میں یہی نام دیتا ہوں —— بلا استثناء جملہ انواع فقہ کو ساتھ لے چلنے پر مجبور تھا، مگر یہ کہ حکومت کی سلامتی اور مصالح ملکی اس کے خلاف تقاضہ کریں وہ اس استقامت میں متفاوت ضرور تھے لیکن ان کی استقامت اسلام پر ہی تھی۔ جس طرح ان کے بعد والوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں تفاوت ہے تو غیر اسلام کے لحاظ سے۔ بالجملہ اسلام کے ابتدائی تینوں ادوار کے مسلمان جنھیں ہم اپنی نمازوں اور عبادتوں کے بعد "الصحابۃ والتابعین وتابعیھم باحسان" کے نام سے یاد کرتے ہیں، وہ لوگ تھے، جن کی حکومتوں میں فقہ کی جملہ انواع پر عمل ہوتا تھا۔

اس کے بعد عباسی دور آتا ہے۔ اس کے اوّلین اکابر وہ تھے جنھوں نے تابعین کا زمانہ دیکھا تھا اور ان کی فقہ اور ان کے طرز زندگی کے سایہ میں وہ پلے تھے، اس لئے کسی نہ کسی صورت سے فقہ کی جملہ انواع پر ان کے دور میں بھی عمل ہوتا رہا۔ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ ان کے عمل اپنے پیش رؤں کی طرح نہ تھا، تاہم اس سے قریب ضرور تھا۔ اس کے بعد ان کی اولاد و احفاد کا زمانہ آیا، جنھوں نے دوآبہ دجلہ و فرات کی نعمتوں میں آنکھیں کھولیں، دارالسلام بغداد کے عیش و تنعم میں ہوش سنبھالا اور مختلف تہذیب و حضارت کی ماؤں کی گودوں میں پروان چڑھے۔ ان اسباب فراغت نے انھیں عجمی طرز زندگی کی طرف مائل کر دیا اور وہ عجمیوں کی اہوائے خواہشات کا شکار ہو گئے! اس کے بعد وہ تُرک علاقوں اور دوسرے اجنبیوں کے پھندوں میں پھنسے ان حالات میں انھوں نے پہلے تو فقہ مملکت کو خیر باد کہہ دیا پھر اسلام کے قانون تعزیرات پر خط نسخ پھیر دیا اس سے بڑھ کر اور اس سے بھی قبل اُنھوں نے اسلام کے قانون اجتماعی کو معطل کر دیا۔ آپ یہ معلوم کر چکے ہیں کہ اسلام کی اجتماعی فقہ، ہمارے ایمان کی نگراں اور محافظ ہے اور ایمان کے اکثر شعبے فرد و جماعت کے مابین اخلاق ہی سے متعلق ہیں —— یا تو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا وہ دورِ مسعود تھا کہ آپ کو کھانے پینے اور پہنے اوڑھنے کے بارے میں اسراف اور نمائش تک سخت ناپسند تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ایسے مسرفین کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ فرمایا کرتے تھے۔ اور تو اور خود بنی امیہ کا یہ حال تھا کہ ان کے لڑکے عرب کے ریگ زار اور معرکہ ہائے کارزار میں پروان چڑھتے تاکہ بچپن سے ان کی طبیعت میں سختی اور مصائب کی برداشت کا مادّہ پیدا ہو جائے۔ عباسی خلفاء بھی منصور کے زمانہ تک ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ضبطِ نفس اور خود اعتمادی کو راس الفضائل شمار کرتے تھے —— قطع نظر اس سے کہ دینی لحاظ سے بھی یہ ایمان کے اہم ترین شعبوں میں سے ہے، اور حکومت پر فرض ہے کہ وہ قوم کو اس زیور سے آراستہ کرے —— یا تو یہ حال تھا اور اختلاف،

حسن بصری اور عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہم جیسے بزرگ قوم کے پیشوا اور رہبر تھے، یا پھر یہ حال ہو گیا کہ حکومت کی باگ ڈور نئے نئے عناصر کے ہاتھ میں آگئی اور وہ کمزور ہو کر رہ گئی۔ لوگ اپنے خلفاء اور اصحاب امر کو دیکھ کر ایمانی بندشوں ہی سے آزاد ہونے لگے۔ حکومت نے اجتماعی زندگی میں اسلامی قانون کی بجا آوری کی طرف توجہ چھوڑ دی۔ بالآخر اسلام کا قانون اجتماعی بازارِ عالم میں جنسِ کاسد بن کر رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے انفرادی اور اجتماعی احکام و قوانین پوری صراحت و وضاحت سے موجود تھے اور صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی سیرت بھی موجود تھی کہ انھوں نے کس طرح ان احکام کو دنیا میں نافذ کیا اور قوم کو اس پر چلایا۔ لیکن یہ سب بس کتابوں میں بند تھے اور عملی زندگی میں اس کا وجود نہ تھا۔ حکومت کی بے پروائی اور ڈھیل کی وجہ سے لوگوں نے سمجھا کہ ان احکام کی پابندی و عدم پابندی میں آزاد ہیں پاسِ ادب سے وہ بس اس حد تک ان احکام کو بجا لاتے کہ ان کے معاشی کاروبار میں کوئی خلل نہ ہو، اور نہ کوئی بات ان کے خواہشات، میلانات اور حالات کے خلاف پڑے۔ اس طرح ساری قوم انحطاط پذیر ہو گئی اور ان کے اہل حل و عقد ہی میں فساد رونما ہو گیا۔ عوام میں ایمانی مقتضیات پر عمل ختم ہو گیا اور ایمان بس "شہادتین" میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اہم اعتقادی امور لوگ مانتے تو تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ ان سے وہ کون کون عملی شاخیں پھوٹتی ہیں جو فرد کی نجات و رستگاری، قوم کی فلاح و کامیابی، حکومت کی قوت و شوکت اور زمین میں برتری و سیادت کی ضامن ہیں۔

آج کے اس دور میں کہ ہم دو عالمی جنگوں اور اس کے تباہ کن نتائج سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہم اجتماعی زندگی کے ایک اہم موڑ پر آگئے ہیں۔ اپنے بقا و استقرار کے لئے یا تو ہمیں غیروں سے اصول مستعار لینے ہوں گے ——— اُن سے جو خود ہی اپنے اصولوں کے تلخ نتائج بھگت رہے ہیں ——— یا اپنے اسلاف کے اس کامیاب تجربے کو دُہرانا ہو گا جو انھیں خیر و برکت، قوت و شوکت اور عزت و کامیابی سے ہمکنار کر چکا تھا۔ اگر ہم اپنی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پھر اس مقام پر لوٹنا پڑیگا، جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ یعنی وہ مقام جہاں سے بے راہ روی و بے قیدی کی ابتدا ہوئی۔

قوم کا فرض ہو گا کہ وہ ایمان کے سارے شعبوں کو اس کی تمام تفصیلات سمیت اپنا لے، اور اللہ تعالیٰ سے ان پر قولاً و عملاً ایمان لانے کا پختہ عہد استوار کر لے۔ اس لئے کہ اسلام میں وہی ایمان معتبر ہے جو قول کے ساتھ عمل سے بھی ہم آہنگ ہو۔ اور یہ عمل کیا ہے؟ ہر حق اور ہر خیر جو دنیا میں ہے اور ان ہی دو چیزوں کا مجموعہ اسلام ہے، حافظ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اور حدیث کے احکام کی روشنی میں ایمان کے شعبوں کا استقصاء کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاہم ہمیں ان سب باتوں کو نئے سرے سے اور نئے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہر مسلمان جان لے کہ مومن کیا ہوتا ہے۔ اس کی کیا شرائط ہیں اور وہ مومن کون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے خلافت فی الارض کا وعدہ فرمایا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے اس سلسلہ میں کچھ لکھا تھا، جس کو مختلف اسلامی ممالک میں بنظر استحسان دیکھا گیا اور انشاء اللہ میں جلد ہی اس باب میں ایک جامع و مفید کتاب کی ترتیب کی طرف توجہ کروں گا۔ اس لئے کہ ہماری زندگی اور ہماری ساری ترقی اسی پر موقوف ہے۔

یہ تو ہوا وہ فرض جو قوم پر عائد ہوتا ہے اس کے بعد حکومت کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اسلام کی فقہ اجتماعی کو پھر

سے زندہ کرے، جس کی روشنی میں ہم یہ جان سکیں کہ خلفاء راشدین اور تابعین کے زمانے میں مقتضیات ایمان کی بجا آوری کس طرح ہوتی تھی فقہ کی یہ قسم، یعنی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی فقہ، اس زمانے میں جب کہ علماء نے فقہ میں کتابیں مدون کرنا شروع کی تھیں۔ حکومت کی بے توجہی کی نذر ہو کر رہ گئی۔ حکومت کی غفلت کی وجہ سے علماء کرام نے بجا طور پر سمجھا کہ فقہ کی اس شق کی تدوین ایک غیر ضروری سا کام ہے۔ اس لئے کہ یہ افراد کے عمل کرنے کی چیز تو ہے نہیں کہ ان کے لئے مرتب کی جاتی۔ اور حکومت، جس کے مطالعہ پر یا کم از کم جس کے عمل کے لئے یہ مرتب کی جاتی اس سے بالکل بے نیاز تھی۔ چنانچہ علمائے بھی خلفائے راشدین اور تابعین کے حالات اپنی مختلف کتابوں میں منتشر طور پر، موقعہ و محل کی مناسبت سے، بیان کر دینے پر اکتفا کیا، ڈھونڈنے والے کو ایسی بہت سی چیزیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحاح ستہ کی بقیہ کتابوں۔ مسند امام احمد اور ائمہ کی دوسری مشہور اور اہم کتابوں میں مل جائیں اور اس کثرت سے ملیں گی کہ اگر ساری جمع کر دی جائیں تو اسلام کی پوری "اجتماعی فقہ" مرتب ہو جائے۔ اور اگر حکومتِ اسلامی نے اس کی اقامت اور ملتِ اسلامیہ میں اس کے مکمل نفاذ کا بیڑا اٹھایا تو وہی وہ "صبح روشن" ہوگی جس کی دنیا منتظر ہے۔ ایک دفعہ پھر دنیا حقیقی اور بے لوث اسلام سے آشنا ہوگی۔ ایک دفعہ پھر وہ زندگی، قوت اور انسانیت کے راستے پر گامزن ہوگی اور پھر ہم اپنے اصلی منصب "منصب خلافت فی الارض" کو پالیں گے۔

حکومت کو اس کا مکلف کرنے سے قبل ہم پر یہ فرض ہے کہ ہم اس حقیقت کو اس کے سامنے پیش کریں، اور اس وضاحت کے ساتھ پیش کریں کہ وہ بھی اس کی حقانیت کی قائل ہو جائے۔ ساتھ ہی ضرورت ہے کہ قوم کو بھی اس سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ اس پر پختہ عقیدہ و عزم کے ساتھ آگے بڑھے اور حکومت رائے عامّہ کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے ——— یہاں سے ہمارے اہل علم طبقے کے فرائض کی ابتدا ہوتی ہے۔

فقہ کی جن اقسام کا میں نے تذکرہ کیا ہے، ضرورت ہے کہ ان کے باقاعدہ درس و تدریس کا انتظام کیا جائے۔ ان کے احکام و اجزاء کو از سر نو منظم کیا جائے اور لوگوں کے سامنے اس کو اچھے انداز میں پیش کیا جائے۔ کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے کہ میرے دوست ڈاکٹر نجیب ارمنازی (موجودہ سفیر سوریا برائے لندن) نے پیرس یونیورسٹی میں تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ڈاکٹریٹ کے لئے فرنچ میں ایک مقالہ پیش کیا تھا جس کا موضوع تھا "اسلام کا بین الاقوامی قانون" (یعنی حالت امن و جنگ میں حکومت اسلامی کے دوسری حکومتوں سے تعلقات) اگرچہ وہ ان دنوں پیرس میں تھے جہاں خاطر خواہ ماخذ میسر نہیں آسکتے تھے، تاہم انھوں نے قابلِ تعریف اور لائق تحسین کتاب لکھی ہے۔ اس کے بعد عربی میں اس کا ترجمہ کیا اور فارس الخوری نے اس پر مقدمہ لکھا۔ اس کے بعد سے اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس موضوع پر ایک اچھی تالیف کے لئے مدد لی جاسکتی ہے۔

فقہ مملکت پر عبدالوہاب خلاف نے "السیاستہ الشرعیہ" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے اس موضوع کے ماخذ تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی کارآمد ہو سکتے ہیں تاکہ وہ بھی اس کے مختلف گوشوں پر اپنی تحقیق کا حق ادا کریں[1]۔

فقہ اجتماعی، فقہ کی آٹھوں اقسام میں پھیلی ہوئی ہے، اور ہر دوسری قسم سے زیادہ اسی پر مسلمانوں کی حیات

[1] اردو میں اس موضوع پر کافی کتابیں لکھی گئی ہیں اور اس باب میں اس کو عربی پر بھی فوقیت دی جاسکتی ہے۔
مترجم

اجتماعی کا دار و مدار ہے۔ جیسا کہ آپ جان چکے ہیں، یہ ایمان کے عین مقتضیات سے متعلق ہے۔ میں انشاء اللہ اس موضوع کے کما حقہٗ استقصاء کی کوشش کروں گا۔ شائقین علم کتب احادیث و سیرت میں اس کی تلاش و جستجو کریں تو ان کیلئے کام کا وسیع میدان ہے۔ ہمارے مبارک دور ماضی کے آثار میں وہ ڈھونڈھ سکتے ہیں کہ ائمہ اسلام، امراء اور خلفاء راشدین کا اس سلسلہ میں کیا موقف رہا ہے، انھوں نے کس طرح قوم کو ایمان کے راستے پر لگایا اور اس کو اخلاقی، اجتماعی اور اقتصادی احکام کا پابند بنایا۔ پھر اس کی ترتیب تدوین میں اسی محنت و جاں فشانی سے کام لینے کی ضرورت ہے، جس محنت و جاں فشانی سے ہمارے فقہاء کرام نے عبادات، معاملات، نکاح و طلاق اور تعزیرات کے نصوص جمع کئے اور اس سے احکام مستنبط کئے، وہ دیکھیں گے کہ اس فقہ کے نصوص ان سے کہیں زیادہ واضح مضبوط اور زیادہ محنت، جاں فشانی و اہتمام کے طالب ہیں، جن سے فقہ کی دوسری قسموں کے احکام مستنبط ہوتے ہیں خاص طور پر وہ احکام، جو نصوص کی گہرائی یا قوت و ضعف کے تفاوت کی وجہ سے، فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہیں۔

جب قوم ایمان کے تقاضوں سے واقف ہو جائے گی اور یہ جان لے گی کہ ان پر عمل ہی اصل ایمان ہے، تحقیق و جستجو کرنے والے جب فقہ اجتماعی کو مرتب کر لیں گے، اور مسلمانوں کے اصحاب امر کے سامنے اس کو اچھے انداز میں پیش کریں گے۔ اور جب عالم اسلام میں ایک ایسی حکومت ہوگی جو اس طرف خاص توجہ صرف کرے گی، تو وہی دن ہوگا جب سورج مغرب سے پھر اپنے افق اول شرق کی طرف پلٹ آئے گا اور اسی شان سے ضیا بار ہوگا جس شان سے وہ ہمارے دور اول میں ضیا بار تھا۔ جب کہ ہماری تہذیب حضارت، ہمارے علوم و تمدن، دعمران اور ہمارے برتر اصول حیات یورپ، ایشیا اور افریقہ میں ——— دوسرے الفاظ میں زمین کے ان تمام اہم حصوں میں جن سے انسان واقف تھا ——— شائع ذائع تھے۔ اور چار دانگ عالم میں ہمارے ہی نام کا ڈنکا بج رہا تھا،

اسعد گیلانی

تحریک اور ابتلا!

انسانی معاشرے پر انسان کا بنایا ہوا کوئی نظام جب اپنی تمام قہرمانی اور جبر کے ساتھ مسلط ہو جاتا ہے۔ اس کے عمل دخل میں خیر کا پہلو کم اور شر کا زیادہ ہو جاتا ہے۔ اس معاشرے کا عام آدمی اس سے نالاں اور اس کی زیادتیوں کا شکوہ گزار ہو جاتا ہے اور اس کے بارے میں عام بندگانِ خدا کی رائے یہ ہوتی ہے کہ یہ سارا ڈھانچہ اپنے مجموعی مزاج کے لحاظ سے سراسر ظلم و تشدد، فسق و فجور اور شر و فساد کا منبع بن گیا ہے۔ اور جب کسی نظام میں ایسا کوئی اہتمام باقی نہیں رہتا کہ دبے ہوئے کو ابھارنے، گرے ہوئے کو اٹھانے، مظلوم کی دادخواہی کرنے اور ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے اسباب فراہم کئے جا سکیں جب انسان کی اصل فطرت کو کچلنے خیر کو تباہ کرنے کے سامان حد سے بڑھ جائیں تو ایسے نظام کے اندر ضرور ایک تحریک اٹھتی ہے جو خیر کی پشت پناہی اور شر کی سرکوبی کرنے کا داعیہ رکھتی ہے۔ خیر کی پشت پناہی اور شر کی سرکوبی کرنے کا داعیہ یوں تو انسانی فطرت میں چھپا ہوا ہی ہے لیکن یہ داعیہ مخالف قوتوں کے چاروں طرف جمع ہو جانے سے کمزور پڑ جاتا ہے اور اکثر صورتوں میں اپنی تنہائی کا احساس کر کے دب جاتا ہے۔ اس احساسِ تنہائی کی کمزوری کو دور کرنے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو فرد فرد کے اس انفرادی داعیہ خیر کو اجتماعی شکل دے سکیں اور مسلط و مستحکم شر کے خلاف مورچہ بنا سکیں۔ جب ایسے لوگ وجود میں آجاتے ہیں تو جن انسانی فطرتوں میں داعیہ خیر پوری قوت سے موجود ہوتا ہے اور اس کی حفاظت اس حد تک کر چکے ہوتے ہیں کہ وہ نہ تو مسخ اور فسخ ہو سکتا ہے اور نہ اس میں شر کے مقابلے میں احساسِ شکست پیدا ہو سکتا ہے وہ لوگ وحدتِ فکر کی ایک لڑی میں خود کو پرو کر ایک نصب العین کے گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور شر کی قوت کے علی الرغم اپنا علیحدہ مورچہ بنانے کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔

داعیہ خیر کی ضرورت

ہر تحریک بہرحال خیر کا داعیہ لیکر اٹھتی ہے اور نظام مسلط کے مقابلے میں شر کی نسبت خیر کی پشت پناہی کا دعویٰ لیکر چلتی ہے۔ خیر کے دعوے کے بغیر کسی فکر کا تحریک کی شکل میں اٹھنا ممکن ہی نہیں ہے اور انسانی فطرت کا اتنا مسخ ہو جانا خلافِ فطرت ہے کہ وہ کسی وقت بھی شر کے کھلے کھلے دعوے کے گرد جمع ہو جائے اور اجتماعی طور پر "انسان آزاری" کو اپنے پروگرام اور نصب العین میں داخل کر کے ایک گھڑی بھی چل سکے۔ البتہ یہ تحریکیں دو بنیادی اقسام پر مشتمل ہوتی ہیں ایک تو تحریکیں جو الٰہی ہدایات لیکر اٹھتی ہیں اور دوسرے ایسی تحریکیں جن کے علمبردار الٰہی ہدایات سے بے نیاز ہو کر موجود الوقت مشکلات اور مسائل کا حل خود اپنے ذہن سے سوچ کر اور خود ہی ایک لائحہ عمل مرتب کر کے مسلط ظلم کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں ہو سکتا ہے کہ دوسری قسم کی تحریکیں کامیاب ہو کر پہلے نظام سے بھی شدید تر اور ظالم تر ثابت ہوں اس لیے کہ انسانی فکر کسی علیم و خبیر بالاتر قوت کی رہنمائی کے بغیر اس قابل نہیں ہو سکتی کہ زمان و مکان کی تبدیلی اور بدلتے ہوئے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے کوئی جامع لائحہ عمل اور نظامِ حیات مرتب کر سکے۔ البتہ ہر نئی فکر وہ چاہے صالح

ہو یا محض صالح نما۔ الٰہی ہدایات پر بنی ہو یا انسانی ذہن کی پیداوار اس وقت تک کسی معاشرے میں جڑ نہیں پکڑ سکتی جب تک اس کی جڑوں کو پھیلانے کیلئے کچھ نہایت مستعد انسانوں کی اجتماعی جدوجہد کے نتیجہ میں ان کا پسینہ نہ ٹپک جائے۔ ایک شدید کشمکش اور فکر و عمل کی برتری ہی ایک فکر کو میدان سے ہٹنے اور دوسری کو اس کی جگہ لانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ فکر مسلط اپنی بقا اور دوامی قیام کے لئے قوت و استبداد کے سارے ہتھیار استعمال کرتی ہے اور نئی تحریک کے علمبرداروں کو جہاں پرانی فکر کے اثرات کو اپنے عرقِ محنت سے دھونا ہوتا ہے وہیں نئی فکر کے پودوں کو اپنے خون سے سینچنا ہوتا ہے اس کے بغیر کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔

آغاز

جب تک کوئی نظامِ حیات اپنے محض فکری اور تصوراتی دور میں ہوتا ہے نظام قاہر اس کے وجود سے عموماً آشنا نہیں ہوتا اور ہوتا ہے تو اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ زندگی کی جس شمع کے گرد پروانے جمع ہوتے رہتے ہیں جب پروانوں کا یہ اجتماع کچھ غیر معمولی سی صورتِ حال پیدا کر دیتا ہے اور معاملات پر اپنی جداگانہ نظر کھلم کھلا ڈالنے لگتا ہے تو نظام مسلط چونکتا ہے اور جان لیتا ہے کہ اس جنگل میں ایک دوسرا شیر بھی پل رہا ہے۔ جسے ختم کئے بغیر اس کی راج دھانی کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اپنے پنجوں کے سارے نکیلے ناخن نکال کر اس پر جھپٹتا ہے۔ یہیں سے اس تحریک کا دورِ ابتلا شروع ہو جاتا ہے۔ یہیں سے وہ نئی فکر ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے اور یہیں سے یہ کاروانِ نو اپنی مسافت کی سب سے زیادہ پُر صعوبت منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہیں اس کی زندگی یا موت اور کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ ہوتا رہتا ہے۔ یہیں سے اس کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے اور زمانہ یہ فیصلہ کرنے پر تُل جاتا ہے کہ انسانوں کو اس کے نئے سانچے میں ڈھلنا ہے یا اس کے سانچوں کو توڑ پھوڑ کر پھینک دینا ہے۔

آزمائش

ابتلا کے اس دور میں الٰہی ہدایات پر چلنے والی تحریکوں اور انسانی فکر کی محتاج تحریکوں کے اندازِ برداشت میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اور یہی دور ان کے فرق کو بہت زیادہ نمایاں کرنیوالا ہوتا ہے۔ اخلاقی اقدار کے قیام کو انقلاب کا مقصود قرار دینے والی تحریکوں پر جب دورِ ابتلا آتا ہے تو ان کے کارکنوں کا اپنے مالک و آقا کی طرف رجوع پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ ان کا تعلق جہان و زمان کے پروردگار سے اور زیادہ قریبی ہو جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو آزما رہا ہے کہ وہ اپنے نصب العین سے کتنی گہری نسبت اور اپنے مقصد سے کتنا پختہ عشق رکھتے ہیں۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کا مالک ان کو ضائع کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کی کھوٹ کو آزمائش کی بھٹی میں تپا کر نکال دینا چاہتا ہے تاکہ یہ زرِ خالص کائنات کی کسی منڈی میں بھی کھوٹا ثابت نہ ہو۔ وہ ان کو رگڑ کر دھو دینا چاہتا ہے تاکہ ان کے دامن سے ذاتی خواہشات اور دنیا طلبی کے سارے دھبے دھل جائیں اور قلب کی لوح پر خدائے واحد کی پرستش کے نقوش کے سوا اور کوئی نقش باقی نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تحریک کے کارکن پر جب کوئی آزمائش آتی ہے تو وہ مایوسی۔ بوکھلاہٹ۔ بدحواسی اور شکست خوردگی کے جذبات سے قطعی بالاتر رہتا ہے اور خلوصِ نیت کی جس نسبت سے اس نے اپنے دل و دماغ اور فکر و نظر کو اس کام میں لگایا ہوتا ہے اسی نسبت سے وہ اپنی فطری کمزوریوں سے پاک رہتا ہے۔ بلکہ اس کے پاس کامیابی اور ناکامی کو تولنے کی وہ ترازو نہیں ہوتی جو عموماً دنیا میں رائج نظر آتی ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے نصب العین کی راہ میں کتنا کچھ لُٹایا پھر جتنا کچھ انہیں لٹتا ہوا نظر آتا ہے اتنا ہی وہ اپنے نفع کے کھاتے میں درج کر لیتے ہیں۔ جو کچھ وہ اس راہ میں لُٹاتے ہیں اسی قدر وہ اپنا بوجھ ہلکا محسوس کرتے ہیں اور کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس قدر امانت ادا ہو گئی اسی قدر سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اگر اس راہ میں ان کی جان بھی چلی جائے تو ان کے لبوں پر دمِ واپسیں یہی ہوتا

ہے کہ سے

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آزمائش جب ان کے چاروں طرف منڈلانے لگے تو آزمائش سے پناہ اور حضوری قلب سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ انہیں اپنی راہ میں ثابت قدمی عطا کرے وہیں دوسروں کو محبوبِ حق کی راہ میں آزمائش میں مبتلا ہوتے اور عشق کے مقامات طے کرتے ہوئے دیکھ کر رشک سے ان کا سینہ معمور ہو جاتا ہے اور وہ تمنا کرتے ہیں کہ ان کا محبوب ان کو بھی قابلِ اعتنا سمجھے۔ ان کو بھی اس قابل جانے کہ اس کی راہ میں کانٹے بچھیں اور ان پر آوازے کسے جائیں۔ ان کی رگوں کا خون بھی اس کی راہ کی گرد کو تر کرے اور ان کا سینہ بھی اس راہ میں چلنے کے جرم میں زخموں سے خونچکاں ہو۔ یہ تمنا ان کو بستروں پر تڑپاتی ہے کہ ان کا بستر ان کانٹوں سے معمور کیوں نہ ہوا جو ان کے حبیب کی راہ میں بچھائے گئے اور راستے کے پتھروں کا وہ نشانہ کیوں نہ بنائے گئے اور جو مصائبِ راہِ حبیب میں چلتے ہوئے دوسروں کو نصیب ہوئے ان سے وہ آخر کس نااہلی کی بنا پر بہرہ مند اور لذت آشنا نہ ہو سکے انہیں وہم ہونے لگتا ہے کہ کہیں محبوب نے انہیں زرِ کم عیار تو نہیں قرار دے دیا کہ ان کی طرف کسوٹی نہیں بڑھائی گئی۔ اور انہیں درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا۔

ابتلا کا دور گویا کسی تحریک کے کارکنوں کے لئے چھان پھٹک کا دور ہوتا ہے جس طرح ایک کسان اپنے کھلیان میں گیہوں کی بالوں کو پیہم کچل کچل کر اناج اور بھس کو علیحدہ علیحدہ کر دیتا ہے اسی طرح ابتلا کا دور بھی کسی نصب العین کے دعویداروں کے انبار کو چھان پھٹک اور کچل کر گندم اور بھس، مقصد کے شیداؤں اور خواہشِ نفس کے پرستاروں کو چھان کر الگ الگ کر دیتا ہے۔ ابتلا کی یہ تپش تحریک کے سارے آماس کو ختم کرکے اس کی اصل فربہی کو نمایاں کر دیتی ہے۔ یہ فصد گندے خون کے سارے مواد کو نکال کر جسم میں صرف صالح خون ہی باقی رکھتی ہے، اس دور سے گزر کر تحریک ایک نئی توانائی لیکر آگے بڑھتی ہے۔ جیسے بیمار غسلِ صحت کے بعد تازہ دم ہو کر بستر سے اٹھتا ہے۔ اس آگ میں گزر کر ملمع اور زرِ خالص ایک ہی تھیلی میں رکھے نہیں رہ سکتے دونوں کی حیثیت متعین ہو جاتی ہے اور اسی حیثیت کے مطابق دونوں کا کام متعین ہو جاتا ہے۔

تاریخ میں آج تک ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ کسی نے انا الحق کا نعرہ لگایا ہو اور اس کے سامنے دار کا تختہ نہ کھڑا کیا گیا ہو۔ کسی نے وقت کے دریا کی مخالف سمت میں تیرنے کی کوشش کی ہو اور حالات کی تیز و تند لہروں نے اسے الٹا اٹھا کر پہاڑ پر پٹخ دینے کی کوشش نہ کی ہو اور کسی نے بت خانے کے آداب کو توڑا ہو اور اسے آگ میں نہ جھونکا گیا ہو۔ جب بھی کبھی کسی نے ایسی جرأت کی ہے۔ غاصب قوتوں نے اس کا راستہ روکنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر کے جان لیوا مقابلہ کیا ہے۔ اور ایک بار تو نئی فکر کے علمبرداروں کو اپنے استبداد کے شکنجے میں کس کر ان کا پورا خون نچوڑ دیا ہے۔

پھر باطل تو ممکن ہے کہ غیر خالص زر بھی قبول کرے۔ اس لئے کہ اس کی بنیاد ہی جھوٹ اور کذب پر اٹھتی ہے۔ زندگی کے غلط زاویوں کو نمایاں کرنے کی دعوت ہی لیکر وہ اٹھتا ہے۔ وہ انہیں مسائل کا احاطہ کرتا ہے جو زندگی کو صراطِ مستقیم سے بھٹکانے والے ہوتے ہیں۔ پھر جھوٹ۔ اور فکری گمراہی کے پاس ذوقِ لطیف اور اتنی نفاست کبھی نہیں ہو سکتی کہ وہ کھرے اور کھوٹے میں پوری پوری تمیز کر سکیں یا تمیز کر سکیں تو ان کی حمیت اور غیرت اتنی قوی نہیں ہوتی کہ اپنے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ پھر باطل نمود و نمائش کے لئے لکڑی کے کندوں کو بھی وردی پہنا کر میدانِ جنگ میں اپنے

سپاہیوں کی گنتی بڑھانے کے لئے لا سکتا ہے۔ وہ ان کرائے کے لوگوں کے کندھوں پر بھی اپنی بندوقیں رکھ سکتا ہے جن کے دل اس کے ظلم و تشدد سے نالاں ہوں لیکن حق تو اتنا باریک بیں واقع ہوا ہے کہ وہ ان لوگوں کو بھی اپنی فوجی خدمات سے بری قرار دے دیتا ہے جو چاہے اس کی ریاست کی وفاداری کا عہد کریں لیکن اس کی بنیادی اُصولوں سے متفق نہ ہوں۔ جبر و اکراہ کا اس کے ہاں سوال ہی نہیں ہے۔ یہاں تو رغبت۔ طلب۔ تڑپ بلکہ جنون دیکھا جاتا ہے اور جس کے پاس جنون ہے وہی اس کی ہتھیلی کا سب سے کھرا سکہ ہے۔

انسان اپنی روزمرہ کی زندگی کے معاملات میں جب اتنا دور اندیش واقع ہوا ہے کہ وہ اپنے دوست اور دشمن کی تمیز کے لئے کئی طرح کے معیار رکھتا ہے۔ معمولی دوستی کے لئے وہ دوسرے میں ایثار۔ خلوص۔ ہمدردی اور وقت پڑنے پر کام آنے کے جذبے کو جانچتا ہے۔ معمولی سودا خریدنے کے لئے وہ سو بار مال کو دیکھتا۔ جانچتا اور پرکھتا ہے اور اس وقت تک نہیں خریدتا جب تک مال کے کھرا ہونے اور اسے دیئے جانے والے سکے کی قیمت کے مطابق نہیں سمجھ لیتا تو آخر حق الیسا بے بصر گاہک کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر قسم کے کھرے کھوٹے مال سے دامن بھرلے اور ہر قسم کے انسان سے اپنے پُراعتماد دوستانہ تعلقات قایم کرے۔ ایک معمولی بے شعور کل کی خبر سے بے خبر انسان جب اپنی دوستی سے پہلے دوسرے انسان کو پرکھتا ہے وقت پڑے پر کام آنے کی صفت کو دیکھتا ہے تب اس پر اعتماد کرتا ہے تو پھر جس کی نفاست طبع اور حمیت سے بڑھ کر نفاست اور حمیت دنیا میں کبھی نہیں پائی گئی وہ کیسے ان صفات کو دیکھے۔ پرکھے اور جانچے بغیر قبول کر سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

"اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ایمان لانے والوں کو اس حالت پر چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ ملنے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کرئے۔" (آل عمران - ۱۸)

"کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ صرف اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لائے چھوڑ دیئے جائیں گے اور انھیں آزمائش کی بھٹی میں تپایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ان سے پہلے جو گزر چکے ہیں (یعنی جنھوں نے بھی ایمان کا دعوے کیا ہے) وہ ضرور تپائے گئے ہیں۔ ضرور ہے کہ اللہ دیکھے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔ (عنکبوت - ۱)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جنت کا داخلہ تمھیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ کیفیت تو گذری ہی نہیں جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکی ہے۔ ان پر سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔ حتیٰ کہ رسول اور اُس کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟" (بقرہ —— ۲۶)

"کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم سستے چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون ایسے ہیں جنھوں نے سعی و جہد کا حق ادا کیا اور اللہ اور رسولؐ اور اہل ایمان کے سوا کسی سے قلبی تعلق نہ رکھا۔" (توبہ —— ۲)

"اور لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے جب اللہ کی راہ میں انہیں ستایا گیا تو انسانوں کی ایذا سے ایسے ڈرے جیسے اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیئے۔ حالانکہ اگر تیرے رب کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو یہی لوگ آ کر کہیں گے کہ ہم تو تمھارے ہی ساتھ تھے۔ کیا اللہ اہل دنیا کے دلوں سے واقف نہیں ہے۔ مگر ضرور ہے کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے ایماندار کون ہے اور منافق کون۔"

(عنکبوت —— ۱)

ہم ضرور تم کو خطرات اور فاقوں سے اور جان و مال اور کمائیوں کے نقصانات سے آزمائیں گے اور کامیابی کی بشارت دے دو ان مستقل مزاج لوگوں کو جنہوں نے ہر مصیبت کی آمد پر کہا کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور آخر اس کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور یہی لوگ راہِ راست پانے والے ہیں" (بقرہ ——— ۱۹)

چنانچہ اس حقیقت کو واضح تر کرنے کے لیے کہ اللہ کی راہ میں چلنا پھولوں کی سیج پر چلنا نہیں ہے بلکہ ایک وادی پُرخار میں قدم رکھنا ہے اور اس وادی کے کانٹوں کے لیے اپنے تلووں کو پیش کر دینا ہی حقیقت میں اصل مُراد کا پا لینا ہے۔
——— رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:— جس کے پاؤں خدا کی راہ میں گرد آلود ہوں ان کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی"۔
یہاں گرد آلود ہونے سے مراد محض پاؤں پر گرد پڑ جانا ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی راہ میں مصائب کو برداشت کرنا۔ لیکن اس کی راہ میں آگے ہی بڑھتے جانا ہے۔ اور اپنے حقیقی نصب العین کی راہ میں پیہم جدوجہد کئے جانا ہے۔

حضرت خبابؓ سے روایت ہے کہ ہم نے آنحضورؐ کی خدمت میں اپنی مشکلات کی شکایت کی اس حالت میں کہ آپؐ کعبے کے سائے میں چادر پر ٹیک لگائے تشریف فرما تھے۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ ہم مشرکین کی سختیاں جھیل رہے تھے۔ ہم نے کہا:— "کیا آپ ہمارے لیے مدد طلب نہ کریں گے؟"
آپؐ نے فرمایا "تم سے پہلوں کا یہ حال ہوا کہ مومن مرد کو پکڑا جاتا اور زمین میں گڑھا کھود کر اس میں اسے ڈال دیا جاتا پھر آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ دیا جاتا اور دو ٹکڑے کر دیئے جاتے۔ اور گوشت ہڈیوں میں لوہے کی کنگھیاں پھیر دی جاتیں۔ لیکن یہ سب کچھ مرد مومن کو دین حق سے باز نہ رکھتا۔ بخدا اللہ اس کام کو پورا کرکے رہے گا۔ یہاں تک کہ سوار صنعاء یمن سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے خدا کے سوا اور بکریوں پر بھیڑئے کے حملے کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لیکن تم جلد بازی سے کام لے رہے ہو"۔

غرض یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی اقامتِ دین جیسے بلند ترین مقصد کو لیکر اُٹھے اور اس کے ظرف کو دیکھا نہ جائے کہ وہ کس حد تک عشق الٰہی سے معمور ہے۔ لگن کی کتنی مقدار حاصل ہے۔ اپنی خواہشات نفس کی کتنی قربانی وہ دے سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ہم تاریخ کے ان تمام ادوار پر سرسری نظر ڈالیں جن میں راہ حق میں جدوجہد کرنے والوں کے کارنامے ہمیں قدرے صاف نظر آتے ہیں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ جس کسی نے بھی دعوئے عشق کیا اس کے سامنے دار و رسن کا مسئلہ بھی کھڑا کر دیا گیا۔ اس امتحان میں کامیابی حاصل کئے بغیر کسی کو اس راہ میں قدم بڑھانے کا پروانہ راہ داری نہ مل سکا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس راہ میں خدا کے بندوں نے جو جو کٹھن امتحان پاس کئے ہیں وہ تاریخ انسانی کے درخشاں باب ہیں جنھیں انسانیت قیامت کے روز فخر کے ساتھ داور محشر کے روبرو پیش کر سکتی ہے۔

ابتلا میں استقامت کی مثالیں

حضرت نوحؑ کی نو سو سالہ دعوتِ حق سے کون ناواقف ہے۔ عشق الٰہی کی اس بے مرد افگن کا کون حریف ہو سکتا ہے جس کا نشہ مسلسل نو سو سال تک نہ اترنے پایا اور اسی قوم میں مسلسل کام کرتے کرتے اور صالح انقلاب کے لئے تمام راہیں مسدود پانے کے باوجود پیمانۂ صبر اس وقت تک لبریز نہ ہوا جب تک مشیت نے اس خطۂ زمین کو ہی عذاب کے پانی سے لبریز نہ کر دیا۔ کسی قوم اور اُس کے لوگوں کے درمیان ایک ہی پیام حق نو صدیوں تک پہونچاتے

رہنا۔ پتھر کھاتے رہنا۔ پاگل اور دیوانہ کہلاتے رہنا۔ حق کی لذت اور اس سے وابستگی کا ایک ایسا عظیم مظاہرہ ہے جس کی نظیر دنیا کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ صبر و استقلال کا گویا ہمالہ ہے جسے مخالفت میں کام کرنے والی انسانی مساعی توڑ نہیں سکیں۔ طوفان آتا ہے اور وہ لوگ جو حق کے اس کسان کی مسلسل محنت کے باوجود جھاڑ جھنکار سے زیادہ اپنی وقعت ثابت نہ کر سکے تھے غرق ہونے لگتے ہیں اور انہیں میں اس کا بیٹا ہے جو اس کے گھر میں پیدا ہوا۔ پلا بڑھا اور جوان ہوا ہے۔

"بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ کشتی میں آجاؤ۔ آج کے دن خدا کے عذاب سے کہیں پناہ نہیں ہے" باپ اپنے بیٹے کو ڈرتے ہوئے دیکھ کر اُسے پکارتا ہے۔

اور جب خدا کی طرف سے تنبیہ ہوتی ہے کہ وہ تو ایک "عمل غیر صالح" ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام" ہے وہ تمہارا بیٹا نہیں ہے۔ تو پھر وہ عظیم رہنما گڑگڑا کر اپنے رب سے استغفار کرتا ہے اس بات پر کہ اس نے اس بیٹے کے ساتھ خفیف سی قلبی لاگ بھی کیوں رکھی جسے حق کے ساتھ کوئی نسبت نہ تھی۔ عذاب سے بھرپور تھپیڑے کے ساتھ ایک لہر بیٹے کو باپ کی آنکھوں کے سامنے بہالے گئی لیکن باپ استغفار کرتا رہا کہ اس نے اپنے رب سے وہ کیوں چاہا جسے اس کا رب نہ چاہتا تھا۔ اس لئے کہ رشتہ تو وہ ہے جسے پروردگار قائم کرے نہ کہ وہ جسے لوگ رشتہ سمجھیں۔

ہر رشتہ خنجر حق کی زد میں

حضرت ابراہیمؑ نے جب خدائی کے ایک احمق اور متکبر دعویدار کو یہ کہکر بوکھلا دیا کہ "میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اسے مغرب سے نکال" تو عراق کی سرزمین ان کے لئے تنگ ہوگئی۔ انہیں آگ میں جھونک دینے کے منصوبے بن گئے۔ خدائی کے دعویداروں کو حقارت سے ٹھکرا دینے کا یہ نتیجہ تھا۔ جو دعوئے بندگیٔ حق کا حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیا تھا اب اس کے امتحان کے یہ سامان تھے۔ پورا خاندان بھڑوں کا چھتہ بن گیا تھا۔ پوری قوم کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ آگ میں جھونکے گئے اور بالآخر وطن سے بے وطن ہوکر بادیہ پیمائی کرنی پڑی۔ بادیہ پیمائی کے ایک طویل دور کے بعد بیٹے کی قربانی کا مطالبہ ہوا اور باپ نے حکم کے مطابق چھری تیز کرکے بیٹے کے ہاتھ پاؤں رسی سے باندھ کر اُسے اوندھے مُنہ زمین پر لٹا دیا۔ یہ واقعہ آسمان کے نیچے اس رشتہ اور ناتہ کی زمین پر پہلی اور آخری بار ہوا۔ پوری کائنات دم بخود تھی کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فرشتے حیران تھے جنھوں نے خدا کی زمین میں ابن آدم پر فساد کا الزام لگایا تھا کہ یہ انسان خدا کی محبت اور اطاعت میں اتنا غرق بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بیٹے کے حلق پر چھری چلا دینے پر بھی تیار ہو جائے اور خدا کی اطاعت و محبت کی تاریخ میں انسانیت نے یہ نمایاں ترین سنگ میل نصب کر دیا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نہ ہاتھ تھرائے۔ نہ آواز کانپی۔ نہ لرزہ طاری ہوا اور چھری چل گئی۔ اس چھری نے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ ابن آدم خدا کی اطاعت میں ہر رشتے پر۔ ہر متاع عزیز پر اور کائنات کی ہر دولت بے بہا پر چھری چلا سکتا ہے۔ انسانیت نے راہِ حق میں قربانی اور ایثار کا ایک معیار قائم کر دیا اور اس معیار پر انسانیت ہمیشہ فخر کر سکے گی، محبوب کی طرف سے آنے والے ابتلا کو دونوں ہاتھوں سے سینے سے لگانا حق سے ثابت قدمی اور استقامت کی توفیق چاہنا اور آنے والے امتحان میں اپنی ساری متاع حیات پھونک دینا یہی وہ طریق کار ہے جسے مومن کا ایمان اختیار کرتا ہے۔

اژدہوں کی یلغار

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بھی ایک طویل دور ابتلا سے گزرنا پڑا اس لئے کہ ابتلا سزا نہیں ہے پرکھ ہے، اگر یہ سزا ہو تو پھر پیغمبروں پر کبھی نہ آئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ خدا کا کوئی بند

جتنا اس کے نزدیک برگزیدہ ہوا اسی قدر سخت ابتلا میں اسے مبتلا کیا گیا۔ جتنا اونچا اس کا درجہ ہوا اتنا ہی کڑا امتحان اس کا لیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر فرعون نے مصر کی زمین تنگ کردی۔ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ذبح کردیا جاتا اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھ لیا جاتا۔ اس طرح پوری قوم کی نسل کشی کے پروگرام پر ایک عرصہ تک عمل کیا جاتا رہا۔ بنی اسرائیل سے بدترین برتاؤ کیا جاتا۔ حضرت موسیٰؑ پر جادوگروں کی ایک بھیڑ اپنے تمام جنتروں، منتروں اور شعبدہ بازیوں کے ساتھ چڑھ آئی اور اسی وقت ٹلی جب حق نے باطل کو پوری طرح شکست دے دی۔

جو کوئی اپنی صلیب نہ اُٹھائے میرے لائق نہیں

حضرت عیسیٰؑ کو روم کے قیصر اور یہودیوں کی ماتحت ریاست سے سابقہ پڑا۔ یہ وقت تھا جب فریسیوں اور صدوقیوں کا طوطی بولتا تھا اور انھوں نے تورات میں تحریف کرتے کرتے اسے اپنی خواہشات کا صداقت نامہ بنا کر رکھ دیا تھا، سیدنا عیسیٰؑ کی دعوت حق کا آغاز ہوتے ہی یہ لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔

اس دعوت میں انھیں اپنے اقتدار کی موت اور کتاب الٰہی میں اپنی تحریفات کا پول کھلتا ہوا نظر آتا تھا ہر فریسی اور فقیہ کو اپنی گدی اس دعوت کے سیل میں بہتی نظر آتی تھی۔ ہر مفاد پرست دین کے نزدیک اس دعوت کی موجودگی میں اس کا روبار چلتا نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ دعوت کے آغاز میں ہی ان کے فتنوں کے بند ٹوٹ گئے اور ان کے مکروفریب کے جال بچھ گئے۔ اس طرح سیدنا عیسیٰؑ کی دعوت کا آغاز ہی ابتلا سے ہوا۔ اور آغاز کے ساتھ ہی مصائب کا وہ نقطۂ عروج آگیا جو ابتدا میں آئے تو کسی تحریک کے لیے انتہائی خطرناک اور اگر کچھ قوت پکڑ جانے کے بعد آئے تو عموماً مفید ہوا کرتا ہے۔ یہاں ابھی دعوت نے اپنی آواز بلند کی ہی تھی کہ چاروں طرف سے فتنے مرنے اور مارنے کے لئے جمع ہونے لگے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے مختلف خطبات اور اقوال جو بائبل میں ملتے ہیں ان کا انداز خطاب وہی ہے جو ابتلا کے دور میں کسی تحریک کا لیڈر اختیار کرتا ہے۔ وہ انہیں واضح طور پر راہ کی مشکلات سے آگاہ کرتا ہے۔ انہیں کھول کھول کر اس راہ کے نشیب و فراز سے خبردار کرتا ہے۔ اس دور میں پیدا ہونے والی ان کی کمزوریوں کا تجزیہ کرتا ہے اور انھیں ثابت قدمی کی تلقین کرتا ہے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کا انداز تلقین بھی یہی ثابت کرتا ہے کہ ابتدا سے ہی دعوت اس دور میں داخل ہوگئی جو ابتلا اور آزمائش کا دور تھا۔ اوّل تو عام حالات میں کسی تحریک کا کارکن ہونا ہی کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ وہ پیہم حرکت اور جدوجہد کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جب وہ تحریک ابتلا کے دور میں سے گزر رہی ہو تو پھر تو اس کا ساتھ دینا گویا خود اپنے آپ کو مقتل میں لاکھڑا کرنا ہے اپنے تلووں کو خود کانٹوں کے فرش پر رکھ دینا ہے۔ اپنا سر خود شکنجے میں دے دینا ہے۔ مسلط نظام سے وابستہ اپنی امیدوں کا خود گلا گھونٹ دینا ہے۔ اور حق کا کام چونکہ دبنا نہیں اُبھرنا ہے۔ شکست کھانا نہیں بلکہ شکست دینا ہے۔ مایوس ہونا نہیں بلکہ مایوس کرنا ہے اس لئے وہ مصائب کے علی الرغم آگے ہی بڑھتا ہے۔ وہ باطل سے حق فروشی کا سودا کبھی نہیں کرتا اس کے ہاں کفر کے لیے صرف مرجانا ہی مقدر ہے۔ اس لیے وہ کبھی منافقانہ مصالحت نہیں کرتا۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں۔ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کردوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔"

"جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی صلیب اُٹھائے اور میرے پیچھے ہولے"
یہاں صلیب اُٹھانے سے مُراد یہ ہے کہ وہ اپنی موت کی سزا کے لئے تیار رہے۔ اس لئے کہ اس راہ کے تقاضے یہی ہیں۔ اگر کوئی اپنے ذہن میں ریزرویشن (RESERVATION) رکھ کر آتا ہو تو اُسے پہلے ہی اس راہ سے ہٹ جانا چاہیئے اس لئے کہ ابتلا تو ہر اُس شخص پر آئے گی جو اس نصب العین کا دعوے کرے گا۔ اگر وہ ملازم ہوگا تو ملازمت سے برخاستگی کی شکل میں اور اگر تاجر ہوگا تو تجارت میں خسارے کی شکل میں۔ اس کے آنے کے تو ہزار پہلو ہیں۔ خالق کائنات جب اپنے سپاہی آزمائے گا کہ وہ جانباز سپاہی ہے یا کاٹھ کا پُتلا ہے تو اس کی آزمائش کے ہزار راستے ہیں۔ جو شخص ایک راستے سے بچے گا اس پر دوسرے راستے سے آزمائش آئے گی تا آنکہ وہ راہ حق سے فرار نہ اختیار کر جائے۔ اور تا آنکہ وہ اس نصب العین سے ہی دست بردار نہ ہو جائے جس نصب العین سے عشق کی گہرائی ناپنے کے لئے وہ آزمائش اُس پر آئی ہوئی ہے۔
چنانچہ آزمائش اور ابتلا کی اسی تفسیر کو سیدنا عیسیٰؑ نے دوسری جگہ بیان فرمایا:۔
"بھائی کو بھائی کے قتل کے لئے حوالے کرے گا۔ اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے خلاف کھڑے ہو کر انھیں مروا ڈالیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا"
کسی نصب العین کے عشق کا دعوے کرنا کھیل نہیں ہے اس لئے کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے معمولی ایذا سے لے کر جان تک دینی پڑ جاتی ہے۔ کسی نظام باطل میں رہتے ہوئے اُس کے خلاف اعلان جنگ کرنا معمولی کام نہیں ہے اس لئے کہ ایسی کسی تحریک سے دلچسپی۔ ہمدردی یا کارکن کے تعلق کا اعلان ہوتے ہی اس کے چاروں طرف کا ماحول اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ وہ دوست اور عزیز جو اس کی محبت کا دم بھرتے رہے ہوتے ہیں اُس کے درپے آزار ہو جاتے ہیں۔ گویا اچانک انسانوں کی بستی سے نکل کر بھیڑیوں کے جنگل میں آ جاتا ہے۔ اس کے خلاف سازشیں ہونے لگتی ہیں۔ اس پر بہتان لگائے جاتے ہیں۔ اُسے غدار اور انتشار پسند کہا جاتا ہے۔ عدالتوں اور جیلوں کے حوالے کیا جاتا ہے معاشرتی بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ عبادت خانوں سے نکال دیا جاتا ہے۔ کفر کا فتوے لگایا جاتا ہے۔ اور اس کے لئے زندگی دوبھر کر دی جاتی ہے۔ اسی لئے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا:۔
"دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں ــــ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عدالتوں کے حوالے کر دیں گے، اور اپنے عبادت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے کئے جاؤ گے"
"اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا ــ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کر دے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا"
اس قول کی رُوح اس آیت قرآنی کی روح سے کتنی ملتی جلتی ہے۔
"اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ اگر تمھیں اپنے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور برادریاں اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے مندے پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو اور گھر جو تمھیں پسند ہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ فرما دے۔ اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں فرمایا کرتا"　　(توبہ ـــ ۲۴)

تحریک کے بالکل ابتدا میں آنے والی اس ابتلا میں جو طریق کار اور طرز عمل ایک مومن کو اختیار کرنا چاہیئے اور حق کے سپاہی کے صبر و تحمل کا جو معیار ہونا چاہیئے اس کا معیار حضرت عیسیٰ ؑ نے اس طرح پیش فرمایا :-

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور اگر کوئی تجھ پر نالش کرکے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چغہ بھی اسے لے لینے دے، اور جو کوئی تجھ کو ایک کوس بیگار میں لے جائے اس کے ساتھ دو کوس چلا جا"

اس کا نمونہ بھی نبیؐ کے آغاز دعوت کے دور میں ملتا ہے جب مسلمانوں کو گرم ریت پر گھسیٹا جاتا۔ دہکتے کوئلوں پر لٹایا جاتا۔ پتھر کی گرم سلوں کے نیچے دبایا جاتا۔ مارا اور پیٹا جاتا اور عورتوں تک کو نیزے مار کر شہید کر دیا جاتا لیکن تحریک کا ہر کارکن اسے صبر و تحمل اور بردباری سے برداشت کرتا رہا۔

حضرت عیسیٰؑ نے ابتلا میں اپنے ساتھیوں کے سامنے مطمح نظر کی بلندی دنیا کے جھوٹے مدعیوں کے سامنے بے خوفی و بیباکی کا یہ معیار پیش کیا :-

"جو بدن کو قتل کرتے ہیں وہ رُوح کو قتل نہیں کرسکتے ان سے نہ ڈرو بلکہ اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو پیدا کرسکتا ہے صرف خدا سے امیدیں وابستہ رکھنے اور آخرت کے نامۂ اعمال پر ہی نظر رکھنے کے لئے فرمایا۔

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لئے آسمان پر مال جمع کرو"

پھر یہ بے لاگ اصول پیش کر دیا تاکہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے، کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص ابتلا سے بچنے کے لیے دُنیا بازوں سے بھی دوستی رکھے اور خدا کے حقوق بھی ادا کرتا رہے۔ ان سے بھی لاگ رکھے جو خدا کے اور اس کے دین کے قیام کے دشمن ہیں اور پھر بھی اس کی محبت و اطاعت خدا سے بے لاگ رہے۔

"کوئی بھی دو مالکوں کی خدمت نہیں کرسکتا ـ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کرسکتے"

ننگی تلواروں کے درمیان

نبی کریمؐ نے جب مکہ شریف میں تحریک اسلامی کا آغاز کیا تو اس تحریک کو ان تمام فطری مراحل میں سے گزرنا پڑا جو ایک اصولی اور آئینی انقلاب برپا کرنے کے لازمی مراحل ہیں، ان تمام مراحل میں حضورؐ اور آپ کے پاک باز ساتھیوں نے اخلاق و عالی ظرفی اور صبر و تحمل کا جو نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے کسی دور کی کسی تحریک کے کارکنوں اور لیڈروں میں بھی نظر نہیں آتا۔ صبر۔ استقامت۔ ثابت قدمی۔ مقصد کا عشق۔ ہر غیر اللہ سے بغاوت۔ ہر بے اصولی اور ظلم سے مکمل بیزاری۔ خدا کے باغی اور بُرائی کے ہر دعویدار کے مقابلہ میں سربلندی اور بے باکی گھر بار۔ مال اولاد۔ کاروبار، برادری غرض تعلقات کو حق کی قینچی سے بیدریغ کاٹ دینے کی مثال اور شاید کہیں نہ مل سکے۔ پھر یہ آزمائش چند روزہ نہ تھی بلکہ برسہا برس رہی۔ ایک نوعیت کی نہ تھی بلکہ ہر نوعیت کی تھی۔ ظلم بھی اور شفقت بھی۔ تشدد بھی اور لالچ بھی۔ مصالحت بھی اور جان لینے کی اسکیمیں بھی۔ برادری کا دباؤ بھی اور قوت و ہیبت کا استعمال بھی۔ نہ گھر میں زندہ رہنے کی اجازت نہ باہر جاکر پنپنے دینے کا عزم۔ ان حالات میں عرب میں نبی کریمؐ کی قیادت میں تحریک اسلامی چلی۔ اس آزمائش سے تحریک کے لیڈر سے کر ایک ایک فرد تک متاثر ہوا اور برسوں تک تختۂ مشق بنا رہا۔ اس آزمائش سے بظاہر نجات کی صورت نہ تھی۔ لیکن تحریک کے علمبرداروں کا عزم بتاتا

تھا کہ یا کفر کی یہ تاریکی چھٹے گی یا اسلام کے نور کے یہ داعی ایک ایک کرکے جانیں دے دیں گے۔ جو بھی اس راہ میں آگے بڑھا واپسی کی کشتیاں جلا کر آیا۔ جس نے بھی اس مصیبت کو چکھا وہ سارے عیش آرام تج کر اس کا ہو رہا۔ مرد تو مرد عورتوں کا جذبۂ اسلام بھی ایسا نظر آیا کہ جس پر آسمان کے فرشتوں کو بھی رشک آئے۔

حضرت عمرؓ تحریک کے قائدؐ کا خاتمہ کرنے کے لیے ننگی تلوار لئے مکہ کی گلی میں سے گزر رہے ہیں کہ ایک راہرو نے سامنے سے آکر کہا:-

محمدؐ کا خاتمہ کرنے سے پہلے گھر کی تو خبر لو۔ تمھاری بہن اور بہنوئی مسلمان ہوگئے " اور تشدد کا رُخ بہن کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ شدید ظلم اور مار سے جب بہن کے خون جاری ہوگیا تو اس نے بے تاب ہوکر کہا " عمر! جو چاہے کر لو اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا "

یہ جملہ جس حالت میں اور جس انداز میں کہا گیا ممکن نہ تھا کہ کوئی صحیح الفطرت آدمی اُسے سُنے اور اس کے دل میں نشتر بن کر نہ اُتر جائے۔ اس طرح اسلام کے ایک نازک ہاتھ نے کفر کا ایک مضبوط قلعہ فتح کیا۔

حضرت سمیہؓ کو دردناک ایذا دیتے دیتے ابوجہل نے بالآخر ران میں نیزہ مار کر ختم ہی کر دیا لیکن ان کی زبان یہی کہتی رہی کہ اب اسلام سے پھرنا ممکن نہیں۔

حضرت بلالؓ کو ان کا مالک تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹتا رہا۔ لٹا تا رہا اور چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے پتھروں کی سلوں کے نیچے دباتا رہا۔ دہکتے کوئلوں پر لٹایا گیا یہاں تک کہ بدن کی چربی پگھل کر نکل آئی۔

مسلمانوں کو شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال تک فقر و فاقے میں بتلا رکھا گیا، جہاں انھیں سوکھے ہوئے چمڑے کو پانی میں بھگو کر اور آگ پر بھون کر کھانا پڑا۔ اسلامی تحریک کے ان ابتدائی کارکنوں کو گلے میں رسی ڈال کر گھسیٹا گیا۔ پیٹا گیا۔ معاشرتی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا گیا اور بھوکے پیاسے قید و بند میں رکھا گیا۔ اور حبش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا بلکہ وہاں ساز باز کرکے حدود حبش سے بھی نکلوا دینے کی پوری پوری کوشش کی گئی۔

مکہ کے ابتدائی تیرہ سال تحریک کے لئے دردناک ترین سال تھے۔ اس سنگلاخ زمین میں اسلام کی جڑیں پیوست کرنے کے لئے حضورؐ کو جن مشکلات میں سے گزرنا پڑا ان کا تصور بھی اس تحریک کے کارکنوں کو اسلام کی راہ میں جان دے دینے کا عزم بخشنے کے لئے بہت کافی ہے۔ حضورؐ کو مجنوں، شاعر اور جادوگر کہا گیا۔ جو لوگ آپؐ کو " امین " کہتے تھے اور حجر اسود کے نصب کرنے کی خوفناک نزاع میں جسے اپنا ثالث تسلیم کرچکے تھے انھوں نے تنگ کرنے کا کوئی حیلہ اور بہانہ اُٹھا نہ رکھا گیا۔ آپؐ کے سر مبارک پر بحالتِ سجدہ میں اونٹ کی اوجھڑ ڈالی گئی۔ آپؐ کے گلے میں کپڑا ڈال کر اتنی شدت سے کھینچا گیا کہ آپ کا دم رکنے لگا۔ آپ کا مذاق اڑایا گیا۔ راہ میں کانٹے بچھائے گئے۔ مکہ سے تنگ آکر حضورؐ طائف دعوت حق کے لیے گئے تو وہاں آپ کو پتھروں سے مار مار کر لہو لہان کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ لونڈوں اور غنڈوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا گیا اور جب آپ خستگی درماندگی اور مار سے تھک کر سائے میں بیٹھے تو آپ کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا گیا۔ اُس وقت کائنات کے سب سے بڑے محسن انسان کا یہ عالم تھا کہ پاؤں لہو لہان تھے اور آپ کی زبان پر تھا

" میرے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے وہ مجھے نہیں پہچانتی "

سختی اور تشدد کے مقابلے میں لالچ کی ایک دوسری ابتلا بھی تھی جب تمام قبائل قریش نے دعوت حق سے

پریشان ہو کر آپ سے درخواست کی

۱- اگر آپ دولت چاہتے ہوں تو ہم عرب کی دولت آپ کے قدموں پر ڈھیر کرنے کے لئے تیار ہیں۔

۲- اگر آپ بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو ہم تمام قبائل کے سردار آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کئے لیتے ہیں۔

۳- اگر آپ کسی حسین ترین عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔

لیکن آپ دعوتِ حق کو چھوڑ دیں۔ اس تحریص اور اس پیشکش کا جواب حضورؐ کی طرف سے یہ تھا:-

"خدا کی قسم اگر تم میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دو تو میں اس سے باز نہ آؤں گا جب تک میرے جسم میں جان ہے"

تاآنکہ اس سرزمین میں کفر نے اسلام کے لیے آئینی ذرائع سے زیادہ عرصہ تک کام کرنا محال کر دیا۔ تاآنکہ کفر نے اسلام کی زندگی پر براہ راست چھاپہ مارنے کے منصوبے بنائے۔ تاآنکہ یہ طے پایا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک فرد مل کر ایک بلوہ کی صورت میں حضورؐ پر رات کے وقت سوتے ہوئے حملہ آور ہو تاکہ قصاص کا سوال پیدا نہ ہو اور بنی ہاشم زیادہ سے زیادہ خون بہا لے سکیں، کفر کے یہ منصوبے اُس مدبّر حقیقی سے چھپے ہوئے نہ تھے جس کا ہاتھ اس تحریک کی پشت پر تھا۔ جو اپنی طرف چل کر آنے والے کی طرف دوڑ کر جاتا ہے اور جس کی راہ میں تیر چلانے والا ہاتھ گویا اُس کا اپنا ہاتھ ہوتا ہے

ہجرت کا عام حکم ہوگیا اور مسلمان آہستہ آہستہ مدینہ کی طرف جانے لگے۔ یہ وقت تھا جب مال۔ اولاد۔ جائداد۔ مکان۔ کھیتی باڑی اور برادری نسبت راستہ روکنے کے لئے ایک ایک کے سامنے آکھڑی ہوئی اور جانے والوں میں سے کوئی بھی نہ تھا جس کا راستہ وہ روک سکی ہو۔ تحریک کا ہر فرد اسے روندتے ہوئے مدینے کی طرف چلا گیا۔ جس رات حضورؐ نے ہجرت کی وہی رات قیامت کی رات تھی جب آپ پر شیطان اپنے حواریوں کو لیکر حملہ آور ہونے والا تھا لیکن شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔

حضورؐ کا بستر اس رات موت کا بستر تھا اور اس بستر پر سونے کے لئے حضورؐ کے بجائے جس نے اپنے آپ کو پیش کیا وہ حضرت علی کرم اللہ وجہ تھے۔ منصوبہ ناکام رہا اور آپ کی تلاش کوہ و دمن میں شروع ہوگئی۔ آپ کے سر کی قیمت مقرر ہو چکی تھی۔ مال و دولت اور سُرخ اونٹوں کے پجاری تلاش میں مصروف تھے اور حضور اپنے رفیق سفر کے ساتھ غار ثور میں پوشیدہ تھے۔

بار بار کھوج لگانے والوں کے پاؤں کی چاپ سُنائی دے جاتی اور اچانک ایک روز ایک سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کی طرف آتا نظر آیا۔

صدیق اکبر نے فرمایا "میرے ماں باپ حضور پر فدا ہم دیکھ لئے گئے۔

آپ نے فرمایا "لا تحزن ان اللہ معنا" غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اور اللہ واقعی ان کے ساتھ تھا۔ ان دو کے ساتھ تیسرا اللہ تھا، جو اُن کا حامی اور محافظ تھا۔

جنگ بدر میں ایک طرف آہن پوش۔ سازو سامان سے لدے پھندے ہزار سے زائد کافر تھے اور دوسری طرف بیچارگی اور بے سرو سامانی کے ساتھ تین سو تیرہ مسلمان تھے۔ دنیا نے ایسے معرکے اس سے پہلے شاید کبھی دیکھے نہ تھے۔ جب ٹوٹی ہوئی تلواریں لیکر چیتھڑوں میں ملبوس تین سو تیرہ نے ایک آہن پوش جرّار لشکر کے سامنے آنے کی کوشش و جرات کی ہو۔

جنگ احد کے اس منظر کا تصور کیجئے جب حضورؐ گڑھے میں گرے پڑے تھے۔ جب آپؐ کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے۔ جب خود کی کڑیاں آپ کی معصوم پیشانی میں گڑ گئی تھیں۔ جب حضرت فاطمہؓ آپ کے زخموں کو دھو رہی تھیں اور علیؓ پانی

ڈال رہے تھے۔ جب چاروں طرف سے تیر برس رہے تھے اور آپ پہاڑ کی طرح تیروں کی بارش میں کھڑے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار رہے تھے اور اُن کی ہمتیں بڑھا رہے تھے۔ پھر جب آپ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ احد پہاڑ پر پناہ گزین تھے اور نیچے کافر للکار رہے تھے۔ اس طرح دنیا کا سب سے بڑا انسان۔ خدا کا فرستادہ امتحان گاہ میں سے گزر کر اپنی دعوتِ حق کے مراحل طے کر رہا تھا اور یہی وہ مراحل تھے جن میں گزر کر وہ دور آیا جبکہ رحمتِ کاملؐ نے خون کے پیاسے دشمنوں کو یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ "آج معافی کا دن ہے۔ آج امن کا دن ہے" اور انہیں مراحل میں سے گزر کر وہ وقت آیا جب گروہ کے گروہ دین کے دائرے میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔

حق کو ایک تحریک کے طور پر چلنا اور اُسے ایک نظامِ زندگی کے طور پر مسلط کرنا اور اس کے مقابلے میں گہری جڑیں رکھنے والے نظامِ باطل کو اکھاڑ کر پھینکنا تو بہرحال ایک کٹھن کام ہے اور اس کے لوازم یقیناً زیادہ بڑے پیمانے پر قربانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور زیادہ وسیع آزمائش ان پر آتی ہے۔ تاریخ میں تو یہ نظر آتا ہے کہ اگر کسی نے انفرادی طور پر بھی باطل کی کسی ایک بات کے مقابلے میں حق کی ایک بات پیش کی اور اس بات کی پشت پناہی کے لیے اپنی ہستی کو وقف کر دیا تو اس پر بھی آزمائشوں اور ابتلاؤں کا وہ ہجوم ہوا جس کا تصور بھی ایک مفاد پرست کے بس کا کام نہیں۔

علم — با عمل

حضرت امام ابو حنیفہؒ نے حق بات کہی اور باطل کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا اور اگرچہ وہ تنہا تھے وہ کوئی تحریک نہیں چلا رہے تھے جس سے حکومت کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آئے لیکن اقتدارِ وقت نے انہیں بھی برداشت نہیں کیا۔ آپ کو قید و بند کی سختیاں برداشت کرنی پڑیں۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کے بادشاہوں نے آپ کو کوڑوں کی شدید سے شدید سزا دی۔ یہاں تک کہ زہر دے کر آپ کا خاتمہ ہی کر دیا گیا۔

امام مالکؒ کو منصور عباسی کے دور میں ۷۰ کوڑوں کی مار کے ساتھ اس سختی سے مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازوؤں سے اُکھڑ گئے۔ لیکن حق پناہی کے جذبہ کا یہ عالم تھا کہ اسی حالت میں اونٹ کی پشت پر کھڑے ہو گئے جس پر ذلت و رسوائی اور تشہیر کے لیے سوار کرا کے شہر میں پھرایا جا رہا تھا۔ اور پکار پکار کر اس حق کو بیان کیا جس کے جرم میں آپ کی یہ حالت کی گئی تھی۔

امام احمد بن حنبلؒ کو مامون اور معتصم کے زمانے میں جس جس طرح ایذا پہونچائی گئی اور فتنہ خلقِ قرآن پر اُن پر ظلم و ستم کئے گئے اس کی مثال ملنی محال ہے۔ جس وقت تمام علماء خلوت کے حجروں میں سر چھپائے بیٹھے تھے یا اس حکومت پر بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اس مردِ خدا نے حق کی پشت پناہی کا اعلان کیا جس کے جرم میں انہیں گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ چار چار بوجھل بیڑیاں پہنائی گئیں۔ عین رمضان کے مہینے میں بھوکے پیاسے بیڑیوں میں محبوس اور ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے دھوپ میں بٹھائے گئے اور پیٹھ پر لگاتار کوڑوں کی بارش اس طرح کی گئی کہ جلاد آگے بڑھ کر دو ضربیں لگاتے تھے اور پیچھے ہٹ جاتے تھے اور پھر تازہ دم جلاد آگے بڑھ کر ضرب لگاتا تھا۔

جب ان سے کسی نے پوچھا کہ اگر تلوار کے نیچے کھڑے کر دئے گئے تو کیا آپ اس وقت مان لیں گے، آپ نے کہا "نہیں"۔ اس کائنات میں میرے سر کو جھکانے والی دو ہی چیزیں ہیں اللہ کی کتاب یا رسولؐ کی سنت"، پھر شاہ کے کوتوال نے بتایا کہ میں نے کسی انسان کو بادشاہوں کے آگے احمد بن حنبل رحمہ سے بڑھ کر بارعب نہیں پایا۔ ہم عمالِ حکومت تو ان کی نظروں میں مکھیوں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے۔

اور جب حیلہ جو علماء نے آپ سے جا کر وہ روایت بیان کی جس سے جان کے خوف سے تقیہ کر لینے کی رخصت نکلتی تھی تو امام نے کہا لیکن اس حدیث کے بارے میں کیا خیال ہے کہ جب صحابہ نے حضورؐ سے مظالم و مصائب کی شکایت کی تو فرمایا "تم سے پہلے ایسے

لوگ گزر چکے ہیں کہ ظالموں نے ان کو گڑھوں میں کھڑا کر کے آرے سے چیر دیا۔ مگر اس پر بھی انھوں نے حق سے منھ نہ موڑا۔ اور ایسا ہوا کہ حق پرستوں کی کھالوں پر لوہے کی کنگھیاں پھرائی گئیں جو گوشت کو ہڈی اور پٹھے سے جدا کر دیتی تھیں لیکن وہ اس کو بھی سہہ گئے اور حق سے منھ نہ موڑا۔ ——— جیل کو علماء یہ جواب سن کر واپس چلے گئے۔

جن کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

پھر وہ تحریک جو ہندوستان کی سرزمین میں پہلی اسلامی تحریک کہلا سکتی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پورے اسلام کے قیام کے لئے خلافت راشدہ کے بعد پہلی بار ایک تحریک اٹھائی گئی اور پہلی بار ایک اسلامی تحریک کے تمام لوازمات کے ساتھ ایک منظم جماعت قائم کی گئی۔ یہ سید احمد شہیدؒ اور سید اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک اسلامی تھی جو دہلی اور بریلی سے اٹھی۔ بہار اور بنگال سے اپنے مجاہد اور ذرائع رسد فراہم کئے۔ سرحد کے قبائل میں ڈیرہ ڈالا اور پنجاب و سرحد کے خونخوار سکھوں سے نبرد آزما ہوئی۔ جس کا تذکرہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ تاریخ نے صحابہ کے دور کے بعد پہلی بار اس طرز کے لوگ دیکھے جو دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر ہوتے تھے۔ اس تحریک نے کم و بیش پچاس برس تک سرحد میں جہاد کا علم بلند رکھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں پر جو آزمائشیں آئیں اور وہ ان میں سے جس عزم و استقلال پامردی و جوانمردی اور صبر و توکل سے گزرے وہ صبر کرنے والوں کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

۱۸۵۷ء میں جب ہندوستان میں فوجی بغاوت اور غدر نے تمام راستوں کو پرخطر بنا دیا۔ سرحد کے مجاہدوں کے لئے بہار اور بنگال سے چلنے والی سپلائی کٹ گئی۔ فاقہ کشی نے مجاہدین کی حالت تباہ کر دی انھوں نے درختوں کی پتیاں اور کونپلیں کھا کر گزارہ کیا۔ کئی ماہ تک غلّہ کا دانہ بھی نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ خون کی اجابتیں آنے لگیں۔

پھر سازش کے مقدمات شروع ہوئے۔ اور انگریز نے اس تحریک سے وابستگی رکھنے والوں کی لاکھوں اور کروڑوں کی جائدادیں ضبط کر لیں۔ ان لوگوں کی عزیمت کا عجب حال نظر آتا ہے کہ بنگال اور بہار سے پاپیادہ چلتے ہیں اور سرحد میں سیکڑوں میلوں کے فاصلے پر جا کر ایک نئے علاقے میں دشمن سے جنگ آزما ہوتے ہیں۔ عزیمت کے یہی نمونے کسی تحریک کی جان ہوتے ہیں۔ سازش کے مقدمات میں جب مجاہدین کی گرفتاریاں ہوئیں تو انہیں جن عذاب ناک جیلوں کی کال کوٹھریوں میں بند کیا گیا ان کی لمبائی چوڑائی ۵ × ۴ فٹ بتائی جاتی ہے۔ کوٹھری کی تنگی اور حبس کا یہ عالم تھا کہ قیدی کے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہوتا۔ اور قید و بند کی یہ کیفیت کئی کئی ماہ تک رہی۔ کھانا اتنا گھٹیا اور کم دیا جاتا کہ جیل کی گھاس پر گزارا کرنا پڑتا رہا۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے انبالہ جیل سے لاہور کی تبدیلی کی عجیب کیفیت لکھی ہے۔ "کمبل اوڑھے ہوئے بیڑی اور ہتھکڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ پاپیادہ خلخال آہنی کو پہنے ہوئے منزل در منزل چلے جاتے تھے"

پھر لاہور پہنچ کر مزید عنایت ہوئی جس کا ذکر یوں کیا ہے۔

"لاہور جیل کا عطیہ ایک آہنی آڑا ڈنڈا تھا جو بیڑیوں میں ڈال دیا گیا۔ پھر بیڑی۔ ہتھکڑی اور ڈنڈے کے ساتھ ایک بہت موٹی آہنی زنجیر بھی بیڑیوں کے بیچ سے پہنا دی گئی جس کے بوجھ سے کوئی ہل نہ سکتا تھا انڈمان کیلئے کراچی جاتے ہوئے دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا لیکن ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے"

جھوٹے گواہوں کو جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کرنے کے لئے اس اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ بے بس ہو گئے۔ بعض مر گئے ———

مولوی جعفر نے اپنی روداد لکھی ہے کہ ان سے مجاہدین کے حالات معلوم کرنے کے لیے ان پر کیا کچھ سختیاں ہوئیں۔

"پارسن صاحب نے مجھے پہلے بہت دھمکایا اور پھر مارنا شروع کیا۔ جب مار حد کو پہونچی اور میں گر پڑا اور اس پر بھی

میں نے نہ بتایا تو وہ مایوس ہو کر چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب مجھ کو یہ لوگ زندہ نہ چھوڑیں گے۔ میرے ذمہ کچھ روزے رمضان کے باقی تھے۔ دوسرے دن سے ان کی قضا رکھنا شروع کر دی۔ پھر دوسرے دن پارسن صاحب مجھے الگ ایک کمرے میں لے گئے۔ جہاں لے جا کر مارنا شروع کیا۔ کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو —— اپنے رب سے ہر دم یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ اے رب یہی وقت امتحان کا ہے۔ تو مجھ کو ثابت قدم رکھیو"

پھر مولانا یحییٰ علی صاحب کا ذکر کیا ہے جو امیر جماعت تھے

"اس مار پیٹ کی وجہ سے جیل میں ہم سب حواس باختہ ہوتے اور آپ نہایت مسرور و خوش تھے۔ آپ کے چہرے پر کچھ بھی آثار رنج و محن کے نہ پائے جاتے۔ ذکر اللہ سے رطب اللسان رہتے۔ اور حضرت خبیبؓ کے شعر اکثر زبان پر رہتے۔

"جب میں اسلام کی حالت میں قتل کیا جاؤں

تو مجھے اس کی پروا نہیں

کہ اللہ کی راہ میں کس پہلو میری جان نکلتی ہے۔

یہ سب اللہ کی راہ میں ہے

وہ چاہے تو بوسیدہ ٹکڑے ٹکڑے جسم کے اعضا میں برکت اور بالیدگی دے"

چنانچہ جب پھانسی کے بجائے حبس دوام کی سزا دی گئی۔ اور مجاہدوں کے لباس بدل کر ان کے ڈاڑھی مونچھ اور سر کے بال بھی کتر دیئے گئے تو مولانا یحییٰ علی اپنی ڈاڑھی کے کترے ہوئے بالوں کو اٹھا کر کہتے۔

"افسوس نہ کر کہ خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اسی کی راہ میں کتری گئی"

پھر مولانا کو ایک بڑے کنوئیں کے رہٹ میں جوت دیا گیا جسے آپ دو تین روز تک چلچلاتی دھوپ میں چلاتے رہے یہاں تک کہ خون کے پیشاب آنے لگے۔

زندانِ یوسفؑ

زمانہ حال میں حق کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعتوں میں مصر کی اخوان المسلمون کے حالات سے کون ناواقف ہے۔ اس اسلامی تحریک پر ایک "مسلمان حکومت" کی سختیاں کسی کافر حکومت کی سختیوں سے کم نہیں ہیں۔ اس لئے کہ جب مسلمان کہلانے والا اقتدار اسلام کے درپے آزار ہوتا ہے تو اس کی ڈھٹائی اور شقاوت قلبی اپنی انتہا کو پہونچ جاتی ہے۔ وہ ہر ظلم خدا اور رسول کا نام لیکر کرتا ہے۔ ہر مظلوم کے گلے پر "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر چھری پھیرتا ہے۔ ہر معصوم کا خون کافر کہہ کر بہاتا ہے۔ اور ہر معصیت کو عین اسلام کا لیبل لگا کر انجام دیتا ہے۔ اس کے شراب خانے بھی اسلامی شراب خانے ہوتے ہیں۔ اس کے ہاں بد اخلاقی کے بدترین ذرائع بھی اسلامی کلب۔ اسلامی سینما اور اسلامی رقص و موسیقی اور آرٹ کہلاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک اقتدار سے جب اخوان المسلمون کو سابقہ پیش آیا تو ان کے گلے پر چھری پھیرنے کے لیے بھی ایک مسلمان حکومت نے وہ تمام مظالم ایجاد کئے جس کی جرأت کسی کافر حکومت کو بھی نہیں ہو سکتی۔ ان کے لیڈر کو دھوکے اور فریب سے نہایت دردناک طریقے پر گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ ان کی جماعت پر پورے ملک میں پابندی لگا دی گئی۔ ہزاروں اور لاکھوں مسلمان نوجوانوں کو جن کا ایمان اپنے ملک کے لیے بیش بہا سرمایہ تھا جیلوں میں محبوس کر دیا گیا اور ان پر ایک طویل عرصے کے لیے مظالم اور تشدد کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ان کو دردناک عذاب دیئے گئے۔ کوڑے لگائے گئے۔ سانس روک دینے والی تنگ جیلوں میں انہیں ٹھونس دیا گیا۔ اور سب کچھ کیا گیا جو ایک

ہ مگر اب چند ماہ سے حکومت مصر کی روش "اخوان المسلمون" کے معاملہ میں قدرے نرم ہو گئی ہے اور اب انگریزی سامراج کے خلاف جہادِ آزادی میں "اخوان" حکومت اور عوام کے ساتھ پوری مستعدی اور جاں فروشی کے ساتھ شریک ہیں۔ (مدیر)

فرد یا جماعت کو مٹانے، کچلنے اور ذلیل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

ارضِ پاک میں

پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہمارے اربابِ اقتدار کی جو روش اور سلوک رہا ہے، وہ ایک جانی پہچانی اور دیکھی ہوئی حقیقت ہے ـــــ یہاں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جس نے جماعتِ اسلامی کا نام سنا ہو اور وہ یہ نہ جانتا ہو، اور جانتا تو الگ رہا یہ اعتراف نہ کرتا ہو کہ جماعتِ اسلامی کا مقصدِ وجود پاکستان میں اسلامی نظامِ حیات کا نفاذ ہے، جماعتِ اسلامی اسی بنیاد پر بنی ہے کہ پورے کے پورے اسلام کو برپا کیا جائے، ادھورے دین اور "کچھ اسلام اور کچھ جاہلیت" کی وہ قایل نہیں ہے ـــــ اُس کے لٹریچر کا ایک ایک صفحہ اور اُس کے کارکنوں کی جدوجہد کا ہر قدم اس کا عینی شاہد ہے کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی اسٹیٹ بنانی چاہتی ہے، جہاں خدا کا حکم چلے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حیات کی اتباع کی جائے ـــــ مگر جماعتِ اسلامی کے لیڈر مسلسل بیس بیس ماہ تک سیفٹی ایکٹ کے تحت حبسِ بیجا میں رکھے گئے، اس تحریک کے اخبارات کو بار بار بند کیا گیا، اس کی بعض کتابوں کو جو اسلام کی اشاعت اور اخلاق و نیکی کی تبلیغ کا کام کر رہی تھیں ممنوع قرار دیا گیا جبکہ ملک میں بدترین فحاشی، بے اخلاقی اور گمراہی پھیلانے والی کتابیں اور رسائل فروغ پا رہے ہیں اس کے کارکنوں کے پیچھے سی، آئی، ڈی لگائی گئی اُن لوگوں کو ملازمتوں سے نکالا گیا، جو پاکستان کی خدمت کو ایک عبادت سمجھ کر کر رہے تھے ـــــ

جماعتِ اسلامی کے خلاف اخبارات میں بہتانوں اور افترا پردازیوں کا ایک طوفان کھڑا کیا گیا، خوشامدی مولویوں اور ہوا پرست مفتیوں نے اُس کی تکفیر کے فتوے صادر کئے، اس دینی تحریک کو "قادیانیت" کا مماثل قرار دیا گیا، کہیں سے آواز آئی کہ یہ لوگ شیخ عبداللہ کے ایجنٹ ہیں، کوئی بولا کہ ہندستان سے ان کی ساز باز ہے، اور یہ بھی سُنا گیا کہ جماعتِ اسلامی والے امریکہ سے ربط ضبط رکھتے ہیں ـــــ پھر اُس کے لیڈر سے "مہدویت" کا دعویٰ منسوب کیا گیا اور جو لوگ خدا کے حکم کی تعمیل، رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کی اتباع اور صحابہ کرام کی زندگیوں کی تقلید ہی کے لئے ساری جدوجہد کر رہے ہیں اُن پر دین سے دُوری اور بے رغبتی کی تہمت لگائی گئی۔

؎ چوں نہ دید ند حقیقت رہِ افسانہ زدند

ایثار اور قربانی

یہ آزمایش اور ابتلا حق ہی نہیں باطل کی راہ میں بھی پیش آتی ہے، ایثار اور قربانی کے بغیر باطل کو بھی مشکل ہی سے فروغ ہوتا ہے، آزمایشوں کی بھٹی میں تپ کر ہی کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے، اور قدرت اس کا امتحان کرتی ہے کہ اپنے مقصد سے کس کو کتنی محبت ہے۔

اشتراکی تحریک جو آج اُبھرتی اور آکاس بیل کی طرح پھیلتی ہوئی نظر آتی ہے اس کے کارکنوں کو شدید سے شدید مظالم سہنے پڑے ہیں، شداید کے ہولناک طوفانوں سے ٹکرلی ہے اشتراکیت کے علمبرداروں نے ۔۔۔ اور ۔۔۔ یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو نہ خدا پر یقین رکھتے تھے۔ نہ اس طرح کا کوئی مقصد ان کے سامنے تھا نہ دنیا کی اس زندگی کے علاوہ کسی زندگی کی وہ اُمید رکھتے تھے۔ کہ اپنی زندگی کھو کر دوسروں کے لیے مرجانے کو وہ حیات جاوداں سمجھتے تھے۔ صرف دنیا کی چند روزہ راحت اور کامیابی کے لیے اُنھوں نے اتنی عظیم الشان قربانیاں دیں۔ تو ان لوگوں کی ذمہ داریوں کا اندازہ لگائیے جن کا عقیدہ ہے کہ یہ زندگی اور یہ دُنیا امتحان گاہ ہے۔ یہ آخرت کی کھیتی ہے۔ اس چھوٹی سی زندگی کے بعد

وہ دائمی زندگی شروع ہوگی جس کی اچھائی یا برائی کا انحصار اس چھوٹی زندگی کی کمائی پر ہی ہے۔ خدا ہے۔ وہ اس زندگی کا حساب لے گا۔ اس ہدایت کے مطابق لے گا جو اس نے کمال مہربانی سے پہلے ہی پیغمبروں کے ذریعے اپنے بندوں تک پہونچا دی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں وہ لکھا جاتا ہے ضائع نہیں ہوتا۔ ایک پیسہ بھی اگر ہم حق کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو اس کا انعام بھی ہمیں کئی گنا ملے گا۔ پھر یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے یہ ہمارا نہیں ہے بلکہ خدا کا دیا ہوا ہے۔ یہ سب کچھ اسی کا ہے۔ اسی کی امانت ہے۔ اگر ہم یہ سب کچھ بھی اس کی راہ میں لٹا دیں تو گویا ہم نے دیانتداری سے جس کی امانت تھی اُسے ہی لوٹا دی بلکہ اگر جان بھی اس کی راہ میں لٹا دیں تو گویا ہم نے اسی کو وہ چیز دے دی جس نے ہمیں وہ دی تھی، یہ تصور اور عقیدہ رکھنے والے پر قربانی کے لحاظ سے کس قدر عظیم ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ پھر چونکہ اسلامی تحریک کا علمبردار یہ تصورات اپنے گہرے بنیادی ایمانیات کے طور پر رکھتا ہے، اس لئے اس کا ظرف بہت وسیع ہوتا ہے۔ باطل مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والا اگر ایک پیسہ بھی اس راہ میں خرچ کرتا ہے تو اسے بجا طور پر اس پیسے کی جدائی کا کچھ صدمہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ گویا اس نے اپنی ایک چیز صرف کی۔ لیکن اس کے مقابلے میں مومن اگر راہِ حق میں اپنی ساری متاع بھی لٹا دے تو اُسے دکھ کی بجائے فرحت ہوگی اس لیے کہ اس کا تھا ہی کیا جو اس نے دیا۔ اسے تو وہی لذت محسوس ہوگی جو ایک مقروض اپنا قرض ادا کر کے محسوس کرتا ہے۔

پھر حق ابدیت کا حامل ہے۔ وہ ازل سے ایک ہی راستہ کی طرف بہتا اور چلتا چلا آیا ہے اور ازل تک ایک ہی راستے کی طرف چلا جائے گا۔ اس کے ہاں مقاصد اور نصب العین کا انتشار نہیں ہے۔ پھر وہ اپنی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کو ابدی اور ہمیشہ کے انعامات دینے کے وعدے کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ عیشِ ابدی کا سودا زیادہ قربانی اور ایثار چاہتا ہے۔

قنوطیت شیطان کا حصہ ہے

حق کی راہ کی جدوجہد میں ناکامی کی منزل بھی نہیں آتی۔ جو منزل تک پہنچ گیا اُسے تو نفع و نقصان کی ترازو والے بھی کامیاب کہنے پر مجبور ہیں لیکن جو منزل کی راہ میں ہی جان دے گیا حق کی لغت میں وہ بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے کامیابی زیادہ مختصر راہ سے حاصل کی۔ اس لیے کہ وہ تو صرف اپنا اثاثہ راہِ حق میں لگا دینے ہی کا مکلف تھا، جب وہ اس راہ میں اپنا دامن جھاڑ دیتا ہے تو اس کی کامیابی میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے، اس نے اپنی ڈیوٹی پوری کر دی اور کارکن کی کامیابی یہی ہوتی ہے کہ اُس نے ذمہ داری کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پوری کر دی؛ نتائج کا حساب کتاب کرنا اس کا کام ہے جس نے اسے اس ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔ نہ کہ اس کا جس نے ڈیوٹی پر جان دیدی۔ ناکامی تو صرف ان کے مقدر میں ہوتی ہے جو آخرت میں اپنی کھیتی میں کانٹوں کی فصل کے سوا کچھ بھی اُگا نہ سکے۔ اور مورخ نے بھی جن کے بارے میں شرح صدر سے گواہی دے دی کہ ناکامی حقیقت میں انہیں کا حصہ تھی جنہوں نے حق کا راستہ روکا وہ راستہ روکنے میں ناکام ہو گئے تو گویا مقدر نے انہیں دوسری ناکامی سے دوچار کر دیا اور اگر چند دن کے لیے ان کا پلڑا بھاری ہو گیا تو بھی ان کے پلڑے کی بے وزنی ان کے لیے مقدر ہے۔ اس لیے یہ بات تو مسلم ہے کہ جس طرح مومن کے نزدیک مایوسی نہیں آتی اس لیے کہ قنوطیت شیطان کا حصہ ہے۔ اس طرح حق اور ناکامی کی منزلیں بھی مخالف سمتوں میں ہیں۔ یہاں چونکہ نفع اور نقصان کی ترازوئیں نصب نہیں ہوتیں بلکہ ادائیگی فرض کی ترازو ہی فیصلے کرتی ہے اس لیے جس نے اس راہ میں اپنا فرض ادا کر دیا اس نے گویا فیصلے کی ترازو میں اپنا بھاری وزن ڈال دیا۔ اور فرض کی کمی بیشی اسی درجہ کی ہوتی ہے جس درجہ کی کسی جگہ کفر و اسلام کی کشمکش ہوتی ہے۔ کفر غالب ہو رہا ہو تو فرض بڑھ جاتا ہے۔ ڈیوٹی سخت ہو جاتی ہے۔ کفر دم توڑ رہا ہو تو فرض کم ہو جاتا ہے۔

ڈیوٹی نرم ہو جاتی ہے - جیسے کسی بستی میں حفظانِ صحت کا اہتمام ہو تو وہاں ڈاکٹر چین سے بیٹھ سکتا ہے وہ بستی کو بہتر سے بہتر بنانے کی تدابیر سوچتا رہتا ہے اور اگر وہاں وبا پھوٹ پڑے تو پھر اس کے لیے دن دن نہیں رہتا اور رات رات نہیں رہتی۔ ہر مریض کی طرف لپکنا اس کا فرض ہے چاہے وہ اسے رات کے بارہ بجے بلائے یا دن کے بارہ بجے - پھر اس کی ڈیوٹی کے حدود متعین نہیں ہو سکتے - وہ سراپا ڈیوٹی ہوتا ہے - اس وقت اگر وہ اپنی تفریحات کے لیے وقت نکالنا چاہے تو وہ مجرم سمجھا جائے گا۔

آج کا فرض

اس ملک میں حق کی جدو جہد ایک خاص مرحلے میں داخل ہو چکی ہے، اللہ کے دین کو پورے کا پورا قایم کرنے کے لیے جو لوگ اُٹھے ہیں، وہ شدید مزاحمتوں سے دوچار ہیں، مگر اللہ کا فضل ہے کہ ان مزاحمتوں کے باوجود حق کے مخلص خدمت گزاروں کے عزایم روز بروز مستحکم تر ہوتے جا رہے ہیں، سچائی کا نشہ دھونس دھمکی، لالچ اور مصیبت کی کسی ترشی سے بھی اُتر نہیں رہا ہے اور اُتر بھی کیسے سکتا ہے کہ جو لوگ اپنی جانیں اللہ کے ہاتھ بیچ چکے ہیں، وہ اپنے ضمیر کی ایک رمق کا بھی ساری خدائی کے بدلے سودا نہیں کر سکتے۔

خدا کے جن نیک بندوں کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے، اور جنھوں نے اپنا مرنا جینا اُسی "سب سے بڑے" کی رضا اور خوشنودی سے وابستہ کر دیا ہو اُن کے دل سے "چھوٹوں" کا خوف نکل جاتا ہے،

یہی وہ لوگ ہیں جن سے انسانیت کو بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں اور جو کائنات کو صلح و عافیت، امن و آشتی اور خیر و اخلاق سے لبریز کر دینے کا عزم رکھتے ہیں!!

ماہرالقادری

یادِ رفتگان

اگر ہے احساسِ جیبؔ و دامن تو پھر جنوں ہوشیار سا ہے

اور

مرے بغیر کہاں اُن کی گرمئ محفل
بہ طورِ خاص بلایا گیا فغاں کے لیے

(نہال سیوہاروی)

نہالؔ سیوہاروی مرحوم کا نام "عبدالخالق" تھا، یہ بات اُن کے مرنے کے بعد معلوم ہوئی، تخلص کی شہرت نے اُن کے اصلی نام کو چھپائے رکھا، اور اُن کی موت نے شاید سب سے پہلی بار اس پردے کو اُٹھایا، موت پردہ کشا بھی ہوتی ہے اور پردہ پوش بھی!

نہالؔ مرحوم اور میں ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے تھے، کلام اور مضامین کے ذریعہ، مگر یہ بالواسطہ تعارف اور غائبانہ شناسائی تھی، ہم دونوں کی سب سے پہلی ملاقات دہلی میں ہوئی، سنہ تو ٹھیک طرح یاد نہیں رہا، مگر یہ اب سے کوئی پندرہ سال پہلے کی بات ہے، حکیم آزادؔ انصاری مرحوم بھی اس ملاقات میں شریک تھے، اور شریک کیا تھے، اس ملاقات کی "تقریب" خود اُن کی ذات تھی!

وہ نوجوان جن کے ادبی شعور کی عمر دس بارہ سال سے زائد نہیں ہے، حکیم آزادؔ انصاری کے نام پر غالباً چونکیں گے کہ یہ کون صاحب ہیں؟ افسوس ہے کہ اُردو دُنیا نے آزادؔ انصاری کو اتنی جلد بھلا دیا، اور بھلایا بھی تو اس طرح بھلایا جیسے اس نام کا کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔

اب سے پچیس سال پہلے اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا موقر اور سنجیدہ رسالہ ہو جس میں حکیم آزادؔ انصاری کا کلام نہ چھپتا ہو، گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک علمی خانوادہ سے آزادؔ کا نسبی تعلق تھا، مولانا الطاف حسین حالیؔ سے تلمذ تھا، درسِ نظامی متوسط کتابوں تک پڑھا تھا، صاحبِ نظر شاعر تھے، نظم اور غزل دونوں اصناف پر قدرت رکھتے تھے، یہ شعر اُنھی کا ہے:-

شاید تمھیں ہنوز یہ الفاظ یاد ہوں
تجھ سے دعا کرے تو خدا سے دعا کرے

آزاد انصاری کی غزلوں کا مجموعہ ـــــــ معارفِ جمیل ـــــــ حیدر آباد دکن میں اُنھی کی زندگی میں شائع ہوا تھا، نظموں کے مجموعہ کا نام "معارفِ جلیل" رکھا تھا جو افسوس ہے کہ چھپنے سے رہ گیا، اور اب کیا چھپے گا، جبکہ آزاد اُردو داں دُنیا کے حافظہ کی کمزوری کا شکار ہوگئے!

جوش ملیح آبادی سے حکیم آزاد انصاری کی خوب گہری چھنتی تھی اور جوش صاحب نے اُن کی صحبتوں سے علمی اور فنی استفادہ کیا ہے، "غزل" کے خلاف جوش ملیح آبادی کی سرکردگی میں جب ہنگامہ بپا ہوا تو آزاد انصاری نے دوستانہ تعلقات تہ کرکے رکھ دیئے اور "غزل" کی پُرجوش حمایت کی، انھوں نے غزل کے مخالفین کو "نمک حرامانِ غزل" کہا اور یہ لفظی ترکیب اور یہ طنز بہت پسند کی گئی۔

نہالؔ سیوہاروی کے حکیم آزاد انصاری سے بہت گہرے تعلقات تھے، اس لیے ایک دوست کا ذکر نکلا تو دوسرے دوست کا ذکر بھی بیساختہ زبانِ خامہ پر آگیا ـــــــ ہاں! تو نہالؔ، آزاد انصاری اور راقم الحروف کی یہ ملاقات چائے نوشی کے بعد شعر خوانی پر ختم ہوئی! یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب میں حیدر آباد دکن میں رہتا تھا، اور مشاعروں کے سلسلہ میں دِلّی آنا جانا ہوتا تھا، دکن چھٹا تو چند مہینہ بمبئی رہا اور پھر دِلّی میں سکونت اختیار کرلی۔

نہالؔ مرحوم سے دِلّی میں اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں، اُردو بازار میں شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا، نگارستان، بتن کا ہوٹل اور مولوی سمیع اللہ کی دُکان، شاعروں کے یہ تین اڈے تھے، کبھی کبھی شام کو ایڈورڈ پارک میں بھی جماؤ ہو جاتا ـــــــ یا پھر خواجہ محمد شفیع دہلوی کی "اُردو مجلس" ایک دوسرے کی ملاقات کا سب سے زیادہ آسان اور یقینی ذریعہ تھی۔

نہالؔ سیوہاروی محکمۂ ریلوے کے دفتر میں ملازم تھے، شام کو دفتر سے آتے تو اُن کی بغل میں دفتر کی بہت سی فائلیں دبی ہوتیں، جس کی زندگی دانش گاہوں، اور علمی اداروں میں بسر ہونی چاہیئے تھی قسمت نے اُسے دفتر میں پھینک دیا تھا، اُس کی ساری جوانی دفتر ہی کی نذر ہوگئی، پاکستان میں نہالؔ کی قدر دانی کی توقع تھی، مگر یہ توقع پوری نہیں ہوئی، یہاں "صوبہ پرستی" کا کابوس قلب و دماغ پر سوار ہے، نذر الاسلام کے اُبھارنے کے لیے سب کچھ ہو رہا ہے مگر نہالؔ سیوہاروی کو کسی نے پوچھا بھی نہیں یہاں تک کہ وہ بیچارہ سول اسپتال کے جنرل وارڈ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا ـــــــ حالانکہ نذر الاسلام کی شاعری کا جتنا ترجمہ میری نگاہ سے گزرا ہے، اُس کے مقابلہ میں نہالؔ سیوہاروی کا کلام ذرا بھی دبتا ہوا نظر نہیں آتا، کسی کو شبہ ہو تو موازنہ کرکے دیکھ لے!

نہالؔ سے اچھی خاصی بے تکلفی تھی اور دِلّی میں ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن تو ملاقات ضرور ہی ہو جاتی تھی لیکن نہ اُن کا مکان مجھے معلوم تھا اور نہ وہ میرے گھر کو جانتے تھے، چار پانچ سال کی مدّت میں بس وہ ایک دن ڈھونڈتے ہوئے شورہ کوٹھی (سبزی منڈی) پہونچے، دوپہر کا وقت تھا، دروازہ پر کسی نے دستک دی، میں نے کواڑ کھول کر دیکھا تو نہالؔ سیوہاروی نظر آئے، اُن کے ساتھ دو تین اور آدمی بھی تھے، کمرے میں بیٹھتے ہی بولے کہ یہ ہمارے دفتر کے لوگ ایک مشاعرہ کر رہے ہیں، تمھیں ضرور شریک ہونا پڑے گا میں نے اس کے جواب میں کچھ کہا ہی تھا کہ نہالؔ قدرے مُسکرا کر بولے "اُس بات کا انتظام کرلیا گیا ہے، میں نے اِن لوگوں سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ماہر معاوضہ کے بغیر شریک نہ ہوگا ...." وہ لوگ تو کمرے ہی میں بیٹھے رہے، میں نے اور نہالؔ نے گلی میں پہنچکر بات چیت کی، تخلیہ کی ضرورت تھی، ایک رقم طے ہوگئی، اور معینہ تاریخ پر ریلوے کے مشاعرے میں شریک ہوا، صدر بازار (دہلی) کے پل کے

قریب پنڈال میں مشاعرہ کا انتظام تھا، مشاعرہ خاصہ کامیاب رہا۔

کراچی میں نہال مرحوم سے دلّی کی طرح جلد جلد ملنا نہ ہوتا تھا، پھر بھی ہفتہ دو ہفتہ کے بعد کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی، وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، ترنم کی تو اُن کو ہوا بھی نہ لگی تھی "تحت لفظ" بھی ٹھیک طرح پڑھنا نہ آتا تھا، کلام کی بلندی اور دلکشی اُن کے پڑھنے کے انداز کی کمزوری پر غالب آجاتی۔

مشاعروں میں عام طور پر گلے باز قسم کے شاعروں کی پُوچھ ہوتی ہے اور نہال کو قدرت نے پُوری فیاضی کے ساتھ شاعر تو بنایا تھا مگر "موسیقار" نہ بنایا تھا اس لیے مشاعروں میں اُن کو کم ہی دیکھا گیا، اب سے ڈیڑھ سال پہلے راولپنڈی کے "کل پاکستان مشاعرہ" میں منتظمین مشاعرہ نے کراچی سے نہال مرحوم کو بلا کر حقیقت میں جوہر شناسی کا ثبوت دیا، وہاں تین دن تک میرا اور اُن کا ساتھ رہا۔

جب نہال سیوہاروی دلّی میں تھے تو نوجوان لکھے پڑھے لائق بیٹے کی موت کا صدمہ سہنا پڑا، کوئی دوسرا اُن کی جگہ ہوتا تو اُس کی کمر ٹوٹ جاتی مگر نہال کا دل غم کے اس پہاڑ کو سہہ گیا، اُن کی زندگی آسودہ حالی سے بہت ہی کم آشنا رہی —— اور شاید نہ بھی رہی ہو، میں نے اُن کے جسم پر اچھا لباس کبھی نہیں دیکھا، سادگی اُن کی فطرت تھی اور شکستہ حالی اُن کا مُقدر! وہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے، اور چہرے پر ربودگی ہر وقت چھائی رہتی، بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا، نیا آدمی اُن کے انداز کلام اور طرز ادا کو دیکھ کر شاید مُسکرا دیتا، مگر اُن کے دوست آشنا اور شناسا اُنکی باتوں کے خوگر ہو چکے تھے اور اُن کی گفتگو میں لُطف اور دلچسپی لیتے تھے۔

مجھے ایک صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ نہال بیمار ہیں اور ہسپتال میں اُن کا علاج معالجہ ہو رہا ہے اس اطلاع کے شاید دوسرے یا تیسرے دن اُن کی علالت کی خبر اخبار میں پڑھی، ایک دن شام کو مغرب کی نماز کے بعد سید شبیہ الحسن صاحب بختیاری بیرسٹر اور میں دونوں سول ہسپتال پہونچے، گیٹ کیپر نے ہمیں دروازے پر روکا، اور اُس کا روکنا نامناسب نہ تھا، مگر منت سماجت پر اُس کا دل پسیج گیا اور ہمیں جانے دیا اندر پہونچکر سب سے پہلے انکوائری آفس کا رُخ کیا، وہاں مریض کے نام کا سوال کیا گیا، ہم نے کہا مریض کا نام تو ہمیں معلوم نہیں ہے، اُن کا شاعرانہ نام "نہال" ہے، رجسٹر میں غالباً یہی نام (تخلص) لکھا ہوگا، اس آفس میں ایک شناسا بھی مل گئے، اُن کی وجہ سے یہ مشکل آسان ہوگئی! پھر ہم دونوں اُس اپنے شناسا کے ساتھ مریضوں کے جنرل وارڈ میں پہونچے، جہاں "شہابِ انقلاب" کا مصنف ایک پلنگ پر سُرخ رنگ کا کمبل اوڑھے ہوئے لیٹا تھا اور اُسے دوا پلائی جا رہی تھی، مُنہ سے آوازیں نکل رہی تھیں! یہ بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے مریض کی آوازیں تھیں جن کو درد ناک ہونا ہی چاہیئے تھا۔

دوا پلائی جا چکی تو ہم دبے پاؤں اس طرح کہ چاپ سُنائی نہ دے، نہال مرحوم کے پلنگ کے پاس پہونچے، اور اُن کی پٹّی کے قریب کھڑے ہوگئے، وہ ہمیں پہچان نہ سکے، پھر میں نے اور بختیاری صاحب نے اپنے اپنے نام بتائے، اس جواب میں "اچھا، اچھا" کہا، شاید ہوش وحواس میں عدم اعتدال کی کیفیت پیدا ہو چلی تھی —— رات کے وقت مریضوں کے جنرل وارڈ میں جانے کا میرا پہلا اتفاق تھا، در و دیوار پر اُداسی، اور حسرتناک سکوت چھایا ہوا تھا، کسی گھر میں ایک مریض ہوتا ہے تو گھر کی فضا بدل جاتی ہے اور یہاں تو چاروں طرف مریض ہی مریض دکھائی دیتے تھے!

پھر ہم نے "وارڈن" سے گفتگو کی، اُس نے کہا کہ اِن کی حالت کل بہت ابتر ہوگئی تھی آج نسبتاً بہتر ہے مگر یہ خطرے سے باہر نہیں ہوئے، بہت سے امراض جمع ہوگئے ہیں، میں نے کہا کہ ہر مریض آپ کی یکساں توجہ کا مستحق ہے، ہم کسی امتیازی سلوک کا مطالبہ نہیں کرتے بس اتنا عرض کیے دیتے ہیں کہ یہ مریض شعر و ادب کی امانت ہے ——— وارڈن نے اس پر دوا کی ایک شیشی دکھائی اور کہا کہ میں ابھی ابھی بازار سے یہ دوا چالیس روپے میں مول لیکر آیا ہوں، ہمارے جو کچھ امکان میں ہے وہ کر رہے ہیں۔

نہالؔ کا یہ آخری دیدار تھا، تیسرے دن صبح کو روزنامہ "جنگ" میں اُن کے انتقال کی خبر پڑھی اور اخباروں میں اب تک اُن کی تعزیت کی اطلاعیں چھپ رہی ہیں، مگر جانے والا جا چکا، ساری دُنیا کی سینہ کوبی بھی اُسے واپس نہیں لاسکتی، موت ہر جاندار کی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے، اس سے مفر نہیں، سب اسی منزل کے مسافر ہیں، بس آگے پیچھے کی دیر ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کہ حئی و قیوم اور دائم و باقی ہے ہر چیز فنا آمادہ ہے، آدمی اس زندگی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا، ہر کوئی دُنیا جہان کی شہرتیں، عزتیں اور مال و دولت اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے، خواہشوں اور تمناؤں کی کوئی انتہا نہیں، ایک تمنا پوری ہوتی ہے تو دوسری آرزو فوراً ہی سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ اب میرے لیے تگ و دو کیجئے! آدمی اس چکر سے مرتے دم تک نکل نہیں پاتا ——— مگر موت آتی ہے تو ساری تمنائیں عزتیں اور شہرتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، دُنیا کی کوئی عزت، کوئی شہرت اور مال و دولت کے انبار سے ایک تنکا بھی آدمی کے ساتھ نہیں جاتا، ہر چیز دُنیا ہی میں چھوٹ جاتی ہے، ہاں! اعمال اور صرف اعمال ساتھ جاتے ہیں۔

بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی، جس کا ایک شعر تھا:-

جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

آبرو اور تندرستی کے ساتھ اللہ سے یہ بھی دعا کرنی چاہیئے کہ وہ اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق بھی عطا فرمائے، ہم نہالؔ مرحوم کے لیے دُعائے مغفرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنا عجز و نیاز بھی پیش کرتے ہیں اور نفس کی بُرائیوں سے پناہ مانگتے ہیں ———

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و التوّاب الرّحیم!

خان بہادر سیّد رضا حسین

انگریز نے ہمیں کیا دیا؟

اور اس پر شاعرِ مشرق چیخ اُٹھا!

جب خاندانِ تیموریہ تاراج ہوا اور لکھنؤ لٹا، تو عافیت پسند بزرگوں نے قوم کو مشورہ دیا کہ فرنگی فاتحین جو نظامِ تعلیم مرتب کر رہے ہیں، اس سے مستفید ہو کر اپنی حالت درست کرو۔ قید مذلّت سہی، پیٹ کی روٹی تن کا کپڑا تو میسر ہوگا۔ دیکھو آخر غیر بھی تو یہی کر رہے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں تم میں کون سا شرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ حکومت گئی، اب غلامی کا تو سلیقہ سیکھو۔

ادھر مفتوح کی طرف سے احتیاج کا اظہار ہونے لگا، اُدھر قومِ فاتح کے دانش وروں نے احتیاط کی تمام نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک نظامِ تعلیم مفتوح کے لئے تیار کر لیا۔ آخر حکومت چلانے کے لیے آدمیوں کی ضرورت تھی ہی، ماہرانِ فرنگ کی رائے ہوئی کہ انگریزی تعلیم رائج کی جائے، اپنے افسروں کو بھی آسانی ہوگی اور رعایا جب روٹی سے لگ جائے گی تو اس کو رام کرنا آسان ہوگا۔ لیکن یہ نظام تعلیم اس انداز کا ہونا چاہیئے کہ ملازموں کی زیادہ سے زیادہ استعداد اور صلاحیت دفتری نظم و نسق میں کام آسکے مگر اُن میں اپنی شیرازہ بندی اور قومی برتری کا احساس پیدا نہ ہو سکے، یعنی تعلیم سے بہرہ مند ہو کر اُن میں وفادار غلام اور تابعِ فرمان محکوم بننے کا اور زیادہ سلیقہ پیدا ہو جائے

؎ شریکِ حکم غلاموں کو کر نہیں سکتے خریدتے ہیں فقط ان کا جوہرِ ادراک

یورپ میں یہ بات تجربہ میں آچکی تھی، اور ۔۔۔ انگریز ماہرینِ تعلیم اس سے خوب واقف تھے، کہ جب تک یورپ میں قومی زبان آزاد نہ ہوئی، اور علوم پر لاطینی غلاف چڑھا رہا، اس وقت تک لوگ ناواقفیت کے باعث، بادشاہوں اور مذہبی پجاریوں کی کورانہ تقلید و اطاعت کرتے رہے۔ لیکن جب لاطینی کی گرفت ڈھیلی پڑی تو ایک دورِ احیائے علوم (Renaissance) شروع ہو گیا اور افکار آزاد ہو گئے۔ اس آزادئ فکر کے بعد انقلابات کے ایسے ایسے پُرشور طوفان یورپ میں آئے کہ بادشاہوں کے تاج و تخت اُس میں غوطے کھاتے اور خس و خاشاک کی طرح بہتے ہوئے نظر آنے لگے ۔۔۔۔۔ یہ تلخ تجربات انگریزوں کے سامنے تھے، اس لئے انھوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ہندوستانیوں کے افکار آزاد نہ ہونے پائیں، فاتح کے علم و تہذیب کی مرعوبیت اُن کے ذہن و فکر پر مسلّط رہے، اور رعایا نئی حکومت، نئے معاشرے اور جدید تہذیب کو اپنے لیے مفید اور بابرکت سمجھتی رہے۔

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض قومی روایات جو اپنی قومی زبان میں اس طرح بیان کی جاتی ہیں کہ لوگ اُسے سُن کر اور

پڑھ کر اپنے اندر ایک طرح کی اُمنگ محسوس کرتے ہیں اور خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن دوسری زبان میں وہی بات کہی جاتی ہے تو اُس کا اثر جاتا رہتا ہے اپنی حکومت کو قومی زبان کے اس جوش پرور اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے "زبانِ غیر" کو مقبول اور عام بنانے کی ضرورت تھی درحقیقت یہ ایک طرح کی سیاسی سازش تھی۔

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

ان تمام مصالح کے پیش نظر انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا کہ مناصب و مراتب اُنھی کو بخشے جائیں گے جو فاتح کی زبان سے واقفیت کا ثبوت دیں گے۔ قومی زبان کا سکہ معیشت کے بازاروں میں اب کھوٹے داموں پر چلے گا!

آقا کی خوشنودی کی فکر غلام میں جذبات کمتری پیدا کرنے والی چیز ہے اور اب کہ اجر وافر کی اُمید پیدا ہو گئی لوگ کیوں نہ نئی روش کو سعادت سمجھتے۔ جو غریب تھے وہ مقامی مشن مدارس میں داخل ہو گئے، جو صاحب ثروت تھے اُنہوں نے اپنے لیے انگلش ہاؤس بنا لیا تاکہ زبان کے ساتھ انگریزی تمدن اور تہذیب سے آشنائی ہو جائے، ایسی آشنائی جو اپنی تہذیب اور قومی روایات سے قلب و دماغ کو بیگانہ بنا دے، اب رہے اُمرا سو وہاں:-

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش (اکبر الہ آبادی)

اور

ہوا ہے بندۂ مومن فسونئ افرنگ اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یارب کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

جذبات احساسات سے پیدا ہوتے ہیں، احساسات معاشرے کے خمیر سے اُٹھتے ہیں اور معاشرے کا انتخاب تربیت پر منحصر ہے۔ اگر آپ کی تربیت اس طرح پر ہوئی ہے کہ آپ اپنی قومی زبان کے ذریعہ اپنی قومی روایات سے روشناس نہیں ہو سکتے تو آپ اپنے معاشرے کی تعمیر کے لیے غیروں کے یہاں سے مسالا لائیں گے اور پھر اس معاشرے سے آپ کے احساسات و جذبات مرتب ہوں گے ؎

ترا وجود سراپا تجلئ افرنگ کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

اس سے مراد یہ نہیں کہ انگریزی زبان کا سیکھنا مضر ہے۔ ضرر تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ زبان پر قابو نہ پائیں بلکہ زبان آپ پر حکومت کرے۔ آپ انگریزی خوب پڑھیں، "ٹینی سن" کے "ان میموریم" کی خوبیوں کا اعتراف کریں لیکن غیر کے مراثی آپ کو انیس کی قادر الکلامی کی یاد دلائیں۔ آپ "ورڈ سورتھ" کے "ڈیفوڈلس" پر مسرور ہوں لیکن یہ حقیقت آنکھوں سے مستور نہ ہو کہ یہ نظم غالب کے "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" کی نقل ہے۔ وہاں سادگی گل ہے یہاں جمالِ یار ہے۔ ایک سیاسی بزرگ کا قول ہے کہ انگریز خراب آقا اور اچھا خادم ہے۔ میں کہتا ہوں انگریزی زبان اچھی باندی اور بری بیگم ہے۔

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی کہ از وے روحِ قومے می تواں کشت

اس بحث سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہونی چاہیئے کہ زبان ہی سب کچھ ہے اور اگر حصول تعلیم قومی زبان کے ذریعہ

سے ہو تو نقائص ہی پیدا نہ ہوں گے۔ ماحول کی بہت سی باتیں اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ایک زمانہ ایسا بھی آگیا تھا کہ ہمارے ادب کے ابتذال پر مولانا حالی کو لکھنا پڑا ؎

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے — مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے (حالی)

بلکہ یوں کہیے کہ ہماری شاعری اُس پستی میں پہونچ چکی تھی کہ غیر زبان کے لٹریچر کی بُرائیوں کے خلاف ہماری غیرت احتجاج تک کے لیے آمادہ نہ تھی۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر — لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ

قومی زبان سے بھی زیادہ قوم کے افراد میں ایک فطری صلابت، جسارت اور طاقت قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ طاقت بے احتیاطی سے زائل بھی کی جا سکتی ہے جیسا کہ مشہور مورخ لین پول لکھتا ہے کہ "بابر کے ہمراہی سُرخ و سپید مرد میدان جفاکش گھوڑوں پر سوار آئے لیکن اُن کی اولاد پالکیوں میں ریشم پہنے ہوئے رخصت ہو گئی" یہ طاقت شائستہ عنوان سے بیدار بھی کی جا سکتی جیسا جاپان و جرمنی و روس میں مختلف نصب العین کے تحت کیا گیا۔ بہر حال ناقص ہے وہ تعلیم اور بدنصیب ہے وہ قوم جو قوت کی قیمت نہیں سمجھتی۔

تو اُن کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے — مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی — دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

فاتحین اپنے مفتوحوں کو عام طور پر نان و شکم کے جھمیلوں میں اُلجھا دیا کرتے ہیں کہ ذہن و فکر کی پرواز محدود ہو کر رہ جائے۔ "اسرار خودی" میں علامہ نے ایک قصہ شیر کے بچوں کا لکھا ہے جو بکریوں کے ساتھ رہ کر ساری شیری بھول گئے۔ ہندوستانی طلباء کو بھی طارق کی جگہ نلسن کی طرف توجہ دلائی گئی۔

با فرنگی بتاں خود را سپردی — چہ نامردانہ در بیت خانہ مردی

جو مدرسے انگریزوں کے لیے مخصوص تھے وہاں باقاعدہ اسلحہ خانہ ہوتا تھا بچے ابتدائی فوجی قواعد میں بائیس بور کی رائفل استعمال کر سکتے تھے لیکن ہندوستانیوں کو لکڑی کی بندوقیں بھی قواعد میں ممنوع تھیں۔ یہ تو جب پہلی جنگِ عظیم میں حکومت پر مصیبت پڑی تب سے دو چار آدمی لیے جانے لگے۔ یہاں بھی زر قاضی الحاجات بنکر آیا۔ کوئی قومی جوش اس کا محرک نہ تھا،

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

انسان خود غرض، آرام طلب، رنگین مزاج، بے حس جان دار بنکر ملت فراموش ہو جاتا ہے۔ جب کوئی انقلاب یا حادثہ اس کو اپنی تنہائی کا احساس دلاتا ہے تو وہ معنوی رشتوں کا سہارا تلاش کرتا ہے لیکن اس کو صحیح مدد میسر نہیں آتی ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

"ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ" کا سبق ایک ایسے نظام تعلیم میں جو ایک فاتح قوم نے مفتوح کے لیے تیار کیا ہو نہ ملے گا۔ فاتح کی حکومت کا نظریہ تو ہمیشہ یہ ہوگا کہ ؎

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی ۔۔۔ موسیقی و صورت گری و علم نباتات

صحیح نظام تعلیم کا مقصد اولین ملت کی شیرازہ بندی ہے

مسلمانی غم دل در خریدن ۔۔۔ چو سیماب از تپ یاراں تپیدن
حضور ملت از خود در گزشتن ۔۔۔ دگر بانگ انا الملت کشیدن

لیکن انگریزوں کی بندہ نوازی اور کرم گستری پر ہم شاکر و صابر اس قدر اعتقاد رکھتے تھے کہ ہماری اور غیروں کی تگ و دو میں بُعد المشرقین پیدا ہوگیا۔ وہ سنگھٹن، سنگ، سیوا سدن، دیسی بھنڈار، کھدر پرچار، دیہات سدھار میں لگ گئے، اور ہم ڈنر، لنچ، ایٹ ہوم، ایڈریس اور ممبری کے چکر میں پھنس گئے۔

مسلمانوں کی اس کوتاہ اندیشی سے قوم کے نوجوانوں کا جو حال ہوا اُسے اقبال کس قدر خلوص عقیدت اور درد مندی کے ساتھ بارگاہ رسالت پناہ میں عرض کرتے ہیں۔

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وارہاں ایں قوم را از سازِ مرگ
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ
ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر
آرزو در سینۂ او زود میر
مکتب[1] از وے جذبہ دیں را ربود
از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر
از مقامِ او نہ داد اُو را خبر

---

[1] مقام افسوس ہو کہ پاکستان بننے کے بعد بھی مدرسوں، کالجوں اور تعلیمی اداروں میں اُسی طرز کی تعلیم دی جا رہی ہے جو مسلم نوجوانوں کو دین سے قریب تو کیا کچھ نہ کچھ دُور ہی کر دیتی ہے، ہماری تعلیم گاہیں ابھی تک انگریز کے نقش قدم پر گامزن ہیں ـــــ صد افسوس! (مدیر)

خالد مینائی
(ایم - اے)

"بالِ جبریل"

رموزِ سروری سیکھے ہیں طغرل سے نہ سنجر سے — کہ میراثِ پیمبر دل نے پائی ہے قلندر سے
قناعت ایک گوشے پر، تمنا بیکراں دل میں — کھلا رازِ کمالِ تابناکی مجھ پہ گوہر سے
فضاؤں پر بلندی کے حقائق ہو گئے روشن — ہما نے جب اپنی ابتدا پوچھی سمندر سے
کہا میں نے کہ پوچھوں حال کس سے تیری سطوت کا — کہا ہنس کر مقدر نے کہ دارا سے سکندر سے
محبت کا بھلا ہو مرکزِ اصلی پہ لے آئی — نہیں تو نوعِ انساں ہٹ چلی تھی اپنے محور سے

تصور سے کسی کے چشم و دل مانوس ہیں اتنے
ابھرتی ہے وہ شکلِ دلنشیں ہر ایک منظر سے

کوثر نیازی نے محسوس کر کے کہا

بیانِ بادۂ گلفام و ذکرِ وصلِ حبیب — مرے وطن کے سخنور کو بس یہی ہے نصیب
فقیہِ شہر تقدس فروخت کرتا ہے — قلم کی عفت و عصمت کو بیچتے ہیں ادیب
مریض کس پہ بھروسا کرے، کہاں جائے — مرض کو خود ہی بڑھانے کی فکر میں ہے طبیب

متاعِ سیم و گہر عام ہے مگر کوثر
زرِ عمل سے تہی دست ہیں امیر و غریب

رہبروں کی فریب کاری نے — رہزنی کو بہار بخشی ہے
دعوتِ دین دینے والوں کو — میری ملت نے دار بخشی ہے

کاش اس پر نثار ہو جاتی
اس نے جو جانِ نزار بخشی ہے

از:- ماہرالقادری

نوائے سروش

نظر نظر پہ ہے بندش، نفس نفس ہے غلام
یہ زندگی ہے تو اس زندگی کو میرا سلام

مری نگاہ میں ہے حسنِ جوہرِ شمشیر
تری نگاہ میں آرایشِ غلافِ نیام

تغیرات خیال و نظر کے پردے ہیں
نہ ابتدائے سحر ہے نہ انتہائے شام

یقین مرکزِ توحید پر رہا لیکن
تصوّرات کے سانچے میں ڈھل گئی اصنام

خرد کے ساتھ جنوں کا نباہ ہو نہ سکا
یہ مصلحت ہے سراپا وہ سوز و درد تمام

ہزار تاج محل اور ایک نقشِ خودی
بس ایک ذرّۂ دل اور بیشمار اہرام

ٹھہر ٹھہر کہ زمانہ پکارتا ہے تجھے
سنبھل سنبھل کہ ہے پھر تیز گردشِ ایام

وہ زہد جو کہ رضامند ہو غلامی پر
ہے ایسے زہد پہ آبِ ہوائے خلد حرام

وہ سرزمینِ حرم جو ہے اہلِ دل کی پناہ
فرنگیوں نے وہاں بھی بچھا دیئے ہیں دام

تمام مشرق و مغرب خراب ہیں اے دوست!
سیاسیات کے فتنے، فریبِ علم کلام

تراشِ حیلہ و رخصت، خیالِ وجد و سماع
یہ مفتیوں کی شریعت وہ صوفیوں کا مقام

جبیں پہ داغِ غلامی، لبوں پہ موجِ درود
جنابِ شیخ پہ مشکل سے آئے گا الزام

سکون و عیش تو اہلِ ہوس کی قسمت ہے
ازل کے دن سے محبت رہی ہے بے آرام

● ماہ جنوری کے "فاران" میں یہ شعر:- بولی ہی ہم نے بتوں کی جے بھی ؛ بات کہنے کی نہیں ہے، ہے بھی — جو شائع ہوا ہے وہ دراصل

ماہر القادری

ڈو جنازے!

کوئٹہ کی برفانی ہوائیں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ بارش کا ایک چھینٹا بھی پڑگیا جس نے کم سے کم ایک رات کے لیے کراچی کی فضا کو کرۂ زمہریر بنادیا، جاڑے کے مارے لوگوں کے دانت سے دانت بج رہے تھے، وہ جسم جو پھیلنے میں راحت محسوس کرتے ہیں، آج زیادہ سے زیادہ سکڑ جانا چاہتے تھے، چھوٹے بچوں کی مٹھیاں آپ ہی آپ بھنچ گئی تھیں وہ اس طرح اپنے اندر گرمی پیدا کرنا چاہتے تھے —— فطرت خود سب سے بڑی معلّم ہے!

غریبوں کی آج موت تھی، اُن کی جان پر سچ مچ بن رہی تھی اور کسی کسی کا تو دم لبوں پر آگیا تھا، جس سردی کو موٹے موٹے لحاف اور اُونی کمبل نہ روک سکتے تھے، اُس کا مقابلہ پھٹی ہوئی چادریں اور بوسیدہ کھیس کس طرح کرسکتے تھے، ہوا کے سرد جھونکے تیر کی طرح جسموں سے آکر ٹکراتے اور رگوں میں سنسنی دوڑ جاتی، جھونپڑیوں میں "ہر" والے کُنبے ایک دوسرے سے اس طرح چمٹے ہوئے بیٹھے تھے جیسے یہ سب کے سب جُڑواں پیدا ہوئے ہیں، ایک دوسرے کی جسم کی گرمی سے فائدہ اُٹھا رہا تھا —— کسی کسی کلرک یا چپراسی کے کوارٹر میں کوئلہ کی انگیٹھی بھی دہک رہی تھی اور پورا گھر اُس پر جھکا پڑتا تھا —— کوئلوں کی چٹک آج کلیوں کی چٹک سے کم نغمہ نواز نہ تھی، اندیشہ تھا کہ اگر سردی کی شدّت کا یہی عالم رہا تو آگ سے یہ محبّت اور دلچسپی "پرستش" کی حد تک نہ پہونچ جائے، اور مسلمان خدانخواستہ "گبر و ترسا" نہ بن جائیں، پارسیوں کے مقدس آتش کدے آج شباب پر تھے!

کوئلوں کی انگیٹھیاں ہر آدمی کو میسر نہیں آتیں، کوئلہ گراں بھی تو پڑتا ہے! جھونپڑی والے تو الاؤ اور چولھوں پر ہاتھ پاؤں سینک رہے تھے اور کوئی کوئی خدا کا بندہ گرم بھوبل پر ہی تاپ رہا تھا —— جانوروں میں سب سے زیادہ سخت وقت بیچارے کتّوں پر تھا، دُم دبائے ہوئے سر چھپانے کے لیے پناہ تلاش کرتے پھر رہے تھے، سردی نے اُن کی جنگ جو طبیعت کو کم سے کم ایک رات کے لیے صُلح پسند بنادیا تھا —— کتّے آج بھیگی بلّی بنے ہوئے تھے۔

نیلے رنگ کے ایک خوش منظر بنگلہ میں تیزی کے ساتھ ایک موٹر داخل ہوئی، ۱۹۵۱ء کے جدید ترین ماڈل کی بیوک کار، جو صبا رفتار بھی تھی اور دیدہ زیب بھی! ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور عجلت کے ساتھ موٹر سے اُترا، جلدی میں اُس کے گلوبند کے پیچ بھی کھُل گئے، اُس نے گلوبند کو مضبوطی کے ساتھ کانوں سے لپیٹا، اور ہاتھوں کی انگلیوں کو کئی بار کھولا اور بند کیا، اتنے میں نوکرانی کی آواز اُس کے کانوں میں آئی .. .. "بابو! سرکار تمھیں بلا رہی ہیں .. .. "! وہ اس آواز پر تیزی کے ساتھ لپکا اور ڈرائنگ روم میں پہونچ ہی تو گیا۔

یہ گولی مار کی جھونپڑیاں نہیں ایک دولت مند کا ڈرائنگ روم تھا، سچ مچ جنت نشان! ایرانی قالین،

ریشمین پردے، گداز صوفے، مرمریں مجسمے، خوبصورت گلدان، پھر ہیٹر (HEATER) نے کمرے کو گرم بنا رکھا تھا، سردی تو غریبوں اور مفلسوں کو ستاتی ہے، امیروں پر اُس کا زور نہیں چلتا، پیسہ میں بڑی طاقت ہے، مایا کے آگے موسموں کی بے رحمی بھی ڈنڈوت کرتی اور سیس نواتی ہوئی نظر آتی ہے۔

—— بابو! تم اب تک کہاں رہے! فریر ہال، یہاں سے ایک میل بھی نہیں ہے اور تم پورے ایک گھنٹہ میں لوٹ کر آئے ہو —— ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے اونی شال کی کور چھوتے ہوئے کہا

—— سرکار! ہوا یہ کہ انجینیر صاحب ہوٹل میں چائے پینے کے لیے اُتر گئے اور کوئی آدھ گھنٹہ میں واپس آئے، اسی سبب سے دیر ہوگئی —— ڈرایور نے نرمی کے ساتھ جواب دیا

—— تو تم اُس سالے انجنیر کو ہوٹل میں چھوڑ کر چلے آتے، اُس کے باپ کی موٹر تھی، میں نے سردی کا خیال کرکے اُسے موٹر میں بھجوا دیا تھا۔ مگر اُس نے بڑے اوچھے پن کا ثبوت دیا، واہ صاحب واہ! عجیب لوگ ہیں، ... ... (سگریٹ سلگاتا ہے .. .. ..) — خیر، دیکھو! بابو کل صبح تم ذرا سویرے آجانا، بی بی کو کالج ذرا جلدی جانا ہے .. .. اور اس کے جواب میں ڈرایور "بہت اچھا" کہہ کر باہر چلا گیا —

ڈرایور موٹر کو گیرج میں کھڑا کرکے گھر پہونچا —— اُس کا گھر جھونپڑی نما تھا، ایک دیوار تو مٹی کی بنی ہوئی تھی اور وہ بھی اتنی بوسیدہ تھی کہ جیسے اب گری تب گری، تین طرف اُس نے چٹائیاں کھڑی کر لی تھیں اور چھت ٹاٹ کے ٹکڑوں کی تھی ، گھر میں چھوٹے بڑے سات نفر تھے اور چار پائیاں کُل تین تھیں جن میں سے ایک کے آدھے سے زیادہ بان ٹوٹ چکے تھے اور سونے والے کو جیتے جی قبر کا تھوڑا بہت تجربہ ہوجاتا تھا۔

ڈرایور تھکا ہارا تھا، موسم اچھا ہوتا تو پلنگ پر لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی، مگر آج نیند کا کوسوں پتا نہ تھا، ایک تو جاڑا، دوسرے اُس کے آقا نے حکم دیدیا تھا، یہ فرمان واجب الاذعان اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ ... . "کہ صبح ذرا سویرے آنا .. .. " اُس کی رات خواب و غنودگی کے درمیان بسر ہوئی، کبھی پلک جھپک جاتی، کبھی ہوشیار ہوجاتا، یہاں تک کہ دن نکلنے سے پہلے وہ اُٹھ بیٹھا، بیوی نے چولھا جلایا، سب بچے چولھے کے اردگرد آن کر بیٹھ گئے، تاپنے اور روٹی کھانے کے لیے!

ڈرایور جلدی جلدی کھانا کھا کر، چل پڑا اور جب وہ بنگلہ میں داخل ہوا ہے تو دھوپ پھیل چکی تھی، اُس نے پہلے موٹر کپڑے سے صاف کی، اتنے میں ایک نوجوان لڑکی کتابیں لیے ہوئے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی خود موٹر گیرج کے دروازے پر آگئی، ڈرایور نے موٹر باہر نکالی، لڑکی تیزی کے ساتھ اُچھل کر اُس میں سوار ہوئی اور موٹر روانہ ہوگئی —— جوانی یوں بھی شوخ و شنگ اور پھرتیلی ہوتی ہے، مگر یہ لڑکی تو بجلی کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی، ایک لمحہ کے لیے ہاتھ، پیر اور زبان کو قرار نہ تھا، ڈرایور سے بیسیوں سوالات کر ڈالے، اور بار بار یہی تاکید کہ موٹر اور تیز چلاؤ، ڈرایور نے کالج کی طرف موٹر کو موڑا تو لڑکی نے کہا نہیں ہوٹل چلو۔

ہوٹل کے دروازے پر موٹر رُکی تو لڑکی نے کتابیں سیٹ ہی پر چھوڑیں اور ہوٹل میں دراتی ہوئی داخل ہوگئی، گھنٹہ پون گھنٹہ میں وہاں سے واپس ہوئی، ایک نوجوان اُسے موٹر تک پہونچانے آیا، چلتے وقت دونوں نے خوب گرم جوشی کے ساتھ ہاتھ ملائے، اور موٹر اسٹارٹ ہوگئی —— "چلو، کالج چلو۔ .. " لڑکی نے

گہرا سانس لیتے ہوئے کہا، اور ذرا دیر کے بعد بولی۔۔ "ڈرایور! یہ لو تمہارا انعام (دس روپے کا نوٹ پرس سے نکالتے ہوئے) صاحب پوچھیں تو کہہ دینا کہ بی بی کو کالج میں چھوڑ کر آرہا ہوں، ہوٹل میں میرے جانے کا ذکر نہ کرنا، سمجھے! بابو! اور دیکھو! تمہیں ضرورت ہوا کرے تو مجھ سے روپیہ پیسہ مانگ لیا کرو، پچھتر روپیہ میں بھلا ایک بال بچے والے آدمی کی گزر کس طرح ہوسکتی ہے!

ڈرایور کو اس بنگلہ کی ملازمت کیے ہوئے چوتھا دن اور اس قسم کے "انعام" کا پہلا سابقہ تھا، دس روپیہ کا نوٹ اُس نے لینے کو لے لیا مگر وہ بڑے شش و پنج میں پڑ گیا کہ کیا کرے کیا نہ کرے، وہ فکر مند رہنے لگا ـــــ اور دس بارہ دن کی مدت میں پانچ پانچ کے چھ نوٹ اُسے اور مل گئے، بابو کی جگہ کوئی دوسرا ڈرایور ہوتا تو خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہ دھرتا، دو ہفتہ کی نوکری اور چالیس روپیہ نقد انعام، چاندی ہی چاندی تھی ـــــ مگر بابو شریف، نیک اور خداترس ڈرایور تھا، اُس نے کبھی خوشی کے ساتھ اس انعام کو قبول نہیں کیا، وہ اسی سوچ میں رہتا کہ اُسے آخر کرنا کیا چاہیئے، لڑکی کے باپ سے اس کا تذکرہ آخر کس عنوان سے کیا جائے، پھر وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ گھر میں بیگم صاحبہ اور اُن کی صاحبزادی بلند اقبال کی حکومت چلتی ہے، "صاحب" تو برائے بیت ہیں۔

بابو کی فکرمندی بڑھتی ہی جارہی تھی، وہ جب بھی سوچتا اور کسی فیصلہ پر پہونچنے کی کوشش کرتا تو نفس بڑھاوے دیتا کہ نادان! آئی ہوئی دولت کو ٹھکراتا ہے، اس لڑکی کا نوجوان سے اس طرح چھپ چھپ کر ملنا پاپ ہی سہی مگر اس پاپ سے تیرا کیا واسطہ! تیرا کام تو اپنے آقا کے موٹر کو چلانا ہے، تجھے اس سے کیا کہ کوئی کہاں اور کیوں جاتا ہے ـــــ مگر ضمیر آواز دیتا کہ یہ نفس کا دھوکا اور شیطان کی چال ہے، اس گناہ میں تو بھی شریک ہے، گناہ کی اعانت بھی خود گناہ ہے، یہ تو ایک طرح کی قرم ساقی ہوئی، ذلیل کہیں کے! تیرے بھی تو بیٹیاں ہیں، خدا کو اک دن مُنہ دکھانا بھی ہے ـــــ کیا اس بنگلہ کے سوا اور کہیں تجھے ڈرایوری نہیں مل سکتی ـــــ اور نہیں مل سکتی تو بلا سے نہ ملے، آخر شرافت تو بھی کوئی چیز ہے،

بابو ضمیر کی آواز کو بہت دنوں تک نہ چھپا سکا مہینے کی دوسری تاریخ کو اُس نے ایک دن جرأت کے ساتھ فیصلہ کر ہی لیا کہ آج ملازمت چھوڑ دوں گا، شام کے وقت "صاحب" برآمدے میں بیٹھے پائپ پی رہے تھے، بابو اُن کے سامنے برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہوگیا،

ـــــ کیا بات ہے بابو؟ تنخواہ تو تم کو مل چکی ہے پھر تم فکرمند کیوں دکھائی دیتے ہو، ارے! موٹر وٹر تو کہیں نہیں توڑ لائے۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ صاحب نے دریافت کیا

ـــــ سرکار! میں نے آپ کا اتنے دن تک نمک کھایا آپ کی میرے حال پر پرورش رہی، مگر اب۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ بابو کہہ ہی رہا تھا کہ "صاحب" بیچ میں بول پڑے۔۔ ۔۔ ۔۔ مگر اب،۔۔ ۔۔ مگر اب کیا؟ یعنی۔۔ ۔۔ ۔۔ (بابو ـــــ میں نوکری کرنا نہیں چاہتا) ـــــ آخر کوئی وجہ؟ تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تم کو، تم سے سخت ڈیوٹی لی جاتی ہے، میں نے یا کسی دوسرے آدمی نے تم سے کچھ کہا ہے، کوئی بات بھی تو ہو، بیٹھے بٹھائے نوکری چھوڑنے کی ترنگ ـــــ! واہ میاں بابو واہ! بھنگ ونگ تو نہیں پی لی ہے تم نے! اور تم یہ نوٹ میری طرف کیوں بڑھا رہے ہو (یہ آپ ہی کے نوٹ ہیں ـــــ بابو آہستہ سے جواب دیتا ہے) میرے نوٹ ہیں! میری جیب سے گر پڑے تھے، بیگم صاحبہ نے بازار سے کوئی چیز ویز منگائی تھی اُس میں سے بچ گئے ہیں۔۔ ۔۔ (جی! یہ سرکار کی صاحبزادی کے دیئے ہوئے ہیں ـــــ بابو نے کہا)۔۔ اور اس کے

"صاحب" اپنی لڑکی کو آواز دی، نہ قدیر سے گرجدار آواز!

بی بی برآمدے میں دوڑتی ہوئی آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ "بی بی! یہ بابو آج عجیب عجیب سی باتیں کر رہے ہیں، کہتے ہیں میں نوکری چھوڑ رہا ہوں، اور یہ نوٹ جو میرے ہاتھ میں ہیں، ان کے بارے میں آپ فرماتے ہیں کہ بی بی نے مجھے دیئے تھے، یہ کیسے نوٹ ہیں، تم نے کس لیے ان کو دیئے تھے، آخر معاملہ کیا ہے؟ ــــــ "صاحب" کے اس جواب پر لڑکی سٹ پٹا سی گئی، وہ بات کو ٹال جانا چاہتی تھی، مگر اُس کے باپ نے بابو سے پھر پوچھا، اُس نے معاملہ کی کُرید شروع کی، بابو ڈرائیور نے ایک ایک بات کھول کر رکھ دی، اتنے میں بی بی کی ماں بھی آ گئی، اُس کے باپ کے تیور بہت زیادہ غضب ناک تھے، بگڑنے کی بات ہی تھی ــــــ یہ رنگ دیکھ کر بی بی نے رونا اور چیخنا شروع کیا، بابو نے وہاں سے چلے جانے ہی میں مصلحت دیکھی، وہ یوں بھی جا ہی رہا تھا، بی بی نے وہ فیل مچائے کہ سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا اُس کے آنسو کسی طرح تھمتے ہی نہ تھے، جھوٹے آنسوؤں سے وہ اپنی بےگناہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئی، اُس کی ماں نے "صاحب" کو آڑے ہاتھوں لیا کہ آپ چار پیسہ کے ڈرائیور کی باتوں میں آ کر میری لڑکی کو عیب لگاتے ہیں، بی بی جیسی نیک لڑکی تمہارے خاندان میں پیدا نہیں ہوئی ہوگی، اور اُس حرام خور ڈرائیور نے میری لڑکی کو کیا مجھی کو عیب لگایا، ہم دونوں ماں بیٹی تمہارے گھر سے اسی وقت نکلے جاتے ہیں، تم یہاں مزے کے ساتھ غیرت اور پاکبازی کے چراغ جلاتے رہنا، میں تو پہلے دن ہی اس ڈرائیور کی صورت دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ نمک حرامی اور بے وفائی کرے گا، کسی دوسرے کے یہاں زیادہ تنخواہ کا معاملہ کر آیا ہے اور ہمارے گھر سے نکلنے کے لیے کیا بہانہ بنا کر لایا ہے، یہ بابو تو پولس کے سپرد کر دینے کے قابل ہے، بدمعاش کہیں کا؟ میں بازار سے ایک دن کپڑا خرید کر لائی تھی تو موا کہنے لگا کہ بیگم صاحبہ! آپ نیلے رنگ کی ساری پہنا کیجئے ــــــ بیچارے "صاحب" کو اُلٹی معافی مانگنی پڑی، نہ مانگتے تو کیا کرتے، بیوی زخمی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی اور بیٹی روتے روتے جان کو ہلکان کئے ڈالتی تھی ــــــ آخر غریب ڈرائیور ہی قصوروار ٹھہرا، وہ تو اُس کی قسمت اچھی تھی کہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا، ورنہ بی بی کے آنسوؤں کی اُسے نہ جانے کیا قیمت ادا کرنی پڑتی، یہ ایک دولت مند کی لڑکی کے آنسو تھے!

ڈرائیور کے اس انکشاف کے بعد بہت کچھ روک تھام کی جا سکتی تھی اور کرنی ہی چاہیئے تھی ــــــ مگر کون کرتا اور کیوں کرتا؟ بی بی کے گریہ دُبکانے گھر والوں کے اعتماد میں اور اضافہ کر دیا، بی۔اے کا آخری سال تھا، صرف کیرکٹر کے شبہ پر لڑکی کو کالج سے اُٹھا لینا اُن کی نگاہ میں حماقت تھا ــــــ چند دن تھوڑی بہت ضرور احتیاط رہی، مگر پھر ڈھیل چھوڑ دی گئی، اس ٹھوکر نے اُن کی آنکھیں کھولی نہیں بلکہ اُن پر اور پٹی باندھ دی!

بابو کی جگہ دوسرا ڈرائیور آیا تو وہ حرفوں کا بنا ہوا تھا، اس قسم کے کھیل تماشے اُس نے بہت دیکھے تھے، وہ خود بھی ہر وقت بنا سنورا اور مانگ پٹی کئے رہتا، بی بی کا وہ رازدار بن گیا، اور بے تکلف رازدار! ہوسناکی پر پُرزے نکال رہی تھی، اور نفس نئی نئی راہیں سُجھا رہا تھا ــــــ بی۔اے کے امتحان سے فارغ ہونے کے دو ہفتہ بعد بی بی شدید بیمار ہو گئی، دوا دارو اور علاج معالجہ میں کنکری کی طرح پیسہ اُٹھ رہا تھا ــــــ بی بی کی ماں کو بیماری کا اصل حال معلوم تھا، مگر وہ مریضہ کے باپ (صاحب) سے اس راز کو چھپا رہی تھی، بی بی کی حالت نازک تر ہوتی چلی گئی، آخر بات کہاں تک چھپتی، ایک ڈاکٹر نے "صاحب" سے اصل ماجرا کہہ ہی دیا۔

ـــــــ مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا تھا!

ایک دن شام کے وقت بی بی کی حالت زیادہ بگڑنے لگی، وہ بُری طرح کراہ رہی تھی، ڈاکٹر آیا، نرس بلائی گئی، انجکشن لگے۔۔۔۔ مگر سب بے سود! اُس کے چہرے پر نیلاہٹ نمودار ہوئی اور پھر سیاہی چھاگئی، اور ہونٹ چہرے کے چہرے رہ گئے ـــــــ "صاحب" کے بنگلہ سے دو جنازے نکل رہے تھے ایک اُن کی لڑکی کا جو سب کو نظر آرہا تھا اور جسے لوگ کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے تھے، اور دوسرا، غیرت و عزت اور ناموس و شرافت کا جنازہ تھا جو لڑکی کے ماں باپ کے سوا کسی دوسرے کو دکھائی نہ دیتا تھا ـــــــ ہاں! تیسرا بابو ڈرائیور تھا جسے اس تابوت کی جھلک اب سے چند ماہ پہلے البتہ نظر آ گئی تھی!

روحِ انتخاب

ہر روز صبح سے لیکر رات تک، آپ کی زبان پر جو کچھ آتا رہتا ہے، کبھی آپ نے تنہائی میں اس پر غور فرمایا ہے؟ ہر روز جتنی باتیں آپ کی زبان پر آتی رہتی ہیں، کبھی آپ نے اُنھیں قلمبند کرکے یہ سوچا ہے، کہ کتنی باتیں اُن میں جا تھیں اور کتنی بیجا؟ کتنے لفظ زبان پر لانے والے تھے، کتنے نہ تھے؟ کبھی آپ نے اس کا حساب لگایا ہے، کہ ہر روز بلاناغہ جتنی گفتگو آپ فرماتے رہتے ہیں، اس کا کتنا حصہ محض عبث فضول اور غیر ضروری ہوتا ہے، کتنا حصہ ایسا ہوتا ہے، جس سے دوسروں کی دلشکنی اور دلآزاری ہوتی ہے، کتنا حصہ جھوٹ، مبالغہ، اور ناراستی پر شامل ہوتا ہے، کتنے حصہ سے دوسروں کی غیبت ہوتی ہے، کتنے سے اپنی بڑائی اور خود بینی نکلتی ہے، کتنے سے اللہ کے ساتھ بے تعلقی، بدگمانی اور بے اعتباری ثابت ہوتی ہے، کتنا دوسروں کی خوشامد اور جھوٹی تعریف کیلئے وقف ہوتا ہے، اور کتنے حصہ میں محض اپنی بات کی پچ کرنے، نباہنے، یا سُننے والے کو خوش کرنے کیلئے آپ کو اپنی دیانت و خودداری کا خون کرتے رہنا پڑتا ہے؟ ساری عمر کا اندازہ نہ کیجئے، ایک سال، ایک مہینہ، ایک ہفتہ کا بھی حساب جانے دیجئے، صرف ایک شبانہ روز ہی کا حساب کرکے اسے جانچ لیجئے۔

آپ دوسروں کو بے احتیاط، بدزبان، دروغ گو، مفتری، عیب چیں، فتنہ پرداز، سخن چیں قرار دینے میں اکثر جلدی فرمادیا کرتے ہیں، لیکن خود اپنی روزانہ گفتگوؤں کو کبھی آپ نے اس پیمانہ سے ناپا ہے، جو آپ دوسروں کیلئے ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتے ہیں؟ کیا آپ کے خیال میں آپکی گفتگو سے متعلق آپ پر کوئی بازپرس نہ ہوگی؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلتا جارہا ہے، یہ کہیں اور حرفاً حرفاً قلمبند نہیں ہوتا جارہا ہے؟ کیا آپکے نزدیک آپکی زبان ہر قسم کی ذمہ داری سے آزاد اور مستثنیٰ ہے؟ کیا آپ کے عقیدہ میں صدقِ مطلق کا یہ وعدہ کہ انسان کوئی بات نہیں بولتا، کا یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید - مگر یہ کہ اُس کے لیے ایک نگہبان تیار رہتا ہے، وہ نعوذ باللہ) جھوٹ ہے؟ یا آپ کو یہ اطمینان ہے، کہ آپکی زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے، کم از کم اُس پر کسی کو گرفت نہیں ہوسکتی؟ اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے، تو پھر آپ اپنی گفتگوؤں کی طرف سے اس قدر مطمئن، بے پروا، اور بے خوف کیوں ہیں؟ کیا قبل اس کے، کہ دوسرے کے سامنے حساب دینا پڑے، خود ہی اپنے سے حساب لینا بہتر نہ ہوگا؟

تاریخ اور تذکروں میں آپ پیمبروں، بزرگوں اور اخلاق و روحانیت کے بڑے بڑے مقدس برگزیدہ رہبروں کے حالات پڑھ چکے ہیں، کیا (نعوذ باللہ) ان میں سے کوئی بھی "یاوہ گو" گزرا ہے؟ کیا وہ بھی دن رات بک بک میں وقت گزارتے تھے؟ خود اپنا تجربہ و مشاہدہ آپ کو کیا بتاتا ہے؟ زیادہ گوئی سے جھگڑے اور فساد بڑھتے ہیں، لوگوں کو ملال و عناد پیدا ہوتا ہے، اپنے قلب پر غفلتوں کا پردہ اور گہرا ہوتا جاتا ہے، آپس کی رنجشیں اور بدگمانیاں بڑھتی ہیں، اپنے نامۂ اعمال میں جھوٹ، مبالغہ، طنز، غیبت، خود بینی، غصہ، سخت کلامی وغیرہ کے عنوانات میں اور اضافہ ہوتا رہتا ہے، یا اس کے برعکس سکونِ خاطر و اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے، روح کو تسلی و تسکین نصیب ہوتی ہے، اور اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا ہوتا معلوم ہوتا ہے؟ اگر آج ہم میں سے ہر شخص محض اتنا عزم کرلے کہ آج سے اپنی زبان اپنے قابو میں رکھے گا، تو ذاتی اور خاندانی، شخصی اور قومی کتنی خرابیوں، کتنی رنجشوں، کتنے فتنوں کا اسی لمحہ اور اسی آن خاتمہ ہوسکتا ہے! قولوا قولاً سدیداً (بات کہو تو پکی اور مضبوط) کا فرمان جہاں اترا ہوا ہے، وہیں یہ بشارت بھی دیدی گئی ہے، کہ یصلح لکم اعمالکم (تمہارے عملوں کی اصلاح ہوجائیگی، تمہارے بگڑے ہوئے کام بنجائیں گے) کاش ایکبار تو ہمیں بھی اس خدائی نسخہ پر عمل کی توفیق ہوجاتا!

(مولانا عبد الماجد دریابادی) "سچ" ۲۲/۲۹ نومبر ۱۹۲۶ء

ہمارِی نظر میں

ترجمان القرآن

"ترجمان القرآن" (پارۂ اول) ضخامت ۱۴۴ صفحات، ہدیہ ایک روپیہ چار آنہ، "ترجمان القرآن" (پارۂ دوم) ضخامت ۱۷۶ صفحات، ہدیہ ایک روپیہ آٹھ آنہ، لکھائی، چھپائی، اور کاغذ دیدہ زیب ——— مولف:- عبدالحق عباس، ملنے کا پتہ:- مکتبہ علیہ مدرسۃ البنات ۱۵ لیک روڈ لاہور!

جناب عبدالحق عباس صاحب نے قرآن پاک کے ایسے آسان ترجمہ کا مبارک کام شروع کیا ہے جس سے عربی سے ناواقف لوگ فائدہ اٹھا سکیں، دو پارے (پہلا اور تیسواں) چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں فاضل مترجم نے لفظی اور بامحاورہ دونوں ترجمے ایک ساتھ کئے ہیں، جس کا ایک نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

الحمد للہ رب العلمین •

ال	حمدُ	لِ	اللہِ	ربِ	اَلْ عالمین
سا ی	تعریف	لیے	اللہ کے	پروردگار (ہے)	(جو) جہانوں کا

ساری تعریف اللہ کے لیے (جو) سب جہانوں کا پروردگار (ہے)

لائق مترجم نے اپنی حد تک ترجمہ کو آسان اور اصل مفہوم سے قریب تر بنانے کی امکانی سعی کی ہے، جس کے لیے وہ ہم بندوں کی طرف سے تبریک وتحسین اور اللہ تعالیٰ کے دربار سے اجر کے مستحق ہیں، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ٹھیک ٹھیک ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور اللہ کے کلام کی ترجمانی تو سب سے زیادہ دشوار ہے، اور پھر عربی کی جامعیت اردو کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی موجود نہیں ہے ——— اس لیے کہیں کہیں ترجمہ میں جھول پیدا ہوگیا ہے:-

(صفحہ ۵) سورۂ فاتحہ میں "غیرا لمغضوب علیہم" کا ترجمہ "نہیں جن پر غصہ کیا گیا" غلط نہیں ہے مگر "غضب" کی جامعیت "غصہ" میں نہیں پائی جاتی، پھر اردو داں طبقہ "غضب" کے معنیٰ کو جانتا ہے اس کے ترجمہ کی ضرورت نہ تھی اور یہ بھی ہے کہ "غضب" کے مقابلہ میں "غصہ" انسانی فطرت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کہ اُس میں جھنجلاہٹ بھی پائی جاتی ہے۔

(صفحہ ۱۲) "انہم ہم المفسدون ولکن لایشعرون" ... ترجمہ:- "ہیں تو یہی لوگ لیکن خبر نہیں پاتے"۔ ——— اس میں "خبر نہیں پاتے" کی جگہ "نہیں سمجھتے" یا "شعور نہیں رکھتے" لکھنا چاہیئے تھا، "خبر" اور "شعور" میں نازک نہیں کھلا ہوا فرق ہے!

(صفحہ ۳۳) "انک انت العلیم الحکیم"۔۔ کا ترجمہ:۔ "بیشک اصل جاننے والا پختہ کار تو ہی ہے" اس میں "پختہ کار" بہت کچھ محلِ نظر ہے "حکمت والا" ہی لکھنا چاہیئے تھا، "پختہ کار" تو انسانوں کی صفت ہے، "پختہ کار" اُس آدمی کو کہتے ہیں، کہ کام کرتے کرتے جس کی خامی دور ہوگئی ہو اور اُس کے کام اور تجربہ میں پختگی آ گئی ہو — اللہ تعالیٰ کی صفت تو "الآن کما کان" ہے!

(صفحہ ۴۲) "وایای فاتقون"۔۔ ترجمہ:۔ "ہاں مجھی سے بچتے رہو"[1] اس کی جگہ "مجھی سے ڈرو" یا میرے غضب سے بچو یا بچتے رہو"۔۔ ترجمہ کرنا تھا، "مجھی سے بچتے رہو" میں ذم کا پہلو بھی نکل سکتا ہے، مثلاً۔۔ کوئی کہے "آپ انگلستان جا رہے ہیں مگر وہاں کے فواحش سے ذرا بچتے رہیئے گا" "بچتے رہنا" میں دوری اور اجتناب کے پہلو پائے جاتے ہیں۔

(صفحہ ۵۱) "فتوبوا الی بارئکم" ترجمہ:۔ "سو اپنے گھڑنے والے کی طرف رجوع کرو" "گھڑنے والے" کے مقابلہ میں "خالق" یا "پیدا کرنے والے" زیادہ آسان سلیس اور مفہوم سے قریب ترین ہے — پھر "گھڑنا" ایک ایسا فعل ہے جو تدریج اور مدت چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو بس وہ چیز اُسی آن پیدا ہو جاتی ہے، وہاں گھڑنے کا کیا سوال؟

پارۂ عم ———— (صفحہ ۴۵) "وما ہو علی الغیب بضنین" ترجمہ:۔ "اور قرآن علمِ غیب (بیان کرنے) میں بخیل نہیں ہے"۔۔ "ہو" (وہ) کا مشارٌ الیہ اور مرجع "قرآن" نہیں "صاحب" (وما صاحبکم بمجنون) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے، ترجمہ میں یا تو صرف "وہ" ہی لکھنا تھا یا "نبیؐ"!

(صفحہ ۱۲۷) "ووجدک ضالاً فہدیٰ"۔۔ ترجمہ:۔ "تجھ کو بھٹکا ہوا (لفظی ترجمہ "بے راہ" کیا ہے) پایا تو راستہ دکھلایا" ———— یہاں "ضال" کے معنیٰ "بے راہ" اور "بھٹکے" ہوئے" کے نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت سے قبل نعوذ باللہ "بے راہ" یا "گم گشتہ راہ" ہرگز نہیں تھے، بلکہ طلبِ حق اور انکشافِ حقیقت کے لیے حضورؐ کی طبیعت میں جو ایک طرح کا اضطراب، بے چینی اور بے تابی تھی اُسی حالت کو اللہ تعالیٰ نے "ضال" سے تعبیر فرمایا ہے، جس طرح کوئی مسافر منزلِ مقصود کے نشان اور آثار دیکھنے کے لیے "سرگرداں" نظر آئے اور پھر اُسے وہ آثار دکھا دیئے جائیں، "ضالاً" کا ترجمہ "سرگرداں" ہونا چاہیئے۔

(صفحہ ۱۷۱) "انہٗ کان توابا" ترجمہ:۔ "بیشک وہ بڑا من جانے والا ہے" اس کی جگہ "معاف کرنے والا" یا "توبہ قبول کرنے والا" ہوتا تو زیادہ اچھا تھا "منایا" اُسے جاتا ہے جو روٹھ جاتا ہے، اور روٹھنے اور منانے میں انسانی جبلت سے مشابہت پائی جاتی ہے۔

جناب عبدالحق عباس کی سعی بہرحال لائقِ تحسین ہے، اگر وہ ہمارے مشوروں کو پسند فرمائیں تو آئندہ ایڈیشنوں میں ترمیم کر دیں اور اسی روشنی میں پورے ترجمہ پر ایک بار پھر نگاہ ڈال لیں۔

[1] مدینہ پریس بجنور سے جو حمائل شائع ہوا ہے، جس کا ترجمہ اور حواشی حضرت شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کے ہیں اُس میں بھی حیرت ہے کہ یہی ترجمہ کیا گیا ہے (م۔ ق)

خطباتِ مدراس

"خطباتِ مدراس" از:- سید سلیمان ندوی، ضخامت دو سو صفحے، سفید کاغذ، کتابت و طباعت دیدہ زیب (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:- مکتبۃ الشرق، نزد مسجد باب السلام، آرام باغ، کراچی!

یہ کتاب، اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے، جو علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر مدراس میں دیئے تھے، یہ اب سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، ۱۹۲۵ء میں "مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف انڈیا" کی دعوت پر علامہ موصوف مدراس تشریف لے گئے اور وہاں کے لالی ہال میں یہ آٹھوں خطبے اکتوبر ۱۹۲۵ء کے پہلے ہفتہ سے لیکر نومبر ۱۹۲۵ء کے اخیر ہفتہ تک خود اپنی زبان سے پڑھ کر سنائے، سامعین میں مسلمانوں کے علاوہ غیرمسلم اصحاب بھی ہوتے تھے اور دو دو تین تین گھنٹہ تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اگر کوئی اور کتاب نہ لکھتے اور صرف یہی ایک کتاب (خطباتِ مدراس) اُنکی ہوتی تو موصوف کی علمی شہرت کی بقا کے لیے کافی تھی، دیکھنے میں تو یہ گنتی کے دو سو صفحے ہیں مگر ان میں ہزاروں صفحوں کے مطالعہ کا "حاصل" سمویا ہوا ہے، عقل و نقل، درایت و روایت، تاریخ و تنقید غرض یہ تمام چیزیں پوری عالمانہ اور محققانہ شان کے ساتھ ان خطبوں میں ملتی ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے کیے جائیں تاکہ لوگ اُس "انسانِ کامل" کے حالاتِ زندگی سے واقف ہوں جس سے بہتر انسان پر سورج طلوع نہیں ہوا اور جس کی اتباع کے بغیر ہدایت نہیں مل سکتی۔

فاضل سیرۃ نگار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور سیرت کا دوسرے انبیاء علیہم السلام سے جو تقابل کیا ہے اُس میں کہیں کہیں زیادہ احتیاط کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، نبیٔ عربی اور دوسرے رسولوں اور نبیوں کے مابین تقابل اور موازنہ کا معاملہ بہت زیادہ نازک ہے، یہاں "جامِ شریعت" اور "سندانِ عشق" والا معاملہ پیش آتا ہے!

آج کل "فتنۂ انکارِ حدیث" جو پر پُرزے نکال رہا ہے، اس فتنہ کی تردید کے لیے "خطباتِ مدراس" میں کافی مواد موجود ہے، فنِ حدیث، اسماء الرجال، اخبار و سیر اور شمائل و مغازی پر جو کچھ لکھا ہے، وہ بار بار پڑھنے دوسروں کو سنانے اور پھیلانے کے قابل ہے تاکہ سنتِ رسولؐ اور حدیثِ نبویؐ کہ قرآن پاک کے بعد جس پر دین کا مدار ہے اُس کی عظمت، اہمیت، عقیدت اور ضرورت کا احساس کم نہ ہونے پائے۔

پاکیزہ کہانیاں

(۱) "جنت سے زمین پر" ۳۲ صفحے، قیمت چار آنہ (۲) "پہلا خون" ۲۹ صفحے، قیمت چار آنہ (۳) "خوفناک طوفان" ۴۶ صفحے، قیمت چھ آنہ (۴) "خدائی معمار" ۶۴ صفحے، قیمت آٹھ آنہ، از:- ابنِ احمد قرنی ایم-اے، ناشر:- مکتبہ فلاحِ انسانیت، آرام باغ روڈ کراچی ۱۔

بک اسٹالوں پر کوئی جا کر دیکھے تو کتابوں، رسالوں اور میگزینوں سے دُکانیں پٹی پڑی ہیں مگر ان کتابوں اور رسالوں میں کام کی کتنی کتابیں ہوتی ہیں؟ بہت کم، جیسے آٹے پر سفیدی! عام طور پر رنگین اور رومانی لٹریچر کی مانگ ہے اور کتب فروش بھی عوام کی پسند اور "demand" ہی کا ساتھ دیتے ہیں، نہ دیں تو کھائیں کیا؟

نیکی اور حق پسندی کے لیے فاقہ بھی کیا جا سکتا ہے مگر اس کیریکٹر کے آدمی بہت ہی کم پائے جاتے ہیں!

فحش لٹریچر کی بدولت نئی نسل کے فکر و ذہن متاثر ہو رہے ہیں، اور بچہ ابھی پوری طرح جوان نہیں ہونے پاتا کہ ہوسناکی اور جنسی تقاضوں کی سن گن اُسے مل جاتی ہے، اس تباہی کو دیکھ کر کچھ ایسے ارباب قلم بھی اللہ کے فضل سے پیدا ہو گئے ہیں جن کی صلاحیتیں اس طوفانِ بدتمیزی کا جرأت کے ساتھ مقابلہ کر رہی ہیں ——— جناب ابن احمد قرنی ایم۔ اے کو بھی یہ توفیق نصیب ہوئی ہے!

سچی اور پاکیزہ کہانیوں کا یہ سلسلہ مسلمانوں کے ایک ایک گھر میں بار پانے کا مستحق ہے، تمام کہانیاں قرآن سے ماخوذ ہیں، زبان بہت سلیس اور سادہ ہے، پھر لطف یہ ہے کہ افسانوی دلچسپی بھی پائی جاتی ہے، نصیحت کی گولیوں کو مصری کے کوزوں میں صحیح صحیح بند کر دیا ہے، کاش! مسلمان بچے اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں اور اُن کے والدین اور سرپرست جس طرح گھروں میں خراب ترکاری، ناقص جنس اور بدبودار گوشت نہیں آنے دیتے اسی طرح فحش لٹریچر کو بھی اپنے گھروں میں نہ آنے دیں اور اسی قسم کے پاکیزہ ادب سے اپنے بچوں کو روشناس کرائیں

یہ کتابیں پرائمری اسکولوں کے نصاب میں شامل ہونے کے قابل ہیں، کاش! محکمہ تعلیمات کے ارباب حل و عقد مصنف کی سعی و سفارش کے بغیر ہی توجہ فرما کر اپنی جوہر شناسی کا ثبوت دیں!

ایک عورت دو ملک

"ایک عورت دو ملک" از:- اسعد گیلانی ضخامت ۲۲۲ صفحات، مجلد، قیمت دو روپے بارہ آنے، ملنے کا پتہ:- مکتبہ افکار نو بیقوب خان روڈ، کراچی

جناب اسعد گیلانی اُن خوش بخت اور پاکیزہ ذوق انشا پردازوں اور افسانہ نگاروں میں سے ہیں، جنھوں نے اسلامی تصورات کی نمایندگی اور ترجمانی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے، اور جن کا قلم باطل سے بغاوت اور حق کی حمایت کے لیے وقف ہے ——— اس کتاب (ایک عورت دو ملک) میں اسعد صاحب کے چند افسانے شریک ہیں جو سب کے سب دلچسپ ہیں، پاکیزہ ہیں، اور اصلاحی ہیں، بعض مقامات پر تو افسانہ نگار کے قلم نے "آرٹ" کی بلندیوں پر کمندیں ڈال دی ہیں۔

اسعد گیلانی بھی شروع شروع میں روشِ عام پر گامزن تھے، اُنھوں نے "حرفِ اوّل" میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں پہلا افسانہ جو میں نے لکھا تو اُس کے ایک ایک لفظ پر "عورت سوار تھی۔۔" مگر اس دلدل میں وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے ——— اُن کے ضمیر سے سوال کیا گیا :-

"اے تجربہ و شہود کی بے منزل وادیوں میں بھٹکنے والے! تجھ پر جو یہ مسلمان ہونے کا لیبل لگا ہوا ہے کچھ اس کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہے؟" ——— پھر زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میرے پاس زبان کے باوجود جواب نہ تھا، مجھے اس بات کا جواب سوچنے کے لیے مسلسل تین سال تک خاموش رہنا پڑا!"

اور تین سال کے سکوت اور غور و فکر کے بعد اسعد گیلانی کے قلم کو جو حرکت ہوئی ہے تو صریرِ خامہ سے حق کی آواز سنائی دینے لگی، اور اب وہ اُس مقام پر کھڑے ہوئے ہیں جہاں نہ کوئی خوف اُن کو مرعوب کر سکتا ہے، اور نہ لالچ اُن کو جھکا سکتا ہے، وہ "نانِ جویں" کھا کر خیبر کشائی کا عزم رکھتے ہیں! اور اپنے قلم اور زبان کو اللہ تعالیٰ کی مقدس امانت سمجھتے ہیں۔

دوسرا رُخ :۔۔۔ اسعد کے ان افسانوں میں بعض مقامات پر "فلسفہ" نے "افسانونیت" کو دبا لیا ہے اور کہیں کہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سقراط اور افلاطون کا کوئی مکالمہ پڑھ رہے ہیں، جب قصداً فلسفیانہ انداز میں کوئی بات کہی جائے گی تو اس میں ایک طرح کا تکلف اور آورد پیدا ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی۔

(صفحہ ۱۹) "جو اپنے قدموں پر چل کر میدانِ معاش میں اپنا دامن بھرنے آئی تھی"۔۔۔ "قدموں" کی جگہ "پاؤں یا پیروں" کہنا تھا۔۔۔ (صفحہ ۳۵) "وہ غیر یقینی موت میں کود گیا" "خطرے میں کود گیا" تو بولتے ہیں مگر "موت میں کود گیا" نہیں بولتے۔۔۔ (صفحہ ۵۱) "نیم دلی سے اُس نے اپنا ذہن اُن کے شور و غل کے بہاؤ میں ڈال دیا" ترجمہ ساز اور وہ بھی ناقص) معلوم ہوتا ہے، اور اس کیفیت کو محسوس کرنے کے لیے پڑھنے والے کے ذہن کو کس قدر ورزش کرنی پڑے گی۔۔۔ (صفحہ ۶۲) "اور اُس نے وہ سوٹ کیس اپنے قریب کھسکا لیا اور پھر اپنے دماغ میں واپس چلا گیا" یہ "دماغ میں واپس چلا گیا" کیا بات ہوئی، توبہ!۔۔۔ (صفحہ ۷۰) "یار! سارے پاپ کٹ جائیں گے" "پاپ کا کٹ جانا" ہم نے آج تک نہیں سنا، یوں کہنا تھا "سارے دلدّر دور ہو جائیں گے"۔۔۔ (صفحہ ۱۷۷) "دھوئیں کا لہریلا گاڑھا پن بڑھ گیا" اس "ترقی پسندانہ" انداز سے ہٹ کر دوسرے دل نشین اور حسین انداز میں بھی یہ مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔۔۔ (۱۸۱) "ایک سوال پھیل کر اس کے ذہن پر جھپٹ گیا تھا" یہ "سوال" چمگادڑ کی طرح شاید کوئی پرند ہوگا۔ ۔۔ (صفحہ ۲۰۹) "ان پریوں کی دید کو اس نے بھی ایک دیو کی پھرتی سے اُوپر ہی اُوپر چرا لیا تھا۔۔۔" نہ جانے افسانہ نگار کہنا کیا چاہتا ہے!

"کتاب" میں کہیں کہیں ایسا نشیب بھی ہے، مگر بلندیوں کی بھی کمی نہیں ہے۔۔۔:۔

"شیخ صاحب نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ خدا سے بعید نہیں کہ وہ فاسقوں اور فاجروں سے بھی اپنے دین کا کام لے لے اور سب سے زیادہ بھروسے کی بات یہ تھی کہ شیخ ابراہیم کا لڑکا بھی اُن میں شامل تھا۔۔۔ اور پھر اشتراکیت اور اسلام میں فرق ہی کیا تھا، معمولی سا فرق، صرف خدا اور رسولؐ کا، اور یہ ذرا سا فرق بھی بھلا کوئی فرق تھا جس سے انہیں علیحدہ سمجھا جا سکے۔۔۔"

اس کے بعد اشتراکیت کا طوفان آتا ہے، تو یہ ہوتا ہے۔۔۔:۔

"شیخ ابراہیم کی آنکھیں تب کھلیں جب اُنھیں مذہب کے نمایندے کی حیثیت سے حُجرے سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا، اُنھوں نے ہزار یقین دلایا کہ وہ اشتراکی انقلاب کے حامی تھے لیکن وہ تو مذہب کی افیون بانٹنے والے غدار تھے، وہ تو بورژوائی جونک تھے، وہ تو اس زمین پر کارل مارکس کی خدائی کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی خدائی کے بھی قائل تھے وہ تو لینن کے علاوہ محمد رسول اللہ کو بھی ہادی مانتے تھے، ایسا کھلا ہوا شرک اسلام کے پیرو کو گوارا ہو تو ہوا کرے، اشتراکیت کا مومن ایسا شرک برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔۔۔"

رشوت پر کتنی لطیف طنز کی ہے، اسعد گیلانی نے:۔

"مسرّت گاہ میں ایک پیگ اور ایک چیک، ان دو پھندوں سے انجنیر کہاں بھاگ سکتا تھا۔"

یقین ہے کہ افسانوں کا یہ مجموعہ (ایک عورت دو ملک) پسند کیا جائے گا اور دوسرے نوجوان سنجیدہ

افسانہ نگاروں کے لیے کم سے کم بنیادی فکر کی صحت اور پاکیزگی کے اعتبار سے چراغِ راہ ثابت ہوگا۔

"ثواب"

"ثواب" از:- ابوالوفا فصیحی غازی پوری، ضخامت ۸۴ صفحے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:- مولوی حبیب اللہ سکریٹری جامع مسجد ہزاری باغ —— پاکستان کے لیے۔ ڈاکٹر عبدالجبار قادری پُرانا بازار، پاربتی پُور، ضلع دیناج پُور (مشرقی پاکستان)

یہ پہلا ناول ہماری نگاہ سے گزرا ہے جس میں "فاتحہ" "عُرس" اور "بدعت" کی حمایت میں ناول نگار نے (افسانوی انداز میں) اپنے معتقدات پیش کیے ہیں اگران معتقدات پر تفصیل کے ساتھ تنقید کی جائے تو یہ تنقید اتنی پھیل سکتی ہے کہ اچھا خاصہ طویل مقالہ بن جائے گی، مختصر یہ ہے کہ آجکل فاتحہ، عُرس، اور نذر و نیاز کے جو طریقے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں وہ زیادہ تر جاہلانہ ہیں اور بعض تو شرک کی حد تک پہونچ گیے ہیں، کتاب و سنت اور آثارِ صحابہ میں انکے لیے کوئی دلیل اور اساس نہیں ملتی۔

اہلِ بدعت کی یہ خاص عادت اور پیٹینٹ انداز ہے کہ اپنے عقیدوں اور رسموں کے ثبوت میں احادیث ہی نہیں قرآن کی آیتیں تک بے تکان پیش کر دیتے ہیں حالانکہ وہ آیتیں اور حدیثیں اُن کے معتقدات اور رسوم و رواج سے غیر متعلق ہوتی ہیں اور اس طرح بخاری، مسلم، مشکوٰۃ کا نام لے کر بیچارے عوام مسلمانوں کو وہ مرعوب کرتے رہتے ہیں
اسی کتاب کے صفحہ (۱۴) پر ایک حدیث درج کی گئی ہے:-

"حدیث غزوۂ تبوک کی مشکوٰۃ میں بروایت مسلم مذکور ہے کہ جب لوگ گُرسنہ ہوگئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آقائے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دُعا کرانا چاہی، آپؐ نے دسترخوان بچھوایا اور حکم دیا کہ جس کے پاس جو کچھ بھی کھانے کی بچی ہوئی چیز ہے لیتا آئے، یہ سُن کر کسی نے مٹھی بھر جوار، کسی نے کھجور، کسی نے روٹی کا ٹکڑا، الغرض جو کچھ جس کے پاس تھا لاکر حاضر کیا، بہت ہی تھوڑا سا ذخیرہ جمع ہوا، پھر آپؐ نے اُس پر دُعا فرمائی اور فرمایا کہ تم لوگ اپنے اپنے برتن بھرلو، لشکر والوں نے اپنے پاس کے تمام برتن بھرلیے اور خوب کھایا، پھر بھی کھانا بچ رہا۔"

حدیث شریف اپنی جگہ بالکل صحیح ہے اور جو کوئی اس کی صحت میں شک اور تاویل کرے وہ بدبخت اور کج فہم! مگر آج کل جس طرح بزرگانِ دین کی فاتحہ دی جاتی ہے اُس سے اس حدیث کا آخر کیا تعلق ہے! اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو "خیرِ کثیر" کا معجزہ عطا فرمایا تھا کہ جب اللہ کو منظور ہوتا تھا اور آپؐ دُعا فرماتے تھے تھوڑی چیز میں زیادہ سے زیادہ برکت ہوجاتی تھی —— مگر حضورؐ نے "تکثیرِ طعام" کے لیے صرف دُعا مانگی تھی، اُس کھانے اور جنس کا ثواب کسی نبی، صحابی یا شہید کی رُوح کو نہیں بخشا تھا، اور آپؐ نے ایسا کبھی نہیں کیا، اور اس طریقہ سے صحابہ کرام قطعاً ناآشنا تھے!

مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پُوری کے عقاید کی ایک جھلک اُن کے ان جُملوں میں ملتی ہے:-

"رجب کی پہلی تاریخ تھی، اجمیر شریف میں آقائے ہند کے بھکاریوں کی بھیڑ بڑھتی ہی جارہی تھی …"

اگر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ آج زندہ ہوکر دُنیا میں آجائیں تو اس قسم کے غلط عقاید کے خلاف جہاد کریں، ہم ان باتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

داستانِ ادب

"داستانِ ادب" از:- ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، ضخامت ۲۲۴ صفحے،

مجلد (۳۲ تصویروں کے ساتھ) قیمت تین روپے آٹھ آنہ (مجلد) دو روپے آٹھ آنہ (بلا جلد) ملنے کا پتہ:——
سب رس، کتاب گھر، خیرت آباد، حیدرآباد دکن!

ادارۂ ادبیات اُردو کو ہزار آفریں کہ وہ اس عہدِ پُرآشوب میں بھی جیسی بھی کچھ بن پڑرہی ہے اُردو کی خدمت کئے جارہا ہے، یہ کتاب اُس کی ایک سو ترسٹھویں پیشکش ہے، جس میں حیدرآباد کی تین سو سالہ اُردو، فارسی اور عربی ادب و شاعری کا جائزہ لیا ہے اور مشاہیر شعراء اور اربابِ کمال کے مختصر حالات بھی دیئے ہیں۔

پہلا دور (سنہ ۱۰۰۰ھ ہجری) سلطان محمد قلی قطب شاہ سے شروع ہوتا ہے، جو شاعر نواز، سخن پرور ہی نہیں، خود بہت بڑا شاعر بھی تھا —— عہدِ ابن خاتون و ابنِ نشاطی (سنہ ۱۰۵۰ھ تا سنہ ۱۱۰۰ھ ہجری) —— دورِ انتشار (سنہ ۱۱۰۰ھ تا سنہ ۱۱۵۰ھ ہجری) —— ادب و شعر کا احیاء (سنہ ۱۱۵۰ھ تا سنہ ۱۲۰۰ھ ہجری) —— عہدِ ارسطو جاہ (سنہ ۱۲۰۰ھ تا سنہ ۱۲۲۰ھ ہجری) —— چندا اور چندو لال (سنہ ۱۲۲۰ھ تا سنہ ۱۲۵۰ھ ہجری) —— شمس الامراء اور شمس الدین فیض (سنہ ۱۲۵۰ھ تا سنہ ۱۲۸۰ھ ہجری) —— مختار الملک اور وقار الامراء (سنہ ۱۲۸۰ھ تا سنہ ۱۳۲۰ھ) —— یہاں تک کہ مہاراجہ کشن پرشاد کے عہد پر جاکر (سنہ ۱۳۲۰ھ تا سنہ ۱۳۵۰ھ ہجری) اس سلسلہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور پھر جامعہ عثمانیہ کے تربیت یافتہ اُبھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے یہ تذکرہ بڑی محنت کے ساتھ مُرتب کیا ہے، اس کے پڑھنے سے اُردو زبان اور شاعری کا تدریجی ارتقا اور دکن کی ادبی خدمات کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اختصار کے باوجود کام کی باتیں "چھوٹنے نہیں پائیں" مختلف دور کے شعراء کے کلام کے انتخاب نے اس "داستان" کو اور زیادہ دلچسپ بنادیا ہے —— یہ دو شعر ایک بار پڑھنے کے بعد مشکل ہی سے کوئی اہلِ ذوق بھول سکے گا:—

گل کے ہونے کی توقع پہ جئے بیٹھی ہے ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے
—— (ماہ لقا چندا بائی۔ سنہ پیدائش سنہ ۱۱۸۱ھ)

زمزمہ نالۂ بلبل ٹھہرے میں جو فریاد کروں غُل ٹھہرے (ڈاکٹر مائلؔ[1])

مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنتہ کے درباری شعراء میں حیرتؔ بدایونی اور نجم الدین ثاقبؔ بدایونی کے حالات ضرور آنے چاہیئے تھے، ثاقبؔ بدایونی کا تو برسوں مہاراجہ بہادر کے دربار سے تعلق رہا ہے، ثاقبؔ بدایونی اُستاد ظہیر گورگانی کے جانشین تھے غزل میں اُن کا ایک خاص رنگ تھا، جب ذکر آگیا ہے، تو چند شعر بھی سُن لیجئے:۔

ساقیٔ بدمست کے بھی ہیں نرالے جوڑ توڑ مجھ پہ تہمت جوڑ دی چپکے سے ساغر توڑ کر
ظلم کا پہلو ندامت میں بھی قاتل کی رہا دفن خنجر بھی کیا میری برابر توڑ کر
وادیٔ غربت کو ثاقبؔ الوداع! گھر کے جانے کا زمانہ آگیا

ثاقبؔ بدایونی قصیدے کے تو بادشاہ تھے، افسوس ہے کہ وہ بالکل گمنام ہوگئے اور اب حیدرآباد دکن کے شعر و ادب کی تاریخ مُرتب ہوئی تو بھی اُن کا نام اور ذکر آنے سے رہ گیا —— اس کتاب میں کچھ اور قابلِ ذکر شاعروں

[1] داغ کے ہم عصر تھے اور اُن پر خوب چوٹیں کرتے تھے (م۔ق)

کے نام بھی چھوٹ گئے ہیں، غالباً اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے "ادارۂ ادبیاتِ اردو" چاہتا ہے کہ جو کچھ ہو سکے جلد سے چھپ چھپا کر منظرِ عام پر آ جائے، نہ جانے کل کیا حالات پیش آ جائیں اور اتنی مہلت اور سہولت بھی میسر ہو کہ نہ ہو!

داغ بیل

"داغ بیل" از:- الطاف مشہدی، ضخامت ۱۶۰ صفحات، مجلّد، ملنے کا پتہ:- عوامی کتب خانہ، بلاک ۱۵ سرگودھا!

جناب الطاف مشہدی اردو دنیا کے جانے پہچانے شاعر ہیں، "داغ بیل" انھی کے کلام کا مجموعہ ہے جس پر مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے مقدمہ لکھا ہے اور بڑے سلیقہ کے ساتھ لکھا ہے۔

الطاف مشہدی کے یہاں "انقلاب" اور "رومان" دونوں کی شدت ملتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُن کی طبیعت کے جوہر خلوت و میخانہ، زلف و آغوش اور لمس و نظارہ کی دنیا ہی میں جا کر کھلتے ہیں:-

یہ کس کی آنکھ اُٹھی اور اُٹھ کے جھک سی گئی   کہ بوتلوں میں شرابوں کی سانس رک سی گئی

اس خراب آباد میں کچھ روز جینے کے لیے   دوست! ہر خوددار ہے مجبور پینے کے لیے

ساون ہے، تو ہے، میں ہوں، جوانی پہ ہے نکھار   شیشے میں ہنس رہی ہے کوئی دخترِ بہار

غزلوں کا یہ رنگ ہے:-

چند آنسو، چند آہیں اور اک خوابِ طویل[1]   تھا ازل میں جس جگہ انساں وہیں ہے آج کل

حسین قہقہہ ٹوٹا لبِ شفق زا سے   فضا کے دوش پہ یا پھلجھڑی نے کروٹ لی

کم ظرفِ محبت بھی ہیں بیداد کے طالب   کیا اور بھی ارزانیٔ بیداد کرو گے

اک حسنِ برق پاش اِدھر اور اُدھر شراب   دانستہ تلخیوں میں گھرا جا رہا ہوں میں

الطاف "ترقی پسندانہ" اندازِ فکر سے بہت زیادہ متاثر ہیں، اس لیے اُن کے کلام میں زبان و بیان کی کمزوریاں یا تو یوں کہیئے کہ آ گئی ہیں یا وہ "اظہار" (Expression) کو ثانوی چیز سمجھ کر اس کی پروا نہیں کرتے۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ خیال اظہار کے لائق ہے بھی یا نہیں؟ اور میں نے جن لفظوں میں اسے ظاہر کیا ہے وہ لفظ اصل خیال سے کس حد تک ہم آہنگ ہیں، اور مفہوم ٹھیک طور پر ظاہر بھی ہو گیا؟ سننے والوں پر اس کا کیا اثر ہو گا؟ اردو روزمرہ کیا ہے؟ وہ تو پانی کے ریلے کی طرح گزرے چلے جاتے ہیں اب اُس کی زد میں چاہے لالہ و گل آ جائیں یا جھاڑ جھنکار!   ؎ دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام   (ماکی)

---

[1] کاش! "طویل" کی جگہ کوئی اور مناسب لفظ ہوتا۔ (م۔ق)

صفحہ (۹) پر ایک نظم ہے جس کا عنوان "دو موڑ" ہے، اس کا ایک شعر ہے :-

مضطرب ہے ترے انفاس میں چکیلی شمیم ذہنِ انساں میں ہیں بیدار ابھی خلد و جحیم

یہ آج ہی معلوم ہوا کہ "خوشبو" چمکدار بھی ہوتی ہے ـــــــ اک خیال، اور پھر کچھ لفظ ذہن میں آئے اور "چکیلی" لگا کر مصرعہ تیار ہو گیا، اس سے کوئی سروکار نہیں کہ "شمیم" کو کوئی خدا کا بندۂ "چکیلی" بھی کہتا ہے یا نہیں!

؎ پُر ہوس جسم کے سینوں میں الاپا ہوا راگ (صفحہ ۲۰)

اوّل تو "پر ہوس جسم" کی ترکیب ہی غیر شاعرانہ سی ہے پھر "سینوں میں الاپا ہوا راگ" آخر کیا بات ہوئی؟ خوابوں میں کون راگ الاپا کرتا ہے اور خوابوں میں گائے ہوئے نغموں کو "پُر ہوس جسم" سے کیا مناسبت ہے؟ اللہ جانے یہ کیا اشاریت، اور کیسی تلمیح ہے؟

؎ تری یادوں نے رُسوا کر دیا مجھ کو زمانے میں (صفحہ ۷۵)

نہ جانے انگریزی زبان کی دیکھا دیکھی اُردو میں کس بے ذوق نے "یاد" کی جمع بنائی، جس کو شعراء تک استعمال کر رہے ہیں حالانکہ شاعر کا ذوق بہت لطیف و نازک ہوتا ہے اور ہونا چاہئیے۔

شاعر ترے سُروں میں تحلیل ہو چکا ہے نغموں کی وسعتوں میں تحلیل ہو چکا ہے (صفحہ ۷۹)

شاعر کا کسی کے سُروں میں "تحلیل" ہو جانا، کس قدر نامانوس اور عجیب سی بات ہے، مفہوم تو بہر حال سمجھ میں آگیا مگر بات کہنے کا ایک قرینہ ہوتا ہے۔

ابرو کے حسیں موڑ پہ جاگی ہوئی نظمیں تخئیل کی آبادی سے بھاگی ہوئی نظمیں

اوّل تو "ابرووں" کا "موڑ" ہی کچھ عجیب نہ تھا، پھر اس پر "جاگی ہوئی نظمیں" - - - اور بات یہاں تک پہونچی کہ تخئیل کی آبادی سے نظمیں بھاگنے لگیں ـــــــ آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے؟

؎ پرستش گلستاں ہی ٹھہری تو فرقِ غنچہ و خار کیا ہے (صفحہ ۱۳۲)

بحر میں تو "غُنچا وُ خار" آتا ہے ـــــــ مگر آیا کرے، مصرعہ تو پورا ہو گیا!

یہ سانسیں اور یہ سانسوں کے ٹکڑے ابھی سب کچھ، ابھی کچھ بھی نہیں ہے (صفحہ ۱۳۶)

سانسوں کے بھی شاید اینٹوں کی طرح یا رسّی کی مانند "ٹکڑے" ہوتے ہیں!ـــ

تجھ کو ہے سجدہ روا اے اشتراکی آفتاب مضطرب ہے تیری شریانوں میں خونِ انقلاب (صفحہ ۲۶)

یہی "اشتراکیت زدہ" فکر، اس طرح روپ دھارتی ہے :-

؎ بہرا ہے رزّاقِ جہاں، آواز دے نادان نہ بن (صفحہ - ۲۶)

وہ "ترقی پسند" ادیب اور "اشتراکیت زدہ" شاعر ہی کیا، جو مذہب پر طنز نہ کرے اور خُدا کا مذاق نہ اُڑائے! اُس خدا کی ربوبیت کے قربان جائیے کہ جو اپنے باغیوں پر بھی رزق کے دروازے بند نہیں کرتا،

نعم المولیٰ ونعم النصیر!

—پاکستان کا پتہ :— دفتر "کوثر" نزد تھانہ گوال منڈی، لاہور —— (سالانہ چندہ چار روپے)

ماہنامہ "فردوس" دینی رسالہ ہی، جو تقریباً چھ سال سے دین و اخلاق کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور جس کی اشاعت کا مقصد اور غایت ہی "اقامتِ دین" ہے! اس "خصوصی اشاعت" میں سورۂ "فیل" سے لیکر سورۂ "ناس" تک دس قرآنی سورتوں کو آسان ترین زبان میں سہل ترجمہ اور دلنشین تشریح کے ساتھ پیش کیا گیا ہی —— ہم نمازوں میں جن سورتوں کو بے سمجھے ہوئے پڑھتے ہیں اُن کو "فردوس" کی اس اشاعت خاص میں سمجھایا گیا ہے —— جناب محمد خلیل خاں صاحب کو اللہ تعالیٰ اس نیک کام کیلئے جزائے خیر عطا فرمائے گا،

یہی قطرے ہیں جو مل جل کے بنیں گے طوفاں
انھی ذرّوں سے نمودار بیاباں ہوگا (انشاء اللہ)!

ہندوستانی سوشلزم

"ہندوستانی سوشلزم" از :— سید اصغر علی عابدی، ضخامت ۴۸ صفحات، قیمت آٹھ آنہ، ملنے کا پتہ :—
مکتبۂ فکر نو، ۱۳۵ شاہ گنج، الہ آباد (بھارت)

جاہلیت کا ایک دور تو وہ تھا کہ بہت سے "لات" اور "ھُبل" اُبھر آئے تھے جن کے آگے آدمی سرِ نیاز جھکاتا تھا —— اور اب اُن جھوٹے معبودوں کی جگہ "ازموں" "ISMS" نے لے لی ہے، اُنھی میں سے ایک "سوشلزم" بھی ہے —— جناب سید اصغر علی عابدی نے "سوشلزم" کے اس طلسم کو توڑا ہے، یہ کتاب اپنے اندر ٹھوس دلائل اور محکم حقائق رکھتی ہی، اور اس کے بعض اجزاء تو معلومات آفریں ہیں —— اللہ کا فضل ہی کہ حق کے علمبردار چاہے تعداد میں تھوڑے ہی سہی مگر ہر باطل قوت کے خلاف مورچہ جمائے ہوئے ہیں، یہ جرأتیں ایک دن "فتح مبین" کی نوید سنائیں گی۔

سالگرہ نمبر "ہمایوں"

سالگرہ نمبر "ہمایوں" :— ضخامت ۱۲۸ صفحات، دیدہ زیب سرورق، ملنے کا پتہ :— دفتر "ہمایوں" ۳۲ لارنس روڈ، لاہور

ماہنامہ "ہمایوں" اُردو کے اُن چند رسالوں میں ہی جن کا ذکر اُردو ادب کی تاریخ میں کیا جائے گا، "ہمایوں" کی ادبی خدمات کی عمر تیس سال کی ہی، قدیم و جدید شاعر نئے اور پرانے ادیب اور اہلِ ذوق اس مجلّہ سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، جنوری میں اُس کا سالگرہ نمبر آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہی۔

جناب میاں بشیر احمد نے اپنے شذرات (بزمِ ہمایوں) میں "اُردو زبان" کو ذریعہ تعلیم قرار دینے کا پُر زور مطالبہ کیا ہی —— اُن کا یہ جملہ کیا عجب ہی کہ آگے چل کر ضرب المثل بن جائے :—

"ایک اسلام اور اُردو —— یہ ہیں پاکستان کی قومی تعمیر کے دو مضبوط ستون" مگر اس کو کیا کیجئے کہ "پاکستان" میں اور تو سب کچھ ہو رہا ہی مگر ان دونوں ستونوں ہی سے نہ جانے کیوں غفلت برتی جارہی ہے، اور کسی کسی کی آنکھوں میں تو یہ دو "ستون" ہی سب سے زیادہ کھٹکتے ہیں۔

"سالگرہ نمبر" مجموعی طور پر خوب ہی، افسانوں، تنقیدی اور علمی مضامین اور نظموں اور غزلوں میں جناب

مظہر انصاری کا ذوقِ انتخاب جھلکتا ہے ــــ "لاوارث" (افسانہ) کے یہ جملے ایک عورت کی زبان کے ہیں اور کتنے اثر انگیز اور غیرت آفریں ہیں :-

"ایک اجنبی اور غیر محرم کا ہاتھ میرے جسم سے مَس کر رہا تھا، سانپ کے کاٹے بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی ہوگی، جتنی اس ہاتھ کے رکھنے سے ہوئی۔ ۔ ۔"

"میر کی فارسی شاعری" بہت اچھا مضمون ہے، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اس مقالہ میں بڑی محنت کی ہے اور اپنی خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔

(صفحہ ۷۰) "یہی وجہ ہے کہ تم نے نقاب اوڑھا ہے" ــــ "وجہ" کی جگہ "سبب" ہوتا تو یہ غلطی باقی نہ رہتی ــــ اس نظم (پردۂ حائل) کے بعض مصرعے بہت کمزور بلکہ غیر شاعرانہ ہیں!

(صفحہ ۸۲) "اُس کے باطن کی سیکڑوں بھیگی یادوں کو جلا دے گئی تھیں" اس افسانہ کے طفیل میں پہلی بار یہ بات معلوم ہوئی کہ "یاد" "بھیگی ہوئی" بھی ہوتی ہے ــــ "حیدرآباد دکن کے علمی وادبی رسائل" میں حیرت ہے کہ مضمون نگار نے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کا ذکر نہیں کیا، جس کا آغاز حیدرآباد دکن ہی سے ہوا تھا اور وہاں سے کئی سال تک یہ بلند پایہ بلکہ اپنی طرز کا منفرد اور نادر رسالہ نکلتا رہا۔

رسالہ "ہمایوں" کے مالک اور سابق مُدیر جناب میاں بشیر احمد نے "اسلام" کو پاکستان کا ستون بتایا ہے مگر اس "ستون" کی جھلک سالگرہ نمبر میں افسوس ہے کہ نظر نہیں آتی، کاش! یہ کمی محسوس نہ ہوتی۔

سالنامہ "نورنگ"

سالنامہ "نورنگ" ــ ادارہ :- آغا سرخوش قزلباش، مسعود الرحمٰن، اثر جلیلی ضخامت ۱۱۴ صفحات، اس شمارہ کی قیمت ایک روپیہ چار آنہ، چندۂ سالانہ ساڑھے پانچ روپے ــ ملنے کا پتہ :- دفتر ماہنامہ "نورنگ" صدر کراچی!

ماہنامہ "نورنگ" کا سالنامہ مضامین کے تنوع اور نظم و غزل کی رنگا رنگی کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے، اس میں ہر مکتبۂ خیال کے شاعر اور ادیب شریک ہیں، اتنے مشہور لکھنے والے عام طور پر رسالوں کو کم میسر آتے ہیں۔

(صفحہ ۶) "ساری زندگی اسی طرح تفصیل سے اس کے سامنے طے شدہ پھیلی ہوئی تھی" ــــ اس "طے شدہ" نے جملہ میں جھول پیدا کر دیا ــــ معین احسن جذبی کی نظم کا ایک شعر ہے :-

> تو ہی بتلا کر بھلا میرے سوادِ دنیا میں ــــ کون سمجھے گا ان آنکھوں کے تبسم کا گداز

"تبسم" میں "گداز" بھی ہوتا ہے! خوب! واہ! میاں جذبی واہ! ــــ (صفحہ ۳۴) "دونوں کندھوں پر افقی لکڑی سے سنبھالی ہوئی بہنگی کو ۔ ۔ ۔" "اُفقی لکڑی" آخر کیا بات ہوئی؟

(صفحہ ۷۵) "اردو شاعری میں الفاظ کی تراش، خراش، نشست اور استعمال، فصاحت اور بلاغت تشبیہ اور استعارے، اسلوبِ بیان اور فکری عناصر کی **کھوج** کافی ہوتی رہی۔ ۔ ۔" شروع سے فارسی اور عربی کے الفاظ چلے آرہے تھے، اُن کے معاً بعد اس "کھوج" نے پورے جملے کے توازن کو خراب کر دیا، "جستجو" یا "تحقیق" اس قسم کا کوئی لفظ لکھنا تھا، نثر ہو یا نظم لفظوں کی صحیح نشست اور توازن ہی کا تو سارا کھیل ہے۔

شاد عارفی کی غزل دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی، اب سے دس بارہ سال پہلے وہ خوب کہتے تھے مگر جب سے نام نہاد

فاران

ماہر القادری

جلد ۳ ——— شمارہ ۱۲

ماہنامہ

فاران

مارچ سنہ ۱۹۵۲ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ

۶ روپے (پاکستانی) ——— فی پرچہ ۸ آنے

۸ روپے (ہندستانی) ——— فی پرچہ ۱۱ آنے

مقام اشاعت

دفتر "فاران" کیمبل اسٹریٹ

کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

تیسرے سال کا آخری شمارہ ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، مارچ ۱۹۵۲ء میں "فاران" کی عمر تین سال کی ہوگئی، اور چھتیس ۳۶ مہینے کی طویل مدت میں ایک شمارہ بھی ناغہ نہیں ہوا، جو لوگ صحافتی کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں، اُنھوں نے "فاران" کی اس باقاعدگی اور اشاعت کے تسلسل پر بارہا اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے، اِن حضرات کی حیرت بے جا نہیں ہے —— اس لئے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ آج بازار میں اُن رسالوں کی مانگ ہے جو ایکٹرسوں کی تصویروں سے مزیّن ہوتے ہیں، جن کے افسانوں اور نظموں میں "جنسیات" کی فراوانی ہوتی ہے، اور جن میں "انعامی معمے" شایع ہوتے ہیں، شعروادب کے ساتھ قمار بازی اور فحاشی کے چٹخارے جب تک شامل نہ ہوں، عوام کا ذوق آسودہ کب ہوتا ہے، ساری دُنیا اسی راہ پر جارہی ہے، انسانی آبادی کی اکثریت نفسانی خواہشوں کی اسیر ہے، لوگوں کو تن پروری کے لیے دولت اور نفس کی سیرابی کے لیے لذّتیں چاہئیں، وہ چاہے کہیں بھی ملیں اور کسی طرح سے ملیں —— کلب گھروں کی قمار بازی میں، گھوڑدوڑ کی شرط میں، انعامی معموں اور لاٹری میں سٹّہ اور سود میں —— سینماؤں میں، تھیٹر ہالوں میں، رقص گاہوں میں، آرٹ گیلریوں میں، حُسن وشباب کے مقابلوں میں، فحش لٹریچر اور عُریاں تصاویر میں!

اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ "فاران" نے اس بے راہ روی میں عوام کے ذوق کا ساتھ نہیں دیا، اُس نے مطلق اس بات کی پروا نہیں کی کہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ بازار میں کسی جنس کی مانگ ہے؟ اور سوسائٹی میں کس قسم کی چیزیں پسند کی جاتی ہیں؟ —— "فاران" روشِ عام سے ہٹ کر اُس راہ میں چلا، جس میں نہ نفس کے لیے لذتیں ہیں اور نہ تجوری اور کیسۂ وجیب کے بھرنے کے لیے منفعتیں اور سہولتیں میسّر ہیں، جو سوسائٹی رقاصاؤں کے گھنگرووں کی نوائیں اور فلمی ریکارڈوں کے نغمے سُننے کی خوگر ہو، اُسے "فاران" نے قرآن کی آیتیں، رسول اللہ

کی احادیث اور حکمت و موعظت کی باتیں سُنائیں، جس قوم کا ذوق رنگین ادب اور فحش لٹریچر کی رَو میں بہتا ہو اور جس کی عورتوں کو فلمی سوال و جواب پڑھے بغیر رات کو نیند نہ آتی ہو، اُس کے سامنے "فاران" نے سنجیدہ ادب اور باوقار لٹریچر پیش کیا، "فاران" برائیوں سے لڑا ہے، برائیوں کا اُس نے ساتھ نہیں دیا، عوام کے بگڑے ہوئے ذوق کی اصلاح کے لیے اُس نے تگ و دو کی ہے، عوام کے ذوق و شوق اور رجحانات کی ہم نوائی نہیں کی۔

جس رسالہ کی پالیسی "زمانہ ستیز" ہو، وہ "زمانہ ساز" پرچوں کے مقابلہ میں مقبولیت اور مالی اعتبار سے کامیاب کس طرح ہو سکتا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ جن بُک اسٹالوں پر دوسرے فلمی اور رنگین ادب کے ترجمان رسالے کئی کئی سو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتے ہیں، وہاں "فاران" آٹھ دس سے زیادہ نہیں بکتا، دوسرے پرچوں کے انبار میں "فاران" اجنبی اجنبی سا لگتا ہے، کتب فروش بھی "فاران" کو اپنی دُکانوں اور اسٹالوں پر نمایاں کر کے نہیں رکھتے، اور وہ کیوں رکھیں، جبکہ گاہکوں کا ذوق دوسری طرح کے ماہناموں کا طلب گار ہے، رسالہ بیچنے والوں کو اچھے، بُرے، سنجیدہ اور فحش، اور خوب و ناخوب سے کیا سروکار، وہ تو لوگوں کی "مانگ" (D E M A N D) کا ساتھ دیتے ہیں، اُنھوں نے اپنی دُکانیں آخرت بنانے کے لیے نہیں، دُنیا بنانے کے لیے لگائی ہیں تو اچھے اور بُرے میں امتیاز کیسا؟

یہ حالات "فاران" کے لیے غیر متوقع نہیں ہیں، ہم نے اس وادی کو فرشِ گل نہیں، "پُرخار" اور انتہائی سنگلاخ سمجھ کر ہی قدم رکھا تھا، حق گوئی کی پوری تاریخ قربانیوں سے لبریز ہے، جھوٹوں پر دُنیا نے سدا پھول اور سچوں پر پتھر ہی برسائے ہیں! حالات کی یہ ناسازگاری ہمارے لیے طبعًا وجہ ملال تو ہے مگر ہمت شکن نہیں ہے —— اس لیے کہ ناامیدی اور بے حوصلگی مردِ مومن کی شان کے خلاف ہے، مُسلمان کا عزم شکست کو قبول کر ہی نہیں سکتا، سچائی ہار مان ہی نہیں سکتی وہ اُس وقت بھی فتح مند ہوتی ہے جب ایک آواز بھی اُس کی حمایت میں بلند نہیں ہوتی اور ذرہ ذرہ اُس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائے۔

شکایت نہیں مقامِ شکر ہے کہ ماحول کی اس نا مساعدت کے باوجود "فاران" اس شان کے ساتھ زندہ اور باقی ہے کہ دیکھنے والے اُس کی زندگی کو ایک "معجزہ" سمجھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اُس ناکارہ انسان سے خدمتِ دین کا کام تھوڑا بہت لے رہا ہے جو علم و عمل دونوں سے تہی دامن ہے، خدا کی ذات کے سوا جس کا کوئی ساتھی اور رفیقِ کار بھی نہیں ہے، اور جو اپنے اندر بہت سی اخلاقی کمزوریاں بھی رکھتا ہے! ایک ناچیز قطرہ میں طوفان کا شور اور ایک حقیر ذرّہ میں پہاڑوں جیسی قوت آخر کہاں سے آگئی؟ وہاں سے آئی کہ جہاں سے ہر چیز کو وجود عطا ہوتا ہے، اُس کی نعمت بے اندازہ اور اُس کا کرم لا محدود ہے، وہ چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا؟ پس "فاران" اُسی کے کرم کا ایک ادنیٰ ظہور اور اُس کے فضل کا معمولی سا کرشمہ ہے، عاجز اور مجبور بندے کے بس میں کیا ہے، وہ کس بات پر اترائے اور فخر کرے، نیکی کی توفیق اُدھر ہی سے ملتی ہے، عزائم میں قوت وہی بخشتا ہے، حوصلوں میں توانائی اُسی کے حکم سے آتی ہے، وہ نہ چاہتا تو "فاران" وجود ہی میں نہ آتا، تمام تحسین، تعریف، توصیف اور حمد و ستایش

اُسی مالکِ حقیقی اور منعمِ واقعی کو زیبا ہے اور "فاران" کا ناچیز مدیر اُس کی کبریائی کے آگے اپنے عجز کو پیش کرتا ہے۔
یہ بات پہلے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ آندھیوں کی گود میں بھی کوئی چراغ جل سکتا ہے "فاران" کی زندگی نے اس حقیقت کو تجربہ کرکے دکھا دیا، کہ مادی بے سر و سامانیوں کے باوجود ایک سنجیدہ رسالہ زندہ رہ سکتا ہے اور جو کوئی حلال کمائی کو ذریعہ رزق بنانا چاہے اُس پر بھی روزی کی راہیں کھل جاتی ہیں، اُس کی کوئی ضرورت بھی بند نہیں رہتی ——— اور عزتِ نفس اور احترامِ خودداری کے ساتھ اُس کے لیے وسائل پیدا کر دیئے جاتے ہیں۔

فلموں، تھیٹروں اور بنکوں کے اشتہار چھاپ کر ہم کافی نفع کما سکتے تھے اور ایک آدھ بار دل للچایا بھی اور نفس نے اس بُرائی کے جواز کے لیے کچھ تاویلیں بھی تراش دیں، مگر اللہ تعالیٰ کے فضل نے ہماری دستگیری کی، ہمارے ہاتھ کو تھاما اور لغزش نہ ہونے دی، اس تجربہ نے ہماری آنکھیں کھول دیں کہ جو کوئی بُرائی سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اُس کے نیک عزم کا دو قدم بڑھکر استقبال کرتی ہے اور جس کی طبیعت میں نیکی کی خواہش، بھلائی کی تڑپ اور سچائی کا مزہ سے عزم ہی نہ ہو اُس پر "ضلالت" مسلط کر دی جاتی ہے،

"یھدی من یشاء و یضل من یشاء"

کا یہی مفہوم ہے، جو کوئی چاہے اس کا تجربہ کرکے دیکھ لے نیت، عزم اور جذبہ کے اعتبار اور کمیت و کیفیت کے لحاظ سے ہی سعادت و شقاوت کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔

"فاران" کے ناظرین اس کے گواہ ہیں کہ اُن سے ہمارا معاملہ تاجرانہ نہیں ہے، ہم نے "فاران" کی توسیعِ اشاعت اور مادی اعانت کے سلسلہ میں ایک سطر بھی نہیں لکھی، ہم نے اپنا دُکھ درد اُس سے کہا کہ جو تمام جہان کا دُکھ درد دُور کرتا ہے اور جس کی قدرت زمین و آسمان کو تھامے ہوئے ہے، دُنیا والوں سے غم و الم بیان کرنے میں جس قدر سُبکی اور اذیت محسوس ہوتی ہے، اُسی قدر بلکہ اُس سے بہت زیادہ وقار، خوش دلی اور شگفتگی اللہ تعالیٰ کے روبرو عرضِ غم کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کرتے وقت جو آنسو آنکھ سے نکلتا ہے اُس میں شگفتہ سامانی، اطمینانِ قلب اور پاکیزگی کے نہ جانے کتنے سمندر موجزن ہوتے ہیں ——— اُس کی رحمت پر فخر و ناز کرتے ہوئے ہم اعلان کر رہے ہیں کہ "فاران" کے انتظامات کے سلسلہ میں تشویش و بے اطمینانی کی ایک صبح بھی ہم پر طلوع نہیں ہوئی، کوئی دشواری آئی بھی تو زیادہ دیر تک سدِ راہ نہیں رہی، کام بنتا اور سلسلہ خیر تا ہی چلا گیا، اور جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا یہ کام چلتا رہے گا۔

ہمیشگی اور دوام و بقاء تو خدائے قادر و برتر ہی کے نام اور کام کو ہے، انسان کسی کام کے لیے دعوے کس طرح کر سکتا ہے کہ یہ کام ہمیشہ یوں ہی جاری رہے گا، "فاران" کی زندگی کی ہم ضمانت کس طرح دے سکتے ہیں جبکہ ایک سانس کے بارے میں بھی ہمیں پوری طرح یقین نہیں ہے کہ یہ اندر جاکر واپس آئے گا کہ نہیں، آنے والے واقعات پر غیب کے پردے ڈال دیئے گئے ہیں، ایک لمحہ کی کسی کو خبر نہیں کہ جانے کب کیا ہو جائے، مشیتِ خداوندی کسی کے عزم اور تمنا کی پابند نہیں ——— مگر ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تکوینی پر یقین رکھتے ہوئے اللہ کی رضا اور خوشنودی کی راہ پر چلتے رہیں اور راستہ کی دشواریوں سے نہ گھبرائیں،

"فاران" کو ہم اپنی طرف سے ہر حال میں جاری رکھنے کی کوشش کریں گے، اور اپنے خون جگر کا آخری قطرہ تک اس کی سیرابی میں صرف کر دیں گے۔

تین سال کی مدت میں ہزاروں روپیہ کا لین دین رہا ہے مگر اُس کارساز کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ آج فروری کی ۲۷ر تاریخ تک "فاران" کے ذمہ کسی کی ایک پائی بھی باقی نہیں ہے اور کسی کاروباری ادارے یا فرد کو ہم سے رقمی حساب کتاب کے سلسلہ میں کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، کام کرنے والوں کو ہم نے اُن کے ماتھے کا پسینہ خشک ہو جانے سے بہت پہلے اُن کے واجبات ادا کر دیئے ہیں! ادا کرنے کی نیت کے ساتھ قرض لینا کوئی بُری بات نہیں ہے، ہر زندگی میں اس کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر یہ مواقع پیش نہ آئیں تو اور اچھی بات ہے، اور "فاران" کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ایسا ہی معاملہ رہا ہے، اُس نے کسی کے سامنے ایک لمحہ کے لیے بھی معذرت خواہ نہیں ہونے دیا، اور عُذر و ندامت کی اذیت سے ہمیں اس وقت تک محفوظ رکھا، جس مالک نے اب تک ایسی ایسی نوازشیں کی ہیں، اسی کے کرم سے ہمارا مستقبل اچھی اُمیدیں رکھتا ہے۔

ضروری اشارے اور مفید مشورے

ہمارا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ "فاران" کو ترقیوں کے سلسلہ میں معراج نصیب ہو چکی ہے کتابت، طباعت، کاغذ اور "GET UP" سے لیکر مضامین تک ہر چیز ترقی کی محتاج ہے اور ہمیں اپنی کوتاہیوں کا اعتراف ہے، ہم اب تک کوئی "خاص نمبر" یا "سالنامہ" بھی نہیں نکال سکے، اسکیمیں بہت سی ذہن میں ہیں مگر ہم چادر کی وسعت دیکھ کر ہی پاؤں پھیلا سکتے ہیں اور اپنی "بساط" اور حالات سے باہر نہیں جا سکتے ——— ہم کہتے ہیں کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں "فاران" جس انداز پر بھی چل رہا ہے، یہ بھی بہت کچھ غنیمت ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی ناشکری نہیں کرتے، اُس کو منظور ہوگا تو اور زیادہ بہتر حالات بھی میسر آجائیں گے، ایک تمنا البتہ شروع دن سے ذہن و فکر میں کھٹک رہی ہے، وہ یہ کہ ہم "سیرت نمبر" بہت بڑے پیمانہ پر شائع کرنے کا عزم رکھتے ہیں، دیکھئے یہ اُمید کب تک بر آتی ہے اور اُس کے لیے کس وقت سامان فراہم ہوتے ہیں، اگر "سیرت نمبر" کی اسکیم خاطر خواہ کامیاب ہو گئی تو یہ شمارہ شاید اُردو ادب میں یادگار رہے گا۔

"فاران" میں نثر و نظم کے جو مضامین چھپنے کے لیے آتے ہیں، اُن کو ہم پوری ذمہ داری اور سختی کے ساتھ جانچتے ہیں، کوشش اب تک یہی رہی ہے کہ "فاران" کا معیار پست نہ ہونے پائے، جن حضرات کی بھیجی ہوئی چیزیں شائع نہ ہو سکیں اُن سے ہم معذرت خواہ نہیں ہیں کہ ہم نے اُن کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کی اور جھوٹ موٹ کی معذرت ہم سے نہیں آتی، ہم اس نزاکت سے بے خبر نہیں ہیں کہ جب کسی مضمون نگار کا مضمون اور کسی شاعر کی غزل یا نظم کسی رسالہ اور اخبار میں نہیں چھپتی اور ادارے کی طرف سے نفی میں جواب ملتا ہے تو اس سے دل شکنی ہوتی ہے، لیکن اس دل شکنی کا علاج افسوس ہے کہ ہمارے پاس نہیں ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں کسی کی دل شکنی کے باوجود، دامنِ اخلاق بے داغ رہتا ہے، وہ دل شکنی البتہ گناہ ہے جس کا سبب کوئی ناانصافی، غفلت، بے اعتدالی اور ظلم و زیادتی ہو، ہر کسی کی دل دہی اور خاطر داری کے لیے

"فاران" کا معیار ہم پست نہیں کر سکتے، اب کوئی اپنے مضامین نہ چھپنے کے سبب ہم سے خفا، کبیدہ خاطر اور روٹھا ہوا رہے تو اس کی تلافی ہم سے افسوس ہے کہ نہیں ہو سکتی۔

یہ بات معلوم تو بہت دنوں سے تھی مگر اس کا مشاہدہ اور تجربہ اس تین سال کی مدت میں ہوا کہ شہرت کے مرض میں عوام اور خواص سبھی مبتلا ہیں جس سے ذرا سا بھی لکھنا اور شعر موزوں کرنا آتا ہے، اس کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ ہر رسالہ میں چھپتا رہے، اور نہ صرف یہ کہ چھپتا ہی رہے بلکہ اس کی شاعری اور مضمون نگاری پر مقالے شائع ہوں، رسالہ کے ایڈیٹر اس کی مدح و توصیف اور تعارف میں اپنا تمام زورِ قلم صرف کر دیں، لوگ بڑی بڑی غلط فہمیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں، کوئی اللہ کا بندہ معقول مشورہ دیتا ہے تو سمجھا جاتا ہے کہ معاصرانہ رقابت اس مشورت میں شریک ہے ——— ہم کہتے ہیں کہ دُنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے اور بہت سے میدان پڑے ہوئے ہیں، آخر نمود و شہرت کے لیے عرصۂ شعر و ادب ہی کو کیوں منتخب کیا جاتا ہے!

"فاران" میں جس ذمہ داری اور کاوش و عرق ریزی کے ساتھ کتابوں اور رسالوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں ہم خود کچھ کہیں گے تو جرمِ خود ستائی کے مرتکب ہوں گے، ہم سرسری تنقید اور چلتے ہوئے ریویو کے قائل نہیں ہیں، ہم کیا کہیں کہ وقت کا کتنا حصّہ کتابوں کے مطالعہ کی نذر ہو جاتا ہے، اس معاملہ میں ہم نے ذاتی تعلقات کی بھی پروا نہیں کی، اور نہ کسی مشہور شخصیت سے مرعوب ہوئے، ہم نے جس کسی کی بات کو قابلِ اعتراض سمجھا اس کے اظہار میں کمزوری نہیں دکھائی، تنقید کے سلسلہ میں ہمارے یہاں جو خطوط آئے، اُن کو بھی ہم نے اپنے رسالہ میں شائع کیا، اور اپنی غلطی کو کھلے دل کے ساتھ مان لیا۔

زبان و بیان کی غلطیوں کی گرفت "فاران" کی تنقیدوں کی خصوصیت ہے ——— اور وہ اس لیے کہ آجکل عام طور پر، زبان سے بے پروائی برتی جاتی ہے، لکھنے والے بہت کم اس بات کا لحاظ رکھتے ہیں کہ جس مفہوم کو وہ ادا کرنا چاہتے ہیں وہ مناسب اور ہم آہنگ لفظوں میں ادا ہوا بھی یا نہیں! اس نام نہاد "ترقی پسندی" نے شعر و ادب کے مزاج کو بگاڑ دیا ہے، یہ غبار اگرچہ آہستہ آہستہ چھٹ رہا ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی تیز سا بگولا آ گیا اور فضا تھوڑی دیر کے لیے اور زیادہ غبار آلود ہو گئی۔

"اسلام پسند شاعروں کے کلام میں جب ہم بے راہ "ترقی پسندوں" کے اندازِ بیان کی جھلک دیکھتے ہیں تو ہمیں بہت دکھ ہوتا ہے، ان شاعروں کی خدمت میں ہم عرض کرتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے کلام کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں اور اُسی کو چراغِ راہ بنائیں، اقبال صرف مفکر اور فلسفی ہی نہیں تھا بلکہ بہت بڑا شاعر اور نئی اصطلاح میں باکمال آرٹسٹ بھی تھا۔

نئے شاعروں اور مضمون نگاروں کو ہم یہ مشورہ دیں گے کہ وہ ہزاروں صفحے صرف اس لیے پڑھیں کہ لکھنے والوں نے اپنے مفہوم کو کن الفاظ میں ادا کیا ہے، جس شخص کو "لفظوں" کی پرکھ نہیں، وہ نہ تو شاعر بن سکتا ہے اور نہ ادیب! یوں لکھنے کو قلم، دوات اور کاغذ پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے جس کے دل میں جو بھی آئے لکھ سکتا ہے، اور ہر لکھی ہوئی چیز کو چھاپنے کے لیے رسالے اور اخبار بھی موجود ہیں ——— ابھی ابھی یہ جو "ہزاروں صفحوں کے مطالعہ" کا مشورہ دیا گیا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جس کسی کی کتاب میں ہاتھ آ گئی اُسے پڑھنا شروع کر دیا، مطالعہ

کا آغاز اچھی اور شستہ کتابوں سے ہونا چاہیے تاکہ مذاق پاکیزہ، سنجیدہ اور صحت مند رہے، علامہ شبلی نعمانی کی تمام کتابیں ہر اُردو شاعر و ادیب کی نگاہ سے گزرنی ضروری ہیں کہ شبلی کے یہاں ادبیت، شعریت اور لفظوں کا توازن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے، اس دور میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیفات خیال و فکر کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی اپنا جواب نہیں رکھتیں، اُن کے قلم نے اُردو انشا کو معراجِ کمال تک پہونچا دیا ہے۔

اُردو کی مقبولیت کا راز اُس کے لفظوں کی دلکشی اور اسلوب کی نزاکت میں پنہاں ہے، اُردو ادب ترقی کی ان بلندیوں تک اسی لیے پہونچا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے اپنے خیالات کو بہترین لفظوں اور حسین انداز میں ادا کیا ہے، جو کوئی اُردو زبان کی بنیادی خصوصیت اور فطری نزاکتوں کو نہیں جانتا اور جانتا ہے تو اس سے بے پروائی برتتا ہے۔ تو وہ حقیقت میں اُردو کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے ——— یہ نظریہ یکسر جہالت پر مبنی ہے ۔ کہ "اس طرح مفہوم تو ادا ہو گیا" دیکھنا یہ ہے کہ "مفہوم ادا کس طرح ہوا" مفہوم تو اشاروں سے اور کچھ غوں غاں کر کے گونگے بھی ادا کر لیتے ہیں مگر کیا گونگوں کا اس طرح مفہوم ادا کر دینا، گویائی رکھنے والوں کے لیے "مثال" بن سکتا ہے۔

کسی چیز کی خوبی اور افادیت کا اندازہ "کمیت" سے نہیں "کیفیت" سے لگایا جاتا ہے، صرف کتابوں کی کثرت کسی زبان کے ادب کی ترقی کا سبب نہیں بن سکتی، دیکھنا یہ ہے کہ کتابیں اپنے مضامین کے اعتبار سے کس پایہ کی ہیں؟ یہ جو کتب فروشوں کے یہاں کتابوں کے انبار لگے رہتے ہیں ان میں سے بہت سی کتابیں ایسی ہیں جن کو پھاڑ کر اُن کے اوراق قصائیوں، حلوائیوں اور سودا سلف بیچنے والوں کے یہاں تقسیم کر دیئے جائیں تاکہ اُن سے صحیح کام لیا جا سکے ——— اللہ تعالیٰ ہر زبان کو اُس کے بولنے والوں کے "مصنف بننے کے شوق" سے محفوظ رکھے!

افسانہ

"فاران" میں صرف ایک افسانہ ہوتا ہے اور وہ بھی اس کے ایڈیٹر کا لکھا ہوا، جس میں افسانہ کی موجودہ "ٹیک نک" کے اعتبار سے کمزوریاں ہوتی ہیں، مگر ہم کیا کریں، جس انداز کے افسانے ہم چاہتے ہیں، اُس انداز کے افسانے ہمیں میسر نہیں آتے، اور جو ہمارے یہاں چھپنے کے لیے آتے رہتے ہیں، وہ ہماری پالیسی کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔

مگر جب افسانہ کا ذکر چھڑا ہے تو ہم یہ بھی عرض کیے دیتے ہیں کہ افسانہ نویسی کی موجودہ "ٹیک نک" بھی ایک "اعجوبہ" سے کم نہیں ہے، ہم نے بہت سے افسانے صرف اُن کی "ٹیک نک" سمجھنے کے لیے پڑھے ہیں اور وجدان تلملا تلملا کر رہ گیا ہے، ذرا سی بات آدھے آدھے صفحہ میں جا کر کہیں ادا ہوتی ہے اور اس درمیان میں "سماج" "پس منظر" "فلسفہ" اور "نفسیات" کی نہ جانے کتنی عجیب و غریب بھول بھلیوں سے گزرنا پڑتا ہے، افسانہ کا "ہر کردار" ایک بلند پایہ مفکر اور انقلابی لیڈر بن کر نمودار ہوتا ہے ——— کسی منظر کی عکاسی اور ماحول کی ترجمانی بھی ایسے انداز میں کی جاتی ہے کہ سوچنے والے دماغ کی لس چولیں ڈھیلی ہو جاتی ہیں ——— مثلاً:-

"دن رینگ رینگ کر شام کے پاس جا پہونچا تھا، اُجالا دم توڑتے ہوئے کراہ رہا تھا اور اندھیرا بھیرویں راگ الاپ رہا تھا، سورج کی کرنیں دن کا جال بُنتے بُنتے تھک گئی تھیں اور

وہ اب راستہ کی اوٹ میں لمبی لمبی لیٹ کر سوجانا چاہتی تھیں ... مگر آرام اس دُنیا میں کسے نصیب ہے؟ ہر زندگی بھوکے گدھ کی طرح کراہتی اور غراتی رہتی ہے ... شیاما نے دیاسلائی کی سرسراتی ہوئی لو سے چراغ کی بتی کو جلادیا، اور کھپریل کے سوراخوں میں اُجالا ناچنے لگا، بدمعاش بھتنوں کی طرح! وہ سوچ رہی تھی، اب کیا ہوگا؟ میں اکیلی ہوں، پتاجی آدھی رات سے پہلے نہ آسکیں گے، وہ بوڑھے ہیں اُن کا بڑھاپا، افریقہ کے بندروں کی لٹکتی ہوئی کھال کی طرح کمزور اور ڈھیلا ہوگیا ہے، اور یہ مورکھ سماج! جس کے سینے میں دل تو ہے مگر اُس میں پیپ پڑگئی ہے ... اور وہ سوچتی رہی اُس دماغ سے جس کی سطح ببول کی چھال کی طرح کھردری تھی، یا جیسے کسی گاؤں کی لڑکی کی کنگھی کے دندانے ٹوٹ گئے ہوں، شیاما کھانسنے لگی، جوار کی روٹی اُس کے حلق کی کھڑکی سے جھانک رہی تھی ... ...“

اس انداز کی افسانوی ”ٹیک نک“ کو ہم مجذوبوں کی بڑسے زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اگر ”ٹیک نک“ عدم توازن، بے ربطی اور کسی اعجوبگی کا نام ہے تو پھر ہم سے ان ”حماقتوں“ کی توقع نہ رکھی جائے، علمی مقالہ ہو، ادبی اور تنقیدی مضمون یا افسانہ اور ناول ہو، ہم ہر چیز میں ربط، توازن، ہم آہنگی اور خوش سلیقگی کے قایل ہیں، آرٹسٹ صحیح معنی میں آرٹسٹ ہو تو اُس سے بڑھ کر کوئی حُسن شناس نہیں ہوسکتا اور حُسن حقیقت میں ”تناسب“ و ”توازن“ ہی کا نام ہے، ہم کو اِک قسم کی افسانوی ”ٹیک نک“ کو زبان و ادب کے ساتھ ایک طرح کا مذاق سمجھتے ہیں، اور اس طرز کے افسانہ نگار، ہماری نگاہ میں اُن بہروپیوں اور جوکروں ([illegible]) کی طرح ہیں جو سرکس کے پنڈال کے دروازوں پر کھڑے ہو کر طرح طرح کی نقلیں کیا کرتے ہیں۔

ہماری تمنّا

”فاران“ کی خدمات ہی کیا ہیں جو اُن پر ناز کرے، اور مخلوق کو کبر و ناز کسی حالت میں بھی زیبا نہیں ہے، پھر بندگی کا فریضہ تو جان دے کر بھی پوری طرح ادا نہیں ہو پاتا، دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں کی یہ تھوڑی بہت محنت ایثار اور قربانی کی تعریف میں کہاں آتی ہے؟

ہاں! اللہ کے فضل کا ہم ضرور اعتراف کرتے ہیں کہ اُس نے ”فاران“ کو حق گوئی کی توفیق بخشی، سچی بات کہنے میں ہم نے جھجک محسوس نہیں کی، یہ بھی اُس کا کرم ہے کہ حق گوئی کی سزا سے ہم ابھی تک محفوظ ہیں مگر جب ایسا وقت آئے گا تو دعا ہمارے لئے استقامت کو اب سے اور زیادہ مضبوط پائے گی۔

”فاران“ ہم نے اس لیے نہیں نکالا کہ کوئی کام کرنے کے لیے نہیں ہے تو لاؤ ایک رسالہ ہی نکال لیں، نہ اس کی اشاعت کا مقصد نام و نمود، کھیل تفریح اور مالی منفعت ہے، ہاں! یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ وہ اس کے ذریعہ ہماری روزی کا بھی بندوبست فرمادے ——— ہم ایک حقیر کارکن کی طرح اُن شہسواروں کی رکابیں تھام کر چل رہے ہیں، جو پوری جرأت اور ناقابلِ شکست عزم و یقین کے ساتھ اللہ کے راستہ میں گامزن ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ ہی کو حقیقی حاکم مانتے ہیں، تکوینی بھی تشریعی بھی! اور کسی دُنیوی حاکم کی معصیت میں اطاعت

کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہیں، کوئی خوف نہ ہمیں مرعوب کرسکتا ہے اور نہ کسی لالچ سے ہم رام ہو سکتے ہیں جہاں جہاں بھی فسق، معصیت اور خدا کی نافرمانی پائی جاتی ہے اُس سے ہم بیزاری بلکہ بغاوت کا اعلان کرتے ہیں!

"افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض" ہمارا مسلک ہرگز ہرگز نہیں ہے، ہم پُورے کے پُورے اسلام کو مانتے ہیں اور اُسی کے عملی نفاذ کے لیے جد و جہد کرنے کو ایمان کا سب سے زیادہ ضروری بلکہ ناگزیر تقاضا سمجھتے ہیں، پاکستان میں ہم نظام حق کا قیام چاہتے ہیں: ایسا نظام جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے ستونوں پر قایم ہو، جہاں اللہ کے قانون کے سوا اور کسی کا قانون نہ چلے، جہاں فاسقوں اور فاجروں پر شرعی حدیں جاری کی جائیں، جہاں کے حاکم اپنے کو ملت کا خادم سمجھتے ہوں، جن کو اقتدار کی ہوس نہ ہو، اور جن میں صدیق و فاروق اور عثمان و علی (رضی اللہ عنہم) کی خُو بُو پائی جاتی ہو ——— ایسا پاکستان جہاں کا معاشرہ اسلامی معاشرہ ہو، ہر طرح کی فحش کاری جہاں قانوناً جُرم ہو، جہاں کی عورتوں کو جاہلیت کے "تبرج" کی اجازت نہ ہو، جہاں کے سرکاری حلقوں کو دیکھ کر، غیر ملکوں کے سفرا، وفود اور سیّاح اسلام کی سادگی، پاکیزگی اور نظم و ضبط کو محسوس کریں، جہاں ناداروں اور محتاجوں کی خبرگیری حکومت کے بجٹ کا ایک جُز ہو، جہاں اغنیا، زکوٰۃ کا مال لیکر محتاجوں کو ڈھونڈتے پھریں، جہاں دولت کی تقسیم میں انصاف پایا جائے۔

"فاران" اسی انقلاب کی تمنا اور ولولہ لیکر زندگی کی چوتھی منزل میں قدم رکھ رہا ہے اس دُعا کے ساتھ کہ بارِ الہٰا! ہمارے قلم اور زبان کو سدا حق کی حمایت کی توفیق عطا فرما، جو لغزشیں اب تک ہوئی ہیں اُن کو معاف کردے، تنگی اور خوشحالی، غم اور مسرت کامیابی اور ناکامی، غرض ہر حالت میں ہم تیری رضا جوئی ہی کو مقصودِ حیات سمجھیں، مالک! وہ قناعت عطا، فرما جو تیرے سوا دوسروں سے بے نیاز کردے، وہ جُرأتِ ایمانی دے جو آتشِ نمرود میں بے دھڑک کود پڑے، یا الٰہ العالمین! جن آنکھوں نے باطل کے غلبہ کو دیکھا ہے وہ آنکھیں ایک بار تیرے دین کے غلبہ کو بھی دیکھ لیں، مولا! آخرت کی رسوائی سے بچانا، نیکو کاروں کے ساتھ ہمارا حشر ہو، رسول اللہ کی شفاعت اور تیری رحمت دونوں مل کر ہمیں ڈھانپ لیں یہاں تک کہ تیری رضا اور ہماری ندامت کے لبوں پر بیک وقت مسکراہٹ آجائے ——— ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم!

ماہر القادری
۲۸ فروری ۱۹۵۲ء

"تابعین"
مُرتبہ:- شاہ معین الدین ندوی
رفیق دار المصنفین

تلخیص:- ادارہ "فاران"

پاک زندگیاں

جن کے نفسِ گرم سے آج تک فوز و سعادت کے چراغ روشن ہیں

والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعواھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ واعد لھم جنٰتٍ عدنٍ تجری من تحتھا الانھار۔

(ترجمہ) اور مہاجرین و انصار میں سے جن لوگوں نے قبولِ اسلام میں سبقت کی اور جن لوگوں نے خوش دلی کے ساتھ اُن کا اتباع کیا، خدا اُن سے راضی اور وہ خدا سے راضی ہیں اور خدا نے اُن کے لیے باغ تیار کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں۔

اُسوۂ رسول اور آثارِ صحابہ کے بعد تابعین کی زندگی میں ہمارے لیے بھلائی کے نمونے ہیں، ان نفوسِ قدسیہ کی سیرتیں، صحابہ کرام کی سیرتوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھیں اور بعض تو اِن میں اس مرتبہ کے تھے کہ خود صحابہ کرام اُن کی عزت کرتے تھے ———— فوز و سعادت کے انھی چراغوں سے کچھ جھلکیاں مستفاد اور مستعار لے کر یہاں پیش کی جارہی ہیں:-

انسان کے علم کے نتائج میں سے خشیتِ الٰہی اور جہل کے نتائج میں سے اپنے عمل پر غرور کافی ہے، اور طرح طرح کے لالچ انسان کو بدکرداریوں پر آمادہ کرتے ہیں　　(ابراہیم بن یزید تیمی)

حضرت ابراہیم بن یزید النخعی شہرت اور ریا کو سخت ناپسند کرتے تھے، چنانچہ فرماتے تھے کہ جو شخص علم کا ایک کلمہ بھی اس نیت سے مُنہ سے نکالتا ہے کہ اس سے لوگوں کو اپنی طرف مایل کرے تو وہ اس کے وسیلہ سے سیدھا جہنم میں گرتا ہے، کہ جس کی شروع سے آخر تک یہی نیت ہو ———— اُن کے ایک شاگرد نے حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے اختلاف کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا، نہ میں سبائی ہوں نہ مُرجی! اسی طرح ایک اور شخص نے آپ سے کہا کہ مجھے ابوبکر رضؓ و عمر رضؓ کے مقابلہ میں علی رضؓ سے زیادہ محبت ہے، آپ نے اس پر فرمایا کہ اگر علی رضؓ تمہارا یہ خیال سُنتے تو تم کو سزا دیتے، اگر تم کو اس قسم کی باتیں کرنی ہیں تو میرے پاس نہ بیٹھا کرو، فرماتے تھے کہ مُجھ کو عثمان رضؓ کے مقابلہ میں علی رضؓ سے زیادہ محبت ہے لیکن میں آسمان سے مُنہ کے بل گرنا پسند کرتا ہوں مگر یہ گوارا نہیں ہے کہ عثمان رضؓ کے ساتھ کسی قسم کا سوءِ ظن رکھوں!

حضرت ایوب بن ابی تمیمہ سختیانی کی ذات اُن کے اوصاف و کمالات کے سبب مرجع خلائق بن گئی تھی لیکن ان کو دُنیا، اہلِ دُنیا اور شہرت و نمود سے اس قدر اجتناب تھا کہ وہ سب سے بھاگتے تھے، چنانچہ عام مجبول اور لوگوں کی نظروں سے بچنے کیلئے عام اور مالوف راستوں کو چھوڑ کر نامانوس اور دور دراز راستوں سے نکلتے تھے ——— اُن کی شخصیت کی وجہ سے لوگ اُن کے سلام کے جواب میں بہت کچھ اضافہ کرتے ان کو یہ امتیاز بھی گوارا نہ تھا، چنانچہ اُن کے جوابات سُن کر کہتے، خدایا! تو خوب جانتا ہے کہ یہ میری خواہش نہیں ہے، خدایا تو خوب جانتا ہے کہ یہ میری خواہش نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا:— "فقہا رسولوں کے امین ہیں مگر اُس وقت تک، کہ وہ سلاطین کی آستاں بوسی نہ کریں"۔

حضرت خواجہ حسن بصری پر خشیت الٰہی کا اس قدر غلبہ تھا کہ ہر آن لرزتے رہتے تھے، یونس بن عبید کا بیان ہے کہ جب حسن آتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی عزیز قریب کو دفن کئے ہوئے آرہے ہیں، جب بیٹھتے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے قیدی ہیں جس کی گردن مارنے کا حکم دیا جا چکا ہے، اور جب دوزخ کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوزخ صرف انھی کے لیے بنائی گئی ہے ——— حضرت حسن بصری فرماتے تھے، دنیا درحقیقت تمہاری سواری ہے اگر تم اُس پر سوار ہو گئے تو وہ تم کو (اپنی پیٹھ پر) اُٹھائے گی اور اگر تم پر وہ سوار ہو گئی تو تم کو ہلاک کر ڈالے گی ——— میں نے کسی ایک شخص کو نہیں دیکھا جس نے دُنیا چاہی ہو اور اُسے آخرت ملی ہو اس کے برخلاف جو آخرت چاہتا ہے اُسے دُنیا بھی مل جاتی ہے ——— اسلام یہ ہے کہ تم اپنے قلب کو خدا کے سپرد کر دو اور ہر مسلمان تمہارے ہاتھوں سے محفوظ رہے ——— ایک شخص کی عداوت کے بدلہ میں ہزار آدمیوں کی دوستی بھی نہ خریدو ——— خدا کی قسم کھا کر کہتے تھے کہ جس شخص نے مال و زر کو عزت دی خدا نے اُس کو ذلیل کیا۔

حضرت ربیع بن خثیم آخر عمر میں فالج کے سبب معذور ہو گئے تھے لیکن اس وقت بھی نماز با جماعت قضا نہ ہوتی تھی دوسروں کے سہارے گھسٹتے ہوئے مسجد پہونچتے تھے، ابوحیان اپنے والد کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ ربیع فالج سے بالکل معذور ہو گئے تھے لیکن نماز کے لیے پیروں سے گھسٹتے ہوئے یا دوسروں کا سہارا لیکر مسجد میں آتے تھے، لوگ کہتے ابو یزید! اس مجبوری کی حالت میں تو آپ کو گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے جواب دیتے "حی علی الصلوٰہ" اور "حی علی الفلاح" سننے کے بعد جہاں تک ہو سکے اُس کا جواب دینا چاہیے، خواہ گھٹنوں کے بل چلنا پڑے۔

حضرت رجاء بن حیوٰۃ امراء اور سلاطین سے ہمیشہ بے نیاز رہے اور کسی کے آستانہ پر حاضری نہیں دی، ایک مرتبہ اُن سے کسی نے پوچھا کہ آپ حاکم وقت کے پاس کیوں نہیں جاتے، جواب دیا مجھ کو اُس رب العالمین کی ذات کافی ہے جس کے لیے میں نے اُن کو چھوڑا ہے۔

حضرت سالم ابن عبد اللہ غیر خدا کے سامنے کسی حاجت کو پیش کرنا پسند نہ کرتے اسی لیے امراءؑ کی دولت اور اُن کی داد و دہش سے اتنے بے نیاز تھے کہ اُن کی درخواست پر بھی کبھی اپنی خواہش کا

اظہار نہ کرتے تھے، ہشام بن عبد الملک آپ کو بہت مانتا تھا اور اتنا احترام کرتا تھا کہ آپ نہایت معمولی موٹے جھوٹے لباس میں بے محابا اُس کے دربار میں چلے آتے تھے اور وہ اُسی لباس میں تختِ شاہی پر ساتھ بٹھاتا تھا، ایک مرتبہ وہ حج کے لیے آیا، خانہ کعبہ میں دونوں کی ملاقات ہوئی، ہشام نے درخواست کی کہ آپ کی جو ضروریات ہوں انھیں بیان کیجئے، آپ نے فرمایا کہ خدا کے گھر میں کسی غیر سے نہ مانگوں گا۔

حضرت سعید بن جُبیر فرماتے تھے کہ جو شخص خدا کی اطاعت کرتا ہے وہ ذاکر ہے اور جو نافرمانی کرتا ہے وہ ذاکر نہیں ہے خواہ وہ کتنی ہی تسبیح اور تلاوتِ قرآن کیوں نہ کرے، آپ سے کسی نے سوال کیا کہ سب سے بڑا عبادت گزار کون ہے، فرمایا جو شخص گناہوں میں مبتلا ہو کر پھر اُس سے تائب ہوگیا اور جب اُس نے اپنے گناہوں کو یاد کیا تو اس کے مقابلہ میں اپنے اعمال کو بے حقیقت سمجھا ——— حضرت سعید اُمتِ مسلمہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ عُلمائے سُوء کو سمجھتے تھے، ہلال بن خباب نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا، لوگوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی؟ فرمایا ان عُلماء کے ہاتھوں!

حضرت سعید بن مسیب فرماتے تھے کہ شیطان جب کسی شے میں انسان سے مایوس ہو جاتا ہے تو اُس کو عورتوں کے ذریعہ سے پورا کرتا ہے ——— آپ کے غلام برد نے ایک مرتبہ آپ سے بعض آدمیوں کی کثرتِ عبادت کا تذکرہ کیا، کہ وہ لوگ ظہر سے عصر تک برابر عبادت کرتے رہتے ہیں، آپ نے فرمایا برد! خدا کی قسم یہ عبادت نہیں ہے، تم جانتے بھی ہو عبادت کسے کہتے ہیں؟ عبادت کہتے ہیں امورِ الٰہی میں غور و فکر کرنے اور اُس کے محارم سے بچنے کو ——— خلفاء اور سلاطین کے مقابلہ میں سعید بن مسیب کی بے نیازی، بے اعتنائی کی حد تک پہونچی ہوئی تھی، اُنھوں نے متعدد اموی خلفاء کا زمانہ پایا لیکن ان میں سے کسی کے سامنے سر خم نہیں کیا، سر خم کرنا تو بڑی بات ہے انھوں نے ان کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا ——— خلیفہ عبد الملک نے بارہا اُن سے ملنے کی درخواست کی مگر حضرت سعید نے ملنے سے انکار کر دیا۔

حضرت سلمہ ابن دینار امراء و سلاطین سے ہمیشہ بے نیاز رہے، کبھی اُن کی آستاں بوسی کا ننگ گوارا نہ کیا، سلیمان بن عبد الملک نے ایک مرتبہ اُن کو امام زہری کی وساطت سے بُلا بھیجا، اُنھوں نے زہری سے کہا اگر خلیفہ کو مجھ سے کوئی ضرورت ہے تو اُس کو خود میرے پاس آنا چاہیے، رہا میں تو میری اُس سے کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے۔

حضرت سلیمان بن طرخان تیمی صدقہ بکثرت کرتے تھے، جریر کا بیان ہے کہ سلیمان ہر وقت صدقہ کیا کرتے تھے، جب صدقہ کے لیے کوئی چیز نہ ملتی تو اُس کے بدلہ میں دو رکعت نماز ہی پڑھ لیتے ——— ——— لیکن اس زاہدانہ زندگی کے باوجود اُنہیں اپنے اعمال پر اعتماد نہ تھا کہ خدا کے یہاں نہ جانے کیا معاملہ پیش آنے والا ہے، فضیل بن عیاض کا بیان ہے کہ سلیمان سے کسی نے کہا کہ آپ، آپ ہیں، آپ کی مثل کون ہے، فرمایا ایسا نہ کہو، مجھے نہیں معلوم کہ میرا رب میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ وبدا لہم من اللہ ما لم یکونوا یحتسبون ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایسی بات ظاہر ہوگی جس کا وہ لوگ گمان بھی نہ کرتے تھے! ——— ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں مواخذہ کا خوف

کرتے تھے، سعید بن عامر کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ سلیمانؔ بیمار ہوئے، بیماری کی حالت میں رونے لگے، کسی نے پوچھا رونے کا سبب کیا ہے، فرمایا ایک مرتبہ میں ایک قدری کے پاس سے گزرا تھا تو اُسے سلام کیا تھا، مجھے خوف ہے کہ اُس کا مواخذہ نہ کیا جائے۔

حضرت سلیمانؔ بن یسار بڑے عفیف اور پاک دامن تھے، اگرچہ تابعین کی مقدس جماعت کے لیے عفت و پاک دامنی کوئی بڑا وصف نہیں ہے لیکن ترغیبات اور آزمائش و امتحان کے موقعہ پر پُورا اُترنا ہر شخص کے لیے کمال ہے، سلیمانؔ نہایت حسین وجمیل شخص تھے، ایک مرتبہ ایک عورت نے آپ کے گھر کے اندر آکر دام ڈالنا چاہا، آپ گھر سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

حضرت قاضی شریحؔ بن حارث نے ایک مقدمہ میں حضرت عمرؔ فاروق کے خلاف فیصلہ دیا ——— ایک مرتبہ خود شریحؔ کے ایک لڑکے نے ایک ملزم کی ضمانت کی، ملزم بھاگ گیا شریحؔ نے اس کے بدلہ میں لڑکے کو قید کر دیا ——— ایک بار اُن کے ایک ہم خاندان نے ایک شخص پر ظلم کیا، شریحؔ نے اس کو ایک ستون سے بندھوا دیا، جب وہ فیصلہ کرکے اُٹھے تو اُس شخص نے کچھ کہنا چاہا، شریحؔ نے کہا مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ میں نے تم کو قید نہیں کیا ہے، بلکہ حق نے قید کیا ہے۔

قاضی شریحؔ کے ایک لڑکے اور چند دوسرے اشخاص کے درمیان کسی حق کے بارے میں جھگڑا تھا، لڑکے نے ان سے واقعات بتا کر پوچھا کہ اگر میرا حق نکلتا ہو اور مقدمہ میں کامیابی کی اُمید ہو تو میں دعویٰ کردوں ورنہ خاموش رہوں، شریحؔ نے مقدمہ کی نوعیت پر غور کرکے دعویٰ کرنے کا مشورہ دیا لیکن جب مقدمہ شریحؔ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے اپنے بیٹے کے خلاف فیصلہ دیا، فیصلہ دے کر جب واپس ہوئے تو لڑکے نے کہا کہ اگر میں نے پہلے سے آپ سے مشورہ نہ کرلیا ہوتا تو مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن مشورہ دینے کے بعد آپ نے مجھے ذلیل کیا، شریحؔ نے جواب دیا جانِ پدر! تو مجھے اُن لوگوں کے جیسے روئے زمین بھر کے آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے لیکن خدا مجھے تجھ سے بھی زیادہ عزیز ہے، جب تو نے مجھ سے مشورہ کیا تو مقدمہ دیکھنے کے بعد مجھے ان لوگوں کا حق نظر آیا اگر میں اسوقت تجھ پر اس کا اظہار کر دیتا تو تو اُن سے صلح کرلیتا اور اس طرح ان لوگوں کا حق ضائع ہو جاتا۔

حضرت صفوانؔ بن سلیم زہری خدا کی راہ میں اس قدر انفاق کرتے کہ بدن کے کپڑے تک اُتار کر دے دیتے تھے، ایک شب کو مسجد سے نکلے، سردی سخت تھی، مسجد کے باہر ایک آدمی ننگے بدن نظر آیا، صفوانؔ نے اسیوقت اپنے جسم کے کپڑے اُتار کر دے دیئے۔

حضرت صفوانؔ استغناء اور بے نیازی کے اس درجہ پر تھے کہ سلاطین اور فرماں روا اُن کی خدمت کرنا چاہتے تھے مگر وہ قبول نہ کرتے تھے، ایک مرتبہ سلیمانؔ بن عبد الملک مدینہ آیا اور عمر بن عبد العزیز کے ہمراہ مسجد نبوی دیکھنے کے لیے گیا، ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد مقصورہ کا دروازہ کھولا تو اس میں صفوانؔ نظر آئے، سلیمانؔ اُنھیں پہچانتا نہ تھا، عمر بن عبد العزیز سے پوچھا یہ کون بزرگ ہیں، ان کے بشرہ سے بہتر میں نے آثار نہیں دیکھے، عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ امیر المومنین! یہ صفوانؔ بن سلیم ہیں، ان کا نام سُن کر اُس نے غلام کو پانسو دینار کی ایک تھیلی اُن کی خدمت میں پیش کرنے کا حکم دیا، غلام نے لیجا کر پیش کی اور کہا کہ یہ امیر المومنین کی جانب

سے نذر ہے وہ یہاں موجود ہیں، صفوآن نے کہا تم کو دھوکا ہوا ہے کسی اور کے پاس بھیجی ہوگی، غلام نے کہا آپ صفوان نہیں ہیں؟ فرمایا ہوں تو میں ہی، غلام نے کہا تو آپ ہی کو یہ تھیلی بھیجی ہے، فرمایا جاؤ دوبارہ پوچھ آؤ، جیسے ہی غلام پوچھنے کے لیے مڑا، صفوآن فوراً اپنا جوتا اُٹھا کر مسجد سے نکل گئے اور پھر جتنی دیر سلیمآن مسجد نبوی میں رہا صفوآن دکھائی نہ دیئے ——

حضرت عطآر بن ابی رباح کے بارے میں ابن حجر کی یہ رائے ہے کہ وہ فقہ، علم و ورع اور فضل کے لحاظ سے ساداتِ تابعین میں سے تھے، حجت، امام اور کبیر الشان تھے، امام اوزاعی کہتے تھے کہ عطاء نے جس وقت انتقال کیا، اُس وقت وہ لوگوں میں روئے زمین کے سب سے زیادہ پسندیدہ آدمی تھے —— لیکن اس کمال علم وفضل کے باوجود وہ اتنے محتاط تھے کہ مسائل میں اپنی رائے کبھی نہ دیتے تھے اگر اس کے متعلق کوئی سند نہ ہوتی تو صاف کہہ دیتے کہ مجھے نہیں معلوم! —— عبد العزیز بن رفیع کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ عطاء سے کوئی مسئلہ پوچھا گیا، انھوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم، لوگوں نے کہا اپنی رائے سے کیوں نہیں جواب دیتے، فرمایا مجھے خدا سے شرم معلوم ہوتی ہے کہ اس کی زمین میں میری رائے کی اطاعت کی جائے۔

حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو سارے بدن میں لرزہ طاری ہو جاتا، لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو یہ کیا ہو جاتا ہے! فرمایا تم لوگ کیا جانو کہ میں کس کے حضور میں کھڑا ہوتا ہوں اور کس سے سرگوشی کرتا ہوں —— محویت کا یہ عالم تھا کہ نماز کی حالت میں کچھ بھی ہو جائے آپ کو خبر نہ ہوتی تھی، ایک مرتبہ آپ سجدہ میں تھے کہ کہیں پاس ہی آگ لگی، لوگوں نے آپ کو بھی پکارا یا ابن رسول اللہ آگ لگی، یا ابن رسول اللہ آگ لگی، لیکن آپ نے سجدہ سے سر نہ اُٹھایا یہاں تک کہ آگ بجھ گئی، لوگوں نے پوچھا کہ آپ کو آگ کی جانب سے اسقدر بے پروا کس چیز نے کر دیا تھا، فرمایا دوسری آگ (آتشِ دوزخ) نے!

انفاق فی سبیل اللہ، فیاضی، دریا دلی، حضرت علی بن حسین کا خاص وصف تھا، آپ خدا کی راہ میں بے دریغ دولت لٹاتے تھے، فقراء اور اہلِ حاجت کی دستگیری کے لیے ہمیشہ آپ کا دستِ کرم دراز رہتا تھا، مدینہ کے معلوم نہیں کتنے غریب گھرانے آپ کی ذات سے پرورش پاتے تھے اور کسی کو خبر تک نہ ہونے پائی، آپ کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ مستقل سو گھرانوں کی خفیہ طور پر کفالت فرماتے تھے۔

لوگوں سے چھپانے کے لیے بنفس نفیس خود راتوں کو جا کر اُن کے گھروں پر صدقات پہونچا آتے تھے، مدینہ میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کی معاش کا کوئی ظاہری وسیلہ نہ معلوم ہوتا تھا، آپ کی وفات کے بعد معلوم ہوا کہ آپ رات کی تاریکی میں خود جا کر اُن کے گھروں پر دے آتے تھے —— غلہ کے بڑے بڑے بورے اپنی پیٹھ پر لاد کر غریبوں کے گھر پہونچاتے تھے، وفات کے بعد جب غسل دیا جانے لگا تو جسم مبارک پر نیل کے داغ نظر آئے، تحقیقات سے پتہ چلا کہ آٹے کی بوریوں کے بوجھ کے داغ ہیں، جنھیں آپ راتوں کو لاد کر، غربا کے گھر پہونچاتے تھے، آپ کی وفات کے بعد اہلِ مدینہ کہتے تھے کہ خفیہ خیرات زین العابدین کے دم سے تھی، سائلین کا بڑا احترام کرتے تھے، جب کوئی سائل آتا تو "میرے توشہ کو آخرت کی طرف لے جانے والے" کہہ کر اس کا استقبال کرتے، سائل کو خود اُٹھ کر دیتے تھے اور فرماتے تھے صدقات سائل کے ہاتھ میں جانے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتے

ہیں! ــــــ زندگی میں دو مرتبہ اپنا کل مال و متاع آدھا آدھا خدا کی راہ میں دیدیا ــــــ اکل حلال کا آپ کو اس درجہ اہتمام تھا کہ اگر آپ چاہتے تو اپنے بزرگوں کے نام پر بڑی دولت کما سکتے تھے لیکن آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یا نام سے ایک درہم کا بھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد، پہلا خطبہ جو ارشاد فرمایا اُس کا اقتباس یہ ہے:-

"تمھارے نبیؐ کے بعد دوسرا نبی اور اُس پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس کے بعد کوئی دوسری کتاب اور دوسرا نبی نہیں ہو، خدا نے جو چیز حلال کردی وہ قیامت تک کے لیے حلال ہو اور جو حرام کردی وہ قیامت تک کے لیے حرام رہے گی میں اپنی جانب سے کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ (احکام الٰہی) کو نافذ کرنے والا ہوں، میں خود کوئی بات شروع کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف پیرو ہوں، کسی کو یہ حق نہیں ہو کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت اور اتباع کی جائے میں تمھاری جماعت کا بہتر آدمی بھی نہیں ہوں بلکہ ایک معمولی فرد ہوں، البتہ خدا نے مجھ کو تم سے زیادہ گرانبار کردیا ہو۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اہل وعیال کے بارے میں مسلمہ نے آپ سے کہا:-

امیر المومنین! آپ نے ہمیشہ اولاد کا منہ اس مال و دولت سے خشک رکھا اور اُن کو ایسی حالت میں چھوڑے جاتے ہیں کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہو، کاش! آپ ان کے متعلق مجھے یا اپنے خاندان کے کسی اور شخص کو کچھ وصیت کرجاتے، یہ سُنکر فرمایا "مجھے ٹیک لگا کر بٹھادو"، پھر فرمایا تمھارا یہ کہنا کہ اس مال سے میں نے ہمیشہ اپنی اولاد کا مُنہ خشک رکھا تو خدا کی قسم میں نے اُن کا کوئی حق تلف نہیں کیا، البتہ جس میں اُن کا حق نہیں تھا وہ اُن کو نہیں دیا، تمھارا یہ کہنا کہ میں تم کو یا کسی اور اہل خاندان کو وصیت کرتا جاؤں تو اس معاملہ میں میرا وصی اور ولی خدا ہی جو صلحاً کا ولی ہوتا ہے، میرے لڑکے اگر خدا سے ڈریں گے تو خدا اُن کے لیے کوئی سبیل نکال دے گا اور اگر وہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو میں اُن کو گناہ کرنے کے لیے قوی نہ بناؤں گا ــــــ اس کے بعد لڑکوں کو بلاکر باچشم پُرنم فرمایا:-

"میری جان تم پر سے قربان جن کو میں نے خالی ہاتھ چھوڑا ہے لیکن خدا کا شکر ہو کہ میں نے تم کو اچھی حالت میں چھوڑا، میرے بچو! تم کسی ایسے عرب اور ذمّی سے نہ ملوگے جس پر تمھارا حق نہ ہو، بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمھارے باپ کے اختیار میں تھی ایک یہ کہ تم دولت مند ہو جاؤ اور تمھارا باپ دوزخ میں جائے، دوسرے یہ کہ تم محتاج رہو اور تمھارا باپ جنت میں داخل ہو، ان دونوں میں اس کو یہ زیادہ پسند تھا کہ تم محتاج رہو اور وہ جنت میں جائے، اچھا اب جاؤ، خدا تم کو حفظ و امان میں رکھے۔

آپ کا معمول تھا کہ عشاء کے بعد تنہائی میں مسجد میں بیٹھ کر رو رو کر دعائیں کرتے تھے اور اسی حالت میں آنکھ لگ جاتی تھی، آنکھ کھلتی تو پھر یہی شغل جاری ہو جاتا، اسی طرح روتے، دُعائیں کرتے اور جاگتے سوتے ساری رات گزر جاتی۔

یہ مشغلہ کبھی گھر میں تنہائی میں ہوتا تھا، ایک دن آپ کی بیوی نے دیکھ لیا اس کی وجہ پوچھی آپ نے ٹالنا چاہا کہ تم کو اس سے کیا غرض؟ بیوی نے اصرار کیا اور کہا کہ میں اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہتی ہوں،

اس وقت آپ نے بتایا کہ میں نے اپنے بارے میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں اس اُمت کے چھوٹے بڑے اور سپید وسیاہ تمام اُمور کا ذمّہ دار ہوں، اس لیے جب میں بکیس، غریب، محتاج، فقیر گم شدہ قیدی اور اس قبیل کے دوسرے آدمیوں کو یاد کرتا ہوں جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے جن کی ذمّہ داری مجھ پر ہے اور خدا اُن کے بارے میں مجھ سے سوال کرے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے متعلق مجھ پر دعویٰ کریں گے، اگر میں خدا کے سامنے ان کا کوئی عُذر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی دلیل پیش نہ کرسکا تو مجھے خوف پیدا ہوجاتا ہے اور میرے آنسو نکل آتے ہیں، میں ان چیزوں پر جس قدر غور کرتا ہوں، اُسی قدر میرا دل خوف زدہ ہوتا ہے۔

بادشاہوں کے درباروں اور محفلوں میں تو بادہ وشاہد اور رقص وغنا کا دور دورہ سدا رہا کیا ہو مگر حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مجلس میں رات کو عُلماء جمع ہوکر موت اور قیامت کا ذکر کرکے اس طرح روتے تھے جیسے اُن کے سامنے جنازہ رکھا ہے۔

بیت المال کی جانب سے فقراء اور مساکین کے لیے جو مہمان خانہ تھا اُس کے باورچی خانہ سے اپنے لیے پانی بھی گرم نہ کراتے تھے، ایک مرتبہ غفلت میں آپ کا ملازم ایک مہینہ تک اس مطبخ سے آپ کے وضو کا پانی گرم کرتا رہا آپ کو معلوم ہوا تو اتنی لکڑی خرید کر باورچی خانہ میں داخل کردی ـــــــ ایک مرتبہ غلام کو گوشت کا ٹکڑا بھوننے کا حکم دیا وہ اسی مطبخ سے بھون لایا آپ نے اُسے ہاتھ نہ لگایا اور غلام سے فرمایا تم ہی کھالو، میری قسمت کا نہ تھا۔

خلافت کے کاموں کے سلسلہ میں جو لوگ آتے تھے وہ اسی مہمان خانہ کے مہمان ہوتے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز اُن کے ساتھ کھانا نہ کھاتے تھے، ایک مرتبہ چند مہمانوں نے کھانا کھانے سے انکار کردیا کہ جب آپ نہیں کھاتے تو ہم کیوں کھائیں، اُس دن سے معاوضہ دے کر مہمانوں کے ساتھ کھانے لگے۔

ایک مرتبہ بہت سے سیب آئے آپ انھیں عام مسلمانوں میں تقسیم فرمارہے تھے، آپ کا ایک چھوٹا بچہ ایک سیب اُٹھاکر کھانے لگا آپ نے اس کے منہ سے چھین لیا وہ رونے لگا اور جاکر اپنی ماں سے شکایت کی ماں نے بازار سے سیب منگا دیئے۔ عمر بن عبدالعزیز گھر آئے تو اُنھیں سیب کی خوشبو معلوم ہوئی، پوچھا فاطمہ! کوئی سرکاری سیب تو تمھارے پاس نہیں آیا ہے، انھوں نے سارا واقعہ بیان کردیا آپ نے فرمایا:۔

"خدا کی قسم میں نے اُس کے منہ سے نہیں اپنے دل سے چھینا تھا لیکن مجھے پسند نہ تھا کہ میں مسلمانوں کے حصّہ کے ایک سیب کے بدلے میں اللہ تعالےٰ کے حضور اپنے نفس کو برباد کردوں ـــ

تختِ خلافت پر قدم رکھنے کے بعد آپ نے ہدایا و تحائف کا سلسلہ بھی بند کردیا تھا ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ کو سیب اور دوسرے میوے ہدیہ میں بھیجے، آپ نے واپس کردیئے بھیجنے والے نے آپ سے کہا کہ ہدیہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے تھے، آپ نے جواب دیا لیکن ہمارے اور ہمارے بعد والوں کے لیے وہ رشوت ہے۔

خلافت کے بعد آپ نے تمام شاہی امتیازات مٹا دیئے تھے، فرمایا "میں بھی عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں" سرکاری پہرہ داروں کو تعظیم کے لیے اُٹھنے کی ممانعت کردی اور خود اُن کے برابر بیٹھتے تھے ـــــــ جنازہ میں شرکت کے وقت خلفاء کے لیے علیحدہ چادر بچھائی جاتی تھی، حسب

معمول آپ کے لیے پہلی مرتبہ بچھائی گئی تو آپ نے اس کو پیروں سے ہٹا دیا۔

لونڈی غلاموں کے ساتھ برتاؤ اتنا مساویانہ تھا کہ کبھی کبھی آپ خود بھی ملازمین کی خدمت کرتے تھے، ایک مرتبہ پنکھا جھلتے جھلتے ایک لونڈی کی آنکھ لگ گئی آپ نے پنکھا لے کر اُسے جھلنا شروع کر دیا، اُس کی آنکھ کھلی تو گھبرا کر چلائی آپ نے فرمایا آخر تم بھی تو میری طرح انسان ہو، تم کو بھی گرمی لگتی ہو گی، جس طرح تم مجھے جھل رہی تھیں، میں نے تم کو جھلنا مناسب سمجھا۔

ملازموں کے آرام میں خلل انداز نہ ہوتے اور اُن کے آرام کے اوقات میں خود اپنے ہاتھ سے کام کاج کر لیتے، ایک مرتبہ رجاء بن حیوۃ سے گفتگو میں رات زیادہ گزر گئی اور چراغ جھلملانے لگا پاس ہی ملازم سویا ہوا تھا، رجاء نے کہا اسے جگا دوں، فرمایا سونے دو، رجاء نے خود چراغ درست کرنے کا ارادہ کیا آپ نے روک دیا کہ مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے اور خود اُٹھ کر زیتون کا تیل لیا اور چراغ ٹھیک کر کے پلٹ کر فرمایا "جب میں اُٹھا تھا تب بھی عمر بن عبد العزیز تھا اور اب بھی عمر بن عبد العزیز ہوں"۔

حضرت علقمہ بن قیس شہرت سے بہت گھبراتے تھے اس سے بچنے کے لیے وہ تعلیم و تعلّم کے سلسلہ میں کسی مقام پر بیٹھنا پسند نہ کرتے تھے، عبد الرحمٰن بن یزید کا بیان ہے کہ ہم لوگوں نے علقمہ سے درخواست کی کہ آپ مسجد میں نماز پڑھتے اور بعد نماز وہاں بیٹھتے تاکہ ہم لوگ آپ سے مسائل پوچھا کرتے، فرمایا میں یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اشارہ کریں کہ یہ علقمہ ہیں؟ اُمراء اور ارباب دول سے یہ صرف بے نیاز تھے اور اُن سے دامن بچاتے تھے بلکہ اُن سے میل جول اور آمد و رفت رکھنا اخلاقی نقصان تصور کرتے تھے، ایک مرتبہ لوگوں نے آپ سے اصرار کیا کہ آپ امراء کے یہاں جایا کیجئے وہ آپ کی حقیقت سے آگاہ ہوں اور آپ کا مرتبہ پہچانیں فرمایا میں ان سے جتنی باتیں دور کروں گا اور جتنی باتیں کم کروں گا، اُس سے زیادہ چیزیں وہ مجھ میں سے گھٹا دیں گے، یعنی میں اُن کی جتنی برائیاں دور کرونگا اتنی ہی وہ میری بھلائیاں دور کر دیں گے۔

حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکرؓ ایسے حق پرست تھے کہ اپنے باپ کی غلطی کو بھی غلطی سمجھتے تھے اور اُن کی آمرزش کے لیے وہ خدا سے دُعائے مغفرت کرتے تھے، اہل تاریخ اس بات کو جانتے ہیں کہ اُن کے باپ محمد بن ابی بکرؓ حضرت عثمانؓ کے شدید ترین مخالفین میں تھے اور باغیوں کے ساتھ کاشانۂ خلافت میں گھس آئے تھے قاسم ان کی اس غلطی کو مانتے تھے اور اُن کے لیے سجدہ میں بارگاہِ الٰہی میں دُعا کرتے تھے کہ خدایا عثمانؓ کے معاملہ میں میرے والد کے گناہ کو بخش دے۔

حضرت محمد بن سیرین عقائد میں سلف صالحین کے سادہ اور بے آمیز عقاید کے پابند تھے اس میں عقلی موشگافیوں اور جدتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے **قدر** کا مسئلہ اُن کے زمانہ میں چھڑ چکا تھا، ابن سیرین کو اس سے سخت نفرت تھی اُس کو وہ سُننا بھی گوارا نہ کرتے تھے، ابن عون کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا اور ان سے "قدر" کی کچھ باتیں کہیں انھوں نے اس کے جواب میں یہ آیت تلاوت کی

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاءِ ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء		اللہ تعالیٰ احسان اور قرابت مندوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور ناشایستہ باتوں اور زیادتی

والمنکر والبغی یعظکم لعلکم تذکرون — کرنے سے منع کرتا ہے، تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے تاکہ اُس کو یاد رکھو۔

یہ آیت سُنا کر انھوں نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں اور باتیں کرنے والے شخص سے کہا کہ تم میرے پاس سے چلے جاؤ یا میں خود اُٹھا جاتا ہوں، یہ نفرت دیکھ کر وہ شخص چلا گیا اس کے جانے کے بعد ابن سیرین نے کہا، میرا دل میرے اختیار میں نہیں ہے، مجھے ڈر تھا کہ وہ میرے دل میں ایسا خیال نہ پھونک دے جس کے دور کرنے کی مجھ میں قدرت نہ ہو، اس لیے میرے لیے یہی مناسب تھا کہ میں اُس کی باتیں ہی نہ سنوں۔

حضرت محمد ابن سیرین تجارت کرتے تھے، جو سودا بیچتے تھے اُسے گاہک کو اچھی طرح دکھا کر خریداری پر لوگوں کو گواہ بنالیتے تھے ———— تجارت کے سلسلہ میں اکثر اُن کے پاس کھوٹے سکے آجاتے، یہ اپنی احتیاط کی بنا پر سب کو بیکار کر دیتے، ابن عون کا بیان ہے کہ جب ابن سیرین کے پاس کوئی کھوٹا سکہ آجاتا تو وہ اُس سے کوئی چیز نہ خریدتے خیانت سے بقدر بچتے تھے کہ قید کے زمانہ میں اتفاق سے جیل کا محافظ اُن کا مرتبہ شناس تھا اس نے اُن سے کہا کہ آپ رات کو گھر چلے جایا کیجئے اور صبح ہوتے ہوتے پھر چلے آیا کیجئے فرمایا میں سلطانی خیانت میں تمھاری مدد نہیں کرسکتا ———— ماں کے بڑے مطیع اور خدمت گزار تھے، عید کے دن خود کپڑے اپنے ہاتھوں سے ماں کے لیے رنگتے، اپنی والدہ کے سامنے اس قدر دھیمی آواز سے بولتے کہ ناواقف آدمی یہ سمجھتا کہ ابن سیرین بیمار ہیں ———— اپنی ذات کے لیے کسی قسم کا امتیاز پسند نہ فرماتے تھے، چنانچہ کسی کو اپنے ساتھ نہ چلنے دیتے تھے اگر کوئی شخص ساتھ چلنا چاہتا تو فرماتے اگر تم بلا ضرورت چل رہے ہو تو لوٹ جاؤ، فرماتے اگر گناہوں میں بُو ہوتی تو کوئی شخص بُو کی شدت سے میرے قریب نہیں آسکتا تھا۔

حضرت محمد بن مُنکدر کا دل اتنا گداختہ اور اثر پذیر تھا کہ کلام اللہ کی موثر آیات پڑھ کر بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے تھے، ایک شب کو تہجد میں بہت روئے، صبح کو اُن کے بھائیوں نے سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس آیت پر گریہ طاری ہوا تھا

بدا لھم من اللہ مالم یکونوا یحتسبون — ان لوگوں کے لیے خدا کی جانب سے ایسی چیز ظاہر ہوگی جس کا وہ وہم و گمان بھی نہ کرتے تھے۔

امام مالک کا بیان ہے کہ جب میں اپنے قلب میں قساوت محسوس کرتا تھا تو جا کر ابن مُنکدر کو دیکھ آتا تھا اس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ چند دن تک نفس میری نگاہ میں مبغوض ہوجاتا تھا۔

حضرت مسلم بن یسار نے فرمایا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بندہ کا ایمان کس کام آسکتا ہے اگر وہ خدا کی ناپسندیدہ چیز کو نہیں چھوڑتا ———— اُن کی نماز بڑے کیف و استغراق کی ہوتی تھی جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کو زوال آرہا ہے، ابن عون کا بیان ہے کہ جب وہ نماز میں ہوتے تھے تو بے جان لکڑی معلوم ہوتے تھے ———— دعوت الی الصلوٰۃ کا اتنا خیال تھا کہ اگر دوسرے کانوں میں اذان کی آواز آجاتی تو اُسی مسجد میں جا کر نماز پڑھتے، ایک مرتبہ کسی مسجد سے واپس جا رہے تھے کہ کچھ دور جا کر مسجد کے مؤذن کی آواز سنی، اذان سن کر پھر مسجد لوٹ گئے، مؤذن نے پوچھا آپ واپس کیوں ہوئے، فرمایا تم نے لوٹا دیا ———— مسجد کی خدمت اُن کا خاص مشغلہ تھا، مسجدوں میں چراغ جلایا کرتے اس مشغلہ کی وجہ سے مسلم المصبح یعنی "چراغ جلانے

والے مسلم" اُن کا لقب ہو گیا تھا ——— ریا اور دکھاوے کو جہالت اور شیطان کا آلہ سمجھتے تھے فرماتے تھے تم لوگ نمایش سے بچو کیونکہ وہ عالم کی جہالت کی ساعت ہے! اسی کے ذریعہ شیطان لغزش پیدا کرتا ہے۔

حضرت مطرف ابن عبداللہ اگرچہ بہت بڑے زاہد و متورع تھے لیکن اندھے اعتماد اور توکل کے قائل نہ تھے بلکہ دنیا کو عالم اسباب مانتے تھے چنانچہ فرماتے تھے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ایک شخص بلند مقام سے اپنے کو نیچے گرا دے اور کہے خدا نے میری قسمت مقدر کردی ہے بلکہ انسان کو چاہیئے کہ بچتا رہے اور کوشش کرے، اگر اس احتیاط اور کوشش کے باوجود اُسے نقصان پہونچ جائے تو پھر اسے تقدیر الٰہی سمجھنا چاہیئے تقدیر خداوندی کے علاوہ کوئی مُصیبت نہیں پہونچ سکتی" اس لیے وہ طاعون کے زمانہ میں وبا زدہ علاقہ سے ہٹ جاتے تھے۔

حضرت یزید ابن حبیبؒ علم کا اتنا وقار قائم رکھتے تھے کہ اس سلسلہ میں کسی امیر کے آستانہ پر جانا گوارا نہیں تھا بلکہ انھیں خود اپنے یہاں بلاتے تھے، ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیز نے آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ آپ میرے پاس آیئے میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم خود میرے پاس آؤ، میرے پاس تمھارا آنا تمھارے لیے زینت اور میرا تمھارے پاس جانا تمھارے لیے عیب ہے ——— اُمراء کو مطلق خاطر میں نہ لاتے بلکہ اُن کے منہ پر اُن کی برائیاں بیان کرتے تھے، ایک مرتبہ آپ بیمار پڑے حوثرہ ابن سہیل امیر مصر آپ کی عیادت کے لیے حاضر ہوا اور مسئلہ دریافت کیا کہ جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہو اُس میں نماز پڑھنے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے! یہ سوال سن کر آپ نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس سے گفتگو بند کردی یہ دیکھ کر حوثرہ اُٹھ گیا آپ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا کہ روزانہ خلق اللہ کا خون کرتے ہو اور مجھ سے مچھر کے خون کے متعلق پوچھتے ہو،

حضرت ابو قلابہ جرمی (تابعی) علمی اعتبار سے بصرہ کے ممتاز تابعین میں تھے حافظ ابن حجر اور حافظ ذہبی دونوں ان کو علمائے اعلام میں لکھتے ہیں، ابن حماد حنبلی اُن کو امام اور علم وعمل میں راس العلما لکھتے ہیں۔

حضرت ابو قلابہ عقاید واعمال میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، عقاید کے باب میں اتنے سخت تھے کہ مبتدعین (اہل بدعت) کے مقابلہ میں تلوار تک اٹھانا جائز سمجھتے تھے، فرماتے تھے جس شخص نے کوئی نئی بات پیدا کی اُس نے تلوار کو جائز کردیا، ایسے لوگوں سے ملنا جلنا اور مباحثہ کرنا بھی پسند نہ تھا، چنانچہ لوگوں کو منع کرتے تھے کہ ہوا پرستوں (اہل بدعت) کے پاس نہ بیٹھو اور نہ اُن سے مجادلہ کرو، مجھے ڈر ہے کہ وہ تم اپنی گمراہی میں مبتلا اور جس شے کو تم اچھی طرح جانتے ہو اُس میں مشکوک نہ کردیں۔

آج کل مذہب کے رنگ میں یہ نیا گمراہ کن مذہب پھیل رہا ہے کہ لوگ "حمایتِ قرآن" کے نام پر رسول اللہ کی احادیث کو دین میں حُجت ہی نہیں مانتے اور حدیث کے مقابلہ میں کتاب اللہ کا مطالبہ کرتے ہیں، ابو قلابہ[1] ایسے لوگوں کو گمراہ سمجھتے تھے، آپ نے فرمایا :-

"جب تم کسی سے کوئی سنت بیان کرو اور وہ اس کے جواب میں کہے کہ اس کو

[1] حضرت عمر ابن عبدالعزیز شامیوں سے فرماتے تھے کہ جب تک تم میں یہ (ابو قلابہ) موجود ہیں اُس وقت تک تم لوگ بھلائی میں رہوگے۔

چھوڑو اور کتاب اللہ کو پیش کرو تو اس کو گمراہ سمجھو!

ابو قلابہ خدا کے عطیہ پر قناعت کو حقیقی دولت مندی اور دوسروں کے علم سے استفادہ کرنے والے کو حقیقی عالم سمجھتے تھے، کسی نے آپ سے سوال کیا کہ سب سے زیادہ غنی کون ہے، فرمایا جو اس شے پر راضی ہو جو خدا نے اسے دی ہے پھر سائل نے پوچھا سب سے بڑا عالم کون ہو، جواب دیا جو دوسروں کے علم سے اپنے علم میں اضافہ کرتا ہو۔

صبر و شکر اور تسلیم و رضا میں آپ کا پایہ بہت بلند تھا بڑی سے بڑی مصیبت اور آزمائش کے موقعہ پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹتا، عبد المومن بن خالد کا بیان ہو کہ آخر عمر میں ابو قلابہ کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں سب اعضا بیکار ہو گئے تھے، ان مصائب کے باوجود اُن کی زبان پر حمد و شکر کے علاوہ دوسرا کلمہ نہ تھا۔

اور ہم کیا کریں؟

ہدایت و سعادت کے ان روشن چراغوں اور تابناک ستاروں کی چند جھلکیاں یہاں دکھائی گئی ہیں، ان میں وہ بھی ہیں کہ جن کی راتیں نمازوں میں اور دن رزم گاہوں میں بسر ہوئے ہیں اور حق کی حمایت کے لیے جنھوں نے جہاد بالسیف کیا ہے، ——— وہ بھی ہیں جن کے ہاتھوں میں منصب و اقتدار بھی تھا مگر انھوں نے حق سے تجاوز نہیں کیا اور جن کا شیوہ انصاف دوستی اور عدل گستری ہی رہا ——— وہ بھی ہیں جو لاکھوں کی تجارت کرتے تھے لیکن صادق القول، وعدہ کے پابند اور انتہائی دیانتدار اور کمال درجہ کے راست باز تھے، ——— وہ بھی ہیں جو بیش بہا لباس پہنتے تھے مگر اُن کو مغرور اور مختار نہیں پایا گیا ——— اور ایسے بھی ہیں جو اصحاب صُفہ کے طرز پر زندگی گزارتے تھے لیکن افلاس اور تنگ دستی اُن کو "خود فروش" نہ بنا سکی، وہ انتہائی باحمیت، غیرت مند اور بلند نظر تھے ——— وہ بھی ہیں جن کا آنا جانا خلفاء اور اُمراء کے یہاں رہتا تھا، مگر وہ بادشاہوں اور امیروں کی "ہاں میں ہاں" نہ ملاتے تھے بلکہ اُن کو نیکی اور تقویٰ کے لیے اُبھارتے تھے ——— وہ بھی ہیں جو بادشاہوں اور امیروں سے ملنا بھی پسند نہ کرتے تھے، امیروں نے اُن کی خدمت میں حاضری کی درخواست کی مگر انھوں نے ان درخواستوں کو ٹھکرا دیا، ارباب دول کے ہدایا اور تحائف بھی انھوں نے قبول نہیں کئے اور جب بھی موقعہ ملا خلفاء اور اُمراء کی غلطیوں پر اُن کو اس طرح ٹوکا جیسے وہ ایک راہگیر کو ٹوک رہے ہیں، دنیوی شان و شوکت ان بوریا نشینوں کو ذرا سی دیر کے لیے بھی مرعوب نہ کر سکی ——— ان میں علومِ قرآن کے جاننے والے، مفسر، محدث، فقیہ، ہی نہیں خطیب، مقرر، ادیب اور شاعر بھی تھے، اُن کے بیوی بچے تھے، بندوں سے بھی اُن کے تعلقات تھے، وہ روزی بھی کماتے تھے، مگر "تقویٰ" اور "خدا ترسی" کا وصف اُن سب میں مشترک تھا، آخرت کے محاسبہ کے تصور سے اُن کے جسم میں لرزہ پیدا ہو جاتا، خوفِ خدا اُن کو راتوں میں رُلاتا اور دوزخ کی آگ کے خیال سے وہ تڑپ تڑپ اُٹھتے۔

خدا کے بعد اُن کو سب سے زیادہ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے تھی، انھوں نے اپنی زندگیوں کو اخلاق رسول کے سانچے میں ڈھال لیا تھا، اُسوۂ حسنہ کے اتباع کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے، پرہیزگاری اور تزکیہ نفس کے بلند سے بلند مقام پر پہونچ کر بھی مجرموں کی طرح خدا سے ڈرتے رہتے ——— اُن کے اعمال میں ریا، اُن کی زندگیوں میں دکھاوا اور اُن کی باتوں میں تصنع نہ تھا، سو باتوں کی ایک بات یہ ہو کہ وہ اللہ سے راضی تھے اور اللہ اُن سے راضی تھا۔

ایک یہ پاک زندگیاں تھیں اور ایک ہم نابکاروں اور آخرت فراموشوں کی زندگیاں ہیں ؟ وہاں جو کچھ ہے اُس کا اُلٹ ہی ہماری زندگیوں میں ملے گا، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اِس دور کے ہم مسلمانوں نے صحابہ کرام اور تابعین کی زندگیوں سے اپنی زندگیاں مختلف بنانے کی جان بوجھ کر کوشش کی ہو! خدا کا خوف اور آخرت کا خیال ذہن و فکر سے نکل چکا ہے، ہر کوئی اپنی دنیا بنانے کی فکر میں مُبتلا ہو، یہ خیال ہی شاید نہیں آتا کہ ہمیں مرنا ہی اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر، اللہ کے سامنے جانا بھی ہو، جہاں دل کی ایک ایک دھڑکن اور آنکھ کی ایک ایک جھپک کا حساب لیا جائے گا۔

ہمارا فرض یہ تھا کہ اپنی کوششوں سے نظامِ حق کو دُنیا میں قائم کریں اور ساری دُنیا کی سیادت قیادت، اور حکومت کی زمام ہمارے ہاتھوں میں ہو، منکر کو ہم مٹائیں اور بھلائی کو ہم پھیلائیں ——— مگر "حق" خود ہمارے ہی ہاتھوں ذلیل اور رُسوا ہو رہا ہو، اور ہماری بے عملی نے اللہ کے احکام کو معطّل کر رکھا ہے، جو کوئی جماعت "نظامِ حق" قایم کرنے کے لیئے اُٹھتی بھی ہو تو اُس کو ہم ہی طرح طرح سے مطعون کرتے ہیں اور ہمارے عوام اور اُمراء سے لیکر علماء کرام تک اُس نیک جماعت کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے ——— اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی کی توفیق، اُبھرنے کا جذبہ، اصلاح کا عزم، اور حمایتِ حق کا ولولہ عطا فرمائے !

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق بعض شبہات

(محمد اسمٰعیل خاں رزی جے پوری)

اور

اُن کے جوابات

(مُدیر "فاران")

ماہنامہ "فاران" بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مدیر فاران ... ماہر القادری نے نقشِ اوّل کے عنوان سے سید ابوالاعلیٰ مودودی کی دینی حمایت میں ایک مقالہ لکھا ہو جو چند اعتبارات سے ... ماہر القادری ... کی ادارت کا ایک بہترین شاہکار کہا جا سکتا ہو۔ سب سے بڑی اہمیت اس مقالہ کی ہو کہ جمعیۃ العلماء ہند کے اس فتوے سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کے خلاف صادر کیا گیا ہے۔ حق یہ ہو کہ اگر ماہر القادری ... کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اسے اس فتوے سے ہذیان ہو جاتا۔ گر ماہر القادری کا یہ حال ہو لے اس فتوے سے صدمہ ہوا ہی کیونکہ جمعیۃ علماء ہند جیسی مقتدر علمی جماعت کے منہ پر یہ نہیں کُھلتا کہ وہ ایسے عالم دین کے خلاف فتوے صادر کرے جو مسلمانوں کے لیے مضر ہونے کے مقابلے میں مفید زیادہ ہو، چونکہ ماہر القادری صاحب جماعت اسلامیہ کے رُکن نہیں ہیں۔ لہٰذا موصوف کے اس مقالے کو ایسا کلمۂ حق سمجھنا چاہیئے جو محض حق کے لیے کہا گیا ہو، اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ جذبہ قابلِ احترام ہے!

یہ مقالہ اسلامی محبت اور دل سوزی اور علم و تحقیق کا ایک بہت اچھا نمونہ ہو اس مقالے میں طعن و تشنیع، ضد و کج بحثی کی بجائے حقیقت رسی اور عدالت پسندی کی جھلک نظر آتی ہو اور واقعہ کے اعتبار سے اس مقالے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس کی مخالفت کی جا سکے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت بلحاظ سیاست قابل بحث قرار دی جا سکتی ہو مگر دینی اور تبلیغی اعتبار سے سیّد ابوالاعلیٰ صاحب ہر قسم کی حمایت کے مستحق ہیں۔ پابندی دین کی تبلیغ میں سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے جو جد و جہد جاری ہو کوئی شبہ نہیں کہ اس نے بعض مخلص اور ذی رتبہ نیکوکار افراد پیدا کرنے میں بڑی مدد دی ہو اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آئندہ اس سے اور بلند و برتر توقعات وابستہ کر لینا چاہئیں،

دینی اعتبار کے علاوہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک حیثیت انشاپردازانہ بھی ہو، ایک بلند پایہ ادیب ہیں انکی چھوٹی چھوٹی کتابیں زبان اُردو کا قیمتی سرمایہ ہو اگرچہ سیّد ابوالاعلیٰ نثر میں کسی طرز خاص کے موجد نہیں ہیں اسلیے موصوف کو سرسید، غالب، حالی، شبلی، محمد حسین آزاد، شرر اور فلک پیما کی صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی تاہم ان کا انداز شبلی سے بہت اشبہ ہو۔ زورِ استدلال، فلسفیانہ مگر سلجھا ہوا اندازِ بیان، منطقی ترتیب اور مذاقِ تحقیق، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو سیّد ابوالاعلیٰ میں شبلی کی جھلک پیدا کرتی ہیں۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا سلسلہ تالیفات سب کا سب مذہبی ہے، مذہب کے ضمن میں کہیں کہیں معاشی اقتصادی سیاسی اور دوسرے قسم کے مسائل بھی آ گئے ہیں مگر موصوف کا اصلی مذاق دینیات ہی ہے۔ دینیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تصانیف نہایت سائنٹفک زمانہ اور اہل زمانہ کے میلانات، مزاج اور تقاضوں کے مطابق ہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سید ابوالاعلیٰ کی کوئی تصنیف کسی ایسے اچھوتے موضوع پر ہے جو سلف صالحین کے ہاں نہیں پایا جاتا بلکہ موصوف کے تمام عنوانات وہی ہیں جن کا سلسلہ قدیم سے آج تک برابر چلا آ رہا ہے مگر اس ذخیرۂ دینیات میں سے انتخاب کر کے کسی اہم موضوع کا انتخاب کرنا، اور اس پر ایک چھوٹا سا دلپذیر رسالہ لکھ دینا یہ بھی بڑی سوجھ بوجھ اور ضرورت شناسی کا کام ہے اور سیّد صاحب موصوف کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل ہے۔

وہ "جبر و قدر" ہو یا خلع یا اور کوئی مسئلہ یا معاملہ سلف صالحین کے ذخیرہ علمی میں سے چُنا ہوا ایک موتی ہے جس کو ایک جداگانہ مالا میں پرو دیا گیا ہے۔ اور یہ طریقہ تالیف سلف ہی سے رائج ہے، راہ نجات، مالابدمنہ، بہشتی زیور وغیرہ اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

سیاسیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کوئی خاص مرتبہ معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر سید صاحب موصوف اس میں مداخلت نہ فرماتے تو ان کا دینی وقار زیادہ محفوظ رہ سکتا تھا، اس موضوع کو اختیار کر کے موصوف نے خود ہی اپنا اندازہ غلط لگانے کا ثبوت دیا ہے، آپ کے اس فعل سے آپ ہی کے ایک مخترعہ اصول پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے ایک عجیب چیز کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ ہم آئندہ بیان کریں گے، جنگ پاکستان کے زمانہ میں سید صاحب کی سیاست کا یہ حال تھا کہ وہ مسلمانوں کے سواد اعظم کے خلاف تھے جس کا نام مسلم لیگ ہے۔ وہ انگریزوں اور ہندوؤں کیساتھ مل کر مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی پوٹاٹیک کوشش کر رہے تھے۔ یا مسلم لیگ کی مخالفت میں ان کا مذہب سیاسی وہی تھا جو انگریز، ہندو، اور ان کے طرفداروں کا تھا، اور لطف یہ کہ جب مسلمانوں نے پاکستان کی جنگ مسلم لیگ کی قیادت میں جیت لی اور پاکستان قایم ہو گیا تو آج بھی سید ابوالاعلیٰ مودودی مسلمانوں کے سواد اعظم مسلم لیگ کے خلاف سرخپوشوں، عوامیوں اور آزاد پارٹی والوں کے حلیف ہیں اس موقف پر بھی سید ابوالاعلیٰ نے دین کو خالص سیاست کیلئے آڑ بنا کر غلطی کی ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے نکلے ہوئے ذخیرہ اور بیان کے مطالعہ سے سید صاحب ممدوح کی نسبت دو شبہے پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) پہلا شبہ یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی علمائے مجتہدین سلف کی تخفیفِ عظمت کر کے مسلمانوں کو ان کی طرف سے بدگمان کرتے ہیں۔

(۲) دوسرا شبہ سید ابوالاعلیٰ کے متعلق یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگی عاملوں کے ہاتھ سے اختیار حکومت یا اقتدار کی کنجیاں چھیننا چاہتے ہیں۔

سید صاحب ہی کی ایک تصنیف سے ہم وہ حوالہ جات پیش کرتے ہیں جن سے یہ شبہات پیدا ہوتے اور تقویت پاتے ہیں۔

"تجدید و احیائے دین" سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک چھوٹی سی تالیف ہے جس کی چوتھی اشاعت ہمارے سامنے ہے، اور چوتھی اشاعت تک نوبت پہونچنے سے اس کی ہردل عزیزی بھی ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع تجدید ہے جس کا مطلب ہے کہ اسلام میں تجدید دین کا ایک سلسلہ جاری ہے نبی کے بعد دین کو چلانے والے قائم رکھنے والے مجدد ہوتے ہیں، مجددین کے

فرائض اور اعمال کی تفصیل اس کتاب میں مندرج ہے اور یہی کتاب مجددین کی ایک مختصر سی فہرست بھی ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے وہ منصوبہ یا تجویز جو سید ابوالاعلیٰ کے ذہن اور ارادے میں جذب ہے اور تجدید دین جس کا ایک بہانہ ہے فوراً صاف شفاف طور پر قارئین کے ادراک میں منتقل و مرتسم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ "تجدید و احیائے دین" کے صفحہ ۲۹ پر کار تجدید کے عنوان میں کچھ شعبے تجویز کئے گئے ہیں ان میں سے بعض شعبے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

۳؎ "خود اپنے حدود کا تعین۔ (مجدد کے خود کے کا تعین۔ رزی) یعنی اپنے آپ کو تول کر صحیح اندازہ لگانا کہ میں کتنی قوت عمل رکھتا ہوں، اور کس راستے سے اصلاح کرنے پر قادر ہوں"

۴؎ "ذہنی انقلاب کی کوشش — یعنی لوگوں کے خیالات کو بدلنا، عقائد و افکار اور اخلاقی نقطۂ نظر کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ فی الجملہ اسلامی ذہنیت کو از سر نو تازہ کرنا"

۵؎ "عملی اصلاح کی کوشش — یعنی جاہلی رسوم کو مٹانا اخلاق کا تزکیہ کرنا، اتباع شریعت کے جوش سے لوگوں کو سرشار کر دینا اور ایسے افراد تیار کرنا جو اسلامی طرز کے لیڈر بن سکیں"

۶؎ "احیائے نظام اسلامی —— جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا، اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کرنا جسے صاحب شریعت علیہ السلام نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نام سے موسوم کیا ہے" تجدید و احیائے دین۔ صفحہ ۳۰ و ۲۹

اسی کتاب کے صفحہ ۳۱ پر "مجدد کامل کا مقام" کے عنوان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں :- "تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجدد کامل پیدا نہیں ہوا"

اگر اسی سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا وہ فیصلہ سامنے رکھ لیا جائے۔ جو موصوف نے ابن تیمیہ کی خامیوں اور عیوب شماری کے باب میں صادر فرمایا ہے تو نہ صرف یہ کہ بے محل نہ ہوگا بلکہ اس نقطۂ نظر کے سمجھنے اور غرض و غایت تک پہونچنے میں بڑی مدد ملے گی جس کو ذہن نشین کرانے کیلئے موصوف بہت ہی مضطر نظر آتے ہیں۔

" ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ (ابن تیمیہ۔ رزی) کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور "اقتدار کی کنجیاں" جاہلیت کے قبضے سے نکل کر اسلام کے ہاتھوں میں آجاتیں" صفحہ ۴۸

ابن تیمیہ کو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اَجَلِّ مجددین میں شمار کیا ہے، اپنے اس مجدد کے متعلق جو سید صاحب کی رائے ہے وہ حوالۂ قلم کی گئی،

ان اقتباسات کا مطالعہ نہایت اور فراست کے ساتھ کرنا چاہیئے اور دیکھنا چاہیئے کہ مصنف اپنی اس تصنیف زیر تنقید و استشہاد میں کیا منشا اور کیا غرض و غایت ظاہر کرنا چاہتا ہے۔

نمبر ۳ میں اپنی سوچی سمجھی تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے ایک موثر اور قابل قبول اصول اختراع کیا گیا ہے جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ نے اپنے مقام پر یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حدود کو سمجھتے ہیں، اور اپنی قوت کا اندازہ بھی لگا چکے ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ پاکستان کے موجودہ مسلم لیگی کارکنوں کے ہاتھ سے زمام حکومت یا اقتدار کی کنجیاں حاصل کرنے کو اُٹھے ہیں۔ اور موصوف نے اپنی ذات میں اس کی سکت بھی پالی ہے اور اپنا راستہ بھی مقرر کر لیا ہے کہ دین کو واسطہ بنا کر وہ اپنا مقصد حاصل کریں گے۔

نمبر ۴ میں سید صاحب نے اپنے کلیہ کی تفصیل پیش کر دی ہے اور ذہنی انقلاب برپا کرنے کا اہتمام جس لائحہ عمل کے تحت میں کیا ہے بتا دیا ہے کہ وہ اسلام کا نام ہوگا۔

نمبر ۵ ایک ایسی دفعہ ہے جس سے نمبر چار کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔

نمبر ۶ میں نمبر ۳ کے مقابلے میں زیادہ واضح اور زیادہ صاف طور پر اپنا مطمح نظر اپنی غرض و غایت اور اپنی سیاسی تحریک کی اساس دین کے بجائے دنیا کو قرار دیا ہے اور بالکل غیر مبہم الفاظ میں یہ بتا دیا ہے کہ جماعت اسلامیہ ایک سیاسی تحریک ہے، دین کا نام اس کو مقبول عام بنانے کا ذریعہ ہے ورنہ اس سیاسی تحریک کی اصل غرض اقتدار کی کنجیاں حاصل کرنا ہے۔

اس شبہ کو تقویت ایک اور لفظ سے ملتی ہے اور وہ لفظ "سیاسی تحریک" ہے ابن تیمیہ کے سلسلے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی استعمال کر چکے ہیں اس لفظ سے دین کے مقابلے میں دنیا کا خاص تعلق ہے،

ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم ان بحثوں کی طرف متوجہ نہیں ہوں گے جو مسئلہ زیر بحث میں ضمناً پیدا ہوں گی، مثلاً اسلام میں سیاست اور دین کے ایک ہونے کی بحث کیونکہ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ اسلام میں سیاست اور دین دو جداگانہ چیزیں ہیں، چونکہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سیاسی تحریک کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ لفظ یقیناً دینی تحریک کا مترادف نہیں ہے اس لیے ہم نے اس لفظ سے وہی فائدہ اٹھایا ہے جس کی مولف کی طرف سے اجازت ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جو شخص بھی "تجدید و احیائے دین" میں مجدد کے فرائض پڑھے گا اور اس نکتہ چینی پر غور کریگا جو سید ابوالاعلیٰ نے ابن تیمیہ پر کی ہے وہ بلا اختلاف یہی سمجھے گا کہ سید ابوالاعلیٰ کی وہ تحریک جو جماعت اسلامیہ کی صورت میں بڑے زور شور سے جاری ہے اس کی غرض واحد یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ مسلم لیگی اراکین کے ہاتھوں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لی جائیں،

اس تحریک کا نام جماعت اسلامی رکھنا حصول دنیا کے لیے دین کو آڑ بنانا ہے، ابن تیمیہ میں یہ عیب نکالنا کہ وہ اقتدار کی کنجیاں جہالت کے ہاتھ سے نہ چھین سکے دراصل یہ جتانا ہے کہ جماعت اسلامی کا بانی وہ غلطی نہیں کریگا جو ابن تیمیہ نے کی۔ اور جماعت اسلامی کا لیڈر یقیناً جہالت کے ہاتھوں سے اقتدار کی کنجیاں چھین لے گا۔

کیا کوئی حقیقت، کوئی قرینہ تجدید و احیائے دین میں ایسا بھی موجود ہے جو اس شبہ کا ازالہ کر سکے۔ اگر کوئی ایسا نکتہ کتاب زیر بحث میں موجود ہے تو ہم اس پر غور کرنے کو بسر و چشم تیار ہیں۔

یہ شبہ کہ سید ابوالاعلیٰ کا دانت پاکستان کی مسلم لیگی حکومت پر ہے ان کے فیصلوں اور ان کے معتقدات سے پیش کیا جا چکا جس پر ان کے روزانہ کے اعمال شاہد ہیں لہٰذا اب ہمیں امر اول کی طرف متوجہ ہونا چاہیے یعنی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے کوشش کی ہے کہ سلف صالحین کی عظمت دینی کو عوام الناس کے عقائد سے زائل کیا جائے یا گھٹایا جائے یہ شبہ جن فیصلوں سے ہوتا ہے پیش کئے جاتے ہیں۔

ابن تیمیہ کے متعلق سید ابوالاعلیٰ کا فیصلہ پیش کیا جا چکا بقیہ مجددین کے متعلق موصوف کے فیصلے نقل کئے جاتے ہیں ان فیصلوں کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عیب جوئی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ادراک و نظر کس قدر کامیاب ہیں

بلکہ سید صاحب موصوف کے خیالات کا پورا جائزہ لینے سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات جب موصوف کو کسی مجدد میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تو وہ کس طرح یہ کمی پیدا کر لیتے ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کمالات و فضائل میں جب کوئی عیب نہ ملا تو ان کے عیوب کی فہرست بجز اس طرح تیار کی گئی،

شاہ ولی اللہ صاحب کے عیوب نقل کرنے سے پہلے اتنا بتا دینا اور ضروری ہے کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب نے معائب کی فہرست تیار کرنے سے پہلے شاہ صاحب کے بہت سے قابل قدر کارنامے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف کے بعض قیمتی حوالہ جات بھی پیش کئے ہیں مگر اس خوف سے کہیں عوام الناس شاہ صاحب کو ایسا ہی عظیم المرتبت عالم و مجتہد نہ سمجھ لیں جیسے وہ دراصل ہیں۔ اس لیے فرماتے ہیں۔

(۱) شاہ ولی اللہ صاحب کا پہلا عیب۔ ... ... اگرچہ اصطلاحات وہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوف کی زبان سے لی ہیں اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی وہیں سے آگئے ہیں" صفحہ ۶۸

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس اقتباس اور اس مقام کے مطالعہ سے جہاں سے یہ اقتباس کیا گیا ہے ایک اوسط درجے کا علم رکھنے والا انسان یہی سمجھے گا کہ اول تو فلسفہ اور تصوف کی اصطلاحات کا استعمال معیوب ہے جو شاہ ولی اللہ صاحب نے مباح سمجھا ہے دوسرے سب سے زیادہ قابل اعتراض یہ فیصلہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف میں ایسے مطالب اور مضامین بھی بیان ہو گئے ہیں جن کو وہ قصداً بیان نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ سید ابوالاعلیٰ کے ذہن میں اُن کا بیان کرنا کسی نہ کسی اعتبار سے ناجائز ہے۔ اور باوجودیکہ یہ مطالب ان کے قلم سے برابر نکلتے رہے مگر انکو اس کا ادراک و شعور ذرا نہ ہو سکا۔

اگر سید ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ رائے صحیح ہے تو شاہ صاحب کے کس بیان کو صحیح مانا جاسکے گا اور کس کو غلط؟ کیسا عجیب و غریب عیب سید ابوالاعلیٰ نے تلاش کیا ہے۔ اس عیب کے پیش نظر شاہ صاحب کی تصانیف کا تمام سلسلہ ملیا میٹ ہو کر رہ جاتا ہے کیا یہ فیصلہ شاہ کی عظمت علمی کے تخفیف کے خیال سے نہیں کیا گیا؟

(۲) شاہ ولی اللہ صاحب کا دوسرا عیب صفحہ ۵۲ کا فٹ نوٹ ہے۔

"... ... ... شاہ صاحب کی تمام زندگی اس امر کی شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوت عامہ کی طرف توجہ کرنے کا ان کو موقع نہیں ملا"

اس فٹ نوٹ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دراصل عوام کے اذہان پر یہ نقش منقش کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحب موصوف بذات خود تنقید و تعمیر افکار کے فرائض کے ساتھ ساتھ دعوت عامہ کے کام سے بھی غافل نہیں ہیں۔ فن عیب جوئی کا یہ ایک نفسیاتی اصول ہے کہ جب کسی کا عیب کامیاب طریقے سے بیان کرنا مقصود ہو تو پہلے اس کے ہنر کا اعتراف کرنا ضروری ہے سید صاحب نے تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار میں انہماک جتا کر دوسرے فرائض سے شاہ صاحب کی غفلت فوراً جتادی اور اتباع سنت کی تکمیل سے جو تنقیح و تنقید کے ساتھ دعوت عامہ کے عمل سے وابستہ ہے شاہ ولی اللہ صاحب کو محروم قرار دیدیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس سے معذور رہے مگر عیب جوئی کرنے والا خود اس سنت کے اتباع میں کمال رکھتا ہے، کیا حقیقت بھی اس عیب شماری کے ساتھ ہے؟

(۳) شاہ ولی اللہ صاحب کا تیسرا عیب ـــ "زندگی کے بگڑے ہوئے مگر پختہ بنے ہوئے سانچے عالم ذہنی

ہیں توڑتے ہیں اور اس کے ملبے میں سے اصلی اور پائدار حقیقتوں کو نکال کر دنیا کے سامنے رکھ جاتے ہیں۔ یہ کام بجائے خود اتنا بڑا ہوتا ہے کہ اس کی مشغولیتوں سے آدمی کو اتنی فرصت مشکل ہی سے مل سکتی ہے کہ وہ خود میدان میں آکر تعمیر کا عملی کام بھی کر سکے۔" صفحہ ۵۵ و ۵۶

شاہ ولی اللہ صاحب پر بے علمی کا الزام لگا کر ان کی ہر دل عزیزی کو کس قدر مجروح کیا ہے۔ گویا سید ابوالاعلیٰ مودودی وہ بزرگ ہیں جو شاہ ولی اللہ صاحب کی طرح بے عمل نہیں ہیں۔

ملا شاہ ولی اللہ صاحب کا چوتھا عیب۔ "خود ان کے اپنے گھروں کے قریبی حلقے میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ ان کی اصلاح پر توجہ کرنے سے معذور تھے۔ مثلاً السلام علیکم کا رواج بھی ان کے گھر میں نہ تھا، "رفیع الدین آداب بجا لاتا ہے" "عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے" صفحہ ۵۶

جبراً عیب نکالنے کی کیسی عجیب و غریب مثال سید ابوالاعلیٰ مودودی نے پیش کی ہے کیا واقع میں سید ابوالاعلیٰ کا یہ فتویٰ صحیح ہے کہ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر السلام علیکم سے بھی واقف نہ تھے ؟ اور ایسا باپ جس کے بچے السلام علیکم کہنے سے واقف بھی نہ ہوں عالم دین ہونے کا مدعی ہو سکتا ہے ؟ اور ایسے بچے جو السلام علیکم سے بھی واقف نہ ہوں کیا روزے نماز سے دور کا واسطہ بھی رکھ سکتے ہیں ؟ تخفیف عظمت کی اس سے زیادہ متعصبانہ مثال شاید کوئی مل سکے،

ﷺ شاہ ولی اللہ صاحب کا پانچواں عیب۔ "شاہ صاحب کی پوتی شاہ عبدالعزیز صاحب کی جوان صاحبزادی بیوہ بیٹھی ہوئی تھیں اور نکاح ثانی میں انھیں تامل تھا کہ ہندوانہ جاہلیت سے اسے معیوب سمجھتی تھی" صفحہ ۵۶

ہندوانہ جاہلیت، بت پرستانہ جاہلیت یعنی مشرکانہ جاہلیت۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کی پوتی شاہ عبدالعزیز صاحب کی بیٹی میں یہ مشرکانہ جاہلیت کہاں سے آئی ؟ یا تو یہ مشرکانہ جاہلیت اس خاتون نے اپنے باپ اور دادا سے اخذ کی یا ہندو پڑوسیوں اور شہریوں سے حاصل کی جس کا اکتساب بغیر بیباکانہ اختلاط کے ناممکن ہے ہم حیران ہیں کہ سید صاحب نے ان دونوں مذموم اور قبیح اسباب میں سے کس کو صحیح سمجھا ہے ؟ کیا اس سے شاہ صاحب اور ان کے صاحبزادے کے وقار علمی کا جنازہ نہیں نکل جاتا ہے ؟

کوئی شبہ نہیں کہ شاہ صاحب میں یہ عیب ثابت کرنے سے سید ابوالاعلیٰ مودودی کا مقصد بھی یہی تھا جو حاصل ہو گیا کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب کے بیان میں یہ الزام جو شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب پر عائد کیا گیا ہے غیر شعوری طور سے نہیں آ گیا ہے، چونکہ فلسفہ اور تصوف کی اصطلاحات سے بچ کر سید صاحب نے یہ حقیقت بیان کی ہے لہذا از خود غیر شعوری طور پر کسی مطلب کے بیان ہو جانے کا سدِ باب ہو گیا یہ جو کچھ کہا گیا ہے نہایت سوچ سمجھ کر شعور کے ساتھ کہا گیا ہے اور دونوں باپ بیٹوں کی تخفیف عظمت کی نیت سے کہا گیا ہے۔

۶ شاہ ولی اللہ صاحب کا چھٹا عیب۔ "بی بی کی صحنک اور اسی قسم کی نیازوں کا سلسلہ خود ان کے (شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان۔ رزمی) خاندان میں جاری تھا" صفحہ ۵۶

ﷺ شاہ ولی اللہ صاحب کا ساتواں عیب۔ تفہیمات الٰہیہ میں ایک جگہ اشادہ کرتے ہیں "اگر موقع یا محل کا اقتضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً اصلاح کی قابلیت بھی رکھتا تھا" مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس طرز کا کوئی کام نہیں کیا۔

"تجدید و احیائے دین" صفحہ ۵۶

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اعتراض اور عیب جوئی کو ہلکا کرنے یا اہمیت نہ دینے کی نیت سے نہیں بلکہ تفہیمات الٰہیہ کی منقولہ عبارت کے مفہوم کے اعتبار سے یہ عرض کرنا پڑتا ہے کہ چونکہ شاہ صاحب نے ایسا کوئی کام سر انجام نہیں دیا اس لیے تفہیمات میں اس کی معذرت میں یہ کہنا پڑا جو سید ابوالاعلیٰ مودودی نے نقل کیا۔

مگر سید ابوالاعلیٰ مودودی اس بُری طرح پیچھے پڑے ہیں اور شاہ صاحب کی عظمت علمی کو خاک میں ملانے کے اس انداز سے درپے ہیں کہ شاہ صاحب کی اس صاف گوئی کے باوجود سید صاحب ہیں کہ مصر ہیں کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ایسا کوئی کام ہرگز ہرگز نہیں کیا جس کے نہ کرنے کا خود شاہ صاحب اعتراف کر چکے ہیں معلوم نہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا اس سے کیا مقصد ہے؟

ہمارے خیال میں سید ابوالاعلیٰ مودودی نے شاہ صاحب کے اعتراف و اعتذار سے یہ غلط نتیجہ نکالا اگر شاہ صاحب یہ کہہ دیتے کہ میں نے اصلاح کا کام جنگ کر کے انجام دیا ہے اور ان کے اس کارنامے پر ان کا کوئی فعل شاہد نہ ہوتا تو سید ابوالاعلیٰ کا اعتراض صحیح ہوتا۔ مگر زیر بحث مقام پر تو سید ابوالاعلیٰ صاحب نے یہ سمجھا ہے شاہ صاحب نے اپنے اعتراف سے یہ ثابت کیا ہے کہ شاہ صاحب نے جنگ کر کے کوئی اصلاح کا کام نہیں کیا مگر انھیں جنگ کر کے اصلاحی کام کرنا چاہیے تھا جو وہ نہ کر سکے۔ یہ منطق سید ابوالاعلیٰ صاحب کی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

اگر سید ابوالاعلیٰ صاحب کا یہ منشا ہے کہ شاہ صاحب میں جنگ کر کے اصلاح کرنے کی شروع ہی سے قابلیت نہ تھی تو ہم اس بیان کو چنداں اہمیت دینے کے قابل ہی نہیں سمجھتے کیونکہ اس منشا کے ادا کرنے میں سید صاحب بُری طرح ناکامیاب رہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہم صرف وہ حقائق پیش کریں گے جن سے مرقومہ شبہات ثابت ہو سکیں، سلف صالحین کی طرف سے سید ابوالاعلیٰ کو جواب دینا ہمارے اس مقالہ کے موضوع سے خارج ہے اگر ضرورت داعی ہوئی تو ہم اپنے آپ کو اس قابل پاتے ہیں کہ سید ابوالاعلیٰ کے ہر اعتراض کا جواب پیش کریں۔ ہم اپنا یہ حق محفوظ رکھتے ہیں۔

امام حجۃ الاسلام امام غزالی بھی بدقسمتی سے ان لوگوں میں آ گئے ہیں جو سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک مجدد نہیں لہٰذا امام صاحب کو اس یادداشت میں یہ سننا پڑا کہ

"امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے، اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کیے جا سکتے ہیں ایک قسم ان نقائص کی جو علم حدیث میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں پیدا ہوئے دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے، تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے، صفحہ ۴۵

ہم دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا اس رائے سے امام حجۃ الاسلام کی نسبت خوش اعتقادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے.؟ اور کیا اس رائے کا پڑھنے والا امام غزالی کو دین کا عالی مرتبت عالم سمجھے گا، خصوصیت سے اس رائے کی موجودگی میں کہ وہ علم حدیث میں کمزور تھے۔ ہمارے خیال میں اس رائے سے امام غزالی کی عظمت علمی کی تنقیص قطعی طور پر مقصود ہے۔

دور حاضرہ کا سب سے عجیب واقعہ یہ ہونا چاہیئے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک ایسے شخص کی تنقیص مرتبت کی جس کا وہ باعتبار اپنے کردار کے قطعاً سزاوار نہیں ہے۔ شیخ احمد سرہندی الملقب بہ مجدد الف ثانی ایک ایسے بزرگ ہیں جو کتاب و سنت کی پابندی کرتے اور کراتے ہیں غیر مشتبہ عظمت کے مالک ہیں، مگر سید ابوالاعلیٰ صاحب کی عیب جوئی اور اعتراض نگاری کا کمال یہ ہے کہ ان بزرگ کو بھی نہ بخشا کیونکہ ان کے نام کے ساتھ تو پہلے ہی سے مجدد کا تمغہ لگا ہوا تھا، اور قابل افسوس یہ امر ہے کہ سید صاحب کا اعتراض چونکہ بالکل خلاف واقعہ اور غلط اور ایسا ہے جس کی تکذیب تاریخ کر رہی ہے اس لیے فرض محال کے طریقہ پر بھی صحیح نہیں ہے۔ باوجودیکہ سید ابوالاعلیٰ صاحب نے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمۃ کو تصوف کا مصلح اعظم مانا ہے تاہم ان پر اعتراض کے لیے تصوف ہی کو تجویز کیا ہے۔ اور ان کے ساتھ شاہ ولی اللہ اور ان کے خلفا کو بھی لپیٹ لیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ پہلی چیز جو مجھکو مجدد الف ثانی کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفا کے وقت تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا۔" صفحہ ۷۳

اسی طرح "تجدید و احیائے دین" میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید پر اعتراضات کئے گئے ہیں جن سے ان بزرگوں کے مرتبہ کی تخفیف و تنقیص غیر مشتبہ طور پر ہوتی ہے جس کے جی میں آئے کتاب بازار میں ملتی ہے خرید لے اور پڑھ لے۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ماہر القادری کا نقش اول ایک بصیرت افروز مقالہ ہے جس سے محبت دینی کی خوشبو آتی ہے ہم نے اس مقالے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ للّٰہیت کے ساتھ حضرت سید ابوالاعلیٰ مودودی کے وہ اقوال اور فیصلے نقل کر دیئے ہیں جن کا فیصلہ ماہر القادری کے مقالے سے مقصود نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم سید ابوالاعلیٰ کو ایک اعلیٰ درجہ کا بلند پایہ انشاپرداز اور نہایت شہرت رکھنے والا عالم سمجھتے ہیں اور انکی عزت کرتے ہیں۔

البتہ ہم سید ابوالاعلیٰ صاحب کے دینی کام کے متعلق ایک خیال رکھتے ہیں جس کا ظاہر کرنا ضروری ہے۔ ہمارے خیال میں سید ابوالاعلیٰ صاحب کا طریقہ اشاعت دین اور حکومت و اقتدار حاصل کرنیکی جدوجہد اسوۂ رسول عالم خاتم النبیین کے بالکل خلاف ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام ایسی حالت میں پھیلایا جب آپ بالکل بیکس اور بے بس تھے۔ اور جب آپ اسلام پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو حکومت اس کامیابی کے ساتھ نتیجہ میں اپنے آپ چلی آئی۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بالکل اس کے خلاف عمل کر رہے ہیں وہ پہلے پاکستان کی وزارت عظمیٰ پر قابض ہونا چاہتے ہیں اور اس قبضے کے بعد جبر و قہر سے مسلمانوں کی اصلاح کے خواہشمند ہیں۔

اگر سید ابوالاعلیٰ صاحب اسوۂ حسنہ رسول عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی کریں اور پہلے جدوجہد کر کے مسلمانوں کو صالح بنائیں تو نتیجہ میں پاکستان کی حکومت ان کے قبضے میں آجانے کا امکان ہے۔

جب ہر حلقہ انتخاب سے موجودہ قانون کے ماتحت صالحین کی جماعت مرکزی اسمبلی میں پہونچے گی تو یقیناً اسمبلی کا طریقہ بھی بدل جائے گا اور ایک مرتبہ زمانہ میں پھر حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کا نمونہ قایم ہو جائے گا۔ ایسی حالت میں بہت قرین عقل وہ واقعہ ہے کہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہی خلیفہ منتخب ہو جائیں،

اسوۂ رسول کے خلاف عمل کرنے میں ہمیں کوئی حجت قابل قبول نظر نہیں آرہی ہے۔

من نگویم کہ ایں مکن آں کن

مصلحت بین و کار آساں کن

معروضات

جناب رزمی جے پوری سے ہمارا تعارف اور شناسائی آج کی نہیں دس بارہ سال پہلے کی ہے، اُن کے جذب و سوز، قومی دردمندی اور اسلامی احساسات کے ہم معترف ہیں، یہ مقالہ اُنھوں نے نیک نیتی کے ساتھ لکھا ہے اور انکی نیت ہمارے نزدیک مشتبہ نہیں ہے ——— مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں وہ شدید غلط فہمیوں کا شکار ہیں، اور بعض مقامات پر تو اُن کے سوچنے اور سوچنے کے بعد نتائج اخذ کرنے کا قریب قریب وہی انداز ہے جو جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے معاندین کا انداز ہوا کرتا ہے۔

یہ مضمون کئی ماہ پہلے آیا تھا، ہم اس کی اشاعت کے بارے میں بہت کچھ غور کرتے رہے، بہت سے وسوسے اور اندیشے ذہن میں آتے تھے کہ اسے چھاپیں کہ نہ چھاپیں ؟ فاضل مقالہ نگار سے جو ہمارے ذاتی تعلقات اور روابط ہیں اُن کے تقاضوں نے اور کشمکش میں ڈال دیا کہ اگر مُراسلہ چھاپ کر ہم رہ جائیں اور اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں تو کتمانِ حق کا الزام ہمارے سر آتا ہے اور اظہارِ حق کریں تو ایک دردمند دوست کی کبیدگی کا اندیشہ ہے ——— مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں نفس کی اس کمزوری اور مصلحت اندیشی کے مقابلہ میں اظہارِ حق کی توفیق دی اور ہم اپنے ضمیر کی آواز دبا نہ سکے !

یہ مقالہ اس لیے اور بھی شائع کیا جا رہا ہے کہ قریب قریب اسی انداز کے اعتراضات دوسروں کی زبانی سُننے میں آتے رہتے ہیں، اس لیے ہم اُن پر آج کُھل کر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ بات مُبہم نہ رہے حقائق پُوری طرح بے نقاب ہو کر منظرِ عام پر آجائیں اور پڑھنے والوں کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو!

ہمارے مضمون (نقشِ اوّل) کے بارے میں رزمی صاحب نے جو ستایش آمیز جملے لکھے ہیں اُن کے لئے ہم بہر حال شکرگزار ہیں ——— مگر ساتھ ہی یہ بھی عرض کردیں کہ علماء کے جن فتووں پر ہم نے اپنے اس مضمون میں تنقید کی تھی، اور جس تنقید کی اصابت اور سنجیدگی کا جناب رزمی نے اعتراف کیا ہے، اُسی قسم کی تنقید صاحب موصوف کے مقالہ پر بھی وارد ہوتی ہے کہ "بزرگانِ دین کی تخفیف و تنقیص کا الزام" اُن علماء نے مولانا مودودی پر لگایا تھا اور ٹھیک یہی فردِ جرم رزمی صاحب نے بھی مودودی صاحب پر لگادی، ہمارے جس مضمون کو رزمی صاحب نے "کلمۂ حق" سے تعبیر کیا ہے اُس میں بعض علماء کی اسی تہمت سازی اور الزام تراشی کی تو تردید کی گئی تھی، جس سے خود صاحبِ موصوف کا قلم آلودہ نظر آتا ہے۔

طرزِ نگارش مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں جو یہ لکھا گیا ہے کہ وہ ایک بلند پایہ ادیب تو ضرور ہیں مگر نثر میں کسی طرزِ خاص کے موجد نہیں ہیں ——— تو اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، یہ کوئی دینی بحث نہیں ہے بلکہ معنی و بیان اور تحریر و انشا کی گفتگو ہے ! مولانا مودودی کی تحریروں نے اُردو ادب کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے، اُردو ادب میں اُن کا طرزِ استدلال یقیناً سب سے جداگانہ اور اچھوتا ہے، جب کسی مسئلہ پر وہ گفتگو کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہ شاید یہ سوچتے ہیں کہ اس مسئلہ کے بارے میں عام اذہان میں کون کون سے شبہات وارد ہو سکتے ہیں، پھر وہ

ایک ایک شبہ کو لیکر اُس کو صاف کرتے چلے جاتے ہیں، عبارت نہایت دل نشین اور اثر انگیز ہوتی ہے، پھر لطف یہ ہے کہ اُردو زبان کی نزاکتیں اور خصوصیتیں قلم کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں، پڑھنے والا ذرا سا بھی بار یا انقباض محسوس نہیں کرتا، اس اعتبار سے وہ اُردو زبان میں یقیناً ایک طرزِ خاص کے مُوجد ہیں، جو اِن سے پہلے اور کسی کے یہاں نہیں ملتا، مودودی صاحب کی تحریر ایک امتیازی حیثیت اور نمایاں خصوصیت رکھتی ہے، اُنکی عبارت کا انداز اور انشا کا طرز خود گواہی دیتا ہے کہ مجھے کسی باکمال فن کار نے "ایجاد" کیا ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مودودی کے یہاں خیالات کا زیادہ سے زیادہ سلجھاؤ پایا جاتا ہے، ابہام اور اُلجھاؤ کی اُنکی تحریر پر کہیں پرچھائیں بھی نہیں پڑنے پاتی، جو کچھ کہتے ہیں دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں، جس طرح اقبال کا شعر سُنکر ایک صاحبِ ذوق کہہ سکتا ہے کہ یہ اقبال کا شعر اور اُن کا انداز ہے، اسی طرح مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی تحریر پڑھ کر وجدان بول اٹھتا ہے کہ یہ مودودی کا اندازِ نگارش ہے، اور اسی چیز کو زبان و ادب میں "طرزِ خاص" یا "ایجاد" کہا جاتا ہے، بعض لوگوں کی زبان سے یہ تو ضرور سُننے میں آیا ہے کہ مودودی صاحب کے یہاں کہیں کہیں تکرار و اعادہ ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ عقلی استدلال کا جہاں تک تعلق ہے، اُردو لٹریچر میں اُن کا کوئی حریف اور مدِ مقابل نہیں ہے۔

اس "عقلیت" "کلامی انداز" اور "فلسفیانہ طرزِ فکر" کے باوجود مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بعض دوسرے عقلئین کی طرح اُس آزادیٔ رائے سے دامن بچایا ہے جو "آزادیٔ رائے" دین میں شعائرِ دین کے انکار، تضحیک یا کم سے کم اُن سے بیزاری اور بےتعلقی کا دروازہ کھولتی ہے —— فرشتوں کو وہ نری "قوت" نہیں سمجھتے بلکہ اُنکی تجسیم کے قایل ہیں، عذابِ قبر، نفخ صور، حشر و نشر، شفاعتِ رسولؐ، دوزخ کے عذاب اور جنت کے عیش و مسرت کے وہ ٹھیک اُسی طرح قائل ہیں جس طرح قرآن اور احادیث میں انکو بیان کیا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "معراج" کے سلسلہ میں جو صحیح روایات ملتی ہیں اُن تمام تفصیلات پر وہ ایمان رکھتے ہیں، ان معتقدات پر ایک "منکرِ حدیث" انشا پرداز نے، مولانا مودودی کو "ماڈرن مُلّا" کہہ کر طنز کی —— مولانا مودودی سود، تصویر، عورتوں کی بےحجابی، گھوڑدوڑ کی شرط، لاٹری، انعامی معموں اور اس قبیل کی تمام "بازیوں" اور منفعت اندوزیوں کو ناجائز کہتے ہیں، وہ ڈاڑھی کو بھی رسول اللہ کی سُنت سمجھتے ہیں اور اُن کی نگاہ میں مسواک، ٹوتھ برش سے زیادہ عزیز ہے کہ اُس کو رسول اللہ کی ذاتِ گرامی سے خاص نسبت ہے! تعقل و تفکر کی تمام صلاحیتوں کے باوجود اُنھوں نے اپنی عقل و فکر کو کلامِ خدا اور حدیثِ رسول کا تابع بنا دیا ہے، اور وہ اپنی عقل و فکر سے قرآن و حدیث کے حدود ہی میں رہ کر کام لیتے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا اُن کے حال پر بہت بڑا فضل ہے! مولانا مودودی کی تحریروں نے ہزاروں نوجوانوں کو تشکیک و تذبذب اور الحاد و دہریت کے پھندوں سے نکالا ہے، اگر اُنکی تحریروں میں دینِ اسلام سے ذرا سی بھی بےرغبتی اور بےتعلقی پائی جاتی تو ہم اُنکی تحریروں اور نوشتوں کو خاک پر دے مارتے، یہ قدر و تحسین اسی لیے تو ہے کہ اس خدا کے نیک بندے نے اسلام کی ترجمانی، اور اعلانِ حق و صداقت کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا ہے ——

—— اس کے باوجود ہم مودودی کے نہیں محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متبع اور پیرو ہیں اور خدا کے بعد حضورؐ ہی کو اپنا مطاع سمجھتے ہیں، اور مولانا مودودی کی کتابوں کو اس لیے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی طرف لے جاتی ہیں، اور دینِ حق کے قیام کا ہمارے اندر حوصلہ پیدا کرتی ہیں۔

مولانا مودودی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں، اور بھول چوک سے اُنکی ذات ہرگز ہرگز محفوظ نہیں ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اُنکی کتابوں میں کوئی ایسی غلطی ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی جس پر کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کا مدار ہو

یا جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ دین کے لئے ایک فتنہ ہے! اجتہاد و قیاس اور رائے میں بڑے بڑوں سے غلطیاں ہوئی ہیں، اور اُن غلطیوں کے باوجود ہم اُن تمام مجتہدین اور راسخون فی العلم کی عزت کرتے ہیں بلکہ اُن سے عقیدت رکھتے ہیں۔

سیاست

مضمون نگار نے لکھا ہے ——— "سیاسیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کوئی خاص مرتبہ معلوم نہیں ہوتا، یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر سید صاحب موصوف اس میں مداخلت نہ فرماتے تو اُن کا دینی وقار زیادہ محفوظ رہ سکتا تھا، اس موضوع کو اختیار کرکے، موصوف نے خود ہی اپنا اندازہ غلط لگانے کا ثبوت دیا ہے۔"

ہم صاحبِ مضمون سے دریافت کرتے ہیں کہ سیاسیات کا شعبہ کیا صرف وکیلوں اور بیرسٹروں کے لیے مختص ہو کر رہ گیا ہے، ہم یہ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ پاکستان اور ہندوستان کی سیاسیات کی زمام کار اب تک زیادہ تر اسی طبقہ کے افراد کے ہاتھوں میں رہی ہے ——— کیا کسی ایسے شخص کو جو وکیل اور بیرسٹر نہ رہا ہو "سیاسیات" میں بولنے کا حق ہی نہیں ہے، یہ عجیب و غریب قسم کی مرعوبیت ہے!

ہمارے خیال میں جو مُسلمان دین میں جتنی زیادہ اچھی فہم رکھتا ہے، اُسیقدر وہ "سیاسیات" کو بہتر طور پر سمجھ سکتا ہے، مردِ مومن کی "فراست" کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحسین فرمائی ہے، اگر فراست سے "سیاست" کا کوئی تعلق ہے تو پھر ایک دینی مُسلمان اور صاحبِ فراست کو بہت اچھا سیاستداں اور قابلِ اعتماد مُدبّر ہونا ہی چاہیئے، حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ذات اور اُن کے دورِ خلافت کو ہم اس پر گواہ بناتے ہیں!

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کو جس طرح عملی طور پر سیاست برتنے کا موقع ملا ہے، مولانا مودودی کو ظاہر ہے کہ اس کا موقع نہیں ملا، اُنکی زندگی کا یہ ورق بالکل سادہ ہے، لہذا نہیں کہا جاسکتا کہ فعل و عمل کی دُنیا میں اُنکی سیاسی بصیرت، کس حد تک کارآمد اور مفید ثابت ہوگی مگر جہاں تک اُنکی تحریروں کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت گہری سیاسی بصیرت رکھتے ہیں، اُنکی سیاست قرآن و حدیث کی سیاست ہے جس میں کوئی چال اور پھند فریب نہیں ہے، پنجاب اور سرحد کے انتخابات میں اُنکی سیاست نے دُنیا پر ظاہر کر دیا کہ مسلمان کی سیاست ایسی ہوتی ہے! جماعتِ اسلامی کے مخالفین چاہے زبان سے نہ کہتے ہوں مگر اُن کے دل مانتے ہیں کہ پنجاب و سرحد کے الیکشنوں میں جن کو بظاہر فتح نصیب ہوئی، وہ اخلاقی محاذ پر بُری طرح سے جنگ ہار گئے، اور جن "صالح اُمیدواروں" کو شکست ہوئی، اُنھوں نے اخلاق کے مورچوں کو جیت لیا، جس شخص کی دینی سیاست نے اتنے پاکباز، با اصول، دیانتدار اور خدا ترس کارکنوں کو تیار کر دیا ہو، اُس کی سیاست پر حرف گیری وہی کر سکتا ہے جو مغرب کی سیاسیات سے مرعوب ہو، اور جس کی نگاہ میں ٹرومین، اٹیلی، اور اسٹالن سیاسیات کے سب سے بڑے امام ہوں! یا جس کے فکر و ذہن پر سر ظفر اللہ خاں کی دستوری سیاست اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی پالیٹکس کی ہیبت چھائی ہوئی ہو!

مولانا مودودی نے سیاست کو دین سے باہر کبھی نہیں سمجھا، اُنکی تحریریں گواہ ہیں، اُن کی تقریریں اس کی شاہد ہیں۔ ——— وہ مسلمانوں کے ذہن میں یہی بات تو اُتار دینا چاہتے ہیں کہ "اسلام" کو مسجدوں، حُجروں اور خانقاہوں تک محدود نہ سمجھو، وہ مکمل ترین نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے، سیاسیات، معاشیات، عمرانیات اور تمام دوسرے شعبوں کو اسلام محیط ہے ——— اس کے بعد مضمون نگار کے ان لفظوں کو ہم پھر دُہراتے ہیں:-

"سیاسیات میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کوئی خاص مرتبہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اگر

سیّد صاحب موصوف اُس میں مداخلت نہ فرماتے تو اُن کا دینی وقار زیادہ محفوظ رہتا ۔۔ "

ہمیں اس تلخ نوائی پر معاف فرمایا جائے، یہی تو وہ ذہنیت ہے جس نے کہا تھا کہ قیصر کا حصّہ قیصر کو دو اور کلیسا کا حصّہ کلیسا کو دو، مسلمانوں کے اربابِ اقتدار نے ہمیشہ یہی چاہا ہے کہ علماءِ اُمت لوگوں کو بس نکاح و طلاق کے مسائل بتاتے رہیں، اور سیاسیات سے کوئی سروکار نہ رکھیں، سیاسیات کے ماہرین ہم ہیں، حکمرانی کے گُر اور فرمانروائی کے طریقے ہم جانتے ہیں، یہ "قل آعوذی" قسم کے مولوی اور مُلّاتے "صلح و جنگ، نظم و نسق اور ڈسپلن کے اسرار کو کیا جانیں !

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند

ان کو سیاسیات میں دخل دینے کا حق ہی نہیں ہے، اس سرحد میں وہ قدم ہی نہیں رکھ سکتے، اور ان حدود سے جب تک وہ باہر رہیں گے تو اُن کو حکومت کی طرف سے خطابات بھی عطا ہوں گے، وظیفے بھی مقرر کئے جائیں گے اور اُنکی خاطر خواہ قدر افزائی بھی ہوگی ——— ابوالاعلیٰ مودودی اسی طلسم کو توڑنا چاہتے ہیں اُن کا کہنا یہ ہے کہ دین اور سیاست کی تفریق مٹ جانی چاہیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو تعلیم دی ہے اُس میں دین اور سیاست ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہیں، خلفائے راشدین بہ یک وقت زاہدِ مُرتاض عالم دین بھی تھے اور سیاستداں بھی تھے !

آہ ! یہ "سوادِ اعظم" ؟

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :—

" جنگِ پاکستان کے زمانے میں سیّد صاحب کی سیاست کا یہ حال تھا کہ وہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے خلاف جس کا نام مسلم لیگ ہے، وہ انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی صف میں انتشار پیدا کرنے کی پوٹا ٹیک کوشش کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ "

جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی سے فاضل مضمون نگار جو اس قدر برہم ہیں، اس کا راز اُن کے اِن جملوں نے کھول دیا، یہ خفگی، بیزاری، اور برہمی کتاب و سُنت اور حق و صداقت کے کسی مُسلّمہ اصول کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اُس کی بُنیاد مسلم لیگ کا اختلاف ہے۔

جناب رزمی صاحب جیسے ذہین اور ہوشمند انسان کی زبان سے مُسلم لیگ کو مسلمانوں کا "سوادِ اعظم" سُن کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی، اگر لفظ "سوادِ اعظم" کے مُنہ میں زبان ہوتی اور وہ بول سکتا تو مضمون نگار سے چیخ چیخ کر فریاد کرتا کہ خدا کے لیے مجھے رُسوائی سے بچاؤ !

"سوادِ اعظم" مسلمانوں کے درحقیقت اُس معاشرے کا نام ہے، جو کتاب و سُنت کی بنیاد پر قایم ہو اور جس کی اکثریت اسلامی اُصولوں کی قولاً اور عملاً پابند ہو، صحابہ کرام کا معاشرہ درحقیقت مسلمانوں کا "سوادِ اعظم"[1] تھا ——— اور خدا جانتا ہے کہ "مسلم لیگ" پر ایک ساعت بھی ایسی نہیں گزری، جسے ہم "سوادِ اعظم" کہہ سکیں، کوئی شک نہیں کہ "مسلم لیگ" کے بعض چوٹی کے کارکنوں میں اپنے مقصد سے اخلاص پایا جاتا تھا، اُن کے عزایم میں بڑی قوت اور مضبوطی تھی، مسلمانوں سے وہ ہمدردی بھی رکھتے تھے، مگر اُس صفتِ عالیہ کی کمی تھی جس کو قرآن بار بار "تقویٰ" کہہ کر پُکارتا ہے۔

ہندوستان میں جب مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کشمکش جاری تھی، اُس وقت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جو کچھ کہا تھا، اور جو پیغام وہ دے رہے تھے، آج بھی وہی پیغام اُنکی زبان سے سُننے میں آرہا ہے ——— اُن کے پیغام کا

---

[1] یا پھر وہ معاشرہ اور جماعت "سوادِ اعظم" کہے جانے کی مستحق ہوگی جو صحابہ کرام کی جماعت اور معاشرہ سے ملتی جُلتی ہو !

لبِ لباب اور خلاصہ یہ تھا کہ اللہ کے دین کو پورے کا پورا قایم کرو، مسلمانوں کی زمامِ قیادت کے سزاوار "صالحین" اور "اہلِ تقویٰ" ہی ہو سکتے ہیں، سیاسی ہوشمندی بہت بڑی چیز ہے مگر اُس کے ساتھ "صالحیت" کا ہونا اور زیادہ ضروری ہے، اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرت کتاب و سنت اور نیکی و تقویٰ کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے ——— اس طرح نہ سوچو کہ مسلمان کو روٹی کہاں اور کس طرح ملے گی، یہ دیکھو اور اس کے لیے کوشش کرو کہ روٹی کے ساتھ مسلمان کا دین کس طرح محفوظ رہ سکے گا۔

چنانچہ جو اندیشے مولانا مودودی نے ظاہر کئے تھے، اور جن باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی، وہ ایک ایک کر کے ہمارے سامنے آرہی ہیں، مسلم لیگ کوئی شک نہیں کہ مسلمانانِ ہند کی ہمدرد جماعت تھی مگر اُس کا مزاج چونکہ "دینی" نہیں تھا لہٰذا اقتدار ملنے کے بعد اُس کے اربابِ حل و عقد نے "پاکستان" کو دینی اور اسلامی بنانے کی عملاً کوشش نہیں کی، پاکستان کو بنے ہوئے ساڑھے چار سال ہو چکے اور "قراردادِ مقاصد" بھی منظور ہو چکی مگر نہ یہاں "معروف" قایم کئے گئے اور نہ "منکر" مٹائے گئے، انگریز نے جس حال میں ہماری سیاست، معاشرت، رسم و رواج اور "formalities" کو چھوڑا تھا، وہ کم نہیں ہوئیں بلکہ اُن میں اور اضافہ ہی ہو گیا ہے،

ہم نے مانا کہ ہیں آزاد حکومت کے حدود
نگہ و دل پہ تو غیروں کی حکومت ہے ابھی

عورتوں کی بے حجابی، فواحش کی کثرت، گھوڑ دوڑ اور کلبوں کی قماربازی، شراب نوشی، رقص و سرود کے جلسے، پاکستان میں اسی مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" (مسلم لیگ) کی حکومت کے سایہ میں پروان چڑھ رہی ہیں، اور تو اور انگریز کے بنائے ہوئے نظامِ تعلیم تک کو ہاتھ نہیں لگایا، کالج اور اسکول انگریزی حکومت کے کارخانے تھے، کپڑے اور شکر کے نہیں کلرک سازی کے! وہی کارخانے آج بھی جوں کے توں قایم ہیں بلکہ اُن میں "غلمانوں" کے ساتھ "حوروں" کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے ——— ——— اکبر نے جو کہا تھا کہ :-

پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

سو پاکستان میں وہ ہو کر رہا ——— کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا تخیل علامہ اقبال کا دیا ہوا ہے، اقبال نے مسلمان لڑکی کو یہ ہدایت کی تھی :-

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرؓ بگیری

مگر جس مسلمان لڑکی کو "بتولؓ" و "عائشہؓ" بننا چاہیے تھا اُسے "گرینا گاربو" بنایا جا رہا ہے، وہ وردی پہنکر، اور سینہ تان کر غیر مردوں کو سلامی دیتی ہے ——— اور مسلمانوں کے "سوادِ اعظم" (مسلم لیگ) کی اس ترقی پر خوشی کے مارے باچھیں کھل جاتی ہیں ——— مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تقسیمِ ہند سے پہلے اسی دن کے لیے روتے تھے اور ڈرتے تھے، کہ کہیں یہ دن مسلمانوں پر نہ آجائے، اور آکے رہا کیونکہ "مسلم لیگ" نے "اسلام" کے نعرہ پر مسلمانوں کو اکٹھا تو کر لیا مگر چونکہ اُس کا مزاج خالص اسلامی اور دینی نہ تھا اس لیے فعل و عمل اور تجربہ کی دنیا میں آکر اُس کی فطرت بے نقاب ہو گئی، اور جو کچھ ہو رہا ہے، ہم دیکھ رہے ہیں!

ہماری وزارتِ خارجہ پردہ "قانون داں" مسلط ہے جس کی قانون دانی "ریڈ کلف اوارڈ" میں شکست کھا چکی ہے، اور جب پاکستان اور ہندوستان کے حدودِ حکومت کا مسئلہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش تھا اور سر ظفر اللہ خاں پاکستان کی طرف سے وکالت کر رہے تھے تو جناب لیاقت علی خاں مرحوم سے اُن کے ایک رفیق کار نے پیش گوئی کر دی تھی کہ ضلع گورداس پور پاکستان میں نہیں رہ سکتا کہ اُس میں "قادیان" شامل ہے ——— چنانچہ یہ ہو کر رہا۔

اس بات کو سب جانتے ہیں کہ ہمارے وزیرِ خارجہ اپنے مذہبی معتقدات کی بنا پر انگریزی اقتدار سے مرعوب ہیں اور انگریزی حکومت کا وفادار رہنے کی تلقین اُن کے پیشوا مرزا غلام احمد نے کی تھی ——— اس ذہنیت کے شخص سے ہم آخر کیا توقع رکھیں جبکہ پاکستان کی نمایندگی اور وفاداری کے ساتھ انگریز کی وفاداری اور نیازمندی بھی اُس کے رُجحانات کی عناں گیر ہو۔

پاکستان میں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کمزوری اور بے عُنوانی کے سبب کسی ذمہ دار عہدیدار کو ہٹایا گیا ہے، تو اُسے سفارت کا منصب تفویض کیا گیا ہے، اس سیاسی ہوشمندی کے قربان جائیے گویا کہ غیر ممالک میں "سفارت" کا عہدہ کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا "افغانستان" میں اس "انتخاب" کا حشر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

سندھ، پنجاب اور سرحد کی مسلم لیگی وزارتوں کا جو کچھ حال رہ چکا ہے، وہ سب پر روشن ہے، رزمی صاحب کے "سوادِ اعظم" کا "شجرِ طیبہ" اسی قسم کے برگ و بار لاتا ہے، جاہ و اقتدار کے لیے کیا کیا رسّہ کشی ہوئی ہے اور ہوتی رہتی ہے، اقتدار کی چاٹ اور فرمانروائی کی خواہش نے کیا کیا رُوپ دھارے ہیں، حکومتِ پاکستان کے دارالخلافہ "کراچی" کی شہری مسلم لیگ کے کارنامے بھی سب پر روشن ہیں، ایسی غنڈہ گردی کی مثالیں بہت کم ملیں گی!

صوبہ سرحد کا معاملہ سب سے زیادہ ابتر ہے، ہمارے دوست رزمی صاحب اگر سرحد تشریف لے جائیں تو پشاور کا تانگہ والا تک خان عبد القیوم صاحب کے ذاتی اوصافِ عالیہ اُنکو بتا دیگا، یہ معاملہ صرف اسی نوبت پر ختم نہیں ہو جاتا، سرحد کی حکومت ہٹلر شاہی کے زور سے قایم ہے، اور جو حکومت خوف و دہشت کے بل پر قایم ہو اُس کا مستقبل خطرے سے خالی نہیں! انتخابات میں سرحد کی حکومت نے جو کچھ کیا ہے اُسے دیکھ کر لوگ سوچنے لگے ہیں کہ اگر "ایمانداری" اسی کو کہتے ہیں تو "بے ایمانی" آخر کس چیز کا نام ہے، مخالفین کو سرحد میں یا تو "دیس نکالا" ملتا ہے، یا اُن کا مقام جیل کی کوٹھریاں ہیں، اگر جور و استبداد کا یہی عالم رہا تو اندیشہ ہے کہ سرحد کے لوگوں میں خان عبد القیوم خاں کی وزارت سے بیزاری کہیں خود پاکستان کی بیزاری سے نہ بدل جائے اور اس کے آثار پیدا ہو چلے ہیں، یہ معاملہ زیادہ خطرناک اس لیے بھی ہے، کہ سرحد سے افغانستان بالکل ملا ہوا ہے، جہاں کی حکومت پاکستان سے خدا واسطہ کا بیر رکھتی ہے۔

پاکستان میں "صوبہ پرستی" کا رجحان روز بروز قوی تر ہوتا جا رہا ہے، انتہا یہ ہے کہ حکومت کے ادبی وعلمی رسالوں تک میں شاعروں اور لکھنے والوں کی تعداد میں صوبہ داری تناسب کا خیال رکھا جاتا ہے ——— اگر مسلم لیگ کی حکومت "اسلام" کو عملاً نافذ کرتی تو یہ تمام "پرستیاں" "تقسیمیں" اور "عصبیتیں" ختم ہو سکتی تھیں مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صوبہ پرستی کا جذبہ تیزی کے ساتھ اُبھرتا چلا جا رہا ہے، یہی لیل و نہار رہے تو اندیشہ

ہے کہ مرکز کی گرفت صوبوں پر کمزور ہو جائے گی اور یہ چیز خود پاکستان کی سالمیت کے لیے خطرے کا باعث ہو گی ——— خود مرکزی حکومت میں بھی پارٹیاں اور گروپ موجود ہیں۔

بنگال میں اُردو کے خلاف آواز اُٹھائی گئی تھی تو قائدِ اعظم مرحوم کی شخصیت نے اُسے اُبھرنے نہ دیا، مگر جناب خواجہ ناظم الدین نے "اُردو" کا لفظ زبان سے نکالا تو مشرقی پاکستان میں[1] اُن کے خلاف مظاہرے ہوئے، یہ چیز ہوا کے رُخ کو بتاتی ہے؟ پنجاب جو اُردو ادب کا گہوارہ رہا ہے، وہاں اب یہ صورتِ حال پیدا ہوتی جا رہی ہے کہ پنجاب کے بعض ادیب جن کی ساری عمر اُردو زبان کی خدمت میں بسر ہوئی ہے اور اُردو ہی جن کی عزت و شہرت کا سبب اور روزگار کا ذریعہ رہا ہے، پنجابی زبان میں رسالے نکال رہے ہیں، پنجابی زبان سے ہمیں کد نہیں ہے مگر سوال یہ ہے کہ انگریز کے زمانہ میں "پنجابی زبان و ادب" کی ترقی کا جذبہ کیوں دبا رہا اب اس کے اُبھرنے کے کیا داعیات ہیں۔

مسلم لیگی حکومت کے کچھ اور کارنامے بھی ہیں ——— جن کو سرکاری حلقوں میں اِس وقت شاید سنہری حروف میں لکھا جائے مگر آنے والے مؤرخ اپنے آنسوؤں سے لکھیں گے! عقل و فکر کے اس دیوالیہ پن کی بھی کوئی انتہا ہے کہ پاکستان کا دستور بن تو رہا ہے کتاب و سُنت کی بُنیاد پر، اور اُس کو لفظی قالب عطا کرنے کے لیے ایک ماہرِ دستور کو انگلستان سے بُلایا جا رہا ہے! ایک صاحب فرمانے لگے کہ اس میں حرج ہی کیا ہے آخر مسجدیں کافروں سے کیا نہیں بنوائی جاتیں، اس کا جواب دیا گیا کہ جی ہاں! مسجدیں تو کافروں سے ضرور بنوائی جا سکتی ہیں مگر کافروں سے جمعہ کا خطبہ تو نہیں لکھوایا جاتا ——— اور اب قائدِ اعظم کی لائف لکھنے کے لیے ایک انگریز مؤرخ کی خدمات مستعار لیکر پاکستان کی رُسوائی اور کمتری کے اسباب فراہم کئے گئے ہیں، آخر یہ کون لوگ ہیں جو انگریزوں کو نئے نئے عنوانوں سے ہم پر مسلط فرماتے رہتے ہیں اور یہ کس کا دماغ ہے جو پاکستان میں انگریزوں کو امپورٹ "IMPORT" کرتا رہتا ہے۔

چند مہینوں کی بات ہے کہ انگلستان سے کرکٹ کی ایک ٹیم نے پاکستان کا دورہ فرمایا تھا، کراچی میں جو میچ ہوا ہے اُسکو "نیم سرکاری" حیثیت دیدی گئی تھی، اور پاکستان کی ٹیم کے جیتنے پر جو فوٹو اخباروں میں ہماری نگاہ سے گزرا ہے اُس میں ہمارے وزیرِ اعظم بہادر کھلنڈروں کے جھرمٹ میں ہاتھ اُٹھا کر فتح کا اعلان فرما رہے تھے ——— جو قوم "کشمیر" میں اپنے حق کو نہ حاصل کر سکی ہو، کیا اُسے کرکٹ میچ کی فتح پر جشن منانے کا حق حاصل ہے، لہو و لعب کے ان اجتماعات، مقابلوں اور مظاہروں کے لیے کیا ابھی ہمیں فرصت میسّر ہے!

یہ ہے "مسلم لیگ" اور اس کے کرتا دھرتاؤں کی پالیسی، روش، سیاست، عزائم، کارنامے اور زندگیاں ——— ——— اس پر ہمیں مجبور کیا جاتا ہے کہ مُسلم لیگ کو مسلمانوں کا "سوادِ اعظم" سمجھو، اچھا "سوادِ اعظم" ہے!

؎ جنوں کا نام خرد پڑ گیا، خرد کا جنوں!

جن پر تنقید کی گئی ہے وہ کوئی غیر نہیں ہیں اپنے ہیں (سر ظفر اللہ خاں کو چھوڑتے ہوئے) اور اپنوں پر تنقید کرتے ہوئے دل دُکھتا ہے، جب بھی تنقید کا موقع آتا ہے تو خدا جانتا ہے بڑی ناخوشگواری اور اذیت کے ساتھ یہ فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے، رہا پاکستان کا سوال، تو پاکستان پہلے ہی سے ہمیں عزیز تھا مگر قراردادِ مقاصد کی منظوری کے بعد تو اس کا ایک ایک چپہ مسجد کی طرح ہمارے لیے مقدس اور محترم ہو گیا ہے، اُسکی حفاظت ہمارا دینی فریضہ ہے، مُسلم لیگ کے اکابر پر تنقید "اصلاحِ حال" ہی کے لیے تو کی جاتی ہے تاکہ پاکستان کے نظم و نسق میں کسی قسم کی کمزوری، ڈھیل اور بگاڑ نہ پیدا ہو! نہ صرف پاکستان کا بلکہ اسلام اور خدا کا غدّار اور باغی ہے وہ مسلمان جو پاکستان میں انتشار پھیلانے

[1] اوائلِ فروری کی ۲۷ تاریخ تک جو واقعات مشرقی بنگال میں رونما ہوئے ہیں اس نے خدا جانتا ہے دل کے ٹکڑے اڑا دیئے ہیں!

کا خفیف سا داعیہ بھی اپنے نفس کے اندر رکھتا ہو، اور حق ناشناس، ظالم اور احمق وہ ہے جو پاکستان میں اسلامی بنیادوں پر اصلاح چاہنے والوں کو پاکستان کا دشمن سمجھتا ہو، پاکستان "اسلام" کے نام پر وجود میں آیا ہے، پس اُس کا حقیقی، بہی خواہ اور سچا دردمند وہی ہو سکتا ہے جس کی زندگی اسلام سے مناسبت اور مطابقت رکھتی ہو، اسلام کا منافق، پاکستان کا بھی منافق ہے، پس جس زندگی، جس ادارے، جس دفتر، جس وزارت اور جس انسٹی ٹیوشن میں اسلام سے جتنی دوری پائی جاتی ہے، وہ ادارہ اور وہ زندگی اُتنی ہی پاکستان کی کمزوری کا سبب بن رہی ہے!

پاکستان کو بہت سے لوگوں نے خوانِ یغما سمجھ رکھا ہے شہرت و عزت اور جاہ و منصب کے حصول اور جلبِ منفعت کا ذریعہ! اُنکو اس سے غرض نہیں کہ پاکستان کی تعمیر کن بُنیادوں پر ہونی چاہیئے "پاکی" (تقویٰ اور نیکی) جو پاکستان کے نام کا جُزوِ اعظم ہے، اُسے کس طرح حاصل کیا جائے اور پھیلایا جائے، اُنکو تو بس ڈنر، پارٹیاں، اور سپاسنامے چاہئیں اور اُن کے فوٹو اخباروں میں چھپتے رہیں ——— اُنکی ان لذتوں کو اگر کوئی چھیڑتا ہے اور کسی کے قول و عمل کی اِن عیش سامانیوں پر زد آ کر پڑتی ہے، تو وہ ان حضرات کی نگاہ میں بہت بڑا مجرم قرار پاتا ہے۔

پاکستان میں کچھ ایسے خدا کے بندے بھی ہیں کہ پاکستان کے نظم و نسق کی خرابیوں کو دیکھکر جن کا دل روتا ہے جنکو اسی غم میں راتوں کو نیند نہیں آتی، جن کو اپاہجوں، بھوکوں، محتاجوں، بے روزگاروں اور بے خانماں مہاجرین کی پریشاں حالی میں "کمیونزم" کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، جو اپنے خدا کے حضور رات کی تنہائیوں میں دعائیں کرتے ہیں کہ بارِ الٰہا! پاکستان کو ہر قسم کے گزند سے بچانا، آج ساری دُنیا اور تمام روئے زمین پر یہی ایک خطہ ہو جس میں "نظامِ حق" برپا کرنے کا اعلان اور وعدہ کیا گیا ہے، مالک! اس خطہ کی حفاظت فرما، اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں سے!

تہمت وافترا

صاحبِ مضمون نے یہ جو انکشاف فرمایا ہے کہ مولانا مودودی انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی صف میں انتشار پیدا کرنے کی پولیٹیکل کوشش کر رہے تھے ——— آگے بڑھ کر رزمی صاحب کے بارے میں ہمارے "حُسنِ ظن" کو سخت دھچکا لگا، کسی کی مخالفت میں حدود سے اتنا آگے چلے جانا خداترس انسانوں کو ہرگز زیب نہیں دیتا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو مُسلم لیگ سے جس نوع کا اختلاف تھا اور آج بھی ہے اُس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں ——— مگر مضمون نگار کو حیرت ہے یہ معلوم نہیں ہے کہ کانگریس کے "ایک قومی نظریہ" کی جس شخص نے سب سے زیادہ مخالفت کی، وہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات تھی، اس وطن پرستانہ نظریہ کی مولانا مودودی کے قلم نے دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں، کتاب و سنت کی روشنی میں روایت و درایت سے اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ وطنیت کی بُنیاد پر "قوم" نہیں بنا کرتی اور مسلمان، ہندوستان کی دوسری قوموں سے جُداگانہ وجود اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں، مولانا مودودی کے یہ مضامین اُنکی سیاسی بصیرت کے شاہد ہیں، اس مسئلہ میں اُنھوں نے جمعیۃ علماء کے اکابر کی مخالفت کی بھی پروا نہیں کی، چنانچہ کانگریسی اخباروں نے مولانا مودودی کو بہت کچھ صلواتیں سُنائیں، جو اُن

کے مدح خواں تھے وہ سب دشنام پر اتر آئے، اور اُن کی اس حقگوئی کا آج تک انتقام لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا دعویٰ مسلم لیگ نے اسی بنیاد پر کیا تھا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور مسلم لیگ کے اس دعوے کو سب سے زیادہ تقویت مولانا ابوالاعلیٰ کی تحریروں نے پہونچائی، چنانچہ مسلم لیگ کے بعض مقررین مولانا مودودی کی تحریروں کے اقتباسات سے اپنی تقریروں میں مدد لیا کرتے تھے!

مولانا مودودی کو مسلم لیگ کی روش سے جس حد تک اختلاف تھا، وہ اس لیے نہ تھا کہ اس طرح مولانا موصوف ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتے تھے، اور "ایک قومی نظریہ" کی جو انھوں نے پوری قوت کے ساتھ مخالفت کی اس کا بھی یہ مقصد نہ تھا کہ اُن کو مسلم لیگ اور قوم کی اکثریت کی خوشی اور تحسین درکار تھی، انھوں نے جس کو غلط سمجھا اُس سے اختلاف کیا اور جس کو حق سمجھا اُس کی حمایت کی اُن کے ردو قبول کا معیار "رضائے الٰہی" تھا اور ہے؛ وہ اُسی چیز کی حمایت کرتے ہیں، جس کو وہ اپنے نزدیک پوری نیک نیتی کے ساتھ حق سمجھتے ہیں، وہ اس بات سے کبھی نہیں ڈرتے کہ اظہارِ حق کے سبب لوگ اُن سے ناراض ہو جائیں گے اور اُن کی شہرت اور ہر دلعزیزی کو نقصان پہونچے گا، مولانا مودودی کو دنیا والوں کے ہاتھوں اپنی ذلت اور رسوائی پسند ہے مگر وہ "حق" کی رسوائی کسی قیمت پر گوارا نہیں کر سکتے۔

مسئلہ زمینداری اور جاگیرداری کے سلسلہ میں مولانا مودودی نے عوام کے رجحان کی ذرہ برابر پروا نہیں کی کتاب وسنت کی روشنی میں اپنے نزدیک جس چیز کو انھوں نے "حق" سمجھا، اُس کا اظہار کر دیا، اظہارِ حق کے اس جرم کی پاداش میں اُن کو سرمایہ داروں اور زمینداروں کے "ایجنٹ" بننے کے دلخراش طعنے سننے پڑے۔

اور مضمون نگار نے یہ جو کہا ہے کہ مولانا مودودی انگریزوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی صف میں انتشار پھیلا رہے تھے ...... اس پر ہمیں ایک قصہ یاد آیا ———— کسی بستی میں ایک خدا ترس، نیک کردار اور اچھے اخلاق کے بزرگ رہتے تھے، بستی کے لوگوں کی اخلاقی اصلاح اُن بزرگ کے پیشِ نظر تھی، اس لیے بد اخلاق لوگوں کو وہ ٹوکتے بھی تھے، بعض لوگ جن کے عیش و آرام میں بیٹھے بٹھائے خلل پڑ رہا تھا، اس روک ٹوک پر بگڑ بیٹھے، اور اُن میں ایک شخص نے اُس نیک انسان پر یہ الزام لگایا کہ یہ صاحب، محلہ کی مرغیاں چُرا کر کاٹ لیتے ہیں، عام طور پر سب نے اس الزام کو غلط ہی سمجھا لیکن کچھ لوگ اس طرح سوچنے لگے کہ مولوی صاحب آخر انسان ہیں اُن سے بھول چوک بھی ہو سکتی ہے، آدمی کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی، ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا ہو، الزام لگانے والوں کو کچھ تائید کرنے والے بھی مل گئے" اور اُن میں سے ایک صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ اِن مولوی صاحب نے نہ صرف یہ کہ مرغیاں چرا کر اُن کا پلاؤ پکا کر کھایا تھا بلکہ ایک ہاتھی بھی ذبح کر کے ہڑپ کر گئے ———— تو "ہندوؤں" کے ساتھ "انگریزوں" کا جو جوڑ ملایا گیا ہے، اُس کی ٹھیک یہی صورت ہے، جو اوپر کے قصہ میں بیان کی گئی ہے،

"تخفیف عظمت" کا وہم

فاضل مضمون نگار نے اپنے شبہات کی دو شقیں قایم کی ہیں، پہلی شق یہ ہے:۔
..... "سید ابوالاعلیٰ مودودی علماء مجتہدین کی تخفیفِ عظمت کر کے مسلمانوں کو اُن سے بدگمان کرتے ہیں"

ہم اس موضوع پر قدرے تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں تاکہ بات مبہم اور گنجلک نہ رہنے پائے۔ رزمی صاحب کا یہ "شبہ" اُس الزام کی جو بعض علماء کرام کی طرف سے مولانا مودودی پر عائد کیا گیا ہے، صدائے بازگشت ہے!

پہلے اس چیز کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی مخلوق کے تمام کام سو فی صدی ٹھیک نہیں ہو سکتے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس میں کسی قسم کی لغزش، نسیان اور نیچ اونچ کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا، وہاں خیر ہی خیر، عدل ہی عدل اور کمال ہی کمال پایا جاتا ہے، اور یہ تو ہم اپنے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں، اُس کی ذات ہماری تمثیل، تشبیہ تعریف اور اظہار و بیان سے بھی بلند ہے!

اللہ تعالیٰ کے بعد انبیائے کرام کا درجہ ہے، جو اس اعتبار سے معصوم ہیں کہ ہوائے نفس کی بنا پر اُن سے کوئی غلطی[1] سرزد نہیں ہوتی، ہاں! دین کی تبلیغ میں دین کی خیر خواہی اور بہتری ہی کے لیے کبھی کبھار تھوڑی بہت نیچ اونچ ہو جاتی ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا تھا، یہ حضور نے تالیف قلب کے لیے کیا تھا اور اس میں "رافت" کا پہلو غالب تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ یہاں "رافت" کی جگہ "شدت" کی ضرورت تھی، یوں سمجھئے کہ انبیاء کرام کسی دینی کام کو "اچھے" طریقے پر کرتے ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اُس سے اور زیادہ اچھے اور بہتر طریقہ کے لیے، توجہ دلاتا ہے ——— یعنی "ترکِ اولیٰ" پر انبیاء کرام کو کبھی کبھی متنبہ کیا جاتا ہے، جہاں تک ہوائے نفس کا تعلق ہے وہ "معصوم" ہوتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کی طرح وہ زلت و نسیان سے بالکل محفوظ نہیں ہیں ——— تقدیس کا کمال، جہاں نقطۂ اعتدال سے اِدھر اُدھر ہونے کا وہم بھی نہیں کیا جا سکتا، صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔

انبیائے کرام علیہم کے بعد صحابہ کرام کا درجہ ہے، جو اہلِ عدل تھے اور وہ اللہ سے راضی تھے اور اللہ اُن سے راضی تھا، پھر تابعین کی باری آتی ہے جو صحابہ کرام کے خوشہ چینوں میں سے تھے اور "احسان" کے درجہ پر فائز تھے، مگر صحابہ اور تابعین اس دینی عظمت و وقار کے باوجود نبی کی طرح معصوم نہ تھے، اُنکی غالب اکثریت صاحب تقویٰ اور انتہائی نیکوکار تھی مگر بعض سے غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔

صحابہ کرام اور تابعین عظام کے بعد تبع تابعین، مجتہدین، اولیائے کرام اور صُلحائے اُمت کا درجہ ہے، جن سے ہم "حُسنِ ظن" رکھتے ہیں، مگر اُن کو معصوم اور منزہ عن الخطاء نہیں سمجھتے ——— اہلِ کتاب و سنت صاحبانِ اعتدال اور حق و صداقت کے تلاش کرنے اور خدا سے ڈرنے والوں کا یہی عقیدہ اور مسلک ہے جو ہم نے ابھی ابھی بیان کیا ہے!

جو کوئی خدا کی ذات سے لیکر صُلحائے اُمت تک کی عصمت و تقدیس کے بارے میں اس "تدریج" اور "فرق مراتب" کا قایل ہے، وہ کسی بزرگ کے کسی فعل، قول یا نظریہ پر پُورے شرف و احترام کے ساتھ کوئی تنقید کرتا ہے، تو اُسے "تخفیفِ عظمت" یا "توہین" نہیں کہہ سکتے، خدا اور رسول کے بعد کسی کی ذات "تنقید" سے بالاتر نہیں ہے! مگر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور انبیائے کرام کے بعد ہر شخصیت پر تنقید ہو سکتی ہے تو اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ان نفوسِ قدسیہ کی زندگیوں میں سے بس "لغزشیں" ہی ہم چُن چُن کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہیں اور اُن کی نیکیوں سے دانستہ

---

[1] قرآن پاک میں حضرت آدمؑ کی "زلت" کا جو واقعہ بیان فرمایا گیا ہے، اُس کی بھی یہ نوعیت ہے کہ حضرت آدمؑ کی ہوائے نفس اس میں شریک نہ تھی، بلکہ "تقربِ الٰہی" کا جذبہ شامل تھا! دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ خاص معاملہ ہے کہ وہ اُن کو فوراً متنبہ فرماتا ہے اور کسی "زلت" پر انبیاء کرام ذرا سی دیر کے لیے بھی جمنے نہیں پاتے،

صرفِ نظر کر جائیں، جو کوئی ایسا کرتا ہے، وہ اعتدال کی راہ سے بہت دُور ہٹ کر پہونچ چکا ہے اور اُس کا دل "صلحاءِ اُمّت" کی دشمنی اور عناد کے مرض میں مبتلا ہے، اور یہ بہت بڑی بد توفیقی ہے۔

جن مسلمان مورخین نے صحابۂ کرام کے مناقب بیان کئے ہیں، اور صحابہ کرام کی زندگی کو چراغ ہدایت اور سرمایہ سعادت سمجھا ہے، اُنھوں نے حضرت ابو محجن ثقفی رضی اللہ عنہ کی شراب نوشی کے واقعہ تک کو بھی بیان کر دیا ہے، اور اس تاریخی واقعہ کے اظہار و بیان پر ہم اُن مورخین کو بزرگوں کی توہین و تخفیف کا الزام لگا کر مطعون نہیں کر سکتے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کاتبِ وحی تھے، اُن کا ہم احترام کرتے ہیں کہ رسول اللہ کی صحابیت کا شرف اُن کو حاصل تھا مگر یزید کی ولی عہدی کا جب بھی ذکر چھڑے گا ——— اُس پر نقد و احتساب کیا جائے گا، واقعہ تحکیم کے سلسلہ میں حضرتِ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی سادہ دلی کو سراہا جاتا ہے اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی ڈپلومیسی پر تنقید کی جاتی ہے، صاحب الحیاء و الایمان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بزرگی اور نیکو کاری میں بس کوئی خبیث ہی شبہ کر سکتا ہے لیکن ایک مورخ پورے احترام کے ساتھ اس رائے کے اظہار کا حق رکھتا ہے کہ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت کے مقابلہ میں، حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں ڈھیل پیدا ہوگئی!

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان پر جو لوگ آپ کو قتل کرنے کے لیے چڑھ آئے تھے اُن میں محمد ابن ابی بکر بھی شامل تھے، آپ کے صاحبزادے یعنی حضرت صدیق اکبرؓ کے پوتے حضرت قاسم اپنے والد کی اس غلطی کا اعتراف فرماتے تھے اور اس خطا پر اللہ سے اپنے باپ کے لیے مغفرت طلب کرتے تھے۔

عبرت و بصیرت کے لیے، حکمت و موعظت کے سلسلہ میں اگر اس قسم کے واقعات کے اظہار کی ضرورت پیش آجائے، تو اس اظہارِ حقیقت کو "تخفیفِ عظمت" کہنا خود اپنی جگہ ایک طرح کی جہالت ہے۔

"اسماء الرجال" کی تاریخ گواہ ہے کہ بعض محدثین کی کمزوریوں پر اربابِ بصیرت نے جرح و تنقید کی ہے! تابعین عظام کی محبت اور عقیدت سے کس مسلمان کا دل خالی ہو سکتا ہے لیکن اربابِ تاریخ و سیر نے بعض تابعین کے بارے میں لکھا ہے کہ توریت و انجیل کے وہ بہت بڑے عالم تھے اس لیے بعض اسرائیلی روایتیں اُنھی کے ذریعہ سے اسلامی ادب میں داخل ہوئی ہیں ——— اس اظہارِ حقیقت کو اُن تابعین کی "تخفیفِ عظمت" سے تعبیر کرنا نقصِ عقل کی دلیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کو دین میں حجت سمجھتے ہوئے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض محدثین متساہل تھے اور احادیث کے جانچنے میں اُس درجہ کی سختی نہ برتتے تھے، جس درجہ کی سختی اُس فن میں مطلوب ہے ——— اس "تنقید" کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ اعتراض کرنے والے نے اُن محدثین کی اس طرح تنقیص کر دی اور فنِ "حدیث" کو (معاذ اللہ) بے اعتبار ٹھہرا دیا۔

"فقہ" کی ضرورت، اہمیت اور افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے، کہا جا سکتا ہے کہ بعض فقہائے غیر ضروری موشگافیوں سے کام لیا ہے، اور فقہی رخصتوں اور حیلوں کے فصول و ابواب کے بعض اجزاء پر بھی جرح و تنقید ہو سکتی ہے ——— اس تنقید و احتساب کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ فقہاء کے مرتبہ کو اس طرح گھٹا دیا گیا یا اُن کی جناب میں گستاخی کی گئی۔

اسلام جہاں مشاہیر و اکابر کا احترام سکھاتا ہے وہاں "شخصیت پرستی" کی بھی نفی کرتا ہے، بزرگوں کو نبیوں اور رسولوں کی سطح پر لے آنا، اور اُن کو "معصوم" سمجھنا اپنی جگہ خود ایک طرح کی گمراہی ہے، اس مبالغہ سے اسلام نے روکا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی "تجدید و احیائے دین" جس پر مضمون نگار نے اعتراضات وارد کئے ہیں اور یہ کتاب دوسرے معترضین کے نقد و احتساب بلکہ ملامت کا نشانہ بھی بنی ہے ہمارے سامنے ہے، ہم نے اس کتاب کو بہت غور سے پڑھا مگر خدا گواہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھ کر حضرت امام غزالی، حضرت امام ابن تیمیہ اور حضرت ولی اللہ کے بارے میں کسی قسم کا "سوءِ ظن" ہمارے قلب و ذہن میں پیدا نہیں ہوا اور نہ اُن بزرگوں کی عظمت میں کمی آئی، بلکہ ان بزرگوں کی جو عظمت پہلے سے ہمارے ذہن میں تھی اس میں اضافہ ہو گیا ——— کسی کو ہماری بات مشتبہ نظر آئے تو اس کتاب کو پڑھ کر دیکھ لے، اس کتاب کی اسپرٹ خالص دینی اور اصلاحی ہے، اور ان بزرگوں کی "تخفیفِ عظمت" کا پہلو تو کہیں سے بھی نہیں نکلتا! ——— احترام کے حدود میں رہ کر تنقید جائز کو تخفیفِ عظمت نہیں کہتے ہرگز نہیں کہتے۔

حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب اور دینی کارناموں پر سید ابوالاعلیٰ نے پورے چھ صفحے لکھے ہیں ..... چند اقتباسات ملاحظہ ہوں ——— (حضرت امام غزالی کی کوششوں نے) فلسفہ یونان کے تسلط کو مٹانے اور جدید تنقید و تحقیق کا فتح باب کرنے میں حصہ لیا ——— اُن غلطیوں کی بھی اصلاح کی جو فلاسفہ اور متکلمین کی ضد میں اسلام کے وہ حامی کر رہے تھے جو علوم عقلیہ میں گہری بصیرت نہ رکھتے تھے ——— انھوں نے اسلام کے عقائد اور اساسیات (FUNDAMENTALS) کی ایسی معقول تعبیر پیش کی جس پر کم از کم اُس زمانے کے اور بعد کی کئی صدیوں تک معقولات کی بنا پر کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا اس کے ساتھ انھوں نے احکام شریعت اور عبادات و مناسک کے اسرار و مصالح بھی بیان کیے اور دین کا ایسا تصوّر لوگوں کے سامنے رکھا جس سے وہ غلط فہمیاں دُور ہو گئیں جن کی بنا پر یہ گمان ہونے لگا تھا کہ اسلام عقلی امتحان کا بوجھ نہیں سہار سکتا ——— انھوں نے اپنے وقت کے تمام مذہبی فرقوں اور اُن کے اختلافات پر نظر ڈالی اور پوری تحقیق کے ساتھ بتایا کہ اسلام اور کفر کی امتیازی سرحدیں کیا ہیں، کن حدود کے اندر انسان کے لیے رائے و تاویل کی آزادی ہے اور کن حدود سے تجاوز کرنے کے معنیٰ اسلام سے نکل جانے کے ہیں، اسلام کے اصلی عقائد کون سے ہیں اور کیا چیزیں ہیں جن کو خواہ مخواہ عقائد دین میں داخل کر لیا گیا ہے، اس تحقیقات سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے اور تکفیر بازی کرنے والے فرقوں کی سُرنگوں میں سے بہت سی بارود نکال دی اور لوگوں کے زاویہ نظر میں وسعت پیدا کی ——— انھوں (امام غزالی) نے دین کے فہم کو تازہ کیا، لوگوں کو کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ کے چشمۂ فیض کی طرف توجہ دلائی، اجتہاد کی رُوح کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور اپنے عہد کے تقریباً ہر گروہ کی گمراہیوں اور کمزوریوں پر تنقید کر کے اصلاح کی طرف عام دعوت دی ——— اِس وقت تک مدارسِ عربیہ میں جو نصاب پڑھایا جا تا رہا ہے اُس کی ابتدائی خط کشی امام غزالی ہی کی رہینِ منت ہے ——— ایک ایک بُرائی کی جڑ اور اُس کے نفسیاتی اور تمدنی اسباب کا کھوج لگایا، اور اسلام کے صحیح اخلاقی معیار پیش کرنے کی کوشش کی ——— انھوں نے اپنے عہد کے نظامِ حکومت پر بھی پوری آزادی کے ساتھ تنقید کی، براہِ راست حکامِ وقت کو بھی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے رہے اور عوام میں بھی یہ رُوح پھونکنے کی کوشش کرتے رہے کہ منفعلانہ انداز سے ہر جبر و ظلم کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دیں ———"

ہم اس مضمون کے پڑھنے والوں کے حسن انصاف سے دریافت کرتے ہیں کہ جو شخص امام غزالی کے بارے میں یہ رائے رکھتا ہو اور امام موصوف کا اس قدر عقیدت مند اور قدر شناس ہو، کیا وہ اُن کی "تخفیفِ عظمت" کا وہم بھی ذہن میں لا سکتا ہے ——— ان کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بے شک یہ بھی لکھا ہے:-

"امام غزالی کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقایص بھی تھے اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں ایک قسم ان نقایص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے اُن کے کام میں پیدا ہوئے، دوسری قسم ان نقایص کی جو اُن کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے اور تیسری قسم ان نقایص کی جو تصوّف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے۔ ۔ ۔ ۔"

اگر کوئی شخص امام غزالی کی پرستش کرتا ہو یا اُن کو اُس نے نبی کا درجہ دے رکھا ہو تو اُس کو اختیار ہو کہ وہ تنقید نگار کے بارے میں جو چاہے رائے قایم کرے مگر جو کوئی امام غزالی کو نبی نہیں عالم دین، مجدد وقت اور مصلح سمجھتا ہو، تو وہ اس تنقید کو "تخفیفِ عظمت" سے ہرگز تعبیر نہیں کر سکتا، ہر انسان کے کام میں کچھ غلطیاں رہ سکتی ہیں اور کمزوریوں سے کون انسان پاک اور منزہ ہو!

حضرت امام غزالی نے بلاشبہ ہر قسم کی حدیثیں اپنی کتابوں میں درج کر دی ہیں اور احادیث کے پرکھنے میں وہ زیادہ احتیاط اور شدت نہیں برتتے، تو جو کوئی عقیدت و احترام کے ساتھ امام غزالی کی کتابیں پڑھے اُس کے ذہن میں یہ چیز بھی ضرور رہنی چاہیئے کہ احادیث کے معاملہ میں امام موصوف متساہل تھے ——— یہ حقیقت ہو جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور جس کا اظہار بھی ضروری تھا!

حضرت امام غزالی نے کوئی شک نہیں کہ معقولات میں کمال حاصل کرنے کے بعد "عقلئین" کے زور کو بہت کچھ توڑا اور فلسفۂ یونان کے رُعب پر ضرب کاری لگائی لیکن یہ بھی واقعہ ہو کہ پوری نیک نیتی اور خدمتِ دین کے جذبہ اور خلوص کے باوجود "عقلیات" کا غلبہ اُن کی بعض تحریروں میں نظر آتا ہو ——— اب رہا تصوف کی طرف امام غزالی کا غیر معمولی میلان تو اُس کے متعلق صرف ایک بات کا ذکر کر دینا کافی ہو کہ "سماع" کے بارے میں امام موصوف نے لکھا ہو کہ اہل کے لیے حلال ہو اور نااہل کے لیے حرام ہو، حالانکہ اسلامی شریعت میں کسی چیز کی حلت و حرمت کے لیے "اہل" اور "نااہل" کی تقسیم نہیں پائی جاتی۔

صاحب السیف والقلم حضرت امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مولانا مودودی نے جو یہ لکھا ہو "۔ ۔ ۔ کہ وہ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھا سکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آجاتیں۔ ۔ ۔" اس کے ساتھ مودودی صاحب کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جملے بھی تو پڑھیئے:—

> "اسلام خالص و محض کا جو صُور اس شخص (امام ابن تیمیہؒ) نے پھونکا تھا، اس کی بدولت ایک مستقل حرکت دُنیا میں پیدا ہو گئی، جس کی آواز بازگشت اب تک بلند ہو رہی ہو ——— اور جس نے اُس تاریک زمانہ میں اصلاح کا علم اُٹھانے کی جرأت کی وہ ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔ ۔ ۔"

ان "مناقب" اور اس "تنقید" کا موازنہ کیا جائے تو کون اہلِ انصاف یہ کہہ سکتا ہو کہ مولانا مودودی کے ذہن میں امام ابن تیمیہ کی تخفیفِ عظمت کا خفیف سا داعیہ بھی موجود ہو۔

اور یہ جو مضمون نگار نے لکھا ہو کہ "عیب جوئی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ادراک و نظر کس قدر کامیاب ہیں۔ ۔ ۔" تو "عیب جوئی" میں نہیں بلکہ دین و صداقت کے معاملہ میں مولانا مودودی کے ادراک و نظر واقعی کامیاب ہیں کہ جہاں

کہیں کسی کا قول یا فعل ذرا سا بھی دین کے نقطۂ اعتدال سے اِدھر اُدھر نظر آتا ہے اُن کے ادراک و نظر اُسے تاڑ لیتے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کا اُن پر بہت بڑا فضل ہے، یہ "فہم و بصیرت" کتاب و سنت میں غور کرنے کے سبب اللہ نے اُن کو عطا کی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگوں کی خوشی اور ناخوشی کے ڈر سے، اس کو کام میں نہ لائیں اور اُسے معطل بنا کر چھوڑ دیں! ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی زبان اور قلم سے جو کچھ بھی نکل جاتا ہے وہی حق ہوتا ہے، اُن سے بھول چوک نہیں ہوتی یا اُن کی ہر رائے سو فیصدی ٹھیک ہوتی ہے، جب امام غزالیؒ اور امام ابن تیمیہ جیسی عظیم شخصیتوں پر وہ تنقید کر سکتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ خود اُن پر کوئی تنقید نہ کرے جب کہ علم و فضل اور تقویٰ میں غزالی اور ابن تیمیہ سے اُن کو کوئی نسبت نہیں ہے ـــــــ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے غلبہ کی جد و جہد میں مولانا مودودی[1] بہت زیادہ حریص واقع ہوئے ہیں، جس کسی کی زندگی میں "نظامِ حق کے قیام کے معاملہ میں ذرا سا بھی تساہل یا کمزوری نظر آتی ہے، وہ اُن کے دل میں کھٹکتی ہے اور دینِ خالص پر کسی دوسرے مکتبۂ فکر و خیال کی ذرا سی پرچھائیں بھی وہ گوارا نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں صفحہ (۶۸) کا حوالہ دیکر فاضل مضمون نگار نے جو عبارت درج کی ہے، افسوس ہے کہ وہ ادھوری اور ناقص ہے، اُنھوں نے اصل عبارت سے وہی ٹکڑے چُن لیے ہیں، جن سے مولانا مودودی پر شاہ صاحب کی "تخفیفِ عظمت" یا اُن کی "عیب جوئی" کے شبہ کو تقویت ہوتی ہو، اور مولانا مودودی لوگوں کی نگاہ میں مطعون ہو سکیں، اب ہم پوری عبارت درج کرتے ہیں:-

"ان کتابوں[2] میں انھوں (شاہ ولی اللہ) نے مابعد الطبیعاتی مسائل سے ابتدا کی ہے، اور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص فلسفۂ اسلام کو مُدوّن کرنے کی بنا ڈال رہا ہے، اس سے پہلے مسلمان فلسفہ میں جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے اس کو محض نادانی سے لوگوں نے فلسفۂ اسلام کے نام سے موسوم کر رکھا ہے، حالانکہ وہ فلسفۂ اسلام نہیں، "فلسفۂ مسلمین" ہے جس کا شجرۂ نسب یونان و روم اور ایران و ہندوستان سے ملتا ہے، فی الواقع جو چیز اس نام سے موسوم کرنے کے لائق ہے اس کی داغ بیل سب سے پہلے اسی دہلوی شیخ نے ڈالی ہے اگرچہ اصطلاحات ہی قدیم فلسفہ و کلام یا فلسفیانہ تصوّف کی زبان سے لی ہیں اور غیر شعوری طور پر بہت سے تخیلات بھی ذہن سے آگئے ہیں جیسا کہ اوّل اوّل ہر نئی راہ نکالنے والے کے لیے طبعاً ناگزیر ہے مگر پھر بھی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولنے کی ایک بڑی زبردست کوشش کی ہے خصوصاً ایسے شدید انحطاط کے دور میں اتنی طاقتور عقلیت کے آدمی کا ظاہر ہونا بالکل حیرت انگیز ہے۔

اس فلسفہ میں شاہ صاحب کائنات اور کائنات میں انسان کا ایک ایسا تصوّر قایم کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اسلام کے نظامِ اخلاق و تمدن کے ساتھ ہم آہنگ اور متحد المزاج ہو ۔۔۔"

اس پوری عبارت کے ساتھ صاحبِ مضمون کے وہ ادھ کٹے جملے پڑھئے جو صاحبِ مضمون نے درج کیے ہیں، تو آپ پر اصل حقیقت واضح ہو جائے گی، اور ان ادھورے جملوں کی بنیاد پر مضمون نگار نے، طعن و طنز کا جو طلسم تیار کیا ہے، وہ

---

[1] اور اسی طرح مولانا مودودی کے دینی کارناموں میں جو خامیاں رہ جائیں گی اُس پر آنے والے اربابِ فکر و بصیرت تنقید کریں گے!

[2] حضرت شاہ صاحب کی تصانیف حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغہ وغیرہ مراد ہیں (م - ق)

یقیناً ٹوٹ جائے گا۔

صفحہ (۵۲) کا فٹ نوٹ بھی پورے کا پورا صاحب مضمون نے درج نہیں کیا، ہم اُس کو یہاں بلفظہٖ درج کرتے ہیں:۔

"مولانا محمد منظور صاحب مدیر "الفرقان" نے مجھے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ شاہ صاحب اور اُن کے خاندان کے متعلق یہ روایات کچھ زیادہ معتبر نہیں ہیں، ممکن ہے کہ یہ بیانات یا اُن میں سے اکثر غلط ہوں مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں وہ بجائے خود حقیقت ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ساری زندگی اس پر شاہد ہے کہ وہ تمام عمر تنقیح و تنقید اور تعمیر افکار کے کام میں منہمک رہے اور دعوتِ عامہ کی طرف توجہ کرنے کا اُن کو موقعہ ہی نہیں ملا، تطہیر و تعمیر فکر اپنی جگہ ایک بہت بڑا کام ہے اور دعوتِ عامہ کا کام اس سے مختلف ایک دوسری نوعیت کا کام ہے، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ دونوں کام ایک ساتھ انجام دے سکے اور اگر کسی شخص نے صرف پہلا ہی کام انجام دیا ہو تو اس کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا"

اس عبارت سے حضرت شاہ صاحب کی تنقیص کا کیا کوئی خفیف سا بھی پہلو نکلتا ہے؟ اس عبارت میں شاہ صاحب پر "بے عملی" کا الزام کہاں لگایا ہے، "تعمیر فکر" کا کام خود اپنی جگہ بہت بڑا کام ہے اور اس کا مودودی صاحب نے کھل کر اعتراف بھی کیا ہے ——— اس سادہ سی بات پر حاشیہ آرائی، خود مضمون نگار کے ذہن کی پیداوار ہے۔

صاحب مضمون نے صفحہ ۵۶ کی یہ عبارت نقل کی ہے:۔

"خود اُن کے اپنے گھر اور اُن کے قریبی حلقہ میں بہت سے غیر اسلامی طریقے رائج تھے اور وہ اُن کی اصلاح پر بھی توجہ کرنے سے معذور تھے مثلاً "السلام علیکم" کا رواج اُن کے گھر میں نہ تھا "رفیع الدین آداب بجا لاتا ہے" اور "عبد القادر تسلیمات عرض کرتا ہے" . . . ."

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے نام اور کام سے اہلِ علم ناواقف نہیں ہیں، وہ ہندوستان اور پاکستان کے اُن چند علماء میں سے ہیں، جن کے علم و فضل اور خیر و تقویٰ پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے، علمی مرتبت کے علاوہ اُن کی "صالحیت" کے بھی سب قائل ہیں، مولانا علی میاں نے "سیرت سید احمد شہید رح" لکھی ہے، جس کے حصہ اول کے صفحہ (۸۷) پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"سید صاحب جب شاہ عبد العزیز کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوئے تو نہایت سادگی سے "السلام علیکم" کہا، یہ وہ زمانہ تھا کہ سلامِ مسنون کا رواج ہی ہندوستان سے جاتا رہا تھا حتیٰ کہ حضرت شاہ صاحب کے خاندان میں بھی اس کی رسم نہ تھی اور وہ جب سلام کرتے تھے تو کہتے تھے "عبد القادر سلام عرض کرتا ہے" "رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے" شاہ صاحب نے جب سید صاحب کا سلام سُنا تو بہت خوش ہوئے اور آپ نے حکم دے دیا کہ سلام بہ طریقِ مسنون کیا جائے"

مولانا علی میاں، حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، اور اُن کی جو عقیدت حضرت شاہ ولی اللہ کے گھرانے سے ہے اور ہونی چاہیئے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے، اور اس واقعہ کے اظہار سے اُن کی یہ نیت ہرگز نہیں ہو سکتی کہ اس طرح شاہ صاحب کے مقدس خانوادہ کی تخفیفِ عظمت ہو جائے ———

——— تو مودودی بے چارہ نے آخر اس واقعہ کا ذکر کر کے کون سا جرم کر دیا۔ یہی دوسرے واقعات کے اظہار

کا حال ہے، اب رہی اُن واقعات پر لوگوں کی حاشیہ آرائی تو اُس کے لیے ہر شخص اپنے ظرفِ معتقدات اور رجحان کے مطابق گنجائشیں نکال سکتا ہے! مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کے رسالہ "ترجمان القرآن" کے ایک دو نہیں سیکڑوں صفحے اس کے گواہ ہیں کہ مودودی صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ کے مضامین بہترین انداز میں منتقل کر کے اُردو داں طبقہ کو بتایا ہے کہ اس مجدد و مُصلح کے اسلامی افکار یہ تھے، شاہ صاحب کے وہ بہت بڑے مداح ہیں بلکہ اُن کے افکار سے خوشہ چینی بھی کی ہے!

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں بھی صاحبِ مضمون نے پُوری عبارت نقل نہیں کی، اب یہاں نقل کی جاتی ہے:-

"پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحب اور اُن کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تصوّف کے بارے میں مسلمانوں کا پورا اندازہ نہیں لگایا اور اُن کو پھر وہی غذا دے دی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی حاشا کہ مجھے فی نفسہٖ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا، وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصلی تصوف ہے اور اس کی نوعیت "احسان" سے کچھ مختلف نہیں ہے لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز و اشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقہ سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کا جاری رکھنا ہے ....."[1]

اس سے محتاط انداز میں اور "تنقید" کیا ہو سکتی ہے؟ حضرت مجدد صاحب کے ادب و احترام کو کس قدر ملحوظ رکھا ہے اور جو بات دل میں کھٹک رہی تھی اُس کو بھی جُرات کے ساتھ ظاہر کر دیا! حضرت مجدد صاحب قدس سرہٗ کے زہد و ورع اور علم و تقدس سے کون سرپھرا انکار کر سکتا ہے، مگر اس کے باوجود اُن کے کسی صوفیانہ نظریہ یا شغل و عمل سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس اختلاف کو ہم "تخفیفِ عظمت" نہیں کہہ سکتے، جس طرح حضرت مجدد صاحب نے "وحدۃ الوجود" کے نظریہ کو غلط بتایا حالانکہ قریب قریب تمام اگلے پچھلے[2] صوفیوں کا اس پر اجماع رہا ہے اور یہ اُن کا بہت ہی محبوب "نظریہ" ہے! مگر "وحدۃ الوجود" کے نظریہ کی تردید کر کے حضرت مجدد صاحب نے صوفیائے متقدمین کی توہین یا تخفیف ہرگز ہرگز نہیں کی ——— مولانا مودودی کے تنقید و

---

[1] اس کے ساتھ مولانا مودودی کی یہ عبارت بھی تو پڑھیے:-

"شیخ (حضرت مجدد صاحب) کا کارنامہ اتنا ہی نہیں ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں حکومت کو بالکل ہی کفر کی گود میں چلے جانے سے روکا اور اس فتنۂ عظیم کے سیلاب کا منہ پھیرا جو اب سے تین چار سو برس پہلے یہاں اسلام کا نام و نشان مٹا دیتا، اس کے علاوہ اُنھوں نے دو عظیم الشان کام اور بھی انجام دیئے، ایک یہ کہ تصوف کے چشمۂ صافی کو اُن آلائشوں سے جو فلسفیانہ اور راہبانہ گمراہیوں سے اس میں سرایت کر گئی تھیں پاک کر کے اسلام کا اصلی اور صحیح تصوف پیش کیا، دوسرے یہ کہ اُن تمام رسوم جاہلیت کی شدید مخالفت کی جو اس وقت عوام میں پھیلی ہوئی تھیں اور اس سلسلہ بیعت و ارشاد کے ذریعہ اتباعِ شریعت کی ایک ایسی تحریک پھیلائی جس کے ہزار ہا تربیت یافتہ کارکنوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مختلف گوشوں میں بلکہ وسط ایشیا تک پہونچ کر عوام کے اخلاق و عقائد کی اصلاح کے لیے کوشش کی یہی کام ہے جس کی وجہ سے شیخ سرہند کی کا شمار مجددینِ ملت میں ہوتا ہے۔"

(تجدید و احیائے دین صفحہ ۵۳، ۵۴)

[2] حضرت معروف کرخی، حضرت جنید بغدادی وغیرہ صوفیا (رحمہم اللہ تعالیٰ) کے تصوف میں "وحدۃ الوجود" کی اصطلاح نہیں ملتی یہ بعد والوں کی نازک خیالیاں ہیں۔ (م۔ ق)

احتساب کا بھی اس پر قیاس کرنا چاہیئے!

اور جناب رزمی صاحب نے یہ شبہ جو وارد کیا ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مسلم لیگی عاملوں کے ہاتھ سے اختیارِ حکومت یا اقتدار کی کنجیاں چھیننا چاہتے ہیں ——— اُس کے بارے میں عرض ہے کہ مسلم لیگی عاملین نے اپنے اقتدار اور اختیارِ حکومت کا کیا دوامی پٹہ لکھا لیا ہے کہ چاہے وہ کیسی ہی روش اختیار کریں مگر زمامِ حکومت اُنھی کے ہاتھوں میں رہے گی ——— کیا لایق مضمون نگار کا ضمیر اس پر مطمئن ہے کہ مسلم لیگی عاملین "پاکستان" کو اسلامی خطوط پر چلا رہے ہیں اور کیا اختیارِ حکومت کی کنجیاں "صالح ہاتھوں" میں جانے کے لیے مضطرب نہیں ہیں؟ ڈسپلن کے احترام اور پورے ضبط و نظم کیساتھ آئینی کوششوں سے حکومت کی تبدیلی کے لیے جد و جہد کرنا کیا کوئی اخلاقی جُرم ہے؟ رزمی صاحب کو مسلم لیگی عاملین سے ہمدردی ہے اور اُن کے اقتدار کی بقاء کے لیے وہ دُعاگو ہیں، اور اُن کے اختیارِ حکومت پر احتجاج کی ضرب بھی اگر پڑتی ہے تو وہ تلملا تلملا جاتے ہیں ——— مگر اُن کے اس ذوق، محبت اور عقیدت کی رعایت کے لیے اصلاح و انقلاب کا کام تو بند نہیں رہ سکتا۔ کچھ لوگوں کو مسلم لیگی عاملین سے ہمدردی ہے، اور بعض لوگ اسلامی نظامِ حکومت سے ہمدردی رکھتے ہیں، اپنی اپنی فکر اور اپنا اپنا ظرف ہے، اور جو جس چیز سے شغف اور ہمدردی رکھتا ہے وہ اُسی کے لیے جد و جہد کرے گا۔

"تجدید و احیائے دین" کے جن اقتباسات سے مضمون نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مولانا مودودی صاحب مسلم لیگی عاملین کے ہاتھوں سے عنانِ حکومت اور زمامِ اقتدار چھین لینا چاہتے ہیں تو اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ کتاب سب سے پہلے سنہ ۱۹۴۰ء میں چھپی تھی، جب ہمہ شما کا تو کیا ذکر ہے، قایدِ اعظم اور گاندھی جی تک کے ذہن میں یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ انگریز ایک تاریخ مقرر کرے گا اور اس تاریخ پر اپنا بوریا بستر باندھ کر ہندوستان سے کوچ کر جائے گا!

جب مولانا مودودی نے یہ مضمون لکھا ہے تو مُسلم لیگیوں کے ہاتھوں میں ملک کے اقتدار کی باگ ڈور نہ تھی، ظاہر ہے کہ اس مضمون میں "جاہلیت" سے مُراد انگریزوں کا وہ نظامِ حکومت ہے، جو ہندوستان پر مسلط تھا، اور اس سے یہ بات واضح مُبرہن ہو جاتی ہے کہ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کو مسلم لیگی حکومت سے خدا واسطہ کا بیر نہیں ہے، وہ ہر اُس حکومت کو "جاہلیت" کی حکومت سمجھتے ہیں، جہاں بندوں کے بنائے ہوئے قانون کی حکومت ہو اور دستورِ کتاب و سُنت نفاذ نہ پا رہا ہو ——— مصر، شام، لبنان، یمن، افغانستان اور نجد و حجاز میں جو حکومتیں ہیں، وہ بھی اسلامی انقلاب کی محتاج ہیں حالانکہ ان حکومتوں کی زمام مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں ہے!

اور یہ جو فرمایا گیا ہے:-

"ہمارے خیال میں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کا طریقہ اشاعتِ دینی اور حکومت و اقتدار حاصل کرنے کی جد و جہد اُسوۂ رسول عالم خاتم النبیین کے بالکل خلاف ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام ایسی حالت میں ٭ آپ بالکل بے کس اور بے بس تھے اور جب آپ اسلام پھیلانے میں کامیاب ہو گئے تو حکومت اس کامیابی کے ساتھ نتیجہ میں اپنے آپ چلی آئی ... ..."

٭ اسلام جو پاکستان کی اکثریت کا مذہب ہے یہاں پہلے سے پایا جاتا ہے، اسی "اسلام" کو ایک نظام کی شکل میں قایم کرنا ہے اسی کا نام اسلامی حکومت ہے، اور اس صورت میں جبکہ پاکستان میں اسلام موجود ہے، اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جد و جہد کرنا خلاف سنت نہیں بلکہ عین منشاء سُنت ہے! (م - ق)

اس بیکسی، بے بسی اور مظلومیت کی مطابقت ہندوستان اور اُن دوسرے ممالک سے بے شک ہوتی ہے، جہاں مسلمانوں کی آبادی واقعی مغلوب مظلوم اور بے سہارا ہے، پاکستان میں "اسلام" پہلے سے موجود ہے، یہاں کے بسنے والوں کی اکثریت مسلمان ہے اور اس جگہ کی حکومت "اسلام" کے نام پر وجود میں آئی ہے، تو یہاں دونوں کام ساتھ ساتھ ہوں گے یعنی حکومت اور عوام مسلمانوں دونوں کی اصلاح! اور عمالِ حکومت اصلاح کے لیے آمادہ نہ ہوں تو اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ پورے ضبط و نظم کے ساتھ آئینی جدوجہد سے زمامِ کار کو صالح ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے ——— اس جدوجہد کو چاہے کوئی "حکومت کا تختہ اُلٹنے" یا "اقتدار کی کنجیاں چھیننے" یا "بغاوت" کے نام سے پکارے اُس کا اختیار ہے مگر ہم تو اسے "اسلامی انقلاب" کہتے ہیں اور جو اللہ کے دین کو بلند کرنے کے لیے برپا کیا جاتا ہے اور جس میں اقتدارِ حکومت کی ذراسی خواہش اور لذت بھی شریکِ کار نہیں ہوتی ——— اگر اسلامی انقلاب کے کسی کارکن کے دل میں اقتدار کی لذت کا شائبہ اور حکومت کی ذرہ برابر بھی ہوس پائی جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اُسے جواب دینا ہوگا اور اُسی ہوس و لذت کے بقدر اُس کے اجر کو کم کر دیا جائے گا۔

تہمت و افتراء

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اُن "شبہات" کے جواب میں تھا، جو مضمون نگار نے پیش کئے تھے ——— مگر اب جب کہ یہ ذکر چھڑ ہی گیا ہے، تو جی چاہتا ہے کہ کچھ اور باتیں بھی یہاں بیان کر دی جائیں، ہم بہت دن سے سوچ رہے تھے کہ دل کے ان کانٹوں کو کس طرح کاغذ پر منتقل کریں، صاحبِ مضمون نے اپنا مقالہ بھیجکر اس کے لیے موقع مہیا کر دیا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اس زمانہ کے شاید سب سے زیادہ مظلوم خادمِ دین ہیں، اُن کے خلاف لوگوں نے تہمت و افتراء اور بہتان و شکوک کا ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے، کچھ لوگوں کو اور کوئی الزام ہاتھ نہیں آتا تو یہی کہدیتے ہیں کہ مولانا مودودی کی تحریروں میں قادیانیت کی بو آتی ہے، معترضین نے لوگوں سے پوچھا اور اصرار کر کے پوچھا کہ اپنے اس شبہ کے لیے آپ کوئی دلیل بھی تو بیان کیجئے ——— مگر "دلیل" وہاں کہاں رکھی تھی؟ ان کا مقصد تو مودودی صاحب اور جماعتِ اسلامی سے لوگوں کو بدگمان کرنا تھا اور اس بدگمانی کے لیے "بوئے قادیانیت" سے زیادہ کامیاب حربہ اور کیا ہو سکتا تھا، ان لوگوں کی "قوتِ شامہ" اگر ایسی ہی حساس واقع ہوئی ہے، تو اس شدتِ احساس کے لیے اللہ تعالےٰ کے سامنے اُن کو جواب دینا ہوگا ——— یہ تو ایسا ہی ہے کہ ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر کوئی طنز کرے کہ اس کے رکوع و سجود سے مجھے بُت پرستی کی بو آتی ہے ——— اور دلیل؟ ——— دلیل یہی کہ اُن صاحب کو "بو" آرہی ہے، لہذا اُن کے وجدان اور قوتِ شامہ پر اعتماد کر لینا چاہیئے۔

مگر ہم کیا کریں ہمیں تو مولانا مودودی کی تحریروں سے کتاب و سنت کی خوشبو آتی ہے، اور خدا نہ کرے، خدا نہ کرے... ... معترضین کے بقول اُن کی تحریروں سے "بوئے قادیانیت" اگر آنے لگی تو یہ ہاتھ جو آج مودودی صاحب کی حمایت اور مدافعت میں اُٹھ رہے ہیں اُس وقت اُن کے حلقوم کی طرف بڑھتے ہوں گے ——— ——— غلام احمد قادیانی کو زندہ چھوڑ کر مسلمانوں نے غلطی کی، اب کبھی یہ غلطی نہیں دُہرائی جائے گی! مودودی صاحب ہمارے مطاع اور مقصود نہیں ہیں، اُن کا احترام صرف اس لیے ہے کہ وہ دین کے پُرخلوص خدمت گزار ہیں، اُن کی تحریریں کتاب و سنت کی طرف ذہن و فکر کو لے جاتی ہیں اور وہ اللہ کے دین کو پورے کا پورا قایم کرنے کے لیے

جدوجہد کر رہے ہیں۔ اُن کی جو بات کتاب و سنت کے مخالف نظر آئے گی ہم اُسے ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیں گے ——— رسول اللہ تو رسول اللہ (فداہ ابی و امی) ہی ہیں، ہم حضرت سیدنا بلال رضؓ کے جوتے کے تسمہ کی تخفیف اور توہین بھی گوارا نہیں کر سکتے، ابوالاعلیٰ مودودی کا احترام صرف اس لیے ہے کہ سید کائنات فخر موجودات، خاتم النبیین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا قلادہ اُن کی گردن میں پڑا ہوا ہے، رسول اللہ کی غلامی اور اطاعت کی نسبت سے ابوالاعلیٰ کا احترام ہے،

کچھ "غیب دانوں" اور جوتشیوں نے یہ پیشگوئی کی ہے کہ مودودی صاحب "مجددیت" کا دعویٰ کرنے والے ہیں، یہ بھی عوام مسلمانوں میں مولانا موصوف کو غیر ہر دلعزیز بنانے اور بدگمان کرنے کی ایک سازش ہے ——— بعض کہتے ہیں کہ مودودی صاحب "مجددیت" کا دعویٰ خود تو نہیں کریں گے مگر اُن کے معتقدین اُن کو "مجدد" کے لقب سے یاد کریں گے، ہمیں اس سلسلہ میں مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات بہت پسند آئی کہ مولانا مودودی صاحب (انشاء اللہ) اس دُنیا میں خود اپنا کوئی مقام متعین نہیں کریں گے بلکہ خدمتِ دین کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملیں گے اور وہی اُن کا مقام متعین فرمائے گا، اور اُن کی خدمات کا صلہ دے گا۔

ہم عرض کرتے ہیں کہ کوئی شخص کتاب و سنت کے مطابق زندگی گزارتا ہو، دین میں فہم و بصیرت بھی رکھتا ہو اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جدوجہد بھی کرتا ہو ——— وہ اگر "مجدد" ہونے کا دعویٰ بھی کر دے تو اس دعوے کی بنا پر ہم اسے خارج از دین نہ سمجھیں گے، اور کسی نیک کام میں اُس شخص کے محض دعوائے "مجددیت" کی ضد پر اُس کی مخالفت نہ کریں گے ——— حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں میں ہمیں یہ عبارتیں ملتی ہیں "... "مجھے اس پر مامور کیا گیا ہے" ... "یہ بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے" "خواب میں مجھے یہ بشارت ہوئی ہے" ..." حضرت شاہ صاحب کے ان ارشادات کو ہم دینی حجت بھی نہیں سمجھتے اور نہ اُن سے محض ان دعووں کی بنا پر سوء ظن رکھتے ہیں ——— تجدید دین اور احیاء سنت کا کام ہر زمانہ میں ہوتا رہنا چاہیئے، اگر یہ کام مولینا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے ذریعہ انجام پا رہا ہو تو اس میں اس قدر بدکنے، بھڑکنے اور جھنجلانے کی کیا بات ہے، اور کوئی شخص کتاب و سنت کی صحیح بنیادوں پر دین کا کام اس دعویٰ کے ساتھ کر رہا ہو کہ یہ "تجدید دین" کا کام ہے، تو یہ بھی کوئی گمراہی اور فسق کی بات نہیں ہے۔

بعض حضرات کو نہ جانے کچھ ایسی خوردبینیں کہاں سے مل گئی ہیں کہ جب اُن کو لگا لیتے ہیں تو مولانا مودودی کی تحریروں میں اُنھیں "خارجیت" نظر آتی ہے، حالانکہ بار بار اس کی تردید ہو چکی ہے کہ مولانا مودودی بے عمل مسلمانوں کو دین سے خارج ہرگز نہیں سمجھتے، ہاں! یہ ضرور ہے کہ وہ "عمل" کو ایمان اور اسلام کا بہت ضروری تقاضا خیال کرتے ہیں، کیا "عمل" کی شدت پر زور دینا "خارجیت" ہے، اگر ہے؟ تو پھر علماء، صلحاء، محدثین، فقہا اور اہل ذکر کی تاریخ میں "خوارج" کی اکثریت ملے گی کہ سب نے "عمل" پر زور دیا ہے، جماعتِ اسلامی کے کسی رکن یا ہمدرد کی ایسی مثال نہیں ملتی کہ اُس نے کسی فاسق مسلمان کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا ہو۔

یہ تہمت طرازیاں اور الزام سازیاں "نظریوں" کی حد پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں، ان کا سلسلہ صفات سے ذات تک پہونچتا ہے! لاہور میں سُنا ہے کسی مولوی صاحب نے یہ انکشاف فرمایا کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی

کو ہندوستانی حکومت روپیہ دیتی ہے، اور بھارت سے ایک ایک لاکھ روپیہ کے منی آرڈر آتے ہیں ——— لوگ جھوٹ بھی سلیقہ کے ساتھ نہیں بول سکتے ——— اور اب یہ سُننے میں آرہا ہے کہ امریکہ سے جماعتِ اسلامی کو مالی امداد ملتی ہے اور تہمت تراشیوں کا یہی عالم رہا تو کیا عجیب ہے کہ کل یہ سُننے میں آجائے کہ مولانا مودودی ٹرانسمیٹر کے ذریعہ اسٹالن سے خفیہ بات چیت کیا کرتے ہیں

"ابوالاعلیٰ" کی لفظی ترکیب ہی پر یار لوگوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا کہ یہ نام ہی شرعاً درست نہیں ہے ——— ایک صاحب نے اس سلسلہ میں ہمیں بھی لکھا، اُن کو جواب دیا گیا کہ "ابوالکلام"، "ابوالبیان" اور "ابوالقلم" کی طرح "ابوالاعلیٰ" کنیت نہیں ہے کہ مودودی صاحب نے اسے خود اختیار کر لیا ہو، اُن کے والد نے اپنے بیٹوں کے نام ہی یہ رکھے تھے، ——— مولانا مودودی کے مرحوم بھائی کا نام ابو محمد تھا، دوسرے بھائی کا نام "ابوالخیر" ہے! ہمارے اس جواب پر اُن صاحب نے لکھا کہ آپ کے جواب نے مجھے ایک بڑی غلط فہمی اور بدگمانی سے بچا لیا ——— کاش! تمام معترضین ایسے ہی نیک نفس اور حق پسند ہوتے!

ایک صاحب فرمانے لگے کہ میں نے اچھرہ میں جاکر دیکھا ہے ابوالاعلیٰ مودودی ایک بنگلہ میں رہتے ہیں، اور میز کرسیاں استعمال کرتے ہیں، اُن کو جواب دیا گیا کہ میز کرسیوں پر بیٹھ کر وہ شرابیں نہیں پیتے، برج نہیں کھیلتے، قرآن کی تفسیر لکھتے ہیں، اگر کوئی "درویش صفت" ہو تو "کلاہ تتری" سر پر رکھنے میں کوئی ہرج نہیں ہے! اور بنگلہ میں رہنا اور کرسیاں استعمال کرنا شریعت میں ناجائز کیا مبغوض بھی نہیں ہے!

کراچی کی ایک دعوت میں خود مجھ سے ایک شاعر نے کہا کہ فلاں صاحب ابھی ابھی کھانا کھاتے میں کہہ رہے تھے کہ مولانا مودودی نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر، دوسری شادی کر لی ہے ——— میں نے کہا اُن صاحب کو خدا کے لیے میرے پاس لاؤ، سب لوگ کھانا کھا کر صحن میں بیٹھے تھے اور کچھ لوگ بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے، میرے شاعر دوست نے ادھر اُدھر تلاش کیا مگر وہ صاحب نہیں ملے ——— میں نے پھر اُن سے کہا کہ اس افسوسناک ذہنیت کے لوگ مودودی صاحب کو طرح طرح سے بدنام کرتے رہتے ہیں، اور مولانا مودودی انسان ہیں فرشتہ نہیں ہیں، اُن سے گناہ بھی سرزد ہو سکتا ہے اور "طلاق" تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے! مگر بھائی! یہ اُس شخص کی سراسر دروغ بافی ہے، مولانا مودودی نے ایک شادی کی تھی، اور وہی بیوی اُن کی اب تک شریک حیات ہیں! ——— یہ ہے ہماری قوم کے ذہین اور لکھے پڑھے لوگوں کی دیانت اور ذمہ داری کا عالم! نیتیں خراب بھی ہوتی ہیں مگر اتنی خراب اور کھوٹی تو نہیں ہو جاتیں۔

جن تک ہماری یہ تحریر پہونچ رہی ہے، وہ دوسروں تک بھی ہماری اس گزارش کو پہونچا دیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں مولویوں کے فتووں اور مضمون نگاروں کے مضامین دیکھ کر لوگ کوئی رائے قائم نہ کریں ——— اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے:— فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین! (ترجمہ) بات کی تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ بغیر جانچے بوجھے تم کسی پر حملہ اور تنقید کر دو اور بعد میں شرمندگی اور جماعت کے لٹریچر کو پہلے اچھی طرح پڑھ لیا جائے، موقعہ ملے تو جماعتِ اسلامی کے ارکان کی زندگیوں کو جانچ کر اور قریب سے مطالعہ کر کے دیکھیں اس کے بعد عوام و خواص کو اختیار ہے کہ اپنے ضمیر کے فیصلے کے مطابق جو رائے چاہیں اختیار کریں!

اگر کسی کو یہ اطمینان ہو جائے کہ "جماعتِ اسلامی" کتاب و سُنت کی بنیادوں پر کام کر رہی ہے، اور وہ شخص اپنی کسی کمزوری یا مصلحت کے سبب جماعت کا مددگار اور معاون نہیں بن سکتا، تو اُس کو کم سے کم جماعت کی مخالفت میں دوسروں کا آلۂ کار تو نہ بننا چاہیئے!

کوئی شریک ہو کہ نہ ہو، کسی کو بُرا لگے یا بھلا، اللہ کے دین کی جد وجہد کا قافلہ اب رُکے گا نہیں، یہ قافلہ اب "نظامِ حق" کی چھاؤں میں دم لے گا، اور لوگ مایوس ہوں تو ہوں، مگر ہمیں تو نشانِ منزل نظر آرہے ہیں اور منزل کے نشان و منارے بھی نظر آئیں، تو بھی ہمیں چلنا تو اسی منزل میں ہے، اگر ہم غبارِ راہ بن کر اُڑ گئے تو بھی کامیاب ہی رہیں گے ——— فزت برب الکعبۃ ——— م ۔ ق

علمائے کرام سے!

("احتفالِ علماء" منعقدہ ۱۵ فروری ۵۲ء کے پہلے اجلاس میں یہ نظم خود "شاعر" کی زبان سے سُنی گئی، پاکستان، ہند، مصر، شام، عراق، الجزائر، افغانستان، برما، انڈونیشیا اور آزاد کشمیر کے علماء کے علاوہ جناب خواجہ ناظم الدین صاحب وزیر اعظم پاکستان اور حضرت مفتی اعظم سید امین الحسینی اور دوسرے عمائد واکابر بھی جلسہ میں تشریف فرما تھے ۔ ۔ ۔)

عالمانِ دینِ حق! اھلاً وسہلاً مرحبا — آپ کی تشریف فرمائی کا دل سے شکریہ

تھیں نگاہیں منتظر اس ربطِ باہم کے لئے — دل بچھے جاتے ہیں سب کے خیر مقدم کیلئے

اہلِ حق کی یہ توجہ غم شناسوں کی طرف — یعنی موجیں خود چلی آئی ہیں پیاسوں کیطرف

ایک مرکز پر ہیں اربابِ نظر، اہلِ علوم — پھر کراچی کے افق پہ ہے ستاروں کا ہجوم

یہ عمامے، یہ عبائیں یہ جلالت یہ وقار — علم وفضل ومرتبت ہیں تیوروں سے آشکار

شعر کے خاکے میں دل کا خون بھرنا ہے مجھے
معذرت کرتے ہوئے کچھ عرض کرنا ہے مجھے

یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے — آج دینِ حق جہاں میں ہر جگہ مظلوم ہے

دین سے بیزار دولت مند بھی نادار بھی — نفس کی خواہش کے بندے شیخ بھی میخوار بھی

قوم کی وہ بیٹیاں جن کو کہ بننا تھا بتولؓ — مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانے کے اصول

جھلملاتے جارہے ہیں شرم وغیرت کے چراغ — روز چکنا چور ہو جاتے ہیں عصمت کے ایاغ

مال وزر جاہ وتعیش منزلِ مقصود ہے — آدمی کا اس جہاں میں آدمی معبود ہے

جس کسی کو دیکھئے تن پروری کی فکر ہے — عشرتوں کے پیچھے ہیں سرخوشی کا ذکر ہے

زندگی نان و شکم کے ماسوا کچھ بھی نہیں
دل میں سب کا خوف ہے خوفِ خدا کچھ بھی نہیں

ہر طرف باطل کے پھندے، ہر جگہ بازی گری
روس کا فتنہ بھی ہے اور لعنتِ افرنگ بھی

مُلک ہیں آزاد لیکن دل پہ غیروں کا ہے راج
دوسروں کے گھر سے آتے ہیں ابھی تک تخت و تاج

اپنی منزل سے ہیں اب تک ناشناس و بے خبر
مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

ہائے وہ اسلام جو مسجد میں گھر کر رہ گیا
خانقاہوں کی بھی تنہائی کے صدمے سہ گیا

جب یہ حالت ہو تو پھر جشنِ مسرت کیا منائیں
آؤ ہم اک دوسرے کو اپنے داغِ دل دکھائیں

صرف جلسے منعقد کرنا کوئی مشکل نہیں
یعنی رسمی اجتماعوں کا کوئی حاصل نہیں

جمع ہو جانا بہت اچھا مگر مقصد کے ساتھ
جوش و ہمت، عزم و جرأت جذبۂ بیجا کے ساتھ

تم کہ تم ہو وارثِ علمِ محمدؐ مصطفےٰ
ہے تمہاری زندگی دع ما کدر خذ ما صفا

اپنے فرضِ منصبی کو بھی سمجھنا چاہیئے
تم کو ہر باطل کی قوت سے اُلجھنا چاہیئے

خامہ و قرطاس کی منزل سے اور آگے بڑھو
قصر و ایواں کی بلندی پر کمندیں ڈال دو

احمدِ حنبلؒ کی حق گوئی کی بن جاؤ مثال
کانپ کانپ اُٹھے امیروں بادشاہوں کا جلال

مذہبِ اسلام ہے پورا نظامِ زندگی
حق نے فرمایا ہے اتممت علیکم نعمتی

جو غلط کاری پہ آمادہ ہو اُس کو ٹوک دو
روک دو طاغوت کے طوفاں کو بڑھ کر روک دو

ہر مسلماں دینِ فطرت کا علمبردار ہو
علم اور تقویٰ کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہو

ماہر القادری

ماہر القادری

کلاتھ مارکیٹ میں

میں کپڑے کا بیوپاری ہوں، امرتسر میں ہماری بہت بڑی دُکان تھی، لاکھوں کا کاروبار ہوتا تھا، ایک دن میں ہزاروں کی لوٹ پلٹ ہو جاتی، آٹھ دس آدمی کپڑا دکھانے اور تھانوں کے کھولنے باندھنے پر نوکر تھے، سارے شہر میں بس ایک سردار جی کی دُکان ضرور ہماری شاپ کی ٹکر کی تھی ورنہ کوئی اور سوداگر ہماری برابری نہ کر سکتا تھا، ہر مہینہ دساور سے مال آتا رہتا، کیا عیش تھے، کیسا سازگار زمانہ تھا، دن رات چاندی برستی تھی ——— میرے باپ کی سرکار دربار میں بڑی عزت تھی، ،، خاں صاحب،، کا خطاب تھا اور وہ تو ایک کرسٹان ڈپٹی کمشنر سے والد مرحوم کی لاگ ڈانٹ ہو گئی تھی ورنہ وہ ،، خان بہادر،، قریب قریب ہو ہی چکے تھے!

اور ——— پھر ——— ؟ پھر نہ پوچھئے ۴۷ء کے انقلاب میں سب کچھ لُٹ گیا، مسلمانوں کے محلّوں میں چاروں طرف آگ ہی آگ دکھائی دیتی تھی، ایسی تباہی کسی قوم پر کاہیکو آئی ہوگی، پولس اور فوج جس سے حفاظت کی اُمید تھی، وہ خود دشمنی پر تُلی ہوئی تھی، قاتلوں اور لٹیروں پر جو گولیاں چلنی چاہیئے تھیں، وہ ہم مظلوموں، نہتوں اور بے کسوں پر چل رہی تھیں۔

اپنا وطن ہر کسی کو پیارا ہوتا ہے، مگر وطن چھُٹ گیا، اپنی خوشی سے نہیں چھوڑ دینا پڑا ہم جب لاہور پہنچے ہیں تو تین وقت کا فاقہ تھا، وہ شام بھی یاد رہے گی کہ جب ہم نے دو دو پیسہ کے اُبلے ہوئے چنے کھا کر پانی پیا ہے، بچّے رونے لگے کہ ہم بھوکے ہیں، کچھ اور کھانے کو دو، مگر لاتے کہاں سے ؟ ہمارے پاس تھا کیا ؟

؎ زمیں سخت تھی آسماں دور تھا

ہماری سچ مُچ یہی حالت تھی، کاش ! دل دکھانے کی چیز ہوتی ؟

پھر ہم کچھ دن کیمپ میں رہے، چند مہینہ صوبہ سرحد میں گزارے، بلوچستان کی طرف بھی جانا ہوا مگر کہیں بھی قسمت نے یاوری نہیں کی، قسمت اچھی ہوتی تو وطن ہی کاہیکو چھوٹتا، گھر سے بے گھر ہی کیوں ہوتے۔

اتنے دن مُقدر میں در در کی ٹھوکریں اور پیسہ پیسہ کی محتاجی لکھی تھی، اور مُقدر کا لکھا پُورا ہو کر رہا، پھر کراچی میں بیوی کے ہاتھوں کے کڑے بیچ کر، چند دن گھی کا کاروبار کیا، اُس میں اچھی خاصی بچت ہونے لگی، اُس کے پس انداز سے کپڑے کی دُکان لگالی، ایک بیوپاری نے کچھ کپڑا اُدھار بھی دے دیا ——— اب خدا کا فضل ہے، اچھا خاصہ کام چل رہا ہے، امرتسر والی بات تو نہیں ہے مگر مالک کا شکر ہے کہ اب پہلے کی طرح محتاج نہیں رہی، کوئی ضرورت خدا کی عنایت سے رُکی نہیں رہتی، دس سے بُرا تو سو سے اچھا ہوں! تھوک فروشوں میں بات بنی ہوئی ہے، دس پانچ ہزار کا مال اُدھار بھی مل جاتا ہے!

میں اب کپڑا بیچتا ہوں ——— جی نہیں کپڑا نہیں بیچتا، دن رات تماشہ دیکھتا ہوں! میری دکان ایک طرح کی سیرگاہ ہے اور عبرت گاہ بھی! خدا کا خوف جذبات میں بریک نہ لگاتا تو اب تک نہ جانے کتنے

گناہ سمیٹ لیے ہوتے، مگر ان شعلوں سے کب تک دامن بچاتا رہوں گا، یہاں تو روز ایک نئے "فتنۂ روزگار" اور "قتالِ جہاں" سے واسطہ پڑتا رہتا ہے،

کس قدر بے باک انداز میں عورتیں کپڑے کا بھاؤ تاؤ کرتی ہیں، وہ اُن کی مُسکراہٹیں، وہ باتوں کا لوچ، وہ ناز و انداز! کوئی کوئی تو چاہتی ہے کہ دو چار مسکراہٹوں ہی میں کام نکل جائے، دُلہنوں کو جس طرح بنا سنوار کر خوابگاہوں میں بھیجتے ہیں، یہ عورتیں بس اُسی طرح بن ٹھن کر بازاروں میں آتی ہیں، ناخن کی کوروں سے لیکر، پیشانی کے بالوں تک ہر چیز مُرتب!

پھر دل سوچتا ہوں کہ یا اللہ! یہ اُسی قوم کی بیٹیاں ہیں جن میں خدیجہؓ، عائشہؓ، فاطمہؓ، اسماءؓ اور رابعہ بصریؒ پیدا ہو چکی ہیں، اور ہائے! اُن کے مردوں کی غیرت اور حمیت آخر کس ویرانہ میں جاکر سو گئی ہے، یا خدا! یہ آخر ہو کیا رہا ہے، قوم جا کہاں رہی ہے؟ اُدھرُ جہاں تباہیاں، رسوائیاں، بے شرمیاں اور گراوٹیں اُن کے خیر مقدم کے لیے پرے جمائے کھڑی ہیں!

کل دوپہر کا کھانا کھا کر میں تکیہ کے سہارے کمر سیدھی کرنے کے لیے ذرا لیٹا ہی تھا کہ ایک عورت پیاک جھپاک دُکان پر آئی بیس پچیس سال کی عمر ہوگی، اُس کی! لانبا قد، گوری رنگت، موزوں ناک نقشہ! ایک دو نہیں دس بارہ تھان اُسے دکھلانے پڑے، چھ گز وائل اور پانچ گز ململ اُس نے مول لی، اُس کے چہرے سے قدرے گھبراہٹ کے آثار سے پائے جاتے تھے، جیسے کسی کا کچھ کھو گیا ہو، کسی کا انتظار ہو یا کسی خطرے اور اندیشہ کی پیش بندی مقصود ہو!

اُس نے پرس سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر دیا، میں نے صندوقچی کھول کر دیکھا تو کل چوالیس روپیہ نکلے، ملازم کو نوٹ تڑانے کے لیے بھیجا، اور اتنے میں میرا چھوٹا بھائی آگیا اور میں اُس سے یہ کہہ کر کہ بیگم صاحبہ سے اتنے روپیہ لینے ہیں، نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا، میں نماز سے فارغ ہوا تو نوکر نے کہا وہ بیگم صاحبہ یہ لفافہ دکان پر چھوڑ گئی ہیں، میں تمام بازار میں ہو آیا اُن کا کہیں پتہ نہیں چلا ——— اب اسے آپ بداخلاقی سمجھئے یا بد تہذیبی میں نے اُس لفافہ کو کھول لیا، اُس میں لکھا تھا۔۔۔

ڈیر انجم! کل تمہارے وعدے کے مطابق مقررہ وقت میں جوہری کی دکان پر تمہارا دو گھنٹہ تک انتظار کرتی رہی مگر تمہیں نہ آنا تھا نہ آئے، ایسا کیوں ہوا؟ وہ تمہاری اگلی سی گرم جوشیاں آخر کیا ہوئیں؟ تم شاید اپنے حُسن و جوانی پر ناز کرتے ہو، مگر میں تمہیں آج یہ بتائے دیتی ہوں کہ کشور ایکٹر سے تمہاری صورت چونکہ ملتی ہوئی ہے، اسی لیے میں تم کو چاہتی ہوں، میں تمہیں دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتی۔۔۔ سمجھے!۔۔۔

میں خط پڑھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں میرا سالا آگیا، مجھے خط پڑھتے میں فکر مند سا دیکھ کر کہنے لگا دولہا بھائی! قمر آپا تو اچھی ہیں، اُن کی بیماری کی تو کوئی خیر خبر نہیں آئی ——— میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔۔۔ تو اپنی قمر آپا کی بیماری کو لیے پھرتا ہے، یہاں قوم کی قوم مر رہی ہے، یہ کہہ کر میری آواز گلوگیر اور میری پلکیں نمناک ہو گئیں!

"فقہ ——— اسلام" میں! فروری ۵۲ء کے شمارے میں یہ مضمون شائع ہوا ہے ——— اس مضمون کے مترجم جناب طٰہٰ لیسین ہیں

روحِ انتخاب

اسلامی حکومت کے امراء و عمال کے لیے اصلی عزت وہ ہے جو اللہ تعالےٰ اور اُس کے دین کے واسطہ سے ان کو حاصل ہوئی ہو اور یہی حقیقی عزت ہے اِس وجہ سے اس عزت کے سوا کسی اور عزت کا نہ ان کے دلوں میں ارمان ہونا چاہیئے اور نہ دین اور اطاعتِ الٰہی کے سوا عزت حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ انہیں اختیار کرنا چاہیئے۔ عزت حاصل کرنے کے تمام جھوٹے طریقے جو دنیا پرست اور جاہ پسند اربابِ اقتدار نے اختیار کیے ہیں مثلاً آداب و کورنش، شاہانہ جلوس، درباری طمطراق، ہٹو بچو، توپوں کی سلامی، باڈی گارڈ کی نمایش، گارڈ آف آنر اور اس قسم کے دوسرے مظاہرے، سب عبدیت اور خدا پرستی کی روح کے منافی اور انسان کے استکبار اور اس کے دعوئ خدائی کی نشانیاں ہیں۔ اِس وجہ سے اسلامی نظامِ زندگی سے یہ چیزیں بالکل بے جوڑ ہیں اور جو لوگ اس مفروضہ پر ان چیزوں کو اختیار کرتے ہیں کہ ان سے دین کی شان میں اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل اپنے کبرِ نفس کو چھپانے کے لیے دین کو پردہ بناتے ہیں ورنہ جہاں یہ فتنے موجود ہوں وہاں دین بے چارے کا کیا کام!

حضرتِ عمرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو نہ کوئی دربار سجایا گیا، نہ جلوس نکالا گیا، نہ جھنڈے لہرائے گئے اور سلامیاں پیش کی گئیں، البتہ حضرت علیؓ نے اِن کو مندرجہ ذیل نصیحتیں فرمائیں جو آج تک اوراق تاریخ میں ثبت ہیں اور حضرت عمرؓ نے ان نصیحتوں پر جس طرح عمل کیا، اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم پر روشن ہے:۔

"اگر آپ اپنے پیش رو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیص میں پیوند لگا لیجئے۔ تہبند اونچی کیجئے جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجئے۔ جرابوں میں پیوند لگائیے۔ ارمان کم کیجئے اور بھوک سے کم کھائیے۔"

(کتاب الخراج ص۹)

اِن نمایشوں سے اگر دین کی دھاک قایم ہوسکتی تو اس مصلحت کے لحاظ سے اس سے زیادہ موزوں بلکہ ضروری وقت اور کون ہو سکتا تھا جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا سفر فرمایا تھا؟ ملک ابھی تازہ تازہ فتح ہوا تھا اور اہلِ ملک رومیوں کے جاہ و جلال کے دیکھنے کے عادی تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اِس بات کی کوئی پروا نہیں کی اور یہ نہیں کہ اپنی طبعی سادگی کی بنا پر اتفاقیہ اس کی پروا نہیں کی بلکہ لوگوں نے بڑے زور و قوت کے ساتھ وقت کی مصلحت ان کو سمجھانے کی بھی کوشش کی، لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سُنی اور اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کردیا کہ دین کی عزت کے سوا جو لوگ کسی اور عزت کے طالب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کو ذلیل کردیتا ہے۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

ہماری نظر میں

وحیٔ منظوم اور سحر البیان

(۱) "وحیٔ منظوم" از :- سیماب اکبرآبادی مرحوم، ضخامت ۵۶ صفحے آرٹ پیپر، رنگین زمین، خوب صورت کتابت وطباعت، ہدیہ دو روپیہ ملنے کا پتہ :- پرچم اسٹریٹ، حسن علی آفندی روڈ، کراچی نمبرا

(۲) "سحر البیان" از :- اثر زبیری لکھنوی، ضخامت ۸۴ صفحے، حسین سرورق، دیدہ زیب لکھائی چھپائی، ہدیہ ایک روپیہ ملنے کا پتہ :- نمبر ۲/۱ زیارت لائینس، ملیر کینٹ کراچی ۹

قرآنِ پاک کے دو پاروں کے یہ منظوم ترجمے ہمارے پاس تبصرے کے لیے بھیجے گئے ہیں، ان پر علماء کرام کی تحسین آمیز آراء بھی درج ہیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بزرگ علماء اور مفتی صاحبان ماشاءاللہ چشم بددور شعر و شاعری سے اچھا خاصہ شغف رکھتے ہیں یہاں تک کہ منظوم تراجم کی تحسین کرتے وقت اُن کی نگاہ سے تھوڑی دیر کے لیے یہ حقیقت اوجھل ہو گئی کہ مشرکین و کفار نے رسول اللہ پر "شاعری" کی جو طنز کی تھی اُس کی خود اللہ تعالیٰ کو نفی کرنی پڑی۔

سب جانتے ہیں کہ "شاعری" حُسنِ تخئیل اور نزاکتِ بیان کا نام ہے، قرآن کے لفظی ترجمہ میں اس کے لیے گنجائش کہاں؟ اس کے یہ معنیٰ ہوئے کہ قرآن کے منظوم ترجمہ میں شاعری کے اصل جوہر نمایاں نہیں ہو سکتے، اسلئے وہ نہ اثر انگیز ہو سکتا ہے اور نہ زبانوں پر چڑھ سکتا ہے —— تو قرآن پاک کا منظوم ترجمہ نہ تو دینی اعتبار سے لائق استحسان ہے اور نہ شعر و ادب میں اس کا کوئی وزن ہے! مگر ہماری اس رائے کو سُنے گا کون، اور ہماری یہ بات مانی کب جائے گی جبکہ مفتی اور علماء اس کے جواز کے لیے تحسین آمیز صداقت نامے عطا فرما چکے ہیں،

اُردو زبان میں سب سے پہلے شاہ شمس الدین شائق ایزدی کا ایک منظوم پارہ الٓمٓ ۱۳۳۶ھ میں چھپ چکا ہے، اُس کے بعد آغا شاعر قزلباش دہلوی نے اس کام کو شروع کیا، اور اب "وحیٔ منظوم" اور "سحر البیان" مارکیٹ میں ؟ ۴۱۹

(۱) "وحیٔ منظوم" کے پارۂ عمّ کا حصّہ ہمارے سامنے ہے، حضرت سیمابؔ مرحوم نے ترجمہ کے علاوہ حاشیہ پر کہیں کہیں ضروری نوٹ بھی دیدیئے ہیں، اب رہا ترجمہ تو سیمابؔ کی قدرتِ کلام میں کس کو کلام ہو سکتا ہے

"وجوہ یومئذٍ خاشعۃ" کا ترجمہ اس طرح کیا ہے :-

ہوں گے اُس دن کتنے ہی لوگوں کے منہ اُترے ہوئے

"منہ اُترے ہوئے" نہایت ہی برمحل ترجمہ اور اصل مفہوم کی بڑی دل نشین اور صحیح ترجمانی ہے۔

"ان الذین فتنوا المومنین والمومنات" کے ترجمہ میں :-

جس نے ایماں دار مردوں عورتوں کو دق کیا

"فتنوا" کا مفہوم "دق کیا" سے بڑی جامعیت کے ساتھ ادا ہوا ہے —— لیکن اس کے ساتھ ہی "ایمان دار"

کو جو "ایمان دار" باندھا گیا ہے اُس کا تلفظ زبان پر قدرے بار گزرتا ہے، پھر "الذین" جمع ہے اور ترجمہ میں واحد نظم کیا ہے۔

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ کے ترجمہ

؎ اور جو سائل ہو جھڑکو تم نہ اُس کو (جانے دو)

میں ناگوار تعقید پیدا ہو گئی ـــــــ اس قسم کی "تعقید" کے نمونے جگہ جگہ نظر آتے ہیں

اَلْقَارِعَةُ، مَا الْقَارِعَةُ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ

کھڑکھڑانے والی ہے وہ، کھڑکھڑانے والی کیا — کھڑکھڑانے والی کیا ہے، سمجھے ہو تم کیا بھلا

اس منظوم ترجمہ میں پڑھنے والوں کو آخر کیا لذت مل سکتی ہے۔

(۲) "سحر البیان" کی بحر "وحیٔ منظوم" سے مختلف ہے، "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا ترجمہ ہم یہاں درج کرتے ہیں

نام سے اللہ کے کرتا ہوں آغازِ (بیاں) — جو بڑا ہی رحم والا ہے نہایت مہرباں (سیماب)

خدا کے نام سے آغاز کرتا ہوں کہ وہ "آقا" — بڑا ہی مہرباں ہے اور نہایت رحمت والا (اثر زبیری)

حضرت سیماب مرحوم نے "آغاز" کے ساتھ "بیاں" کا جوڑ لگا کر، "بسم اللہ" کی معنویت کو بہت محدود و تنگ کر دیا!

جناب اثر زبیری کا منظوم پارہ الٓمّ (سحر البیان جلدِ اوّل) ابھی تک چھپ کر منظرِ عام پر آیا ہے، ترجمہ کافی رواں اور شگفتہ ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ سیماب مرحوم نے لفظی ترجمہ کی جتنی زیادہ پابندی کی ہے، اثر زبیری نے اتنی نہیں کی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ

؎ خدا کو واقعی کوئی جھجک اس میں نہیں ہوتی

ہمارے خیال میں "شرمانے" کے مقابلے میں "جھجک" زیادہ جامع ترجمہ ہے!

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ

؎ فرشتوں نے گزارش کی کہ ہاں تو "برگزیدا" ہے!

"سُبحٰن" کا ترجمہ "برگزیدہ" اصل مفہوم کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا اور "برگزیدگی" تو بندوں کی صفت ہے

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

؎ کہ یہ دُشوار ہے سب پر بجز اربابِ خشیت کے

"اہلِ خشیت" کہتے تو "خشیّت" کی "ی" کی تشدید ظاہر نہ ہونے کا نقص دُور ہو جاتا

فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ

؎ لہٰذا اس جسارت پر تمھیں بجلی نے آدابا

"آپکڑا" کہا جاتا تو کلام میں زیادہ زور پیدا ہو جاتا اور یہ ترجمانی اصل مفہوم سے اقرب ہوتی۔

جگہ جگہ "زیادہ" کو "زادہ" نظم کیا ہے۔۔۔ مثلاً :۔

؎ اور اس ہستی سے زیادہ کون ظالم ہے "سرگیتی" (صفحہ ۲۸)

یہاں "زائد" یا "بڑھ کر" ہونا چاہئے تھا۔

قرآن کے منظوم ترجمے کے بارے میں اپنی رائے ہم شروع میں ظاہر کر چکے ہیں، مگر اس میں کوئی شک نہیں، کہ ترجمہ کرنے والوں کی نیتیں نیک ہیں اور اس کا اجر ان کو ملے گا۔

نوائے سینہ تاب

"نوائے سینہ تاب" از :- جلیل قدوائی، ضخامت ۱۴۴ صفحات مجلّد گرد پوش کے ساتھ، قیمت دو روپے، ملنے کا پتہ :- بیگم ہرمزی ۱۴/۲ جیکب لائن کراچی ۳

جس شاعر کا کلام رسالوں اور اخباروں میں چھپتا رہے، قوال اور گانے والے اُس کی غزلیں گاتے رہیں اور شاعر خود مشاعروں میں شریک ہوتا رہے ــــــ تو اُس "شاعر" کی یاد تازہ رہتی ہے، جناب جلیل قدوائی کی دُنیا ان تینوں باتوں سے خالی ہے، جب سے وہ سرکاری نوکری میں آئے ہیں رسالوں میں اُن کا کلام بس یوں ہی سا چھپتا ہے، مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ وہ "گمنام" شاعر ہیں، لکھے پڑھے لوگ اُن سے واقف ہیں اور بعض ادبی تذکروں میں بھی جلیل قدوائی کا ذکر موجود ہے۔

جناب جلیل قدوائی کا مجموعہ کلام خود اُن کی بیگم صاحبہ نے ترتیب دے کر شائع کیا ہے، قدردانی اور جوہر شناسی کا یہ سلسلہ گھر ہی سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بہت خاص چیز ہے ورنہ شاعروں کی بیویاں عام طور پر شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں رکھتیں اور حُسن و عشق کا چٹخارہ خود شاعروں کو زیادہ اچھا شوہر بھی نہیں بننے دیتا۔

جلیل قدوائی شروع ہی سے مولانا حسرت موہانی کا رنگِ تغزل پسند کرتے ہیں اور بقول محترمہ ہرمزی جلیل "حسرت کے رنگ کو اپنی شاعری میں برتتے بھی ہیں"، اس لیے قدرتی طور پر وہ کسی طرزِ خاص کے موجد نہیں ہیں مگر کسی صاحب طرز شاعر کی اتباع بھی ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے !

جلیل کے ان شعروں کے ساتھ

کون ہے جو زندگی بھر میری غم خواری کرے　　　دل ہے سو رنجور ہے، رنجور کیا یاری کرے

بے رُخی پر تری جب غور کیا　　　مجھ کو اپنی ہی خطا یاد آئی

اپنے گیسوئے پریشاں کا جنھیں ہوش نہیں　　　کیا خبر اُن کو مرے دل کی پریشانی کی

وہ دشمن ہے تو یہ حالت ہے قلبِ ناشکیبا کی　　　خدا معلوم کیا ہو گر وہ اپنا یار ہو جائے

حسرت موہانی کا نام اگر لکھ دیا جائے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ سچ مچ یہ حسرت ہی کے شعر ہیں ؟

جلیل قدوائی کی غزلوں سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ اُن کی محبت ہوس اور پاکبازی کے درمیان کھڑی ہوئی ہے، جدھر کی کشش زیادہ ہوتی ہے! اسی طرف وہ جُھک جاتے ہیں، اُن کے کچھ شعر روایاتی بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن بعض شعر آپ ہی آپ بول رہے ہیں کہ ہم ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کی آواز ہیں !

آغازِ عاشقی کے زمانے کو بھول جا　　　پیارے اب اُس حسین فسانے کو بھول جا

دُنیائے عشق کی جو یہی رسم ہے جلیل　　　تو بھی لُٹا کے دل سے خزانے کو بھول جا

ضبط کرنا بھی مجھے آجائے گا　　　دل سلامت ہے تو دیکھا جائے گا

جو گزرتی ہے مرے دل پہ اُسے کیا معلوم　　　میں ہوں دریا پہ وہ ساحل پہ اُسے کیا معلوم

منائی تھیں دل نے جہاں رنگ رلیاں　　　وہ سونی پڑی ہیں محبت کی گلیاں

ایسے کچھ ایک دم سے وہ انجان ہو گئے　　　کل اُن سے مل کے ہم تو پریشان ہو گئے

اب نہیں عشاق کو کچھ اپنی حالت کی خبر　　　اب وہی وہ ہیں خیال و فکر پر چھائے ہوئے

خندۂ گل جو ہوا ختم[۱] تو میں نے دیکھا باغ میں کچھ بھی نہ تھا گریۂ شبنم کے سوا

جلیل قدوائی کی جو نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ زیادہ تر "المیہ" ہیں مگر اُن کی طبیعت کے جوہر یہاں بھی نمایاں ہیں۔ مرثیہ سردآس مسعود کا ایک شعر ہے :۔

جُز صبر کے کچھ اور نہیں غم کا مداوا جُز ضبط کے کچھ اور نہیں درد کا چارہ

اپنی بڑی بہن کی موت پر جو نظم اُنھوں نے کہی ہے، اُس کے یہ شعر کتنے اثر انگیز ہیں :۔

ہے ضروری جاگنا جس طرح سونے کیلئے ہم ہوئے ہیں سب یوں ہی اک دن ہونے کیلئے

ہو یہ مقصد یا نہ ہو میں تو سمجھتا ہوں یہی دل تڑپنے کے لیے ہے جان کھونے کے لیے

اس سرائے دہر میں بھٹکے مسافر کی طرح دیکھئے کب تک رہوں میں اُن کو رونے کیلئے

نوحہ سلمٰی کا ایک شعر۔۔ ۔۔ بلکہ نشتر :۔

ہونے بھی نہ پائے تھے خد و خال نمایاں بننے بھی نہ پائی تھی کہ تصویر مٹا دی

اُنھوں نے اپنے شش ماہہ بچے حسن کی موت پر جو نظم کہی ہے، وہ خونِ جگر میں ڈوبی ہوئی ہے :۔

تکلیف تھی تجھے مگر آرام ہو گیا اے میری جان تمام ترا کام ہو گیا

آیا تھا چند دن کے لیے تو جہان میں آنے کا چند دن کے لیے نام ہو گیا

آخر تو قیدِ زیست سے چھُٹنا تھا ایک روز اچھا ہوا کہ آج ہی یہ کام ہو گیا

دفنا کے تجھ کو اے مرے ننھے حسن جلیل
خوش[۲] ہوں کہ جیسے آج بڑا کام ہو گیا

دوسرا رُخ :۔ وہ دل جو کبھی تیری توجہ کا تھا مرکز افسوس ہے اب تیر حوادث کا نشانہ (صفحہ ۱۹)

یہاں "حوادث" کا نہیں "بے نیازی" اور "بے پروائی" کا محل تھا۔

میں نے بھی خوب ہی دیوانہ بنایا اُسکو مجھ کو اُس شوخ نے دیوانہ بنا رکھا تھا (صفحہ ۲۲)

شاعر نے "دیوانہ" کو یہاں بے وقوف کے معنیٰ میں استعمال کیا ہے، یعنی میں نے بھی اپنے محبوب کو خوب چرکا دیا اور اُسے اچھا بے وقوف بنایا مگر حسن کی بارگاہ میں یہ سوءِ ادبی مزاجِ عاشقی کے خلاف ہے! یہ بات کسی اور طرح سے کہنی تھی۔

اس کو بخشے گا مرا عشق حیات جاوید کون کہتا ہے ترا حُسن یہ ڈھل جائے گا (صفحہ ۲۳)

"حُسن" نہیں "شباب" کہنا چاہیئے تھا

کچھ تو سمجھ کے تم نے دلائی تھی دل کو آس اب کیا ہوا جو تم نے مرا دل بجھا دیا (صفحہ ۲۴)

پہلا مصرعہ بہت جاندار ہے اور دوسرے مصرعہ میں "اب کیا ہوا" تک بھی یہ زور قایم رہا مگر "جو تم نے مرا دل بجھا دیا" نے شعر کو کمزور کر دیا، آس توڑنا، نااُمید کرنا اور مایوس بنانا کی صحیح ترجمانی "دل بجھانے" سے نہیں ہوتی!

تمناؤں کو دل نے مار ڈالا غمِ ناکام تیرا بول بولا (صفحہ ۲۵)

---

[۱] "خندۂ گل کے ختم" ہونے کی داد نہیں دی جا سکتی، بالکل اچھوتے انداز سے کہا ہے (م - ق)

[۲] یہاں "خوش" کی جگہ "مطمئن" "فارغ" یا اسی انداز کا کوئی لفظ ہوتا، تو شعر اور زیادہ مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتا۔